البقرۃ (۲۶۹)

جسے حکمت و دانائی عطا ہوئی اسے بہت بڑی بھلائی مل گئی

تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند

جلد چہارم

اردو ادب

(۱۸۵۷ء - ۱۹۱۴ء)

مدیرانِ خصوصی سید فیاض محمود و ڈاکٹر عبادت بریلوی

پنجاب یونیورسٹی ، لاہور

طبع اول : فروری ۱۹۷۲ء
تعداد : ایک ہزار
طابع : پنجاب یونیورسٹی
ناشر : گروپ کیپٹن سید فیاض محمود
مطبع : حبیب پریس ، ۳۴ سرنگ روڈ ۔ لاہور

پاکستان و ہند

کی

اِسلامی تہذیبؒ

کے

نام

اراکینِ مجلسِ منتظمہ

مجلسِ ادارت

پہلی جلد	مقدمہ	مصنف	سید فیاض محمود
دوسری جلد	(عربی ادب ۷۱۲ء - ۱۹۷۲ء)	مدیرانِ خصوصی	سید فیاض محمود و پروفیسر عبدالقیوم
تیسری جلد	(فارسی ادب ۱۰۰۰ء - ۱۵۲۶ء)	مدیرانِ خصوصی	ڈاکٹر محمد باقر و ڈاکٹر وحید مرزا
چوتھی جلد	(فارسی ادب ۱۵۲۶ء - ۱۷۰۷ء)	مدیرِ خصوصی	پروفیسر میرزا مقبول بیگ بدخشانی
پانچویں جلد	(فارسی ادب ۱۷۰۷ء - ۱۹۷۲ء)	مدیرانِ خصوصی	سید فیاض محمود و پروفیسر وزیر الحسن عابدی
چھٹی جلد	(اردو ادب ابتداء - ۱۷۰۷ء)	مدیرِ خصوصی	ڈاکٹر وحید قریشی
ساتویں جلد	(اردو ادب ۱۷۰۷ء - ۱۸۰۳ء)	مدیرِ خصوصی	پروفیسر سید وقار عظیم
آٹھویں جلد	(اردو ادب ۱۸۰۳ء - ۱۸۵۷ء)	مدیرِ خصوصی	سید فیاض محمود
نویں جلد	(اردو ادب ۱۸۵۷ء - ۱۹۱۴ء)	مدیرانِ خصوصی	سید فیاض محمود و ڈاکٹر عبادت بریلوی
دسویں جلد	(اردو ادب ۱۹۱۴ء - ۱۹۷۲ء)	مدیرِ خصوصی	سید فیاض محمود
گیارھویں جلد	(بنگالی ادب - اول)	مدیرِ خصوصی	ڈاکٹر سید علی اشرف
بارھویں جلد	(بنگالی ادب - دوم)	مدیرِ خصوصی	ڈاکٹر سید علی اشرف
تیرھویں جلد	(علاقائی ادبیات مغربی پاکستان - اول)	مدیرِ خصوصی	سید فیاض محمود
چودھویں جلد	(علاقائی ادبیات مغربی پاکستان - دوم)	مدیرِ خصوصی	سید فیاض محمود
پندرھویں جلد	(علاقائی ادبیات ہند)	مدیرِ خصوصی	سید فیاض محمود
سولھویں جلد	(خلاصہ جملہ جلد ہائے ادبیات در انگریزی)	مؤلف	سید فیاض محمود

تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند

(نویں جلد) اردو ادب چہارم (۱۸۵۷ء - ۱۹۱۴ء)

فہرستِ مضامین

نمبر شمار	باب	مقالہ	مقالہ نگار	صفحہ
		پیش لفظ	پروفیسر علاء الدین صدیقی	
		تعارف	مدیر عمومی	
۱	پہلا	سیاسی ، فکری ، معاشرتی اور تہذیبی پس منظر	ڈاکٹر شمس الدین صدیقی	۱
۲	دوسرا	ادبی منظر	ڈاکٹر شمس الدین صدیقی	۴۵
۳	تیسرا	سر سید احمد خان	پروفیسر محمد فرمان	۹۰
۴	چوتھا	مولانا الطاف حسین حالی	ڈاکٹر عبدالقیوم	۱۰۶
۵	پانچواں	سید اکبر حسین اکبر (الہ آبادی)	ڈاکٹر محمد صادق	۱۳۸
۶	چھٹا	محمد شبلی نعمانی	پروفیسر محمد فرمان	۱۷۳
۷	ساتواں	دوسرے مصنفین	ڈاکٹر عبداللہ خاں	۲۰۸
۸	آٹھواں (الف)	غزل گو شعراء	ڈاکٹر ناظر حسن زیدی	۲۴۰
	(ب)	دیگر شعراء	ڈاکٹر ناظر حسن زیدی	۲۷۱
	(ج)	قومی و ملی شاعری	سہیل احمد خاں	۲۹۴
۹	نواں	محمد حسین آزاد	ڈاکٹر محمد صادق	۳۰۸
۱۰	دسواں	مولوی نذیر احمد دہلوی	ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی	۳۳۵
۱۱	گیارھواں باب (الف)	عبدالحلیم شرر	پروفیسر سید وقار عظیم	۳۶۷
	(ب)	رتن ناتھ سرشار	ڈاکٹر وزیر آغا	۳۸۷

۱۲ -	بارھواں	اردو ڈراما	عشرت رحمانی	۳۹۸
۱۳ -	تیرھواں (الف)	سوانح	الطاف فاطمہ	۴۳۵
	(ب)	مکاتیب	ڈاکٹر عبدالقیوم	۴۵۷
	(ج)	عورتوں کا ادب	نادرہ زیدی	۴۷۳
	(د)	بچوں کا ادب	ڈاکٹر اسد اریب	۴۸۹
۱۴ -	چودھواں	دوسرے ناول نگار	خواجہ محمد زکریا	۴۹۹
۱۵ -	پندرھواں	صحافت	مسکین علی حجازی	۵۲۷
۱۶ -	سولھواں	اردو شعراء کے تذکرے	ڈاکٹر فرمان فتح پوری	۵۵۵
۱۷ -	سترھواں	مناظراتی ادب	ادارہ	۵۸۴
۱۸ -	اٹھارھواں	اردو زبان کا جائزہ ۔ صرف و نحو پر تصانیف و تالیفات	ڈاکٹر ابواللیث صدیقی	۶۲۳
		اس دور کے ادب کا مجموعی جائزہ	مدیرِ عمومی	۶۴۴

پیش لفظ

تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند لکھنے کا مقصد یہ تھا کہ ان فکری عوامل اور شعائرِ زندگی کی نشاندہی کی جائے جس سے اس برِصغیر کے مسلمانوں کی ثقافتی زندگی اور معاشرتی اقدار کی تعمیر ہوئی۔ ادب سے مراد یہاں ان خیالات و جذباتِ عالیہ کا مؤثر اظہار ہے جن سے قلب و نظر کی جلا ہوتی ہے اور جن سے انسانی زندگی با معنی بنتی ہے۔ ایسے خیالات و تصورات جہاں ہمیں ادراک کی منتہیات کا راستہ دکھاتے ہیں وہاں روحانی تسکین کا باعث بھی ہوتے ہیں۔ ان سے ہمارے ایام بھی روشن ہوتے ہیں اور ہمارے لمحات بامراد۔ ادب میں مذہب، تصوف، فلسفہ، اخلاقیات، تاریخ، لسانیات، شاعری، افسانے، انشائیات، مکتوبات، ہر چیز شامل ہے۔ ہم نے کوشش کی ہے کہ جس جس زبان میں برِصغیر کے مسلمانوں نے اپنے رنج و مسرت، اپنی فکر و نظر، اپنی اُمنگوں اور عزائم کو متجسم کیا ہے۔ ان کے شاہپاروں اور ان کے مصنفین سے اپنے ہم وطنوں اور باہر کی دُنیا کو رُوشناس کرایا جائے۔ تاکہ ہم پہچان سکیں کہ ہماری زندگی کس قسم کی تہذیب و ثقافت پر استوار ہے اور ہمیں اس بات کا مستقل احساس ہو جائے کہ مسلمانانِ پاکستان و ہند خواہ وہ شرق میں ہوں یا مغرب میں، شمال میں ہوں! جنوب میں، ایک ہی ثقافتی رشتہ میں منسلک ہیں اور ایک ہی تہذیبی روایت کے علمبردار ہیں۔

محمد علاء الدین صدیقی

(پروفیسر علاء الدین صدیقی مدیرِ اعلیٰ)

تعارف

مسلمانوں کو اس برِ صغیر میں آئے ہوئے سوا تیرہ سو سال ہو چکے ہیں یہ اس لئے درست ہے کہ مکران ۴۴ھ میں فتح ہو گیا تھا۔ اس طویل عرصے کو ہم چار ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک وہ دور جو سلطان محمود غزنوی کی فتوحات پر ختم ہوا۔ یہ کوئی پونے چار سو سال کی مدت ہے[1]۔ اس عرصے میں برِ صغیر کے شمال مغربی علاقوں پر عربی زبان و ادب اور عربی تہذیب و تمدن کا تسلط رہا۔ دوسرا دور کوئی پانچ سو سال کا ہے۔ جو غزنوی عہد اور عہدِ سلاطین پر مشتمل ہے۔ اس دور میں برِ صغیر "دار السلام" کہلایا اور تہذیبی طور پر ملتِ اسلامیہ کی عالمی وحدت کا رکن رہا۔ پانچ سو سالوں کے اس دور میں، جس کا آغاز محمود غزنوی کے ورود سے ہوتا ہے، فارسی ادب کا رواج ہوا اور فارسی زبان اظہار کا ذریعہ رہی۔ ویسے مغربی پاکستان کی سرزمین میں فارسی زبان اس عہد سے بھی پہلے پہنچ چکی تھی، بلکہ ملتان کے علاقے میں عام تکلمی زبان کی حیثیت[2] حاصل کر چکی تھی۔ پھر تیسرا دور مغلیہ عہد ہے، جو ۱۵۲۶ء سے ۱۸۵۷ء تک کی مدت پر محیط ہے۔ اس میں ملتِ اسلامیانِ پاکستان و ہند نئے تہذیبی اثرات سے روشناس ہوئی اور معاشرے میں فکری مد و جزر کارفرما رہا۔ اس دور میں افکار اور خیالات میں وسعت پیدا ہوئی، اور اگرچہ اعتقادات میں ایک حد تک تزلزل کے آثار نمایاں ہونے لگے، لیکن تخریب اور انتشار کے ساتھ ساتھ تعمیر کا عمل بھی جاری رہا۔ اس پوری مدت میں فارسی

۱؎ دیکھئے، چوتھی صدی ہجری کے ابنِ صاعد اندلسی کی تالیف "طبقات الاسلام"

کی ادبی اقدار ہماری تہذیبی زندگی کا محرک اور غالب عنصر تھیں۔ اس کے بعد مغربی تہذیب، اس کے اصول زندگی اور اس کے معاشی، سماجی اور معاشرتی افکار کی اشاعت ہوئی۔ چونکہ یہ دور نشر و اشاعت کا دور ہے، اور اس میں بعض وسائل فراہم ہونے سے تعلیم عوام تک پھیل گئی، اس لئے خیالات میں انقلاب پیدا ہونے لگا۔ اس ذہنی انقلاب نے کئی نئی صورتیں اختیار کیں اور اس کے نتائج آجکل ہماری خانگی، اجتماعی، سیاسی اور مذہبی زندگی میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ گذشتہ تین چار سو سال کی مدت میں اردو، بنگلہ اور دیگر زبانوں اور بولیوں کا علاقائی ادب بھی فنی پختگی کے ساتھ ساتھ حسنِ اظہار کا وصف پیدا کر چکا ہے۔

ادب میں معاشرتی اور تعلیمی عوامل منعکس ہوتے ہیں۔ زندگی کے تقاضے اظہار، احتجاج، طنز، شکایت، دعا یا الحاح کی صورت میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔ اس تاریخ ادبیات کا مقصد یہ ہے کہ ادب کو معاشرے کے ایک تقاضے کے طور پر پیش کیا جائے، تاکہ زندگی کے ہر رخ، قلبِ انسانی کی ہر کیفیت، روحِ کائنات کے ہر پرتو میں ہم آہنگی نظر آئے اور مسلمانانِ برِصغیر کی پوری زندگی اور ان کی تہذیب کا جامع عکس، بلکہ وحدت کا مکمل ثبوت، ہر اس زبان اور اس کے ادب میں یقین آفریں انداز میں پیش ہو، جو یہاں بولی جاتی رہی ہے۔ اس سے یہ اندازہ ہو جائے گا کہ ہم جس تہذیبی ورثے کے مالک ہیں، وہ کتنا پائدار ہے اور اس میں کتنی توانائی اور استقامت موجود ہے۔

اس تاریخ کی تدوین میں دو تین باتیں خاص طور پر ملحوظِ خاطر رکھی گئی ہیں۔ اوّل یہ کہ کسی قوم کی تہذیبی اور ادبی تاریخ اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی، جب تک اس قوم کی لسانی، ادبی اور معاشرتی سرگرمیوں کا پوری طرح اور ہمدردانہ انداز سے محاسبہ نہ کیا جائے۔ اس لئے ہم نے کوشش کی ہے کہ عربی، فارسی، ترکی، اردو، بنگلہ، پشتو، پنجابی، سندھی، کشمیری، بلتی، شینا، بروشسکی، کھوار، ہندکو، سرائیکی، بلوچی اور براہوی، غرض ہر اس زبان کے معاشرتی اور فکری پس منظر کی نشاندھی کی جائے، جو پاکستان میں بولی گئی ہے یا بولی جاتی ہے، اور جو ادبی تخلیقات اس ماحول سے ابھرتی ہیں، خواہ وہ ضرب الامثال ہوں یا لوک کہانیاں، گیت ہوں یا لوریاں، ان میں رزم، تصوّف، فکر اور عمیق جذبات کی ترجمانی ہو یا محض

تفننِ طبع کا سامان ۔ سبھی کا تاریخی اور تنقیدی جائزہ سے کر اپنی قوم کی ادبی تاریخ مرتب کی جائے ۔ چنانچہ ہم نے زندگی کے ہر پہلو، زبان کے ہر انداز اور فکر کی ہر جہت کی ترجمانی کرنے کی کوشش کی ہے اس طرح یہ تاریخ کامل طور پر اور صحیح معنوں میں ہماری ثقافت کی آئینہ دار ہو جاتی ہے ۔

علاقائی ادبیات میں خاص طور پر لوک ادب کا مقام بہت بلند ہے ۔ اور ہم نے اسے ادب عالیہ کا ایک رکن تصور کیا ہے ، اس لئے کہ ہر قوم کی ادبی تاریخ میں لوک ادب ایک معنی خیز کردار ادا کرتا ہے ۔ اکثر لوگوں کی زندگیاں اسی ادب کی اقدار سے متاثر ہوتی ہیں ، اور اسی کے کردار علامت بن کر ان کے محرک بنتے ہیں اور ان کے استعمال کا جواز پیش کرتے ہیں ۔ اس لئے ادبی تاریخ میں اس کا ذکر ضروری ہے ۔

یہی حال ان مصنفین کا ہے ، جو عام طور پر دوسرے درجے کے ، یا بالفاظِ دیگر چھوٹے مصنف شمار ہوتے ہیں ۔ یہ تو بدیہی امر ہے کہ کسی قوم کی رفعتِ فکر اور اسکی جذباتی بلندی صرف انہی مصنفین کے کلام یا تصانیف میں نظر آئے گی ، جن کی نگاہ وسعت ، بلندی اور گہرائی کے لحاظ سے روزمرہ کے تجربات کے حدود میں مقید نہ ہو ، اس لئے کہ چھوٹے شاعر یا افسانہ نگار یا ناول نویس یا نثر لکھنے والے اپنے اپنے تجربے اور فنی کوشش کے دائرے میں محدود اور محصور ہوتے ہیں ۔ مگر یہاں یہ بات نظر انداز نہیں ہونی چاہیئے کہ اس دائرے سے اچھی طرح واقف ہونے کے باعث وہ ان چھوٹی چھوٹی باتوں کو ، جن سے عام لوگوں کی زندگی عبارت ہوتی ہے ، زیادہ توجہ سے قلم بند کرتے ہیں ۔ ان کی نظر وسیع نہیں ہوتی مگر وہ روزمرہ کے تقاضوں اور زندگی کے عام مشاغل اور قلبی واردات کے سطحی تاثرات کو صاف طور پر بیان کر دیتے ہیں ۔ چنانچہ ان کے ہاں عام زندگی کی عکاسی عظیم شعراء یا مصنفین کی نسبت بہتر طریقے سے ہوتی ہے اس لئے کسی قوم کی تہذیبی تاریخ مرتب کرتے وقت ان چھوٹے اہلِ قلم کی تخلیقات کا جائزہ لینا بھی اسی قدر ضروری ہوتا ہے جتنا ادبی عظماء کا ۔ چنانچہ اس تاریخ میں یہ پہلو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا ۔ اس طرح ہمارا خیال ہے کہ یہ تاریخ مسلمانانِ پاکستان و ہند کی پوری ادبی زندگی کی ترجمان بن گئی ہے ۔

مذکورہ مطالب کے حصول کے لئے ہر ادب کا ذکر کرنے سے پہلے اس کے سیاسی اور معاشرتی پس منظر کو سامنے لایا گیا ہے، تاکہ قارئین کو معلوم ہو سکے کہ جن لوگوں کے تاثرات اور خیالاتِ عالیہ کی ہم عکاسی کر رہے ہیں، وہ اپنی اجتماعی زندگی کن ضوابط، کن پابندیوں اور کن اصولوں کے تحت بسر کرتے تھے۔ اس بنا پر اس تاریخ ادبیات کو در اصل ملّتِ اسلامیانِ پاکستان و ہند کی تہذیبی تاریخ تصور کرنا چاہیئے۔

سید فیاض محمود

گروپ کیپٹن سیّد فیّاض محمود
مدیر عمومی

پہلا باب

سیاسی ، فکری ، معاشرتی اور تہذیبی پس منظر

(۱۸۵۷ء تا ۱۹۱۴ء)

تحقیق سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی بغاوت کی حد تک محدود نہ تھی بلکہ شمالی و وسطی ہند میں ہمہ گیر تھی[1]۔ پھر بھی ناکام اس لیے ہوئی کہ پوری تیاری اور تنظیم کے بغیر اچانک شروع ہو گئی تھی اور اس تحریک کے کارکنوں میں نہ صرف باہمی تعاون کی بلکہ فنونِ جنگ کی مہارت کی بھی بڑی کمی تھی۔ نیز بعض ملکی عناصر بھی موقع پر اس قومی تحریک کا ساتھ دینے کے بجائے اس کی مخالفت اور انگریزوں کی حمایت کے لیے سرگرمِ کار ہو گئے تھے۔ یہ امر بھی اب محتاجِ ثبوت نہیں رہا ہے کہ آزادی کی اس جنگ میں مسلمان اور ہندو دونوں ہی شریک تھے[2] مگر اس ناکام تحریک کی سزا اکثر و بیشتر مسلمانوں کو ملی[3]۔

انگریزوں کے مسلمانوں سے خصوصی معاندانہ سلوک کی کئی وجوہات تھیں۔ اسلامی تعلیمات و عقائد کو یورپ میں صدیوں سے جس طرح مسخ کرکے پیش کیا جاتا رہا ہے ، اس سے مغربی اذہان میں مسلمانوں کے خلاف نفرت و حقارت کے جذبات فطری طور پر پیدا ہو چکے تھے اور ان سے انگریز بھی محفوظ نہ تھے۔ پھر انہیں مسلمانوں سے جو خاص بدگمانی صلیبی جنگوں کے زمانے میں پیدا ہوگئی تھی وہ صدیاں گزرنے پر بھی نہ مٹی۔ ان عمومی اسباب کے علاوہ خصوصی وجہیں یہ تھیں کہ ہندوستانی مسلمانوں کا صدیوں کا اقتدار چھن کر انگریزوں کے ہاتھ میں چلا گیا تھا ، جس کی وجہ سے مسلمانوں کی ناراضگی انگریزوں کے خلاف ہندوؤں کے مقابلے میں بدرجہا زیادہ تھی اور اس کا احساس انگریز حکام کو ہو گیا تھا۔ نیز انگریزوں نے یہ بھی دیکھا تھا کہ مسلمان باوجود اس کے کہ وہ

---

(۱) مہر ، غلام رسول ، ۱۸۵۷ء - مطبوعہ لاہور -

(۲) خورشید مصطفی رضوی ، جنگ آزادی ۱۸۵۷ء - مطبوعہ دہلی ۱۹۵۹ء -

(۳) نوٹ : اس جنگ کے غیر جانبدار مطالعہ کے لیے دیکھیے ڈاکٹر آر - سی موجمدار کی انگریزی کتاب The Revolt and Mutiny of 1857 - مطبوعہ کلکتہ ۱۸۵۷ (مدیر عمومی) -
بلکہ بقول ڈاکٹر موجمدار بحوالہ کتاب مذکورہ بالا اس جنگ میں مسلمان زیادہ تعداد میں شامل تھے ... . مدیر عمومی -

جنگِ آزادی کے علاقوں میں آبادی کے لحاظ سے کم تھے اور فوج میں بھی ان کی تعداد ہندوؤں سے کم تھی، تاہم انہوں نے ہندوؤں سے زیادہ جوش و خروش سے انگریزوں کا مقابلہ کیا تھا، بے مثال استقامت کی شان دکھائی تھی اور بے شمار جانی و مالی قربانیاں دی تھیں۔ اس کے علاوہ انگریزوں کو یہ بھی علم تھا کہ بہت سے مسلمان علماء نہ صرف ۱۸۵۷ء کے زمانے میں بلکہ اس سے بہت پہلے سے مسلمانوں کو جہاد کے لیے اکساتے رہے تھے۔ ان تمام باتوں کے پیشِ نظر ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کو سرکشی و بغاوت کا نام دے کر اس کا ذمے دار انہوں نے مسلمانوں کو قرار دیا[۱]۔ اور اس بغاوت میں ہندوؤں کی شرکت کو محض ایک عارضی لغزش سے تعبیر کیا[۲]۔

۱۸۵۷ء کے بعد کئی برس تک انگریزوں کی حکمتِ عملی اسی اصول پر مبنی رہی کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ کمزور، نادار اور محتاج بنا دیا جائے اور ان کے حوصلے ایسے پست کر دیے جائیں کہ وہ پھر کبھی انگریزی حکومت کے خلاف نبرد آزما ہونے کا خیال تک دل میں نہ لا سکیں۔ چنانچہ جنگِ آزادی کے ناکام ہوتے ہی انہوں نے اپنے مظالم شروع کر دیے۔ جہاں ان کا تسلط دوبارہ قائم ہوتا جاتا تھا، وہاں مہینوں تک انگریز سپاہی اور ان کے معاون دسیے نہتے باشندوں کا شکار کھیلتے پھرتے تھے اور تخمینہ لگایا گیا ہے کہ ہر انگریز کے عوض میں کم و بیش ایک ہزار دیسی مارے جاتے تھے[۳]۔

جو حال دہلی اور اہلِ دہلی کا ہوا اسی سے ملتا جلتا حال ہر اس جگہ کا ہوا جہاں تحریک آزادی کو ناکام بنا کر انگریزوں نے اپنا تسلط دوبارہ قائم کیا۔ لکھنؤ، الہ آباد، آگرہ، کانپور، بنارس، فتح پور، باندہ، فرخ آباد، بدایوں، بریلی، شاہجہانپور، مراد آباد، اٹاوہ، ایٹہ، علی گڑھ، مین پوری، بلند شہر، مظفر نگر، پٹنہ، جھانسی، سہارنپور وغیرہ ہر جگہ ایک ہی کیفیت تھی۔ انیس بیس کا فرق

---

(۱) ٹامس و گیرٹ، ہندوستان میں برطانوی راج کا عروج و تکمیل - (انگریزی) ص ۴۳۳، مطبوعہ لندن ۱۹۳۴ء، نیز برطانوی سلطنت کیمبرج تاریخ (انگریزی) جلد پنجم - ص ۱۶۹ - بحوالہ تحریک آزادی کی تاریخ (انگریزی) جلد دوم، حصہ اول - ص ۲۳۱ - نیز سرسی کیمبل، ہندوستانی بغاوت کا بیان (انگریزی) مطبوعہ لندن ۱۸۵۸ء، بحوالہ ملک حفیظ ہندوستان و پاکستان میں مسلم قومیت (انگریزی) ص ۷۰۲، مطبوعہ واشنگٹن ڈی سی ۱۹۶۳ء

(۲) ٹامپسن و گیرٹ، ص ۴۴۴، نیز برطانوی سلطنت کی کیمبرج تاریخ (انگریزی) جلد پنجم - ص ۱۶۹، بحوالہ تاریخ تحریک آزادی، جلد دوم، حصہ اول - ص ۲۳۱ -

(۳) ہاشمی فرید آبادی، تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت، جلد دوم، ص ۱۴۳ اور ایڈورڈ ٹامسن کی، تصویر کا دوسرا رخ -

ہو تو ہو - وہی قتلِ عام ، وہی لوٹ مار ، وہی موت اور کالے پانی کی سزائیں - تنوع اگر نظر آتا تھا تو شقاوت اور قسی القلبی کے نئے نئے طریقوں میں جیسے پھانسی کے لیے درختوں پر لٹکانا ، سولی پر چڑھانا ، جلتی ہوئی سلاخوں سے داغ کر مارنا ، زندہ جلا دینا، ایک دوسرے کو بدفعلی کرنے پر مجبور کرنا ، سور کی کھال میں سی کر جلا دینا ، توپ سے باندھ کر اڑا دینا ، بھوکا رکھ کر دم گھوٹ کر مارنا ، بستیوں کو جلا دینا وغیرہ[1] -

جنگِ آزادی میں حصہ لینے والوں سے انگریزوں نے جو انتقام لیا ، جو وحشیانہ قتلِ عام ، ناراجی و غارت گری کی اور اس کے بعد جو ضبطیاں ، قرقیاں ، خانہ بربادیاں اور جلا وطنیاں کیں ان میں زیادہ نقصان مسلمانوں ہی کو پہنچا ، کیونکہ وہی ظلم و تعدی کا خاص طور پر نشانہ بنائے گئے[2]- یہ صورتِ حال تھی کہ نومبر ۱۸۵۸ء میں برطانیہ کی ملکہ وکٹوریہ کا ایک شاہی اعلان ہندوستان میں سنایا گیا -[3] جس کے ذریعے ملکہ نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت ختم کر کے ہندوستان کی حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی ، مکمل مذہبی آزادی کا اعلان کیا ، سرکاری نوکریوں کے لیے رنگ و قومیت کا امتیاز اٹھا دیا اور تمام مجاہدینِ آزادی کو جن پر قتل کا الزام نہیں تھا اور سزا سے ابھی تک بچے ہوئے تھے معاف کر دیا - لیکن اس اعلان کے باوجود شمالی ہند کے مسلمانوں کے لیے شدید ابتلا و آزمائش کا زمانہ ختم نہیں ہوا - پکڑ دھکڑ پھر بھی جاری رہی اور پھانسیوں اور کالے پانی کی سزاؤں سے پھر بھی انہیں نجات نہ ملی[4] اور سیاسی ، اقتصادی ، تعلیمی ، ذہنی و نفسیاتی طور پر انہیں مفلوج بنا دینے کا سلسلہ برابر جاری رہا اور حکمرانوں کی ایک سوچی سمجھی پالیسی کے تحت جاری رہا - مسلمانوں کے خلاف انگریزوں کی بدگمانی و نفرت میں کوئی کمی نہیں آئی اور وہ برابر مسلمانوں ہی کو جنگِ آزادی کا محرک قرار دیتے رہے -

یہ حالات تھے کہ مراد آباد کے صدرالصدور سید احمد خاں نے جو آگے چل کر سر سید کے نام سے مشہور ہوئے ، انگریزی حکومت کی ملازمت میں ہونے کے باوجود وہ جرأت مندانہ اقدام کیا جو ان کی خود اعتمادی ، بے خوفی ، صداقت اور تدبیر کی زندہ یادگار ہے ، یعنی انہوں نے 'رسالہ' اسبابِ بغاوتِ ہند' لکھا اور ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کی ذمے داری مسلمانوں کے سر سے ہٹا کر خود انگریزوں کی غفلت ، نا عاقبت اندیشی ،

---

(۱) خورشید مصطفیٰ رضوی ' جنگ آزادی ۱۸۵۷ء - ص ۴۰۹ تا ۵۷۵ -
(۲) ہاشمی فرید آبادی' تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت جلد دوم - ص ۳۴۸ -
(۳) گروور ' بی ایل و سیٹھی ' آر ' آر جدید تاریخ ہند کے مطالعے (انگریزی) ص ۱۸۷ - ۱۸۸ - مطبوعہ دہلی ۱۹۶۳ء -
(۴) خورشید مصطفیٰ رضوی ، جنگ آزادی ۱۸۵۷ء - ص ۴۰۹ -

بے تدبیر ، بد انتظامی ، غرور و تمکنت ، خود داری و چیرہ دستی اور ہندوستانیوں کو حکومت میں شامل نہ کرنے کی پالیسی پر ڈالی ۔ ہنگامے کو ختم ہوئے زیادہ دن نہیں گذرے تھے ، ایسے زمانے میں مسلمانوں کے حق میں یا ان کے بچاؤ کے لیے کوئی بات کہنا یا ان کی طرف سے وکالت کرنا اور ساتھ ہی ہنگامے کی ذمے داری خود انگریزوں پر ڈالنا بڑے دل گردے کا کام تھا جو سر سید نے انجام دیا ، لیکن اس رسالے کا اثر فوری طور پر انگریزوں کی پالیسی پر کچھ نہ پڑا کیونکہ انگریزوں کی مسلم دشمنی کوئی ۱۸۵۷ء سے شروع نہیں ہوئی تھی ، بلکہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے بنگال میں بر سرِ اقتدار آنے کے بعد ہی سے شروع ہو چکی تھی ۔ لارڈ میکالے کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ کلائیو کسی مسلمان کو بنگال کے محکمہء انتظامی کا سردار بنانے کے خلاف تھا ۔[1] گورنر جنرل ایلن برا نے ۱۸۴۳ء ہی میں صاف الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ ہماری صحیح پالیسی یہ ہے کہ ہم ہندوؤں کو اپنا طرفدار بنائیں[2]۔ چنانچہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنی فوجی ، زرعی ، انتظامی ، عدالتی و تعلیمی پالیسی ہی ایسی بنائی تھی کہ مسلمان گھاٹے میں رہیں اور ہندو فائدے میں ۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ انیسویں صدی کے ربع اوّل تک بنگال میں مسلمانوں کا بالائی طبقہ مفقود ہو گیا اور عام مسلم خاندانوں کو با عزت زندگی گزارنا تک مشکل ہو گیا ۔ جیسے جیسے وقت گذرتا گیا مسلمانوں کی حالت بد سے بدتر ہوتی گئی ۔ ۱۸۵۷ء کے بعد تو غضب ہی ہو گیا ۔ باوجود ملکہ وکٹوریہ کے اعلانِ ۱۸۵۸ء کے بقول ڈاکٹر ہنٹر "۱۸۶۹ء میں کلکتے میں مشکل ہی سے کوئی دفتر ہوگا جس میں بجز چپراسی یا چٹھی رساں یا دفتری کے مسلمان کو کوئی اور نوکری مل سکے[3]"۔ ڈاکٹر ہنٹر نے یہ بھی لکھا کہ مسلمان اب اس قدر گر گئے ہیں کہ اگر وہ سرکاری ملازمت پانے کی قابلیت بھی حاصل کر لیتے ہیں تب بھی انہیں سرکاری اعلانات کے ذریعے خاص احتیاط کے ساتھ ممنوع کر دیا جاتا ہے ، ان کی بے کسی کی طرف کوئی متوجہ نہیں ہوتا اور اعلیٰ حکام تو ان کے وجود کو تسلیم کرنا ہی اپنی کسرِ شان سمجھتے ہیں[4]۔

بنگال میں تو یہ حال تھا ، ادھر پنجاب میں تعلیمی پالیسی کا رخ بدل دیا گیا ، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پنجاب میں مسلمانوں کی اکثریت کے باوجود اساتذہ ہندو ہی

---

(۱) طفیل احمد ، سید ، مسلمانوں کا روشن مستقبل - ص ۱۶۴ - مطبوعہ دہلی ۱۹۴۵ء -

(۲) جذبی ، معین احسن ، حالی کا سیاسی شعور - ص ۲۹ ، مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۵۹ء -

(۳) طفیل احمد ، مسلمانوں کا روشن مستقبل - ص ۱۷۲ -

(۴) ہنٹر ڈبلیو ، ڈبلیو ، ہمارے ہندوستانی مسلمان (انگریزی) ص ۱۵۸ - مطبوعہ لندن ۱۸۷۱ء ،
طفیل احمد ، مسلمانوں کا روشن مستقبل - ص ۱۷۱ - ۱۷۲ -

ہوتے تھے ۔ کبھی کبھی مسلمان کا نام جو شاذ و نادر نظر آتا تو وہ محض اس وجہ سے کہ اس وقت علاقہ سرحد بھی پنجاب کے تحت تھا اور وہاں ہندو استاد جانا پسند نہ کرتے تھے ، اس لیے مسلمان وہاں بھیجے جاتے تھے(۱)۔

ہنٹر نے فوسیت اور جنگجویانہ حوصلہ مندی کے جذبات کا جو حوالہ دیا ہے وہ سید احمد شہید کے پیروؤں کی سرگرمیوں کی طرف ایک اشارہ ہے ۔ سید احمد شہید اور ان کے پیروؤں کی تحریک اصلاح و جہاد کو انگریزوں نے سیاسی مصلحت کی بنا پر وہابیت کا نام دے دیا تھا ، حالانکہ اس کا تعلق عرب کی وہابی تحریک سے نہ تھا بلکہ شاہ ولی اللہ کی اصلاحی تحریک سے تھا ۔ ان وطن پرست اسلام کے شیدائیوں کی وحدانیت اور مساوات نے زیر اثر بنگال کے مسلمان کسانوں اور کاریگروں میں مذہبی بیداری ہی نہیں بلکہ سیاسی بیداری بھی پیدا ہو رہی تھی اور ایک جماعت 'فرائضی' کے نام سے تیار ہو گئی تھی ۔ اسے دبانے کے لیے بعض فرائضی رہنماؤں کو گرفتار کر لیا گیا اور بعضوں کو بزورِ شمشیر ختم کر دیا گیا(۲)۔ جب تک انگریزوں کی سیاسی مصلحت یہ تھی کہ سکھوں سے مسلمانوں کو لڑایا جائے اس وقت تک وہ سکھوں کے خلاف مسلمانوں کی تحریکِ جہاد میں مدد دیتے رہے ، لیکن جب سکھوں کا زور ٹوٹا اور ۱۸۴۹ء میں پنجاب پر انگریزوں کا پورا تسلط ہو گیا ، تو انہی مجاہدین کا خاتمہ کرنے کے لیے کئی دفعہ مہمات بھیجی گئیں ، ان کے مرکز ستھیانہ کے در و دیوار بلکہ آس پاس کی پہاڑیاں تک جلا کر خاکستر کر دی گئیں اور پھر ۱۸۶۳ء اور ۱۸۶۸ء میں بڑے پیمانے پر حملے کر کے ان کا تقریباً خاتمہ ہی کر دیا گیا ۔ مجاہدین کے معاونین پر بغاوت و سازش کے مقدمے بنائے گئے اور تمام وہابی فرقے کو دشمنِ فرنگ قرار دے دیا گیا ۔ نہ صرف اہلِ قلم اور سیاست پیشہ انگریز بلکہ عدالتی اور انتظامی حکام تک علانیہ کہتے تھے کہ یہ فرقہ مسلمانوں کو قرآن کی اصلی تعلیم سکھاتا اور قرنِ اول کی روح تازہ کرنی چاہتا ہے جس کے معنی کفار کا قتل اور فرنگی سے جنگ و جہاد کی ترغیب دینا ہیں(۳)۔

وہابی تحریک کا ایک مرکز پٹنہ تھا جہاں سید احمد شہید کے خلفاء مولوی ولایت علی اور ان کے چھوٹے بھائی عنایت علی رہتے تھے ۔ وہاں سے یہ اصحاب بنگال ، مدراس

---

(۱) خورشید احمد خان ، بحوالہ طفیل احمد ، مسلمانوں کا روشن مستقبل ۔ ص ۱۲۳ ۔

(۲) قریشی ، اشتیاق حسین ، برصغیر ہند و پاکستان میں مسلم طبقہ ۶۱۰ء تا ۱۹۴۷ء (انگریزی) ص ۲۰۹ ۔ ۲۱۰ مطبوعہ ہیگ ۱۹۶۲ء نیز طفیل احمد مسلمانوں کا روشن مستقبل ۔ ص ۱۱۷ ۔ ۱۱۸ ۔

(۳) ہاشمی فرید آبادی ، تاریخ مسلمان پاکستان و بھارت جلد دوم ۔ ص ۳۴۸ ۔

اور تمام ہندوستان کے دور دراز مقامات میں صحیح اسلامی تعلیمات کی اشاعت کے لیے مبلّغین بھیجتے تھے ۔ جو ہندوستانی مسلمان بد دل ہو کر سرحد کو ہجرت کر جاتے تھے ، ان کے پاس ہندوستان سے مالی امداد اور عزیز و اقارب اور ہمدردوں کی آمد و رفت بھی جاری رہتی تھی ۔ ۱۸٦۴ء میں انگریزوں کی طرف سے اس پر کوئی پابندی نہ تھی ، لیکن ۱۸٦۴ء سے ۱۸۷۰ء تک جب کہ سرحد میں انگریز وہابیوں کا استیصال کرنے پر تلے ہوئے تھے ، باشندگانِ ہند پر یکے بعد دیگرے پانچ مقدماتِ بغاوت چلائے گئے ۔ ان مقدمات میں سب سے بڑے ملزمان پٹنہ کے خاندان کے لوگ اور ان کے مریدین و معتقدین تھے ، جنہیں کالے پانی بھیج دیا گیا[۱] ۔

غرض یہ کہ انگریزوں نے مسلمانانِ پاکستان و ہند کی تضعیف و تذلیل کو اپنی پالیسی کا سنگِ بنیاد بنا کر انہیں نہ صرف ذرائع معاش اور عزت کی زندگی بسر کرنے کے وسائل سے عاری کر دیا بلکہ ان کی ذہنی و فکری صلاحیتوں کو تعلیم سے محروم کر کے برباد کر دیا اور ان کی دینی و ثقافتی سرگرمیوں کو بھی کچل کر رکھ دیا اور جب بعضے ہجرت کر کے سرحد چلے گئے تو وہاں بھی انہیں چین سے نہ بیٹھنے دیا ۔ انگریز مسلمانوں کو قعرِ مذلّت میں گرا کر ہندوؤں کی ہر لحاظ سے سرپرستی کرتے رہے ، انہیں معاشی اور تعلیمی برتری دلا دی اور ساتھ ہی سابقہ محکومی کی یاد جگا کر مسلمانوں سے عداوت و نفرت کی آگ بھی ان کے سینوں میں ایسی بھڑکا دی جو کبھی نہ بجھی ۔ گویا مسلمانانِ پاکستان و ہند کو نہ تو انگریز حاکموں سے کوئی توقع رہ گئی تھی اور نہ اہلِ وطن ہندوؤں سے کہ وہ ان کی بقا کے لیے کچھ کریں گے ۔ ایسے حالات میں اگر عام مایوسی و بد دلی پھیل گئی تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں ۔

۱۸۷۰ء میں برطانوی حکومت کو اپنی پالیسی میں تبدیلی کا خیال اس وجہ سے آیا کہ ہندو لیڈروں نے انگریزوں پر تنقید شروع کر دی تھی ۔ ہندو مت اور ہندو سماج کے احیاء کی کوششیں تیز ہو گئی تھیں ۔ دوسری طرف نواب عبداللطیف اور مولوی کرامت علی جیسے مسلم لیڈر بنگال میں مسلمانوں کو انگریزی حکومت کی مخالفت سے باز رہ کر اور سیاست سے کنارہ کش ہو کر صرف اپنی سماجی ، تعلیمی اور دینی اصلاح کرنے کی تلقین کر رہے تھے ۔ غرض ۱۸۷۰ء میں وائسرائے لارڈ میئو نے ڈاکٹر ولیم ہنٹر سے کہا کہ وہ مسلمانوں کے بارے میں ایک مفصل رپورٹ تیار کریں[۲] اور یہ بھی بتائیں کہ آیا مسلمان مذہباً برطانوی حکومت کی مخالفت پر مجبور ہیں ۔ چنانچہ ڈاکٹر ہنٹر نے ۱۸۷۱ء میں

---

(۱) طفیل احمد ، مسلمانوں کا روشن مستقبل ۔ ص ۱۲۳ - ۱۲۴ ۔

(۲) ڈار ، بشیر احمد ، سر سید کے مذہبی افکار (انگریزی) ص ۴۷ ، مطبوعہ لاہور ۱۹۵۷ء ۔

'ہمارے ہندوستانی مسلمان' کے نام سے ایک مفصل جائزہ پیش کیا ۔ اس میں اگرچہ انہوں نے وہابیت اور بغاوت کو مترادف قرار دیا اور لکھا کہ "تمام مسلمان اپنے بغاوت سکھانے والے پیغمبر کی زہر آمیز نصیحتوں کو نہایت ذوق و شوق سے سنتے ہیں اور ایسے بہت تھوڑے ہیں جو اپنی تیزیٔ طبیعت سے انی شریعت کا کچھ اور مطلب ٹھہرا کر بغاوت کے بڑے فرض سے بچ جاتے ہیں . . . . ہندوستان کے مسلمان اب بھی ہندوستان میں گورنمنٹ انگریزی کے لیے موجبِ خطر ہیں جیسے کہ ایک مدت سے موجبِ خطر چلے آتے ہیں"[1] ۔ تاہم ساتھ ہی انہوں نے مسلمانوں کی زبوں حالی اور ان کی شکایات کی خاصی تفصیل دی اور برطانوی راج میں مسلمانوں کے ساتھ جو سلوک ہوا تھا اس پر روشنی ڈالی ۔ ڈاکٹر ہنٹر نے لکھا ۔ "اس حقیقت سے چشم پوشی بے سود ہے کہ مسلمان ہم پر کیسے کیسے شدید الزام عائد کرتے ہیں ۔ ایسے الزام جو شاید ہی کسی حکومت پر عائد کیے گئے ہوں ۔ وہ ہمیں اس بات کا ملزم ٹھہراتے ہیں کہ ہم نے ان پر ہر قسم کی باعزت زندگی کا دروازہ بند کر دیا ۔ وہ ہمیں اس بات کا ملزم ٹھہراتے ہیں کہ ہم نے ایک ایسا طریقۂ تعلیم رائج کر دیا ہے ، جس سے ان کی قوم بہرہ ور نہیں ہو سکتی اور جو ان کی ذلت و خواری کا سبب بن گیا ہے ۔ وہ ہمیں یہ بھی الزام دیتے ہیں کہ ہم نے مسلمان قاضیوں کی برطرفی سے ہزارہا خاندانوں کو مبتلائے آفات کر دیا . . . . ہمارا بڑا جرم ان کے نزدیک یہ ہے کہ ہم نے مسلمانوں کے مذہبی اوقاف میں بد دیانتی سے کام لیتے ہوئے ان کے سب سے بڑے تعلیمی سرمائے کا غلط استعمال کیا ۔ ان مخصوص الزامات کے علاوہ جن کے متعلق ان کو یقین ہے کہ باسانی ثابت کیے جا سکتے ہیں ، اور بھی بہت سی شکایات ہیں جو جذبات پر مبنی ہیں ۔ وہ علی الاعلان کہتے ہیں کہ ہم نے بنگال میں قدم رکھا تو مسلمانوں کے ملازمین کی حیثیت سے لیکن اپنی فتح و نصرت کے وقت ان کی مطلق پرواہ نہ کی اور نو دولت طبقے کی گستاخانہ ذہنیت کے ساتھ اپنے سابق آقاؤں کو پاؤں تلے روند ڈالا ۔ اس کے جواب میں یہ کہنا کہ یہ سب کچھ نتیجہ ہے ان کے اپنے انحطاط کا عذرِ گناہ بد تر از گناہ کے مصداق ہوگا ، کیونکہ ان کا انحطاط بھی تو ہماری ہی سیاست غفلت اور بے پرواہی سے مرتب ہوا ہے . . . . یہ وہ قوم ہے جسے برطانوی حکومت کے تحت تباہ و برباد کر دیا گیا"[2] ۔

ہنٹر کی تفصیلی رپورٹ پڑھ کر بقول میجر باسو "لارڈ میو نے محسوس کیا کہ تعلیم اور ملازمت سے علیحدگی کی وجہ سے مسلمان ناراض ہیں اور سرحدوں کو امداد بھیجتے ہیں

---

(۱) حالی ، الطاف حسین ، حیات جاوید ۔ ص ۲۳۱ ، مطبوعہ لاہور ۱۹۵۷ء ۔

(۲) ہنٹر ، ڈبلیو، ڈبلیو، ہمارے ہندوستانی مسلمان ، (مترجم) ڈاکٹر صادق حسین ۔ ص ۲۱۹ تا ۲۲۴ ۔ بحوالہ جذبی ، ص ۳۰ - ۳۱ ۔

جہاں سے ہندوستان کو خطرہ رہتا ہے''[۱] ۔ چنانچہ وائسرائے نے ۷ اگست ۱۸۷۱ء کو مختلف صوبجات کے پاس احکام بھیجے جن کا منشا یہ تھا کہ مسلمانوں کی تعلیم کی طرف توجہ کی جائے ، سرکاری سکولوں میں مسلمانوں کی قدیم زبانوں کی اور نیز دیسی زبانوں کی تعلیم جاری کی جائے اور مسلمان استاد مقرر کیے جائیں ۔ اردو ، انگریزی کے جدید اسکولوں کو مالی امداد دی جائے ، مسلمانوں کی دیسی زبان کی طرف زیادہ توجہ کی جائے ، یونیورسٹیوں میں عربی ، فارسی کی تعلیم کا اضافہ کیا جائے[۲] ۔

ڈاکٹر ہنٹر نے مسلمانوں کے مذہبی خیالات اور وہابیوں کے بارے میں جو کچھ لکھا تھا اس کی تردید سر سید نے اس تبصرے میں کر دی جو انھوں نے 'ہمارے ہندوستانی مسلمان' پر لکھا ۔ سر سید نے اس تبصرے میں ''بہت صاف اور روشن شہادتوں سے ڈاکٹر ہنٹر کی غلطیاں ظاہر کی ہیں اور وہابیوں کی مختصر تاریخ اول سے آخر تک اور وہابیت کے اصولِ مشرح بیان کیے ہیں اور صاف اقرار کیا ہے میں خود وہابی ہوں اور وہابی ہونا جرم نہیں ، بلکہ گورنمنٹ کی بد خواہی اور بغاوت جرم ہے . . . . انھوں نے جہاد کے مسئلے کی حقیقت اور جو غلط فہمیاں اس کی نسبت تھیں ان کو اچھی طرح ظاہر کیا ہے اور بتایا ہے کہ جو مسلمان انگریزی گورنمنٹ کی رعایا اور مستامن ہیں اور اپنے فرائضِ مذہبی بلا مزاحمت ادا کرتے ہیں وہ شریعتِ اسلام کی رو سے بمقابلے انگریزوں کے نہ جہاد کر سکتے ہیں نہ بغاوت اور نہ کسی قسم کا فساد''[۳] ۔ سر سید کے اس تبصرے نے مسلمانوں کے بارے میں انگریزوں کی بد گمانیوں کو دور کرنے میں خاصا حصہ لیا ۔[۴] یہ سب اپنی جگہ درست ہے مگر اس دور میں حکومتِ ہند نے جو سماجی تعلیمی اور اخلاقی اصلاحات نافذ کیں ، ان کا ذکر نہ کرنا نا انصافی ہی نہیں ، بلکہ تاریخی بد دیانتی ہوگی ۔ در اصل یہی اصلاحاتِ احیائے ملّی کا باعث بنیں اور بعد میں تحریکِ آزادی پر منتج ہوئیں ۔ انھی کی بدولت مولانا محمد علی جوہر ، ابوالکلام آزاد اور قائد اعظم ،حکیم محمد اجمل خان اور ڈاکٹر انصاری ، علامہ اقبال ، مولانا حسرت موہانی اور ظفر علی خان جیسے رہنما پیدا ہوئے اور انھی رہنماؤں نے مسلمانوں کے بیڑے کو پار لگایا ۔

۱۸۵۸ء میں الہ آباد اور دوسرے صدر مقامات کے جلسوں میں ملکہ وکٹوریہ کا یہ اعلان پڑھا گیا کہ ہر شخص کو مذہبی آزادی اور بنیاری حقوق ملیں گے اور انگریز حکومت کا مقصد اہلِ ہند کی خوش حالی اور بہبودی کی کوشش کرنا ہے ۔ اگرچہ یہ اعلان بہت دیر تک محض لفظی تھا اور اس میں معنے بہت آہستہ رفتار سے پڑنے شروع

---

(۱) میجر باسو ، ہندوستان تاج برطانیہ کے عہد میں (انگریزی) ص ۱۲۸ - ۱۲۹ -

(۲) محمود ، سید ، تاریخ التعلیم - ص ۱۴۹ - بحوالہ طفیل احمد ، ص ۱۸۰ -

(۳) حالی ، الطاف حسین ، حیات جاوید - ص ۶۸۳ -

(۴) یہاں سے مدبر عمومی کا ایزاد شروع ہوتا ہے -

ہوئے اور نئی پالیسی کی وجہ سے انگریزوں کے دلوں میں ملوکیت کا غرور بڑھ بھی گیا ، مگر ملکہ کے اعلان کا اثر یہ بھی ہوا کہ برِ صغیر کے باشندوں کے سامنے ایک سیاسی نصب العین قائم ہو گیا ۔ یاد رہے کہ ۱۸۳۳ء میں جو قانون منظور ہوا اس سے کمپنی کی تجارتی اجارہ داری کا خاتمہ کر کے اسے عملاً برطانوی حکومت کا ایک ماتحت عہدہ بنا دیا گیا تھا ۔ ۱۸۶۰ء میں 'قانون مجالسِ ہند' وضع کیا گیا جس میں اہلِ ہند کی انتظامیہ میں شرکت کی پالیسی کو مان لیا گیا ۔

انگریزی تعلیم اور سیاسی آزادی کے نئے حالات نے رفتہ رفتہ لوگوں کو بیدار کیا اور یہ احساس دلایا کہ وطن کی خدمت اعلیٰ درجے کی اخلاقی قدر سمجھی جانے لگی ۔ اور کانگریس کے قیام (۱۸۸۵ء) کے بعد اس میں بالتدریج ترقی ہوئی اور جب ۱۹۰۵ء میں تقسیمِ بنگال ہوئی تو مسلمانوں میں بھی سیاسی شعور نے ایک نئی کروٹ لی ۔ اور جب ہندوؤں کی طرف سے اس تقسیم کی مخالفت ہونی شروع ہوئی اور تشدد آمیز مظاہرے ہونے لگے تو مسلمانوں نے اپنی سیاسی تنظیم کے لیے مسلم لیگ کی بنا ڈالی (۱۹۰۶ء) اور اسی دو رخی تحریک یعنی ہندوؤں اور مسلمانوں کے مطالبات اور داد رسی کی کوششوں کا یہ نتیجہ ہوا کہ ۱۹۰۹ء میں منٹو مارلے اصلاحات نافذ ہو گئیں ۔ ان کی رو سے برِ صغیر کے دونوں فرقوں کے لیے مندرجہ ذیل حقوق تسلیم کر لیے گئے :

۱ ۔ تمام صوبوں میں مجالسِ آئین ساز اور صوبائی قانون ساز مجالس قائم کی جائیں ۔

۲ ۔ اقلیتیں مثلاً مسلمان ، سکھ اور زمیندار وغیرہ کے اپنے منتخب نمائندے ہوں گے ۔

۳ ۔ وائسرائے کی مجلسِ انتظامیہ کے ارکان کی تعداد چھ سے بڑھا کر سات کر دی جائے گی ۔

۴ ۔ بمبئی اور مدراس کے گورنر اور سیکرٹری اسٹیٹ کونسل کے لیے ہندوستان کے نمائندے مقرر کیے گئے ۔ یہ وعدہ کیا گیا کہ دس سال بعد پھر ان اصلاحات پر نظرثانی کی جائے گی ۔

اس اثنا میں پہلی جنگِ عظیم واقع ہوئی اور کانگریس اور مسلم لیگی مطالبات بڑھنے شروع ہو گئے ۔ چنانچہ ۱۹۱۹ء میں مان ٹیگو چمس فورڈ اصلاحات کا اعلان ہوا ۔ ان کی رو سے ذیل کے حقوق برِ صغیر کے لوگوں کو تفویض کیے گئے :

۱ ۔ مرکز میں دو قانون ساز مجلسیں ہوں گی ۔ ان میں سے ایک انگلستان میں کام کرے گی اور امراء اس کے ممبر ہوں گے اور دوسری قانون ساز اسمبلی کے نام سے سرکاری ہندوستان میں قائم کی جائے گی ۔

۲ ۔ قانون ساز اسمبلی کے صدر کا انتخاب وائسرائے کرے گا ۔

۳ - صوبائی قانون ساز مجلس کے ارکان کی تقرری انتخابات کے ذریعہ ہوگی -

۴ - اصلاحات کمیٹی ہر ہر دس سال کے بعد ایک وفد نظر رسانی کرے گا -

۵ - وائسرائے ، اور گورنر کی ایگزیکٹو کونسل میں دو دو ہندوستان کے ممبر ہوں گے - وغیرہ وغیرہ -

ان ساٹھ سالوں میں تین چار ایسے وائسرائے بھی آئے جنھوں نے پاکستان و ہند کے لیے حقیقتاً مفید کام کیے ان میں لارڈ میو ، لارڈ ڈفرن اور لارڈ کرزن خاص طور پر قابل ذکر ہیں -

لارڈ میو (۱۸۶۹ء - ۱۸۷۲ء) نے سب سے اہم کارنامہ یہ انجام دیا کہ ہر صوبہ کو اپنی ضروریات اور اخراجات کا ذمہ دار ٹھہرایا - مرکز سے پیسے لینے کی محتاجی کو دور کر دیا - جیل کے انتظام کو بہتر بنایا - شہزادوں اور امراء کے بچوں کے لیے علیحدہ چیف کالج لاہور ، راج کوٹ اور اجمیر میں کھولے - اسی کی حوصلہ افزائی سے سر سید نے ۱۸۷۵ء میں علی گڑھ میں ایم - اے - او کالج کی بنا ڈالی - محکمۂ زراعت میں نئے نئے آلات اور جدید طریقوں کو داخل کر کے زراعت کو ترقی دی -

لارڈ ڈفرن (۱۸۸۴ء - ۱۸۸۸ء) نے عوام کی بہبود میں بہت دلچسپی لی - فیکٹری ایکٹ نافذ کر کے اوقات کار میں کمی کی - نو سال سے کم عمر کے بچوں کو کارخانوں میں نوکری نہیں دی جاتی تھی - بیشتر بڑے بڑے شہروں میں لیڈی ڈفرن ہسپتال کھولے جس میں غریبوں کا علاج مفت کیا جاتا -

لارڈ کرزن (۱۸۹۹ء - ۱۹۰۵ء) نے دیگر سماجی بہبود کے کاموں کے علاوہ تعلیم کو عام کرنے اور فروغ دینے اور منظم بنانے میں جو کام کیا وہ قابل ذکر ہے - کلکتہ یونیورسٹی کا جائزہ لینے کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ یہ ادارہ ایک امتحان لینے کی مشین ہے تعلیم دینے کی جگہ نہیں اور نہ ہی کوئی اچھے اصول و ضوابط کی حامل ہے - چنانچہ ۱۹۰۴ء میں 'ہندوستان یونیورسٹی ایکٹ' کا نفاذ کیا گیا ، جس میں وائس چانسلر کی تقرری بھی کی گئی - مزید برآں بہت سے نئے کالج اور ہوسٹل کھولے گئے اور لڑکوں کی سہولتوں کے لیے بہت سی انتظامی کمیٹیاں بنائی گئیں - پولیس کا باقاعدہ محکمہ قائم کیا گیا اور محکمہ آثار قدیمہ کے قیام سے برصغیر کے آثار قدیمہ کی حفاظت کا انتظام ہی نہیں کیا گیا بلکہ ان کی شکست و ریخت کا سدِ باب کرنے کے ذرائع بھی اس محکمہ کا فرض قرار دیا گیا[1] -

---

(۱) ابزاد ختم ہوتا ہے ....مدیر عمومی

ان اصلاحات اور انتظامیہ سہولتوں کے باوجود سر سید نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ انگریزوں کے مکمل استیلا کے بعد ، جب کہ مسلمان اپنے تنزل کی انتہا پر پہنچ گئے تھے اور ہندو برطانوی حکمتِ عملی کے طفیل اقتصادی ، تعلیمی ، انتظامی اور عدالتی شعبوں میں مسلمانوں پر بالا دستی حاصل کر چکے تھے ، مسلمانوں کے لیے بقا کی واحد صورت یہ تھی کہ وہ انگریز حکمران سے تعاون کرکے ان کی حمایت حاصل کریں تاکہ اپنی حالت سدھار سکیں۔ سر سید پورے وثوق کے ساتھ برطانوی حکومت کے استحکام کو مسلمانوں کی بہبود کے لیے ضروری سمجھتے تھے اور انھوں نے بارہا اس امر کی صراحت کی کہ ''میں ہندوستان میں انگلش گورنمنٹ کا استحکام کچھ انگریزوں کی محبت اور ان کی ہوا خواہی کی نظر سے نہیں چاہتا بلکہ صرف اس لیے چاہتا ہوں کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی خیر اس کے استحکام میں سمجھتا ہوں''[۱]۔ سر سید کا انگریزی حکومت سے تعاون کا فیصلہ ان کی بزدلی یا ابن الوقتی کا ثبوت نہیں کہا جا سکتا بلکہ حقیقت پسندی اور موقع شناسی کا۔ ہندو اہلِ وطن کی مسلم دشمنی کا وہ مظاہرہ جس نے سر سید کو اس بات کا قائل کیا کہ اب مسلمان اور ہندو دونوں مل کر کسی کام میں دل سے شریک نہیں ہو سکیں گے ، ۱۸۶۷ء میں بنارس میں پیش آیا۔ حالی نے اس کی تفصیل دی ہے کہ ''۱۸۶۷ء میں بنارس کے بعض سر برآوردہ ہندوؤں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ جہاں تک ممکن ہو تمام سرکاری عدالتوں میں سے اردو زبان اور فارسی خط کے موقوف کرانے میں کوشش کی جائے اور بجائے اس کے بھاشا زبان جاری ہو جو دیو ناگری میں لکھی جائے۔ سر سید کہتے تھے کہ یہ پہلا موقع تھا جب مجھے یقین ہو گیا تھا کہ اب ہندو مسلمانوں کا بطور ایک قوم کے ساتھ چلنا اور دونوں کو ملا کر سب کے لیے ساتھ ساتھ کوشش کرنا محال ہے''[۲]۔ سر سید نے اسی سال اگست میں شمال مغربی علاقوں کے واسطے اردو ذریعۂ تعلیم کی ایک یونیورسٹی قائم کرنے کے لیے وائسرائے کو لکھا تھا اور ساتھ ہی پیشکش کی تھی کہ علی گڑھ کی سائنٹفک سوسائٹی انگریزی سے اردو میں کتابوں کے ترجمے کا انتظام کرے گی۔ حکومت ابھی اس تجویز پر غور کر رہی تھی کہ ہندوؤں کی طرف سے مطالبہ ہوا کہ اس نئی یونیورسٹی میں ہندو طلباء کے لیے ہندی ذریعۂ تعلیم ہونا چاہیے[۳]۔ اس جھگڑے کی وجہ سے ورنیکلر یونیورسٹی کا منصوبہ رو بعمل نہ آ سکا۔ ہندوؤں نے اردو کی مخالفت اور ہندی کی حمایت میں منظم طور پر کام کرنا شروع کر دیا اور بہار میں ہندی کے بھاری روپ کو اردو کی جگہ صوبائی زبان تسلیم کروا لیا۔ اردو کے خلاف ہندوؤں کی جد و جہد صرف ہندو ثقافت کے احیاء کی حیثیت نہیں رکھتی تھی ، بلکہ مسلم قوم کی وحدت و استحکام

---

(۱) حالی ، الطاف حسین ، حیات جاوید - ص ۶۸۳ -
(۲) حالی ، حیات جاوید - ص ۱۹۳ - ۱۹۴ ، مطبوعہ لاہور ۱۹۵۷ء -
(۳) ایضاً - ص ۱۹۱ -

پر کاری صرف تھی اور اس بات کو سرسید نے ۱۸۶۷ء ہی میں سمجھ لیا تھا ۔ حالی نے سرسید کی زبانی بیان کیا ہے کہ "ایک روز مسٹر شیکسپیر سے جو اس وقت بنارس میں کمشنر تھے ، میں مسلمانوں کی تعلیم کے باب میں کچھ گفتگو کر رہا تھا اور وہ متعجب ہو کر میری گفتگو سن رہے تھے ۔ آخر انھوں نے کہا کہ آج یہ پہلا موقع ہے کہ میں نے تم سے خاص مسلمانوں کی ترقی کا ذکر سنا ہے ۔ اس سے پہلے تم ہمیشہ عام ہندوستانیوں کی بھلائی کا خیال ظاہر کرتے تھے ۔ میں نے کہا کہ اب مجھ کو یقین ہو گیا ہے کہ دونوں قومیں کسی کام میں دل سے شریک نہ ہو سکیں گی ۔ ابھی تو بہت کم ہے آگے آگے اس سے زیادہ مخالفت اور عناد ان لوگوں کے سبب سے جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں بڑھتا نظر آتا ہے ، جو زندہ رہے گا وہ دیکھے گا ۔ انھوں نے کہا اگر آپ کی یہ پیشین گوئی صحیح ہوئی تو نہایت افسوس ہے ۔ میں نے کہا مجھے بھی نہایت افسوس ہے مگر اپنی پیشین گوئی پر مجھے پورا یقین ہے"[1] ۔ مولوی عبدالحق بھی سرسید سے متفق ہیں کہ ہندو مسلم تنازع سیاسی نہیں اس کی بنیاد ہندوؤں نے اردو کو مٹانے کی کوشش سے ڈالی[2] ۔

جس تحریک کو 'علی گڑھ تحریک'، یا 'تحریکِ سرسید' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے وہ اگرچہ سرسید کے انگلستان سے واپس آنے کے بعد ۱۸۷۰ء میں شروع ہوئی ، لیکن اس کی ہلکی سی داغ بیل اس وقت پڑ چکی تھی جب وہ غازی پور میں تعینات تھے ۔ علومِ جدیدہ سے واقفیت کو سرسید اہلِ ہند کے لیے اہم ترین ضرورت سمجھتے تھے ۔ چنانچہ ۱۸۶۳ء ہی میں انھوں نے غازی پور میں ایک انگریزی اسکول قائم کیا اور سائنٹفک سوسائٹی کی بنیاد ڈالی[3] ۔ اور پھر ۱۸۶۶ء میں ایک اخبار جاری کیا جس میں ایک کالم انگریزی اور دوسرا اردو میں ہوتا تھا ۔ اس میں سائنٹفک سوسائٹی کے جلسوں کی علمی تحریریں چھاپی جاتی تھیں اور تعلیمی ، سیاسی اور تمدنی موضوعات پر بھی اظہارِ خیال کیا جاتا تھا[4] ۔ اس زمانے میں سرسید بلا امتیازِ مذہب و ملت ہندوستانیوں کی اصلاحِ معاشرت اور عمومی ترویجِ تعلیم میں کوشاں تھے ، لیکن ہندوؤں کی مخلصانہ رفاقت میسّر نہ ہونے اور اردو کی مخالفت کی تحریک شروع ہو جانے کے بعد وہ ہندو مسلم اتحاد سے مایوس ہو کر صرف مسلمانوں کی فکری و معاشرتی اصلاح اور تعلیم و تربیت کی طرف متوجہ ہو گئے ۔ انھیں پورا یقین تھا کہ جب تک مسلمانوں میں جدید تعلیم نہ پھیلے گی ان کا پنپنا ممکن نہیں ۔ جدید تعلیم ہی کے ذریعے مسلمان پھر اپنی حیثیت مضبوط بنا سکتے ہیں اور اپنے معاشرتی اور مذہبی تصورات میں تبدیلی کر کے زمانے کا ساتھ دے سکتے ہیں ۔ چنانچہ مغربی تعلیم کے اداروں کا بغور

---

(۱) حالی ، حیات جاوید ۔ ص ۱۹۴ ، مطبوعہ لاہور ۱۹۵۷ء

(۲) عبدالحق ، سرسید احمد خان ۔ ص ۶۹-۷۰ ۔

(۳) سالک ، عبدالمجید ، مسلم ثقافت ہندوستان میں ۔ ص ۶۳۰ ، مطبوعہ لاہور ۔

(۴) ہاشمی فرید آبادی ، تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت ۔ ص ۳۷۱ ۔

مطالعہ کرنے کے لیے سرسید اپنے بیٹوں کے ہمراہ اپریل ۱۸۶۹ء میں انگلستان گئے اور ڈیڑھ سال وہاں رہ کر اکتوبر ۱۸۷۰ء میں واپس ہوئے[1] ۔ 'رسالہ تہذیب الاخلاق' جاری کرنے کا منصوبہ انھوں نے لندن ہی میں بنا لیا تھا اور وطن واپس پہنچ کر اس منصوبے پر عمل شروع کر دیا ۔ ساتھ ہی مجلس خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان کی بھی بنیاد ڈالی ، جس نے سرسید کی راہنمائی میں ایک دارالعلوم کے قیام اور طریقہ تعلیم و تربیت کی ایک سکیم منظور کی (۱۸۷۳ء) اور سرمایہ فراہم کرنے کے لیے ایک کمیٹی بنائی ۔ کوئی دو سال کی جد وجہد میں معقول سرمایہ فراہم ہو گیا ۔ اس عرصے میں کچھ اصولی اور کچھ ذاتی وجوہ سے انگریزی درسگاہ بنانے کی مذمت اور مخالفت بھی میدان میں آ گئی تھی ۔ ان کے جھوٹے الزام اور مسلمانوں کے مختلف اوہام کا سدِّ باب کرنے کی غرض سے طے پایا کہ ابتدائی مدرسہ کھول دیا جائے تاکہ اس کی تعلیم اور طریقِ تعلیم کو لوگ دیکھ لیں کہ اس میں کوئی بات شریعتِ اسلامی کے خلاف نہیں ہے ۔ چنانچہ مئی ۱۸۷۵ء میں نئے مدرسے کا باقاعدہ افتتاح علی گڑھ میں کر دیا گیا[2] اور جنوری ۱۸۷۷ء میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کا افتتاح بھی وائسرائے کے ہاتھوں ہو گیا[3] ۔ اس مدرسے اور کالج کا نصاب تو سرکاری سررشتہ تعلیم اور یونیورسٹی کے تابع تھا ، مگر ابتدا سے مذہبی تعلیم کا مخصوص نظام و نصاب تھا ، نماز کی پابندی لازمی تھی اور درجے کی ترقی کے لیے امتحانِ دینیات میں کامیابی ضروری تھی ۔ یہ تعلیمی درسگاہ اقامتی نوعیت کی تھی اور عام نظمِ اوسط کیمبرج اور آکسفورڈ یونیورسٹیوں کے اصول پر قائم کیا گیا تھا ۔ جسمانی تربیت کا معقول انتظام کیا گیا تھا ۔

سرسید نے اپنے جس تعلیمی نظریے کا عملی تجربہ علی گڑھ میں کیا تھا اس کی وضاحت ایک تقریر میں یوں کی تھی "سب سے اول ہمارا مقصد ہے کہ مسلمانوں میں نیشنیلیٹی یعنی قومیت اور قومی ہمدردی جو اول سیڑھی قومی ترقی کی ہے قائم رہے ۔ اس کے لیے ہم کو کیا کرنا ہے؟ سب سے مقدم یہ کرنا ہے کہ وہ مسلمان رہیں اور مذہبِ اسلام کی حقیقت ان کے دل میں قائم رہے ۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہم انگریزی تعلیم بھی دیں اور عقائدِ مذہبی سے بھی روشناس کرائیں اور جہاں تک ممکن ہو ان کو فرائضِ مذہبی کا پابند رکھیں ۔ تاریخِ اسلام اور مذہبِ اسلام کے شیوع سے ان کو آگاہ کریں ۔ اس کے بعد ان کو اخوّتِ اسلامی کا سبق دیں ، بتلا دیں کہ اخوّتِ اسلامی کیا چیز ہے جو نسبی اخوّت سے بھی زیادہ مستحکم ہے"[4] ۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ سرسید علی گڑھ میں

---

(۱) سالک ، عبدالمجید، مسلم ثقافت ہندوستان میں ۔ ص ۶۳۱ ۔

(۲) ہاشمی فرید آبادی ، تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت ۔ ص ۲۷۹ ۔

(۳) ایضاً ۔ ص ۲۸۰ ۔

(۴) امین زبیری ، تذکرۂ سر سید ۔ ص ۵۷ ۔ ۵۸ ، مطبوعہ لاہور (تاریخ درج نہیں) ۔

اسلام اور سائنس کا ملاپ کرنا چاہتے تھے تاکہ سائنس مذہب پر غالب نہ آئے۔ وہ نئی تعلیم سے مسلمانوں میں بیداری اور نئی روشنی پھیلانا چاہتے تھے تاکہ ان کا شمار بھی مہذب دنیا میں ہو۔

باوجودیکہ سرسید کا مطمحِ نظر بلند بھی تھا اور حقیقت پسندانہ بھی، تاہم علی گڑھ کی درسگاہ کی مخالفت بھی بہت ہوئی۔ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ قدیم خیال کے راسخ العقیدہ مسلمان سرسید کے غیر تقلیدی مذہبی خیالات سے بدظن ہو گئے تھے اور نہیں چاہتے تھے کہ مسلمان نوجوانوں کی تعلیم کا کام ایسے شخص کے سپرد کیا جائے۔ سرسید کے بارے میں بدگمانیوں کا آغاز ان کے بنارس میں ایک انگریز کے یہاں کھانا کھانے ہی سے ہو گیا تھا، پھر 'تبیین الکلام' کی اشاعت سے اس میں شدت پیدا ہو گئی اور سائنٹفک سوسائٹی سے جو الفنسٹن کی 'تاریخ ہند' کا ترجمہ شائع ہوا تو اس میں 'پیغمبرِ باطل' کے الفاظ جو ترجمے میں آ گئے تھے، اس کی بنا پر سرسید کو کافر و مرتد قرار دے دیا گیا تھا۔ ان کے 'رسالۂ طعام اہلِ کتاب' کو بھی ان کی تکفیر کا بہانہ بنایا گیا اور پھر لندن سے واپسی پر 'رسالۂ تہذیب الاخلاق' میں سرسید نے مذہب، اخلاق، معاشرت وغیرہ پر ایسے مضامین لکھے جن سے قدیم توہمات و تعصبات بلکہ رسم و رواج پر ضرب پڑتی تھی اور جنھیں عام مسلمان تعلیمِ اسلامی کے خلاف سمجھتے تھے۔ ان مضامین نے بھی سرسید کے بارے میں راسخ العقیدہ لوگوں کو بدظن کیا۔ غرض علی گڑھ کی درسگاہ کی مخالفت زیادہ تر اس وجہ سے ہوئی کہ اس کی بنا میں سرسید کا بڑا عمل دخل تھا، اور اکثر علماء اور عوام یہ کہتے تھے کہ جس شخص کے عقائد سرسید جیسے ہوں وہ مسلمان نہیں، اور جو درسگاہ ایسا شخص قائم کرے اس کی اعانت جائز نہیں۔

مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے سب سے بڑے مخالف دو بزرگ تھے اور دونوں معزز سرکاری ملازم، یعنی مولوی امداد العلی ڈپٹی کمشنر اور مولوی علی بخش سب جج۔ حالی نے لکھا ہے کہ "ہندوستان میں جس قدر مخالفتیں اطراف و جوانب سے ہوئیں ان کا منبع انھی دو صاحبوں کی تحریریں تھیں"۔ اور ان کی مخالفت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ "بعض جلیل القدر انگریز مدرسۃ العلوم کے سخت مخالف تھے اور ان میں سے بعض کے ساتھ ان دونوں صاحبوں کا خاص تعلق تھا، اس لیے سرسید کی مخالفت کو انھوں نے ایک ذریعہ ان کی خوشنودی اور اپنی سرخروئی کا سمجھا"[1]۔ پھر بہت سے دیسی اخباروں نے اپنے پرچے کی اشاعت بڑھانے کے لیے سرسید اور ان کے حامیوں پر اعتراضات کی بوچھاڑ شروع کر دی

(۱) حالی، حیاتِ جاوید۔ ص ۶۲۲ - ۶۲۳۔

اور سر سید کے خیالات اور ان کی تحریرات کے برخلاف نہ صرف اخباروں میں مقالے بلکہ مستقل کتابیں اور رسالے لکھے جانے لگے ۔ 'تہذیب الاخلاق' کے توڑ پر کانپور سے 'نور الاخلاق' اور 'نور الانوار' ، مراد آباد سے 'لوحِ محفوظ' ، آگرے سے 'تیرھویں صدی' اور شمال مغربی اضلاع سے 'امداد الآفاق' ، 'شہاب ثاقب' اور 'تائیدِ اسلام' وغیرہ نکلے ۔ 'رفیقِ ہند' لاہور کے ایڈیٹر محرم علی چشتی شروع میں تو سر سید کے حامی تھے پھر سخت مخالفت پر اتر آئے ۔ 'اودھ پنچ' تو خیر علی گڑھ تحریک کا مخالف تھا ہی ۔ ان لوگوں کے علاوہ سر سید کے مخالفوں میں علماء کا وہ حلقہ بھی پیش پیش تھا جو اپنی حریت پسندی اور انگریز دشمنی کے جذبات میں پختہ تھا ۔ یہ طبقہ سر سید کا انگریزوں سے تعاون پسند نہیں کرتا تھا ، اس لیے ان کا مخالف تھا ۔ سید جمال الدین افغانی اسی طبقے سے تعلق رکھتے تھے ۔

مختلف طبقوں کی ، مختلف اسباب کی بنا پر مخالفتوں کے باوجود سر سید اپنے مشن میں ہمہ تن مصروف رہے ۔ ان کا خیال تھا کہ اگرچہ حکومت کی پالیسی مسلمانوں کی تعلیم اور ملازمت کے بارے میں ۱۸۷۱ء سے کچھ بدل رہی تھی تاہم اس سے کوئی خاص فائدہ مسلمانوں کو ہونے کی امید نہ تھی ۔ اس پالیسی کے پیچھے یہ خیال کار فرما تھا "کہ مسلمانوں کے لیے جدید نظام تعلم کا نفاذ ان مقامات میں کرنے سے جہاں مذہب کا زور تھا یہ زور ٹوٹ جائے گا اور بقول ہنٹر ایک ہی سال میں عام پسند رنگ بدل جائے گا"[۲] سرکاری درسگاہوں میں شرحِ ملّا کی تعلیم کے بجائے انگریزی اور فارسی لٹریچر جاری کرنے کی تجویز تھی ، حتیٰ کہ کلکتہ مدرسے میں بھی جو ایک اسلامی درسگاہ تھی انگریز پرنسپل مقرر کر کے اسی پالیسی کو نافذ کرنے کا ارادہ تھا[۲]۔ سر سید جانتے تھے کہ سرکاری مدارس اور ان کا طریقۂ تعلیم مسلمانوں کی ضروریات کے مطابق نہیں ہے اور اگرچہ حکومت مسلمانوں کے لیے اپنے طریقۂ تعلیم میں کچھ تبدیلی پیدا کر دے تو بھی ان کی ضرورتیں رفع نہیں ہو سکتیں ، اس لیے ضروری ہے کہ مسلمان اپنی تعلیم کا خود انتظام کریں ۔ مدرسۃ العلوم علی گڑھ کی بنیاد اسی جذبے کے تحت رکھی گئی تھی اور سر سید کی آرزو تھی کہ مسلمانوں کی آزاد یونیورسٹی قائم کی جائے ، لیکن حکومت یہاں تک ساتھ دینے پر آمادہ نہ تھی اس لیے انہیں کالج ہی پر اکتفا کرنا پڑا ۔ مغربی تعلیم سے عام مسلمانوں کو اس زمانے میں جو بدظنی اور نفرت تھی اس تعصب کو توڑنا اور مذہبی بنیادوں پر مخالفتوں کا حوصلے اور استقلال کے ساتھ سامنا کرنا ۔ یہ دونوں سخت مراحل سر سید نے اپنے خلوص اور ثابت قدمی سے طے کیے اور علی گڑھ بہت جلد نہ صرف ایک درسگاہ بن گیا ، جہاں کتابی اور علمی درس دیا جاتا تھا بلکہ ایک تربیت گاہ بھی بن گیا ، جہاں انسان گری اور

(۱) طفیل احمد ، مسلمانوں کا روشن مستقبل - ص ۱۸۳ -
(۲) طفیل احمد ، مسلمانوں کا روشن مستقبل - ص ۱۸۴ - ۱۸۵ -

سیرت سازی کا سبق بھی ملتا تھا ۔ مدرسۃ العلوم نے نہ صرف مسلمانوں میں تعلیم کا شوق پیدا کیا بلکہ یہ روشن خیالی اور قومیت کا سر چشمہ اور مسلمانان ہند کی علمی ، سیاسی ، تہذیبی ، معاشرتی غرض ہر قسم کی تحریکوں کا مرکز بن گیا ۔ اس کی بدولت مسلمانوں کا وقار نہ صرف اپنائے وطن میں بلکہ حکام فرنگ کے ہاں بھی بڑھ گیا ۔ بقول حالی "اگر کوئی چیز مسلمانوں کو پولیٹکل بے وقعتی سے نکالنے والی اور گورنمنٹ میں ان کا اعتبار زیادہ کرنے والی اور گورنمنٹ کو ہندوستان کی چھ کروڑ رعایا کی طرف سے مطمئن کرنے والی ہو سکتی ہے ، تو وہ یہی محمڈن کالج ہو سکتا ہے"[1]۔

١٨٦١ء میں انڈین کونسلز ایکٹ کے تحت مرکز اور صوبوں میں قانون ساز کونسلوں کا قیام عمل میں آیا[2] جس کی ضرورت اور اہمیت سر سید نے ١٨٥٨ء ہی میں رسالہ "اسباب بغاوت ہند" ہی میں جتا دی تھی ۔ پھر ١٨٦٦ء میں سر سید ہی کی کوششوں سے پہلی سیاسی انجمن "برٹش انڈین ایسوسی ایشن" کا قیام عمل میں آیا ، جس کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستانی اپنے حقوق کی خواہش اور اپنے درد دل اور اپنی شکایتوں کے اظہار کے لیے براہ راست برطانوی پارلیمنٹ اور حکومت ہند سے تعلق پیدا کریں ۔ اسی کی تقلید میں اور بہت سی انجمنیں ملک کے مختلف حصوں میں قائم ہو گئیں ۔ مثلاً "بنگالی انڈین ایسوسی ایشن" ، "بمبئی ایسوسی ایشن" ، "مدراس نیٹیو ایسوسی ایشن" ، "اپر کلاس ہندو ایسوسی ایشن" وغیرہ ۔ ان سب میں ہندو غالب تھے ، اور سب کا مقصد ہندوؤں کے مفاد کی حفاظت و ترقی تھا ۔ ان کے علاوہ اور تحریکیں مثلاً برہمو سماج ، آریا سماج ، پرارتھنا سماج ، راما کرشنا مشن وغیرہ شروع ہو گئی تھیں جن کے مخاطب بھی ہندو ہی تھے ۔ ان تمام سیاسی ، سماجی اور مذہبی انجمنوں اور تحریکوں نے ہندوؤں میں مسلمانوں کے خلاف جذبات تیز تر کر دیے اور محرم ، دسہرا ، بقر عید وغیرہ تہواروں پر ہندو مسلم فسادات ہونے لگے ۔ صوبہ متحدہ کے مشرقی اضلاع اور بہار میں گاؤ کشی کے خلاف مہم میں دو مرتبہ خون ریز لڑائی ہو گئی[3]۔ "اس روز افزوں تفرقے کو دیکھ کر سر سید کو ہندوستان میں نیابتی حکومت کے اصول کی مخالفت کرنی پڑی ۔ غدر میں کیا ہوا ؟ ہندوؤں نے شروع کیا ، مسلمان دل جلے تھے وہ بیچ میں کود پڑے ۔ ہندو تو گنگا نہا کر جیسے تھے ویسے ہی ہو گئے مگر مسلمان اور مسلمانوں کے خاندان تباہ و برباد ہو گئے ۔ یہی نتیجہ مسلمانوں کے پولیٹکل ایجی ٹیشن میں شریک ہونے سے حاصل ہوگا[4]"۔

---

(١) حالی ، حیات جاوید ۔ ص ٦٧٥ ۔

(٢) کروور و سیٹھی ، جدید تاریخ ہند کے مطالعے (انگریزی) ۔ ص ٣٥٣ ۔ ٣٥٤ ۔

(٣) ہاشمی فرید آبادی ، تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت ۔ ص ٣٩٣ ۔

(٤) امین زبیری ، تذکرۂ سید ۔ ص ١٧٧ ۔ ١٧٨ ، مطبوعہ لاہور ۔

الدین نیشنل کانگریس میں جو لوگ شریک نہیں تھے ان کی رائیں اور خیالات برطانوی حکومت تک پہنچانے کے لیے سر سید کی حمایت سے 'انجمن محبّانِ وطن' یعنی 'پیٹریاٹک ایسوسی ایشن' قائم ہوئی ۔ کانگرسی راہنما بال گنگا دھر تلک کی مسلم دشمن سرگرمیوں کے ردِّ عمل کے طور پر اور ہندوؤں کے مذہبی و نسلی تعصّبات اور مسلم آزاری کے جذبات کی شدت سے متاثر ہو کر 'انجمن دفاعِ مسلمین' یعنی 'محمڈن ڈیفنس ایسوسی ایشن' قائم ہوئی جس کے مقاصد میں معقول طریقے سے اور وفاداری کے ساتھ مسلمانوں کی بہبودی اور خیر خواہی کی کوشش کرنا ، اپنے حقوق کو حکومت کے سامنے پیش کرنا اور عام نقصان رساں ایجی ٹیشن کو روکنا شامل تھا ، نہ یہ کہ عام پسند ایجی ٹیشن کو جو ہندوستانی ضروریات پر معقولیت کے ساتھ ہو ۔ سر سید نے اس طرح اپنی تعلیمی تحریک اور سیاسی راہنمائی سے بکھرے ہوئے مسلمانوں کو ایک لڑی میں پرو دیا ۔ بہت سے لوگ جو ان کی مذہبی آزادہ روی سے ناراض تھے سیاست میں ان کے ہمنوا ہو گئے ۔ کیونکہ یہ عام طور پر محسوس کر لیا گیا تھا کہ ہندو اکثریت کے اغراض و مقاصد مسلمانوں کے مفاد کے منافی ہیں اور کانگریس کے مطالبات سب ایسے ہیں جن سے عام طور پر ہندوؤں کو فائدہ ہوتا ہے اور مسلمانوں کو نقصان ۔

سر سید کے انتقال کے دو سال بعد ۱۹۰۰ء میں ہندوؤں کے اصرار پر صوبجات متحدہ کی سرکاری تعلیمی ، قانونی اور تجارتی زبان ہندی اور رسم الخط ناگری قرار دے دیا گیا[1] جس سے مسلمانوں کو نہ صرف جذباتی دھکہ لگا ، بلکہ ان کے اقتصادی اور ثقافتی مفادات بھی متاثر ہوئے ۔ مسلمانوں نے احتجاج کیا مگر بے سود ۔ چنانچہ ۱۹۰۱ء میں پھر مسلمانوں نے ایک انجمن علی گڑھ میں قائم کی جس کا نام 'سیاسی و معاشرتی ادارۂ مسلمانان' رکھا اور ایک انجمن لکھنؤ میں 'محمڈن پولیٹیکل آرگنائزیشن' کے نام سے قائم کی ۔ اس زمانے میں لارڈ کرزن وائسرائے تھے جنھوں نے ایک تو بنگالی ہندوؤں کی بڑھتی ہوئی قوت کو توڑنے کے لیے ، دوسرے بنگال کے انتظامی بار کو ہلکا کرنے کے لیے ۱۹۰۵ء میں بنگال کو (جس میں اس وقت بہار اور اڑیسہ بھی شامل تھے) ۔ دو حصوں میں تقسیم کر دیا[2] ۔ مشرقی بنگال میں (جس میں آسام بھی شامل تھا) مسلمانوں کی اکثریت تھی اس لیے اس کا علیحدہ صوبہ بن جانا ہندوؤں کو سخت ناگوار ہوا اور انہوں نے اس کے خلاف ایجی ٹیشن شروع کیا ۔ نہ صرف احتجاجاً ولایتی سامان کا بائیکاٹ کر دیا بلکہ ہندو تشدد آمیز کارروائیوں پر اتر آئے ۔ نیشنل کانگریس نے اس ایجی ٹیشن کی حمایت کی ۔ مخالفت کا غوغا بنگالے سے اٹھ کر دوآب و پنجاب تک اور جنوب میں مہاراشٹر تک گونجنے لگا ۔ اسی زمانے میں

---

(۱) تاریخ تحریک آزادی جلد سوم ، حصۂ دوم ۔ ص ۲۶۳ ، مطبوعہ کراچی ۱۹۶۳ء ۔
(۲) طفیل احمد ، مسلمانوں کا روشن مستقبل ۔ ص ۲۸۵ تا ۳۴۸ ۔

برطانوی حکومت ہندوستانیوں کو کونسلوں میں مزید حقوق دینے پر غور کر رہی تھی۔ مسلمانوں نے ضروری سمجھا کہ اپنے تحفظ کے لیے کوئی اقدام کیا جائے۔ چنانچہ ایک عرضداشت اکتوبر ۱۹۰۶ء میں وائسرائے کی خدمت میں پیش کی گئی جس میں اہم مطالبات یہ تھے کہ شہری اور ملکی قانون ساز مجالس میں مسلمان ارکان کا انتخاب مسلمانوں کی رائے سے ہو اور ان کے لیے جداگانہ حلقہ انتخاب بنائے جائیں[1]۔ نیز یہ کہ جن انتخابی جماعتوں اور سرکاری ملازمتوں سے مسلمان خارج ہیں ان میں انہیں واجبی حصہ دیا جائے۔ انگریز حکام نے مسلمانوں کے مطالبات جو کہ ہندو تعصبات اور مسلم مسلّمہ خصوصیات کا نتیجہ تھے، تسلیم کر لیے۔

اس کے بعد دسمبر ۱۹۰۶ء میں مسلمان راہنماؤں کا ایک بڑا اجتماع ڈھاکے میں ہوا اور کل ہند مسلم لیگ کی تشکیل عمل میں آئی[2]۔ اس کے مقاصد میں مسلمانوں کے دل میں برطانوی حکومت کی نسبت جو غلط فہمی پیدا ہوئی اسے دور کر کے وفادارانہ خیالات کو ترقی دینے کے علاوہ یہ تھا کہ مسلمانانِ ہند کے سیاسی حقوق و مفادات کی نگہداشت کی جائے اور ان کی خواہشات اور ضروریات کو حکومت کے آگے پیش کیا جائے۔ ساتھ ہی لیگ کے دوسرے مقاصد کو نقصان پہنچائے بغیر مسلمانانِ ہند میں ایسے خیالات پیدا نہ ہونے دیے جائیں جو دوسرے فرقوں کی نسبت معاندانہ ہوں۔ قیام کے پہلے پانچ سالوں میں مسلم لیگ کو نہ تو برطانوی حکومت کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا اور نہ ہی لیگ نے حکومت کی مخالفت میں کچھ کیا۔ نئی سیاسی مجالس یعنی منٹو مارلے اصلاحات (۱۹۰۹ء) میں حکومت نے جداگانہ انتخابات کا اصول عملاً نافذ کر دیا تھا جس سے مسلمان مطمئن تھے۔ تقسیمِ بنگال اگرچہ ان کے مطالبے پر نہیں ہوئی تھی بلکہ حکومت نے از خود کی تھی، تاہم اس سے بھی مسلمان خوش تھے۔ لیکن تقسیمِ بنگال کے خلاف ہندوؤں کا ایجی ٹیشن برابر جاری تھا۔ وزیرِ ہند نے اگرچہ تقسیمِ بنگال کے فیصلے کو ناقابلِ تبدیل قرار دیا تھا، لیکن حکومت نے اچانک دسمبر ۱۹۱۱ء میں تقسیم کی تنسیخ کر کے پھر بنگال کا ایک صوبہ بنا دیا۔ یہ اعلان حکومت کی وعدہ خلافی، بے اعتباری اور کمزوری کا اشتہار تھا۔ اس سے مسلمانوں کو بہت بڑا صدمہ ہوا مگر اس نے انہیں چونکا بھی دیا۔

تقسیمِ بنگال کی منسوخی کے بعد کچھ ایسے واقعات پیش آئے جن کی وجہ سے مسلمانوں کا قدم روز بروز سیاست کی طرف بڑھتا گیا اور وہ انگریزی حکومت سے بد دل ہوتے چلے گئے۔ اب تک کی وہ پالیسی کہ حکومتِ وقت کے ساتھ تعاون کر کے اور اس کی خوشنودی و

---

(۱) ہاشمی فرید آبادی، تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت - ص ۵۲۶ -
(۲) ایضاً، ص ۵۲۲ -

حمایت حاصل کر کے اپنی حالت بہتر بنائی جائے ، اب انہیں بدلنی پڑی اور اور اپنی ترقی و بہبود اور اپنے حقوق کے حصول کے لیے صرف اپنی ہی کوششوں پر بھروسہ کرنے کی حکمتِ عملی اختیار کرنی پڑی ۔ چنانچہ وقار الملک نے بھی یہی بات کہی ہے ۔

ابھی مسلمانانِ ہند نے تقسیمِ بنگال کی تنسیخ کا صدمہ اٹھایا ہی تھا کہ انہیں اور کئی جذباتی صدمے پے در پے پہنچے ۔ روس نے مشہدِ مقدس میں امام رضا کے مزارِ مبارک پر گولہ باری کی ، طرابلس پر اطالیہ نے یکایک چھاپہ مارا ، بلقانی ریاستوں نے مل کر ترکی پر حملہ کر دیا اور ان سب مسلم دشمن کارروائیوں میں اگرچہ انگریزوں کی سازش کی تفصیلات معلوم نہ تھیں ، مگر ان کی روش کسی سے چھپی ہوئی نہ تھی ۔ دوسرے مسلم ممالک میں یہ سب کچھ ہو رہا تھا کہ ادھر ۱۹۱۳ء میں کانپور میں مسجد مچھلی بازار کا بغلی دالان سڑک چوڑی کرنے کے لیے حکماً توڑ دیا گیا ہے ۔ مسلمانوں کے احتجاج کی کچھ پرواہ نہ کی گئی اور انہوں نے اکٹھا ہو کر جب دوبارہ بنانے کی کوشش کی تو انگریز حکام کے حکم سے گولیوں کی باڑ ماری گئی ۔ سیکڑوں زخمی اور سیکڑوں شہید ہوئے ۔ کئی قید کیے گئے[1] ۔ ہندوستانی مسلمان پہلے تو اداس اور بیزار تھے مگر اب بیدار ہو چکے تھے ۔ چنانچہ ان کے دل پر کانپور کے واقعے سے بڑی چوٹ لگی ۔ پنجاب میں مولانا ظفر علی خان کا اخبار 'زمیندار' جو ۱۹۱۰ء میں جاری ہو چکا تھا ، اور کلکتے میں مولانا ابوالکلام آزاد کا 'ہفت روزہ الہلال' اور مولانا محمد علی کا 'کامریڈ' ۱۹۱۱ء میں چھپ رہا تھا ، ان سب اخبارات میں مسلمانوں کے جذبات و احساسات کا بھرپور اظہار ہونے لگا ۔ مسلم لیگ نے ان حالات میں اپنے مقاصد میں تبدیلی ضروری سمجھی اور ہندوستان کے مسلمانوں کے سیاسی اور دیگر حقوق کی حفاظت و ترقی کے علاوہ تاجِ برطانیہ کے تحت ہندوستان کے مناسبِ حال حکومت خود اختیاری حاصل کرنا بھی اپنا مطمحِ نظر قرار دیا[2] اور یہ طے کیا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو مل کر یہ مقصد حاصل کرنا چاہیے ، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ جداگانہ انتخابات کا سلسلہ ختم ہو جائے ۔

ادھر انیسویں صدی کے نصف آخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں مسلمانانِ ہند کی حالت سدھارنے اور انہیں ان کے جائز حقوق دلانے کی کوششیں ہو رہی تھیں ادھر دوسرے اسلامی ممالک میں سید جمال الدین افغانی کی مساعی سے فرنگی ملوکیت سے نجات پانے اور نسل ، قوم اور وطن کے محدود تصورات سے بالا ہو کر اسلام کے ملّی تصور کو اپنانے اور تمام مسلم ممالک کے باہمی اتحاد سے ایک مضبوط اسلامی بلاک بنانے کی تحریک شروع

---

(۱) ہاشمی فرید آبادی ، تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت ۔ ص ۵۳۳ ۔

(۲) اردو انسائیکلوپیڈیا ۔ ص ۵۴۶ ۔ ۵۴۷ ، مطبوعہ لاہور ۱۹۶۲ء ۔

ہو گئی تھی ۔ سید جمال الدین افغانی اسد آباد (کابل) میں ۱۸۳۸ء میں پیدا ہوئے، ۱۸ برس کی عمر تک تعلیم حاصل کرکے حج کو گئے، پھر امیر دوست محمد خان کے ہاں ملازم رہے اور ان کے انتقال کے بعد جب افغانستان میں خانہ جنگی شروع ہو گئی تو وہ ہندوستان اور قاہرہ ہوتے ہوئے قسطنطنیہ چلے گئے ۔ وہاں سے پھر قاہرہ آئے ۔ ان کا سیاسی اور علمی شہرہ اسی وقت سے شروع ہوا ۔ وہ بیک وقت فلسفی، ادیب، خطیب، اخبار نویس اور عالمِ علومِ اسلامی تھے ۔ دنیائے اسلام میں جہاں کہیں وہ گئے ان کی زبردست شخصیت نے وہاں سب کو متاثر کیا ۔ افغانستان، ہندوستان، ایران، مصر، ترکی غرض ہر جگہ انہوں نے اپنے خیالات کے گہرے نقوش چھوڑے اور انہیں بڑی بڑی یورپی سلطنتوں کی زیادتیوں کے فوری خطرے کے خلاف آپس میں عاجلانہ اتحاد کی دعوت دی ۔ ان کی اس تحریک کو 'اتحاد بین المسلمین' یا 'تحریکِ اتحادِ اسلامی' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے ۔ انگریزوں نے جمال الدین افغانی کو اپنے اقتدار کے لیے خطرناک تصور کرکے انہیں ہندوستان میں نظر بند کر دیا ۔ وہاں سے نکلنے کے بعد کچھ عرصے کے لیے وہ امریکہ اور انگلستان گئے اور پھر پیرس سے ۱۸۸۴ء میں انہوں نے اپنا مشہور اخبار 'العروۃ الوثقی' نکالا ۔ ان کا آخری زمانہ قسطنطنیہ میں گزرا جہاں وہ ۱۸۹۷ء میں انتقال کر گئے[1] ۔

جب تک اس دور کی سیاسی حکمتِ عملی جو سر سید کے خیالات سے متاثر تھی ہندوستان کے مسلمانوں میں مقبول رہی اس وقت تک سید جمال الدین افغانی کی تحریک ہندوستانی مسلمانوں کو اپنی طرف راغب نہ کر سکی ۔ اسی لیے جمال الدین افغانی سر سید کے بڑے مخالف تھے اور انہوں نے اپنے اخبار میں سر سید کے خلاف بہت کچھ لکھا ۔ لیکن جب انگریزی حکومت کا اعتبار مسلمانوں کے دلوں سے اٹھ گیا اور علاوہ ہندوستان کے دوسرے ممالک میں بھی مسلمانوں کو برطانوی حکومت نے بالواسطہ یا بلا واسطہ نقصان پہنچانا شروع کیا تو اخوتِ اسلامی کا جذبہ ہندوستان میں تیز ہونے لگا ۔ سلطنتِ عثمانیہ کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینے کے لیے اطالیہ اور بلقانی ریاستوں کی جارحانہ کارروائیوں جن کی پشت پر برطانیہ کا اقتدار تھا، نے ترکوں کے ساتھ مسلمانانِ ہند کی ہمدردیاں اتنی بڑھا دیں کہ برطانوی اور اطالوی سامان کا بائیکاٹ شروع ہو گیا اور ترکوں کی امداد کے لیے بڑی بڑی رقمیں فراہم ہونے لگیں ۔ مولانا محمد علی نے نہ صرف اخبار نویسی کے ذریعے اس مہم میں ہاتھ بٹایا بلکہ ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی قیادت میں ایک طبی وفد مرتب کیا (۱۹۱۲ء) دو درجن سے زیادہ تعلیم یافتہ نوجوان رضاکار بن کر وفد کے ساتھ ترکی گئے اور وہاں کے اعیان و اکابر سے ہندوستانی مسلمانوں کا رابطہ قائم کیا ۔ اطالیہ نے خانۂ کعبہ پر گولا باری کرنے کی جو دھمکی دی تھی اس کے جواب میں 'انجمنِ خدامِ کعبہ' کے نام سے ایک انجمن ہندوستان میں بنی جس کے سرگرم کارکن مولانا عبدالباری فرنگی محلی، علی برادران

---

(۱) طفیل احمد، مسلمانوں کا روشن مستقبل - ص ۳۸۱ -

اور مشیر حسین قدوائی تھے - دیوبند کے شیخ الاسلام مولانا محمود الحسن نے ۱۹۰۹ء ہی میں 'جمعیت الانصار' کے نام سے مختلف اسلامی فرقوں سے تعلق رکھنے والے افراد کو متحد کرنے کے لیے ایک انجمن کی بنا ڈال دی تھی اور اب دوسرے اسلامی ممالک سے ربط پیدا کر کے خلافتِ عثمانیہ کے لیے عملی امداد حاصل کرنے کے منصوبے بنا رہے تھے - ان کا خیال تھا کہ ایران اور افغانستان کی حکومتوں پر دباؤ ڈالنے سے وہ ترکی کی امداد کرنے کے لیے تیار ہو جائیں گے اور اس طرح عالمِ اسلامی کا اتحاد ممکن ہو گا - غرض 'اتحاد بین المسلمین' کے جذبات اس زمانے میں عام طور پر مسلمانوں میں پیدا ہو گئے تھے - علاوہ عملی کارکنوں کے نئی اہلِ قلم جن میں شعراء ، ادباء اور صحافی شامل تھے اس تحریک میں سرگرمی سے حصہ لیتے رہے - جیسے شبلی نعمانی ، مولانا ظفر علی خان ، مولانا ابوالکلام آزاد ، مولانا محمد علی جوہرؒ ، علامہ اقبالؒ ، حسرت موہانی وغیرہ - انگریزوں نے اس تحریک کو جس قدر شدت سے دبانا چاہا یہ اسی شدت سے ابھری اور اس تحریک کے حامیوں نے قید و بند کی کوئی پرواہ نہیں کی - یہی تحریک تھی جس نے آگے چل کر 'تحریکِ خلافت' کی شکل اختیار کی -

شیخ محمد اکرم 'موجِ کوثر' میں لکھتے ہیں کہ ''اجتماعی نقطۂ نظر سے مسلمانانِ ہند کی جداگانہ قومی تشکیل اگرچہ کسی حد تک ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان چھوت چھات اور اردو ہندی جھگڑے کا نتیجہ تھی لیکن حالی کی نظموں اور سرسید کی پالیسی نے اسے بہت تقویت دی - سرسید علی گڑھ کو مسلمانوں کا سیاسی مرکز بھی بنانا چاہتے تھے اور ۱۹۱۰ء کے قریب تک یہ جگہ قوم کا سیاسی مرکز رہی[1]'' - اور مسلمانوں میں ایک نئے تعلیم یافتہ اور مشرق و مغرب کی بعض عمدہ خصوصیات کے حامل طبقے کی بنیاد پڑ گئی جو نئی زندگی کی ضروریات کا کفیل بھی ہو سکتا تھا اور مغربی افکار و خیالات ، مغربی معیاروں کو ہندوستان میں نافذ کرنے کا بھی اہل تھا - سر آکلنڈ کالون نے بھی یہ تسلیم کر لیا تھا کہ ''جو شخص ان نوجوان آدمیوں سے واقف ہے جو اس کالج سے پاس ہو کر نکلے ہیں ، وہ غالباً اس امر میں مجھ سے اتفاق کریں گے کہ وہ اپنی تعلیم و تربیت کی علامتیں ایسی ہی صاف صاف ظاہر کرتے ہیں جیسی کہ انگلستان میں ہمارے پبلک اسکولوں اور ہماری یونیورسٹی کے گریجویٹ ظاہر کرتے ہیں - علی گڑھ کالج کا طالبعلم فیاضانہ خیالات اور ترقی یافتہ تعلیم و تربیت اور آزادانہ خصلت رکھنے والا شخص خیال کیا جاتا ہے[2]'' - خوش گفتاری 'خوش باشی' خوش پوشی اور آزاد خیالی علی گڑھ کے تعلیم یافتہ طلبا کے امتیازی اوصاف تھے -

---

(۱) اکرام ، شیخ محمد ، موج کوثر - ص ۱۴۱ ، مطبوعہ لاہور ۱۹۵۸ء -

(۲) حالی ، حیات جاوید - ص ۵۶۴ -

علی گڑھ تحریک کا مقصد سماجی لحاظ سے یہ تھا کہ عام روز مرہ زندگی میں مسلمان جن فضول غیر اسلامی رسوم و رواج کی پابندی کرتے ہیں، ان سے باز آئیں اور انگریزوں کے ساتھ میل جول، کھانا پکانا وغیرہ اپنے اوپر خواہ مخواہ حرام نہ کر لیں بلکہ مغربی تمدن و معاشرت میں جو چیزیں مفید و سود مند ہیں انہیں بلا تکلّف اختیار کر لیں تاکہ رجعت پسند کی بجائے ترقی پسند کہلائیں ۔ ادبی لحاظ سے تحریکِ سر سید کا مقصد افادیت اور سادگی کا اختیار کرنا تھا ۔ سر سید چاہتے تھے کہ ادب کو محض تفریح یا محض لفظی بازیگری و آرائشِ بیان کے تنگ دائرے سے باہر نکالا جائے اور حقیقی جذبات و خیالات کا ترجمان اور معاشرے اور زندگی کا عکاس ، خادم اور رہبر بنایا جائے ، بیان و ادا میں سادگی و سلاست، بے تکلّفی و بے ساختگی ، مدعا نویسی و صداقت کو پیشِ نظر رکھا جائے ۔ سر سید نے خود اس نظریۂ ادب پر عمل کیا اور دوسروں سے بھی اس پر عمل کروایا ۔ انہوں نے مختلف النوع موضوعات پر قلم اٹھا کر اردو زبان کو ہر قسم کے خیالات کی ادائیگی کے قابل بنایا اور ان کی تحریک ایک عرصے تک نثر لکھنے والوں کے لیے نمونہ بنی رہی ۔ اردو نظم بھی سر سید کی کچھ کم احسان مند نہیں ۔ اگرچہ کرنل ہالرائڈ کی تحریک نے جس میں محمد حسین آزاد ، حالی ، پیارے لال ، آفتاب وغیرہ شامل تھے نیچرل شاعری کی بنا اس برِّ صغیر میں ڈالی لیکن اس کے رخ کو سادگی اور افادیت کی طرف موڑنے میں سر سید کا ہاتھ بھی تھا ۔

غرض مختصر یہ کہ علی گڑھ تحریک نے مسلمانانِ ہند کے طرزِ فکر و طرزِ عمل کو ایک نئے راستے پر ڈال دیا جو ترقی پسندانہ کہا جا سکتا ہے البتہ یہ سچ ہے کہ سر سید نے تعلیم یافتہ طبقے کو مذہبِ اسلام کے عقائد اور عبادات سے بیگانہ و لا تعلق ہو جانے سے بچانے کے لیے جو تدبیریں کیں وہ کامیاب نہ ہو سکیں ۔

علی گڑھ تحریک نے مسلمانانِ ہند کو نہ صرف بے شمار فائدے بلا واسطہ پہنچائے بلکہ بالواسطہ بھی اس سے کئی فائدے ہوئے ۔ اس تحریک کے زیرِ اثر ملک کے مختلف علاقوں میں قومی تعلیم گاہوں کا قیام عمل میں آیا جن کا انتظام خود مسلمانوں نے کیا ۔ لاہور میں 'انجمن حمایتِ اسلام' کی بنیاد ستمبر ۱۸۸۴ء میں قاضی حمید الدین کے ہاتھوں پڑی جس کے مقاصد یہ تھے : (۱) مسلمان طلبا و طالبات کے لیے تعلیم کے ساتھ ساتھ مذہبی تعلیم کا اہتمام کرنا ۔ (۲) اسلام کی مدافعت و اشاعت کرنا ۔ (۳) اسلام کے خلاف کیے جانے والے پروپیگنڈے کا ردّ ، تقریروں ، کتابوں اور رسالوں وغیرہ کے ذریعے سے کرنا[1] ۔ اس انجمن نے نواب سر فتح علی خان قزلباش ، میاں سر محمد شفیع ، خان بہادر شیخ انعام علی ، خان بہادر شیخ امیر علی ، علّامہ اقبال ، نواب شاہنواز خان ، سر عبدالقادر

---

(۱) تاریخ تحریک آزادی ، جلد سوم ، حصہ دوم - ص ۳۲۲ - ۳۲۱ -

وغیرہ کی حیات اور مساعی سے بہت ترقی کی اور کئی اسکول، یتیم خانے اور بیوہ خانے قائم کیے۔ ۱۹۰۷ء سے یونانی طب کی تعلیم کا انتظام بھی انجمن نے سنبھال لیا۔ سیاسی اور تعلیمی میدان میں انجمن حمایت اسلام کو علی گڑھ سے اتفاق تھا۔ البتہ مذہبی تعمیر و اصلاح میں اس انجمن نے سر سید کی انتہا پسندانہ عقلیت سے اختلاف کیا اور مبالغہ روی کی مخالفت کی۔ اسلام کی حمایت اور اشاعت کے سلسلہ میں انجمن اپنی مطبوعات کے ذریعے برابر حاصل کرتی رہی۔ اسی انجمن کے جلسوں میں اقبال نے اپنی بعض مشہور نظمیں مثلاً 'نالۂ یتیم'، 'شکوہ'، 'جواب شکوہ'، 'خضر راہ'، 'طلوع اسلام' وغیرہ سنائیں۔ غرض پنجاب کے علاقے میں انجمن حمایت اسلام نے علی گڑھ تحریک کو عام کرنے میں بڑا حصہ لیا۔

اندرون سندھ میں حسن علی آفندی کی کوششوں سے ۱۸۸۵ء میں سندھ مدرسۃ الاسلام کراچی قائم ہوا جہاں نہ صرف علاقۂ سندھ سے بلکہ اور جگہوں کے مسلمان بھی حصول تعلیم کے لیے آتے تھے۔ قائد اعظم محمد علی جناح نے بھی اسی مدرسے میں اپنی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ اسی طرح اپنی مدد آپ کے اصول پر مولوی بشیر الدین کی کوششوں سے ایک اسکول اٹاوہ میں قائم ہوا (۱۸۹۰ء)۔ اس کے آغاز کے وقت وہاں صرف آٹھ طالب علم تھے لیکن آگے چل کر ان کی تعداد بہت بڑھ گئی اور اسکول بڑی حد تک اقامتی ہو گیا۔ مؤخر الذکر مدرسے کے پڑھے ہوئے طالب علم اعلیٰ تعلیم کے لیے علی گڑھ میں بڑی خوشی سے قبول کیے جاتے تھے، کیونکہ یہاں کی تعلیمی و تربیتی پالیسی وہی تھی جو علی گڑھ کی تھی۔ جنوبی ہند میں ۱۸۸۵ء میں انجمن مفید اہل اسلام اور انجمن اسلامیہ مدراس کا قیام عمل میں آیا اور پھر محمڈن ایجوکیشنل ایسوسی ایشن آف سدرن انڈیا وجود میں آئی۔ جس کی کوششوں سے ویلور، بلور، کرنول وغیرہ میں مسلمانوں کی تعلیم گاہیں قائم ہو گئیں۔

سر سید جانتے تھے کہ سارے ہندوستان کے مسلمانوں کی تعلیمی ضروریات صرف علی گڑھ میں ایک درسگاہ قائم کر دینے سے پوری نہیں ہو سکتیں اس لیے انہوں نے ۱۸۸۶ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانگرس کی بنیاد ڈالی جس کا نام ۱۸۹۰ء میں بدل کر محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کر دیا گیا۔ اس کانفرنس کا مقصد ہندوستان کے مختلف صوبوں میں مسلمانوں کے مسائل حل کرنے میں مدد دینا اور اسلامی علوم پر تحقیقی کتابیں شائع کرنا تھا۔ اس کانفرنس کے اجلاس ہر سال ایک نئے شہر میں ہوتے تھے۔ اس کانفرنس نے مسلمانوں کی ترقیٔ تعلیم میں بڑا ہاتھ بٹایا۔ سر سید اور ان کے رفقاء کی تقریروں، نظموں اور خطبوں سے عام مسلمانوں کے دلوں میں غیرت، جذبہ، حوصلہ اور قومی تعلیم میں امداد دینے اور اپنی پسماندگی کا احساس پیدا ہوا۔ سر سید کی زندگی میں کانفرنس کے کل گیارہ اجلاس ہوئے۔

ان کی وفات کے بعد اس کو مسلسل ترقی و وسعت ہوئی اور ہر سال باقاعدہ اجلاس منعقد ہوتے رہے اور جا بجا مسلم تعلیم گاہیں قائم ہوئیں اور نادار طلبا کے وظائف کا انتظام ہوا ۔

ملک بھر میں مسلمانوں کی تعلیم کے مختلف اداروں کے قیام کے علاوہ اس دور کی اہم تعلیمی سرگرمی یونیورسٹیوں کا ارتقاء اور مقبولیت ہے ۔ کلکتہ ، مدراس اور بمبئی کی یونیورسٹیاں ۱۸۵۷ء ہی میں قائم ہو گئی تھیں ۔ ان کے طریقِ امتحان کا اثر پہلے سے قائم شدہ کالجوں پر پڑا اور کئی نئے کالج قائم ہوئے تاکہ اعلیٰ تعلیم کے انگریزی نظام کے بڑھتے ہوئے تقاضے پورے کیے جائیں ۔ تاہم شمالی ہند میں مشرقی علوم کی مقبولیت بھی برقرار رہی ۔ ۱۸۶۴ء میں لکھنؤ میں کیننگ کالج اور لاہور میں گورنمنٹ کالج شروع ہوا ۔ آخر الذکر کالج کا قیام پریذیڈنسی کالج کلکتے کے نمونے پر ہوا اور اس کے پرنسپل ڈاکٹر لائٹنر مقرر ہوئے ، جنھوں نے نومبر ۱۸۶۴ء میں اپنی خدمت سنبھالی ۔ ان کے لاہور پہنچنے سے پہلے ڈبلیو الگزینڈر اور ڈبلیو ایچ کرینک یہ خدمات انجام دیتے رہے تھے ۔ ڈاکٹر لائٹنر نے آتے ہی سب سے پہلے پنجاب یونیورسٹی کا منصوبہ تیار کرنا شروع کیا آخر اٹھارہ سال کی مسلسل کوشش کے بعد ۱۸۸۲ء میں پنجاب یونیورسٹی وجود میں آگئی ۔ اورینٹل کالج لاہور ۱۸۷۰ء میں قائم ہو گیا تھا ۔ یہ بعد میں پنجاب یونیورسٹی کی تحویل میں دے دیا گیا ۔ ۱۸۸۷ء میں الہ آباد یونیورسٹی قائم ہوئی ۔ یہ دونوں یونیورسٹیاں کلکتہ ، مدراس اور بمبئی کی یونیورسٹیوں سے مختلف خطوط پر کام کرنے لگیں ۔ پنجاب یونیورسٹی نے تین مقاصد اپنے سامنے رکھے : (۱) عوام کے مذاق اور ادبیات کو سنوارنا اور ترقی دینا ۔ (۲) تدریس کا ایسا معیار قائم کرنا جو تمام تعلیمی اداروں کو اوپر سے نیچے تک ہر سطح پر محیط ہو اور (۳) امتحانات منعقد کرنا جن کے ذریعے دوسرے دونوں مقاصد کے حصول یا عدمِ حصول کا اندازہ لگایا جا سکے ۔ شروع شروع میں کچھ بحث اس بات پر ہوئی کہ آیا پنجاب یونیورسٹی صرف مشرقی علوم سے مختص ہو ، لیکن آخر طے پایا کہ مشرقی ادبیات و علوم کے ساتھ ساتھ مغربی علوم کی تعلیم و تدریس بھی اس کے مقاصد میں شامل ہو[1] ۔ مسلمانوں ، آریا سماجوں اور سکھوں نے اپنی اپنی مذہبی تعلیم کا اپنے تعلیمی اداروں میں میں انتظام کر رکھا تھا اور اس طرح سرکاری انگریزی تعلیم میں جو کمی تھی وہ اپنے طور پر پوری کر لی تھی ۔

قدیم نظام و نصاب تعلیم اور دینی علوم سے مسلمانوں کی دلچسپی انگریزی اثرات کے باوجود فنا نہ ہو سکی تھی ۔ ابھی مسلمانوں میں نئی تعلیم اور نیا طرزِ فکر و عمل پھیلانے کی بھرپور تحریک بھی شروع بھی نہ ہوئی تھی کہ دوآب کے شمالی گوشے میں

---

(۱) یوسف علی ، عبداللہ ، برطانوی عہد میں ہندوستان کی ثقافتی تاریخ (انگریزی) ۔ ص ۲۵۶ ، مطبوعہ بمبئی ۱۹۴۰ء ۔

پرانی تعلیم کے لئے دو مدرسوں کی بنیاد پڑی ۔ ایک مولوی محمد مظہر نے سہارنپور میں ۱۸۶۷ء میں قائم کیا جو 'مدرسہ' علوم' کہلایا اور دوسرا اس ضلعے کی بستی دیوبند میں چند علماء کی سرگرمی سے اسی سال شکل پذیر ہوا ۔ مدرسہ مظاہر العلوم کو مولانا رشید احمد گنگوہی ، مولانا خلیل احمد سہارنپوری اور مولانا اشرف علی تھانوی کی سرپرستی حاصل ہوئی[1] اور یہاں سے بڑی تعداد میں علماء اور علم دین کے مخلص خدمت گار گزار فارغ ہو کر نکلے جنہوں نے خاص طور پر فن حدیث کی بڑی خدمت کی ۔ مدرسہ دیوبند کا آغاز اگرچہ ایک چھوٹے سے مدرسے کی حیثیت سے ہوا لیکن آگے چل کر یہ سارے ہندوستان میں خالص دینی تعلیم کا سب سے بڑا ادارہ بن گیا ۔ شروع شروع میں اس مدرسے کے مقاصد ایک معمولی مکتب سے زیادہ وسیع نہ تھے، لیکن جب مولانا قاسم نانوتوی اس سے وابستہ ہوئے تو انہوں نے اسے ایک شاندار دار العلوم بنانے کا ارادہ کیا اور اپنے اخلاص و للّٰہیت ، بلند ہمتی و بلند نظری اور انتظامی صلاحیتوں کی بدولت اپنے ارادے میں کامیاب ہوئے ۔ حکومت کے عمل دخل سے محفوظ رہنے کے لیے یہ طے پایا کہ کوئی سرکاری امداد وصول نہ کی جائے اور نہ ہی متمول افراد سے عطیات لیے جائیں بلکہ اس کے اخراجات کے لیے صرف عوام الناس سے چندہ لیا جائے[2] ۔ مولانا محمد قاسم کا اصل مقصد شاہ ولی اللہ کے مشن کو جاری رکھنا تھا ۔ مسلک ولی اللّٰہی سے فیضیاب ہونے اور اسے عام کرنے کے عزم کے علاوہ مدرسے کے منتظمین درس و تدریس کے جدید طریقوں اور نئے تعلیمی انتظامات سے بھی واقف تھے ۔ خوش قسمتی سے دار العلوم کو روز اول ہی سے مخلص کارکن اور صاحب دل اساتذہ کا تعاون حاصل رہا جس کی وجہ سے تقویٰ و طہارت ، اخلاص ، تواضع و انکساری کی روح پورے ماحول پر طاری رہی ۔ ان باکمال و مخلص اساتذہ میں مولانا محمد قاسم کے علاوہ مولانا محمد یعقوب نانوتوی ، مولانا محمود الحسن ، مفتی عزیز الرحمٰن ، مولانا غلام رسول اور پھر مولانا انور شاہ ، مولانا حسین احمد مدنی ، مولانا سید اصغر حسین وغیرہ کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے[3] ۔ دار العلوم کا دائرۂ عمل روز بروز وسیع سے وسیع تر ہوتا رہا ۔ چند سال میں طلباء کی تعداد اتنی بڑھ گئی کہ درس اور اقامت خانے کے لیے کئی عمارتیں بنانی پڑیں ۔ پچاس برس میں تعلیم پانے والوں کا شمار ایک ہزار کے قریب آ گیا ۔ کتب دینیہ کا معقول ذخیرہ فراہم ہو گیا ۔ افتاء کا مستقل شعبہ اضافہ کیا گیا ۔ آخر میں تصنیف و تالیف کی طرف بھی توجہ ہوئی اور ماہنامہ رسالہ 'القاسم' کا اجراء عمل میں آیا ۔ ان سب ترقیوں کے باوجود مدرسۃ العلوم دیوبند کا نصاب وہی مدرسہ رحیمیہ دہلی کا نصاب تھا جس میں

(۱) ابوالحسن علی ندوی ، سید ، ہندوستانی مسلمان - ص ۱۲۰ ، مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۶۱ء -
(۲) طفیل احمد ، مسلمانوں کا روشن مستقبل - ص ۱۸۸ -
(۳) ابوالحسن علی ندوی ، ہندوستانی مسلمان - ص ۱۸۸ -

پرانی معقولات یعنی فلسفہ و منطق اور فقہ و اصول فقہ سے زیادہ منقولات یعنی قرآن و حدیث پر زور دیا جاتا تھا اور الحاقی روایات اور تقلیدی بدعات سے قطع نظر کر کے دین کے صحیح عقائد و اعمال واضح کیے جاتے تھے ۔ جدید علوم سے اسے کوئی سروکار نہ تھا ان معنوں میں یہ مدرسہ علی گڑھ سے بالکل مختلف تھا ۔ جس طرح تعلیمی پالیسی میں اسے علی گڑھ سے کوئی مناسبت نہ تھی اسی طرح سیاسی حکمتِ عملی میں بھی یہ علی گڑھ کی ضد تھا ۔ سیاسی طور پر علمائے دیوبند خلافت عثمانیہ سے قریبی ربط اور تحریک اتحاد اسلامی کے قائل تھے اور برطانوی حکومت کے سخت مخالف ۔ البتہ سماجی اور اخلاقی اصلاح میں تحریکِ دیوبند اور تحریکِ علی گڑھ میں بہت کچھ اتفاق تھا ۔ تمسک بالدین ، مسلک احناف کی سختی سے پابندی ، اسلاف کی روایات کی حفاظت اور سنت کی مدافعت دیوبند کا شعار تھا اور اب بھی ہے[1]۔ عیسائی مشنری اور آریا سماجی کارکن اسلام اور راہنمایانِ اسلام پر جو اعتراضات اور حملے کرتے تھے اور مناظروں کے چیلنج دیا کرتے تھے ان کا جواب دینے میں بھی علمائے دیوبند پیش پیش ہوتے تھے ۔ غرض قدیم طرز کی اسلامی درسگاہوں میں دیوبند امتیازی مقام رکھتا تھا اور یہ مقام اسے اب بھی حاصل ہے ۔ اس کی مقبولیت و شہرت علمی فتوحات سے زیادہ اس کے علماء کی روحانی پاکیزگی کی مرہونِ منت ہے ۔ علی گڑھ اور دیوبند کے مقاصد اور طریقِ کار میں بعد عظیم تھا اور اگرچہ دیوبند نے کھل کر علی گڑھ تحریک کی مخالفت نہیں کی لیکن اس کے کام اور اس کی حکمتِ عملی کی حیثیت اس تحریک کے خلاف ایک خاموش ردِّ عمل کی سی تھی ۔

مدرسۂ دیوبند بننے کے کوئی پچیس برس بعد ندوۃ العلماء کے قیام کی تحریک شروع ہوئی جس کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ صرف عوام کی اصلاح نہیں ، بلکہ علماء کی اصلاح سے بھی تعلق رکھتی تھی اور ان کے باہمی نزاع کو رفع کر کے انہیں متحد بنانا چاہتی تھی ۔ علی گڑھ تحریک کے اثر سے روشن خیال علماء کو دینی مدارس میں نئی روشنی لانے کا خیال بھی پیدا ہو گیا تھا اور اس غرض کے لیے نصابِ تعلیم میں بھی اصلاح مقصود تھی ، تاکہ وہ ضروریات زمانہ کا ساتھ دے سکے ۔ چنانچہ ان مقاصد کے پیشِ نظر ۱۸۹۴ء میں لکھنؤ میں 'ندوۃ العلماء' کی بنیاد ڈالی گئی[2]۔ اگرچہ اس کے محرّک مولوی عبدالغفور تھے مگر اس کی تکمیل سید محمد علی کانپوری کے ہاتھوں ہوئی ۔ علامہ شبلی نعمانی اور مولوی عبدالحق دہلوی نے اس کے قواعد و ضوابط مرتب کیے ۔ اکابرِ قوم مثلاً سر سید ، محسن الملک ، وقار الملک وغیرہ نے بھی 'ندوۃ العلماء' کے اعراض و مقاصد کو پسند کیا ۔ ۱۸۹۸ء میں 'ندوۃ العلما' کے زیر اہتمام ایک دارالعلوم بھی قائم ہو گیا اور ایک کتب خانہ

---

(۱) ابوالحسن ندوی ۔ ص ۱۱۹ ۔

(۲) ہاشمی فرید آبادی ، تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت ۔ ص ۵۱۴ ۔

بھی بن گیا ۔ نیا نصاب تعلیم ترتیب دیا گیا جس میں انگریزی زبان بھی شامل تھی ۔ ادب اور عربیت کا معیار بلند کیا گیا ۔ قرآن پاک کو نصاب میں زیادہ اہمیت دی گئی ، طلبا میں عربی تحریر و تقریر کی قابلیت پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ۔ علوم و فنون کے ساتھ ساتھ مختلف صنعتیں بھی طلبا کو سکھائی جاتی تھیں ۔ ان اصلاحات کی پرانے خیال کے علماء نے مخالفت کی، شروع میں انگریز حکام بھی کچھ مشکوک تھے، لیکن ۱۹۰۴ء میں جب شبلی نعمانی اس کے معتمد بنے تو انہوں نے ندوے کی مالی حالت استوار کی ، حکام سے تعلقات سازگار بنائے اور ندوے کی قدر و وقعت قوم کی نظروں میں بڑھا دی ۔ لیکن ۱۹۱۳ء میں شبلی اندرونی اختلافات کی بنا پر مستعفی ہو گئے جس سے ندوے کی شہرت و وقعت کو بہت دھکا لگا ۔ ندوۃ العلماء کے بانی قدیم و جدید کے افراط و تفریط ، علماء کی علیحدگی پسندی کے رجحانات اور فقہی تنازعات کو مسلمانوں اور اسلام کے لیے مضر سمجھتے تھے ۔ وہ قدیم و جدید کے امتزاج سے ایک ایسا ادارہ بنانا چاہتے تھے جہاں کے تعلیم یافتہ افراد جدید دور کی ضروریات و مقتضیات سے بھی واقف ہوں اور دینِ اسلام کو جدید دنیا کے سامنے مؤثر انداز اور نئے اسلوب میں پیش کر سکیں ۔ لیکن ندوہ میں نہ تو علوم دینیہ میں دیوبند کی برابری کا درجہ حاصل کر سکا اور نہ انگریزی یا عربی ہی میں بڑے کالج کے درجے تک پہنچ سکا ۔ دیوبند اور علی گڑھ دونوں کی خوبیوں کا مجموعہ بننے کی کوشش ناکام رہی ۔ ندوے میں نہ تو جدید طرزِ تعلیم کی ارضیت و مادیت ہی آئی نہ قدیم اندازِ فکر کی روحانیت و مادیت ۔ شیخ محمد اکرم کا خیال ہے کہ ندوے کی ناکامی کی وجہ شخصی نفاق اور اتفاقی حوادث تھے نیز یہ کہ ''فی الوقعہ ندوے نے علی گڑھ اور دیوبند کی خوبیاں صحیح طور پر اخذ کرنے کی کوشش ہی نہیں کی، جب ندوے کی بنیادیں ذرا گہری ہوئیں اس نے اپنے آپ کو دوسرے اداروں کے مقابلے میں حریفانہ حیثیت سے پیش کیا . . . ارباب ِ ندوہ کا دعویٰ تھا کہ وہ قوم کے دونوں بڑے تعلیمی اداروں سے اشتراک عمل کریں گے لیکن ندوے میں دونوں کی مخالفت ہوتی رہی[۲]''۔ تاہم ندوے کے فضلاء نے اسلامی ادب علم کلام ، تاریخ اور سیرتِ نبوی پر جو لٹریچر فراہم کر دیا اس کی قدر و قیمت اور اہمیت سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا ۔

شاہ ولی اللہ کی تعلیمات کو عام کرنے اور نئے علم کلام کو رائج کرنے کے لیے بیسویں صدی کے اوائل میں ایک مدرسہ کانپور میں بھی مدرسۂ الٰہیات کے نام سے قائم ہوا[۳]۔ اس زمانے میں مذہبی مناظروں اور مباحثوں کا سلسلہ جاری تھا اس لیے اس مدرسے

(۱) اکرام ، موج کوثر ۔ ص ۲۰۷ تا ۲۲۱ ۔
(۲) مدرسہ الٰہیات کانپور کے بارے میں میری معلومات تمام تر مولانا اسمعیل ذبیح کے بیان پر مشتمل ہیں ۔ مولانا ذبیح جو آج کل پشاور میں مقیم ہیں اسی مدرسے کے تعلیم یافتہ ہیں اور اس مدرسے کے دوسرے پرنسپل مولوی غلام یحییٰ کے فرزند ہیں ۔

میں ،مذاہب عالم کا تقابلی مطالعہ بھی سکھایا جاتا تھا ۔ یہاں مبتدیوں کو داخلہ نہیں ملتا تھا بلکہ مشرقی علوم کے اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد ہی داخل کیے جاتے تھے ۔ اس مدرسے کے پہلے صدر مولانا آزاد سبحانی تھے اور وہاں کے ممتاز اساتذہ میں مولانا سعید انصاری ، مولانا وصی علی ، مولانا کرم علی شامل تھے ۔ اس مدرسے کو شبلی نعمانی ، حکیم اجمل خان اور مولانا ابوالکلام آزاد کی حمایت حاصل تھی ۔

یوں تو علم حدیث کو ہندوستان میں رائج و مقبول بنانے کا کام اٹھارھویں صدی میں شاہ ولی اللہ ہی کے زمانے سے شروع ہو گیا تھا جو طبقہ اہل حدیث یا غیر مقلد کے نام سے مشہور ہوا اس کی سر گرمی کا سہرا بقول سید سلیمان ندوی مولانا شاہ اسحاق صاحب کے شاگرد مولانا سید نذیر حسین بہاری ثم دہلوی کے سر ہے[1] ۔ ان کی تلقین سے توحید خالص اور رد بدعت کے علاوہ فقہ حنفی کی تقلید کے بجائے براہ راست کتب حدیث سے بقدر فہم استفادہ اور اس کے مطابق عمل کا جذبہ نمایاں ہوا ۔ مولانا سید نذیر حسین کے شاگردوں کا بڑا حلقہ تھا ۔ جنھوں نے ملک کے گوشے گوشے میں پھیل کر اپنے طریقے کی اشاعت کی ۔ اس تحریک کا ایک فائدہ بقول سلیمان ندوی یہ ہوا کہ ”طبیعتوں کا جمود دور ہوا اور جب ایک بند ٹوٹا تو اجتہاد کے دوسرے دروازے بھی کھلے ۔ مولوی نذیر حسین کے شاگردوں میں مولوی ابراہیم آروی خاص حیثیت رکھتے تھے . . . . . . نئے طرز پر انجمن علماء اور عربی مدرسہ اور اس میں دارالاقامہ کی بنیاد کا خیال انھی کے دل میں آیا اور انھی نے ۱۸۹۰ء میں مدرسۂ احمدیہ کے نام سے ایک مدرسہ آرہ میں قائم ہوا اور اس کے لیے جلسۂ مذاکرۂ علمیہ کے نام سے ایک مجلس بنائی گئی جس کا بسال بسال جلسہ آرہ میں ہوتا تھا ۔ اس میں انگریزی بھی پڑھائی جاتی تھی ۔ ندوہ کے قیام کے بعد ۱۸۹۶ء/۱۳۱۳ھ میں اس کا سب سے پہلا جلسہ آرہ سے باہر دربھنگہ میں ہوا اور وہاں بحث پیش آئی کہ ندوہ کے رہتے ہوئے اس کے قیام کی ضرورت ہے یا نہیں ، بہر حال وہ قائم رہا اور خوش اسلوبی سے چلتا رہا . . . . . عربی مدرسوں کی یہ نئی بدعت انھی اہل حدیث سے شروع ہوئی“[2] ۔

۱۸۵۷ء کے بعد علمائے اہل حدیث نے بقول شیخ محمد اکرام تین بانوں میں امتیاز حاصل کیا ۔ اول حدیث کی اشاعت میں جس کے لیے کئی مدرسے قائم ہوئے اور فضلائے حدیث کے درس کا انتظام ہوا ۔ دوسرے عیسائیوں ، آریا سماجیوں ، مرزائیوں اور شیعوں کی مخالفت میں ، جس کے لیے صدہا کتابیں اور رسالے تصنیف کیے گئے ، سینکڑوں جگہ مناظرے قائم ہوئے ۔ تیسرے شرک و بدعت کی مخالفت میں[3] ۔ علاوہ سید نذیر حسین بہاری

---

(۱) سلیمان ندوی ، سید ، حیات شبلی - ص ۴۴ ، ۳۰۸ ، مطبوعہ اعظم گڑھ ۱۹۴۳ء -
(۲) سلیمان ندوی ، حیات شبلی - ص ۳۰۸ -
(۳) اکرام ، موج کوثر - ص ۴۸ -

ثم دہلوی کے اس دور کے دوسرے ممتاز اہل حدیث نواب صدیق حسن قنوجی ثم بھوپالی تھے - سر سید احمد خان بھی اپنے آپ کو 'وہابی کریلا نیم چڑھا' گردانتے تھے جس سے ان کی مراد یہی تھی کہ وہ کٹر قسم کے غیر مقلد یا اہل حدیث تھے - اہل حدیث کی مرکزی جماعت اہل حدیث کانفرنس امرتسر تھی اور اس کے سرگرم کارکن مولوی ابوالوفا ثناء اللہ امرتسری تھے ، جنہوں نے آریا سماج اور قادیانی جماعت کے ساتھ مباحثوں میں بڑا حصہ لیا -

اہل حدیث کی سرگرمیوں کے رد عمل کے طور پر دو اور گروہ پیدا ہوئے جن کے مقاصد ایک دوسرے کی ضد تھے - ایک کے سرگروہ مولوی احمد رضا خان بانی بریلوی تھے اور دوسرے کے مولوی عبداللہ چکڑالوی - اول الذکر کی جماعت بریلوی پارٹی کے نام سے مشہور ہوئی اور آخر الذکر کی اہل قرآن کے نام سے - بریلوی پارٹی نے شدت سے قدیم حنفی طریقوں کی حمایت پر کمر باندھی اور سینکڑوں کتابیں مختلف نزاعی اور علمی مباحث پر لکھیں اور مسلمانوں میں رائج تمام رسومات مثلاً فاتحہ خوانی ، چہلم ، برسی ، گیارھویں ، عرس ، تصور شیخ ، قیام میلاد ، استمداد از اہل اللہ وغیرہ کی تائید کی - اس کے برخلاف اہل قرآن نے صرف فقہا کی تقلید ہی سے آزادی کو ناکافی سمجھ کر احادیث سے بھی آزادی حاصل کرنی چاہی اور کہا کہ صرف قرآن ہدایت کے لیے کافی ہے -

ہندوستان کی مذہبی دنیا میں پہلے سے کچھ کم فرقے موجود نہ تھے کہ قادیان سے مرزا غلام احمد نے ۱۸۹۱ء میں مسیح موعود اور مہدی ہونے کا اور ۱۹۰۴ء میں کرشن اوتار ہونے کا دعوی کر دیا اور اس طرح مرزائی فرقے کے بانی ہوئے - اپنے ان دعووں سے پہلے مرزا غلام احمد نے 'براہین احمدیہ' شائع کی تھی اور اسکاٹ لینڈ چرچ کے مشنریوں کے ساتھ مباحثے کیے تھے اور ان کے طرز استدلال اور جوش مذہبی کو عام مسلمانوں نے پسند بھی کیا تھا لیکن ان کے مسیح و مہدی و کرشن اوتار ہونے کے دعووں سے نہ صرف علمائے اسلام بلکہ آریا سماجی کارکن اور عیسائی پادری سب ان کے خلاف ہو گئے - تاہم انہوں نے اپنے خیالات کی اشاعت کے لیے قادیان سے 'ریویو آف ریلیجنز' شروع کیا اور بیشتر وقت مباحثوں ، مباہلوں اور پیشین گوئیوں میں صرف کیا - ان کا مسلک اکثر اعتقادی امور میں وہی تھا جو سر سید ، مولوی چراغ علی اور سید امیر علی کا - وہ بھی ان لوگوں کی طرح عقلیت کے واسطے سے اسلامی عقائد کی تاویل و تعبیر کرتے تھے اور اس لحاظ سے انہیں بھی نو معتزلہ خیالات کا حامل قرار دیا جا سکتا ہے - مرزا غلام احمد کی وفات کے بعد ان کی جماعت دو گروہوں میں بٹ گئی - ایک وہ جو قادیانی کہلائے دوسرے وہ جو لاہوری احمدی کے نام سے مشہور ہوئے - قادیانی جماعت مرزا

---

(۱) ڈار ، بشیر احمد ، سر سید کے مذہبی افکار (انگریزی) - ص ۲۴ - ۲۵ مطبوعہ لاہور ۱۹۵۷ء -

صاحب کی نبوت کی قائل ہے اور سیاسیات سے الگ تھلگ رہنے کو صحیح مسلک سمجھتی ہے ۔ لاہوری احمدی جماعت مرزا صاحب کو صرف مجدد مانتی ہے اور سیاسیات میں حصہ لیتی ہے ۔ دونوں جماعتیں جہاد بالسیف کے خلاف اور جہاد بالقلم و جہاد باللسان کی حامی ہیں ، یعنی تحریری اور زبانی تبلیغ کی قائل ہیں اور اس سمت میں سرگرمی سے مصروفِ عمل ہیں ۔

ایسٹ انڈیا کمپنی شروع شروع میں چونکہ صرف تجارت اور کاروبار سے تعلق رکھتی تھی اس لیے ہندوستان میں اس کی ابتدائی پالیسی یہ تھی کہ کسی قسم کے مذہبی پروپگنڈے یعنی تبلیغِ مسیحیت سے پرہیز کیا جائے ، لیکن جیسے جیسے کمپنی کا اثر و تسلط بڑھتا گیا ویسے ویسے اس کی پالیسی میں تبدیلی آتی گئی اور مشنری سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی شروع ہوئی ، کئی مشن اسکول کھولے گئے تاکہ ان کے واسطے سے مسیحی نظریۂ حیات اور عقائد کی تعلیم دی جائے اور اس طرح طالب علموں کو ذہنی طور پر تبدیلِ مذہب کے لیے تیار کیا جائے ۔ مشن کے یتیم خانے بھی کھولے گئے ، تاکہ نادار و محتاج بچوں کو ان میں رکھ کر عیسائی بنا لیا جائے ۔ یہ ترکیبیں خاصی کامیاب رہیں اور ۱۸۵۱ء کی مردم شماری کے مطابق برطانوی ہند میں تقریباً ایک لاکھ افراد عیسائی ہو چکے تھے ۔ ۱۸۵۷ء میں جنگِ آزادی ناکام ہوئی اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی جگہ برطانوی حکومت نے ہندوستان کی حکمرانی کی ذمے داری اپنے سر لے لی تو اگرچہ برطانوی مشنریوں کی یہ بات تو نہیں مانی گئی کہ برطانوی حکومت اپنے مقاصد میں تبلیغِ مسیحیت کو بھی کھلے طور پر شامل کر لے ، تاہم ملکہ وکٹوریہ کے اعلان میں اس امر کی طرف اشارہ ضرور تھا کہ وہ مسیحیت کی صداقت پر اعتقاد رکھتی ہیں اور آئندہ سے ہندوستان ایک مسیحی کی حکمرانی کے تحت رہے گا ۔

۱۸۶۰ء میں ہندوستان میں قحط پڑا تو اس وقت پھر مسیحی مشنریوں نے اس سے فائدہ اٹھایا اور نادار اور لا وارث بچوں کو اپنی تحویل میں لے کر عیسائی بنا لیا ۔ اب تبلیغی سرگرمیاں تیز تر ہو گئیں اور مذہب تبدیل کرنے والوں کو ہر طرح کی مالی ، اخلاقی اور تعلیمی امداد دی جانے لگی ۔ لڑکیوں کے لیے بھی مشن اسکول قائم کیے گئے اور ساتھ ہی متعدد شفاخانے اور علاج گھر قائم ہوئے جہاں مریضوں کو عیسایت کی تعلیم دی جاتی تھی ۔ ان باتوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۸۶۱ء میں ہندوستانی عیسائیوں کی تعداد ۱۸۵۱ء کے مقابلے میں ڈیوڑھی ہو گئی جو ۱۸۸۱ء تک چہار گنی ہو کر چار لاکھ سے متجاوز ہو گئی ۔ ۹۶ - ۱۸۹۷ء میں پھر قحط پڑا اور طاعون کی وبا پھیلی تو پھر مسیحی مشنریوں کی بن آئی ۔ غرض چونکہ حکومت ہی عیسائیوں کی تھی اس لیے عیسائیت کو

برابر فروغ ہوتا رہا ۔

ایک طرف مسیحی مشنریوں کی یہ عملی سرگرمیاں تھیں ، دوسری طرف ان کی تحریری و تقریری کارروائیاں تھیں جن میں ہندو مت اور اسلام کے عقائد و تعلیمات اور مذہبی راہنماؤں پر نکتہ چینیاں ہوتی تھیں تاکہ باشندگانِ ہند اپنے آبائی مذاہب سے بد دل ہو جائیں اور ذہنی طور پر مسیحیت قبول کرنے کے لیے تیار ہو جائیں ۔ اس کے ردِ عمل کے طور پر ہندوؤں میں اصلاحی تحریکات شروع ہوئیں جو شروع شروع میں تو مدافعانہ تھیں ، لیکن آگے چل کر جارحانہ بن گئیں ۔ مسلمانوں نے بھی اپنے مذہب اور مذہبی راہنماؤں کی مدافعت پر کمر باندھی ۔ عیسائی مشنری نہ صرف مدرسوں ، ہسپتالوں اور یتیم خانوں میں مسیحیت کا پرچار کرتے تھے بلکہ شاہراہوں اور چوکوں میں کھڑے ہو کر لیکچر دیتے ، پمفلٹ تقسیم کرتے ، مناظرے کی دعوتیں دیتے تھے ۔ ضروری تھا کہ جو ہتھیار یہ لوگ استعمال کرتے تھے ، انہی سے ان کا مقابلہ کیا جائے ۔ چنانچہ مولوی رحمت اللہ کیرانوی ، مولوی آل حسن اکبر آبادی ، ڈاکٹر وزیر خان اکبر آبادی ، مولوی محمد ناصر الدین ، مولانا محمد قاسم نانوتوی ، مولوی منصور علی دہلوی ، مولانا رحم علی منظوری ، مولانا عنایت رسول چڑیا کوٹی ، مولانا سید محمد علی مونگیری ، مرزا غلام احمد قادیانی ، مولوی ثناء اللہ امرتسری ، آغا حشر کاشمیری اور دوسرے بزرگوں نے اسی طرح ان کا مقابلہ کیا ، ان سے بالمشافہ مناظرے کیے ، ان کے مقابلے کے لیے کتابیں لکھیں ، پمفلٹ تقسیم کیے اور اس طرح عام مسلمانوں کو مشنریوں کے اثر سے بچایا ۔ مسیحی مبلغین جو مباحثوں ، مناظروں اور پمفلٹ بازیوں میں حصہ لیتے تھے یورپین بھی تھے اور دیسی عیسائی بھی ۔ ان میں پہلے تو ریورنڈ لی اور چارلس فورسٹر اور بعد کے دور میں ڈاکٹر فینڈر ، ماسٹر رامچندر ، پادری عماد الدین پانی پتی اور پادری رجب علی امرتسری کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں ۔

مباحثوں ، مناظروں سے ہٹ کر علمی انداز میں اسلام اور مسیحیت کا تقابلی مطالعہ کرنے اور خصوصیت سے اسلام و اکابر اسلام کے بارے میں عیسائیوں کے جو اعتراضات اور جو غلط فہمیاں تھیں انہیں دور کرنے کے لیے جن بزرگوں نے کام کیا ان میں سر سید احمد خان ، مولوی چراغ علی ، سید امیر علی ، صلاح الدین خدا بخش ، شبلی نعمانی اور حالی وغیرہ کا نام خصوصیت سے لیا جا سکتا ہے ۔ سر سید کی تصنیفات میں 'تبئین کلام' 'خطبات احمدیہ' ، 'تفسیر القرآن' ، رسالہ ابطال غلامی ، رسالہ 'احکام طعام اہل کتاب' ۔ اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں ۔ ان میں 'تفسیر القرآن' جدید علم کلام کی بنیاد ڈالنے والی تصنیف ہے ۔ کیونکہ اس میں سر سید نے قرآن کے تمام اندراجات کو عقل اور سائنس کے مطابق

ثابت کرنے کی کوشش کی ہے - مذہبی مباحث میں سر سید کے دست راست مولوی چراغ علی تھے - متعدد اردو رسائل و مضامین کے علاوہ جو رسائل چراغ علی کے نام سے شائع ہوئے ہیں ، انہوں نے دو اہم کتابیں انگریزی میں لکھیں جن کا ترجمہ 'تحقیق جہاد' اور 'اعظم الکلام فی ارتقاء الاسلام' کے نام سے اردو میں شائع ہوا - مولوی چراغ علی کی ایک اور قابل ذکر تصنیف 'مسلم حکومتوں کے تحت اصلاحات' کے موضوع پر انگریزی زبان میں ہے - سید امیر علی کی سیاسی ، قانونی اور فقہی خدمات بہت قابل قدر ہیں اور ان کے علاوہ 'تاریخ مسلمانان' اور 'روح اسلام' کے نام سے جو تصنیفات بزبان انگریزی ہیں وہ اسلام اور پیغمبر اسلام کے بارے میں عیسائیوں کی غلط فہمیوں کو دور کرنے کے لیے بہترین کتابیں ہیں - صلاح الدین خدا بخش نے بھی انگریزی میں اسلام کے بارے میں عالمانہ کتابیں لکھی ہیں - شبلی نعمانی کی تصنیفات 'علم الکلام' ، 'الکلام' ، 'سیرت النبی' ، 'الفاروق' ، 'الانتقاد علی التمدن الاسلامی' ، 'الجزیہ' ، وغیرہ اور حالی کی 'تافع المسلمین' سب کا انداز علمی ہے جن میں مناظرانہ قیل و قال ، حریفانہ تعصبات جوابی الزامات ، بد نما طعن و طنز ، سؤ تعبیر اور ناسزا سب و شتم کے بجائے اپنے دعووں کو دلنشین ، دلچسپ اور محققانہ طرز استدلال سے بیان کرنے کی کوشش نظر آتی ہے -

جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے - مسیحی مبلغین نے ہندو مت اور اس کے سماجی ڈھانچے پر نکتہ چینی شروع کی تو اس کے جواب میں ہندوؤں میں مدافعانہ انداز میں اصلاحی تحریکیں شروع ہوئیں جن میں برہمو سماج کے بانی راجا رام موہن رائے (م - ۱۸۳۳ء) ، دیوندر ناتھ ٹیگور (م - ۱۸۰۵ء) ، کیشب چندر سین (م - ۱۸۸۴ء) ، راما کرشنا (م - ۱۸۸٦ء) نے حصہ لیا - ان لوگوں کا رویہ جارحانہ نہیں تھا لیکن سوامی ووِکننندا (م - ۱۹۰۲ء) نے مدافعانہ و مصلحانہ رویہ ترک کر کے یہ دعویٰ کر دیا کہ ہندو ویدانت واحد ابدی مذہب ہے اور ساری دنیا کی نجات اسی میں ہے کہ وہ ہندو مت اختیار کرے - یہ جارحانہ عسکری انداز مول شنکر سوامی دیا نند سرسوتی (م - ۸۸۳ ء) کو بہت بھایا اور انہوں نے صرف زبانی و تحریری دعووں پر اکتفا نہ کر کے ۱۸۷۵ء میں آریا سماج تحریک شروع کر دی اور عیسائیت اور اسلام پر حملے کرنے لگے - ساتھ ہی ہندو مت کی تبلیغ شد و مد سے شروع کی . تاکہ نہ صرف جن لوگوں نے یہ دھرم چھوڑ کر اسلام یا مسیحیت قبول کر لی تھی انہیں واپس اسی دھرم میں لایا جائے بلکہ دوسرے مذاہب والوں کو بھی اپنا عقیدہ بدلنے پر راغب کیا جائے - سوامی دیا نند نے بت پرستی اور دیوتاؤں پر اعتقاد کو ویدوں کی تعلیم کے برخلاف قرار دیا - انہوں نے سوائے چار ویدوں کے اور کسی مذہبی کتاب کو مستند ماننے سے انکار کر دیا اور ہر قسم کی تاویل و تعبیر سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ دنیا کا سارا علم جن میں جدید علوم اور

ان کی ایجادات بھی شامل ہیں سب کا ذکر ویدوں میں موجود ہے ۔

سوامی دیا نند کی تعلیم و تلقین کا مطلب یہ نکلتا تھا کہ ہندوستان صرف ہندوؤں کے لیے ہے اور ہندوستان میں جتنے مذاہب ہیں انہیں یا تو ہندوستان سے نکال باہر کرنا چاہیے یا ہندو دھرم میں تبدیل کر دینا چاہیے ۔ سوامی دیانند نے ہندو مت کو بھی ایک مذہب بنا دیا ۔ اس سے پیشتر یہ تصور بالکل نہیں پایا جاتا تھا ۔ جہاں تک ہندو مت کو اس کی ابتدائی اصلی حالت میں دوبارہ زندہ کرنے کا تعلق تھا ۔ آریا سماج کے اس مقصد سے کسی کو شکایت کی گنجائش نہ تھی ۔ لیکن جب سوامی دیانند نے اس پر اکتفا نہ کر کے اسلام اور مسیحیت پر حملے شروع کر دیے اور یہ نا ر ندا کیا کہ بقائے باہمی خارج از بحث ہے تو لازماً عیسائی اور مسلمان علماء و مبلغین سے آویزش ہوئی ۔ مناظرے مباحثے اور مقابلے منعقد ہونے لگے ۔ تحریر و تقریر ہر دو ذریعوں سے کام لیا گیا ۔ مسلمانوں کی طرف سے مولوی چراغ علی ، مولانا محمد قاسم نانوتوی ، مولوی منصور علی دہلوی ، مرزا غلام احمد قادیانی، مولوی ثناء اللہ امرتسری وغیرہ نے آریا سماجیوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا وہ آریا سماجی کارکن معاشرے اور نوجوانوں کے ذہن کو متاثر کرنے کے لیے تعلیم کی اہمیت سے خوب واقف تھے چنانچہ انہوں نے کئی سکول اور کالج بھی قائم کیے جہاں اپنے خیالات کو عام کیا ۔ اس طرح اپنی تبلیغی سرگرمیوں اور مسلم دشمن جارحانہ کارروائیوں سے آریا سماج تحریک نے مسلمانوں اور ہندوؤں کے مابین خلیج کو وسیع تر کر دیا اور ہندو مسلم کشیدگی میں خاصا اضافہ ہو گیا ۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ہندو مسلم اختلافات انگریزوں کے ہندوستان میں عمل دخل سے پہلے نہیں پائے جاتے تھے اور انگریزوں کی حکمت عملی ''لڑاؤ اور حکومت کرو'' کے تحت پیدا کیے گئے ۔ لیکن تاریخ ہند کے مطالعے سے ظاہر ہوگا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں مغائرت بہت پرانی ہے ، ہاں یہ درست ہے کہ اس مغائرت میں شدت اور وسعت پیدا کرنے میں انگریزی حکمت عملی کا بڑا حصہ رہا ۔ انگریزوں کے تسلط سے قبل ہندوؤں اور مسلمانوں کا باہمی تعلق محکوم اور حاکم کا تھا لیکن انگریزوں کی حکومت قائم ہونے اور جنگ آزادی کے ناکام ہو جانے کے بعد ہندو اور مسلمان ہر دو کی حیثیت محکوم کی ہو گئی اور دونوں طبقوں کو نئی حکمران طاقت ، اس کی زبان ، اس کی تہذیب و تمدن اور اس کے اقدار سے اپنے آپ کو مطابق کرنا پڑا ۔ حکمرانوں نے کبھی اس طبقے کا ساتھ دیا کبھی اس طبقے کی پیٹھ ٹھونکی اور اس طرح ہندو مسلم تنازع نے غیر ملکی حکومت کے تحت پہلے اقتصادی و تعلیمی اور پھر سیاسی ترقی و برتری کے لیے مسابقت و مقابلے کی شکل اختیار کر لی ۔ ہندو اکثریتی طبقے نے اپنی عددی برتری کے زعم میں

مسلم اقلیتی طبقے پر ہر پہلو سے حملے کر کے اس کی پوزیشن کمزور کرنے اور اس کے حوصلے پست کرنے کی کوشش کی، جس کے نتیجے میں مسلمانوں کو اپنی بقاء و استحکام کے لیے مدافعتی اقدامات کرنے پڑے۔ پنجاب میں آریا سماج، بنگال میں گیتا اور کالی دیوی مہاراشٹر میں گنیس پوجا کی جوش انگیز تحریکیں چلنے لگیں۔ ہندو صحافی بھی مسلم دشمن جذبات بھڑکانے میں مصروف ہو گئے اور ہندو مصنفین نے بھی اس غرض کے لیے کتابیں لکھنی شروع کیں مثلاً بنکم چندر چٹرجی نے ۱۸۷۴ء میں 'آنند مٹھ' کے نام سے ایک ناول لکھا جس میں بندے ماترم والا ترانا بھی تھا۔ اردو کو ہٹا کر ہندی رائج کرنے اور گاؤ کشی کو روکنے کی تحریکیں جاری ہوئیں۔ غرض ہندو مسلم کشیدگی برابر بڑھتی ہی گئی۔ مسلمان اپنے ہندو ابنائے وطن سے برابر دور ہوتے گئے اور مسلم قومیت کی تشکیل جداگانہ صورت میں ہونے لگی۔ ۱۹۰۹ء میں جداگانہ انتخابات منعقد کرا کے انگریزوں نے بھی یہ حقیقت تسلیم کر لی کہ مسلمان بحیثیت ایک قوم کے ہندوؤں سے علیحدہ اپنا وجود رکھتے ہیں۔

سیاسیات میں الجھنے سے پہلے مسلمانوں کی دلچسپی تمام تر مذہب، تعلیم اور علم و ادب کی طرف مبذول رہی۔ علم و ادب کا جو چسکا مغلیہ دور میں شہروں کے رہنے والے خاص و عام میں پیدا ہو گیا تھا وہ انگریزوں کے دور میں بھی برابر قائم رہا اور اس کا اظہار ملک کے مختلف گوشوں میں علمی و ادبی انجمنوں کے قیام کی شکل میں ہوا۔ گارساں دتاسی کے خطبات سے ایسی بیسیوں انجمنوں کا علم ہوتا ہے۔ سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی اور لاہور کی 'انجمن پنجاب' سے تو لوگ عام طور پر واقف ہیں لیکن دوسری انجمنیں اتنی معروف نہیں ہیں حالانکہ انھوں نے بھی اپنے وقت میں اچھا خاصا کام کیا ہے۔ دہلی سوسائٹی ۱۸۶۵ء میں وجود میں آئی جس کے جلسوں میں اکثر دلچسپ مقالے پڑھے جاتے تھے اور بصیرت افروز مباحثے ہوتے تھے۔ ان کارروائیوں کا خلاصہ انجمن کے ماہنامے میں شائع ہوتا تھا۔ اسی طرح لکھنو میں 'انجمنِ تہذیب'، میرٹھ میں 'انجمنِ مباحثہ'، مظفر پور اور بہار میں 'سائنٹفک سوسائٹی'، شاہجہانپور میں 'انجمنِ شاہجہانپور' اور اسی ہی انجمنیں اٹاوہ، بنارس، بدایون، مراد آباد اور الہ آباد میں قائم ہوئیں۔ مغل سرائے، نینی تال، بٹالہ، ور گونڈہ، عرب سرائے اور گوجرانوالہ، پشاور اور جالندھر وغیرہ کی انجمنوں کا بھی گارساں دتاسی نے ذکر کیا ہے۔ ان میں سے بہت سی انجمنیں ایسی تھیں جن کا اپنا رسالہ بھی نکلتا تھا۔ اردو صحافت پر تحقیقی کام کرنے والوں نے ایسے بہت سے رسالوں کا ذکر کیا ہے، مثلاً زمرۂ احباب منگلور، انجمن مذاکرۂ علمیہ پٹنہ، انجمن تہذیب کانپور، انجمن اسلامی کلکتہ، انجمن رفاہ گونڈہ، انجمن مناظرہ دہلی، انجمن اسلام لکھنؤ، انجمن اسلام جبل پور، انجمن

---

(۱) دتاسی، گارساں، مقالات گارساں دتاسی، حصہ دوم - ص ۸۹-۹۰، مطبوعہ دہلی ۱۹۴۳ء -

علمی بدایوں ، انجمن عمل افروز رنلام ، انجمن رفاہ عام لدھیانہ ، انجمن فیضان عام گجرانوالہ ، انجمن احباب مدراس ، انجمن درخشاں بمبئی ، مجلس اسلامیہ میرٹھ ، انجمن حمایت اسلام لاہور وغیرہ کے اپنے اپنے رسالے نکلتے تھے ۔ ان میں کئی انجمنیں ایسی تھیں جو علمی و ادبی سرگرمیوں کے علاوہ مذہبی اور سماجی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیتی تھیں ۔ ۱۸۷۳ء میں قصبہ قصور میں ایک ادبی ، علمی ، معاشرتی ، تعلیمی اور اصلاحی انجمن ' انجمن مفید عام ' کے نام سے قائم ہوئی ۔ اس کا بھی ایک ماہانہ رسالہ شائع ہوتا تھا ۔ سرسید ، حالی اور محمد حسین آزاد کے بہت سے مضامین اس رسالے میں شائع ہوئے ۔

سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی ۱۸۶۳ء میں قائم ہوئی جب کہ وہ غازی پور میں تعینات تھے ۔ اس سوسائٹی کا مقصد یہ تھا کہ مغربی علوم ترجمہ و تالیف کے ذریعے سے ہندوستان میں رائج کیے جائیں ۔ جب اگلے سال سرسید کا تبادلہ علی گڑھ ہو گیا تو یہ سوسائٹی بھی وہاں منتقل ہو گئی ۔ یہاں سوسائٹی نے غیر معمولی ترقی کی ۔ ایک مستقل عمارت اس کے لیے تعمیر ہو گئی ، بڑا مطبع قائم ہو گیا اور تھوڑے ہی عرصے میں متعدد کتابیں مختلف علوم وفنون کی ترجمہ ہو کر اردو میں شائع ہو گئیں ۔ سوسائٹی کا ایک اخبار بھی جاری کیا گیا ۔ سرسید کی زندگی میں ۳۲ برس تک وہ بہت باقاعدہ وقت پر نکلتا رہا ۔ خود سرسید نے اس کی ادارت کا کام سنبھالا اور تعلیمی ، سیاسی اور تمدنی موضوعات پر اپنے افکار و آراء کا اظہار شروع کر دیا ۔ اخبار میں انجمن کے جلسوں کی علمی تقریریں چھاپی جاتی تھیں ، ہندوستان اور باہر کی خبریں سلیقہ مندی اور صحت کی پابندی سے شائع ہوتی تھیں ۔ یہ پہلے ہفت روزہ تھا بعد میں سہ روزہ ہو گیا ۔ سائنٹفک سوسائٹی سرسید کی قائم کردہ پہلی جماعتی تنظیم تھی اور ان کے بعد والی ہمہ گیر تحریک کی طرف پہلا عملی اقدام تھا ۔

جیسا کہ پہلے ذکر ہوا ۱۸۶۴ء میں گورنمنٹ کالج لاہور قائم ہو چکا تھا اور اس کے پرنسپل ڈاکٹر جی ڈبلیو لائٹنر مقرر ہوئے تھے ۔ وہ ایک ممتاز ماہرِ لسانیات تھے اور علومِ مشرق سے بھی دلچسپی رکھتے تھے ۔ انھوں نے لاہور میں ایک انجمن کی بنیاد ڈالی تا کہ علومِ مفیدہ کی اشاعت کی جائے ، ادبی اور علمی دلچسپی کے موضوعات پر بحث مباحثے کیے جائیں اور سماجی اور سیاسی مسائل پر دیسی افراد کو اپنی رائے ظاہر کرنے کے لیے ایک پلیٹ فارم فراہم کیا جائے ۔ اس انجمن نے سارے صوبہ پنجاب میں مقبولیت حاصل کی ۔ اس کے زیرِ اہتمام ایک کتب خانہ کھولا گیا جس سے ہر کوئی بلا معاوضہ استفادہ کر سکتا تھا ، ایک کمرۂ مطالعہ قائم ہوا اور عام دلچسپی کی تقریریں اور شعراء سے ان کا کلام بھی سنوایا جانے لگا[1] ۔ یہ انجمن جنوری ۱۸۶۵ء میں ' انجمن اشاعت مطالبِ مفیدہ پنجاب '

---

(۱) تاریخ تحریک آزادی ، جلد دوم ، حصہ دوم ۔ ص ۵۴۸ ، مطبوعہ کراچی ۱۹۶۱ء ۔

کے نام سے قائم ہوئی تھی لیکن 'انجمنِ پنجاب' کے نام سے مشہور ہوئی ۔ مولانا محمد حسین آزاد جو اس زمانے میں ناظمِ تعلیمات پنجاب کے دفتر سے منسلک ہو چکے تھے اس انجمن کے سرگرم کارکن تھے ۔ 'انجمنِ پنجاب' کو ابتداء ہی سے سرکاری حکام کی سرپرستی حاصل تھی ۔ اس انجمن کے ایک اجلاس میں جو اگست ۱۸۶۷ء میں منعقد ہوا محمد حسین آزاد نے ایک لیکچر ''خیالات در باب نظم اور کلام موزوں کے'' دیا تھا جسے بعض نقادوں نے جدید شعری تحریک کا نقطہ آغاز قرار دیا ہے[1] ۔

اس زمانے میں پنجاب کے سرکاری مدارس میں اردو کی جو کتابیں پڑھائی جاتی تھیں انہیں دیکھ کر نفٹنٹ گورنر پنجاب نے یہ خیال ظاہر کیا کہ ان میں نظمیں بالکل نہیں ہیں اور یہ خواہش ظاہر کی کہ سرکاری مدارس کے ذریعے دیسی نظم کا رواج ہو جائے تو بڑی اچھی بات ہو ۔ گورنر کی اس خواہش نے پنجاب کے ناظمِ تعلیمات میجر ہالرائڈ کو (جو بعد میں کرنل بن گئے ، اردو نظم کے سلسلے میں ایک تحریک شروع کرنے پر آمادہ کیا اور انہوں نے اس بارے میں محمد حسین آزاد کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانا طے کیا ۔ چنانچہ 'انجمنِ پنجاب' کے جلسے میں جو ۸ مئی ۱۸۷۴ء[2] کو منعقد ہوا ، آزاد نے جدید نظم کے بارے میں ایک لیکچر دیا اور کہا ''نئے انداز کے خلعت و زیور جو آج کے مناسب حال ہیں وہ انگریزی صندوقوں میں بند ہیں ، انہوں نے اپنی ایک مثنوی بھی سنائی جو 'شام کی آمد' اور 'رات کی کیفیت' پر مثنوی کی عام مروجہ بحروں سے ہٹ کر لکھی گئی تھی ۔ اسی جلسے میں آزاد کی تقریر اور نظم کے بعد ہالرائڈ نے تقریر کی اور یہ تجویز پیش کی کہ جس طرح ہر شہر میں عموماً شاعری ہوا کرتی ہے آپ بھی ایک مشاعرہ کیا کریں مگر اتنا ہو کہ یہاں بجائے مصرع طرح کے کوئی موضوع دیا جائے ، جس پر سب لوگ طبع آزمائی کیا کریں اور جلسہ عام میں سنایا کریں[3] ۔ ہالرائڈ نے مقامی جلسے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ آزاد کی مثنوی اور لیکچر کی نقلیں ہندوستان کے دوسرے صوبوں کے تعلیمی محکموں میں بھی بھجوائیں اور ساتھ ہی ساتھ یہ درخواست کی کہ انہیں چھپوا کر مدارس میں تقسیم کر دیا جائے تاکہ وہاں بھی اس نئی قسم کی شاعری کی بنیاد ڈالی جا سکے یا کم از کم اساتذہ کو جدید شاعری پر اظہارِ خیالات کا موقع ملے ۔ نئے انداز کا پہلا مشاعرہ ۳۰ مئی ۱۸۷۴ء کو منعقد ہوا جس کا موضوع ہالرائڈ کی تجویز کے مطابق برسات تھا[4] ۔ حالی نے اپنی نظم 'برکھا رت' اسی مشاعرے میں سنائی ۔ اس کے بعد موضوعی

---

(۱) موہن سنگھ دیوانہ ڈاکٹر ، بحوالہ سروری ، عبدالقادر ، جدید اردو شاعری ۔ ص ۶۷ ۔

(۲) بقول غلام حیدر نثار و آغا محمد باقر ، بحوالہ اسلم فرخی ، محمد حسین آزاد ، جلد اول ۔ ص ۲۳۳ ، مطبوعہ کراچی ۱۹۶۵ء ۔

(۳) اسلم فرخی ، محمد حسین آزاد ، جلد اول ۔ ص ۲۳۸ ۔

(۴) ایضاً ۔ ص ۲۵۲ ۔

مشاعروں کا سلسلہ شروع ہو گیا اور مارچ ۱۸۷۵ء تک 'زمستان'، 'امید'، 'حبِ وطن'، 'امن'، 'انصاف'، 'مروت'، 'قناعت' اور تہذیب کے موضوع پر مشاعرے ہوئے۔ شخصی اور مقامی مخالفتوں کے باوجود جدید شاعری کی تحریک عام ہونے لگی ۔ لکھنؤ، میرٹھ اور دہلی میں بھی اس قسم کے مشاعرے منعقد ہوئے ۔ جدید شاعری کی یہ تحریک نہ صرف مصرع طرح کے بجائے موضوعی مشاعرے منعقد کرنے کی تحریک تھی بلکہ فرضی، خیالی، رسمی و روایتی عشقیہ مضامین اور مبالغہ آمیز خیالات کو چھوڑ کر ہر قسم کے فطری و حقیقی جذبات و مشاہدات کو سادگی و صفائی سے پیش کرنے کی تحریک بھی تھی ۔ جسے اس زمانے میں نیچرل شاعری کے نام سے یاد کیا گیا ۔ چنانچہ سر سید نے یکم محرم ۱۲۹۲ھ مطابق ۷ فروری ۱۸۷۵ء کے 'تہذیب الاخلاق' میں لکھا ۔ ''اردو زبان کے علم و ادب کی تاریخ میں ۱۸۷۴ء کا وہ دن جب لاہور میں نیچرل پوئٹری کا مشاعرہ ہوا ہمیشہ یادگار رہے گا''[1] ۔ حالی نے بھی اس کی توثیق کی کہ ''اس مشاعرے کا مقصد یہ تھا کہ ایشیائی شاعری جو کہ در و بستِ عشق اور مبالغے کی جاگیر ہو گئی ہے اس کو جہاں تک ممکن ہو وسعت دی جائے اور اس کی بنیاد حقائق و واقعات پر رکھی جائے''[2] ۔

نظم اردو کے مشاعروں کو عام طور پر 'انجمنِ پنجاب' کے مشاعروں کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، کیونکہ یہ انجمن کی عمارت میں منعقد ہوتے تھے اور انجمن کے رسالے میں ان کی روداد چھپتی تھی، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ یہ مشاعرے پنجاب کے محکمۂ تعلیم کے زیرِ اہتمام ہوتے تھے اور جب محکمۂ تعلیم کے ارباب حل و عقد نے لفٹنٹ گورنر کی خوشنودی مزاج حاصل کرنے کا مقصد پورا ہو جانے کے بعد ان مشاعروں سے اغماض برتا تو یہ بند ہو گئے ۔

حاکم قوم محکوم قوم کو زندگی کے ہر شعبے میں متاثر کرتی ہے چنانچہ ہندوستان پر انگریزوں کے تسلط کا اثر اہلِ ہند کی ادبی، علمی، مذہبی، تعلیمی، فکری و سیاسی زندگی ہی پر نہیں بلکہ معاشرتی و تمدنی زندگی پر بھی پڑا ۔ انگریزوں کی برتری سے متاثر ہو کر بعض لوگ تو اس حد تک چلے گئے کہ کہنے لگے سوائے مذہب کے ہر چیز میں انگریز بن جانا چاہیے ۔ سر سید کی تحریک اصلاح و ترقی اگرچہ اس حد تک نہیں گئی لیکن اس کے قریب قریب ضرور پہنچ گئی ۔ صرف انگریزوں کی طرح عام مردوں، عورتوں کے باہمی میل جول اور عورتوں کی آزادی کے وہ خلاف تھے اور اسلامی تعلیمات کے لحاظ سے پردے کی جو حدود ہیں انہیں برقرار رکھنے کے حامی تھے، نیز عورتوں کے لیے جدید تعلیم کو

---

(۱) اسلم فرخی، محمد حسین آزاد، جلد اول - ص ۲۸۰ -

(۲) عبادت بریلوی، جدید شاعری - ص ۱۲۰، مطبوعہ لاہور ۱۹۶۱ء -

وہ نا مناسب سمجھتے تھے اور پرانے طریقہ تعلیم کی سفارش کرتے تھے ۔ اس کے علاوہ وہ لباس میں ترکی ٹوپی کے حامی تھے ۔ باقی باتوں میں وہ انگریزوں کے تمدن و معاشرت کو اختیار کرنے کے حق میں تھے ۔ سر سید کا کہنا تھا کہ ''ہم بلاشبہ اپنی قوم کو اپنے ہموطنوں کو سویلائزڈ قوم کی پیروی کی ترغیب کرتے ہیں مگر ان سے یہ خواہش رکھتے ہیں کہ ان میں جو خوبیاں ہیں اور جن کے سبب وہ معزز اور قابلِ عمل سمجھی جاتی ہیں اور سویلائزڈ شمار ہوتی ہیں ان کی پیروی کریں ، نہ ان کی ان باتوں کی جو ان کے کمال میں نقص کا باعث ہیں'' ۔ سر سید مغرب اور مغربی تہذیب کا عروج دیکھتے تھے ، اپنی پستی دیکھتے تھے تو چاہتے تھے کہ ہم بھی مغرب کی طرح معزز اور مہذب ہو جائیں ۔ لیکن ان کی تحریک میں مغربیت کے غلو سے جس طوفان کے دروازے کھلے اور جو ہیجان و ہنگامہ برپا ہوا اس کی طاقت ، اس کے جوش اور اس کے غیر تعمیری اثرات کا خود سر سید کو اچھی طرح اندازہ نہ تھا ۔ جدید تعلیم اور مغرب کی تقلید کے مضر اثرات کو اکبر الہ آبادی ، شبلی ، 'اودھ پنچ' کے لکھنے والوں اور ایک حد تک نذیر احمد نے اجاگر کیا اور اس طرح مغربی علوم و افکار ، مغربی تہذیب و معاشرت ، مغربی طرزِ احساس و عمل سے جو شدید مرعوبیت پیدا ہو رہی تھی اس کے سیلاب کو روکنے کی کوشش کی ۔ اس طرح جدید اور قدیم کی کشمکش معاشرتی تصورات میں بھی شروع ہو گئی ۔

سر سید نے لباس ، طریقِ خورد و نوش ، طرزِ بود و ماند وغیرہ میں نہ صرف مغربی انداز اختیار کرنے کا اوروں کو مشورہ دیا بلکہ خود بھی ان طریقوں پر عمل شروع کر دیا ۔ سر سید کے رفیقِ کار مولوی ذکاء اللہ نے ان کی تحریک کے جواز میں لکھا ''قاعدہ ہے کہ جب ایک قوم دوسری قوم کی محکوم ہو جاتی ہے تو محکم قوم کی عزت و آبرو اسی قدر بڑھ جاتی ہے جس قدر کہ وہ شایستگی میں علم و فضل و لیاقت میں حاکم قوم کے ساتھ مماثلت پیدا کرتی ہے اور اتنی ہی ذلت بڑھ جاتی ہے جتنی کہ وہ مباننت کرتی ہے''[1] ۔ اسی طرح خود سر سید کہتے تھے ''جب ترک اپنی ہمسایہ قوموں فرنچ اور انگریزوں میں مل کر بیٹھتے ہیں تو ہمجولی معلوم ہوتے ہیں اور امید ہے کہ روز بروز اور زیادہ مہذب ہوتے جائیں گے ، پس ہندوستان کے مسلمانوں سے بھی ہم یہی چاہتے ہیں کہ اپنے تعصبات اور خیالاتِ خام کو چھوڑ دیں اور تربیت و شایستگی میں قدم بڑھائیں''[2] ۔

شروع شروع میں تو کوٹ پتلون پہننے ، میز پر بیٹھ کر چھری کانٹے سے کھانا کھانے اور بود و ماند کے دوسرے مغربی طریقوں کے خلاف بڑا ردِّ عمل ہوا لیکن آہستہ آہستہ یہ سب باتیں قبول کر لی گئیں ۔ بہت سی معاشرتی خرابیاں جن پر عرصے سے مصلحین

---

(۱) امین زبیری تذکرۂ سرسید ۔ ص ۴۶ ، ۴۷ ۔

(۲) طفیل احمد ، مسلمانوں کا روشن مستقبل ۔ ص ۲۰۴ ، ۲۰۵ ۔

توجہ دلا رہے تھے مغربی تہذیب و تمدن کے اثرات بڑھنے پر نظروں میں اور بھی زیادہ کھٹکنے لگیں اور زیادہ زیر بحث آنے لگیں مثلاً بیواؤں کے نکاح کا مسئلہ ، خوشی اور غمی کے موقعوں پر رسومات میں اصراف نہ کرنے کا مسئلہ ، تعداد ازواج کا مسئلہ وغیرہ۔ لڑکیوں کی تعلیم کا مسئلہ بھی زیر بحث آیا ۔ مغربی اثرات نے زبان کو بھی متاثر کرنا شروع کیا اور لکھنے اور بولنے میں انگریزی الفاظ کا استعمال بہت بڑھ گیا ۔ یوں تو نئی تہذیب ، نئی تعلیم ، نئے افکار و تصورات اور نئی چیزیں اپنے ساتھ نئے الفاظ اور نئی زبان لاتی ہی ہیں اور یہ بالکل فطری امر ہے لیکن مغرب کی سیاسی و علمی تفوق نے ذہنوں کو اس قدر مرعوب کر دیا کہ جہاں ضرورت نہ ہوتی وہاں بھی انگریزی الفاظ ہی استعمال کیے جانے لگے ۔ مرعوبانہ ذہنیت کے علاوہ اس میں نمائش پسندی کا عنصر بھی شامل تھا کہ سننے یا پڑھنے والوں کو یہ بتایا جائے کہ بولنے یا لکھنے والا انگریزی کے نا بلد نہیں ہے ۔ مثلاً لائف ، بائیوگریفی ، پوئٹری ، سپیچ ، ایجیٹیشن وغیرہ ایسے الفاظ نہیں ہیں کہ ان کے مترادف اردو میں موجود نہ ہوں لیکن پھر بھی اچھے اچھے اہلِ زبان اور اہلِ قلم (جیسے سر سید ، حالی ، نذیر احمد وغیرہ) یہ الفاظ اپنی عبارتوں میں برتتے تھے ۔

قدیم جاگیرداری نظام کو ۱۸۵۷ء کی ناکام تحریک آزادی نے جو ضرب لگائی تھی اس سے برطانوی ہند میں پرانی اشرافیہ کو قریب قریب نابود کر دیا اور انگریزی حکومت کی حکمتِ عملی نے ایک نئی اشرافیہ کو جنم دیا جس کے ارکان نئی حکومت کے ساختہ پرداختہ تھے اور حکومت کے اشارے پر چلتے تھے ۔ اس طبقے میں بڑے بڑے وثیقہ خوار ، تعلقدار اور جاگیردار تھے جنھیں انگریزوں نے نوازا تھا لیکن جن کی تاریخی روایات قدیم جاگیرداری نظام سے کوئی تعلق نہ رکھتی تھیں ۔ قدیم جاگیرداری نظام میں آرٹ اخلاق ، سیاست ، تہذیب غرض زندگی کے ہر شعبے کے امین ، امرا ، نواب ، بادشاہِ وقت اور ان کے مقربین ہوتے تھے جب کہ غیر اشرافی طبقے والے یعنی پیشہ ور ، مزدور ، کاشتکار ، صناع ، سپاہی وغیرہ زندگی کی آبیاری کے لیے اپنے آقاؤں کے دست نگر تھے ۔ جب انگریزوں کی حکومت نے قدیم نظام کا خاتمہ کیا تو ایک تیسرا طبقہ ایسا وجود میں آیا جو نہ اشرافیہ میں شمار ہو سکتا تھا نہ پیشہ ور نچلے طبقے میں گنا جا سکتا تھا ۔ یہ متوسط طبقہ ۱۸۵۷ء کے بعد سارے معاشرے پر چھانے لگا اور اخلاق ، سیاست ، تہذیب ، آرٹ ، معاشرت ، مذہب غرض زندگی کے ہر شعبے میں قیادت سنبھالنے لگا ۔ اس طبقے میں وہ نئے تعلیم یافتہ لوگ بھی تھے جو حکومت کے ملازم ضرور تھے لیکن اسے ظلِ سبحانی نہیں جانتے تھے ، وہ لوگ بھی تھے جو نوابین سے وابستہ تھے لیکن اب انہیں آقا نہیں سمجھتے تھے ، وہ بھی تھے جنھوں نے وکالت ، صحافت ، تدریس ، ڈاکٹری علم و ادب ، اصلاحِ معاشرت وغیرہ مشاغل کو اپنایا تھا ۔ یہ طبقہ مغرب سے خاصا

متاثر تھا ۔ مغربی ادب ، مغربی، تاریخ ، مغربی فلسفہ ، مغربی سیاست ، مغربی جمہوری تصورات ، مغربی اصلاح معاشرت کی کوششوں اور اصلاح مذہب کی تحریکوں کا علم رکھتا تھا کیونکہ اس نے زیادہ تر مغربی تعلیم پائی تھی ۔ اسی متوسط طبقے نے نئے معیار ، نئے اقدار، نئے افکار و تصورات سے ہندوستان کو وسیع پیمانے پر روشناس کرایا ۔ نتیجے کے طور پر یہ سوالات اہل ہند کے ذہنوں میں گردش کرنے لگے کہ آیا جدید اقدار و افکار کو یکسر مسترد کر دیا جائے یا انہیں عیناً قبول کر لیا جائے یا انہیں قوم کے ساتھ ترکیب دے کر کوئی درمیانی راہ نکالی جائے ۔ مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں قوموں میں تین مکاتب فکر پیدا ہو گئے ۔ پرانی تہذیب و روایات و اقدار کے علمبردار جو ہر نئی چیز کو مسترد کرتے تھے ، نئی روشنی کے دلدادہ جو ہر پرانی چیز کو مسترد کرتے تھے ، اور مفاہمت کرنے والے جو قدامت میں جدت کا پیوند لگا کر زمانے کا ساتھ دینا چاہیے تھے ۔ اور اپنے مفاہانہ رویے کی وجہ سے قدامت پرست اور جدت پرست ہر دو حلقوں میں غیر مقبول تھے ۔

نئی روشنی نے عقلیت ، تجربیت ، مادیت اور اینجہانیت کی جو راہ سمجھائی تھی اس کا اثر مذہبی عقائد پر کیسے نہ ہوتا ۔ نئے تعلیم یافتہ طبقے میں روحانیت و مذہب کی طرف رجحان کم ہوتا گیا اور معیشت و سیاست کی طرف زیادہ ۔ اور قدامت پرستوں کو نئی روشنی کے خلاف کہنے سننے کے لیے ایک اور دلیل یہ مل گئی کہ اس سے مذہبی بے اعتنائی پیدا ہوتی ہے ۔

جدید تعلیم یافتہ طبقہ تھیٹر ، رقص اور موسیقی کی سرپرستی کو تہذیب و تمدن کا لازمہ سمجھتا تھا کیونکہ مغربی انداز فکر یہی تھا ۔ اس کے برخلاف قدامت پرست لوگ موسیقی اور رقص کی محفلوں میں شرکت کو برا سمجھتے تھے اور تھیٹر سے احتراز کرتے تھے کہ یہ سب لہو و لعب کی صورتیں ہیں ۔ قدیم جاگیرداری نظام کے خاتمے سے آداب معاشرت و آداب مجلس میں تبدیلی پیدا ہو گئی ۔ رسمی تکلفات و تصنعات کی جگہ سادگی نے لے لی ۔ بیویوں کو ساتھ لے کر مخلوط محفلوں میں جانا معیوب نہ رہا ۔ داڑھی مونچھوں کا صفایا ہونے لگا ۔ مکانات کی تعمیر کا قدیم انداز ترک ہونے لگا جس میں عورتوں کا حصہ الگ ہوا کرتا تھا اور مردوں کا الگ ۔ مغربی انداز کے گھر بننے لگے ۔ دالانوں نے برآمدوں کی شکل اختیار کر لی ، مکان کو چاروں طرف سے گھیرنے والی اونچی دیواریں غائب ہونے لگیں ۔ نئے انداز کے باورچی خانے اور غسل خانے بننے لگے ۔ انگریزی طرز کا فرنیچر اور ساز و سامان استعمال ہونے لگا ۔

غرض یہ کہ انگریزی حکومت ہندوستان میں کیا آئی کہ نظام ریاست ، نظم عدالت

مواصلات ، انتظامی مشینری ، پولیس ، طب ، حفظانِ صحت ، صنعت ، تجارت ، معیشت ، تعلیم ، علوم ، فنون ، افکار و اقدار ، اخلاق ، معاشرت ، تہذیب ، ثقافت ، ادبیات ، زبان ، رسوم و رواج ، عقائد ہر چیز مغرب کے رنگ میں رنگی جانے لگی اور قدامت نے انگریزی اثرات سے بچنے کے لیے جو بند باندھے وہ سب بیکار ثابت ہوئے ۔ ہندوستان عہد وسطیٰ سے نکل کر عہد جدید میں داخل ہو گیا ۔ ابن ...دستان و ہند کے طرزِ فکر ، طرزِ احساس اور طرزِ عمل میں تبدیلی آئی ۔ وطنیت و قومیت کا احساس ، جمہوریت کا تصور ، آزادی، اظہار و آزادی رائے اور بنیادی انسانی حقوق کا تصور ، سائنس اور ٹیکنالوجی میں دلچسپی ، قانون کی برتری کا خیال ، دنیوی و مادی زندگی در مقابلہ اخروی زندگی کے خاطر نظر انداز نہ کرنے کا رویہ ، عقلیت و تجربیت کی اہمیت ، مذہب کو تمام زندگی پر محیط کرنے کے بجائے صرف عقائد اور خدا کے ... ایک ذاتی رشتہ ... دینے کا رویہ ، تشکک اور قدیم روایات و رسوم و ... قبول نہ کرنے کا رجحان ، صنعت و حرفت کی ترقی ... ترقی ... و جامد ... و معاشرتی نظام کے فرسودہ و ناکارہ ہونے کا خیال ... انگریزی ... کہ مغربی اثرات کی رہین منت ہیں اور ۱۸۵۷ء کے بعد عام ہوئی ہیں ۔ ان میں کونسی چیزیں مستحسن ہیں اور کونسی غیر مستحسن اس کا فیصلہ ہر شخص اپنے مخصوص تصورات اور اقدار کی روشنی میں کرتا ہے ۔

(کتابیات)

(اردو)

۱ ۔ ابوالحسن علی ندوی ، سید ، ہندوستانی مسلمان ، لکھنؤ ۱۹۶۱ء ۔

۲ ۔ اردو انسائکلوپیڈیا ، لاہور ۱۹۶۲ء ۔

۳ ۔ اسلم فرخی ، محمد حسین آزاد ، کراچی ۱۹۵۵ء ۔

۴ ۔ اکرام ، شیخ محمد ، ثقافتِ پاکستان ، کراچی ، سن اشاعت درج نہیں ۔

۵ ۔ اکرام ، شیخ محمد ، رودِ کوثر ، لاہور ۱۹۵۸ء ۔

۶ ۔ اکرام ، شیخ محمد ، موجِ کوثر ، لاہور ۱۹۵۸ء ۔

۷ ۔ امداد صابری ، فرنگیوں کا جال ، دہلی ۱۹۴۹ء ۔

۸ - امین زبیری ، محمد ، تذکرۂ سر سید ، لاہور ، سن اشاعت درج نہیں -
۹ - جذبی ، معین احسن ، حالی کا سیاسی شعور ، لکھنؤ ۱۹۵۹ء -
۱۰ - جعفری ، رئیس احمد ، بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد ، لاہور ، سن اشاعت درج نہیں -
۱۱ - جعفری ، رئیس احمد ، سیرت محمد علی ، لاہور ۱۹۵۰ء -
۱۲ - حالی ، الطاف حسین ، حیات جاوید ، لاہور ۱۹۵۷ء -
۱۳ - حالی ، الطاف حسین ، مقالات حالی ، علی گڑھ ۱۹۵۷ء -
۱۴ - حیدر ، کمال الدین ، قیصر التواریخ ، ۱۸۹۶ء -
۱۵ - رضوی ، خورشید مصطفیٰ ، جنگ آزادی ۱۸۵۷ء ، دہلی ۱۹۵۹ء -
۱۶ - خورشید ، عبد السلام ، صحافت پاکستان و ہند میں ، لاہور ۱۹۶۳ء -
۱۷ - دتاسی ، گارساں ، مقالات گارساں دتاسی ، اورنگ آباد دکن ۱۹۳۵ء -
۱۸ - دتاسی ، گارساں ، مقالات گارساں دتاسی ، دہلی ۱۹۴۳ء -
۱۹ - ذکاء اللہ ، تاریخ عروج عہد سلطنت انگلیشیہ ، دہلی ۱۹۴۳ء -
۲۰ - رحمان علی ، تذکرۂ علمائے ہند ، کراچی ۱۹۶۱ء -
۲۱ - سالک ، عبدالمجید ، مسلم ثقافت ہندوستان میں ، لاہور ، سن اشاعت درج نہیں -
۲۲ - سر سید ، اسباب بغاوت ہند ، کراچی ۱۹۵۷ء -
۲۳ - سر سید ، مضامین تہذیب الاخلاق ، کراچی ۱۹۵۴ء -
۲۴ - سر سید ، مضامین سر سید ، لاہور ۱۹۶۷ء -
۲۵ - سر سید ، مقالات سر سید (کئی جلدوں میں) ، لاہور ۱۹۵۹ء -
۲۶ - سر سید ، مکتوبات سر سید ، لاہور ۱۹۵۹ء -
۲۷ - سروری ، عبدالقادر ، جدید اردو شاعری ، لاہور ۱۹۶۲ء -
۲۸ - سلیمان ندوی ، سید ، حیات شبلی ، اعظم گڑھ ۱۹۴۳ء -
۲۹ - شبلی نعمانی ، مقالات شبلی (کئی جلدیں) ، اعظم گڑھ ۱۹۳۸ء -
۳۰ - طفیل احمد ، سید ، مسلمانوں کا روشن مستقبل ، دہلی ۱۹۴۵ء -
۳۱ - ظہیر دہلوی ، داستان غدر ، لاہور ۱۹۵۵ء -
۳۲ - عبادت بریلوی ، جدید شاعری ، لاہور ۱۹۶۱ء -

۳۳ ۔ عبدالحق ، مولوی ، سر سید احمد خان ، کراچی ۱۹۵۹ء ۔

۳۴ ۔ عبدالغفار ، قاضی ، آثار جمال الدین افغانی ، دہلی ۱۹۴۰ء ۔

۳۵ ۔ محمد میاں ، سید ، علمائے ہند کا شاندار ماضی ، جلد سوم ۱۹۵۷ء ۔

۳۶ ۔ مہر ، غلام رسول ، ۱۸۵۷ء ، لاہور ، تاریخ درج نہیں ۔

۳۷ ۔ مہر ، غلام رسول (مرتب) ، خطوط غالب ، لاہور ، تاریخ درج نہیں ۔

۳۸ ۔ نور الرحمٰن ، حیات سر سید ، علی گڑھ ، تاریخ درج نہیں ۔

۳۹ ۔ فرید آبادی، ہاشمی ، تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت جلد دوم ، کراچی ۱۹۵۳ء ۔

* * *

(انگریزی)

1. Ahmad, Aziz : *Islamic Culture in the Indian Environment* ; Oxford 1964.
2. Ahmad, Jamiluddin : *Early Phase of Muslim Political Movement* ; Lahore (n.d.).
3. Arshad, M. & Rahman, H. : *History of Indo-Pakistan* ; Dacca 1962.
4. Basham, A.L. : *Indian Sub-contiuent in Historical Perspective* ; London 1924.
5. Campbell, C. : *Narrative of the Indian Revolt* : London 1858.
6. Dar, Bashir Ahmad : *Religious Thought of Sayyid Ahmad Khan* ; Lahore 1957.
7. *Encyclopaedia of Islam* ; London 1913-1934.
8. Fanshawe, N. C. : *Delhi Past and Present* ; London 1924.
9. Farquhar, J. : *Modern Religious Movements in India* ; London 1924.
10. Gibb, H.A.R. : *Modern Trends in Islam* ; Chicago 1945.
11. Gopal, Ram : *The Indian Muslims* ; Bombay 1959.
12. Griffiths, Percival : *The British Impact on India* ; London 1965.
13. Grover, B.L. & Sethi, R.R. : *Studies in Modern Indian History* ; Delhi 1963.
14. *History of the Freedom Movement* ; Vols. II & III ; Karachi 1960-63.

15. Hunter, W.W. : *Our Indian Mussalmans* ; Calcutta 1945.
16. Ikram, S.M. : *Modern Muslims in India and the Birth of Pakistan* ; Lahore 1965.
17. Latif, S.A. : *Outline of the Cultural History of India* ; Hyderabad Dn. 1958.
18. Lees, W.N. : *Indian Mussalmans* ; London 1871.
19. Majumdar, R.C. & others : *An Advanced History of India* ; London 1960.
20. Malik. Hafeez : *Moslem Nationalism in India and Pakistan* ; Washington, D.C. 1963.
21. Mehta, Asoka : 1857, *The Great Rebellion* ; Bombay 1946.
22. Morrison, T. : *Imperial Rule in India* ; London 1899.
23. Mujeeb, M. : *The Indian Muslims* ; London 1967.
24. Mustafa, S.G. : *The British in the Sub-Continent* ; Lahore 1964.
25. Qureshi, I.H. : *Muslims Community of the Indo-Pakistan Sub-Continent* ; The Hague 1962.
26. Ram Gopal : *Indian Muslims, A political History* ; London 1959.
27. Roberts, Lord : *Forty One Years in India* ; London 1897.
28. Smith, Bosworth, R. : *Life of Lord Lawrence* ; London 1885.
29. Smith, W. Cantwell : *Islam in Modern History* ; Princeton 1955.
30. Smith, W. Cantwell : *Modern Islam in India* ; London 1946.
31. Spear, Percival : *India, Pakistan and the West* ; London 1958.
32. Thompson, E. & Garrett, G.T. : *Rise and Fulfilment of the British Rule in India* ; London 1934.
33. Yusuf Ali, A. : *Cultural History of India during the British Period* ; Bombay 1940.

دوسرا باب

ادبی منظر (۱۸۵۷ء تا ۱۹۱۴ء)

۱۸۵۷ء ہماری تاریخ کا وہ موڑ ہے جس نے نہ صرف سیاسی و اقتصادی حیثیت سے مسلمانوں کو شدید دھکا پہنچایا بلکہ ذہنی ، فکری اور تہذیبی لحاظ سے بھی انہیں کشمکش اور تذبذب میں مبتلا کر دیا ۔ انگریزی حکومت اور انگریزی تعلیم کے ساتھ مغربی افکار و اقدار کا سیلاب اس تیزی اور قوت سے آیا کہ برصغیر کے باشندوں کے طرزِ فکر ، طرزِ احساس اور طرزِ عمل کو برق رفتاری سے بدلنے لگا ۔ اب تک مسلمان جن مابعد الطبیعی مفروضوں پر اپنے معیارات ، اقدار اور زاویہ ہائے نظر کی بنیاد رکھا کرتے تھے ۔ ان کا تعیّن روحانی زندگی اور انفرادی قلبی واردات کے حوالے سے ہوا کرتا تھا ، نہ کہ خارجی و مادی دنیا کے حوالے سے ۔ اب جو مغربیت کے اثر سے عقلیت ، نیچر ، سائنس ، مادیت ، ارضیت ، افادیت اور اجتماعیت کو بنیادی قدروں کی حیثیت حاصل ہونے لگی ، تو اس کا اثر مسلمانوں کے دینی ، فکری اور تہذیبی تصورات پر بھی ہوا ۔ وہ صرف مغربی علوم و فنون ہی نہیں بلکہ مغربی تہذیب و تمدن سے بھی مرعوب ہو کر اس کی تقلید کرنے لگے ۔ ان میں زندگی کی مادی قدروں سے ہمہ گیر عقیدت اور روحانی قدروں کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا ہونے لگے ۔ ان کا اپنے مذہب ، اپنی تاریخ ، اپنی روایات ، اپنی ثقافت ، اپنی معاشرت ، اپنے تصورات و اقدار پر یقین و اعتماد کم ہونے لگا ۔ احساسِ کمتری کی رو میں بہہ کر ملّتِ اسلامیہ اپنی انفرادی شخصیت کو مسخ کرتی ہوئی اپنے مرکز اور اپنی بنیاد سے ہٹنے لگی ۔ ۱۸۵۷ء کے بعد اگرچہ مسلمانوں کی بقا و ترقی کا تقاضا یہی تھا کہ ان کی زندگی کو بدلنے کے لیے انہیں مابعد الطبیعاتی تعلیم نہ دی جائے جس پر وہ اپنی سماجی ، سیاسی اور تہذیبی زندگی کی تشکیل کر سکیں اور سر سید کی تحریک اسی تقاضے کو پورا کرتی تھی ، لیکن قوم کو جلد از جلد ترقی کی منزل پر پہنچانے کی دھن میں سر سید نے اسے اتنا تیز دوڑایا کہ وہ ایک کٹی ہوئی پتنگ کی مانند اڑنے لگی جس کی ڈور کا سرا کسی کے ہاتھ میں نہ تھا ۔ اس طرح مغربیت کے غلو سے جس طوفان کے دروازے کھلے اس کی طاقت ، اس کے جوش اور اس کے تخریبی اثرات کا اندازہ خود سر سید کو شروع شروع میں نہ تھا ۔ اگرچہ آخری عمر میں ہو گیا تھا ۔

تحریکِ سر سید

اسی زمانے میں جب کہ سر سید کی تحریک اپنے عروج پر تھی ایک طرف قدامت پرست

علماء سر سید کے اجتہادی ، مذہبی تصورات پر نکتہ چینی کرکے انہیں حلقہ اسلام سے خارج کر رہے تھے اور دوسری طرف 'اودھ پنچ' کے لکھنے والے ان کی تحریک کے ہر پہلو کو اور خود ان کی شخصیت کو نشانہ طنز و تضحیک بنا رہے تھے ۔ لیکن یہ دونوں طبقے بنیادی طور پر سر سید کی تحریک کی مخالفت اس لیے نہیں کر رہے تھے کہ انہوں نے مغربی تہذیب و معاشرت اور مغربی افکار و اقدار کا کوئی عمیق ناقدانہ و حقیقت پسندانہ مطالعہ کرکے انہیں سطحی پایا تھا ، بلکہ اس مخالفت کی بڑی وجہ ان کی ماضی پرستی ، قدامت پسندی اور تقلید دوستی تھی جو ہر نئی چیز سے بھڑکتی تھی اور محض اس کے نئے پن کی وجہ سے اسے مسترد کر دیتی تھی ۔ البتہ جب صاحب بصیرت نئے تعلیم یافتہ مسلمانوں نے مغربی علوم ، مغربی تاریخ اور مغربی تہذیب کا وسیع و عمیق مطالعہ کرنا شروع کیا تو ان پر مغرب کی اصل حقیقت کھلنے لگی ۔ انیسویں صدی کے اواخر میں سید امیر علی اور بیسویں صدی کے اوائل میں علامہ اقبال ان بالغ نظر مسلمانوں کی نمائندگی کرتے ہیں جن کی آنکھیں مغرب کی ترقیوں سے خیرہ نہیں ہو گئیں بلکہ جنھوں نے مغرب کا ناقدانہ اور حقیقت پسندانہ مطالعہ کیا ۔ چنانچہ سید امیر علی نے اپنی علمیت سے کام لے کر اپنی کتاب 'روحِ اسلام' میں بدلائل ثابت کیا کہ مسیحیت کی تاریخ خونیں واقعات سے پر ہے اور عقلیت پرست مغرب کے مذہب 'مسیحیت' کی بنیاد ایسے عقائد پر ہے جو عقل سے بعید ہیں اور اسلام کی تعلیمات نہ صرف مسیحیت بلکہ دوسرے تمام مذاہب سے بہتر ہیں ۔ علامہ اقبال نے ۱۹۰۷ء میں وہ مشہور غزل لکھی جس میں یہ دو شعر شامل ہیں :

دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خود کشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

غرض بیسویں صدی کے اوائل میں ایسے اہلِ نظر پیدا ہو گئے جنھوں نے مغربی علوم و فنون و اخلاقیات پر تنقیدی نظر ڈالی اور قوم کی غلامانہ ذہنیت کو دور کرکے اس میں خود اعتمادی پیدا کرنے کی کوشش کی ۔ فکری و عامی سطح پر نقطہ نظر میں اس تبدیلی کو جنگ روس و جاپان (۱۹۰۵ء) میں جاپان کی فتح نے مزید تقویت پہنچائی اور اہلِ مشرق کے ذہنوں پر مغرب کی مادی برتری کا جو رعب بیٹھا ہوا تھا وہ بھی اب کم ہونے لگا ۔ مغربی تعلیم پانے والے نوجوانوں میں جو یہ خیال پیدا ہو رہا تھا کہ مغرب کی ہر چیز اچھی ہے اور مشرق کی ہر چیز بری ، یہ خیال اب بدلنے لگا ۔

مغرب کے خلاف ردِ عمل کو تقویت پہنچانے والے اور بھی کئی اسباب و واقعات ایسے ہوئے جن سے مسلمان، خصوصیت کے ساتھ اہلِ فرنگ سے، برگشتہ ہوتے گئے اور یہ برگشتگی مغربی تہذیب و اقدار سے برگشتگی پیدا کرنے لگی۔ انیسویں صدی کے اواخر ہی میں 'اتحاد بین المسلمین' کی تحریک شروع ہو چکی تھی جو مغربی استعمارات کے خلاف تھی، تقسیمِ بنگال کی منسوخی، اطالیہ کا طرابلس پر حملہ اور انگریزوں کا ترک فوج کو طرابلس جانے کے لیے راستہ نہ دینا، روسیوں کی مشہد مقدس پر گولہ باری، بلقانی ریاستوں کا ترکی پر حملہ، مچھلی بازار کانپور کی مسجد کا سانحہ، یہ سب بانیں مغرب سے برگشتگی کا سبب بنیں۔ کئی نئے رسائل اور اخبار بھی بیسویں صدی کے ابتدائی دس گیارہ سالوں میں ایسے جاری ہوئے جن کا مقصد عام طور پر انگریزوں پر شدید نکتہ چینی کرنا تھا، مثلاً علی گڑھ سے 'اردوئے معلیٰ'، لکھنؤ سے 'مسلم گزٹ'، لاہور سے 'زمیندار'، کلکتے سے 'الہلال' اور دہلی سے 'کامریڈ' وغیرہ۔ گویا ۱۹۱۴ء میں پہلی عالمی جنگ کے آغاز سے پہلے ہی مغرب اور مغربیت کے خلاف ردِ عمل خاصی شدت اختیار کر چکا تھا۔ چنانچہ پہلے اگر مغرب کی ہر چیز کو اچھا کہا جاتا تھا تو اب مغرب کی ہر چیز کو برا قرار دے کر مشرق کی ہر چیز کو بے عیب قرار دینے کا رویہ پیدا ہو رہا تھا جس کے نتیجے میں ملت کی اصلاح کا وہ رجحان کمزور پڑ گیا جو سر سید اور ان کے رفقا کے زمانے میں بہت قوی تھا۔

۱۸۵۷ء کے سیاسی بحران کے نتائج

۱۸۵۷ء کے سیاسی بحران کا ردِ عمل تو سر سید تحریک کی شکل میں ظاہر ہوا لیکن اس ردِ عمل کا ایک اور پہلو بھی تھا اور وہ یہ کہ مغرب کی نئی مادی توانائیوں کے مقابلے میں مشرق کے قدیم روحانی و اخلاقی یعنی بالفاظ دیگر ذہنی قلعوں پر دفاعی توپیں چڑھا کر تہذیبی اور ذہنی مورچوں پر قوی و غالب دشمن کے حملوں کو روکا جائے۔ چنانچہ، ادب، معاشرت، تہذیب، تعلیم غرض ہر شعبۂ فکر و عمل میں قدیم اقدار کی حمایت اور ماضی کی طرف واپسی کا رجحان بھی سر اٹھانے لگتا ہے۔ علی گڑھ کے تعلیمی اداروں کے قائم ہونے سے کچھ پہلے قدیم تعلیم کے دو نئے مدرسے سہارن پور اور دیو بند میں کھل گئے تھے۔ علاوہ ازیں علم و ادب کے میدانوں میں اب ہمیں قدیم مذہبی روایات، تاریخی واقعات اور افسانہ و افسوں کی گرم بازاری ملنے لگتی ہے جس کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں میں مذہبی روح بیدار کی جائے، شاندار ماضی کے ورق کھول کر ان کے آگے رکھے جائیں، ان کے پرانے عقائد کو تازہ اور استوار کیا جائے تاکہ وہ نئی ہوا کے تیز جھونکوں میں نہ اڑ جائیں۔ چنانچہ 'داستانِ امیر حمزہ' سے لے کر شرر کے تاریخی اسلامی ناولوں تک داستانوں، قصوں اور کہانیوں کا ایک ذخیرہ ایک دم ادبی خزانہ بن کر

وجود میں آ جاتا ہے۔ مرثیہ جس میں اسلامی تاریخ کے ابتدائی ساٹھ سال کے واقعات کا رزم اور بزم سب کچھ موجود ہے ، انیس و دبیر اور ان کے متبعین کے ہاتھوں اپنے عروج پر پہنچ گیا تھا ، وہ اب سننے والوں کے دلوں میں عہد رفتہ کے کارناموں اور مذہبی عقائد اور روایات و رسوم سے محبت بیدار کرنے لگتا ہے۔ قومی و ملّی شاعری کو فروغ ہوتا ہے اور نعت کہنے کا رواج بھی اسی زمانے میں بڑھ جاتا ہے اور شہید ، امیر ، محسن اور بیان اس صنفِ سخن میں مقبولیت حاصل کرتے ہیں۔

سرسید تحریک کی مخالفت میں جو ادبی و علمی ذخیرہ وجود میں آیا وہ نو فکر جدید کے خلاف اور قدیم مذہبی و ثقافتی اقدار و افکار کا علم بردار ہے ہی ، خود سرسید تحریک کے حامیوں کے یہاں بھی احیائے ماضی کی کوشش اور اسلاف کے کارناموں کو اجاگر کرنے کا رجحان کچھ کم نہیں۔ چنانچہ حالی کی نظم "مدوجزر اسلام" مسلمانوں کو ان کی گزری ہوئی عظمت یاد دلاتی ہے ، ان کی روشن تاریخ ان کے سامنے دہراتی ہے ، ان کے علمی ، ادبی اور سیاسی کارنامے بیان کرتی ہے اور اس طرح مسلمانوں کا رشتہ جو اپنے ماضی کو بھلا کر مغربی تہذیب و معاشرت کی طرف بڑھ رہے تھے ، ماضی سے جوڑتی ہے۔ حالی کی یہ نظم یہ تاثر بھی دیتی ہے کہ مسلمانوں کی انفرادیت کا انحصار حکومت یا سیاسی تسلط سے زیادہ ان کی تہذیب اور تہذیبی اقدار پر ہے اور یہ کہ مسلمانوں کی تہذیب بنی نوع انسان کے لیے امن اور سلامتی کی تہذیب ہے۔ اس تہذیبی تصور کے سامنے کائنات ایک کھلی کتاب ہے اور علم ایک مخفی خزانہ اور جو شخص اس تصور کو قبول کرتا ہے وہ زمین کی وراثت کا حقدار بنتا ہے اور جب تک مسلمان اس تصور کو نہیں اپناتے ، پستی ان کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتی۔ نذیر احمد کی 'الحقوق و الفرائض' اور 'امہات الامہ'، حالی کی 'حیات سعدی' اور شبلی کی 'سیرت النبی'، 'الفاروق' ، 'سیرت النعمان' اور 'المامون' مسلمانوں کے اسلاف بزرگ کی سوانح عمریوں کے ذریعے احیائے ماضی کی کوششوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ان مستقل تصانیف کے علاوہ بیسیوں مضامین و مقالات بھی سرسید کے رفقاء کے قلم سے نکلے ہیں جن میں مسلمانوں کی تاریخ کے تابناک پہلو اجاگر کیے گئے ہیں اور اسلاف کے کارناموں کو ذہنوں میں تازہ کیا گیا ہے[1]۔

---

(۱) فاضل مقالہ نگار اس ضمن میں اکبر الہ آبادی کا کردار نظر انداز کر گئے ہیں۔ اکبر ایک طرف تو اپنی تہذیب کے شدت سے دلدادہ تھے اور دوسری طرف مغربیت کے بڑھتے ہوئے اثرات سے خائف تھے ، چنانچہ جہاں انہیں اس دور میں ایسے شعر کہنے پر مجبور کیا :

دل مرا جس سے بہلتا کوئی ایسا نہ ملا　　　بت کے بندے ملے اللہ کا بندہ نہ ملا

اور

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

مغربی تعلیم کے اثرات

برِ صغیر میں مغربی تعلیم ۱۸۵۷ء سے پہلے ہی رواج پا رہی تھی اور جدید علوم و فنون کے تجرباتی و مشاہداتی معلومات جو مسلمانوں کے صدیوں پرانے تصورات سے ٹکراتے تھے ان کے ذہنوں میں شکوک و شبہات پیدا کرنے لگے تھے - ۱۸۵۷ء کے بعد مغربی تعلیم اور زیادہ رائج ہوئی اور ذہنوں میں تشکک اور بھی بڑھنے لگا - قدیم مذہبی عقائد جو عامۃ المسلمین کو سکھائے جاتے تھے متزلزل ہونے لگے - سر سید خود بھی

(گذشتہ سے پیوستہ)

سید آٹھے جو گزٹ لے کر تو لاکھوں لائے   شیخ قرآن دکھاتا پھرا پیسا نہ ملا

یا

وہ ہوا نہ رہی ، وہ چمن نہ رہا ، وہ گلی نہ رہی وہ حسیں نہ رہے
وہ فلک نہ رہا ، وہ سماں نہ رہا ، وہ مکاں نہ رہا ، وہ مکیں نہ رہے

اس کے ساتھ ساتھ معاشرہ پر جو تنقید اپنے طنزیہ اشعار میں کرتے تھے اس سے بھی دردِ ملت اور اصلاحِ قوم کا قومی جذبہ ایک نشتر کی طرح دلوں میں چبھ جاتا تھا - مثال کے طور پر یہ چند اشعار ملاحظہ ہوں :

یہ آپ کا فرمانا ہے بجا قرآں بھی ہے اللہ بھی ہے
مشکل تو یہ ہے لیکن کہ ادھر آنر بھی ہے اور تنخواہ بھی

☆ ☆ ☆

عہدہ دیتے ہیں ، سند دیتے ہیں ، زر دیتے ہیں
خانساماں وہ مجاہد کو بھی کر دیتے ہیں

☆ ☆ ☆

کیوں سول سرجن کا آنا روکتا ہے ہم نشیں
اس میں اک بات آنر کی شفا ہو یا نہ ہو
مولوی صاحب نہ چھوڑیں گے خدا گو بخش دے
گھیر ہی لیں گے پولیس والے سزا ہو کہ نہ ہو
ممبری سے آپ پر تو وارنش ہو جائے گی
قوم کی حالت میں اس سے کچھ جلا ہو یا نہ ہو

(مدیر عمومی)

تسلیم کرتے ہیں کہ ''اگر خدا مجھ کو ہدایت نہ کرتا اور تقلید کی گمراہی سے نہ نکالتا اور میں خود تحقیقاتِ حقیقت پر نہ متوجہ ہوتا تو یقیناً مذہب چھوڑ دیتا(۱)''۔ مثال کے طور پر ، اس زمانے کے مسلمانوں کا عقیدہ تھا جو صدیوں سے چلا آ رہا تھا کہ زمین تہ بہ تہ نو آسمانوں میں اس طرح گھری ہوئی ہے جیسے انڈے کے اندر زردی ، نیز زمین ساکن ہے اور آسمان کے کُرے حرکت کرتے ہیں جن کے ساتھ آفتاب جو ان میں جڑا ہوا ہے زمین کے گرد گھوم جاتا ہے اور اس طرح دن رات بنتے ہیں ۔ اس عقیدے کو تقلید پرستی کی وجہ سے مذہبی تقدس حاصل ہو گیا تھا ۔ چنانچہ مغربی علوم کے مطالعے سے خود سر سید نے بھی ایک رسالہ 'قولِ متین در ابطالِ حرکتِ زمین' لکھا تھا ۔ بعد میں جب انہیں اپنی غلطی کا علم ہوا تو انہوں نے اس عقیدے کو غلط اور غیر اسلامی بتایا اور ایک طویل مضمون 'تہذیب الاخلاق' میں لکھا کہ یہ عقیدہ علمائے اسلام نے یونانی حکماء سے لے کر مذہبی مسائل میں شامل کر لیا اور قرآنِ مجید کی تفسیر یونانی و بطلیموسی علم ہیئت کے مطابق کر ڈالی ۔

جدید علوم نہ صرف زمین کو خود اپنے محور کے گرد اور سورج کے گرد گھومتا ہوا ثابت کرتے تھے، بلکہ کائنات اور انسان کی تخلیق و ارتقاء کے بارے میں ایسے نظریے پیش کرتے تھے جو قدامت پسندانہ عقائد سے ٹکراتے تھے ۔ اسی طرح بنتھم اور مل کے افادی فلسفے کے عام ہونے سے مسلمانوں کے ان تصورات کو ضعف پہنچ رہا تھا جو دین کے زیرِ اثر انسانی زندگی کی غایت اور اعمالِ انسانی کے منتہا کے بارے میں لوگوں کے دلوں میں راسخ ہو چکے تھے ۔ عقلی نقد و جرح ، مذہب کے مافوق العقل اور ماورائی حصے کو مشتبہ بنانے لگی تھی ۔ انگریز مصنفین اسلام کی تعلیمات و احکام کو عقل و اخلاق اور انسانی ترقی کے منافی ثابت کر رہے تھے اور سر ولیم میور کے الفاظ میں کہتے تھے کہ 'انسانیت کے سب سے بڑے دشمن محمدؐ کی تلوار اور محمدؐ کا قرآن ہیں' (نعوذ باللہ) ۔ یہ سب کتابیں اور آزاد خیال مغربی مفکروں کی بحثیں انگریزی تعلیم پانے والوں کی نظر سے گزرتی تھیں اور انہیں شکوک میں مبتلا کر کے مذہب سے انحراف کی طرف مائل کرتی تھیں ۔

جدید علمِ کلام کی ضرورت

یہی دیکھ کر سر سید نے ایک تقریر میں واشگاف انداز میں کہا 'اس زمانے میں . . . ایک جدید علمِ کلام کی حاجت ہے جس سے یا تو ہم علومِ جدیدہ کے مسائل کو باطل

---

(۱) اکرام ، ایس ، ایم ، موج کوثر ۔ ص ۱۵۶ ، مطبوعہ لاہور ۱۹۶۸ء ۔

کر دیں یا مشتبہ ٹھہرا دیں یا اسلامی مسائل کو ان کے مطابق کر کے دکھائیں[۱]۔ زمانے کی اس نہایت اہم ذہنی و فکری ضروریات کو پورا کرنے کا بیڑا سب سے پہلے خود سر سید نے اٹھایا اور اسلام کی ایسی ترجمانی کرنے پر کمر باندھی کہ اس پر جدید علوم، جدید فلسفے اور عقل و عمل کی رو سے کوئی اعتراض وارد نہ ہو سکے۔ یہ کام انہوں نے نہ صرف ایک ضرورت کو پورا کرنے کے لیے کیا، بلکہ اس لیے بھی کہ خود انہیں اسلام کی صداقت کا یقین کامل تھا اور بڑے خلوص اور پوری دیانت داری سے وہ سمجھتے تھے کہ قرآن یعنی خدا کے قول اور فطرت یعنی خدا کے فعل میں کوئی تناقض نہیں ہو سکتا۔

سر سید کی تاویلات اور جدیدیت

چنانچہ سر سید نے ایک نئے علم کلام کی بنیاد ڈالی جس میں انہوں نے افکار، علوم جدیدہ اور مذہب میں مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اسلام کی تاریخ میں اس سے پہلے بھی ایک بار یونانی فلسفے کے اثر سے اسلام کے عقائد و تصورات کی عقلی تعبیروں کا غلغلہ معتزلہ متکلمین نے بلند کیا تھا سر سید نے ان سے بھی استفادہ کیا اور ابن رشد، غزالی، مجدد الف ثانی رح اور شاہ ولی اللہ دہلوی رح کی تصانیف سے بھی جہاں جہاں ان کے نقطۂ نظر اور موقف کی تائید میں دلیلیں اور مثالیں مل سکتی تھیں حاصل کیں۔ انہوں نے قرآن کے تمام اندراجات کو عقل، سائنس اور اصول تمدن کے مطابق ثابت کیا اور جہاں کہیں دونوں میں اختلاف نظر آیا وہاں معتزلہ طریقے کے مطابق آیات کی نئی تاویل و تشریح کر کے اس اختلاف کو دور کیا۔ چنانچہ وہ ایسے تمام معجزوں سے انکار کرتے ہیں جن سے قدرت کے قوانین کی نفی ہوتی ہے۔ وہ نبی کریم ؐ کے معراج اور معجزۂ شق القمر کو رویا کا فعل قرار دیتے ہیں، انسان کی دنیا سے الگ ابلیس اور فرشتوں کے روحانی وجود کو نہیں مانتے، دوزخ اور جنت کو روحانی کیفیات قرار دیتے ہیں۔ حساب، کتاب، میزان وغیرہ کے متعلق تمام قرآنی ارشادات کو بطریق استعارہ و تمثیل سمجھتے ہیں۔ ناسخ و منسوخ آیات کے قائل نہیں۔ حالی نے ایسے باون مسائل کا ذکر کیا ہے جن میں سر سید نے عام عقائد و تصورات سے اختلاف کیا ہے۔ لیکن بقول شیخ اکرام ''ان میں اکتالیس مسائل تو ایسے ہیں جن میں علمائے کبار میں سے کوئی نہ کوئی بزرگ سر سید کے ہم خیال تھے اور گیارہ مسائل ایسے ہیں جن کے متعلق کہا نہیں جا سکتا کہ ان میں سر سید کا کوئی ہم خیال تھا کہ نہیں''[۲]۔

---

(۱) سر سید احمد خان، مجموعہ لیکچرز - ص ۲۷۶ تا ۲۹۸، مطبوعہ لاہور ۱۹۰۰ء۔

(۲) اکرام، موج کوثر - ص ۱۶۰ -

سر سید کے مذہبی افکار نے آگے چل کر مطالعۂ قرآن کے طریقوں اور عام مذہبی تصورات پر بڑا اثر ڈالا ۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ انھوں نے دینی مباحث میں عقلی اور تمدنی اصولوں کو استعمال کر کے دینی بحث و نظر کو باطنی و روحانی سمت سے ہٹا کر علمی و عقلی سمت میں موڑ دیا اور اجتہاد اور تنقیدِ مذہب کا دروازہ کھول دیا ۔

سر سید کے رفقاء

دینی امور میں سر سید جس تحریکِ تجدید کے بانی تھے ، اس میں چند جزئی باتوں کو چھوڑ کر ان کے دوسرے رفقاء محسن الملک اور مولوی چراغ علی بھی پورے طور پر ان سے متفق تھے ۔ مولوی نذیر احمد بھی اگرچہ فطرت اور عقل کی اہمیت پر بہت زور دیتے تھے ، لیکن موقع بہ موقع سر سید سے اختلاف بھی کرتے تھے اور اپنے آپ کو نیچری ہونے کے الزام سے بچانے کی کوشش کرتے رہتے تھے ۔ شبلی نعمانی پر بھی سر سید کے اثر سے عقل پسندی کا رنگ چڑھ گیا تھا ، چنانچہ انھوں نے بھی اپنی اکثر تحریروں میں اس بات پر زور دیا کہ اسلام کو جدید علوم اور جدید تمدن سے مطابقت دی جائے اور فلسفۂ حال کے ان مسائل کی تشریح کی جائے جو بظاہر مذہب سے ٹکراتے نظر آتے تھے ۔ البتہ بقول ڈاکٹر سید عبداللہ ''سید صاحب قدیم کو ایسے رنگ میں پیش کرتے ہیں کہ اس سے تمدن اور زندگی کے نئے رجحانات کی تائید ہو ، اس کے برعکس شبلی جدید رجحانات کی تاویل اس طرح کرتے ہیں کہ اس سے قدیم عقائد کی تائید نکلتی ہو[1]''۔ علمِ کلام میں شبلی کے اجتہادی نکات یہ تھے : انھوں نے بتایا کہ مسلمانوں میں عقائد کا اختلاف اکثر سیاسی اسباب سے پیدا ہوتا رہا ۔ دوسرے انھوں نے علم کلام کو دو قسموں میں تقسیم کیا ۔ ایک وہ جس میں اسلامی فرقوں کے اندرونی اختلافات پر تبصرہ ہے ، دوسرا وہ جو فلسفہ و حکمت کے مقابلے میں ایجاد ہوا ۔ شبلی نے اس خیال کی بھی تردید کی کہ مسلمانوں کا فلسفہ کاملاً یونانی فلسفے سے ماخوذ ہے ۔ انھوں نے عقائد کے علاوہ قانونی اور اخلاقی مسائل کو بھی علم کلام کے دائرے میں شامل کر لیا جیسے تعددِ نکاح ، طلاق ، غلامی ، جہاد وغیرہ کے مسائل ۔

۱۸۵۷ء سے لے کر پہلی عالمی جنگ تک کے اردو ادب میں مذہبی مسائل ، مباحث ، موضوعات و محرکات کا جو غلبہ نظر آتا ہے اس کی توجیہ مرقومہ بالا بحث سے بآسانی ہو جاتی ہے ۔

---

(۱) عبداللہ ، سید ، سر سید اور ان کے نامور رفقا کی نثر ۔ ص ۷۷ ، مطبوعہ لاہور ۱۹۶۰ء ۔

ادب میں نیا شعور

برِ صغیر کے نئے حالات نے نئے شعور کو ابھارا اور نئے شعور نے نئے ادب کی راہ نکالی ۔ اس طرح وہی بجلی جس نے اردو کے شعراء و ادبا کی پناہ گاہوں یعنی سلاطین و امرا کے درباروں کو جلا کر راکھ کر دیا ، ان کے ماتم خانے میں نئی شمع بھی روشن کر گئی اور انہیں فکر کے لیے نیا ذخیرہ ، خیال آرائی کے لیے نئے موضوع اور بیان کے نئے اسلوب فراہم کر گئی ۔ تحریکِ سر سید نے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے جو راہیں سجھائیں ان سے نہ صرف زندگی اور معاشرے میں ، نہ صرف فکری و تہذیبی دائرے میں بلکہ شعر و ادب کی دنیا میں بھی بڑی دور رس تبدیلیاں پیدا ہو گئیں ۔ ادبی لحاظ سے اہم ترین بات یہ ہوئی کہ اب لکھنے والوں نے شعوری طور پر ادب کا رشتہ اپنے زمانے کی سیاست اور سماج سے جوڑ کر اجتماعی زندگی کے مسائل کا عقلی حل پیش کرنا شروع کر دیا ، زندگی کی مادی ضرورتوں کو براہِ راست قابلِ توجہ قرار دے کر ارضی زندگی کی ترقی و تکمیل پر زور دینے لگے ، ادب کی تفریحی و ذوقی حیثیت کو بدل کر اسے اجتماعی مقاصد سے روشناس کرنے لگے ، اس کا رخ تخئیلیت اور داخلی زندگی سے ہٹا کر واقعیت اور خارجی زندگی کی طرف موڑ دیا اور اس سے اخلاقی ، فکری ، سماجی ، تہذیبی اور مذہبی اصلاح کا کام لینے لگے ۔ اس طرح گویا سر سید اور ان کے حامیوں نے پہلی مرتبہ ایک ہمہ گیر اصلاحی تحریک کے سلسلے میں ادب کی عمرانی و تہذیبی اہمیت کا اندازہ لگا کر اردو میں مقصدی شعر و ادب کی تخلیق کی روایت قائم کی ۔ مقصدیت اور اصلاح پسندی کا یہ رویہ اور مصنفین میں معاشرتی ذمے داری کا احساس سر سید تحریک کے بعد اردو ادب کی ہر صنف میں صاف طور پر دیکھا جا سکتا ہے ۔ چنانچہ حالی کے مسدس 'مد و جزر اسلام' اور جدید غزلوں میں ، سر سید ، حالی ، شبلی ، نذیر احمد ، شرر وغیرہ کے مقالات و خطبات میں ، شبلی اور حالی کی تاریخی و سوانحی تصانیف میں نذیر احمد اور شرر کے ناولوں میں اور کارکنانِ علی گڑھ کے 'قومی تھیٹر' میں یہ محرکات نمایاں ہیں ۔

نئی شاعری

محمد حسین آزاد نے اگرچہ لاہور میں ڈائرکٹر تعلیمات کے ایما پر ۱۸۷۴ء میں ایک نئے قسم کے مشاعرے کی بنیاد رکھی تھی جس میں شعراء کو ایک موضوع دے کر نظمیں لکھنے کو کہا جاتا تھا لیکن آزاد کی تحریک کے زیرِ اثر منعقد ہونے والے یہ مشاعرے ایک سال کے اندر ہی ختم ہو گئے تھے ۔ ان موضوعاتی مشاعروں میں حالی بھی چار ماہ تک آزاد کے ساتھ رہے تھے ، لیکن جب وہ لاہور چھوڑ کر دلی چلے گئے اور سر سید کے

زیرِ اثر آ کر ان کے ایما پر مسدس 'مد و جزر اسلام' لکھا تو صحیح معنوں میں اس وقت نئی شاعری کا وہ سلسلہ شروع ہوا جو برابر جاری رہا اور پھیلتا گیا ۔ آزاد چونکہ سر سید کی ہمہ گیر اصلاحی تحریک سے وابستہ نہیں تھے اس لیے ان کی کوششوں کا دائرۂ اثر وسیع نہ تھا جتنا حالی کی کوششوں کا تھا ۔ یہ حالی ہی کا اثر تھا کہ ان کے ہمعصر شعراء نے اردو شاعری کو سماجی زندگی کے سارے میلانات کا آئینہ بنا دیا ۔ حالی کے علاوہ اسماعیل میرٹھی ، چکبست ، اکبر الہ آبادی ، شبلی ، اقبال ، سلیم ، نظم طباطبائی ، ظفر علی خان وغیرہ کا کلام اس امر کا شاہد ہے کہ مذہب ، معاشرت ، ادب ، تہذیب و تمدن ، معیشت ، سیاست ، اخلاق غرض کوئی پہلو سماجی زندگی کا ایسا نہیں رہ گیا جس پر نظمیں نہ لکھی گئی ہوں ۔ اس نئی شاعری کا اولین خطاب اجتماع سے ہے اور اجتماع کے توسط سے افراد سے ۔ اس میں ایک طرح کا منظم اجتماعی احساس اور عمرانی ادراک ، اجتماعی طور پر محسوس کیے ہوئے جذبات اور سوچے ہوئے افکار ، قومی مسائل کا بیان اور ان کا عملی و عقلی حل ملتا ہے ۔ یہ شاعری جذبات کی آسودگی سے آگے بڑھ کر ذہن و فکر کی بیداری و وسعت کو اپنا مطمعِ نظر بناتی ہے ۔

نئے اندازِ بیان

اندازِ بیان چونکہ مضامین و موضوعات سے متعیّن ہوتا ہے ۔ اس لیے اس دور کے لکھنے والوں کی مقصدیت ان کے انداز پر بھی اثر ڈالتی ہے ۔ شاعری میں سیاسی و واعظانہ یا پھر خطیبانہ رنگ پیدا ہو جاتا ہے ، مثلاً حالی کی مثنویوں ، قطعات ، رباعیات اور دوسری نظموں میں ، شبلی ، اسماعیل اور ظفر علی خاں کی شاعری میں اور اقبال کی ابتدائی دور کی نظموں میں اس رنگ کو صاف محسوس کیا جا سکتا ہے ۔ اکبر الہ آبادی اور 'اودھ پنچ' کے دوسرے لکھنے والوں کی طنزیہ و مزاحیہ شاعری کو بھی سر سید تحریک ہی کی دین سمجھنا چاہیے کہ یہ اسی کی مخالفت میں وجود میں آئی اور اس طرح اردو شاعری کے اسالیبِ اظہار میں ایک بعد کا اور اضافہ ہوا ۔ اس جوابی تحریک نے اس کمی کو بھی پورا کر دیا جو سر سید تحریک کے ادب میں پائی جاتی تھی ۔ ظرافت و شگفتگی کا عنصر مقصدی و اصلاحی ادب میں بالکل دب کر رہ گیا تھا اور متانت ، منطقیت و استدلالیت نے اردو ادب میں ایک طرح کی خشکی سی پیدا کر دی تھی جسے 'اودھ پنچ' کے لکھنے والوں نے اپنی نیم سنجیدہ اور ظریفانہ تحریروں سے دور کر دیا ۔

موضوعاتِ شاعری

اردو شاعری میں اجتہاد کی جو تحریک لاہور میں اٹھائی گئی اس کا بنیادی مقصد محکمۂ تعلیم کے ورنیکلر نصابات کے لیے انگریزی طرز پر کچھ نئی نظموں کا فراہم کرنا

تھا ۔ اس سلسلے میں جو نظمیں موضوعاتی مشاعروں کے لیے لکھی گئیں وہ اگرچہ کسی خاص اصلاحی تحریک کی پیروی میں نہیں لکھی گئیں ، تاہم ان میں جدید اردو شاعری کے وہ ابتدائی نقوش دیکھے جا سکتے ہیں جو بعد میں اصلاحی تحریکوں کی پیروی میں زیادہ واضح ہو گئے ۔ ان نقوش میں حب الوطنی کا تصور خاص طور پر قابلِ ذکر ہے جو مغربی اثرات اور انگریزی ادب کی وساطت سے اردو شاعری میں آیا تھا اور مقتضائے زمانہ سے پوری مطابقت بھی رکھتا تھا ۔ اردو میں وطن پرستانہ شاعری کا نقطۂ آغاز اسی مشاعرے کو قرار دیا جا سکتا ہے جس میں آزاد اور حالی نے حبِ وطن کے موضوع پر اپنی نظمیں پڑھی تھیں ۔ (سمبر ۱۸۷۴ء) اور سارے ہندوستان کو ایک وطن اور اس میں بسنے والے سب لوگوں کو ہم وطن قرار دیا تھا اور حب الوطنی کا مطلب صرف اپنے مقامِ پیدائش سے محبت نہیں لیا تھا ، بلکہ وہ اپنی ذات سے بلند ہو کر وطن اور ہم وطنوں کی خدمت میں تن من دھن سب کچھ نثار کر دینا لیا تھا ۔ شاعری میں وطن پرستی کی اس لے کو آگے چل کر سرور ، شبلی ، چکبست ، ظفر علی خاں ، حسرت موہانی اور اقبال نے خوب تیز کیا ۔ لیکن سر سید تحریک کی وجہ سے مسلمانوں کی اصلاح اور نشاۃ ثانیہ کی جو کوششیں شروع ہوئیں انھوں نے وطن پرستی کے رجحان کے ساتھ ساتھ ایک ملّی رجحان بھی پیدا کر دیا ۔ شاعری میں اس ملّی رجحان کا اولین اور ممتاز ترین نمونہ حالی کا مسدس ہے ۔ یہ ایک عہد آفرین ملی کارنامہ تھا جس کے مخاطب خاص طور پر مسلمان تھے ۔ اس نظم میں حالی نے بقول خود ''قوم کے لیے اپنے بے ہنر ہاتھوں سے ایک آئینہ خانہ بنایا ہے جس میں آ کر وہ اپنے خط و خال دیکھ سکتے ہیں کہ ہم کون تھے اور کیا ہو گئے'' ۔ اسی مسدس سے اردو میں ملّی شاعری کا آغاز ہوتا ہے ۔ نذیر احمد ، شبلی ، اسماعیل ، شوق قدوائی ، شرر ، اکبر ، اقبال ، ظفر علی خاں ، آغا حشر وغیرہ کی ملی نظمیں اسی جذبے کی نمائندگی کرتی ہیں جسے حالی نے اپنے مسدس کے ذریعے مسلمانوں کے دل میں بیدار کیا تھا ۔

شعر میں نفسِ مضمون کی اہمیت

اگرچہ آزاد کی نئی ادبی تحریک اور موضوعاتی مشاعروں کو لکھنوی شاعری کے بڑھتے ہوئے منفی رجحانات کے خلاف ردِ عمل کی حیثیت بھی دی جا سکتی ہے کہ لکھنوی شاعری میں ہیئت و زبان پر زور تھا ، رنگینی تھی ، مبالغہ تھا ، تصنّع تھا اور عشق و ہوس کے چونچلے خاص مضامین تھے ۔ درآنحالیکہ آزاد اور حالی نے لاہور کے مشاعروں میں ہیئت سے زیادہ نفسِ مضمون اور غیر عشقیہ شاعری پر زورِ طبع صرف کیا اور حقائق و واقعات کے سادے اور سچے بیان کو اہم سمجھا ۔ لیکن تاریخی لحاظ سے یہ حقیقت پھر بھی برقرار رہتی ہے کہ نئی ادبی تحریک کے اصل محرک پنجاب کے لفٹنٹ گورنر اور محکمۂ تعلیم کے

ڈائرکٹر تھے جو نصاب میں شامل کرنے کے لیے انگریزی طرز کی نظمیں لکھوانا چاہتے تھے ۔ آزاد اور حالی دونوں نے انگریزی شعر و ادب کے مضامین و موضوعات اور اسالیب اظہار سے واقفیت لاہور ہی میں ترجموں کے ذریعے حاصل کی اور چند ترجمہ شدہ انگریزی نظموں کو اردو کا جامہ بھی پہنایا ۔ بقول آغا محمد باقر انگریزی سے اردو میں ترجمے کا فرض ماسٹر پیارے لال آشوب ادا کرتے تھے[1] ۔ اس طرح اردو ادب جو اب تک عربی ، فارسی اور کسی حد تک ہندی ادب کا خوشہ چین رہا تھا ، اب انگریزی ادب کے خزانوں سے بھی فائدہ اٹھانے لگا ۔ قلق میرٹھی ، اسمٰعیل ، سرور ، نظم ، شرر ، ظفر علی خان ، نادر کاکوروی اور اقبال وغیرہ نے کئی انگریزی نظموں کو اردو نظم کا لباس پہنایا جس سے نئے مضامین اور نئے اسالیبِ اظہار اردو شاعری میں متعارف ہوئے ۔

نیچری شاعری

انگریزی شاعری کے نمونے دیکھ کر ہی آزاد اور حالی نے قدرتی نظاروں کی مصوری کو شعوری طور پر اپنی بعض نظموں کا مقصود بنایا تھا ۔ ویسے تو مناظرِ قدرت اور مظاہرِ فطرت کی عکاسی پہلے بھی اردو قصیدوں ، مثنویوں اور مرثیوں میں ہوتی رہی تھی اور نظیر اکبر آبادی نے مخمس اور مسدس اور دوسری ہیئتوں میں بھی اس طرف توجہ دی تھی ، لیکن با ایں ہمہ اردو شاعری کی نئی تحریک سے پہلے مناظرِ قدرت یا ''فطری'' شاعری نے کوئی مستقل حیثیت اختیار نہیں کی تھی ۔ لیکن اب اس کے لیے ایک مستقل حیثیت قائم ہوگئی ۔ شعراء نے مناظرِ قدرت کو بہار و خزاں اور گرمی و سردی کی حد تک محدود نہیں رکھا بلکہ بہت زیادہ تنوع پیدا کیا اور ہر قسم کے مناظر دکھائے ۔ پہلے کی شاعری میں عام طور پر ایسے مناظر کی عکاسی ہوتی تھی جو برِصغیر سے زیادہ ایران کے ساتھ مخصوص تھے اور اس میں بھی محاکات سے زیادہ تخیئل کا عنصر غالب تھا ۔ مناظرِ قدرت و مظاہر فطرت کی جو شاعری انگریزی ادب کے اثر سے وجود میں آئی اور جسے غلطی سے بجائے نیچر شاعری کے نیچرل شاعری کا نام مل گیا ، اس میں دیسی عنصر نمایاں رہا اور تخیئل پر محاکات کا غلبہ رہا ۔ آزاد اور حالی کے بعد کئی شعراء ، خصوصاً رسالہ 'دلگداز' اور رسالہ 'مخزن' میں لکھنے والے شعراء مثلاً اسمٰعیل ، بے نظیر شاہ ، ناظر ، سرور ، محسن ، محروم ، چکبست ، اوج ، شوق ، ہادی وغیرہ اس قسم کی شاعری میں مختلف تجربات کرتے رہے ۔ لیکن عام طور سے ان شاعروں نے کسی منظر سے مجموعی طور پر لطف اندوز و متاثر ہونے کے بجائے اس کے مختلف پہلوؤں کی فہرست بنا کر رکھ دینے ہی پر اکتفا کی اور فطرت کے خارجی اور مصنوعی مطالعے ہی پر اپنی شاعری کی بنیاد رکھی ۔ اسی لیے ان کے کلام میں فطرت ایک اجنبی

---

(۱) باقر ، آغا محمد ، 'محمد حسین آزاد' مشمولہ 'اورینٹل کالج میگزین فروری ۱۹۳۹ء لاہور ۔ ص ۸۹ ۔

چیز ہی رہی جو ان کی ذہنی و جذباتی زندگی کا جزو نہ بن سکی ۔ اس دور میں نیچری شاعری اگرچہ بہت لکھی گئی ، لیکن اس میں عام طور پر ذاتی اور انفرادی تجربے کا فقدان نظر آتا ہے ۔ چونکہ مقصدیت اور اصلاح پسندی کا رجحان بھی ادب میں پیدا ہو چکا تھا اس لیے اگر فطری مناظر کے بیان ہی پر اکتفا نہیں کی گئی تو پھر فطری مناظر کی مشکش سے کسی اخلاقی قدر کا احساس دلانا شاعر کا مقصود رہا ۔ اچھی شاعری کے لیے یہ لازمی تھا کہ فطرت کے حسن کا ایک بے پناہ احساس ہر تخلیق کی تہ میں کارفرما ہوتا کہ فطرت کے جمال ہی سے قدر نکلتی ہوئی محسوس ہو ۔ یہاں ایسا بالعموم نہیں ہوا اور اس کی وجہ وہی ذاتی تجربے کا فقدان اور جذباتی لگاؤ کی کمی تھی ۔ معدودے چند نظمیں ہی ایسی نکل سکیں جنھیں انگریزی کی نیچر شاعری کے مقابلے میں پیش کیا جا سکتا ہے ۔

ہیئت کے تجربے

انگریزی ہی کے اثر سے شعرائے اردو نے ہیئت میں بھی تجربات شروع کیے ۔ چنانچہ محمد حسین آزاد نے اپنی ایک نظم 'جغرافیہ طبعی کی پہیلی' میں قافیے کی پابندی سے دامن چھڑانے کی کوشش کی ۔ اسمٰعیل میرٹھی نے 'تاروں بھری رات' اور 'چڑیا کے بچے' جیسی بے قافیہ نظمیں لکھیں ۔ ہیئت کے ان تجربات میں شرر نے بھی حصہ لیا اور اپنے رسالے 'دلگداز' میں اس کے لیے باقاعدہ ایک تحریک چلائی ۔ گرے کی 'ایلجی' کا ترجمہ جو نظم طباطبائی نے 'گورِ غریباں' کے نام سے کیا تھا 'استانزوں' کے فارم میں تھا ۔ یہ ۱۸۹۶ء میں 'دلگداز' میں شائع ہوا جس پر شرر نے ایک تعارفی نوٹ بھی لکھا ۔ نظم طباطبائی ہی نے چند رباعیاں بھی کہیں جن کا ٹھاٹ انگریزی نظمِ معریٰ کے مطابق تھا پھر شرر نے خود ۱۹۰۰ء میں اپنا ایک منظوم ڈراما 'فتح اندلس' شائع کرنا شروع کیا جو شیکسپیر کی تقلید میں نظمِ معریٰ میں لکھا گیا تھا ۔ ۱۹۱۰ء میں شرر نے ایک اور ڈراما 'منظوم ورجنا' لکھا جو نظمِ معریٰ ہی میں تھا ۔ اول الذکر تو ناتمام رہا لیکن مؤخر الذکر مکمل ڈراما تھا جو دو مناظر پر مشتمل تھا ۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہیئت کے ان تجربوں کو اس زمانے میں عام قبولیت و پسندیدگی حاصل نہ ہو سکی اور قدیم اصنافِ سخن ہی کا سکہ زیادہ چلتا رہا ۔ خصوصیت سے مسدس ، مثنوی اور قطعے کی ہیئتیں عام طور پر مستعمل رہیں ، اگرچہ مضامین اور موضوعات اکثر و بیشتر نئے تھے ۔ لیکن قدیم اصنافِ سخن میں جب نئے مضامین بیان ہونے لگے تو ٹکنیک میں گہری تبدیلی ہو گئی ، رائج بحریں بدل گئیں ، الفاظ کے انتخاب میں اور لب و لہجے میں فرق پیدا ہو گیا ، اور اس فرق کی توجیہ محض شعراء کے الگ الگ طرزِ ادا سے نہیں کی

جا سکتی ، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ یہ بدلے ہوئے موضوعات کے بدلے ہوئے تقاضوں کا نتیجہ تھا - مثلاً قدیم شاعری میں برسات کا منظر میر حسن اور قلق کی مثنویوں میں دیکھیے اور اس کا مقابلہ آزاد کی نظم 'ابر کرم' یا حالی کی 'برکھا رت' یا اسماعیل کی 'برسات کی رات' سے کیجیے تو تکنیک ، انتخاب الفاظ اور لب و لہجے کا فرق روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جائے گا - یہی نئی تکنیک جدید اردو شاعری میں مغربی شاعری کے اثر سے جدید نظم کا پیش خیمہ بن گئی -

نئی غزل

بدلے ہوئے حالات ، جدید مضامین و موضوعات اور نئے رجحانات نے غزل کو بھی متاثر کر دیا - حالی نے غزل کے مروجہ مضامین کو از کار رفتہ قرار دے کر غزل میں نیا تصورِ محبت ، نیا ماحول فطرت ، نیچر شاعری سے رغبت ، نیا اندازِ فکر اور نیا طرزِ سخن رائج کرنے کی کوشش کی اور غزل کو بھی افادی شاعری بنا دیا - روایتی عشقیہ رنگ اور لا مقصدیت کو ترک کر کے اصلاحی جذبے ، اخلاقی تاثر یا حالاتِ حاضرہ کی تنقید و تشریح کے لیے غزل کو ذریعۂ اظہار بنایا - حالی کی غزل ذاتی معاملات اور شخصی واردات سے آگے بڑھ کر انسانیت ، کائنات ، مسائلِ حیات ، سماجی اصلاح ، سیاسی و تاریخی و قومی مسائل اور فلاحِ ملّت کے موضوعات سے متعلق ہو گئی - غزل میں حالی کے موضوعاتی تجربوں اور حالی کے نظریۂ شعر کا اثر دوسرے شاعروں پر بھی پڑا - چنانچہ حالی ہی کی طرح اسماعیل ، چکبست ، سلیم ، اکبر الہ آبادی اور پھر اقبال نے غزل کو افادی طور پر برتا اور اس میں ہر قسم کے مضامین ادا کیے -

غزل کی قلبِ ماہیت

دبستانِ لکھنؤ کے شعراء نے شاعری کو غزل میں اور غزل کو رعایتِ لفظی ، نازک خیالی اور رسمی و روایتی مضامین حسن و عشق کی حد تک محدود کر دیا تھا - غزل کی اس تنگ دامانی کے خلاف سب سے پہلے محمد حسین آزاد نے آواز اٹھائی اور پھر حالی نے اس آواز میں آواز ملائی - حالی نے نہ صرف اپنی غزلوں میں رسمی مضامین اور رسمی اندازِ بیان ترک کر کے حقائق و واقعات پر اپنے کلام کی بنیاد رکھی بلکہ 'مقدمۂ دیوان حالی' میں جو 'مقدمۂ شعر و شاعری' کے نام سے مشہور ہوا غزل میں ضروری اصلاحات کرنے کے لیے اپنی تجویزیں مدلل انداز میں پیش کیں - حالی کے خیالات کی شمع سے اوروں نے بھی شمع جلائی اور غزل کے فرسودہ مضامین اور ذخیرۂ الفاظ کے خلاف اظہار خیال کرتے ہوئے اپنی اپنی اصلاحی تجویزیں پیش کیں مثلاً شرر ، اسماعیل ، امداد امام اثر اور شاد عظیم آبادی

نے ۔ آزاد ، حالی اور ان کے معاصرین کی تجویزوں کا ماحصل یہ تھا کہ غزل میں صداقتِ جذبات ہونی چاہیے ، جنسی محبت کی تجدید نہیں ہونی چاہیے ۔ بلکہ ہر قسم کی محبت کی عکاسی کی جانی چاہیے ۔ محبت کے علاوہ دوسرے تاثرات و ہیجانات و کیفیات کو بھی موضوع بنایا جانا چاہیے ۔ غزل کو زندگی کا آئینہ اور ذہنی رجحانات کا ترجمان ہونا چاہیے ۔ حبِ وطن ، جذبات ملّی ، مناظرِ فطرت ، عہدِ رفتہ ، وارداتِ گزشتہ ، اصلاحِ معاشرت ، درستیٔ اخلاق کے موضوعات پر شعر ہونے چاہئیں اور اظہارِ تاثرات میں تبعیتِ فطرت اور مذاقِ صحیح کا خیال رکھا جانا چاہیے ۔ انگریزی اور ہندی ادب کے موضوعات ، خیالات ، علامات اور تلمیحات سے بھی استفادہ کیا جانا چاہیے ۔ لیکن زبان نرم و نازک ، فصیح و لطیف ، شیریں و سلیس ہونی چاہیے ۔ لہجے میں درستی اور رنگ اور کریہہ الفاظ سے بچا چاہیے اور ایسے الفاظ بھی استعمال نہیں ہونے چاہئیں جن سے کھلم کھلا معشوق کا مرد یا عورت ہونا پایا جائے ۔ صنائع بدائع ، ایہام ، ضلع ، جگت اور رعایت لفظی پر مضامین کی بنیاد نہیں رکھی جانی چاہیے ۔ ردیف کی پابندی کم کی جانی چاہیے اور مسلسل غزل کو رائج کرنے کی کوشش کی جانی چاہیے ۔

اگرچہ کئی شاعروں نے ان تجویزوں کو پسند کیا اور عملاً بھی اپنی غزلوں میں انھیں برتا تاہم پرانی روایات کو برقرار رکھنے والوں کی بھی کمی نہ تھی ۔ قدیم روایت غزل کے علمبردار بالعموم وہ تھے جو دیسی ریاستوں سے وابستہ تھے یا پھر ازمنۂ وسطیٰ کی قدروں کو ازمنۂ جدید کی قدروں پر ترجیح دیتے تھے ۔ دیسی ریاستوں میں وہ تہذیبی ، فکری ، معاشرتی ، سیاسی و اقتصادی تبدیلی ابھی پیدا نہیں ہوئی تھی جو برطانوی ہند میں ہو گئی تھی ۔ وہاں ابھی وہی قدیم جاگیردارانہ نظام پہلے کی طرح رائج تھا جس میں بادشاہ یا رئیس کی ذات مرکزی حیثیت رکھتی تھی اور اس کا دربار ہی زندگی اور معاشرت کے تمام پہلوؤں کی قدریں متعین کرتا تھا ۔ چنانچہ جو شعراء رامپور ، حیدر آباد ، بھوپال ، ٹونک اور دوسری دیسی ریاستوں سے وابستہ ہوئے وہ روایتی ، میکانکی قسم کی غزل ہی لکھتے رہے ۔ ان میں سر برآوردہ داغ ، امیر اور جلال ہوئے ۔

جدید نثر

سر سید کی ہمہ گیر تحریک کے لیے نثر کا وسیلہ نظم سے بھی زیادہ مفید ، کارگر اور مؤثر ثابت ہوا اور یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ اردو میں نثرِ جدید کا ارتقاء اسی تحریک کا مرہونِ منت ہے کہ اس کے مؤیدین اور مخالفین دونوں نے نثر کے وسیلے سے خوب کام لیا اور اردو ادب کے دامن کو ہر قسم کی نثری تحریروں سے بھر دیا ۔ سر سید سے پہلے

اردو نثر کا علمی و ادبی دائرہ بہت محدود تھا اور نثر کی مقدار بھی بہت کم تھی ۔ نثر کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ تبلیغِ افکار اور ترسیلِ علم کا کام دیتی ہے اور اس کے ذریعے وہ سیاسی ، سماجی . فکری ، علمی اور تہذیبی مقاصد آسانی سے پورے کیے جا سکتے ہیں جن کا بروئے کار لانا کسی خاص زمانے میں ضروری ہو جاتا ہے ۔ چنانچہ سر سید تحریک میں نثر کا پلہ اسی لیے نظم پر بھاری ہے کہ لکھنے والوں کو اپنے نقطۂ نظر کی اہمیت و افادیت ثابت کرنے کے لیے ایسی صنف اور ایسے اسلوب کا سہارا اپنا ضروری تھا جو مدلل ، رواں ، عام فہم اور اثر انگیز ہو ۔ یہی چیز جدید نثر کے ارتقاء کا سنگِ بنیاد بن گئی اور تھوڑے ہی دنوں کے اندر اردو نثر ۱۸۵۷ء تک مذہب و تصوف ، تذکرہ نویسی ، قصہ کہانیوں اور معمولی ترجموں سے آگے نہیں بڑھی تھی اب اس قابل ہو گئی کہ سیاسی ، تعلیمی ، علمی اور فلسفیانہ مضامین ، انشائیہ نگاری ، تاریخ نویسی ، خط نگاری ، علم کلام ، ناول ، افسانہ ، ڈراما ، ادبی تنقید وغیرہ اصنافِ ادب کو وجود میں لا سکے ۔

اشاعت میں توسیع اور انشائی ادب

اشاعت اور طباعت کی آسانیوں نے اخبارات اور رسائل کا اجراء آسان کر دیا تھا اور اخبارات و رسائل کے صفحات کو قدرتاً وقتی مسائل اور عصری مباحث سے بھرنا ضروری تھا ۔ مستقل کتابیں لکھنے کے مقابلے میں مختصر مضامین و مقالات میں اپنا مدعا اجمالاً و اشارتاً بیان کرنا آسان ہے ۔ اس لحاظ سے رسائل اور اخبارات روزمرہ زندگی میں پیدا ہونے والے سماجی ، علمی ، ادبی ، تہذیبی ، مذہبی اور سیاسی مسائل کی بحث کے لیے بہت موزوں ہوتے ہیں اور آہستہ آہستہ نئے میلانات اور رجحانات ، نئے رویوں اور تحریکوں کے لیے فضا کو سازگار بناتے ہیں ۔ چنانچہ ایسے ہی مساعد حالات تھے کہ ایڈیسن ، اسٹیل ، جانسن اور دوسرے انگریز مضمون نگاروں کی تحریریں ماسٹر رامچندر ، آزاد اور سر سید وغیرہ کے علم میں آئیں اور ان مضامین کے نمونے پر اردو میں اس صنف کو رواج پانے کا موقع ملا جسے اب انشائیہ کہا جاتا ہے ۔ انشائیہ ایک نئی اصطلاح ہے ورنہ ابتدا میں اس کو مضمون یا مقالہ کہہ کر ہی پکارا گیا ۔ اگرچہ اس کے لکھنے والے انشاء پرداز کہلاتے تھے ۔ خواہ ہم آزاد کو پہلا انشائیہ نگار قرار دیں یا ماسٹر رامچندر کو یا اس کی ابتدا کا سہرا 'تہذیب الاخلاق' کے سر یا ان مختلف رسالوں کے جو انیسویں صدی کے وسط میں نکلنے شروع ہو گئے تھے ، ہر لحاظ سے اس صنف نثر کا شمار دور جدید ہی میں کرنا ہوگا اور ہر حیثیت سے اس کو مغربی ادب کے مطالعے کا اثر قرار دینا ہوگا ۔ ماسٹر رامچندر کے انشائیوں میں کوئی ادبی حسن نہیں اور نہ وہ محاورہ کے پابند ہی تھے ، اس کے برعکس آزاد نے انگریزی انشائیوں کے جو ترجمے اور چربے پیش کیے ہیں ان کی ادبی حیثیت تو مسلم ہے لیکن

یہ سب رمزیہ اور تمثیلیہ انداز کے انشائیے ہیں جن کی بنا کسی نہ کسی اخلاقی مسئلے پر ٹوٹتی ہے - چنانچہ انہیں بجا طور پر اس صنف کا معمارِ اوّلین کہا جا سکتا ہے - پھر حالی ، محسن الملک ، چراغ علی ، ذکاء اللہ ، سلیم ، شبلی اور دوسرے مصنفین ہیں جنھوں نے اس صنف کو عام کیا - البتہ یہ درست ہے کہ ان سب مصنفوں کے انشائیوں میں عام طور پر شخصی عنصر کی بھی کمی ہے اور شگفتگی و لطافت اور سرور و دانشبنی کی بھی کیونکہ مقصدیت و اصلاح پسندی کے رجحان کی وجہ سے ان کے انشائیے بالعموم عالمانہ ، مدلل اور معروضی ہیں - جہاں تک سرور کا تعلق ہے ان کے جو انشائیے علمی و معلوماتی نہیں وہ بیشتر خاکے اور مرقعے ہیں - البتہ بیسویں صدی کے اوائل میں سجاد حیدر یلدرم نے انشائیہ نگاری کو علمی بوجھل پن اور مقصدی معروضیت سے آزاد کر کے ایک نئی جہت عطا کر دی - یلدرم کے بعد انشائیہ ایک ایسا ادب پارہ بن گیا جو منطق یا استدلال کے بغیر بڑھنے والے کو متاثر کرتا ہے اور جس میں زندگی کے مختلف مسائل اور اشیا کے بارے میں ایک تخلیقی ذہن کا استعجاب یا خوشگوار اور لطیف ردِّ عمل شگفتہ انداز میں پیش ہوتا ہے -

سوانح عمریوں کا شوق

انشائیوں کی طرح ، صحیح معنوں میں سوانح عمریاں لکھنے کا رواج بھی اردو میں مغربی اثرات اور نئے حالات کا مرہونِ منت ہے - مغربی اثرات کے نفوذ کے بعد اردو کی ابتدائی سوانح نگاری میں کسی حد تک مناظرانہ و مدافعانہ رنگ پایا جاتا ہے - مثلاً 'خطباتِ احمدیہ' (سر سید)، مولوی چراغ علی کی تصانیف 'بی بی ہاجرہ' اور 'ماریہ قبطیہ' ، اور نذیر احمد کی 'امہات الامہ' میں - البتہ شبلی نعمانی نے مدافعانہ رویے کے بجائے جارحانہ طرزِ عمل اختیار کیا - چنانچہ غالباً اسی لیے ان کی سوانح عمریوں میں جذباتی تحریک کا عمل دخل زیادہ ہے - اس کے برعکس حالی کی سوانح عمریوں میں علمی تحریک زیادہ کارفرما ہے - حالی اور شبلی کی سوانحی تصانیف کے دیباچوں سے مغربی اثرات کی کھلی شہادت ملتی ہے - شرر نے بھی کئی سوانح عمریاں ، خاکے اور مرقع لکھے جن میں سوانحی اور شخصی جزئیات پر مرکوز رکھی - سوانح نگاری کے مغربی تصورات کو قبول کرنے کے لیے اس دور کے ہر مصنف میں عام آمادگی نظر آتی ہے لیکن چونکہ ان تصورات کی ماہیت سے صحیح اور مکمل واقفیت نہیں پیدا ہوئی تھی اس لیے یہ سوانح نگار فن کے صحیح تقاضوں کی جن کی خالص علمی اور فنّی نقطۂ نظر سے ان سے توقع تھی تکمیل نہیں کر سکے - دعویٰ تو ان مصنفین کا یہ تھا کہ وہ اپنی سوانح عمریوں میں غیر جانبدار ہیں ، لیکن چونکہ اس دور کی سوانح نگاری کا سرچشمہ تحریک جذبۂ احیائے قومی تھا اس لیے

غیر جانبداری برقرار نہیں رہ سکی ۔ اس لیے اس دور کی سوانح نگاری میں شخصی حیثیت سے اشخاص کا مطالعہ کرنے کی کوشش اتنی نہیں ہے جتنی ہونی چاہیے ، بلکہ تاریخی احساس اور تاریخی نقطۂ نظر زیادہ غالب ہے ۔ اکثر اوقات سوانح عمری کو تاریخ نویسی کا واسطہ بنایا گیا ہے ۔

سوانح عمری کے ذریعے سے تاریخ لکھنے کا کام زیادہ تر شبلی نے انجام دیا چنانچہ ان کی سوانحی تصانیف میں حیات سے زیادہ کارناموں پر بحث ملتی ہے اور انداز بیان تشریحی و توضیحی ہوتا ہے ۔ وہ کارلائل سے بہت متاثر ہیں چنانچہ تاریخ عالم کو مشاہیر عالم کی تاریخ قرار دیتے ہیں ۔ لیکن وہ تاریخ نگاری کو فلسفے کا ایک شعبہ بھی سمجھتے ہیں جس کے چند عقلی اور سماجی اصول ہوتے ہیں ۔ اسی لیے وہ کسی واقعے کے بیان کے لیے اس کے پس منظر میں پھیلے ہوئے طویل سلسلۂ اسباب کی جستجو کرنے کی بھی کوشش کرتے ہیں ۔

خطوط

اردو میں خطوط لکھنے کا آغاز اگرچہ انیسویں صدی کے نصف اول ہی میں ہو چکا تھا لیکن اس میں فارسی اندازِ خط نگاری کی پیروی کی جاتی تھی ، وہی القاب و آداب ، وہی سرنامے ، وہی عنوان ، وہی اختتامیے ، وہی تکلف ، وہی رنگینی ، وہی رنگ انشا ۔ البتہ 'انشائے بے خبر' سے اندازہ ہوتا ہے کہ سادگی کا کچھ کچھ میلان پیدا ہو رہا تھا ۔ لیکن صحیح معنوں میں نئی طرز کی ایجاد کا سہرا غالب کے سر ہے جن کے خطوط کا مجموعہ کتابی صورت میں ۱۸۶۹ء میں شائع ہوا ۔ ان خطوں کی مقبولیت سے اردو خط نگاری کو ایک خاص ادبی رتبہ حاصل ہو گیا چنانچہ اسی لیے آگے چل کر کئی ادباء و علماء کے خطوط کتابی شکل میں شائع ہوئے مثلاً سر سید ، شبلی ، حالی ، اکبر الہ آبادی وغیرہ کے ۔ اس طرح خط نگاری بھی نثر کی ایک مستقل ادبی صنف بن گئی ۔

ناول

جس صنفِ ادب کو ناول کہا جاتا ہے اس کی اردو میں ابتدا بھی نئے سماجی اور ذہنی حالات کی مرہون منت ہے ۔ انگریزوں کی حاکمیت کے برّ صغیر پر مستحکم ہو جانے کی وجہ سے زندگی پیچیدہ تر ہو گئی تھی اور اس کی گتھیوں کو سلجھانے یا اس کا تذکرہ کرنے کے لیے ایک پیچیدہ ادبی ہیئت کی ضرورت تھی اور اسی تاریخی ضرورت کو ناول نے پورا کیا ۔ اردو کے پہلے ناول نگار نذیر احمد قرار دیے جا سکتے ہیں کہ ان کے قصے

ان کی سماجی بصیرت اور تاریخی شعور کی آئینہ داری کرتے ہیں اور ان کے تخلیق کردہ اہم کرداروں میں کوئی بھی محض تخئیل کی پیداوار نہیں اور کوئی بھی اپنے زمانے کی کشمکش سے دور نہیں ۔ وہ اپنے عہد کے مسائل پر قصے کی بنیاد رکھتے ہیں ۔ ان کا اپنے ناولوں کے ذریعے مسائلِ حیات کو پیش کرنا محض اتفاق نہیں قرار دیا جا سکتا ۔ غالباً وہ مغرب کی اس صنف ادب کی اہمیت کو جان گئے تھے اور اس کی مدد سے وہ حقائق پیش کر رہے تھے جسے وہ کسی اور شکل میں پیش نہیں کر سکتے تھے ۔ رتن ناتھ سرشار کو سروانیٹز کے ناول پڑھنے کے بعد اپنی راہ ملی اور شرر کو اسکاٹ کا ٹیلسمن پڑھنے کے بعد ۔ سرشار کے ناول اگرچہ فنی خصوصیات کے لحاظ سے ناقص رہے ۔ لیکن زندگی کے مظاہر ہونے کی حیثیت سے بلند پایہ بن گئے ۔ سرشار نے اپنے کرداروں کے ذریعے روایت اور تسخیر ، قدیم اور جدید بدلتی ہوئی قدروں ، تعلیمی مسئلوں ، مذہبی اور سماجی اداروں ، رسموں اور رہن سہن کے طریقوں کو اجاگر کیا ۔ اس کے برعکس شرر نے اپنے زیادہ تر ناول مسلمانوں کی قدیم تاریخ سے متعلق تصنیف کیے اور مسلمانوں کے جذبۂ افتخار و برتری کو اکسانے کی کوشش کی ۔ انھوں نے انگریزی ناولوں کے انداز پر پلاٹ تعمیر کر کے ناول کے فن میں ایک اہم عنصر کی طرف لکھنے والوں کو متوجہ کیا ۔ پھر رسوا نے 'امراؤ جان ادا' لکھ کر جاندار حقیقت نگاری اور بلند پایہ فنکاری کی داغ بیل ڈالی ۔ اس طرح ناول کی صنف برابر چڑھتی گئی ۔

مختصر افسانے

ادبی اصناف کے سب ناموں کا کھوج لگانے والے اردو میں مختصر افسانے کا رشتہ ویسے تو قدیم کہانیوں اور حکایتوں سے جوڑ سکتے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ مختصر افسانہ مغربی اثرات ہی کی پیداوار ہے اور عصری تقاضوں کا نتیجہ ہے ۔ اردو میں مختصر افسانہ نگاری کا آغاز پریم چند اور سجاد حیدر یلدرم کی تحریری کاوشوں سے پہلے مشکل ہی سے کہا جا سکتا ہے اور اگر کسی رسالے یا اخبار میں ۱۹۰۵ء سے پہلے ایسی کہانیاں مل جائیں جنھیں جدید مفہوم میں مختصر افسانہ کہا جا سکے تو وہ بھی مغربی اثرات ہی کا پرتو ہوں گے ۔

اخبارات

برِ صغیر میں مطبوعہ اخبارات کا وجود بھی انگریزی اثرات کا مرہون منت ہے ۔ فارسی اور اردو اخبارات جب جاری ہوئے تو انگریزی صحافت کے نقش قدم پر چلے ۔ 'اودھ اخبار' نے جو ۱۸۵۸ء سے جاری تھا جب ۱۸۷۷ء میں روزنامے کا روپ اختیار کیا

تو لندن کے اخبار 'ٹائمز' کو نمونہ بنایا - ہر چند کہ 'اودھ اخبار' کی صحافت کا پایہ اعلیٰ نہ تھا لیکن اس نے صحافت کی ان گھٹیا ترکیبوں اور داؤ پیچ سے بھی دامن آلودہ نہ کیا جو اس عہد میں عام ہو گئے تھے - علاوہ بریں اس اخبار نے سرشار اور شرر کو تعلیم یافتہ طبقے میں روشناس کرا کے اردو ادب پر بڑا احسان کیا - 'اودھ اخبار' کے روزنامہ بننے کے بعد ہی 'اودھ پنچ' جاری ہوا جس نے لندن کے 'پنچ' کو اپنے لیے نمونہ بنایا اور صحافت کے میدان میں طنز و مزاح کا عنصر غالب کر دیا - اگرچہ 'اودھ' پنچ سے پہلے بھی مزاحیہ صحافت کے کچھ آثار ملتے ہیں لیکن چونکہ 'اودھ پنچ' سے اس عہد کے بہت سے سربرآوردہ ادیب اور انشا پرداز وابستہ تھے اور اس نے سر سید تحریک کی مخالفت کو اپنا شعار بنایا تھا اس لیے بہت مقبول ہوا - اس اخبار نے مزاحیہ صحافت کو نہایت شوخ انداز میں پیش کیا جس کی سرحدیں ابتذال اور دھکڑ پن سے ملا دیں - لیکن یہ بھی درست ہے کہ اس نے ایک خاص سیاسی ، سماجی اور تہذیبی مسلک قائم کیا اور سماجی اور تمدنی زندگی پر طنز و ظرافت کے پردے میں انتہائی کڑی تنقید کی جس کے پیچھے کبھی دم توڑتے اقدار و تصورات سے بغاوت کا جذبہ تھا اور کبھی ان کی اصلاح کا - 'اودھ پنچ' کے اڈیٹر مرزا سجاد حسین نے یوں تو کئی مزاحیہ ناول بھی لکھے لیکن ان کا زیادہ اہم کارنامہ 'اودھ پنچ' کی ادارت ہی تھا - انھوں نے سید محمد خان آزاد ، احمد علی شوق ، جوالا پرشاد برق ، احمد علی کسمنڈوی ، ترہبون ناتھ ہجر ، مرزا مچھو بیگ ستم ظریف ، اکبر الہ آبادی وغیرہ کا تعاون حاصل کیا جن کی شوخ و شنگ تحریروں نے 'اودھ پنچ' کو صحافت کے بجائے ادبیات کا مخزن بنا دیا - اکبر الہ آبادی 'اودھ پنچ' کے نکلنے سے پہلے سنجیدہ شاعر تھے لیکن اس اخبار کا رنگ دیکھ کر جب اس میں لکھنے لگے تو نثر اور نظم دونوں میں طنز و مزاح کا پیرایہ اختیار کیا - غرض یہ کہ ۱۸۷۷ء تک 'اودھ پنچ' کا دور دورہ کبھی سرد اور کبھی گرم طریقے پر چلتا رہا اور اس نے اردو ادب میں ایسے اجزا کی نمائندگی کی جو ابھی تک اس محفل میں موجود نہ تھے -

ڈرامہ

اردو کے ابتدائی ڈرامے جو واجد علی شاہ ، امانت اور مداری لال نے لکھے تھے ڈرامے سے زیادہ رہس اور جلسے کہلانے کے مستحق تھے کہ ان میں تفریحی عنصر پیش نظر تھا اور شعوری طور پر زندگی کی ترجمانی لکھنے والوں کے پیش نظر نہیں تھی - یہ دراصل رقص و موسیقی ہی کی توسیع کی حیثیت رکھتے تھے اور ان میں ڈرامائی عناصر برائے نام ہی تھے - مغربی اثرات کی وجہ سے برِ صغیر میں جو نیا متوسط طبقہ پیدا ہو رہا تھا اس نے مغربی تفریحی روایات کا کچھ سطحی شعور حاصل کر لیا تھا - چنانچہ اسی شعور کی تسلی و تسکین کی

خاطر ، انگریزی اسٹیج اور ڈرامے کی روایت کو رقص و موسیقی کی دیسی روایت سے آمیز کر کے نئے متوسط طبقے کی تفریح کا سامان بہم پہنچانے کی کوششوں سے جدید انداز کا اسٹیج اور جدید طرز کا ڈراما اردو میں متعارف ہو گیا ۔ پارسی تاجروں نے اس میں بڑا حصہ لیا ۔ ۱۸۵۷ء سے پہلے ہی اس قسم کے ڈرامے بمبئی تھیٹر میں شروع ہو گئے تھے ، لیکن جن تھیٹروں میں اس قسم کے ڈرامے دکھائے جاتے تھے ان کی کوئی قومی یا تہذیبی اہمیت نہیں تھی بلکہ یہ صرف نئے تجارتی مراکز کی تفریح گاہ تھے ۔ ایسے ڈرامے معمولی تغیرات کے ساتھ کئی برس تک دکھائے جاتے رہے ۔ عموماً ڈرامے لکھنے والے معمولی صلاحیتوں کے ادیب تھے اور جن میں اچھی صلاحیتیں تھیں وہ خود بھی عوام کے تفریحی معیار سے بلند نہ کر سکے چنانچہ اسی لیے اگرچہ اس صنف میں مقداری لحاظ سے بہت بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا لیکن ادبی اور فنی لحاظ سے یہ صنف کم مایہ ہی رہی ۔

ادبی تنقید

یوں تو ادبی تنقید کی کچھ جھلکیاں شعرائے اردو کے قدیم تذکروں میں بھی مل جاتی ہیں کہ تذکرہ نگاروں نے شعراء کے متعلق رائیں بھی دی ہیں اور کہیں کہیں معمولی سوانحی یا نفسیاتی اشارے بھی دے دیے ہیں ۔ لیکن قدیم تذکرہ نویسوں نے بالعموم شعراء کی شاعری کو نہ تو اجتماعی یا انفرادی شعور سے متعلق کرنے کی کوششیں ہی کیں اور نہ ہی ان کے اشاروں سے شاعری کے عصری رجحانات یا بنیادی تقاضوں پر خاطر خواہ روشنی پڑتی ہے ۔ ان کی تنقیدوں میں مضامین کی تحلیل ، خیالات کے تجزیے یا مواد کی حقیقت سے یا شاعر کے شعور سے اتنی دلچسپی نظر نہیں آتی جتنی شاعری کے ظاہری فنی مسائل ، طرزِ اظہار اور زبان و بیان سے ۔

البتہ مغربی خیالات سے متاثر ہو کر محمد حسین آزاد نے اگست ۱۸۶۷ء میں جو لکچر انجمنِ پنجاب لاہور میں دیا اسے جدید ادبی تنقید کا نقطۂ آغاز قرار دیا جا سکتا ہے ۔ اس لیکچر میں نئی صورتِ حال اور اپنے ادب کو نئے تصورات سے مالا مال کرنے کی خواہش کا اظہار تھا ، شاعری میں حقیقت اور اصلیت سے کام لینے پر زور دیا گیا تھا اور قدیم اردو شاعری کی خامیوں اور کوتاہیوں کی طرف واضح الفاظ میں اشارہ کیا گیا تھا ۔ آزاد کا یہ لیکچر تاریخی طور پر اہم ضرور ہے لیکن ان کے اصل تنقیدی کارنامے 'آبِ حیات'، 'نگارستانِ فارس'، 'سخندانِ فارس'، 'مقدمہ' دیوانِ ذوق' اور 'دیباچہ' نیرنگِ خیال' ہیں ۔ آزاد نے شاعری کی ماہیت ، خیال اور الفاظ کے تعلق اور شعر کی افادیت کے مسئلے پر بھی غور کیا تھا ، لیکن ساتھ ہی وہ معانی و بیان کی ان خصوصیات کو بھی پسند کرتے تھے جن سے مشرقی شاعری کا حسن و کمال وابستہ ہے ۔ حالی کے شعور میں ، اس دور میں پیدا ہونے والی

عقلیت ، اجتماعیت و مادیت کا تصور اور سائنٹفک نقطہ نظر جس طرح واضح طور پامتلر ہے ، ویسا آزاد کے یہاں نہیں ملتا ۔

حالی اپنے مقدمہ 'شعر و شاعری' اور تنقیدی تحریروں میں شعر و ادب کو شعوری طور پر سماجی زندگی سے مربوط کرتے ہیں ۔ وہ اردو کے پہلے نقاد ہیں جنھوں نے ایک منظم اور مربوط شکل میں تنقیدی نظریات کو پیش کیا اور اس طرح اصولِ تنقید کی تدوین کا کام سماجی اور اخلاقی بنیادوں پر حالی ہی کے ہاتھوں شروع ہوا ۔ انھوں نے مغرب سے اثر تو لیا لیکن مغرب کی اندھی تقلید نہیں کی ۔ ان کے تنقیدی تصورات نہ خالص مشرقی ہیں نہ خالص مغربی بلکہ انھوں نے مغربی تنقید اور مشرقی نقطہ نظر میں سوند قائم کر کے ایک اجتہادی شان پیدا کی ۔

آزاد اور حالی کے بعد اس دور کے سرمایہ ادب میں وقیع تنقید کا اضافہ کرنے والے شبلی ہیں جن کی 'شعر العجم' ، 'موازنہ انیس و دبیر' ، 'سوانح مولانا روم' اور متعدد تنقیدی مقالات ان کے تاریخی شعور کی بھی آئینہ داری کرتے ہیں اور ان کے ذوق ، وجدانی اور جمالیاتی نظریہ تنقید کے نقوش بھی ابھارتے ہیں ۔ ویسے تو اس دور میں تنقید کو جن لوگوں نے ایک مستقل فن کی حیثیت سے استعمال کیا اور چند اصولوں کی روشنی میں عملی تنقید کی طرف توجہ دی وہ آزاد ، حالی اور شبلی ہی ہیں ، لیکن تنقیدی نظریات اور عملی تنقیدوں کے کچھ نمونے سرسید ، نذیر احمد اور 'تہذیب الاخلاق' کے دوسرے مضمون نگاروں کے یہاں بھی مل سکتے ہیں ۔ بعد کے نقادوں میں وحیدالدین سلیم ، امداد امام اثر اور مہدی افادی نے حالی اور شبلی کے نظریات ہی کا اتباع کیا ۔

ادبی ماحول ۔ مجموعی تاثر

از

مدیر عمومی

۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۴ء تک کا دور صحیح طور پر انقلابی دور کہلا سکتا ہے کیونکہ اس دور میں ایک طرف ہم اپنی پرانی اقدار سے بیگانہ ہوتے گئے اور دوسری طرف نئے سیاسی اور ثقافتی رجحانات ہمارے اذہان میں داخل ہوئے ۔ جہاں پہلے عشق کے جذبہ کی پرستش ہوتی تھی اور اسے زندگی کا ماحصل قرار دیا جاتا تھا ، وہاں حالی کی ایسی نظمیں چھپنے لگیں :

اے عشق تو نے اکثر قوموں کو کھا کے چھوڑا
جس گھر سے سر اٹھایا اسے بٹھا کے چھوڑا

رایوں کے راج چھینے شاہوں کے تاج چھینے
گردن کشوں کو اکثر نیچا دکھا کے چھوڑا

حالی کی مثنویوں کا اگر مومن کی مثنویوں سے مقابلہ کیا جائے تو یہ بات اور بھی واضح ہو جائے گی ۔ موضوع ہی نہیں بدلے ، مخاطب بھی بدل گئے ۔ یہاں تک کہ اقبال نے من و تو کی آویزشوں سے بھی مسلمانانِ ہند • بند کو ایک طرح آزاد کر دیا ۔ ان کے چند اشعار ملاحظہ ہوں جو ان غزلوں سے لیے گئے ہیں جو ۱۹۰۸ء سے پہلے لکھی گئی تھیں ۔ ان میں ان کے تمام تصورات اپنی ابتدائی شکل میں نظر آئیں گے :

نشہا کے درس نہ رکھ ہے سونے اے واعظ
خدا وہ کیا ہے جو بندوں سے احتراز کرے

یا

میں جبھی تک تھا کہ تیری جلوہ پیرائی نہ تھی
جو نمودِ حق سے مٹ جاتا ہے وہ باطل ہوں میں

علم کے دریا سے نکلے غوطہ زن گوہر بدست
وائے محرومی ! خزف چینِ لبِ ساحل ہوں میں

یا

تقلید کی روش سے تو بہتر ہے خودکشی
رستہ بھی ڈھونڈ خضر کا سودا بھی چھوڑ دے

مانندِ خامہ تیری زباں پر ہے حرفِ غیر
بیگانہ شے پہ نازشِ بیجا بھی چھوڑ دے

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے
(ما قبل - ۱۹۰۵ء)

یا

گیا ہے تقلید کا زمانہ ، مجاز رختِ سفر اٹھائے
ہوئی حقیقت ہی جب نمایاں تو کس کو یارا ہے گفتگو کا

یا

نیا جہاں کوئی اے شمع ڈھونڈے کہ یہاں
ستم کش تپشِ نا تمام کرتے ہیں
(۱۹۰۵ء تا ۱۹۰۸ء)

اور

میں ظلمتِ شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو
شرر فشاں ہوگی آہ میری، نفس مرا شعلہ بار ہوگا

فرضی داستانوں کی جگہ معاشرتی ناول، نذیر احمد کا 'مرأۃ العروس'، 'فسانۂ مبتلا'، 'توبۃ النصوح' یا سجاد حسین کا 'میٹھی چھری' اور 'طرحدار لونڈی' یا محمد علی کا 'گورا' اور میرزا ہادی حسن رسوا کا 'امراؤ جان ادا'، اور مرزا سعید کا 'یاسمین' اور راشد الخیری کے ابتدائی ناول منصۂ شہود پر آ گئے۔ تغزل پرستی کی جگہ سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی مسائل نے لے لی۔ شعراء ان مسائل سے شدت کے ساتھ متاثر ہونے لگے۔ اس لیے بے اختیار زبان شعر سے بیان کر دیتے تھے۔ خوشی محمد ناظر کی نظم 'جوگی' اس عہد کا ایک ایسا شاہکار ہے جس میں معاشی، معاشرتی مسائل کا زیادہ ذکر ہے۔ یہ بڑی بڑی نظموں کا دور ہے جس میں اقبال نے بھی اپنی 'بانگ درا' میں ذیل کی مشمولہ نظمیں کہیں: تصویر درد (۱۹۰۵ء)، نالۂ یتیم (۱۸۹۹ء)، شکوہ (۱۹۱۱ء)، شمع و شاعر (۱۹۱۲) جوابِ شکوہ (۱۹۱۳ء)۔

تیسرا باب

سر سید احمد خاں

سوانح

سر سید احمد خاں ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء بمطابق ۵ ذوالحجہ ۱۲۳۲ھ کو دہلی میں راجہ بیرم خان کے قریب اپنے نانا کی حویلی کے اس حصہ کے اندر جو خواص پورہ کہلاتا تھا ، ایک معزز برآوردہ خاندان سادات میں پیدا ہوئے - یہ دو بھائی اور ایک بہن تھے - ان کے بھائی کا نام سید محمد خاں اور بہن کا صفیہ النساء بیگم تھا - ان کے والد سید محمد متقی ، جن کا سلسلۂ نسب چھتیس (۳۵) واسطوں سے آنحضرت تک پہنچتا ہے بادشاہ وقت کے مقربین میں شامل تھے - ان کے نانا دبیر الدولہ امین الملک خواجہ فریدالدین احمد خان نہایت نامور اور صاحب علم و فضل اور صوفی منش آدمی تھے اور خصوصاً ریاضی میں ید طولیٰ رکھتے تھے - اس زمانہ میں جیسا کہ مسلمان اشراف بچوں کی تعلیم کا عام دستور تھا ، سید احمد خان محلہ کے مکتب میں قدیم فارسی نصاب کی کتابیں پڑھنے کے بعد اٹھارہ سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہوئے - انھی ایام میں ان کے بڑے بھائی سید محمد خاں نے اردو زبان کا غالباً پہلا اخبار 'سید الاخبار' کے نام سے جاری کیا - جس میں یہ بھی مقالہ نگاری کرنے لگے اور اس طرح سید احمد خان کی مضمون نویسی کا آغاز ہوا - یہ وہ عہد تھا جب کہ تمام قوم بادۂ غفلت میں سرشار تھی عیش و نشاط کی رنگین محفلیں شبانہ روز گرم رہتی تھیں ، عاشقانہ شاعری کی دھوم تھی - چنانچہ یہ بھی مشاعروں میں جا کر طبع آزمائی کرتے تھے - ایک مختصر سی مثنوی بھی لکھی اور 'آہی' تخلص اختیار کیا - ۱۸۳۸ء میں یکایک ان کے والد وفات پا گئے تو خانگی تفکرات سے مجبور ہو کر ان کو تلاش معاش کرنی پڑی - چنانچہ ان کے خالو ، مولوی حسین اللہ خان نے جو دہلی کے صدر امین تھے ، ان کو اپنے ہاں سر رشتہ دار مقرر کر دیا - ۱۸۳۹ء میں آگرے جا کر کمشنری کے دفتر میں نائب منشی کے عہدہ پر مقرر ہو گئے - جہاں اڑھائی سال تک متعین رہے - آگرہ میں انہوں نے فارسی زبان میں ایک فہرست بطور نقشہ کے مرتب کرکے 'جام جم' کے نام سے ۱۸۴۰ء میں طبع کرائی - اس زمانہ میں منصفی کے امتحان کے امیدواروں کے لیے قوانین دیوانی کی ایک تلخیص اپنے بھائی سید محمد خان کی شراکت سے 'انتخاب الاخوین' کے نام سے چھپوائی - یہ ان کی دوسری تالیف تھی -

دسمبر ۱۸۴۱ء میں منصفی کا امتحان پاس کیا اور مین پوری میں منصف مقرر ہوئے -

جنوری ۱۸۴۲ء میں وہاں سے تبدیل ہو کر فتح پور سیکری (ضلع آگرہ) میں آ گئے جہاں چار سال کے قیام میں تین فارسی رسالوں کے ترجمے شائع کیے ۔ ان میں 'جلاء القلوب' اور 'تحفۂ حسن' کا موضوع مذہبی ہے ۔ تیسرا رسالہ 'علمِ جرِّ ثقیل' ہے ۔ انہی ایام میں دلی کے آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر نے سر سید کو ان کا موروثی خطاب 'جواد الدولہ' باضافۂ 'عارف جنگ' عطا کیا ۔

جس زمانے میں سید احمد خاں فتح پور سیکری میں منصف تھے ، سید محمد خاں بہ کام ضلع فتح پور میں منصف تھے ۔ ۱۸۴۵ء میں یہ دونوں بھائی اپنی ماں کے پاس دلی آئے ہوئے تھے کہ سید محمد خاں کا عین عالمِ شباب میں انتقال ہو گیا ۔ سید احمد خاں کو بھائی سے والہانہ محبت تھی ، اس لیے وفت موت کا کچھ ایسا اثر ہوا کہ انہوں نے رنگین مزاجی ترک کر کے مولویانہ وضع اختیار کر لی ۔ والدہ کی دلجوئی کی خاطر سید احمد خاں نے فتح پور سیکری سے اپنا تبادلہ دہلی میں کرا لیا ۔

فروری ۱۸۴۶ء میں جب سر سید احمد خاں دہلی پہنچے تو ان کی عمر انتیس برس کی تھی ۔ نو برس تک دہلی میں متعین رہے ۔ ابھی تک یہاں علومِ قدیمہ کا چرچا تھا ۔ جیّد اساتذہ موجود تھے جن سے انہوں نے فقہ ، حدیث اور قرآنِ مجید کی تعلیم حاصل کی اور پرانے سبق از سرِ نو غور اور توجہ سے پڑھے ۔ اس کے بعد وہ ہمہ تن تصنیف و تالیف میں مصروف ہو گئے ۔ انہوں نے اپنے مرحوم بھائی کی یادگار 'سید الاخبار' کو دوبارہ جاری کیا ۔

۱۸۴۷ء میں انہوں نے اپنی پہلی معرکۃ الآرا تصنیف 'آثار الصنادید' اپنے دوست مولانا امام بخش صہبائی کی علمی اعانت سے شائع کی ۔ اس کا دوسرا اڈیشن بہت سے اضافوں کے ساتھ ۱۸۵۴ء میں شائع ہوا ۔ جس کا ترجمہ مشہور فرانسیسی مستشرق 'گارساں دی تاسی' نے ۱۸۶۱ء میں فرانسیسی زبان میں شائع کیا ۔ اسی دوران میں سات اردو رسائل ، (۱) 'فوائد الافکار فی اعمال الفرجار' (ترجمہ ۱۸۴۶ء) ۔ (۲) 'کلمۃ الحق' (مؤلفہ ۱۸۴۹ء) ۔ (۳) 'راہِ سنت و ردِ بدعت' (مؤلفہ ۱۸۵۰ء) ۔ (۴) 'نمیقہ' در بیان مسئلۂ تصور شیخ (مؤلفہ ۱۸۵۲ء) ۔ (۵) 'سلسلۃ الملوک' (مرتبہ ۱۸۵۲ء) ۔ (۶) کیمیائے سعادت کے چند ابتدائی اوراق کا اردو ترجمہ (مرقومہ ۱۸۵۳ء) ۔ (۷) 'قول متین در ابطالِ حرکتِ زمین' (مؤلفہ ۱۸۴۸ء) طبع کرائے ۔ ان میں ریاضی ، مذہب ، تصوّف ، تاریخ ، فلسفہ اور جغرافیہ سے متعلق مضامین ہیں ۔

جنوری ۱۸۵۵ء میں ترقی پا کر بجنور میں صدر امین کے عہدے پر مقرر ہوئے ۔ وہاں نہایت محنت اور تحقیق سے ضلع بجنور کی ایک مستند تاریخ مرتب کی ۔ اس کے بعد ابوالفضل

کی 'آئین اکبری' کی پہلی اور تیسری جلدیں تصحیح کے بعد شائع کیں ۔ دوسری جلد کا مسودہ ایک مفصل اور محققانہ دیباچہ کے ساتھ دہلی کے ایک مطبع میں زیر طبع تھا کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں تلف ہو گیا ۔ ضلع بجنور کی تاریخ کا مسودہ بھی اسی زمانے میں آگرہ میں ضائع ہو گیا ۔ اس جنگ میں انگریز کامیاب ہوئے ۔ اور دلی کے آخری مغلیہ بادشاہ قید کر کے رنگون بھیج دیا گیا اور لاکھوں بے گناہوں کا قتل عام ہوا ۔ ہزاروں اعلیٰ خاندان تباہ ہو گئے ، ان کی جائیدادیں ضبط کر لی گئیں ۔ ہندوستان کی یہ بربادی اور بالخصوص مسلمانوں کی تباہی دیکھ کر سر سید کا دل ٹوٹ گیا ۔ انہوں نے دل برداشتہ ہو کر ترک وطن کر کے مصر میں سکونت اختیار کرنے کا ارادہ کر لیا ۔ مگر جلد اس ارادے سے باز آ گئے اور اپنے ہم مذہب بھائیوں کو مصیبت میں چھوڑ کر تنہا گوشۂ عافیت میں جا بیٹھنے کو نامردی اور بے مروتی قرار دیا اور قومی ہمدردی کو پسند کیا ۔ چونکہ سر سید دیانتداری اور نیک نیتی کے ساتھ انگریزی راج کو امن و امان کا ذمہ دار سمجھتے تھے ، اس لیے انہوں نے ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں میں انگریزوں کی مدد بھی کی اور اپنے فرائض منصبی کو خوبی سے انجام بھی دیا تھا ۔ اس لیے انگریزوں نے میر صادق علی اور میر رحمت علی رئیسان چاند پور (ضلع بجنور) کا علاقہ بغاوت کے جرم میں ضبط کر کے تعلقہ جہاں آباد جو اس وقت ایک لاکھ روپیہ سے زیادہ مالیت کا تھا سر سید کو دینا چاہا مگر سر سید نے اس کے لینے سے انکار کر دیا اور اس انعام کے بدلے پنشن لینا منظور کیا ۔ ۱۸۵۸ء میں صدر الصدور کے عہدہ پر ترقی پا کر مراد آباد متعین ہو گئے ۔ سب سے پہلے 'تاریخ سرکشی بجنور' شائع کی ، ۱۸۵۹ء میں 'رسالہ اسباب بغاوت ہند' طبع کرایا ۔ ۱۸۶۰ء میں رسالہ 'لائل محمڈنز آف انڈیا' (وفادار مسلمان ہند) جاری کیا جو ایک سال تک شائع ہو کر بند ہو گیا ۔ ۱۸۶۱ء میں رسالہ 'تحقیق لفظ نصاریٰ' چھپوایا ۔ ان تمام کوششوں کا مقصد صرف یہ تھا کہ انگریزوں کے دل مسلمانوں سے صاف ہو جائیں اور مسلمانوں کی معاشری اور تعلیمی اصلاحات کے لیے میدان صاف کیا جائے ۔ ۱۸۶۱ء میں ان کی بیوی کا انتقال ہو گیا جنہوں نے اپنی یادگار سید احمد ، سید محمود (دو بیٹے) اور ایک کمسن بیٹی چھوڑی اس وقت سید احمد خان کی عمر تقریباً (۴۴) برس تھی ، ان کی صحت بہت اچھی تھی مگر انہوں نے دوسری شادی نہ کرنے کا فیصلہ کیا اور اپنی عمر کا قیمتی حصہ تجرد میں کمال پارسائی کے ساتھ گزار کر قومی خدمات کی نذر کر دیا ۔

مئی ۱۸۶۲ء میں سید احمد خان کی تبدیلی مراد آباد سے غازی پور ہو گئی ۔ جہاں انہوں نے 'انجیل' کی تفسیر (عہد عتیق سے کتاب پیدائش کے گیارہویں باب تک اور عہد جدید میں سے انجیل متی کے پانچویں باب تک) اسلامی نقطۂ نظر سے مرتب کر کے اردو میں اور انگریزی ترجمہ کے ساتھ 'تبئین الکلام' کے نام سے شائع کی ۔

۱۸۶۲ء میں غازی پور میں سائنٹفک سوسائٹی کی بنیاد رکھی جس کا نصب العین اعلیٰ درجہ کی قدیم کتابوں اور علومِ جدیدہ کی مفید انگریزی کتابوں کے ترجمے کرا کے چھپوانا تھا - غازی پور میں اس سوسائٹی نے باقاعدہ کام شروع کیا اور علومِ جدیدہ کو مسلمانوں میں روشناس کرانے میں کافی خدمات سر انجام دیں - ۱۸۶۴ء میں ان کا علیگڑھ تبادلہ ہو گیا - تو وہ اپنے ساتھ سوسائٹی کا تمام ساز و سامان اور عملہ بھی غازی پور سے علی گڑھ لے آئے - اسی سال وہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن کے رکن منتخب کیے گئے - ۱۸۶۶ء میں ایک رسالہ 'علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ' جاری کیا - جو ان کے آخری دم تک جاری رہا - اس میں ان کے مفید اور معرکے کے مضامین شائع ہوتے رہے - اگست ۱۸۶۷ء میں وہ ترقی پا کر جج بن گئے اور ان کا تبادلہ علی گڑھ سے بنارس ہو گیا - جہاں انہوں نے رسالہ 'احکامِ طعامِ اہلِ کتاب' شائع کیا - اپریل ۱۸۶۹ء میں رخصت لے کر بنارس سے انگلستان کے سفر پر روانہ ہوئے - اس سفر کی غرض و غایت انگلستان کے حالات کا مشاہدہ کر کے اپنے ہم وطن مسلمانوں میں جدید تہذیب اور علوم و فنون کو رواج دینا تھی - لندن میں ان کو سی - ایس - آئی کا خطاب اور تمغہ عطا کیا گیا - یہیں انہوں نے اپنی مایۂ ناز تصنیف 'خطباتِ احمدیہ' مرتب کر کے شائع کی اور اپنے سفر کے حالات و تاثرات انگلستان سے سوانر بھیجتے رہے - جو ہندوستان کے اخبارات میں چھپتے رہے ، اس طرح اہلِ وطن کو مغرب کے ایک تہذیب یافتہ ملک کے حالات سے آگاہی ہوتی رہی - انگلستان میں ڈیڑھ برس قیام کر کے اکتوبر ۱۸۷۰ء کو وطن واپس آئے اور اسی ماہ کے آخر میں بنارس پہنچ کر اپنے منصبی فرائض میں مصروف ہو گئے ، انگلستان کے سفر سے واپسی پر سر سید کی زندگی میں ایک نیا انقلاب آیا - انہوں نے مولویانہ وضع ترک کر کے ترکی لباس اختیار کیا اور قدیم ہندوستانی معاشرت چھوڑ کر مغربی بود و باش اختیار کی - اور اپنی قوم کو جدید تہذیب اور تعلیم و تربیت سے مستفید کرانے کے لیے رسالہ 'تہذیب الاخلاق' جاری کیا -

۱۸۷۶ء میں سر سید ملازمت سے سبکدوش ہو کر مستقل طور پر علی گڑھ آ بسے ، اب ان کی تمام توجہ مدرسۃ العلوم کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں صرف ہونے لگی اور وہ اس کام میں ایسے منہمک ہوئے کہ قرآنِ مجید کی ادھوری تفسیر کو چھوڑ کر کوئی بڑا علمی کارنامہ سر انجام نہ دے سکے - گویا انہیں تصنیف و تالیف میں امتیاز دکھانے کا موقع کم ہو گیا ، حالانکہ پنشن پانے کے بعد وہ پورے بائیس سال بقیدِ حیات رہے - دار العلوم کی خدمت میں یہ مصروفیت ان کی اس شیفتگی کو ظاہر کرتی ہے جو انہیں مسلمانوں کی تعلیمی ترقی سے تھی تاہم جب کبھی وقت میسّر آتا ، چھوٹے چھوٹے مضامین سپردِ قلم کرتے تھے - یہاں تک کہ مرنے سے صرف آٹھ دن پہلے اردو

رسم الخط کی حمایت میں حکومت کو اپنے ہاتھ سے خطوط لکھے ۔ اس مقصد کے لیے حامیانِ اردو کی جو کمیٹی قائم ہوئی تھی اسے اپنی ملی اعانت کا ہر طرح یقین دلایا ۔ جب ان کا انتقال ہوا تو دو مضامین 'ازواجِ مطہرات' اور 'قومی زندگی اور موت' کے مسودے ناتمام حالت میں چھوڑ گئے ۔ اب ان کی عمر (اسی ۸۰) سال کی ہو گئی تھی ۔ چوبیس مارچ کو پہلے چنگے بیٹھے ہوئے تھے کہ یکایک احتباس بول کا عارضہ لاحق ہوا ۔ فوراً طبی امداد حاصل کی گئی ، لیکن ڈاکٹروں اور اطباء کی کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی ۔

شام سے حالت غیر ہونی شروع ہو گئی چوتھے دن صبح سے نہایت سخت درد شروع ہوا ۔ اسی روز سات بجے شام کو اسی سال کی عمر میں چار دن بیمار رہ کر ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء مطابق ۵ ذیقعد ۱۳۱۵ھ رات کے دس بجے ، اپنے دوست حاجی اسمٰعیل خان کی کوٹھی میں جہاں دس بارہ روز حالتِ صحت میں اپنے بیٹے سید محمود کی کوٹھی سے اٹھ کر آ گئے تھے ، داعیٔ اجل کو لبیک کہا ۔ مرنے سے پہلے ان کی زبان پر صلواۃ و درود کا ورد جاری تھا ۔ علی گڑھ یونیورسٹی کی مسجد کے شمالی پہلو پر جو تھوڑی سی جگہ مسجد کی حد سے خارج اس کے احاطے کے اندر بیکار پڑی تھی ، وہاں انتیس مارچ کو عصر اور مغرب کے درمیان سپردِ خاک کیے گئے ۔

شخصیت

سر سید کی تصویر حالی نے یوں کھینچی ہے :

''سر سید کا رنگ نہایت سرخ و سفید ، پیشانی بلند ، سر بڑا اور موزوں ، بھویں جدا جدا ، آنکھیں روشن ، نہ بہت بڑی ، نہ چھوٹی ، ناک نسبتاً چھوٹی ، کان دراز ، گلے میں آگے کو دائیں جانب بڑی رسولی جو داڑھی میں چھپی رہتی تھی ۔ جسم بہت فربہ . . . قد لمبا ، ہڈی چکلی ، سینہ چوڑا ، ہاتھ پاؤں اور تمام اعضاء نہایت قوی اور زبردست ، وزن ساڑھے تین من تھا ۔ عنفوانِ شباب میں رسولی نہ تھی اور بدن بھی زیادہ فربہ نہ تھا ۔ بڑھاپے کی وجاہت صاف دلالت کرتی تھی کہ جوانی میں بہت خوبصورت ہوں گے ۔ ان سے ملنے والے ان کی شکل و صورت سے بہت متاثر تھے ۔ دن ہو یا رات لکھنے پڑھنے کا کام جوانوں کی طرح بلا تکان کرتے تھے ۔ آخری ایام میں بیمار رہنے لگے تھے اٹھنے بیٹھنے میں دشواری پیش آنے لگی تھی ۔ نسیان بھی بڑھ گیا تھا ۔ خوراک گھٹ گئی تھی تاہم اپنے کام میں ہمہ تن مصروف رہتے تھے''[1] ۔

---

(۱) حالی ، حیات جاوید ۔ ص ۶۶۱ ۔

انہوں نے کسی قسم کی مسکرات کا استعمال مدت العمر نہیں کیا ۔ انگلستان جانے سے قبل پان تمباکو کھانے اور حقہ پینے کی زیادہ عادت تھی ۔ لیکن وہاں جا کر پان کھانا بالکل ترک کر دیا تھا اور حقہ کی بجائے سگریٹ پینے لگے تھے ۔

سر سید کی شخصیت کی سب سے نمایاں خوبی ان کا استقلال ہے ۔ وہ ایک جامع صفات مسلمان تھے ۔ ان کی بے لوث قومی ہمدردی اور بیباک صداقت ان کے تمام کاموں سے ظاہر ہوتی ہے ۔ وہ جس بات کو اصولاً صحیح سمجھتے تھے اس کا برملا اظہار کرتے تھے اور کسی کی مخالفت کی پرواہ نہیں کرتے تھے ۔ اپنی بات منوانے کے لیے فراخ حوصلگی سے کام لیتے اور دلائل و براہین کی مدد سے مخالفین کو قائل کرنے کی کوشش کرتے اور انتقامی کارروائیوں سے اجتناب برتتے تھے ۔ یہی وہ صفات تھیں جن کی بدولت وہ نامساعد حالات میں بھی ناکامی کا شکار نہیں ہوتے تھے ۔

اس کے علاوہ وہ راستباز اور خلیق تھے تعصب سے متنفر اور آزادیٔ رائے کے دلدادہ تھے، ان کے اخلاق کی یہی خوبیاں مخالفوں کے دلوں سے بدظنی کے خدشات دور کر دیتی تھیں ۔ انہی اوصافِ حمیدہ کی بدولت ان کے گرد جان نثار احباب کا ایک محنتی طائفہ اکٹھا ہو گیا ، مخالف آہستہ آہستہ کم ہوتے گئے اور ان کی تحریکِ اصلاح کا اصلی مقصد واضح ہوتا گیا ۔ انہوں نے ایک مرتبہ سید مہدی علی کو لکھا تھا کہ :

> ''جوں جوں مخالفوں نے نیکی کا مقابلہ کیا ہے ووں ووں نیکی بڑھتی گئی ہے پس اگر میرا کاروبار سچا اور میری نیّت نیک ہے تو انشاء اللہ اس میں کچھ نقصان نہیں ہونے کا'' ۔

تصانیف

سید احمد خان نے سولہ سترہ برس کی عمر میں قلم سنبھالا اور وفات تک برابر لکھتے رہے اس طویل عرصے میں انہوں نے مختلف موضوعات پر بہت سی کتابیں تصنیف و تالیف کیں ، دوسروں کی چند عمدہ کتابوں کی تصحیح کی اور ان پر مفید دیباچے لکھے ، سینکڑوں مضامین اور مقالے تحقیق و تدقیق ، محنت اور کاوش سے مرتب کیے ان کی تصانیف کی فہرست حسب ذیل ہے :

۱ ۔ **جامِ جم :** ہندوستان کے سلاطینِ مغلیہ کی تاریخ فارسی میں (مطبوعہ ۱۸۴۰ء)

۲ ۔ **انتخاب الاخوین :** قوانینِ دیوانی متعلقہ منصفی کا خلاصہ (مطبوعہ ۱۸۴۱ء)

۳ - **جلاء القلوب ،** بذکر المحبوب - مدح طرز کا ایک مولود (مطبوعہ ۱۸۴۳ء)

۴ - **تحفۂ حسن :** تحفۂ اثنا عشریہ کے دو ابواب کا اردو ترجمہ (مؤلفہ ۱۸۴۴ء)

۵ - **تسہیل فی جرّالثقیل :** علمِ جرّ ِالثقیل کے متعلق ایک فارسی رسالے کا ترجمہ (مطبوعہ ۱۸۴۴ء)

۶ - ترجمہ **فوائد الا فکار فی اعمال الفرجار :** علمِ ہیئت کے متعلق مطبوعہ ۱۸۴۶ء -

۷ - **آثار الصنادید :** دہلی کی تاریخی عمارات کا حال (مطبوعہ ۱۸۴۷ء) - اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۸۵۴ء میں شائع ہوا جس کا اسلوب سادہ اور زبان سلیس ہے -

۸ - **قولِ متین در ابطالِ حرکتِ زمین :** مطبوعہ ۱۸۴۸ء

۹ - **کلمہ الحق :** پیری مریدی کے مروجہ طریقوں کی مخالفت میں (مؤلفہ ۱۸۴۹ء)

۱۰ - **ترجمہ فیصلہ جات صدر شرقی و صدر غربی :** (مقدمات کے متعلق اعلیٰ عدالتوں کے فیصلے (مرتبہ ۱۸۴۹ء) -

۱۱ - **رسالہ راہِ سنت و ردِّ بدعت :** اہلِ حدیث کے مشرب کے موافق سنت کی تائید اور بدعت کے ردّ میں (مصنفہ ۱۸۵۰ء) -

۱۲ - **امیقہ :** متعلق تصوف ، در بیانِ تصورِ شیخ ، بزبانِ فارسی (مطبوعہ ۱۸۵۲ء)

۱۳ - **سلسلة الملوک :** راجگان و شاہانِ دہلی کی تاریخ بصورتِ جدول (مطبوعہ ۱۸۵۲)

۱۴ - **ترجمہ کیمیائے سعادت :** امام غزالی کی مشہور کتاب کیمیائے سعادت کی ابتدائی تین فصلوں کا اردو ترجمہ (محررہ ۱۸۵۳ع) -

۱۵ - **تاریخ ضلع بجنور :** اس تاریخ کا مکمل سودہ ۱۸۵۷ع کے ہنگامے میں تلف ہو گیا - (مؤلفہ ۱۸۵۷ع) -

۱۶ - **تصحیح آئینِ اکبری :** پہلی اور تیسری جلد -

۱۷ - **تاریخ سرکشئی بجنور :** ہنگامہ ۱۸۵۷ کے موقع پر بجنور میں جو حوادث پیش آئے ان کی مفصل روئداد - (مطبوعہ ۱۸۵۸ع) -

۱۸ - **رسالہ اسبابِ بغاوتِ ہند :** ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے اسباب و علل (مطبوعہ ۱۸۵۹ء) -

۱۹ - **گذارش در باب تعلیم اہل ہند :** ہندوستانیوں کی ابتدائی تعلیم کے متعلق گورنمنٹ کو تحریری مشورے اردو اور انگریزی میں - (مطبوعہ ۱۸۵۹ء) -

۲۰ - **تحقیق لفظ نصاریٰ :** لفظ 'نصاریٰ' کے متعلق انگریزوں کی غلط فہمی دور کرنے کے لیے یہ رسالہ ۱۸۵۹ء میں سرسید نے اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں شائع کیا -

۲۱ - **تبئین الکلام فی تفسیر التوراۃ والانجیل علیٰ ملّۃ الاسلام :** (در دو جلد) توریت اور انجیل کی تفسیر اور قرآن و حدیث سے اس کی تطبیق (مولفہ ۱۸۶۲ء) -

۲۲ - **تصحیح تاریخ فیروز شاہی :** برنی کی مشہور کتاب 'تاریخ فیروز شاہی' کی تصحیح کی - (مطبوعہ ۱۸۶۲) -

۲۳ - **سیرت فریدیہ :** سرسید کے نانا خواجہ فریدالدین وزیر اکبر شاہ ثانی کی سوانح عمری (مطبوعہ ۱۸۶۴ء) -

۲۴ - **رسالہ علاج ہیضہ :** بموجب اصول ہومیوپیتھک (مطبوعہ) -

۲۵ - **احکام طعام اہل کتاب :** یہود و نصاریٰ کے ساتھ کھانے پینے کے معتلق شریعت اسلامیہ کے احکام - (مطبوعہ ۱۸۶۸ء) -

۲۶ - **سفر نامہ مسافران لندن :** سفر لندن کے حالات اور وہاں کی معاشرت کی تصویر یہ سفر نامہ 'سائنٹفک سوسائٹی' کے اخبار میں چھپا -

۲۷ - **الخطبات احمدیہ فی العرب والسیرت المحمدیہ :** سر ولیم میور کی کتاب 'لائف آف محمد' کا جواب انگریزی میں ۱۸۷۰ء اردو میں ۱۸۸۷ء -

۲۸ - **ہندوستان کا طریقۂ تعلیم :** (انگریزی) - ہندوستان میں رائج انگریزی طریقۂ تعلیم پر اعتراضات (مطبوعہ ۱۸۷۰ء) -

۲۹ - **ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب پر ریویو :** مسلمانوں کے خلاف ڈاکٹر ہنٹر کی زہریلی کتاب 'انڈین مسلمانز' کا جواب انگریزی میں (مطبوعہ ۱۸۷۱ء) -

۳۰ - **النظر فی بعض مسائل الامام غزالی :** حضرت امام غزالی کے بعض مسائل پر تنقید (مطبوعہ ۱۸۸۰ء) -

۳۰ - **تفسیر القرآن :** جلد اول ۱۸۸۰ء/۱۲۹۷ھ - ابتدائی سولہ سورتوں کی تفسیر -
۳۱ - سورتوں کی سر سید کی زندگی میں طبع ہوئی - تین سورتوں کا مسودہ ان کی
... کے بعد ملا اور بعد میں شائع کیا گیا -

۳۲ - **اردو لغت :** صرف چند صفحات (غیر مکمل) - ۱۸۸۰ء -

۳۳ - **ازدواج المطہرات :** عیسائی مصنف احمد شاہ شائق کی کتاب 'امہات المومنین' کا جواب غیر مکمل (مرتبہ مارچ ۱۸۹۸ء) -

تصانیف کا پہلا اور دوسرا دور : (۱۸۴۰ء - ۱۸۵۷ء) اور (۱۸۵۸ء - ۱۸۶۸ء)

ان تصانیف میں ۱۸۵۷ء سے پہلے کی تصانیف دورِ اول کی تصانیف قرار دی جا سکتی ہیں - سر سید کی تصانیف کا دوسرا دور اپریل ۱۸۵۸ء سے شروع ہوتا ہے - جب وہ بجنور سے منتقل ہو کر مراد آباد آئے تو ان کے اندر ایک شدید خواہش یہ پیدا ہو چکی تھی کہ وہ مسلمانوں کو ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں میں باغیانہ شرکت کے الزام سے بچائیں - اس خواہش کی بدولت ان میں ایک خاص قسم کا معذرتی میلان پیدا ہو گیا تھا اور اس کے زیرِ اثر انہوں نے ایک طرف تو نئی سیاسی حکمتِ عملی کی بنیاد رکھی اور دوسری طرف مسلمانوں کے دینی نقطۂ نظر میں تبدیلی پیدا کرنے کی ضرورت محسوس کی - لہذا اپنے اس خاص نقطۂ نظر کے ماتحت انہوں نے جدید علمِ کلام کی بنیاد رکھی - جس کا پہلا اصول یہ تھا کہ عیسائی حاکموں اور مسلمانوں کے درمیان دینی بنیادوں پر بھی ایک سمجھوتا اور رابطہ قائم کیا جائے - ان کی مندرجہ ذیل تصانیف انہی خیالات کی آئینہ دار ہیں -

۱- 'تاریخ سرکشی بجنور' - ۲- 'اسبابِ بغاوتِ ہند' - ۳- 'رسالہ لائل محمڈنز آف انڈیا' - ۴- 'تحقیق لفظ نصاریٰ' - ۵- 'تبیین الکلام' - ۶- 'رسالہ طعام اہلِ کتاب' -

تصانیف کا تیسرا دور (۱۸۶۹ء سے ۱۸۹۸ء تک)

یہ دور سفر نامۂ لندن سے شروع ہوتا ہے - اس دور میں ان کے مصلحانہ خیالات میں شدت پیدا ہو گئی تھی - اظہارِ خیال میں بیباکی اور بے خوفی نمایاں تھی - وہ مخالفت کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے ان کے پہلے اور تیسرے دور کے خیالات میں 'بعد المشرقین' ہے ، پہلے دور میں تصورِ شیخ جیسے نازک اور دقیق مسئلے میں بھی گہری دلچسپی لیتے نظر آتے ہیں - مگر اس دور میں انہیں معراجِ رسولؐ تک کا جسمانی ہونا نا ممکن نظر آتا ہے اور وہ دین کی ایک ایک بات کی تصدیق کے لیے عقل و فکر کی سند کی ضرورت محسوس کرتے ہیں - ان کا ذہن جدید اندازِ فکر کے اثرات کو اس درجہ قبول کر لیتا ہے کہ وہ

تمام مشرقی علوم کو ترقی کے لیے مضر خیال کرنے لگتے ہیں ۔ وہ مغربی مفکرین کے نظریۂ ترقی ، نظریۂ تمدن اور نظریۂ فطرت کے اتنے مداح ہیں کہ مذہب اور معاشرت کے ہر شعبے میں انہی نظریات کا عمل دخل دیکھنا چاہتے ہیں ان کے اس دور کے رجحانات ذیل کی تصانیف میں ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں :

۱ ۔ 'سفر نامہ مسافران لندن'　　　۲ ۔ 'خطبات احمدیہ'

۳ ۔ 'ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب پر ریویو'　　　۴ ۔ تہذیب الاخلاق کے متعدد مضامین

۵ ۔ 'تفسیر القرآن'

اب ہم سرسید کی متعدد تصانیف میں سے صرف چند کتابوں پر مفصل نظر ڈالتے ہیں ان کا انتخاب ان کے مسائل کی اہمیت اور ان مسائل کے دور رس اثرات کے پیش نظر کیا گیا ہے ۔

تبیئن الکلام

سرسید کی یہ تصنیف بڑی تقطیع کے چار سو صفحات پر مشتمل ہے ۔ مختلف مذاہب کے منصفانہ تقابلی مطالعہ کے نقطۂ نظر سے اسے ایک اہم تصنیف کہا جا سکتا ہے ۔ اس میں حق پسندی اور انصاف سے کام لیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ تمام مذہبی کتابیں اصولی طور پر ایک ہی سرچشمۂ فیض سے جاری ہوئی ہیں ۔ بڑی کاوش اور محنت کے ساتھ انجیل کے اشخاص اور مقامات کی چھان بین کی گئی ہے ۔ ماحول سے مطابقت کا جذبہ واضح ہے ۔ عقل و فطرت پر بہت زیادہ اعتماد کیا گیا ہے ۔ علاوہ ازیں موجودہ انجیل کو مستند قرار دے کر قرآن کے بعض علوم کو انجیل کے علوم سے خواہ مخواہ مطابق ثابت کرکے انہوں نے ایک لغزش بھی کی ہے ۔ اس کتاب کے فقرے بہت لمبے ہیں ۔ دلائل کے سلسلے نہایت طویل ہیں ، مگر منظم اور مربوط ہیں ۔ محنت اور کاوش نمایاں ہے ۔ اگرچہ یورپین تصانیف سے خوب استفادہ کیا گیا ہے مگر ذاتی اپج اور اجتہاد سے بھی کام لیا گیا ہے ۔ انجیل کی یہ تفسیر مذہبی خیالات میں اعلیٰ درجہ کی رواداری ظاہر کرتی ہے ۔ اس میں اسلام اور عیسائیت کے مشترک مسائل کا بیان عمدہ ہے ۔ مقصود یہ ہے کہ دونوں مذاہب ایک دوسرے کے نزدیک آ سکیں ۔ یہ تفسیر مروّجہ مذہبی تصورات سے بلند ہو کر لکھی گئی ہے ۔ یہ عیسائیوں کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف جو شکوک ہیں انہیں دور کرنے کی ایک مخلصانہ کوشش ہے ۔ اس کتاب پر فرانسیسی عالم ''گارساں دی تاسی'' نے جو تبصرہ کیا ہے وہ قابل مطالعہ ہے ۔

سر ولیم میور لفٹننٹ گورنر ممالک آگرہ و اودھ کی کتاب 'لائف آف محمد' ۱۸۶۱ء میں چار جلدوں میں شائع ہوئی ۔ مصنف نے اپنے زورِ قلم اور حسنِ بیان سے ہندوستان اور انگلستان کے پڑھے لکھے طبقے کو بہت متاثر کیا ۔ اس کتاب میں رسول اللہؐ پر بہت سے اتہام لگائے گئے ہیں اور اس عقیدہ کی تردید کی گئی ہے کہ قرآن وحی الٰہی ہے اور احادیثِ نبوی قانونِ الٰہی کی صحیح تفسیر ہیں اور اسلام ایک مکمل ضابطۂ اخلاق کا حامل ہے ۔ اسلام کو زمانۂ حال کی سائنسکی، تمدن اور حسنِ معاشرت کے خلاف ظاہر کیا گیا ہے ۔ مسلمانوں کی موجودہ پستی اور تنزل کو اسلام کی تعلیمات کا نتیجہ قرار دیا ہے ۔ اس زمانے کے عیسائی مبلغین نے اس کتاب کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور اس کی روشنی میں مسلمانوں کے عقائد پر حملہ آور ہوئے ۔ انہیں اس بات کا یقین تھا کہ نوجوان تعلیم یافتہ جلد یا بدیر اسلام سے منحرف ہو کر عیسائیت کے دامن میں پناہ لے لیں گے ۔ سر سید نے اس کتاب کے مضامین سے بخوبی واقفیت بہم پہنچانے کے بعد اس خطرے کو محسوس کیا اور اس کا جواب 'خطبات الاحمدیہ' کی صورت میں دیا ، جن کا مختصر حال ذیل میں دیا جاتا ہے ۔

۱ ۔ **پہلا خطبہ :** یہ خطبہ سب سے بڑا اور مکمل مقالہ ہے اس میں ملکِ عرب کا مفصّل تاریخی جغرافیہ اس نظر سے مندرج ہے کہ ان مسلّمات کو ثابت کیا جائے ، جن کا سر ولیم میور نے اپنی کتاب میں انکار کیا ہے ۔ مثلاً 'جبل فاران' جس کا نام توریت میں مذکور ہے اور جس سے آنحضرتؐ کی رسالت کی بشارت نکلتی ہے ۔ وہ ملکِ عرب میں ثابت کیا ہے ۔ حضرت اسمٰعیل اور ان کے بیٹوں کا عرب میں آباد ہونا تحقیق سے ثابت کر دکھایا ہے اور عیسائی معترضین کے نظریات کی تردید کی ہے ۔

۲ ۔ **دوسرا خطبہ :** اس میں عرب جاہلیت کی رسومات ، خیالات اور عقائد کی وضاحت کی گئی ہے تاکہ اسلام سے پہلے عربوں کے اخلاق کی صحیح تصویر معلوم ہو سکے ۔

۳ ۔ **تیسرا خطبہ :** اسلام سے پہلے عرب میں جو ادیان تھے ان کا حال لکھا ہے ، مثلاً بت پرست ، خدا پرست ، لا مذہب اور معتقدین مذاہب الہامی اور یہ ثابت کیا ہے کہ اسلام نے سابقہ مذاہب کی تصدیق کی ہے اور یہی بات اسلام کی سچائی کی سب سے بڑی دلیل ہے ۔

۴ ۔ **چوتھا خطبہ :** اس میں ثابت کیا ہے کہ اسلام انسان کے حق میں رحمت ہے اور اس سے موسوی اور عیسوی مذہب کو نہایت عمدہ فائدے پہنچے ہیں ۔

۵ ۔ **پانچواں خطبہ :** مسلمانوں کی مذہبی کتابوں یعنی 'کتب حدیث' ، 'کتب سیر' 'تفاسیر و کتب فقہ' کی تصنیف ، تدوین ، منشاء ، اور غرض و غایت پر مفصل

بحث کی ہے تاکہ ان کتابوں کی طرز تصنیف سے آگاہ ہو کر دوسرے مذاہب کے محققین آئندہ گمراہ نہ ہوں اور ولیم میور کی طرح غیر معتبر راویوں کو اپنا رہبر نہ بنائیں۔

۶ - **چھٹا خطبہ :** اس میں مذہب اسلام میں ''روایت'' پر اظہار خیال کیا ہے۔ روایات کی اصلیت اختلاف روایات کے مختلف اسباب، احادیث موضوعہ سے بحث کرکے سر ولیم میور کے اعتراضات کا نہایت شافی جواب الزامی اور تحقیقی دونوں طرح سے دیا ہے۔ یہ خطبہ کافی معلوماتی ہے۔

۷ - **ساتواں خطبہ :** اس میں قرآن مجید کا نزول، سورتوں اور آئتوں کی ترتیب، مختلف قرأتیں، ناسخ و منسوخ کی بحث، جمع قرآن کا زمانہ، اس کی نقول کی اشاعت، اس کا کامل اور الہامی ہونا بیان کرکے سر ولیم میور اور دوسرے عیسائی مصنفوں کی غلطیوں کی شرح کی گئی ہے۔

۸ - **اٹھواں خطبہ :** اس طویل خطبے میں سر ولیم میور کے ان شبہات کا جواب دیا گیا ہے جو انہوں نے خانۂ کعبہ کی تعمیر حضرت ابراہیم کے ہاتھوں اور اس کے تمام مراسم کا حضرت ابراہیم و حضرت اسمٰعیل علیہ السلام سے متعلق ہونے کے ضمن میں بیان کیے گئے ہیں۔

میور کا یہ ادعا ہے کہ حجر اسود کو بوسہ دینا، کعبہ کے گرد طواف کرنا، مکہ، عرفات اور منا میں رسمیات کا ادا کرنا مقدس مہینوں اور مقدس شہر کی تعظیم کرنا، ان سب باتوں کو حضرت ابراہیم سے یا ان کی اولاد سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

سر سید نے مسلمان مورخین اور یورپ کے عیسائی محققین اور جغرافیہ دانوں کی تحقیقات سے سر ولیم میور کے اعتراضات کی تردید کی ہے اور خانۂ کعبہ اور مکۂ معظمہ کی تاریخ بیان کی ہے۔

۹ - **نواں خطبہ :** سر ولیم میور نے اپنی کتاب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کے بنی اسماعیل ہونے سے انکار کیا ہے۔ یہ خطبہ حضور کے نسب کی تحقیقات پر ہے۔ آخر میں حضور کا نسب نامہ درج کر کے مصنف نے اپنے نسب نامہ کو بھی اس کے ساتھ شامل کر دیا ہے۔

۱۰ - **دسواں خطبہ :** اس میں بشارتوں کا بیان ہے جو 'تورات' اور 'انجیل' میں حضور صلعم کی نبوت کی نسبت موجود ہیں۔

۱۱ - **گیارھواں خطبہ :** اس خطبے میں معراج اور شقِ صدر کی تحقیقات و ماہیت سے بحث کی گئی ہے اس باب میں جو مختلف حدیثیں موجود ہیں ان کا اختلاف دکھا کر یہ واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ معراج محض رویا تھا - سر سید نے ان مسائل پر اپنی تفسیر میں جو مفصّل بحث کی ہے وہ تحقیقی نقطۂ نظر سے قابلِ مطالعہ ہے -

۱۲ - **بارھواں خطبہ :** اس میں حضور کی ولادت سے بارہ برس کی عمر تک کے حالات معتبر اور صحیح روایتوں سے بیان کیے ہیں - یہ کتاب زیادہ تر مالی مشکلات کے سبب سر سید کے ارادے کے موافق پوری نہ ہو سکی - وہ سر ولیم میور کی چاروں جلدوں کا جواب لکھنے کا ارادہ رکھتے تھے مگر صرف ایک ہی جلد لکھ سکے اور ولایت سے ہندوستان واپس آنا پڑا - ہندوستان پہنچ کر ان کا زیادہ وقت کالج کی فکر میں اور دوسرے مسائل حل کرنے میں صرف ہوتا رہا - تاہم انہوں نے سر ولیم میور کے اٹھائے ہوئے اہم مسائل کا تفصیلی جواب اسی ایک جلد میں لکھ دیا ہے - اس کتاب میں سر سید نے دو ایک مقامات کے سوا کسی جگہ جمہور اہلِ اسلام سے اختلاف نہیں کیا - اس وقت مذہبی خیالات کے متعلق ان میں وہ آزاد خیالی نہیں تھی جو تفسیر القرآن میں نمایاں ہو گئی ہے[1] -

'خطبات' کی تدوین کے زمانے میں سر سید نہایت مضطرب دکھائی دیتے ہیں - ضروری کتابوں کی فراہمی ، اشاعت کے لیے سرمایہ کا انتظام کرنا اور اس مقصد کے لیے اپنا تمام اثاثہ تک بیچ ڈالنے کی خواہش نے ایک ایسی کیفیت پیدا کر دی تھی ، جسے ایک سچے عاشق رسول کا نیک اور پختہ جذبۂ ایمانی کہنا بجا اور درست ہے - ولیم میور نے اپنی کتاب میں تعصّب اور افترا پردازی سے کام لے کر جس قدر زہر افشانی کی ہے ، مگر سر سید نے جواب لکھنے وقت بڑی متانت اور سنجیدگی سے کام لیا ہے اور مناظرانہ رنگ بہت کم اختیار کیا ہے - طرزِ استدلال محققانہ اور عالمانہ ہے - جہاں کہیں الزامی جوابات ہیں ، نہایت نرم اور مناسب زبان میں ہیں اور تحقیقی جواب لکھ چکنے کے بعد ہیں - گویا ان کا طریقہ دوستانہ اور بے تعصبانہ ہے -

مولانا حالی نے 'حیاتِ جاوید' میں 'خطباتِ احمدیہ' کی اہمیت اور مباحث سے متعلق تفصیل کے ساتھ اظہارِ خیال کیا ہے - ان کی آراء کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلام کی حمایت میں جو کتابیں پہلے لکھی گئی ہیں ان پر خطبات کو فوقیت حاصل ہے - مولانا عبد الماجد دریا بادی لکھتے ہیں :

---

(۱) تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ، عنوان بنام تفسیر القرآن مقالہ ہذا -

''یہ خیال رہے کہ قدیم وضع کے میلاد ناموں کو چھوڑ کر جدید طرز کے کلامی پہلو کو لیے ہوئے سب سے پہلے کون سی کتاب کس ہندوستانی مسلمان کے قلم سے وجود میں آئی ہے ؟ وہ بالاتفاق سر سید احمد خان کی 'خطبات احمدیہ' ہے - اس کے جو دلائل و شواہد فرنگیوں کے مقابلہ میں اثبات رسالت میں پیش کیے گئے ہیں ، خصوصاً بشارات 'توریت' و 'انجیل' کے دلیل میں ، ان پر اضافہ آج تک شاید ہی کچھ ہو سکا ہو'' (۱) -

علی گڑھ انسٹیٹوٹ اور تہذیب الاخلاق

سر سید اپریل ۱۸۶۹ء سے ستمبر ۱۸۷۰ء تک انگلستان میں مقیم رہے - وہاں انگریزی کے قدیم اصلاحی رسالوں 'ٹیٹلر' ، 'سپکٹیٹر' اور 'گارڈین' کی فائلوں کو دیکھنے کا اتفاق ہوا - ان کی اصلاحی قدر و قیمت سے وہ متاثر ہوئے - لہذا ملک واپس آ کر 'تہذیب الاخلاق' کے نام سے ایک اردو رسالہ جاری کیا - اس کا پہلا شمارہ ۲۴ دسمبر ۱۸۷۰ء کو شائع ہوا - اس کی سات جلدوں میں ایک سو آٹھ نمبر چھپے ، جن کے اندر کل دو سو باسٹھ مضامین تھے ، جن میں ایک سو بارہ سر سید کے قلم سے تھے - اس سلسلے کا آخری شمارہ ۲۰ ستمبر ۱۸۷۶ء کو نکلا - یہ 'تہذیب الاخلاق' کا پہلا دور تھا -

تین برس کے بعد یہ پھر اجرا ہوا اور اس کا پہلا شمارہ ۲۳ اپریل ۱۸۷۹ء کو شائع ہوا - اس دفعہ بارہ جلدوں میں کل سڑسٹھ مضامین نکلے - ان میں تئیس سر سید کے لکھے ہوئے تھے - یہ اس رسالے کا دوسرا دور تھا -

بارہ سال کے بعد ۷ اپریل ۱۸۹۴ء کو اس سلسلے کا پہلا شمارہ منظر عام پر آیا - اس دفعہ تین جلدوں میں چھتیس نمبر نکلے - ان میں کل ایک سو تیس مضامین تھے - جن میں بہتر سر سید ہی کے زور قلم کا نتیجہ تھے - اس سلسلے کا آخری شمارہ فروری ۱۸۹۷ء کو شائع ہوا اور اس کے بعد یہ مقبول رسالہ انفرادی حیثیت ترک کر کے 'انسٹی ٹیوٹ گزٹ علی گڑھ' کا ایک حصہ بن گیا - اس گزٹ کے جن مضامین کی پیشانی پر 'تہذیب الاخلاق' مندرج ہوتا وہ اس کے قائم مقام متصور ہوتے تھے - لیکن سر سید کی وفات کے ساتھ ہی ۲۰ مارچ ۱۸۹۸ء کو یہ تخصیص بھی مٹا دی گئی - گویا اس طرح اس مفید پرچے کا تیسرا دور بھی ختم ہو گیا - اس حساب سے 'تہذیب الاخلاق' کی عمر تقریباً بارہ سال ہوتی ہے - اس پرچے کا پہلا دور شاندار تھا اور عملی نتائج کی رو سے بھی کامیاب تھا - اس زمانے میں سر سید زیادہ مصروف نہیں تھے - اس کے بعد دوسرے اور تیسرے دور میں جب وہ کالج کے امور میں بہت زیادہ منہمک ہو گئے ، اس پرچے کی

---

(۱) زبیری ، مضامین ، تذکرہ سر سید - ص ۲۶۷ -

آب و تاب میں بھی فرق واقع ہوتا گیا ۔ یہ پرچہ مہینے میں کبھی ایک بار ، کبھی دو بار یا تین بار نکالا جاتا تھا ۔ اس کی ضخامت کی کوئی خاص حد مقرر نہیں تھی ۔ ٹائپ میں طبع ہوتا تھا ۔ اس پرچے کے اجراء سے سر سید کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کے حسنِ معاشرت اور تہذیب کی ترقی ہو ، غلط اوہام رفع ہوں ، بری رسمیں مٹ جائیں ، نئے علوم و فنون کا رواج ہو ، پر تکلف اور دور از کار طرزِ تحریر کی مناسب اصلاح ہو ۔ اس سے براہِ راست مذہبی اصلاح مقصود نہیں تھی ۔ مگر جو باتیں اس وقت مسلمانوں کی دنیوی ترقی کی مانع تھیں وہ اکثر مذہبی خیالات پر مبنی تھیں ۔ اس لیے اس رسالہ میں عموماً مذہبی بحثیں بھی چھڑ جایا کرتی تھیں ۔ اگرچہ سنجیدگی ، نرمی ، دلسوزی اور درد مندی سے کام لیا جاتا تھا مگر اس کے باوجود جہاں تعلیم یافتہ طبقہ کے ایک حصے نے اس پرچے کو سر آنکھوں پر لیا ، وہاں بہت سے علماء اور ان کے متبعین نے اس کی شدید مخالفت کی ۔ سر سید کی باتوں کی بر صغیر ہند و پاک میں سب سے زیادہ پنجاب کے مسلمانوں نے قدر کی ۔ بقول مولانا حالی :

"پنجاب کے مسلمان سرسید کی منادی پر اس طرح دوڑتے جیسے پیاسا پانی پر دوڑتا ہے[1]۔"

اس رسالے میں نواب محسن الملک ، مولوی چراغ علی ، مولانا ذکاء اللہ کے مضامین خاص طور پر شمار و نمایاں ہوتے تھے ۔ اس سے تمام ملک میں ایک تحریک چل پڑی ۔ سوئے ہوئے مسلمانوں جاگ اٹھے ۔ اپنے اسلاف کے کارنامے پڑھ کر ان میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ گئی اور ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی ناکامی کے اثرات آہستہ آہستہ دور ہوتے گئے ۔ اس رسالہ کے چند مضامین کے عنوان ملاحظہ ہوں :

'اپنی مدد آپ' 'قومی اتفاق' 'ہمدردی' 'ضمیر' 'آزادی رائے' اور 'امید کی خوشی' ۔ اس رسالے نے نثرِ اردو کو مطلب نویسی سے روشناس کرایا ۔ بے شمار نئے اور مفید موضوعات پیش کیے ۔ معاشرتی اور سیاسی زندگی میں ایک انقلاب پیدا کیا اور اس طرح علی گڑھ تحریک کا نقیب قرار دیا گیا ۔

سر سید کا اسلوبِ بیان

سر سید کی تصانیف میں علمی حقائق بھی ہیں اور لطائف بھی ، ان میں مزاح کی چاشنی بھی ہے اور درد و اضطراب بھی ، ان میں نصیحت بھی ہے اور تذکرۂ ماضی بھی ،

---

(۱) حالی ، حیات جاوید - ص ۵۶۷ -

حالاتِ حاضرہ سے دلچسپی بھی ہے اور مسلمانوں کے روشن مستقبل کی خواہش بھی موجود ہے۔ سر سید نے مضمون نویسی کی ابتدا ۱۸۳۶ء سے کی اس وقت ان کی عمر ۱۸/۱۹ سال تھی اور اپنی زندگی کے آخری ایام یعنی مارچ ۱۸۹۸ع تک وہ تصنیف و تالیف میں برابر مصروف رہے۔ انہیں مضمون نویسی سے خاص رغبت تھی۔ دوستوں کی موجودگی میں بھی وہ برابر اپنے اس شغل میں منہمک رہتے تھے۔ خلوت در انجمن کا یہ ملکہ ان میں نہایت راسخ تھا۔ زندگی کی تمام مصروفیتوں کے باوجود قلم ان کے ہاتھ سے نہیں چھوٹا۔ ان کی تحریریں دو حصوں میں تقسیم ہوتی ہیں۔

ابتدائی دور کی تصانیف کا انداز پر تکلف ہے اور ان کی عبارت مسجع و مقفیٰ ہے۔ دوسرے دور کی تحریروں میں مطلب نویسی مدِ نظر رکھی گئی ہے اور عبارت آرائی پر بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد انہوں نے عبارت آرائی کو ترک کرکے سلاست اور سادگی اختیار کی اور مختلف قسم کے مضامین کے لیے ایسی زبان استعمال کی جو ہر قسم کے مفہوم کے لیے مناسب ذریعۂ اظہار تھی اور اس کے ساتھ اس میں جوش و خروش اور اثر اندازی کا جوہر بھی موجود تھا۔ بقول مولانا حالی:

> "سر سید کے ہاں ہر مقام کے مقتضا کے موافق ان کی تحریر کا رنگ خود بخود بدل جاتا ہے۔ اگر ان کے علمی و تاریخی مضامین میں دریا کے بہاؤ جیسی روانی ہے تو مذہبی اور پولیٹیکل تحریروں میں چڑھاؤ کی پیراکی کا سا زور ہے۔ اعتراضات کے جواب میں متانت اور سنجیدگی ہے اور بے دلیل دعووں کے مقابلے میں ظرافت و خوش طبعی، نصیحتیں نشتر سے زیادہ دلخراش اور مرہم سے زیادہ تسکین بخش ہیں[1]۔"

خصوصیات

سر سید مشکل الفاظ اور پیچیدہ عبارت سے پرہیز کرتے ہیں۔ عربی ضرب الامثال، قرآنی آیات اور احادیثِ نبوی کا بکثرت استعمال کرتے ہیں۔ فارسی اشعار اور محاورات بھی ان کے ہاں موجود ہیں۔ بالعموم فقرے چھوٹے چھوٹے اور پیرے مختصر ہوتے ہیں۔ دلائل اور براہین سے اپنی رائے کو مضبوط کرکے پیش کرتے ہیں۔ کہیں کہیں ظرافت اور زندہ دلی کے آثار بھی موجود ہیں۔ وہ مخالفین کی باتوں کو یا تو مذاق میں اڑا دیتے ہیں یا ان پر توجہ ہی نہیں دیتے یا رنج و افسوس کا سر سری اظہار کرکے خاموش ہو جاتے ہیں۔ لیکن جب انہیں سخت غصہ آتا ہے ان کے قلم سے نہایت درشت الفاظ بھی ٹپک

---

(۱) حالی، الطاف حسین، حیات جاوید۔ ص ۶۳۰۔

پڑے ہیں ۔ مگر ایسا بہت کم ہوتا ہے ۔ تحریر میں مترادف الفاظ بھی ملتے ہیں ۔ عطف کرنے وقت اور کا لفظ بعض دفعہ ان کے ہاں ناگوار سا لگتا ہے ۔ اگرچہ انہوں نے بہت سے انگریزی مضامین کو کاسانی کے ساتھ اردو کا لباس پہنایا ہے ، مگر اکثر جگہ بلا ضرورت انگریزی کے الفاظ استعمال کیے ہیں ۔ ان تحریروں میں چند متروک الفاظ اور مرادِب بھی مل جاتی ہیں ، کہیں کہیں عبارت میں معجبنہ جملے بھی نکل آتے ہیں ۔ مذہبی مضامین لکھتے وقت ان کا اندازِ بیان اکثر مناظرانہ ہو جاتا ہے ۔ مذہبی بحثوں میں معقولات سے استفادہ کرنا ان کی تحریر کی ایک نمایاں صفت ہے ۔

مضمون نویسی کے متعلق وہ اس اصول پر ہمیشہ کاربند رہے ہیں کہ طرز سادہ اور سلیس ہو ، صفائی اور سادگی ہمیشہ مدِنظر رہے ۔ ان اوصاف کی بدولت انہوں نے اردو نثر کو اس قابل بنایا ہے کہ دقیق سے دقیق فلسفیانہ مباحث تک اس میں بیان ہو سکتے ہیں ۔ اس امر کی وضاحت کے لیے سر سید کا اپنا بیان ملاحظہ ہو :

''جہاں تک ہم سے ہو سکا ہم نے اردو زبان کے علم و ادب کی ترقی میں کوشش کی ۔ مضمون کے ادا کرنے کا ایک سیدھا اور صاف طریقہ اختیار کیا ، رنگینیٔ عبارت سے جو تشبیہات اور استعارات خیالی سے بھری ہوتی ہے اور جس کی شوکت صرف لفظوں ہی لفظوں میں رہتی ہے اور دل پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا ، پرہیز کیا ۔ تک بندی سے جو اس زمانے میں مقفیٰ عبارت کہلاتی ہے ہاتھ اٹھایا ۔ جہاں تک ہو سکا سادگیٔ عبارت پر توجہ کی ۔ اس میں کوشش کی کہ جو کچھ لطف ہو وہ صرف مضمون کے ادا میں ہو ۔ جو اپنے دل میں ہو وہی دوسرے کے دل میں پڑے تا کہ دل سے نکلے اور دل میں بیٹھے[1]''

سر سید کی نثر کی انہی خوبیوں نے اسے مقبول بنایا ۔ سر سید کے مخالفین نے بھی سر سید کا سا اندازِ بیان اختیار کیا اور پر تکلف اندازِ تحریر آہستہ آہستہ متروک ہوتا گیا ۔ رفتہ رفتہ اردو نثر ایک وسیع معاشرے کی ترجمانی کرنے لگی ۔ انہوں نے ادبی پرداخت اور بیان کی رعنائی پر مطلق توجہ نہیں دی ، بقول مولانا حالی :

''ان کی حالت تو اس بے قرار آدمی کی طرح تھی جو گھر میں آگ لگی دیکھ کر ہمسایوں کو بے تابانہ آگ بجھانے کے لیے پکارتا ہے ۔ ایسے الفاظ

---

(۱) تہذیب الاخلاق ، بابت یکم شوال ۱۲۹۲ھ/۱۸۷۵ء ۔

استعمال کرتا ہے جو گھبراہٹ کی حالت میں بے ساختہ انسان کے منھ سے نکل جاتے ہیں(۱)"۔

غرضیکہ ان کی تحریر نے اپنے پورے ماحول کو متاثر کیا ۔ آنے والے ادیبوں نے ان کی پیروی کی ہے اور آج اردو نثر جس درجہ کی صلاحیتوں سے بہرہ ور ہے ، اس میں سر سید کا بڑا ہاتھ ہے ۔

سر سید کا اثر ادبیات پر

سر سید سے پہلے اردو ادب کا دائرہ تصوف ، تاریخ اور تذکرہ نویسی تک محدود تھا ۔ طبعی علوم ، ریاضیات اور فنونِ لطیفہ کی طرف بہت کم توجہ دی جاتی تھی ۔ سر سید کا اثر اسلوبِ بیان پر بھی ہوا اور موضوع پر بھی ۔ اگرچہ سر سید سے پہلے فورٹ ولیم کالج کی سادہ نثر ، دہلی کالج کی علمی نثر اور مرزا غالب کی شخصی نثر ، جس میں ادبیت اعلیٰ درجے کی ہے ، نظر انداز نہیں کی جا سکتی ، مگر ان سب کوششوں کا دامن اتنا وسیع نہیں تھا ۔ سر سید کی بدولت نثر میں موضوعات کا تنوّع اور سادگی پیدا ہوئی اور اسے ایک نیا انداز فکر نصیب ہوا ۔ سر سید ہی وہ پہلے ادیب ہیں جنہوں نے روایت کی تقلید ترک کر کے آزاد خیال کو رواج دیا اور ایک ایسے مکتبِ فکر کی ابتدا کی جس میں عقل ، نیچر اور مادی ترقی اور جدید تہذیب کو بڑی اہمیت حاصل ہے ۔ ان کے نظام تک میں مادہ کو اصلی اور مرکزی حیثیت حاصل ہے ۔ مادہ میں عقل کی بدولت مناسب تصرف کام میں لا کر معاشی اور اجتماعی فوائد حاصل کرنے کا نام ترقی ہے ۔

سر سید نے اپنی دینی تصانیف میں اس بات پر کافی زور دیا ہے کہ حقیقت تک رسائی کا واحد ذریعہ تقلید نہیں بلکہ تحقیق ہے ، تاہم انہوں نے تجسس کے شوق میں انقلابی بننے کی کوشش نہیں کی ۔ وہ ایک مصلح رہنے پر ہی اکتفا کرتے ہیں ۔ انہوں نے فکر و نظر میں آزادی کا عمل دخل تسلیم کیا ہے اور سائنسی نقطۂ نظر کو پسندیدہ اور مقبول قرار دیا ہے ۔ مگر ان کا انداز عقل پسندی ، توازن اور مصلحت اندیشی کی بدولت روایات سے کلیتہً بغاوت پر مبنی نہیں ہے ۔ یعنی ان کا راستہ نہ کلاسیکی ہے نہ خالص رومانوی ۔

ان کا طریقِ کار فکر سے زیادہ عمل کی ترغیب دلاتا ہے ۔ انہوں نے ادب سے فرسودگی اور تعطّل دور کر کے اسے نیا پن ، واضح مقصدیت ، سنجیدگی ، معقولیت اور ہمہ گیری عطا کی ہے ۔ سر سید کے ہم خیال ادباء کی تحریروں میں سر سید مکتبِ فکر کے

(۱) حالی ، الطاف حسین ، حیات جاوید ۔ ص ۶۲۶ ۔

واضح اثرات ملتے ہیں ۔ ان اثرات کے اجتماعی عمل کا نام 'علی گڑھ تحریک' ہے ۔ گویا ان ادیبوں کا اور ان کے پیروکاروں کا خاص اندازِ نظر اور طرزِ عمل ہے وہ سر سید کے افکار ہی کی ایک وسیع صورت ہے ۔

سر سید نے اردو میں تاریخ نگاری کو بھی متاثر کیا ہے ۔ ان کی یہ پختہ رائے تھی کہ تاریخ قومی ترقی اور اصلاح کے لیے مفید ہے اور اسی نقطۂ نظر سے تاریخ نگاری کرنی چاہیے ۔ علاوہ ازیں وہ افراد سے زیادہ اجتماعی مسائل سے متعلق غور و فکر کو پسند کرتے تھے ۔ لہذا وہ رجال کو اتنی اہمیت نہیں دیتے تھے ۔ غرضیکہ اردو ادب کے ہر شعبے میں سر سید کے اثرات نمایاں ہیں ۔ ان اثرات کا خلاصہ یہ ہے : ۱ ۔ مقصدیت کا عمل ۲ ۔ پیچیدہ اور پرتکلف اندازِ بیان سے اجتناب ۳ ۔ موضوع کے موافق اسلوبِ بیان[1]۔

سر سید اور سیاست

۱۸۶۷ء سے پہلے سر سید نے جتنے قومی کام کیے اور جس درجہ کی اصلاحی خدمات سر انجام دیں ان میں ہندو و مسلم کی تفریق قطعاً مدِ نظر نہیں تھی ۔ مذہبی اصلاح سے قطع نظر معاشی ، سماجی اور اقتصادی اصلاحات کے بارے سوچتے وقت اور اپنے خیالات کو عملی جامہ پہنانے وقت وہ ہمیشہ اس اصول کے پابند رہے کہ ہندوستان کی بھلائی صرف اس میں ہے کہ ہندو ، مسلمان بطور ایک قوم کے مل جل کر رہیں ، مگر ایسے بہت سے اسباب جمع ہونے لگے جن کا بغور مشاہدہ اور مطالعہ کرنے پر انہیں اپنی رائے تبدیل کرنی پڑی ۔

اردو زبان جو درحقیقت ہندی تہذیب کی ایک ترقی یافتہ صورت ہے اور جس میں عربی اور فارسی کے صرف کسی قدر الفاظ شامل ہیں ، اس کو ہمارے ہم وطن بھائیوں نے صرف اسی بنا پر مٹانا چاہا کہ اس کی ترقی کی بنیاد مسلمانوں کے عہد میں پڑی تھی ۔ چنانچہ ملک کے سربرآوردہ ہندوؤں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ جہاں تک ممکن ہو تمام سرکاری عدالتوں میں سے اردو زبان اور فارسی رسم الخط موقوف کرانے کی کوشش کی جائے اور بجائے اس کے بھاشا زبان جاری ہو جو دیوناگری میں لکھی جائے[2]۔ سر سید کا بیان ہے کہ :

> "یہ پہلا موقع تھا کہ جب مجھے یقین ہو گیا کہ اب ہندو مسلمانوں کا بطور ایک قوم کے ساتھ ساتھ چلنا اور دونوں قوموں کو ملا کر سب کے لیے ساتھ ساتھ کوشش کرنا محال ہے ۔ انہی دنوں جب کہ یہ چرچا بنارس میں

---

(۱) سید عبداللہ ، سر سید اور ان کے نامور رفقاء کی نثر کا فکری اور فنی جائزہ ۔ (تلخیص) ۔ ص ۲۵۰ تا ۲۷۵ ۔

(۲) یہ واقعہ ۱۸۶۷ء کا ہے ۔

پھیلا ایک روز مسٹر شیکسپیئر سے جو اس وقت بنارس میں کمشنر تھے ، میں مسلمانوں کی تعلیم کے باب میں کچھ گفتگو کر رہا تھا اور وہ متعجب ہو کر میری گفتگو سن رہے تھے - آخر انہوں نے کہا کہ آج یہ پہلا موقع ہے کہ میں نے تم سے خاص مسلمانوں کی ترقی کا ذکر سنا ہے ، اس سے پہلے تم ہمیشہ عام ہندوستانیوں کی بھلائی کا خیال ظاہر کرتے تھے - میں نے کہا : ''اب مجھ کو یقین ہو گیا ہے کہ دونوں قومیں کسی کام میں دل سے شریک نہ ہو سکیں گی - ابھی تو بہت کم ہے آگے آگے اس سے زیادہ مخالفت اور عناد ان لوگوں کے سبب جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں بڑھتا نظر آتا ہے - جو زندہ رہے گا وہ دیکھے گا - انہوں نے کہا اگر آپ کی یہ پیش گوئی صحیح ہے تو نہایت افسوس ہے - میں نے کہا مجھے بھی نہایت افسوس ہے مگر اپنی پیش گوئی پر مجھے پورا یقین ہے'' (۱) -

اس کے بعد سرسید نے اپنی قوم کی بقا کی خاطر دن رات ایک کر دیے - ان کے دائرۂ فکر و عمل میں بے پناہ ہمہ گیری آ گئی اور مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہ رہا جس پر انہوں نے اثر نہ ڈالا ہو - میدان سیاست میں وہ ہمیشہ کانگریس کے مخالف رہے -

سر سید اور کانگریس کی مخالفت

سرسید نے کانگریس کی جو مخالفت کی وہ در اصل مسلمانوں کی بقا کے لیے نہایت ضروری تھی - لیکن بہت سے لوگوں نے اسے ایم - اے - او علی گڑھ کالج کے پرنسپل مسٹر تھیوڈر بیک کی پالیسی قرار دیا - معترضین میں طفیل احمد صاحب منگلوری پیش پیش ہیں - ان کی کتاب 'مسلمانوں کی روشن مستقبل' کے باب ہفتم میں سر سید کی سیاست سے بحث ہے اور اس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ سرسید کی پالیسی نام نہاد تھی ، در اصل پرنسپل مذکور ہی اس کی روح و رواں تھے - لیکن ہماری تحقیق یہ ہے کہ منگلوری صاحب کا یہ ارشاد افسانہ طرازی کا ایک عمدہ نمونہ ہے - ہمارے پاس اس دعوے کے ثبوت کے لیے بہت سے شواہد موجود ہیں ، مثلاً ۱۹۰۹ء میں مسلم لیگ کے صدر سر علی امام نے سرسید کی دور اندیشی کا جن عمدہ الفاظ میں اعتراف کیا ہے وہ ملاحظہ ہوں :

''کانگریس کی اس خواہش کا کہ قانون سازی اور ملکی انتظام انگریزوں کے ہاتھ سے نکل کر ہندوستانیوں کے ہاتھ آ جائے ، دوسرے لفظوں میں یہ مطلب ہے

---

(۱) حالی ، حیات جاوید - ص ۱۶۴ -

> کہ ملک کی حکومت اس گروہ کے ہاتھ میں آ جائے جن کی کثرت رائے ہندوستانی "سلف گورنمنٹ" کی کونسلوں میں ہو۔ صاف ظاہر ہے کہ اس تبدیلی کا مسلمانوں کی حالت پر کیا اثر پڑے گا۔ سرسید نے اس سوال کا جواب اکتیس برس پہلے اپنی لکھنؤ والی اسپیچ میں دیا تھا جس پر آج تک مسلمانوں کا عمل درآمد رہا ہے اور وہ کانگرس سے الگ تھلگ رہے ہیں۔ آل انڈیا مسلم لیگ کو پھر اسی جواب کا اعادہ کرنا ہے"[۱]۔

سرسید پر یہ الزام کہ وہ مسلمانوں کو ہر زمانہ میں سیاسیات سے الگ رہنے کی تلقین کرتے ہیں، کسی طرح درست نہیں ہے۔ وہ بخوبی جانتے تھے کہ ان کے زمانہ کے مسلمان معاشی اور اقتصادی طور پر ہندوؤں سے بہت پیچھے تھے۔ بڑی مشکل اور جدوجہد کے بعد انگریز حاکموں کے دلوں سے مسلمانوں کے خلاف غبار دور ہوتا جا رہا تھا۔ سرسید کو اس امر کا یقین تھا کہ اگر مسلمان کانگرس کے ساتھ شامل ہوئے تو وہ اپنی طبیعت اور مزاج کی گرمی کی بدولت انگریزوں پر سخت سے سخت نکتہ چینی شروع کریں گے اور ہندوؤں سے کہیں زیادہ وہی غصہ کا نشانہ بنیں گے۔ علاوہ ازیں ان کا یہ نظریہ درست بھی تھا کہ مسلمان اگر ترقی چاہتے ہیں تو انہیں سب سے پہلے مغربی قسم کی تعلیم حاصل کرنی چاہیے۔ لہٰذا سرسید نے مخالفین کی پروا نہ کرتے ہوئے اپنی تمام توجہ اسی مقصد پر صرف کر دی کہ مسلمانوں کو انگریز دشمن سیاست سے باز رکھا جائے۔

اس موضوع پر مولانا محمد علی جوہر نے اپنے اخبار 'ہمدرد' میں مندرجہ ذیل اداریہ لکھا تھا:

> "جب ۱۸۸۵ء میں کانگرس کا آغاز ہوا تو سرسید کو متنبہ کرنا پڑا کہ وہ مسلمانوں کو کیا مشورہ دیں۔ یہ سراسر غلط ہے کہ انہوں نے کبھی بھی آزادیٔ ہندوستان کی یا ہندوجاتی کی مخالفت کی۔ لیکن وہ اسے کبھی جائز نہیں سمجھتے تھے کہ وہ ہندوجاتی سے اپنے لیے آزاد خیالی، بے تعصبی اور فراخ دلی کا سارٹیفکیٹ، ملت اسلامیہ کے مفاد کو نظر انداز کرکے حاصل کریں، جیسا کہ کانگرسی مسلمانوں نے کانگریس کی ابتداء میں کیا تھا اور ایک دو آج بھی کر رہے ہیں۔ ان کی سیاست اور ان کے کریکٹر دونوں کو جانچنے اور پرکھنے کے لیے بہترین کسوٹی وہ فتنہ ہے جو سن ستاون کے بعد برپا ہوا"[۲]۔

---

(۱) زبیری، محمد امین، تذکرہ سر سید۔ ص ۲۲۷۔
(۲) " " " ، تذکرہ سر سید۔ ص ۲۳۰۔

بیسویں صدی کے شروع سے تقسیم ملک تک سیاست میں جو تبدیلیاں رونما ہوتی رہی ہیں ان پر غور کرنے سے سر سید کی سیاسی دوربینی اور بصیرت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ قائد اعظم محمد علی جناح رح نے اپنی سیاسی زندگی کانگریس میں شامل ہو کر شروع کی اور بہت جلد کانگرس کے ممتاز لوگوں میں ان کا شمار ہونے لگا۔ لیکن کانگریسی ذہنیت کا صحیح اندازہ کرنے پر ۱۹۱۳ء میں انہوں نے مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کی اور ایک عرصہ تک نہایت خلوص کے ساتھ اس کوشش میں مصروف رہے کہ صحیح بنیادوں پر ہندو مسلم اتحاد قائم کر سکیں۔ اسی مقصد کی خاطر 'میثاقِ لکھنؤ' ہوا۔ لیکن آخرکار وہ دیانت داری کے ساتھ یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ :

۱۔ "ایک دیانت دار مسلمان کا یہ پختہ یقین ہے کہ کانگریس محض ہندوؤں کی ایک انجمن ہے اور اس کے عائد کا صرف ایک مدعا ہے کہ ہندوستان میں ہندو راج قائم کیا جائے اور دوسری تمام قوموں کو اسا پورا پورا محکوم بنایا جائے۔

۲۔ ہندوستان میں جمہوریت کے معنی صرف ہندو راج ہیں ، یہ وہ حالت ہے کہ جسے مسلمان ہرگز قبول نہیں کریں گے۔ ہم کسی ایسے نظام کو قبول نہیں کر سکتے ، جس کا مطلب ہندوؤں کی آزادی اور مسلمانوں کی غلامی ہو"[1]۔

یہ حقیقت ہے کہ اس سیاسی تدبّر ، دور اندیشی اور مسلمان قوم کی بقاء کے عظیم جذبے کی بدولت بالآخر پاکستان وجود میں آیا۔ سب سے پہلے سر سید ہی نے دو قومی نظریہ کی دھندلی سی تصویر پیش کی اور مسلمانوں کو ہندوؤں میں جذب ہونے سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ اگر انہوں نے بر وقت ایسا نہ کیا ہوتا تو ہندوستان کی آزادی کے موقع پر مسلمانوں کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچنے کے واضح خدشات موجود رہتے۔ اگر مسلمانوں کی آزاد اور خود مختار مملکتِ پاکستان وجود میں نہ آتی تو وہ سیاسی اور مذہبی دونوں حیثیتوں سے بالکل تباہ و برباد ہو جاتے۔

جو لوگ کانگرس کے پروپیگنڈے کے زیرِ اثر یہ خیال رکھتے ہیں کہ سر سید کی پالیسی محض انگریزوں کو خوش رکھنے کے لیے تھی اور مسلمانوں کی من حیث القوم آبرومندانہ آزادی حاصل کرنا سر سید کے پیشِ نظر نہیں تھا ، ہم ذیل میں ان کی اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے کانگریس کے طریقِ کار کا ایک اجمالی خاکہ پیش کرتے ہیں۔

۱۸۸۵ء میں ایک انگریز مسٹر ہیوم نے کانگریس کی بنیاد رکھی اس کے سالانہ اجلاسوں میں ایک عرصہ تک حکومت کی وفاداری کا اعلان کرتے رہنے کی روایت بحال رہی

(۱) زبیری ، محمد امین ، تذکرہ سر سید - ص ۲۳۰ - ۲۳۱ -

اور پہلا ریزولیشن ہمیشہ اسی اطاعت شعاری کے اظہار کا ہوتا ہے رہا۔ اس کے ابتدائی جلسے میں صدر جلسہ نے کہا "ہم کو مردانہ وار برسر عام کہنا چاہیے کہ ہم راج بھگت اور حکومت کے وفادار ہیں۔ ہماری رگ رگ میں راج بھگتی بھری ہوئی ہے، ہم انگریزی سلطنت کے فائدوں کو سمجھتے ہیں"[1]۔ ۱۸۸۱ء میں اس کا اعادہ یوں کیا گیا۔ "ہم کو مردوں کی طرح اعلان کرنا چاہیے کہ ہم پورے طور پر وفادار ہیں"[2]۔ ۱۹۰۱ء میں صدر کانگریس نے کہا:

"تمام سوچنے سمجھنے والے برطانوی راج کو اللہ کی جانب سے سمجھتے ہیں جب سے ہندوستان کا برطانوی راج سے بلاواسطہ تعلق ہوا ہے ہم ہمیشہ بادشاہ کے وفادار رہے ہیں"[3]۔

ہندو یونیورسٹی بنارس کے بانی پنڈت مدن موہن مالویہ نے ۱۹۱۸ء میں دہلی کے اجلاس (کانگریس) کی صدارت کرتے ہوئے اعلان کیا تھا:

"ہم ہمیشہ بادشاہ کے وفادار رہے ہیں اور ہماری وفاداری غیر متزلزل ہے اور جب کہ ملک معظم اپنی تاجپوشی کے بعد ۱۹۱۱ء میں ہندوستان تشریف لائے تو ہم نے اپنی وفاداری کا پھر اعادہ کیا اور اب بھی ہماری خواہش ہے کہ تاج برطانیہ کی وفادار رعایا رہیں"[4]۔

اسی جلسہ میں جنگ عظیم کی فتح پر ملک معظم کی خدمت میں وفادارانہ مبارک باد پیش کی گئی تھی . . . یہ تھی کانگریس کی "انگریز دشمن پالیسی"!

سر سید نے اپنی کتاب 'اسباب بغاوت ہند' میں جہاں بغاوت کے اسباب بیان کیے ہیں وہاں جا بجا ضمناً اس حقیقت کا بھی اظہار کیا ہے کہ اس عظیم ملک میں ہندو اور مسلمان دو علیحدہ قومیں ہیں اس کے بعد وہ اپنی زندگی کے مختلف مواقع پر تحریروں اور بیانوں کے ذریعے اس حقیقت کو وضاحت کے ساتھ پیش کرتے رہے ہیں۔ مثلاً . . . انہوں نے ۱۸۸۲ء میں لوکل سلف گورنمنٹ کے بل پر بحث کرتے ہوئے کہا:

"ہندوستان فی نفسہ ایک برّ اعظم ہے۔ اس میں مختلف اقوام اور مختلف مذاہب کے آدمی کثرت سے رہتے ہیں اور مذہبی دستورات کی سختی نے اب تک

---

(۱) رئیری، محمد امین، تذکرہ سر سید۔ ص ۱۶۶۔
(۲) " " "، تذکرہ سر سید۔
(۳) " " "، تذکرہ سر سید۔ ص ۱۶۷۔
(۴) " " "، تذکرہ سر سید۔ ص ۱۶۷، روئیداد جلسہ کانگریس بمقام دہلی ۱۹۱۸ء۔

ہمسایوں کو بھی ایک دوسرے سے جدا رکھا ہے ۔ جب تک قوم اور مذہب کے اختلافات اور ذات کا امتیاز ہندوستان کی سوشل اور پولٹیکل حالت میں ایک جزوِ اعظم رہے گا ۔ اس وقت تک الیکشن کا خالص فائدہ طمانیت کے ساتھ جاری نہیں کیا جا سکتا"(۱) ۔

سر سید دو سال تک کانگریس کے طریقِ کار اور مطمحِ نظر کا مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ اگر کانگرس کے مطالبات منظور ہو گئے تو مسلم اقلیت اسمبلیوں میں اور اعلیٰ سرکاری ملازمتوں میں ہمیشہ کے لیے ایک بے بس مخلوق بن کر رہ جائے گی ۔ چنانچہ انہوں نے ایک عام اجتماع میں دسمبر ۱۸۸۷ء میں لکھنؤ کی تعلیمی کانفرنس کے موقع پر کانگریس کے مطمحِ نظر پر روشنی ڈالی ۔ اس پر بنگالی پریس ان کا سخت مخالف ہو گیا ۔ سر سید نے جواباً لکھا :

"اگر ہمارے بنگالی دوست یہ چاہیں کہ وہ اس از با افتادہ قوم کو اپنی جوتیوں تلے مسل ڈالیں تو ان کو یہ توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ ہم اس کو برداشت کریں گے ۔ ان کو خوب یاد رکھنا چاہیے کہ ہماری مثال ایک ایسی رسی کی ہے جو بیشک جل گئی ہے مگر اس کا بل نہیں نکلا ۔ وہ بدستور اس میں باقی ہے اور ابھی وہ بالکل ٹھنڈی بھی نہیں ہوئی ۔ اس میں گرمی بھی باقی ہے ۔ سمجھ کر اس کو ہاتھ لگانا چاہیے ایسا نہ ہو کہ ہاتھ جل جائے ۔ کانگریس درحقیقت بن ہتھیاروں کی ایک سول وار ہے اس کا یہ مقصد ہے کہ انگلش گورنمنٹ برائے نام ہندوستان کی گورنمنٹ رہے ۔ مگر ملک کی اندرونی حکومت ان کے ہاتھ میں آ جائے ۔ وہ علانیہ اپنا خاص نام نہیں لیتے مگر خود سمجھتے ہیں کہ مسلمان تو اس لائق نہیں ہیں ، پھر ملک کی اندرونی حکومت انہیں کے ہاتھ میں رہے گی ۔ ہم بھی سول وار کو پسند کرتے ہیں مگر بن ہتھیاروں کی سول وار کو نہیں ، بلکہ ہتھیاروں والی سول وار کو ۔ اگر حکومت اندرونِ ملک کی حکومت اپنے ہاتھ سے منتقل کرنا پسند کرتی ہے تو ہم اس سے درخواست کریں گے کہ وہ مقابلہ کے لیے دوسرے قسم کے قلم کے کام میں لانے کی اجازت دے جو ہمارے باپ دادا کے لکھنے کا قلم ہے ۔ پھر جو پاس ہو وہی ملک کی حکومت کرے . . . ہماری عین خواہش ہے کہ ہندوستان کی تمام قومیں آپس میں محبت و دوستی سے رہیں ، مگر وہ دوستی اس وقت تک قائم رہ سکتی ہے جب تک کہ ایک دوسرے پر غالب آنے کی

---

(۱) زبیری ، محمد امین ، تذکرہ سر سید - ص ۱۷۰ -

حال نہ چلے ۔ بنگالیوں نے اور نیز ہمارے ملک کے تعلیم یافتہ ہندوؤں نے بھی چال اختیار کی ہے اور پھر اس پر توقع رکھتے ہیں کہ ہم مسلمان ان کے شریک ہوں :

ایں خیال است و محال است و جنوں"(۱)

اس کے بعد ۱۸۸۷ء میں انہیں کانگرس کے صدر کے گشتی خط کا جواب دیتے ہوئے لکھا :

"میں نے لکھنؤ کی تقریر میں ثابت کیا ہے کہ کوئی طریقہ بھی الیکشن کا اختیار کریں ہندوؤں کی تعداد مسلمانوں سے چوگنی ہوگی کل ملک کی قانونی حکومت ہندوؤں کے ہاتھ میں ہوگی اور مسلمان نہایت ذلت کی حالت میں پڑ جائیں گے ۔ ایک مسلمان موچی سے لے کر ایک مسلمان رئیس تک اس بات پر راضی نہیں ہوگا کہ ہماری حالت ایسی ہو جائے کہ ہم دوسری قوم کے جو ہمارے ساتھ رہتی ہے حلقۂ غلامی میں آ جائیں"(۲)۔

سر سید کی اگرچہ یہ مسلمہ رائے تھی کہ مسلمانوں کی سب سے بڑی ضرورت اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا ہے ۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ مسلمانوں کی سیاسی ضروریات سے بھی باخبر تھے ۔ اس مقصد کے حصول کے لیے انہوں نے اپنے ہم خیال افراد کے مشورہ کے بعد ایم ۔ اے ۔ او ڈیفنس ایسوسی ایشن قائم کی جو معقول قسم کی ایجی ٹیشن میں مسلمانوں کی شمولیت کو جائز سمجھتی تھی ۔ الغرض سر سید نے جو سیاسی پالیسی اختیار کی تھی اس پر ان کی زندگی میں اور موت کے بعد بھی عام مسلمانوں کا اتفاق رہا ہے ۔ مگر کانگریس کے حامی انگریز افسر اور کانگریس میں شامل مسلمان ہمیشہ یہ کہتے رہے ہیں کہ سر سید کی یہ پالیسی انگریزوں کو خوش کرنے کے لیے تھی ۔ وہ سر سید کے ایک گشتی خط کو کبھی معاف نہیں کر سکے ۔ اس خط میں انہوں نے مسلمانوں کو کانگریس میں شرکت نہ کرنے کی نصیحت کی تھی ۔ لکھتے ہیں :

"اگر بفرض محال کانگریس کے مقاصد پورے ہو جائیں تو ہندوستان میں مسلمانوں کا حال یہودیوں سے بھی بہت زیادہ بدتر ہو جائے گا"(۳)۔

---

(۱) زبیری ، محمد امین ، تذکرہ ، سر سید ۔ ص ۱۷۴ ۔

(۲) " " " ، تذکرہ ، سر سید ۔ ص ۱۷۶ ۔ ۱۷۷ ۔

(۳) " " " ، تذکرہ ، سر سید ۔ ص ۱۷۸ ۔

سر سید نے ۱۸۵۷ء کے زہرہ گداز حالات دیکھے تھے - کانگریس سیاسی مقاصد کے لیے جگہ جگہ مجلسیں منعقد کراتی تھی جن میں حکومت پر نکتہ چینی ہوتی تھی - ایسی مجلسوں کی نسبت سر سید کی یہ رائے تھی کہ :

''ان میں مسلمانوں کا شریک ہونا ہماری قوم کے لیے نا مناسب ہے ، غدر میں کیا ہوا ؟ ہندوؤں نے اسے شروع کیا مسلمان دل چلے تھے بیچ میں کود پڑے - ہندو تو گنگا نہا کر جیسے تھے ویسے ہی ہو گئے مگر مسلمان اور مسلمانوں کے خاندان تباہ و برباد ہو گئے - یہی نتیجہ مسلمانوں کے پولیٹیکل اجی ٹیشن میں شریک ہونے سے ہوگا''(۱)۔

سر سید بحیثیت ماہر تعلیم

ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنی عملداری میں ایک عرصے تک اسی نظام کو برقرار رکھا جو مغلیہ سلطنت میں رائج تھا - ۱۸۲۳ء میں بعض سیاسی مفادات کے پیش نظر جنرل کمیٹی قائم کر کے قدیم مدارس میں انگریزی تعلیم کے درجے بھی کھول دیے گئے - ہندو قوم نے بالعموم اور بنگالی ہندوؤں نے بالخصوص اس جدید تعلیم کی طرف بہت زیادہ شوق اور رجحان ظاہر کیا - اور وہ ایک مختصر سے عرصے میں اس نئی تعلیم کی بدولت سرکاری ملازمتوں میں امتیازی حیثیت کے مالک ہو گئے - ۱۸۳۴ء میں حکومت نے انگریزی تعلیم کی اشاعت پر بہت زور دیا - جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۸۳۷ء میں عدالتوں سے فارسی زبان کا اخراج عمل میں آیا - اس کے بعد ۱۸۴۱ء میں انگریزی جاننے والوں کا حق ملازمت دوسروں سے فائق قرار دیا گیا اور اس جدید نظام تعلیم کو اتنی ترقی دی گئی کہ ۱۸۵۶ء میں کلکتہ ، بمبئی ، مدراس میں یونیورسٹیاں قائم کی گئیں جن میں مسلمان طلباء کے مقابلے میں غیر مسلم طلباء کی تعداد حیران کن حد تک زیادہ تھی -

سر سید نے ۱۸۵۷ء کے بعد جب مسلمانوں کی تباہی کے اسباب پر غور کرنا شروع کیا تو وہ دیانت داری کے ساتھ اس نتیجے پر پہنچے کہ مسلمان اپنی کھوئی ہوئی عظمت صرف اسی صورت میں بتدریج حاصل کر سکتے ہیں کہ وہ جدید تعلیم میں ہمہ تن مصروف ہو جائیں -

۱۸۷۰ء میں سر سید نے کمیٹی 'خواستگار تعلیم مسلمانان' کی بنیاد رکھی اور ایک نہایت مفصل اور جامع منصوبہ تعلیم کے باب میں پیش کیا اگرچہ وہ اسے عملی جامہ نہ

---

(۱) زبیری ، محمد امین ، تذکرہ سرسید - ص ۱۷۸ -

بھا سکے تا ہم وہ اپنے خیالات پر تمام عمر سختی سے کار بند رہے - ان کے نزدیک قومی تعلیم کا منتہائے نظر یہ تھا :

"ہماری تعلیم اس وقت ہوگی جب کہ ہماری تعلیم ہمارے ہاتھ میں ہوگی یونیورسٹی کی غلامی سے آزادی ہوگی - ہم آپ اپنی قوم میں علوم پھیلائیں گے - فلسفہ ہمارے داہنے ہاتھ میں ہوگا اور نیچرل سائنس بائیں ہاتھ میں - اور کلمہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا تاج سر پر - سب سے اول ہمارا مقصد ہے کہ مسلمانوں میں دوستی اور قومی اتحاد اور قومی ہمدردی جو اول سیڑھی قومی ترقی کی ہے قائم رہے ، اس کے لیے ہم کو کوشش کرنا ہے ، سب سے مقدم یہ کرنا ہے کہ وہ مسلمان رہیں اور مذہب اسلام کی حقیقت ان کے دل میں قائم رہے - اس لیے ضروری ہے کہ ہم انگریزی تعلیم کے ساتھ ان کو مذہبی تعلیم بھی دیں -

پھر ہمیں ان کو اس طرح تربیت کرنا ہے کہ وہ مردہ دل نہ ہونے پائیں اور ان کی دلی امنگیں ٹھنڈی نہ پڑنے پائیں اور ان کی جرأت کسی کام کرنے کی گھٹنے نہ پائے -

پھر ہم کو ان کے اخلاق کی درستی پر متوجہ ہونا ہے اور ان میں نیکی اور راستبازی ، سچائی اور دوستوں سے سچی دوستی کی فیلنگ پیدا کرنی ہے - اس مقصد کے لیے ہم کو نصیحت سے زیادہ ان کے گرد اسباب پیدا کرنے ہیں اور ان کے آس پاس ایسے نیک لوگوں کا جمع کرنا ہے جن کی صحبت سے ان کی طبیعت نیکی کی طرف مائل ہو اگر تعلیم کے ساتھ تربیت نہ ہو تو وہ تعلیم درحقیقت کچھ قدر کے لائق نہیں - بس انگریزی تعلیم پڑھ لینا اور بی - اے اور ایم - اے ہو جانا جب تک کہ اس کے ساتھ تربیت اور قومیت کی فیلنگ نہ ہو ہم قوم کو قوم اور معزز قوم نہیں بنا سکتے"(۱) -

سر سید مسلمانوں میں جدید عسکری تعلیم کو بھی ضروری سمجھتے تھے - ان کے نزدیک قومیت کو زیادہ مؤثر کرنے کے لیے ایک قومی لباس بھی ضروری تھا - انہوں نے اپنے کالج میں اقامتی نظام قائم کرکے مسلمان طلباء کو قومیت کا جو احساس دلایا تھا وہ آگے چل کر ایک تحریک کی صورت میں ظاہر ہوا - علاوہ ازیں سر سید طریقہ تعلیم میں نمایاں اصلاح چاہتے تھے - وہ اعلیٰ تعلیم کی ضرورت پر بہت زور دیتے تھے - اسی پر انہوں

---

(۱) زبیری ، محمد امین ، تذکرہ سر سید - ص ۵۷ - ۵۹ -

نے ۱۸۸۱ء میں پنجاب یونیورسٹی کی شدید مخالفت کی تھی - ان کی یہ مخلصانہ رائے تھی کہ اگر مشرقی علوم کی ترغیب دی گئی تو اعلیٰ تعلیم کی طرف توجہ بہت کم ہو جائیگی اور وہ اسے مسلمانوں کے حق میں مضر سمجھتے تھے - لکھتے ہیں :

"ہمارے لیے سیدھا راستہ کھلا ہوا ہے کہ جہاں تک ہو سکے یورپین لٹریچر اور یورپین سائنس میں اعلیٰ درجہ کی ترقی حاصل کریں" -

بلاشبہ ہم کو اس وقت خوف پیدا ہوتا ہے جب کہ ہم ایسے لوگوں کو جن کے ہاتھ میں خدا نے ہمارے ملک کی بھلائی برائی نفع نقصان سپرد کیا ہے - مردہ مشرقی علوم اور مشرقی زبانوں کے زندہ کرنے پر مائل پاتے ہیں تو ضرور سمجھتے ہیں کہ مردہ علوم مشرقی اور مشرقی زبانوں کے زندہ کرنے کی فکر میں پڑنا ہمارے لیے ، ملک کے لیے بلکہ گورنمنٹ کے لیے کچھ بھلائی نہیں ہے"[1] -

مولانا الطاف حسین حالی لکھتے ہیں :

"پس انہوں نے جو علی العموم مشرقی علوم اور مشرقی لٹریچر اور دیسی زبانوں کے ترجموں کی مخالفت کی ہے ، اس سے ان کا صرف یہ مطلب ہے کہ ہندوستان کے کالجوں میں اعلیٰ درجہ کی تعلیم محض انگلش لینگوائج کے ذریعے ہونی چاہیئے"[2] -

اس خیال سے کہ اعلیٰ تعلیم سے توجہ نہ ہٹ جائے سر سید نے ۱۸۹۸ء میں ٹیکنیکل ایجوکیشن کی بھی مخالفت کی تھی تاہم اس غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے کہ سر سید دیسی زبانوں کو ناپسند کرتے تھے ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ انہوں نے فارسی رسم الخط ترک کرنے اور ناگری حروف کے استعمال کو رواج دینے کی ہندو تحریک کی سخت مخالفت کی تھی - یہ بھی یاد رہے کہ وہ ایک زمانے میں اردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے کے حامی تھے مگر اپنے تجربہ کی روشنی میں انہوں نے یہ نظریہ تبدیل کر لیا تھا - تاہم یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ انہوں نے اردو زبان کی ہر مشکل وقت میں حمایت کی ہے - ۱۸۶۷ء میں شمالی ہندوستان کے دفاتر میں جب ہندوؤں کی سازش سے حکومت نے اردو زبان کی جگہ ہندی زبان اور ناگری رسم الخط کو رواج دینا چاہا تو سر سید نے اردو زبان کی زبردست حمایت کی اور اردو زبان اور فارسی رسم الخط کو بحال کرا کے ہی دم لیا - یہیں

---

(۱) حالی ، حیات جاوید - ص ۹۰۴ -

(۲) حالی ، حیات جاوید - ص ۱۱۴ -

سے ہندو دہنیت ان پر بے نقاب ہوئی اس کے بعد وہ ہمیشہ اردو زبان اور رسم الخط کی مخالفت کرنے والوں سے نبرد آزما رہے ۔ ۱۸۹۸ء میں اردو زبان اور فارسی رسم الخط کے خلاف تیسری بار جھگڑا اٹھا تو انہوں نے مرنے سے آٹھ دن پہلے پھر اپنی قدیم رائے ظاہر کی اور حکومت کو اس کی طرف توجہ دلائی اور جو کمیٹی الہ آباد میں اردو کی حمایت کے لیے قائم کی گئی تھی ، اس سے خط و کتابت کی اور باوجود ہر طرح کی معذوری کے تا بہ مقدور اس کی تائید کرنے کا وعدہ کیا ۔

غرضیکہ سر سید اس حیثیت سے ایک نامور ماہر تعلیم تھے کہ وہ تعلیم و تربیت کے مقاصد سے بخوبی با خبر تھے اور اعلیٰ علم کو اعلیٰ عہدوں کے حصول کا اور مسلمانوں کی سیاسی و معاشی ترقی کا ذریعہ سمجھتے تھے ۔ دارالعلوم میں مناسب اقامتی نظام قائم کرکے انہوں نے بڑی دانش مندی کا ثبوت دیا تھا ۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ اساتذہ شائستگی کے ساتھ اپنے طلباء پر جو عمدہ اثر ڈال سکتے ہیں ، سر سید اس سے کماحقہ آگاہ تھے اور یہی وجہ تھی کہ وہ مغربی علوم کی ترویج کے لیے ہمیشہ انگریز اساتذہ مقرر کرتے تھے اور ان کی دیانت داری کے ساتھ یہ رائے تھی کہ صرف اسی طرح دارالعلوم کے طلباء تہذیب اور شائستگی میں ترقی کر سکتے تھے ۔

سر سید ، عقلیت اور اس کے زیرِ اثر مذہبی اصلاحات

اس موضوع کی نمایاں تصنیف ان کی 'تفسیر القرآن' ہے ۔

مولانا حالی حیاتِ جاوید میں لکھتے ہیں :

''قرآنِ مجید کی تفسیر لکھنے سے سر سید کا مقصد جیسا کہ عموماً خیال کیا جاتا ہے یہ ہرگز نہ تھا کہ اس کے مضامین عام طور پر تمام اہلِ اسلام کی نظر سے گزریں ۔ سر سید نے ایک موقع پر اپنی تفسیر کی نسبت کہا کہ اگر زمانے کی ضرورت مجھ کو مجبور نہ کرتی تو میں کبھی اپنے ان خیالات کو ظاہر نہ کرتا ۔ بلکہ لکھ کر اور ایک لوہے کے صندوق میں بند کرکے چھوڑ جاتا اور یہ لکھ جاتا کہ جب تک ایسا زمانہ نہ آئے ، اس کو کوئی کھول کر نہ دیکھے اور اب بھی اس کو بہت کم چھپواتا ہوں اور گراں بیچتا ہوں تاکہ صرف خاص خاص لوگ اس کو دیکھ سکیں ۔ سرِ دست تمام لوگوں میں اس کا شائع ہونا اچھا نہیں''(۱) ۔

---

(۱) حالی ، حیات جاوید ۔ ص ۷۳۳ ۔

سر سید نے یہ تفسیر دینِ اسلام اور مغربی علوم میں مصالحت کی خاطر لکھی تھی۔ انہوں نے مذہب کی سچائی کا یہ معیار قرار دیا تھا کہ اس کی تعلیم میں کوئی بات فطرتِ انسانی اور فطرتِ اللہ کے خلاف نہ ہو اور اس بات کا دعویٰ کیا تھا کہ اس معیار پر جیسا کہ اسلام پورا اترتا ہے دنیا کا کوئی مذہب ایسا پورا نہیں اترتا۔ اس مقصد کو پورا کر دکھانے کے لیے انہوں نے 'تفسیر القرآن' میں نئے علمِ کلام کی بنیاد قائم کی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یونانی فلسفہ کے مقابلہ میں عباسی خلفاء کے زمانہ میں ہمارے متکلمین نے جو طریقہ اختیار کیا تھا وہ سر سید کے زمانے میں کارآمد نہیں رہا تھا۔ ان کے عہد کے جو مصنفین قدیم متکلمین کے طریقہ پر کاربند ہو کر تصنیفات کرتے تھے ان سے جدید تعلیم یافتہ طبقہ کی تشفی نہیں ہوتی تھی اور مذہب کی نسبت جو شبہات ان کے دل میں گمانوں کے لشکر کی صورت میں خطور کرتے تھے ان کے سامنے انہیں دم کا ثبات حاصل نہیں تھا۔ یہ طبقہ اب بھی ہر چیز کی صداقت کے لیے دلیل چاہتا ہے اور اس بات کا خواہشمند ہے کہ اسلام کے عقائد فلسفیانہ دلائل سے اس کو بتائے جائیں۔

سر سید اور حریتِ فکر

سر سید کا مقصدِ اولین ہندوستانی مسلمانوں کی معاشرتی زندگی میں انقلاب لانا تھا اور مذہب میں اصلاح ان کے پروگرام میں مرکزی حیثیت نہیں رکھتی تھی، مگر انہیں مذہبی معاملات میں مجبوراً دخل دینا پڑا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں کے معاشرتی احوال کا سارا تانا بانا مذہبی معتقدات اور رسومات پر مشتمل تھا۔ ان میں سے اکثر رسومات سر سید کے نزدیک معاشرتی ترقی کی راہ میں رکاوٹ تھیں اور بہت سے موانع کو دور کرنے کے لیے محولہ بالا کتابیں لکھی تھیں اور 'تہذیب الاخلاق' کے متعدد مضامین میں اپنے مجتہدانہ خیالات کو پیش کیا تھا۔ اس کا فوری نتیجہ یہ نکلا کہ علماء کا ایک معتد طبقہ ان کا مخالف ہو گیا۔ مگر سر سید نے حریتِ فکر کی جو شمع روشن کی تھی وہ ان کے خلوص، ایثار، جد و جہد اور ہم مشرب رفقاء کے تعاون کی بدولت بدستور روشن رہی اور وہ مخالفت کے باوجود آزادیٔ رائے، اجتہاد اور عقل پرستی کو رواج دینے میں کامیاب ہو گئے۔

سر سید کو یہ نیا راستہ اختیار کرتے وقت ماضی کی بہت سی فرسودہ روایات سے بغاوت کرنی پڑی۔ یہ کوئی معمولی کام نہیں تھا کہ وہ اسے بآسانی سرانجام دے لیتے۔ جب انہیں اس میدان میں قدم قدم پر مصائب کا سامنا کرنا پڑا تو انہیں اپنے فلسفہ کی تقویت کے لیے امام غزالیؒ اور شاہ ولی اللہ کی تعلیمات سے استفادہ کرنے کی ضرورت لاحق

ہوئی ۔ بقول ڈاکٹر سید عبداللہ :

"سر سید کے مضامین میں جو فلسفۂ اخلاق پیش ہوا ہے اس کی خاص علمیت اور عقلیت ہے ان کے نزدیک جو ہے دنیاوی طور پر مفید ہیں وہ اچھی بھی ہیں ۔ تہذیبِ نفس اور مجلسی شائستگی ان کے ضابطۂ اخلاق میں ایک اہم قدر ہے ۔ سر سید کے اخلاقی خیالات پر امام غزالیؒ کی تعلیمات کا بھی عکس پڑا ہے ۔ مگر وہ امام غزالیؒ کی صرف منطقی اور عقلی نظریوں کے مداح معلوم ہوتے ہیں ، امام غزالیؒ کی روحانیت سے انہیں کوئی خاص دلچسپی معلوم نہیں ہوتی"[1] ۔

ہم اپنے اس دعوے کے ثبوت کی خاطر سر سید کے مقالات سے چند حوالے پیش کرتے ہیں :

"اعمال کے ترازو میں تولے جانے اور سزا کا تعین کرتے وقت سر سید نے امام غزالیؒ کی کتاب "المضنون بہ علیٰ غیر اہلہ" سے استدلال کرکے ان کا وجود منافی تسلیم کیا ہے"[2] ۔ "گناہ سے کیوں عذاب ہوتا ہے کے زیرِ عنوان روح کے کاسب ہونے یعنی گناہ و ثواب کے اثرات قبول کرنے کی وضاحت امام غزالیؒ کی کتاب مذکورہ بالا سے اقتباس پیش کرکے کی ہے"[3] ۔

"مرنے کے بعد روحِ انسانی پر کیا گزرتی ہے ۔ موحدین نجات پاتے ہیں اور مشرکین ہمیشہ دوزخ میں رہتے ہیں ۔ ۔ ۔ اس مسئلے پر بھی دلائل دیتے وقت شاہ ولی اللہ کی کتاب 'حجۃ اللہ البالغہ' کی عبارت نقل کی ہے[4] ۔ شاہ ولی اللہ نے 'تفہیماتِ الٰہیہ' میں معدنیات ، نباتات اور عالمِ حیوانات میں زندگی کے مختلف مظاہر پر جو تدریجی ترقی کا تصور پیش کیا ہے ان کا خلاصہ پیش کرکے یہ خواہش ظاہر کی ہے کہ اگر شاہ صاحب نے یہ نوادر کتاب و سنت سے اخذ کیے ہیں تو کوئی دوست ان کے ماخذ سے مطلع فرمائیں"[5] ۔

---

(۱) سر سید اور ان کے نامور رفقاء کی اردو نثر کا فنی اور فکری جائزہ ۔ ص ۵۸ ۔

(۲) مضمون کتابۃ الاعمال والمیزان ، مندرجہ تہذیب الاخلاق ۔ یکم ربیع الاول ۱۳۱۲ھ مشمولہ مقالات سر سید ۔ ص ۱۹۸ ۔

(۳) تہذیب الاخلاق ، یکم ربیع الاول ۱۳۱۲ھ ، مقالات سر سید ۔ ص ۲۰۳ ۔

(۴) ایضاً ۔

(۵) العجب ، ثم العجب از آخری مضامین سر سید مشمولہ مقالات سر سید ۔ ص ۲۸۶ ۔

شاہ ولی اللہ کے نظریہ عالم مثال کے متعلق لکھتے ہیں :

"شاہ ولی اللہ صاحب نے جو تمثل اور تمثل برزخی مراد لی ہے یعنی بین المثال و الشہادہ جس کے معنی وہی سمجھتے ہوں گے مگر ہماری سمجھ میں تو نہیں آتے ۔ غالباً اور کوئی بھی نہیں سمجھا ہوگا ۔ مگر اس امر کی نسبت کہ جب حضرت جبرئیل ادمی کی صورت بن کر رسول خدا صلی اللہ علیہ و سلم کے پاس آتے تو ان کا اصلی جسم کیا ہوتا تھا ۔ علماء اسلام نے عجب عجیب بحثیں کی ہیں"[1] ۔

نو معتزلہ

سر سید نے اپنی تحریروں میں امام غزالی اور شاہ ولی اللہ کے علاوہ معتزلہ کا بار بار حوالہ دیا ہے ۔ اسلام کے مروجہ خیالات سے نپٹنے کے بعد انہیں اپنے جدید خیالات کو سہارا دینے کے لیے اسلام کے جس مفکر کے خیالات سے جو بات اپنے عقائد کے موافق ملتی ہے وہ اسے قابل قبول گردانتے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے دور عباسیہ کے مسلمان مفکرین سے بخوبی استفادہ کیا ہے ۔ ان مفکرین نے یونانی فلسفہ کے ساتھ مذہبی مسائل کو تطبیق دیتے وقت جو روش اختیار کی تھی وہ قرون وسطیٰ کے مزاج اور ان کے زمانے کے موافق تھی ۔ سر سید نے یورپین خیالات کے ساتھ موجود الوقت مذہبی مسائل کی تطبیق کرتے وقت جو طریق کار اختیار کیا وہ اپنے مزاج اور رنگ و آہنگ میں معتزلہ جیسا ہی ہے ۔ لہذا سر سید اور ان کے رفقاء کار کو نو معتزلہ قرار دینا ، قرین انصاف معلوم ہوتا ہے ۔

نیا علم کلام

سر سید کے زمانے میں مسلمانوں کو تین خطرے در پیش تھے ۔ پہلا خطرہ عیسائی مشنریوں کی طرف سے تھا ، دوسرا خطرہ یورپ اور ہندوستان میں ان خیالات کی ترویج تھی کہ اسلام عقل و اخلاق کا دشمن اور ترقی کا بیری ہے ۔ تیسرا خطرہ نئی تہذیب و تمدن کی وجہ سے خود مسلمانوں کے دلوں میں مذہب کے معاملے میں شکوک و شبہات کا پیدا ہونا تھا ۔ ان تینوں خطروں کے سدِ باب کے لیے سر سید نے جس جدید علم کلام کی بنیاد رکھی ، اس کا مرکزی خیال عقل کو ہر چیز پر مقدم رکھتا ہے اور دلائل و قیاسات کے ذریعے اسلام کی حقیقت واضح کرنا ہے ۔ اگرچہ اس طریق کار کی خاطر سر سید

---

(۱) عالم غیب ، مندرجہ تہذیب الاخلاق یکم ذی الحجہ ۱۳۱۲ھ مشمولہ مقالات سر سید ، ص ۱۴۰ ۔

کو جہت سے مسائل میں ناروا تاویلات سے کام لینا پڑا اور یہ حقیقت نظر انداز کی جاتی رہی کہ مذہبی زندگی کی اساس روحانی تجربہ اور عقیدہ پر ہے نہ کہ عقل و قیاس پر ، تاہم ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ایسی فرو گذاشتوں کے باوجود سر سید ہی ہندی مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کے علمبردار ہیں ۔

سر سید اور نشاۃ ثانیہ

۱۸۵۷ء میں ہندی مسلمانوں کو جس عالمگیر تباہی سے دو چار ہونا پڑا اس کو دیکھتے ہوئے اس امر کی کوئی امید نہیں تھی کہ مستقبل قریب میں مسلمان قوم دوبارہ ابھر سکے گی ۔ اس زمانے میں انگریز حاکم معمولی معمولی واقعات کو بڑی بڑی سازشوں سے وابستہ قرار دیتے تھے ۔ بے گناہ مسلمانوں کی عزت ، مال اور آبرو مانند خس ارزاں تھی ۔ خود مسلمانوں کے دلوں میں نکبت و ادبار کی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں ۔ ایک وقت تھا کہ سر سید حالات سے اس درجہ مایوس ہو گئے تھے کہ انہوں نے ہندوستان سے ہجرت کر جانے کا ارادہ کر لیا تھا ۔ الغرض ایسے حالات میں سر سید کو اپنی قوم کی بہتری کا خیال آیا ۔ انہوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگ کے پس منظر میں کی مدد کی انگریزوں کے ذہنوں سے بدگمانیاں دور کیں اور مسلمانوں پر سے 'غدر' کا الزام دور کرنے میں جرأت مندانہ جد و جہد کی[1] ۔ انہوں نے پوری ہمدردی کے ساتھ قوم کو احساسِ زیاں دلایا ۔ مسلمانوں کے سامنے جدید علم کی خوبیاں بیان کیں ۔ انہیں حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کی ہمت دلائی نہ مخالفین کی سب و شتم کی پروا کی نہ موافقین کی آزردگی سے دل برداشتہ ہوئے ۔ جس راستے پر قوم کو چلانے کا منصوبہ بنایا تھا اسی پر خود بھی گامزن رہے اور دوستوں کو بھی پکار پکار کر اپنے ساتھ ملاتے رہے ۔ ان کی یہ بانگِ درا مؤثر نکلی اور ان کی تحریکِ اصلاح نے آخر کار مسلمانوں میں ایک نئی زندگی پیدا کر دی ۔

دورِ جدید کے مؤرخ کے لیے انیسویں صدی کا نصفِ آخر اس لحاظ سے بڑی اہمیت کا زمانہ ہے کہ اس دور میں ہندوستان میں نئی دماغی سرگرمیاں شروع ہوئیں ۔ ان سرگرمیوں میں علی گڑھ تحریک کا حصہ نمایاں اور ممتاز ہے ۔ یہ ایک اصلاحی تحریک تھی ۔ اصلاحِ مذہب ، اصلاحِ رسومات ، ترکِ توہمات اور اصلاحِ اخلاق کے میدانوں میں اس تحریک کے اثرات نہایت قوی اور دیرپا ہیں ۔ مسلمانوں میں اپنی قومیت کا جو تصور بیسویں صدی کے نصف اول میں پروان چڑھا وہ اسی مردِ خود آگاہ و حق اندیش کی مساعیٔ جلیلہ کا مرہونِ منت ہے ۔

---

(۱) تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو رسالہ بغاوت ۔

زندگی سے محبت ، عمل کی دعوت مستقبل پر یقین ، نا امیدی ، خود اعتمادی ، فکر و عمل کے میدانوں میں دوڑ و تاز کرتے وقت حاضر و موجود حریفوں پر نگاہیں مرکوز رکھنا سر سید کی تعلیمات کی ضروری باتیں ہیں ۔ توہم پرستی اور تعصب نے مسلمانوں کو مس جمود کا شکار بنا دیا تھا ۔ انہیں اس جمود سے نکالنے کے لیے سر سید کی حریتِ فکر اور آزادی رائے نے نمایاں کردار ادا کیا ہے ۔

سر سید کی اس انقلابی تحریک سے پہلے اعلیٰ اخلاق کا تصور انفرادی تھا اور اس حسنِ اخلاق کے اثرات بھی ذاتی زندگی تک محدود تھے ۔ سر سید نے حوصلہ ، سچائی ، نرم روی ، زندگی کے خارجی مظاہر سے دلچسپی اور ذاتی وقار کو اعلیٰ اخلاق قرار دیا ۔ انسانی ہمدردی اور خدمتِ خلق کو ذاتی حسنِ اخلاق سے بہتر گردانا ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے نزدیک نماز اور روزہ ذاتی اور نجی محاسن ہیں ۔ ہمسایہ کی مدد اور بنی نوع انسان کی خدمت اجتماعی محاسن ہیں ، لہٰذا قابل قدر اور اعلیٰ اخلاق ہیں ۔

سر سید کی تعلیمات کے نتائج

سر سید کی تعلیمات کے نتائج جمہور اہلِ اسلام کے مذہبی اعتقادات کی روشنی میں دو طرح کے ہیں ۔ ایک وہ جن کے مفید ہونے میں کسی شک و شبہ کو راہ نہیں ہے ۔ دوسرے وہ جو کسی ایک فرقہ کے لیے تو مفید ہیں مگر عام مسلمان انہیں اعتبار سے ساقط اور مضر قرار دیتے ہیں ۔ مسلم علماء کرام کا ایک مقتدر طبقہ اپنے مضر اثرات کی بنا پر آج بھی سر سید کا ویسا ہی مخالف ہے جیسا کہ ان کے زمانے میں مخالف تھا ۔ پہلی قسم کے اثرات یہ ہیں :

۱ ۔ فضول رسومات کو مٹانا ۔

۲ ۔ ترقی یافتہ اقوام کے علوم و فنون سے استفادہ ۔

۳ ۔ ادب کو عام زندگی کا ترجمان بنانا اور اس مقصد کے لیے زبان و بیان کی سادگی پر زور دینا ۔

۴ ۔ (ہندوستان میں) دو قومی نظریہ پر اعتماد ۔ ۔ ۔ ۔ اس نظریے کی اہمیت سب سے پہلے سر سید ہی نے بتائی ہے ۔ مسلمانوں کی قومیت جن مبادیات پر استوار ہوتی ہے ان کی واضح نشاندہی انہیں نے کی ہے ۔ اگرچہ علامہ اقبال مرحوم نے اس نظریہ کے جملہ منطقی ، مذہبی ، حکیمانہ اور سیاسی عواقب و نتائج پر سیر حاصل بحث کی ہے اور اسے ایک زندہ حقیقت کی صورت میں پیش کرکے ہند کے دہر نشینوں کو حرم آشنا کیا ہے اور ان کی

تعلیمات کے نتیجہ میں حصولِ پاکستان کی جد و جہد نے جنم لیا ہے۔ لیکن سر سید کو اس معاملے میں جو اولیت حاصل ہے وہ دلیلِ صد ستائش ہے۔

اب دوسری قسم کے اثرات ملاحظہ ہوں:

۱۔ جدید تعلیم کے نتیجے میں پرانی اور مسلمہ اخلاقی قدروں کی پامالی۔۔۔ جدید تعلیم نے پرانی اخلاقی اقدار کو جس طرح مٹانا شروع کیا تھا، اس کا احساس سر سید کو خود اپنی زندگی ہی میں ہوگیا تھا۔ لیکن نئی تعلیم کے گوناگوں مالی فائدے متوقع نقصان کے مقابلے میں زیادہ اہمیت رکھتے تھے اور آج تک یہی کیفیت بدستور موجود ہے۔

۲۔ اپنے زمانے کی سائنسی تحقیقات اور ان کے فلسفی نتائج کو یقینی اور قطعی قرار دینا۔۔۔ یہ وہی غلطی تھی جس میں تیسری چوتھی صدی میں فلسفۂ یونان کا مقابلہ کرنے والے متکلمین مبتلا ہوئے تھے۔ سر سید چونکہ یورپ اور عیسائیت کے تاریک پہلوؤں سے خوب واقف نہیں تھے اور سائنس کی قوت سے بہت زیادہ متاثر ہوئے تھے، لہٰذا وہ مذہبی مسائل پر اظہارِ خیال کرتے وقت عقل و منطق پر ضرورت سے زیادہ زور دیتے تھے۔ اقبال کی تعلیمات نے اعتقاد اور ایمان کی بلاشبہ ثابت کرکے سر سید کے اس اثر کو بڑی حد تک مٹا دیا ہے۔

۳۔ رائے اور قیاس کی رو سے قرآنی آیات کا مفہوم متعین کرنا۔۔۔ بعضوں نے اس معاملے میں سر سید کی پیروی بہت بری طرح کی ہے اور ہر آیت یا حدیث کی تاویل کرکے حسبِ خواہش معنی مراد لیے ہیں۔ اگرچہ سر سید نے بعض مذہبی امور میں اس طرح تمام مسلمانوں سے اختلاف کیا ہے، لیکن انہوں نے کوئی نیا فرقہ نہیں پیدا کیا۔ وہ نہ محدّثیت کے دعویدار تھے نہ امامت کے نہ نبوت کے۔ لہٰذا ان کی غلطیاں اجتہادی غلطیاں ہیں۔ مگر ان کے بعض پیرو، اس رعایت کے مستحق نہیں ہیں۔ بقول شیخ محمد اکرام صاحب:

> "بعض مسلمانوں نے کئی اہم مسائل میں سر سید کی رائے اختیار کر لی ہے مولوی محمد علی امیر احمدیہ کی تفسیرِ قرآن دراصل سر سید ہی کی رہنمائی ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ کے متعلق سر سید کے جو عقائد تھے وہ مرزا غلام احمد نے اختیار کر لیے"[1]۔

۴۔ احادیث پر تنقید کرتے وقت اعتدال سے انحراف۔۔۔۔ سر سید نے سر ولیم میور وغیرہ کے اعتراضات کا جواب دیتے وقت وضعی احادیث سے ان معترضین کے استفادہ کرنے

(۱) اکرام، موج کوثر۔ ص ۸۷۔

پر جو بحث کی ہے اس میں ان سے تدوینِ حدیث کے باب میں بہت سی غلطیاں سرزد ہوگئی ہیں ۔ ان کے انہی خیالات سے متاثر ہوکر 'اہلِ قرآن' کا فرقہ وجود میں آیا ہے ۔ اس فرقے کے نقیبوں نے آج تک حدیث کو غیر یقینی سرمایۂ علمی ثابت کرنے کے لیے جو کچھ لکھا ہے ، اس کے بیج سر سید کی تحریروں میں موجود ہیں ۔ مثلاً :

> "سب سے زیادہ مقدس حدیث کا علم ہے ۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے وقت میں تو حدیث کی روایت کرنے کی ممانعت تھی ۔ خود حضرت عمرؓ نے لوگوں کو حدیث کی روایت کرنے سے منع کر دیا تھا ، جو لوگ حدیث کی روایت کرتے تھے ان کی درّہ سے خبر لیتے تھے اور ابنِ مسعود اور ابو درداء اور ابو مسعود انصاری کو بجرم روایت احادیث قید کر دیا تھا ۔ کہا جاتا ہے کہ خود حضرت ابوبکرؓ نے جس قدر حدیثیں جمع کی تھیں وہ جلا دی تھیں"[۱] ۔

اہلِ نظر جانتے ہیں کہ سر سید کا یہ دعویٰ سراسر غلط اور بے بنیاد ہے[۲]۔ لیکن سرسید کے ان خیالات کو کافی اشاعت نصیب ہو چکی ہے ۔ 'رسالہ طلوعِ اسلام' کے مدیر غلام احمد صاحب پرویز سرسید کی مہیا کردہ ان ہی بنیادوں پر حدیث کے خلاف قلعہ بندی کرنے میں مصروف ہیں[۳]۔

اس دور کی تاریخ میں سر سید کا مقام

سر سید نے اپنی طویل اور مصروف زندگی میں بہت سے مفید کام کیے ۔ مسلمانوں پر سے 'غدر' کا الزام دور کیا ۔ مسلم معاشرے کی اصلاح کی جسے مسلمانوں کے متوسط طبقہ نے قبول کیا ۔ فطرت کی پیروی اور عقل مندی کے زیرِ اثر مذہبی مسائل کی توجیہ کی ۔ لیکن یہ سب ناپس وقتی اور ہنگامی تقاضوں سے متعلق ہیں ۔ ہمارے نزدیک ان کے دو کارنامے مستقل قدرو قیمت رکھتے ہیں اور انہی کی بدولت وہ اپنی کئی اجتہادی غلطیوں ، توجیہی لغزشوں اور بشری خامیوں کے باوجود ایک ایسے مصلح ہیں جن کے احسانات سے مسلم معاشرہ آج تک فیض یاب ہو رہا ہے ۔

۱ ۔ ادبِ اردو کو عام زندگی کا ترجمان بنانا اور مسائلِ حیات پر تنقید کا ایک ذریعہ قرار دینا ۔ مسائلِ حیات پر تنقید کرتے وقت موجود الوقت ترقیوں سے استفادہ کرنا ۔ یہی

---

(۱) زبیری ، محمد امین ، مقالات سر سید ۔ ص ۲۶۶ ۔

(۲) تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ۔ ۱ ۔ رسالہ ترجمان القرآن ، منصب رسالت نمبر ستمبر ۱۹۶۱ء از مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب ۔ ۲ ۔ محمد فرمان ، پروفیسر ، اقبال اور منکرین حدیث ۔

(۳) محمد فرمان ، پروفیسر ، انکار حدیث ایک فتنہ ایک سازش ۔

وجہ ہے کہ وہ ہمارے پہلے ادب دوست ادیب کہلانے کے مستحق ہیں۔

۲ ۔ وہ قومی مطالبے [illegible] اور مسلمانوں [illegible] علیحدہ وجود [illegible] [illegible] یعنی انڈین نیشنل کانگریس میں شمولیت [illegible] جس کا نتیجہ [illegible] اسلامی مملکت ''پاکستان'' کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔

کتابیات

۱ ۔ حالی ، مولانا الطاف حسین — حیات جاوید — انجمن ادب ، لاہور — ۱۹۶۶ء

۲ ۔ رئیس ، مولوی محمد امین — تذکرہ سر سید — پبلشرز یونائیٹڈ ، لاہور — ۱۹۶۱ء

۳ ۔ محمد اکرام ، شیخ — موج کوثر — سر فیروز سنز پریس لاہور — ۱۹۶۰ء

۴ ۔ سید ، عبداللہ ڈاکٹر — سر سید اور ان کے نامور رفقاء کی اردو نثر کا فنی اور فکری جائزہ — مکتبہ کارواں ، لاہور — ۱۹۶۵ء

۵ ۔ مولانا محمد اسماعیل — مقالات سر سید — مجلس ترقی ادب ، لاہور — ۱۹۶۲ء

۶ ۔ سر سید احمد خان — اسباب بغاوت ہند — اردو اکیڈمی سندھ — ۱۹۵۷ء

۷ ۔ محمد صادق — آکسفورڈ یونیورسٹی پریس لندن — ۱۹۶۴ء

---

(۱) محمد صادق ، تاریخ ادب اردو (انگریزی) ۔ ص ۲۶۳ ۔

چوتھا باب

مولانا الطاف حسین حالی

سوانح

الطاف حسین حالی ١٨٣٧ء میں پانی پت میں پیدا ہوئے۔ صدیوں پہلے حالی کے آبا و اجداد سلطان بلبن کے عہد میں واردِ ہندوستان ہوئے اور شاہی خدمت سے منسلک ہو کر منصبِ قضا پر فائز ہوئے اور پانی پت کا علاقہ انہیں بطورِ جاگیر کے عطا ہوا۔ آپ کا سلسلۂ نسب مشہور صحابی حضرت ابو ایوب انصاری سے ملتا ہے۔ ممکن ہے کہ اس فضیلت کی وجہ سے شاہی اعزاز اور مراتب میں اضافہ ہوا، لیکن حالی کی پیدائش کے وقت مغل سلطنت کے سیاسی اقتدار کے خاتمہ کے ساتھ ساتھ ان کا خاندانی اقتدار اور اقبال بھی رخصت ہو چکا تھا۔ حالی کے والد خواجہ ایزد بخش محکمۂ نمک میں ایک معمولی ملازم تھے، اس لیے خوشحالی کے بجائے انہیں بد حالی اور عسرت سے سامنا ہوا۔ بچپن ہی میں والد کا انتقال ہو گیا اور والدہ خللِ دماغ کا شکار ہو گئیں۔ اس طرح بچپن ہی سے حالی کو محرومیوں اور پریشانیوں سے سابقہ پڑا، شاید جس کی وجہ سے ان کے کردار میں عاجزی، انکساری اور ضبط و نظم کا مادہ پیدا ہو گیا۔ بڑے بھائی خواجہ امداد حسین نے ہر طرح مدد کی، لیکن وہ بھی مالی اعتبار سے پریشان تھے، اس لیے محبت اور شفقت کے باوجود وہ چھوٹے بھائی کی تعلیم کا کوئی مناسب انتظام نہ کر سکے[1]۔

انگریزوں کی آمد سے قبل ہمارے تعلیمی نظام میں باقاعدگی نہ تھی، لیکن ملک کے تمام مرکزی مقامات پر لائق اور شفیق اساتذہ ضرور مل جاتے تھے۔ اگرچہ حالی اس قدیم طریقۂ تعلیم میں بھی منتہی نہ ہو سکے، تاہم ان کی ذہنی تربیت اس طرح ہوئی کہ مسائل کو سمجھنے اور اس کا تجزیہ کرنے کی صلاحیت پیدا ہو گئی۔ انہوں نے ابتداء میں قرآنِ مجید حفظ کیا اور قرآت بھی سیکھی۔ فارسی پانی پت میں مولوی جعفر علی صاحب سے پڑھی۔ مولوی جعفر ہی پہلے شخص تھے جن کی صحبت میں حالی کو فارسی زبان و ادب اور شاعری کا ذوق پیدا ہوا۔ عربی کی تعلیم حاجی ابراہیم حسین سے حاصل کی۔ طلبِ علم کی ان منزلوں تک پہنچتے پہنچتے سترہ (١٧) سال کی عمر ہو گئی۔ اسی کم عمری میں شادی ہو گئی۔ ازدواج کا یہ رشتہ ان کو طلبِ علم سے غافل نہ کر سکا۔ بیوی کا میکہ آسودہ حال تھا، اس لیے انہیں ضروریاتِ زندگی کی طرف سے اطمینان حاصل ہو گیا۔ ایک

---

(١) محمد فاروق (مرتب) ترجمہ حالی، تذکرہ حالی، اسماعیل پانی پتی اور حیات حالی اور یادگار حالی بیادگار صالحہ عابد حسین سے لیے گئے ہیں۔

خاموشی سے گھر سے چلے گئے اور دہلی پہنچ کر مدرسہ حسین بخش کے واعظ مولوی نوازش علی کے درس میں شریک ہو گئے۔ دہلی میں اگرچہ دلی کالج عروج پر تھا، لیکن حالی اس کی طرف نہیں آئے۔ حالانکہ انھیں اس کا بڑا قلق رہا۔ اسی زمانہ میں وقت دلی نہ صرف علمی بلکہ ادبی مرکز تھی۔ دہلی میں غالب، آزردہ، ذوق، صہبائی اور شیفتہ کی شاعری کی بڑی دھوم تھی۔ حالی ان شعراء کی طرف راغب ہوئے اور مرزا غالب کے حلقہ میں شامل ہو گئے۔ یہاں مرزا کی صحبت اور ان کی شاعری سے متاثر ہوئے۔ ابھی دلی ہی میں گزر رہا تھا کہ بھائی کے اصرار پر گھر واپس جانا پڑا، لیکن ذہن میں یہی دھن تھی وہ اپنی علمی استعداد کے بڑھانے کے لیے کوشاں رہے۔ مالی پریشانیوں سے مجبور تھا اور دوبارہ وطن سے نکل کھڑے ہوئے۔ حالانکہ کے انھیں ڈپٹی کمشنر حصار کے دفتر میں ایک چھوٹی سی ملازمت کرنے پر مجبور کیا۔ ابھی تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ رونما ہوا۔ ہر طرف افراتفری مچ گئی۔ حصار بھی اس آگ کی لپیٹ میں آ گیا، مجبوراً حالی کو وہاں سے نکلنا پڑا۔ اس وقت حالی کی عمر بیس سال تھی۔ جوانی کی اس عمر میں ان اندوہناک واقعات نے حالی کے ذہن پر گہرا اثر ڈالا۔ آگے چل کر ان کی قومی و اصلاحی تحریک میں اسی جذبہ نے بڑا کام کیا۔ کئی سال تک پانی پت میں بے کاری میں گزر گئے، لیکن اس عرصہ میں وہ برابر اپنا وقت علمی مصروفیات میں گزارتے رہے۔ خاص کر منطق، حدیث اور تفسیر پر زیادہ توجہ دی۔ چار سال بعد پھر وطن سے نکل کر دلی پہنچے۔ یہاں ان کا وہ پرانا ذوقِ سخن اور مرزا غالب سے ربط و ضبط زیادہ بڑھ گیا۔ نواب مصطفیٰ خان شیفتہ نے اپنے بیٹوں کا اتالیق مقرر کر دیا، چنانچہ وہ جہانگیر آباد ضلع بلند شہر چلے گئے لیکن دلی برابر آنا جانا رہا۔ اس طرح مرزا غالب کے ساتھ نواب شیفتہ کی صحبت سے بھی مستفید ہونے کا موقع ملا۔ شیفتہ کے ساتھ حالی بھی اپنا کلام مرزا کو برابر بھیجتے رہے، لیکن بقول ان کے ''مرزا کے مشورے اور اصلاح سے مجھے چنداں فائدہ نہ ہوا، بلکہ جو کچھ فائدہ ہوا نواب صاحب کی صحبت سے ہوا''[1]۔ غالباً حالی کا مزاج غالب کے مقابلہ میں شیفتہ سے زیادہ ہم آہنگ تھا۔ شیفتہ کے انتقال سے یہ صحبت بھی برہم ہو گئی اور حالی لاہور پہنچ کر پنجاب بک ڈپو سے منسلک ہو گئے۔ جہاں وہ چار سال تک اردو میں ترجمہ ہونے والی کتابوں کی زبان کی اصلاح کرتے رہے۔ لاہور کے قیام کے زمانہ میں انھیں جدید اثرات اور ان کی اہمیت کا احساس ہوا۔ یہاں کرنل ہالرائڈ کی سرپرستی میں 'انجمنِ پنجاب' کے زیرِ اثر جدید طرز کے مشاعرہ کی بنیاد پڑ چکی تھی، جس میں مصرعِ طرح کے بجائے موضوع پر طبع آزمائی کی جاتی تھی۔ آزاد اس کے سیکرٹری تھے۔ حالی نے بھی اس مشاعرہ میں شرکت کی اور چار مثنویاں 'برکھا رت'، 'امید'، 'رحم و انصاف' اور 'حبِ وطن' لکھیں۔ جو ملک میں مقبول ہوئیں۔ چار سال

---

(۱) محمد فاروق (مرتب) ترجمہ حالی۔

بعد لاہور سے پھر دہلی واپس آ گئے اور اینگلو عربک اسکول سے منسلک ہو گئے ۔ اب ملک میں مغربی اثرات زیادہ شدت سے محسوس کیے جا رہے تھے اور ہندوستان جو متعدد اقوام کا مسکن اور ایک ملے جلے تمدن کا گہوارہ تھا ، انگریزی اثر کے ماتحت تیزی سے آتا جا رہا تھا ۔ نئے علوم و فنون کی مانگ بڑھ رہی تھی اور ان سے آگہی عزت کی زندگی بسر کرنے کے لیے ایک لازمی شرط بنتی جا رہی تھی ، لیکن مسلمانوں کو اس تبدیلی کا کوئی خاص احساس نہ تھا ۔ چونکہ وہ ابھی ابھی سلطنت سے محروم ہوئے تھے اور زندگی کی بہت سی پیچیدگیوں سے واقف نہ تھے اس لیے زندگی میں کوئی خاص تبدیلی نظر نہ آتی تھی ۔ آیندہ آنے والے مسائل کا نہ اس کے پاس کوئی حل تھا اور نہ احساس ۔ مصلحین قوم اس ضرورت کا احساس رکھتے تھے ، لیکن انھیں کوئی راستہ دکھائی نہ دیتا تھا ۔ سر سید کی سب سے بڑی اہمیت یہی ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کو نئے حالات سے مانوس کرنے اور جدید طرزِ زندگی میں ڈھالنے کا ایک واضح اور سوچا سمجھا منصوبہ پیش کیا ۔ حالی جو ایک مصلح کی نظر اور درد مند دل رکھتے تھے ، انہوں نے سر سید کی اس تحریک کو لبیک کہا اور اس میں تن من دھن سے شامل ہو گئے ۔ مؤرخینِ ادب نے حالی کے ذہنی ارتقاء میں کئی موڑوں کی طرف اشارہ کیا ہے ۔ ۱۸۷۱ء میں ان کا مضمون "سر سید احمد خاں اور ان کے کام" در اصل سر سید سے تجدید تعلقات کی حیثیت رکھتا ہے ۔ رفتہ رفتہ تعلقات کا رشتہ استوار ہوتا گیا اور ان کے ہاں ذہنی تبدیلی سر سید سے ملاقات کے بعد تیزی سے پیدا ہوئی ۔ یہ اثرات ان کی بعد کی تمام تصانیف میں پھیلے ہوئے ہیں ۔ خود کو انہوں نے سر سید کی تحریک کے ساتھ وابستہ کر لیا اور اس کی اصلاحی علمی اور تعلیمی سرگرمیوں میں پوری طرح شریک ہو گئے ۔ ۱۹۰۴ء میں گورنمنٹ نے شمس العلماء کا خطاب دیا ۔ سر سید کی سفارش پر انہیں سرکارِ نظام سے پہلے پچھتر روپیہ اور پھر سو روپیہ ماہوار علمی وظیفہ ملنے لگا اور وہ ہمہ تن علمی کاموں میں مشغول ہو گئے اور اینگلو عربک اسکول کی مدرسی سے قطع تعلق کر لیا ۔

۱۹۰۷ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ کراچی کے اجلاس کی صدارت کی ۔ اس زمانہ میں علمی مصروفیتیں تقریباً ختم ہو گئی تھیں ۔ مختصر علالت کے بعد ۳۱ دسمبر ۱۹۱۴ء کو پانی پت میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے ۔

غزلِ حالی

اردو ادب کی تاریخ میں حالی ایک غزل گو شاعر ، جدید نظم کے ، بانی جدید اردو تنقید کے پیشوا اور جدید سوانح نگاری کے اوّلین معمار سمجھے جاتے ہیں ۔ تحریکِ سر سید

سے متاثر ہو کر انہوں نے زندگی کی نئی ضرورتوں پر زور دیا ہے[1] اور مسلمانوں کے اخلاق سیاسی اور معاشی انحطاط سے انہیں اخلاقی اور اصلاحی نقطہ نظر اختیار کرنے پر مائل کیا ، لیکن اس سے قبل بھی وہ ایک اچھے غزل گو شاعر کی حیثیت سے مشہور تھے ۔ قدماء کی تقلید کرنے اور پامال موضوعات پر طبع آزمائی کرنے کے بجائے انہوں نے غزل گوئی میں نئی روایت کی بنا ڈالی ۔ وہ قدیم سرمایۂ شاعری پر گہری نظر رکھتے تھے ، انہوں نے اس رنگ پر اعتراضات بھی کیے اور اس کی اصلاح کی کوشش بھی ، پھر بھی غزل کی روایت سے اپنے کو الگ نہ کر سکے ۔ فراق گورکھپوری[2] ، مجنوں گورکھپوری[3] اور سید حسن عسکری[4] ان کے یہاں رنگِ تغزل کی نشاندھی کرتے ہیں ۔ بلا شبہ حالی کی غزلوں میں ایک نرمی اور کسک پائی جاتی ہے ۔ ان کے بیان میں جوانی کا جوش ، جذبات کا ابال اور شرابِ دو آتشہ کی کیفیت نہیں ہے :

حالی سخن میں شیفتہ سے مستفید ہوں
شاگرد مرزا کا ہوں مقلد ہوں میر کا

مجنوں گورکھپوری حالی کے مخصوص تغزل پر زور دیتے ہیں : ''حالی کے یہاں خستگی اور گھلاوٹ مرکی ہے ۔ میر اور تمکنت کے تیور غالب کے ہیں ، شائستہ عمومیت اور مہذب سادگی ان کی اپنی ہے''۔ یہ صحیح ہے لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ حالی کی غزلوں میں سپردگی اور محویت کی وہ کیفیت نہیں ملتی جو میر کی شاعری کی خصوصیت یا بڑے فکر اور فن کا امتیازی وصف ہے ۔ مگر ان کی غزلوں میں اعلیٰ قسم کے اشعار اور دیوان میں بہت عمدہ غزلیں بھی مل جاتی ہیں ۔ مثال کے طور پر چند اشعار ملاحظہ ہوں :

ہم کو ہزار شرم سہی مجھکو لاکھ ضبط
الفت وہ راز ہے کہ چھپایا نہ جائے گا

☆ ☆ ☆

حال اور دل میں سوا ہو گیا
دلاسا تمہارا سوا ہو گیا

ٹپکتا ہے اشعارِ حالی سے حال
کہیں سادہ دل مبتلا ہو گیا

---

(۱) فراق ، اندازے (حالی)
(۲) ادب اور زندگی (حالی کا مرتبہ اردو ادب میں) ۔
(۳) حسن عسکری ، ستارہ یا بادبان ۔
(۴) سید حسن عسکری ، بھلا مانس غزل گو ۔

آنے لگا جب اس کی تمنا میں کچھ مزا
کہتے ہیں لوگ جان کا اس میں زیاں ہے اب

☆ ☆ ☆

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب ٹھہرتی ہے دیکھیے جا کر نظر کہاں
اک عمر چاہیے کہ گوارہ ہو نیش عشق
رکھی ہے آج لذت زخم جگر کہاں

☆ ☆ ☆

ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور
عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں

☆ ☆ ☆

قیس ہو کوہکن ہو یا حالی
عاشقی کچھ کسی کی ذات نہیں

☆ ☆ ☆

کیوں بڑھاتے ہو اختلاط بہت
ہم کو طاقت نہیں جدائی کی

ایسے اشعار کی کمی نہیں ، جس میں حالی نے محبت کے رموز سے پردہ اٹھایا ہے ۔ وہ یہ اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ تمام کوششوں کے باوجود ''عشق جس نے اکثر قوموں کو کھا کر چھوڑا ہے'' نہیں چھوٹ سکتا :

گو ہیں نظروں سے سب باتیں پرانی
مگر الفت کہ اک رسم کہن ہے

لیکن وہ اس محبت میں حزم و احتیاط ، توازن اور اعتدال کے قائل ہیں ۔ نیک نامی اور بدنامی کا بھی ان کو دھڑکا لگا رہتا ہے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کوچہ میں جانا چاہتے ہیں ، لیکن اس کی گرمی اور تپش کے متحمل نہیں ہو سکتے ۔ اسی احتیاط کی وجہ سے ان کی غزل میں دردناکی اور شوریدہ سری نہیں پیدا ہو سکی اور یہی کمزوری انہیں آفاقی شعراء کی صف سے محروم رکھتی ہے ۔ مثلاً :

ایک عالم سے وفا کی تو نے اے حالی مگر
نفس پر اپنے سدا ظالم جفا کرتا رہا

نظمِ حالی

حالی نے رباعیات و قطعات ، مرثیے ، ترکیب بند اور قصائد بھی کہے ہیں اور ان میں اپنی راہ آپ نکالی ہے ۔ رباعیات کا موضوع زیادہ تر اخلاق اور ناصحانہ ہے ۔ اس میں عروج و زوال ، عزّت و ذلت اور جہالت ، مکر و ریا ، خود غرضی ، بے غرضی اور انقلابِ روزگار وغیرہ جیسے مسائل کا تذکرہ ملتا ہے ۔ مثلاً :

دنیائے دنی کو نقشِ فانی سمجھو
رودادِ جہاں کو اک کہانی سمجھو
پر جب کرو آغاز کوئی کام بڑا
ہر سانس کو عمرِ جاودانی سمجھو

حالی نے مرثیہ میں بھی بلند قدروں کے ماتم پر زور دیا ہے ۔ کسی بڑے اور باکمال شخص کے اٹھ جانے سے ملک و ملت کو جو نقصان پہنچتا ہے ، حالی اس کا ماتم کرتے ہیں ۔ اردو میں مرثیہ حضرت امام حسین اور شہدائے کربلا اور ان کے مصائب سے مخصوص رہا ہے ۔ حالی نے اس کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے نئی نسل کے شاعروں کو مشورہ دیا کہ وہ اسی کولہو کے گرد گھومنے کے بجائے نئے میدان تلاش کریں ۔ خود انھوں نے شخصی مرثیے لکھکر ایک نئی بنیاد اردو مرثیہ میں رکھی ۔ مرزا غالب اور حکیم محمود خان کے مرثیے اردو میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ ان میں صرف ذاتی غم نہیں بلکہ قومی نقصان کا ماتم کیا گیا ہے ، مثلاً غالب کی وفات پر لکھتے ہیں :

غم سے بھرتا نہیں دلِ ناشاد	کس سے خالی ہوا جہان آباد
نکتہ داں ، نکتہ سنج ، نکتہ شناس	پاک دل ، پاک ذات ، پاک صفات

☆ ☆ ☆

بے ریائی تھی زہد کے بدلے	زہد اس کا اگر شعار نہ تھا
مظہرِ شانِ حسنِ فطرت تھا	معنئ لفظِ آدمیت تھا

مرثیۂ محمود خان بھی شاعرانہ کمال اور قومی دلسوزی کی نمایاں مثال ہے ۔ حکیم محمود خان کی غم‌گساری اور قومی ہمدردی نے حالی کو بہت متاثر کیا اور یہ تاثر تہذیب و تمدن اور انسانی خوبیوں کی ایک اور لا زوال یادگار کی شکل میں ظاہر ہوا ۔ اس میں بھی شخصی ماتم سے زیادہ تہذیبی اقدار کے مٹنے کا ماتم کیا گیا ہے ، مثلاً :

چل ولے نوبت یہ نوبت تیرے شاعر اور ادیب
لٹ گئی تیری طبابت چھٹ گئے تیرے طبیب

جاگ جاگ، آخر سدا کو سو گئے تیرے نصیب
اس گلستاں سے نہ اٹھی پھر صدائے عندلیب

جز کنوؤں کے میٹھے طعنے ان کا کہیں پایا نہ پھر
ہو گیا اس کا کوئی قائم مقام آیا نہ پھر

قصائد میں بھی دربار داری، خوشامد، غلو اور مدح و ستائش کے بجائے حقیقی معرفت و توصیف پر زور دیا گیا ہے۔ میر عثمان علی خان کا قصیدہ اس رنگ کو بخوبی ظاہر کرتا ہے:

مبارک تمہیں ملک کی نگہبانی　　مبارک رعیت کی خدمت گزاری
مبارک ہو تم کو وہ دشوار منزل　　جہاں حتے چتے د ہے ذمہ داری

ایجوکیشنل کانفرنس میں میر عثمان علی خان کی نظمیں خاص اہمیت رکھتی ہیں، لیکن ان کی قومی صحت قابلِ یادگار ہے۔ شاعرانہ اعتبار سے ان میں زیادہ جاذب ہیں لیکن حالی کا خلوص ہر جگہ پھوٹا پڑتا ہے۔ مثلاً:

جھٹ پٹے کے وقت گھر سے ایک مٹی کا دیا
ایک بڑھیا نے سرِ راہ لا کے رکھ دیا

تاکہ رہگیر اور پردیسی کہیں ٹھوکر نہ کھائیں
راہ سے آسان گزر جائے ہر اک چھوٹا بڑا

یہ دیا بہتر ہے ان جھاڑوں سے اور اس لیمپ سے
روشنی محلوں کے اندر ہی رہی جن کی سدا

سرخرو آفاق میں وہ رہنما مینار ہیں
روشنی سے جن کی ملاحوں کے بیڑے پار ہیں

مسدسِ حالی

مسدسِ حالی (۱۸۷۹ء) اردو میں پہلی طویل قومی نظم ہے اس میں مسلمانوں کی مذہبی، تہذیبی اور علمی زندگی کا ارتقاء دکھایا گیا ہے۔ ظہورِ اسلام اور مسلمانوں کے زوال کی کہانی باہم شیر و شکر ہو گئی ہے۔ نظم کا مقصد ایک طرح سے قومی بیداری کا شعور پیدا کرنا ہے اور اس نا قابلِ تلافی نقصان کا ازالہ کرنا مقصود ہے جو معاشی اور اخلاقی تنزل کی وجہ سے ظہور میں آیا۔ اس کے لیے شاعر نے ان تمام عیوب اور کمزوریوں

کو انتہائی مؤثر اور دردانگیز طریقہ سے بیان کیا ہے کہ ہر مصرع عبرت کا مرقع بن گیا ہے۔ اس کا مقصد احساسِ زیاں کو پیدا کرنا تھا اور مسلمانوں کی پستی کا علاج بھی، سرسید نے تو مسدس کو اپنے اعمالِ حسنہ میں شمار کیا ہے۔

مسدس کے خیالات کی سختی اور تلخی مخالفوں کے لیے ناقابلِ برداشت بن گئی، تھی۔ مسدس سرسید کے خیالات کی ترجمان تھی۔ جو بہت سے لوگوں کے نزدیک گمراہ، نیچری اور کافر تھے۔ انگریزوں کے دوست اور مغربی تہذیب و تمدن کے دلدادہ تھے۔ اس لیے اس کی مخالفت لازمی تھی۔ چنانچہ اس کی رد میں متعدد مسدس لکھے گئے، جن کا عام انداز مخالفانہ و معاندانہ تھا۔ مرزا حسرت بدیوی نے 'مسدس مد و جزرِ حالی' میں نہایت درشت اور غیر مناسب لہجہ اختیار کیا اور 'مسدسِ حالی' کے جواب کے ساتھ ساتھ حالی کی ذات پر بھی ناشائستہ حملے کیے مگر پیش کی یہ ادبی حیثیت ابھری ہے اور نہ تاریخی حیثیت برقرار رہی ہے۔ یہ مسدس خرافات اور فحش باتوں کا مجموعہ ہے۔ مثلاً 'مسدسِ حالی' کے تیسرے بند "یہی حال دنیا میں اس قوم کا ہے" کا جواب اس طرح دیا ہے:

یہ تردید احوال خیر الوریٰ کی
بہت دھوم سے کرنے کی آج حالی
یہ کیوں کفر کی تم نے بنیاد ڈالی
کہ مومن سے بس مومنیت نکالی
بڑھاپے میں کرتے ہو یہ حرص و رغبت
خدا کی بھی اب چاہیے کچھ تو دہشت

'مسدسِ حالی' نے مسلمانوں کے ماضی و حال کو جس طرح پیش کیا تھا اور جس طرح ایک سوئی ہوئی قوم کو بیدار کیا تھا اس کو معترضین نہ سمجھ سکے۔ البتہ بعض ہندوؤں نے مثبت اثر قبول کیا۔ بابو گورکھ پرشاد عبرت نے 'مسدس سو و تمانے بند' اور پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی نے 'بھارت درپن' میں ہندوستان کی عظمت کا راگ گایا ہے۔

مسدس میں حالی نے سلف کی جن باتوں پر اعتراض کیا تھا وہ زمانہ کے لحاظ سے ایک بالکل انوکھی بات تھی۔ غزل کے شاعر نے جب مسدس کی شاعری کی تو وہ اس کے اثر سے بخوبی واقف تھا۔ چنانچہ حالی خود لکھتے ہیں "ہمارے ملک کے اہلِ مذاق ظاہراً اس روکھی پھیکی، سیدھی سادھی نظم کو پسند نہ کریں گے، کیونکہ اس میں تاریخی واقعات ہیں، چند آیتوں اور حدیثوں کا ترجمہ ہے یا جو آج قوم کی حالت ہے اس کا صحیح صحیح نقشہ کھینچا گیا ہے، نہ کہیں نازک خیالی ہے نہ رنگین بیانی نہ تکلف کی چاشنی . . . . ."

شکوۂ ہند

حالی نے مسدس میں نئی تہذیبی قدروں اور سیاسی تبدیلیوں کا وقت کی ضرورت سمجھ کر استقبال کیا تھا ۔ مسدس ایک طرح سے مشرق اور مغرب کے درمیان (حاکم و محکوم کی حیثیت ہی سہی) رابطہ کی حیثیت رکھتی ہے ۔ مسلمانوں میں معاشی ، سیاسی اور اخلاق زوال کیوں ہوا ، مسلمانوں کی انفرادیت اور قومی خصوصیات ہندوستان میں آ کر کس طرح مسخ ہوئیں اور یہاں کی اکثریت نے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا ۔ مسلمانوں نے اس ملک میں آ کر حکومت تو کی لیکن رفتہ رفتہ اپنی انفرادیت اور خصوصیت کھو بیٹھے ۔ اس داستان کو انہوں نے 'شکوۂ ہند' میں پیش کیا ہے ۔ یہ شکوہ مسلمانوں کی بدلی ہوئی کیفیت کا مرقع ہے اور شاعر کی دلسوزی کا آئینہ دار ہے[1] :

رخصت اے ہندوستان اے بوستانِ بے خزاں
رہ چکے تیرے بہت دن ہم بدیسی میہماں

ہندوستان سے بیزاری ان کی غیرت اور نا روا سلوک کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے :

چھین لی سب ہم سے یہاں شانِ عرب آنِ عجم
تو نے اے غارت گرِ اقوام و اذلّ الامم

☆ ☆ ☆

تھا یقیں ہم کو کہ شامت رفتہ رفتہ آئے گی
ہم کو تو اے خاکِ ہند آخر یونہیں کھا جائے گی

دین و دولت علم و دانش ہم میں کچھ باقی نہیں
حق نے پوری کی تھی جو ہم پر وہ نعمت کیا ہوئی

غرض یہ داستانِ الم مختلف منزلیں طے کرتی ہوئی یہاں ختم ہوتی ہے :

ہیں یہ باتیں بھول جانے کی مگر کیوں کر کوئی
بھول جائے رات کا سب صبح ہوتے ہی سماں

بزم کو برہم ہوئے مدت نہیں گزری بہت
اٹھ رہا ہے کل سے شمع بزم کے اب تک دھواں

---

(۱) ڈاکٹر ، غلام مصطفیٰ خان ، حالی کا ذہنی ارتقاء - ص ۱۰۹ میں تاریخ تصنیف ۱۸۸۸ء ہے - لیکن شیخ اسماعیل پانی پتی نے کلیات نظم حالی ، جلد دوم ، حالی بک ڈپو پانی پتی میں اس کی تاریخ تصنیف ایک جگہ ۱۸۸۷ء اور دوسری جگہ ۱۸۸۸ء لکھی۔

کہہ رہے ہیں نفسِ ہائے رہ‌رواں اے خاکِ ہند
یہاں سے گزرا ہے ابھی اک با تحمل کارواں

ساحرا ہم درد ہمارا عبرت اوروں کے لیے
جیت جائیں گے بہت سن کر ہماری داستاں

مناجاتِ بیوہ

'مناجاتِ بیوہ'[1] اور 'چپ کی داد'[2] یہ دونوں نظمیں بھی حالی کے ذہنی رجحان کو ظاہر کرتی ہیں۔ 'مناجاتِ بیوہ' ایک دکھی دل کی پکار ہے اس کا تعلق جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے بیوہ عورت سے متعلق ہے۔ ہندوؤں کے اثر سے مسلمانوں میں بھی بیوہ کے متعلق عجیب و غریب خیالات پیدا ہوئے تھے۔ کوئی اسے منحوس سمجھتا تھا اور کوئی اسے سارے خاندان کی بد نصیبی پر محمول کرتا تھا۔ ایک طرف اہلِ دنیا کی یہ تنگ نظری لعن طعن دوسرے رنڈاپا اور بیکسی۔ حالی کا بڑا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اس نظم میں اس کیفیت کو بڑی خوبی سے اجاگر کیا ہے۔ فراق گورکھپوری نے خوب لکھا ہے۔ ''اس کو پڑھ کر ایسا احساس ہوتا ہے کہ . . . پڑتی ہے وہ چوٹ جو ابھرتی نہیں'' . . . .

ریت کی سی دیوار ہے دنیا
اوچھے کا سا پیار ہے دنیا

دکھ سے یہاں کے گھبرانا کیا
سکھ جو ہے یہاں کے اترانا کیا

عیش کی یہاں مہلت ہے نہ غم کی
سب یہ نمائش ہے کوئی دم کی

آنی جانی چیز ہیں خوشیاں
حلنی پھرتی چھانو ہیں ارماں

---

(۱) ڈاکٹر مصطفیٰ خان، حالی کا ذہنی ارتقاء - ص ۹۲ نے اس کا سال تصنیف ۱۸۸۴ء لکھا ہے - مولانا حامد حسین قادری نے داستان تاریخ اردو میں ۱۸۸۷ء اور شیخ اسماعیل نے تذکرہ حالی میں ۱۸۸۶ء یا ۱۸۸۷ء لکھا ہے -

(۲) ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، حالی کا ذہنی ارتقاء - ص ۱۹۲ پر اس کا سال تصنیف ۱۹۰۶ء لکھا ہے مولانا حامد حسن قادری نے داستان تاریخ اردو میں یہی سال دیا ہے - لیکن شیخ اسماعیل پانی پتی نے کلیات نظم حالی جلد دوم میں ۱۹۰۵ء لکھا ہے -

اس نظم کی سادگی ، سلاست اور سوز و گداز کے ساتھ ساتھ عام انسانوں کی زبان میں لکھی جانے والی نظموں میں امتیازی حیثیت حاصل ہے اور ادبی اعتبار سے معیاری۔

چپ کی داد

'چپ کی داد' یہ نظم بھی عورتوں سے متعلق ہے اس میں عورتوں کے فضائل ، فرائض اور ان کی جملہ خصوصیات اور نیک ارادوں کا احاطہ کیا گیا ہے اور عورتوں کی مظلومیت پر بھی آنسو بہائے گئے ہیں اور یہ شکوہ دہرایا گیا ہے کہ اس طبقہ کو اس کے پورے حقوق نہیں دیے گئے ۔ یہ نظم جس انداز میں لکھی گئی ہے اس کی برجستگی اور خلوص متاثر کیے بغیر نہیں رہتا ۔ مثلاً :(۱)

جو علم مردوں کے لیے سمجھا گیا آبِ حیات
ٹھہرا تمہارے حق میں زہرِ ہلاہل سر بسر

آتا ہے وقت انصاف کا نزدیک ہے یوم الحساب
دنیا کو دینا ہوگا ان حق تلفیوں کا جواب

حالی کی طویل شاعرانہ زندگی غزل سے شروع ہو کر نظمِ جدید کے بانی کی حیثیت سے ختم ہوتی ہے ۔ اس طویل مدت میں حالی نے فی الحقیقت فکری اعتبار سے نظمِ اردو کے بہت سے گوشے منور کیے ۔ آج وہ جدید اردو کے بانی کہلاتے ہیں اور جدید اردو نثر کی تاریخ میں سب سے پہلے اور سب سے بڑے سوانح نگار اور نقاد کی حیثیت سے اردو ادب کی تاریخ میں لازوال مرتبہ کے مالک ہیں ۔ نثر کی تاریخ میں سادگی اور سلاست کے سب سے بڑے مبلغ ۔

نثرِ حالی

حالی کی شاعرانہ زندگی کا سراغ ان کی کم عمری ہی سے ملتا ہے اور خود بقول ان کے ۱۸۵۵ء میں جب وہ پہلی بار مرزا غالب کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے اس کی ابتدا ہو چکی تھی ۔ ساتھ ہی ساتھ نثر کے میدان میں ان کا قلم اٹھ چکا تھا ، لیکن جب ۱۸۸۶ء میں 'حیاتِ سعدی' ان کے قلم سے نکلی تو لوگوں نے ان کی ناقدانہ بصیرت اور سوانحی سلیقہ کا اعتراف کیا ، لیکن اس سے قبل بھی انہوں نے بہت کچھ لکھا اگرچہ آج اس کی کیفیت محض تاریخی ہو کر رہ گئی ہے ، تاہم یہ تصانیف حالی کے ذہنی ارتقاء کی

---

(۱) حسن عسکری ، انسان اور آدمی (تنقیدی مجموعہ) ص ۲۳۷ - ۲۳۸ -

ابتدائی کڑیاں ہیں ، جن کے بغیر ان کا مطالعہ مکمل نہیں ہو سکتا ۔ ان کتابوں کا خاص موضوع مناظرہ ہے جس کا مقصد مذہب کی حمایت کرنا تھا ۔ لیکن مناظرانہ اندازِ نظر کے باوجود ان کی زبان زیادہ جذباتی نہیں ہے بلکہ منطقی استدلال کے سہارے یہ حمایت کی گئی ہے ۔ حالی کا بحیثیت ادیب یہ بہت بڑا وصف ہے کہ انہوں نے اردو نثر میں وہ طرز اختیار کیا جس میں بلاغت کا پہلو پوری طرح اجاگر ہے ، صفائی اور سادگی جس کے بنیادی اجزاء ہیں اور جس کا عقلی رجحان ان کا مزاج ہے ۔ اس اسلوب میں مقبول ہونے کے وسیع امکانات ہیں ۔ حالی کے یہاں ابتدا ہی سے اندازِ بیان کی وضاحت اور صفائی کی طرف رجحان ملتا ہے ۔ ان کا یہی طرزِ تحریر ملکی اور تمدنی ضرورتوں کے پیشِ نظر اور زیادہ واضح اور صاف ہوتا گیا ۔ آج جو نثر علمی موضوعات اور فلسفیانہ خیالات کے لیے درکار ہے وہ حالی کی زبان ہے جو مولوی عبدالحق کے وسیلے سے جدید نسل تک پہنچی ۔ اسے اردو کا مقبول ترین اسلوب کہہ سکتے ہیں ۔

تصانیفِ حالی

حالی کی تصانیف دو حصوں میں تقسیم ہو سکتی ہیں ۔ ابتدائی تصانیف جن میں مناظرہ کا رنگ غالب ہے ۔ دوسرے دور کی تصانیف میں سر سید کا اثر زیادہ ہے ۔ 'حیاتِ سعدی'، 'یادگارِ غالب'، 'حیاتِ جاوید'، 'مقدمۂ شعر و شاعری' اور مقالات و خطبات وغیرہ اسی دوسرے سلسلہ سے وابستہ ہیں ۔

حالی کی ابتدائی تصانیف میں پہلی تصنیف 'مولود شریف'[1] ہے جو پہلی بار ۱۹۳۲ء میں خواجہ سجاد حسین خلف مولانا حالی کے مقدمہ اور حالی پریس پانی پت سے شائع ہوئی ۔ اس کتاب میں حمد ، ذکرِ رسولِ مقبول صلعم اور آخر میں ایک مناجات جو منظوم مناجات سے مختلف ہے ۔ یہ وہی مناجات ہے جو 'مقالاتِ حالی'، حصہ اول میں شامل ہے ۔ کل [illegible] صفحات پر مشتمل ہے ۔ اس کے اسلوب میں جذباتی کیفیت غالب ہے ، جو عقیدت مندی کی وجہ سے پیدا ہو گئی ہے ۔ اس میں خاص تعداد میں عربی فارسی الفاظ اور ان کی تکرار موجود ہے ۔ پاک و ہند کے مسلمانوں میں جو میلاد شریف کی کتابیں رائج ہیں اس کتاب کے بیشتر بیانات میں بھی کم و بیش وہی باتیں ہیں ۔

---

(۱) ڈاکٹر سید عبداللہ نے 'اردو نثر سر سید کے زیر اثر میں' اور حامد حسن قادری نے 'داستان تاریخ اردو میں' حالی کی پہلی تصنیف 'تریاق مسموم' لکھی ہے ۔ لیکن خواجہ سجاد حسین کے دیباچہ سے واضح ہوتا ہے کہ یہ کتاب ۱۸۶۵ء اور ۱۸۷۰ء کے درمیان کی تصنیف ہے ۔ جبکہ حالی کا تعلق جہانگیر آباد سے تھا ۔

تریاقِ مسموم:

دوسری تصنیف 'تریاقِ مسموم' ۶۷ - ۱۸۶۸ء ہے جو پادری عماد الدین (مرتد) کی کتاب 'تحقیق الایمان' کے جواب میں ۱۸۶۷ء میں لکھی گئی۔ موضوع کے پیشِ نظر اس کا اندازِ تحریر بھی جذباتی اور پر جوش ہونا چاہیے تھا، لیکن جوش و خروش کے بجائے اس میں استدلالی رنگ غالب ہے۔ اس کے دیباچہ میں تمہیدی سوالات قائم کیے گئے ہیں اور پھر دو ابواب میں ان کا جواب دیا گیا ہے۔ پہلے باب میں شرائطِ مناظرہ کی بحث ہے اس باب میں دوسری بحث تعریف کے بیان میں ہے یہ بحث تفصیلی ہے اور اس میں تکرار پائی جاتی ہے۔ دوسرے باب میں عیسائیوں کے اس دعویٰ کا جواب ہے کہ آنحضرت میں معجزات کی نشانی نہ تھی۔ یہاں پر کتاب ختم ہو گئی ہے۔

'اصولِ فارسی' حالی کی اس زمانہ کی ایک تصنیف فارسی صرف و نحو سے متعلق ہے جو ۱۸۶۸ء میں لکھی گئی، کتاب نا مکمل رہی اور کبھی شائع نہیں ہوئی۔ شیخ اسماعیل پانی پتی، مولانا حامد حسن قادری اور ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان تینوں اس کو ۱۸۶۸ء کی تصنیف بتاتے ہیں۔ شیخ اسماعیل پانی پتی نے اسے رسالہ نقوش لاہور، اکتوبر ۱۹۵۳ء میں شائع کر دیا ہے۔

مبادیٔ علمِ جیولوجی

یہ کتاب لاہور کے قیام کے زمانہ میں لکھی گئی۔ مولانا حامد حسن قادری 'داستانِ تاریخِ اردو' ص ۵۸۶ میں اس کے نام اور سنہ تالیف دونوں سے اختلاف کرتے ہیں۔ وہ اس کا نام 'طباق الارض' اور سالِ تصنیف سنہ ۱۸۶۸ء بتاتے ہیں۔ چونکہ حالی نے خود ترجمہ حالی میں اسے لاہور کے زمانہ کی تصنیف بتایا ہے، اس لیے وہی سن زیادہ قرینِ قیاس ہے اور اسی کو صحیح تسلیم کیا جا سکتا ہے۔

تاریخِ محمدی پر منصفانہ رائے

سنہ ۱۸۶۰ء میں پادری عماد الدین نے 'تاریخِ محمدی' کے نام سے ۳۱۲ صفحات کی ایک ناپاک کتاب شائع کی جسے پڑھ کر حالی بہت بیچین ہو گئے اور انھوں نے اس کا مدلل جواب لکھا۔ اگرچہ انداز مناظرہ کا ہے، لیکن دلائل کو تحقیق اور سلیقہ سے جمع کیا گیا ہے۔

کیا یہ بات خیال میں آ سکتی ہے کہ جس شخص نے نہایت ناسازگار حالات

میں اعلائے کلمۃ الحق کہا اور جس نے اپنی قوم کو بت پرستی کے بدلے خدائے واحد کی اطاعت کی طرف راغب کیا "[1]۔

شواہد الالہام

یعنی الہام اور وحی کی ضرورت پر عقلی دلائل۔ یہ مختصر ۲۲ صفحات کا رسالہ ۱۸۷۲ء میں لکھا گیا۔ حالی نے ترجمہ میں اس کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔ البتہ جب مولانا وحید الدین سلیم نے ۱۹۰۲ء میں مضامینِ حالی، حالی پریس پانی پت سے شائع کیے تو اس میں ایک مضمون "الہام کی ضرورت پر ایک وجدانی شہادت" شائع کیا تھا۔ یہ مضمون 'شواہد الالہام' کا آخری حصہ ہے، جسے پہلے چھاپ دیا گیا تھا۔ غالباً فقط یہی حصہ دستیاب ہوا ہوگا۔ اس کا طرزِ تحریر استدلالی ہے، نتائج منطقی طور پر نکالے گئے ہیں۔ حسبِ ضرورت مثالیں دی گئی ہیں اور وہ اس انداز سے جیسے ایک استاد طالب علموں کو سمجھاتا ہے۔ اس رسالہ کا مقصد ایک مذہبی پہلو کی طرف مدلل انداز میں لوگوں کو متوجہ کرنا تھا۔

مجالس النساء

حالی کی ابتدائی نثری تصنیف میں 'مجالس النساء'[2] (۲ حصے) کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ حالی کے اصلاحی مشن کی یہ پہلی کڑی ہے۔ مصنف نے دلی کی شریف عورتوں کی حالت سادے انداز میں خود ان کی زبان میں بیان کی ہے۔ اس میں ایک بڑھیا اس کی بیٹی اور شاہ جی کی گفتگو بطور مکالمے کے لکھی ہے۔ جس میں بیٹی ماں کی قدامت پرستی پر اعتراض کرتی ہے۔ یعنی عورتوں کے فرسودہ خیالات، توہمات، تنگ نظری اور غلط طریقۂ علاج کی اصلاح پر بہت زور دیا گیا ہے۔ چونکہ کورانہ تقلید اور قدامت پرستی کی وجہ سے بسا اوقات بڑے بھیانک نتائج نکلتے ہیں۔

---

(۱) شیخ اسماعیل پانی پتی اس کا سال تصنیف ۱۸۷۱ء یا ۱۸۷۲ء بتاتے ہیں۔ تذکرہ حالی۔ ص ۱۲۰۔ مولانا امداد صابری بھی ۱۸۷۱ء لکھتے ہیں (فرنگیوں کا جال) فہرست کتب عماد الدین میں مولانا صابری دوسری جگہ اسی کتاب میں ص ۱۶۱ پر سال ۱۸۷۲ء لکھتے ہیں اور ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان صاحب حالی کے ذہنی ارتقاء میں ۱۸۷۲ء لکھتے ہیں۔ (رسالہ اردو حالی نمبر جولائی ۱۹۶۲ء)۔ اس کتاب کی رد میں مولوی چراغ علی نے بھی تعلیقات لکھی تھی۔

(۲) مجالس النساء کا پہلا حصہ ۱۸۷۴ء میں مطبع محمدی لاہور سے شائع ہوا۔ بعد میں حالی پریس پانی پت سے شائع ہوئی۔ اس کتاب پر مصنف کو چار سو روپیہ کا انعام بھی ملا تھا۔ اودھ اور پنجاب کے مدارس میں یہ کتاب مدت تک جاری رہی۔

قصہ کی ابتدا بچوں کی تعلیم و تربیت سے ہوتی ہے ، ماں کی کیا ذمہ داریاں ہیں ان میں کس طرح بچوں کی تربیت کرنا چاہیے ، زیادہ سختی کرنا اور بے جا پیار دونوں نقصان دہ ہیں ۔ عورتوں کو کس حد تک آزاد ہونا چاہیے ۔ مثلاً شادی کے معاملہ میں ان کی رضامندی ضروری ہے ، ورنہ تلخ نتائج کا اندیشہ قائم رہتا ہے ۔ عورتوں کی تعلیم بھی ضروری ہے تاکہ وہ اپنے بچوں کی بہتر تربیت کر سکیں اور ابتدا میں بچہ کو جس خوشگوار ماحول کی ضرورت ہوتی ہے ، وہ اسے میسر آ سکے ۔ غرض تمام گھریلو مسائل کا حالی نے احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے ، تاکہ اصطلاحِ معاشرت کا پہلو تشنہ نہ رہ جائے ۔ حالی نے عورتوں کے اوہامِ باطلہ کو بیان کرنے میں عورتوں کی نفسیات سے اچھی واقفیت کا ثبوت دیا ہے ۔ لیکن ان مسائل سے بڑھ کر ان کے اپنے دور کے بعض اثرات کتاب میں داخل ہو گئے ہیں ۔ حقیقت یہ ہے کہ انیسویں صدی کا یہ دور سر سید کا دور تھا اور ہر طرف 'تہذیب الاخلاق' اور اس کے اثرات کی کارفرمائی تھی ، چنانچہ حالی نے گھریلو زندگی سے ان حالات کی مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے ۔

اگرچہ 'مجالس النساء'[1] کو صحیح معنوں میں ناول نہیں کہا جا سکتا ، مگر ناول نگاری کی تاریخ میں یہ کتاب ایک کڑی ضرور ہے ۔ اس میں کردار نگاری کی طرف توجہ دی گئی ہے اور مکالمات میں سادگی اور روز مرہ کا استعمال کیا گیا ہے ۔ در اصل حالی کا محبوب مقصد اصلاحِ قوم ، اصلاحِ شاعری اور تعلیم و تربیت تھا نہ کہ قصہ گوئی و داستان سرائی ۔ لیکن حالی اپنے مقصد میں کامیاب ہیں ، وہ جس نیکی اور اصلاحی جذبہ کے ساتھ کتاب شروع کرتے ہیں ۔ اس جذبہ کے اختتام تک پہنچا دیتے ہیں ۔ توہمات کی تاریکی کو علم کی روشنی اور آزاد خیالی سے بدلنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ یہ کتاب کسی حد تک اپنے عہد کی معاشرتی تاریخ ہے ۔

> ''نندوں کو یا تو آٹھ پہر بھاوج کے نام کی تسبیح تھی یا بھائی کی صورت سے بیزار ہو گئیں ۔ خیر ہماری تمہاری بہت سی گزر گئی اور تھوڑی بہت رہی ہے وہ بھی بری بھلی گزر ہی جائے گی ۔ پر اس نئی (نسل) کا اللہ ہی بیلی (نگہبان) ہے'' ۔

اس دور میں ہمیں کچھ اور کتابیں اس موضوع پر ملتی ہیں ۔ مرزا عباس حسین ہوش کی 'فسانۂ طاہرہ' ، مولوی عبداللہ کی 'انشاء النساء' ، مولوی عبدالحامد کی 'مفید النساء' ، مولوی سید احمد ہوں کی 'انشاء ہادی النساء ، غلام حیدر خان کی 'افسانۂ حمید' وغیرہ ۔ لیکن یہ بھی قبولِ عام کا درجہ حاصل نہ کر سکیں ۔

---

(۱) علی عباس حسینی ، مجلس النساء ، فروغ اردو لکھنؤ حالی نمبر پہلا حصہ ۔ ص ۳۴۴ ۔

تذکرۂ رحمانیہ(۱)

اس میں حالی نے اپنے استاد قاری عبدالرحمٰن کے حالات زندگی لکھے ہیں - قاری صاحب کا وصال ۱۸۹۶ء میں ہوا - اس میں ہر لحاظ سے عقیدت نمایاں ہے - لیکن ان کی سیرت مجموعۂ محاسن تھی - درحقیقت حالی تو بھی محاسن گرویدہ لیے ہوئے تھے - اس میں بہتر سے بہتر انسان کی تلاش کا جذبہ کارفرما ہے - غرض یہ رسالہ ایک ایسے انسان کی یاد دلاتا ہے جس میں خلق ، مروت ، انسانیت ، شرافت اور نیکی ، زہد ، علم اور تمام اسوۂ حسنہ تھے -

سوانح نگاری

حیات سعدی

'حیات سعدی'(۲) اردو میں پہلی باضابطہ سوانح عمری ہے جسے فنی نقطۂ نظر سے کسی حد تک کامیاب کہا جا سکتا ہے - یہ کتاب ۱۸۸۶ء میں مطبع انصاری دہلی سے شائع ہوئی - اس کتاب پر جو مختصر دیباچہ ہے اسے اردو سوانح نگاری کا منشور کہنا چاہیے - اس سے قبل اردو میں جو سیرت اور حالات زندگی پر مواد ملتا ہے - اس میں کسی مخصوص تربیت یا فنی نقطۂ نظر کو برقرار نہیں رکھا گیا تھا - حالی ایک ایسے شخص کی سوانح سے اپنے سوانحی سلسلہ کو شروع کیا جس کی علمی حیثیت اسلامی معاشرہ میں مسلّمہ تھی -

---

(۱) یہ مضمون چودھویں صدی راولپنڈی میں ۱۸۹۶ء میں شائع ہوا تھا - رسالہ نقوش لاہور کے پنج سالہ نمبر فروری ، مارچ ۱۹۵۳ء میں بھی شائع ہوا ہے - حالی کے خیالات کی تائید مولانا حبیب الرحمان خان شیروانی کے مضمون سے بھی ہوتی ہے جو انہوں نے قاری صاحب کے حالات مطبع معارف اعظم گڑھ مارچ ۱۹۳۱ء میں لکھا تھا - یہ مضمون مقالات شیروانی میں شامل تھے -

(۲) حیات سعدی کے سال اشاعت کے متعلق اختلاف ہے ، داستان تاریخ اردو از حامد حسن قادری مطبوعہ برقی پریس آگرہ ص ۵۸۶ پر ۱۸۸۲ء اور ص ۵۹۰ پر ۱۸۸۴ء بتایا گیا ہے - ڈاکٹر عابد حسین نے رسالہ جامعہ دہلی اکتوبر ۱۹۳۵ء میں ۱۸۸۱ء اور ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان نے حالی کے ذہنی ارتقاء میں ۱۸۸۶ء لکھا ہے یہی قرین قیاس ہے - کیونکہ مولوی شبلی نے اپنے خط مؤرخہ ۱۰ مارچ ۱۸۸۶ء میں حیات سعدی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ حالی نے حال ہی میں شیخ سعدی کی متعصبانہ سوانح لکھی - مکاتیب شبلی جلد اول ص ۷۷ مزید مولوی ذکاء اللہ نے ۲۶ مارچ کے انسٹیٹوٹ گزٹ ریویو کیا تھا - مزید مولوی نصیر الدین ہاشمی نے کتب خانہ سالار جنگ کے اردو مخطوطات کا جائزہ مطبوعہ نوائے ادب جولائی ۱۹۶۰ء میں ص ۴۸ پر حیات سعدی مطبع انصاری دہلی کا سن اشاعت ۱۸۸۶ء لکھا ہے -

سعدی کی شخصیت ایک مصلح ، شاعر اور روحانی پیشوا کی تھی اور بلاشبہ یہ کمالات ان کی زندگی میں ملتے ہیں ۔ ان کی 'گلستان' اور 'بوستان' کو قدیم تعلیمی نظام میں بڑی اہمیت حاصل تھی ۔ ان کتابوں کو ادبی اور اخلاقی نقطۂ نظر سے بہت بلند سمجھا جاتا تھا ۔

کتاب دو حصوں میں تقسیم ہے ۔ پہلے حصہ میں حالات زندگی ، پیدائش ، علمی و ادبی سرگرمیاں ، سیاحت ، تعلقات دنیوی اور وفات وغیرہ ۔ یہ حصہ پوری کتاب کا تقریباً چوتھائی ہے ۔ دوسرے حصہ میں علمی و ادبی کمالات پر تبصرہ کیا گیا ہے ۔ کتاب کی ترتیب کے پیش نظر اندازہ ہوتا ہے کہ حالی حالات جمع کرنے سے زیادہ کارناموں پر زور دیتے ہیں ، اگرچہ سعدی کے سلسلہ میں انہوں نے بڑی محنت سے حالات جمع کیے ہیں اور ان کا منطقی تجزیہ کرکے قرین قیاس واقعات کا انتخاب کیا ہے اور وہ تمام افسانے اور فرضی قصے مثلاً سعدی کا خسرو سے ملنے کے لیے ہندوستان آنا ، سومنات کے مندر میں جانا اور ایک پجاری کو کنویں میں دھکیلنا کو نظر انداز کر دیتے ہیں ۔ لیکن 'حیات سعدی' میں ان کا مخصوص مقصد اور نقطۂ نظر ابھر آتا ہے ۔ حالی نے سعدی کے کلام میں اپنی آواز کو پہچانا اور ان کی اخلاقی اور روحانی زندگی میں قوم کے لیے ایک اچھے سبق کا نمونہ دیکھا ۔ اس لیے قدرتی طور پر اس میں اخلاقی اور غیر اخلاقی واقعات کی تخصیص پیدا ہو گئی ہے ۔ حالانکہ سوانح نگار کو صرف یہ دیکھنا چاہیے کہ واقعات کیا ہیں ، حقیقت کے اظہار میں پسند یا نا پسند اخلاق یا غیر اخلاقی کی تمیز کسی طرح مناسب نہیں ۔ کیونکہ سوانح نگاری ، علم اخلاق کی نسبت ایک اعتبار سے زیادہ سود مند ہے ۔ علم اخلاق سے صرف نیکی اور بدی کی ماہیت معلوم ہوتی ہے اور سوانح نگاری سے اکثر نیکی کرنے اور بدی سے بچنے کی نہایت زبردست تحریک دل میں پیدا ہوتی ہے اور اسلاف کے ستودہ کارناموں کی ریس کرنے کا شوق دامن گیر ہوتا ہے ۔ سوانح محض ایک میکانکی جسز نہیں ہے ، وہ فرد کے حالات سے بحث کرتی ہے ۔ اس کی نفسیاتی کیفیت کا پتہ لگاتی ہے اور تمام اجزاء کو ایک وحدت میں پرونے کا کام انجام دیتی ہے ۔ ڈاکٹر سید عبداللہ یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ حالی نے سعدی کو ایک انسان کی حیثیت سے نہیں دیکھا مگر فیصلے میں خلوص اور صداقت نمایاں ہے ۔ عشق و عاشقی اور شاہد بازی کا رجحان سعدی کے یہاں ملتا ہے ۔ لیکن حالی اسے مخرب اخلاق سمجھ کر قابل ذکر نہیں سمجھتے ۔ اسی طرح سعدی کے مطائبات کے سلسلہ میں طرح طرح کی تاویلیں کرتے ہیں ۔ حالانکہ سعدی خود کہتا ہے :

تمتع زہر خوشہ یافتم زہر خرمنے خوشۂ یافتم

سعدی کے شاعرانہ کمال پر تمام نقاد متفق ہیں ، حالی بھی اس کمال کی تہ تک پہنچ گئے تھے ۔ انہوں نے سعدی کی غزل پر بہترین ریویو کیا ہے ۔ غرض 'حیات سعدی' کی

تربیت سے اردو سوانح اور اسلوب دونوں میں ایک نیا انداز سامنے آیا اور بے تکلف سادہ نثر میں اہم اضافہ ہوا ۔

یادگارِ غالب

'یادگارِ غالب' سوانحی سلسلہ کی دوسری کڑی ہے جو ۱۸۹۷ء میں نامی پریس کانپور میں شائع ہوئی ۔ غالب کی زندگی اور کلام کے تجزیہ سے متعلق غالب پر یہ پہلی مبسوط کتاب ہے جس سے غالب کے کلام اور زندگی کے مادی حالات عوام تک پہنچے ۔ دیباچہ میں لکھتے ہیں "اگرچہ مرزا کی تمام لائف میں کوئی بڑا کام ان کی شاعری اور انشاء پردازی کے سوا نظر نہیں آتا ۔ مگر صرف اسی ایک بات نے ان کی لائف کو دارالخلافہ کے اخیر دور کا ایک مہتم بالشان واقعہ بنا دیا ہے" . . . . اصل مقصود اس کتاب کے لکھنے سے شاعری کے اس عجیب و غریب ملکہ کا لوگوں پر ظاہر کرنا ہے جو خدا تعالیٰ نے مرزا کی فطرت میں ودیعت کیا تھا اور جو کبھی نظم و نثر کے پیرایہ میں کبھی ، ظرافت اور بذلہ سنجی کے روپ میں کبھی عشق بازی اور رند مشربی کے لباس میں اور کبھی تصوف اور 'حب اہلِ بیت' کی صورت میں ظہور کرتا تھا ۔ 'حیاتِ سعدی' کی طرح 'یادگارِ غالب' کو بھی دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے ۔ پہلے حصہ میں مرزا کے حالاتِ زندگی ، ولادت سے وفات تک ، دوسرے حصہ میں ان کی نظم و نثر پر تبصرہ ۔ 'حیاتِ سعدی' کی طرح پہلا حصہ مختصر اور دوسرا تفصیلی ہے ۔ اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ حالات سے زیادہ کارناموں پر زور دیا جائے ، کیونکہ حالی ، سرسید سے ملاقات کے بعد اپنے ذہنی سفر میں کسی ایسے راستہ پر چلنا نہیں چاہتے جس سے قومی تعمیر میں مدد نہ ملے ۔ اگرچہ حالی کو غالب کی زندگی میں سوائے ان کے ملکۂ شاعری کے اور کوئی بات نظر نہیں آتی ، لیکن وہ اس بات پر معترض ضرور تھے کہ علاوہ اس خوبی کے ان کی طبیعت کی ظرافت ، وسیع المشربی اور رنج و غم کو برداشت کرنے کی زبردست قوت میں ایک مردہ دل سوسائٹی کے لیے (جیسی اس وقت مسلمانانِ ہند کی تھی) بہت بڑا سبق پنہاں تھا ۔ اس خیال نے ان کے ارادہ کو اور زیادہ مستحکم کر دیا اور انہوں نے غالب کی زندگی اور کمالاتِ نظم و نثر کو بڑی قابلیت سے پیش کیا ۔ حالی کا مواد ایک ذہین اور پہلودار شخصیت ہے ۔ چنانچہ 'یادگارِ غالب' ، نفسیاتی الجھنوں اور ذہنی پریشانیوں کی داستان بھی ہے ۔ وہ اپنے آپ کو رئیس زادہ تصور کرتے تھے ، لیکن ریاست باقی نہ رہی تھی اور جو کچھ باقی تھی وہ ابھی الجھنوں میں گھری ہوئی تھی ۔ غالب کیا تھے اور اپنے آپ کو کیا ظاہر کرنا چاہتے تھے ، کبھی شاعری کا سہارا لیتے تھے اور کبھی شاعری کے بجائے سپہ گری کو ذریعۂ عزت سمجھتے تھے ۔ ان کی تقریباً پوری زندگی کشمکش میں گزری ۔ وہ قدیم مشرقی تہذیب میں پلے بڑھے ، لیکن اپنی آنکھوں سے اس تہذیب کو دم توڑتے دیکھا ۔ جدید تمدن کی آمد نے

انہیں متاثر کیا اور بعض باتیں حقائق بن کر سامنے آئیں ۔ غالب انہیں کسی طرح جھٹلا نہ
سکے ۔ اس تصادم نے بھی ان کی زندگی پر غیر معمولی اثر ڈالا ۔ در اصل غالب شکست
سے آشنا نہیں ہونا چاہیے تھے ، لیکن ان کے حالات حوصلہ شکن تھے ۔ غالب کبھی ان
حالات سے مصالحت کر لیتے اور کبھی الجھ جاتے ۔ اگر اس نقطۂ نظر سے ہم 'یادگارِ غالب'
کو دیکھیں تو بڑی تشنگی نہیں ہوتی ۔ کیونکہ حالی کے سامنے ان مسائل سے قطع نظر
غالب کی شخصیت کے دلنواز پہلو زیادہ تھے ، مزید برآں کی شاعری میں جو نادر پہلو
تھے ۔ حالی کو انہیں کھولنا تھا ۔ اس سب سے واقعات میں حالی زیادہ چھان بین نہ
کر سکے اور جو واقعات ان کے علم میں تھے ، لیکن مرزا کی کمزوری پر دلالت کرتے تھے ۔
حالی نے انہیں بھی حسبِ ضرورت ہلکا اور شوخ کر دیا ہے ۔ مقصد کتاب کے اصلی پہلو
کو ہر حال میں برقرار رکھنا تھا ۔ بعض بیانات انہوں نے بجنسہ قبول کر لیے ۔ کچھ مرزا
کے خطوط کی مدد سے لکھے اور کچھ ذہنی یادداشت سے کام لیا ۔ بلاشبہ کسی سوانح کی
ترتیب میں تمام طور در انہیں باتوں سے مدد لی جاتی ہے ۔ لیکن حالی کا اخلاقی نقطۂ نظر
انہیں بعض واقعات کی تفصیلات کو منظرِ عام پر لانے سے روکتا ہے ۔ جیسے مرزا کی قید
کا واقعہ ، عزیزوں اور دوستوں سے اختلافی مسائل اور نوابانِ رامپور سے ان کے تعلقات کی
تفصیل اور اختلافی خط و کتابت ، واقعات اور حالات کی توجیہہ انداز فکر طلب تھی ۔
مولانا ابوالکلام آزاد نے شکایتاً لکھا ہے کہ "مولانا حالی ناخوشگوار واقعات کو پسند
نہیں کرتے تھے" ۔ آزاد کے اس بیان میں حقیقت ہے تاہم حالی نے واقعات کو توڑ مروڑ
کر نہیں لکھا ہے ، بلکہ تفصیلات سے گریز کرتے ہوئے واقعات کو تشنہ اور نامکمل
چھوڑ دیا ہے ۔ بعض تاریخی غلطیاں بھی حالی سے سرزد ہوئیں ہیں حالی نے نسخ کے حوالہ
سے لکھا ہے کہ مرزا کو پانچ ہزار ملتے تھے ، تین ہزار روشن الدولہ کھا گئے ۔ مسئلہ یہ
خود حالی نے مرزا کے لکھنؤ پہنچنے پر نصیر الدین حیدر کو فرمانروا اور روشن الدولہ کو
نائب السلطنت لکھا ہے (یادگارِ غالب ص ۱۵) ۔ لیکن یہ صحیح نہیں ہے بلکہ مرزا
۱۸۲۷ء میں لکھنؤ پہنچے تو اس وقت غازی الدین حیدر کا آخری زمانہ تھا اور معتمد الدولہ
آغا میر تھے ۔ غازی الدین حیدر کا انتقال ۱۹ اکتوبر ۱۸۲۷ء کو ہوا ۔ اس کے بعد
نصیر الدین حیدر بادشاہ ہوئے اور اس وقت مرزا لکھنؤ سے گزر چکے تھے ۔ نصیر الدین
کے ابتدائی دور میں معتمد الدولہ ہی مدارالمہام تھے ۔ روشن الدولہ پانچ سال بعد وزیر
ہوئے ۔ در اصل حالی کو غالب کے خط سے سہو مزید ہوئی ۔ خود غالب کلیاتِ نثرِ فارسی
میں صراحت کرتے ہیں کہ "دوستوں نے رفتہ رفتہ میرا ذکر سید آغا میر کی بزم میں پہنچایا
جو اس وقت معتمد الدولہ کے خطاب سے مشرف تھے" ۔ مزید غالب کے لکھنؤ پہنچنے
وقت صاحبِ یادگار کے نزدیک کچھ کم چالیس سال کے تھے ، لیکن مولانا غلام رسول مہر

نس بتاتے ہیں'' (۱) یعنی ۱۷۹۷ء غالب کا سالِ پیدائش ہے اور وہ لکھنؤ ۱۸۲۷ء میں پہنچے۔ اسی طرح اور بھی بعض واقعات ہیں، جو تحقیق طلب تھے، لیکن حالی نے انہیں روا روی میں لکھ دیا اور واقعات کے سلسلہ میں بعض دفعہ تاریخی صداقت مجروح ہو گئی۔ شیخ محمد اکرام (آثارِ غالب) کی تحقیق اور اعتماد کے مطابق مثنوی 'ابرِ گوہر بار' ۱۸۴۵ء کی تصنیف ہے، لیکن حالی اسے آخری دور کی تصنیف قرار دیتے ہیں، حالانکہ اس مثنوی کے کئی اشعار 'مہرِ نیمروز' میں درج ہیں، جو ۱۸۵۲ء کی تصنیف ہے۔ ایسی خامیوں کے باوجود حالاتِ زندگی کے سلسلہ میں بھی غالب کی کوئی سوانح عمری 'یادگارِ غالب' سے بے نیاز نہیں رہ سکتا، کیونکہ حالی نے ذاتی مشاہدات، معلومات اور واقعات کی بناء پر جو باتیں لکھی ہیں وہ تاریخی پہلو سے بھی مخصوص ہیں اور رہیں گی۔

'یادگارِ غالب' کا دوسرا حصہ، کلام پر تنقید ہے۔ مصنف کی سعی و محنت کی آماجگاہ یہی حصہ ہے۔ غالب کے سلسلہ میں سب سے زیادہ قابلِ توجہ امر یہ تھا کہ آیا ان کی شاعرانہ بصیرت اور حکیمانہ مزاج، زمانہ کے مذاق سے ہم آہنگ کیوں نہ ہو سکے۔ اگر ایک طرف مرزا کے مداحوں کا ہجوم تھا تو دوسری طرف ان کے مخالفین کی تعداد بھی کم نہ تھی۔ اصلاحات کی ان بھول بھلیوں میں مرزا کے شاعرانہ کمال کا کھلے دل سے اعتراف نہیں کیا جاتا تھا اور نہ بلند پروازی اور شاعرانہ کمال کی طرف لوگ توجہ دیتے تھے۔ حالی نے ان کے کلام کے ان مخصوص گوشوں کو اجاگر کیا اور ان کے مشکل اشعار کی جو ایک طرح سے 'بے معنی' سمجھے جاتے تھے شرح کر کے ان اشعار کی اصل خوبیوں کو واضح کیا۔ اس طرح غالب کے متعلق بہت سی غلط فہمیوں کو دور کرنے کے لیے فضا ہموار کی۔ غالب کی وسعتِ خیال اور دستاویز زرف بینی کی طرف لوگوں کو متوجہ کیا۔ شعر کے متعلق انداز سے انیسویں صدی میں خاص کر اس کے نصف آخر میں جو رویہ اور نظریہ قائم ہو گیا تھا، اس کی رو سے زیادہ تر صناعی اور فنی باریکی ہی کو شاعری سمجھا جانے لگا تھا۔ حالی نے غالب کے سہارے اس محدود خیال کو وسعت بخشی اور مرزا کی شاعری سے وہ پہلو ڈھونڈھ کر لوگوں کے سامنے رکھے، جنہیں آفاقی شاعری کے زمرہ میں رکھا جا سکتا ہے۔ اس کتاب سے خود ہندوستان میں غالب کے مطالعہ کا ذوق بڑھا اور غالب شناسی کا یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔

تجزیہ و تشریح کی بے مثال قابلیت کا ثبوت اس کتاب میں ملتا ہے۔ غالب کے شاعرانہ کمال کے ساتھ ان کی بے مثل نثر جو اکثر خطوط کی شکل میں ظاہر ہوئی ہے اور جس کی ظرافت، ذہانت اور بذلہ سنجی ہمیں متوجہ کیے بغیر نہیں رہ سکی، اس کی طرف

---

(۱) مہر غلام رسول، غالب - ص ۲۰۹، ۲۱۰ -

لانے میں بھی یادگارِ کا بڑا حصہ ہے ۔ واقعات کی بعض غلطیوں کے باوجود حالی کی بہترین ناقدانہ صلاحیتوں نے محققین اور ناقدین دونوں کے لیے غور و فکر کا سامان بہم پہنچایا ۔ حالی کا خیال ہے کہ مرزا نے ۱۸۵۰ء سے اردو میں خطوط نویسی شروع کی ۔ لیکن یہ خیال صحیح نہیں ، بلکہ منشی بخش فقیر کے نام ۱۸۴۸ء کا خط ملا ہے ۔ ممکن ہے کہ یہ سلسلہ اور بھی پیچھے جائے ۔

اردو خطوط نویسی کی ابتداء سے قطع نظر مرزا کا اپنے مکاتیب کے متعلق خیال تھا کہ "میں نے وہ اندازِ تحریر ایجاد کیا ہے ۔ مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے ، ہزار کوس سے بیٹھے بزبانِ قلم باتیں کیا کرو ، ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو" ۔ حالی اور دیگر نقاد بھی اسی نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ مرزا اسی طرزِ خاص کے موجد تھے ۔ یہ اندازِ تحریر انہیں سے شروع ہوا اور انہیں پر ختم ہو گیا ۔ مرزا کی باغ و بہار اور پہلو دار شخصیت کے مطالعہ میں ان کے خطوط سے بہت مدد ملتی ہے ۔

حیاتِ جاوید

'حیاتِ جاوید' حالی کے سوانحی سلسلہ کی آخری کڑی ہے ۔ یہ کتاب ۱۹۰۱ء میں نامی پریس کانپور سے شائع ہوئی ۔ اردو کی ضخیم ترین سوانح عمریوں میں سے ہے ۔ یہ کتاب صرف سر سید احمد خان کی لائف ہی نہیں ، بلکہ انیسویں صدی کی تمدنی ، تہذیبی ، ادبی ، تعلیمی اور سیاسی زندگی کی تاریخ ہے ۔ حالی کی دونوں سوانح عمریوں کی طرح 'حیاتِ جاوید' میں بھی سر سید کے کارناموں پر زیادہ زور دیا گیا ہے ، لیکن 'حیاتِ جاوید' کی ترتیب میں انہیں جن مسائل اور مشکلات کا سامنا تھا وہ 'حیاتِ سعدی' اور 'یادگارِ غالب' سے مختلف تھے ۔ کیونکہ مذکورہ بالا دونوں شخصیتیں متنازعہ فیہ نہ تھیں اور سر سید کی زندگی موافقت اور مخالفت کے ہجوم میں گھری ہوئی تھی ۔ اسی نازک حالت میں کسی ایسی سوانح عمری کا مرتب کرنا جس سے واقعات و حقائق مسخ بھی نہ ہونے پائیں اور نہ افادی پہلو مجروح ہو ، مشکل امر تھا ۔ اپنی اس کشمکش کا اظہار حالی نے دیباچہ میں خود کیا ہے ۔ "اگرچہ ہندوستان میں جہاں ہیرو کے ایک عیب یا خطا کا معلوم ہونا اس کی تمام خوبیوں اور فضیلتوں پر پانی پھیر دینا ہے ، ابھی وقت نہیں آیا کہ کسی شخص کی بایوگرافی کریٹیکل طریقہ سے لکھی جائے ۔ اس کی خوبیوں کے ساتھ اس کی کمزوریاں بھی دکھائی جائیں اور اس کے عالی خیالات کے ساتھ اس کی لغزشیں بھی ظاہر کی جائیں ۔ چنانچہ اسی خیال سے ہم نے جو دو ایک مصنفوں کا حال لکھا ہے ، اس میں جہاں تک ہم کو معلوم ہو سکا ان کی اور ان کے کلام کی خوبیاں ظاہر کی ہیں اور ان کے پھوڑوں کو کہیں ٹھیس نہ لگنے دی ہے ، لیکن اول تو ایسی بایوگرافی چاندی سونے کے ملمع سے زیادہ وقعت نہیں

رکھتی ، جنہوں نے اس موج خیز اور پر آشوب دریا کی منجدھار میں ناؤ ڈالی اور کنارے کنارے ایک گھاٹ سے دوسرے گھاٹ پر صحیح سلامت جا اترے ، ان کو سب نے بھلا جانا ، کیونکہ ان کو کسی کی بھلائی یا برائی سے کچھ سروکار نہ تھا ۔ وہ کہیں رستہ نہیں بھولے ، کیونکہ انہوں نے اگلی بھیڑوں کی لیک سے کہیں ادھر ادھر قدم نہیں رکھا ۔ لیکن ہم کو اس کتاب میں اس شخص کا حال لکھنا ہے جس نے چالیس برس برابر تعصب اور جہالت کا مقابلہ کیا ہے ۔ تقلید کی جڑ کاٹی ہے ، بڑے بڑے جماہ مسمرین کو تاڑا ہے ۔ ایسے شخص کی لائف جب چاپ کیوں کر لکھی جا سکتی ہے ۔ ضرور ہے کہ اس کا سونا کسوٹی پر کسا جائے اور اس کا کھرا کھوٹا بجا کے دیکھا جائے"۔

یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ حالی نے پوری طرح اس فرض کو ادا کیا اور بجا طور پر اپنے دعوی پر پورے اترے ، لیکن اس میں شبہ نہیں کہ حالی کے متوازن اور معتدل اندازِ فکر نے ان کی بڑی رہنمائی کی ، ورنہ سر سید کی زندگی میں واقعات کا ایک بہت بڑا جنگل پھیلا ہوا ہے اور یہ واقعات بسا اوقات نہ صرف ایک دوسرے سے متصادم ہو جاتے ہیں ، بلکہ ان میں مسائل کی ایسی نزاکت موجود ہے کہ ان کے کم و کاست بیان خطرہ سے خالی نہیں ۔ حالی نے کسی جگہ واقعات کو سطح پر دیکھا ہے اور کسی جگہ مصلحت کا شکار ہوئے ہیں ۔ کسی جگہ ان کا اخلاقی نقطۂ نظر کام کرتا ہے کہیں فن کے تقاضے انہیں تصویر کے دونوں رخ دکھانے پر مجبور کرتے ہیں ۔ لیکن یہ بات یقینی ہے کہ انہیں سرسید سے بڑی عقیدت تھی ۔ انہیں اس بات کا بھی یقین تھا کہ سرسید کا کوئی کام خلوص اور سچائی سے خالی نہ تھا اور ان کے تمام کاموں کی بنیاد مذہبی جذبہ پر تھی ۔ وہ اس بات سے بھی واقف تھے کہ سرسید وقت کی سب سے موثر آواز تھے ۔ انہوں نے وقت کے دھارے کو دیکھ لیا تھا اور اس دھارے کی قوت اور اہمیت سے بخوبی واقف تھے وہ زندگی کی بدلتی ہوئی قدروں کا خوبی احساس رکھتے تھے ۔ انہوں نے مسلمانوں کی تہذیبی ، تمدنی اور اقتصادی ضرورتوں کو خوب سمجھ کر ان کے لیے راستہ متعیّن کرنے کا کامیاب منصوبہ بنایا تھا ۔ اس لیے حالی کے نزدیک سر سید کی لائف کو اسی نقطۂ نظر سے ڈھالنے کی ضرورت تھی ۔ یہ وقت کی سب سے بڑی ضرورت اور قومی مسائل کے حل کا حقیقی تقاضا تھا ۔ اس سے آنکھ بند کرنا ملک و قوم سے غفلت برتنا تھا اور حالی اس جرم کے مرتکب نہیں ہونا چاہتے تھے ۔ اس لیے انہوں نے واقعات میں ترمیم و تنسیخ اور ردّ و بدل تو نہیں کی ، لیکن حسب ضرورت رنگوں کو ہلکا اور گہرا کر دیا ۔ وہ سر سید کی غلطیوں پر نگاہ تو رکھتے ہیں ، لیکن ان کی تشہیر سے زیادہ ان کی تاویلیں کرتے ہیں اور کارناموں کو پھیلانا زیادہ ضروری سمجھتے ہیں ۔ کیونکہ یہی کارنامے ہیں جنہوں نے مسلمان قوم کی قسمت بدل دی اور انہیں قعرِ مذلت سے نکال کر زندگی کی منزل سے آشنا کیا ۔

سر سید کی یہی سب سے بڑی عظمت ہے کہ انہوں نے مسلمان قوم کو تذبذب کے تصور سے نکالا ۔ ان کی منزل کا تعیّن کیا اور انہیں ایک راستہ پر لگا دیا ، جس سے خوشحالی اور بلندی کے امکانات نظر آتے ہیں ۔ 'حیاتِ جاوید' کا مرکزی خیال یہی تصور ہے اور حالی کی تمام سلیقہ مندی اور صلاحیت اسی محور کے گرد گھومتی ہے اور وہ سر سید کو ایک ''ڈسپاٹ'' اور ضدی سمجھتے ہوئے بھی ان کی عظیم الشان خدمات اور شخصیت کے نہ صرف معترف تھے ، بلکہ اسے مسلمانوں کی نجات کا واحد ذریعہ سمجھتے تھے ۔ سر سید کی طرح حالی بھی اس بات کے قائل تھے کہ سعی و محنت سے فرد اور قوم کی تقدیر بدلی جا سکتی ہے ۔ یہ کوئی جامد شے نہیں ہے بلکہ متحرّک ہے ۔ انسان کے نزدیک سب سے بڑی حقیقت یہ ہے کہ وہ وقت کے تقاضوں کو سمجھے زندگی پر بحیثیتِ مجموعی نظر ڈالے اور پھر وقتی ضرورتوں اور مستقل قدروں میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کرے ۔ پھر بھی 'حیاتِ جاوید' کو پڑھ کر متعدد سوالات انسان کے ذہن میں ابھرتے ہیں ۔ سوانح نگار کے کیا فرائض ہیں اور سوانح کے کیا تقاضے ہیں ۔ سوانح صرف عظمت کی داستان ہے یا ایک فرد کی زندگی کے نشیب و فراز ، نجی معاملات ، ذہنی ارتقا ، اس کے عادات و اطوار ، مزاج اور خصلت ، کی کہانی ہے ۔ اس کا مقصد ہیرو کے مخصوص واقعات کا اندراج اور ترجمانی ہی نہیں ، بلکہ تمام ظاہری اور باطنی خد و خال ، عہد اور حالات کی عکاسی ، دلچسپ انداز میں بیان کرنا بھی ہے ۔ یہیں سے سوانح ادب کی شاخ ہو جاتی ہے ۔ حالی کو کچھ واقعات کرنل گریہم اور منشی سراج الدین کی بدولت ہاتھ آئے ، لیکن زیادہ تر خود حالی کی ذاتی واقفیت نے کتاب کو وزن اور وقار عطا کیا ۔ 'حیاتِ جاوید' کی سب سے بڑی خوبی اور کمزوری یہی ہے کہ اس میں حالی کا نقطۂ نظر غالب ہے اور بعض مسائل کی توجیہہ اور مخصوص رنگ و آہنگ نے ''منحرف طبائع'' میں غلط فہمی کو جنم دیا ۔ پھر واقعات کی تشنگی نے اسے مزید ہوا دی ۔ یہ واقعہ ہے کہ حالی نے ٹرسٹی بل ، مولوی سمیع اللہ جیسے مخلص رفیق کار کے کالج چھوڑنے ، یورپین اسٹاف اور اس کے حاکمانہ رویہ اور سر سید کا انگریزوں کو خوش کرنے کے لیے حدِ تجاوز سے بڑھ جانا وغیرہ ، جیسے تلخ لیکن ضروری واقعات کو کم سے کم جگہ دی ہے اور حالات کو اپنے نقطۂ نظر سے دیکھا ہے ۔ دیگر اسباب کے علاوہ ، غالباً اس خاص وجہ سے بھی ، شبلی نے 'حیاتِ جاوید' کو ''مدلل مداحی کتاب المناقب اور سرکاری رپورٹ ، وہ بھی یک رخی ، کے نام سے یاد کیا ہے'' ۔ جب مولانا حبیب الرحمان خان شیروانی نے 'حیاتِ جاوید' پر ریویو لکھا تو مولانا شبلی نے انہیں مبارک باد دی اور لکھا کہ ''مبارک باد ! ریویو پڑھا

اور بار بار پڑھا ۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ تحسین نہیں حسد کے لائق ہیں[١]‘‘ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ ریویو اخبار تک محدود رہ کر اڑ پڑ جائے گا ۔ اس کو ایک رسالہ کی صورت میں چھپنا اور شائع ہونا چاہیے ۔ اس سے اور عمدہ نمونے قائم ہوں گے اور شاید رفتہ رفتہ ’حیاتِ جاوید‘ کا خونِ فاسد ان نشتروں سے نکل جائے گا‘‘ ۔ لیکن جیسا کہ شیخ عبدالقادر نے لکھا ہے ۔ ’’سر سید کا مزاج آزادی اور اطاعت کا ایک مجموعہ تھا ۔ جس میں یہ دونوں چیزیں مناسب مقدار میں موجود تھیں اور اپنے وقت پر دونوں ظاہر ہوتی تھیں‘‘ ۔ حالی نے بھی سرسید کی انگریز دوستی اور جدید علوم و فنون کے استقبال اور اسی ضرورت کے تحت ترک کیا دیکھا ہے اور انہیں واقعات کی تصویر کشی میں زمانہ رنگ آمیزی کی ہے جو اس کیفیت کے ظاہر کرنے میں مدد گار معلوم ہوئے ۔ اسی نقطہ نظر کے غلبہ نے ’حیات جاوید‘ میں فنی خامیاں پیدا کر دیں ۔ مثلاً بعض معمولی مخالفتوں کا ذکر کرکے انہیں اہم اور بڑی مخالفتوں کو معمولی بنا دیا ۔ یہ ’حیاتِ جاوید‘ کا ایک کمزور پہلو ہے ۔ سرسید کے نام بہت سے ضروری مخالف خطوط کو نظر انداز کر دیا ہے ۔ حالانکہ ایسے خطوط کے اقتباسات درج کرنا ضروری تھا ۔ تاکہ قوم اپنی ذہنی کیفیت کو خود اپنے آئینہ میں دیکھ سکتی ۔ کالج کی عمارت کی تفصیل حالی نے نہیں لکھی ۔ سرسید کے رفقاء کا ذکر مناسب جگہ نہ پا سکا ، حالانکہ یہ رفقاء جس مرتبہ کے تھے اور انہوں نے جس خلوص و محبت کا مظاہرہ کیا تھا ، وہ سرسیدی تحریک کی کامیابی کی ضمانت بن گیا ۔ حالی نے مشاہیر و اخبارات کی تحریروں و تقریروں کو ضرورت سے زیادہ درج کتاب کیا ہے ۔ حالانکہ بقول ایک مبصر ’’سر سید کے غیر مطبوعہ دلچسپ خط شامل ہو سکتے تھے‘‘ ، اسی طرح مولوی عبدالحلیم شرر کے نزدیک ’’مولانا حالی نے ہندوؤں کے چندے کا ذکر نہ کرکے ، ایک بڑی فروگذاشت کی ہے ، لیکن یہ ایک سہو ہے بدنیتی نہیں‘‘ ۔ غرض سرسید کی زندگی جس کشمکش ، مخالفت صبر و استقلال تعمیر و تشکیل میں گزری وہ ’حیاتِ جاوید‘ کا اہم ترین موضوع ہے ۔ ضرورت تھی کہ اس کشمکش کو زیادہ واضح شکل میں پیش کیا جاتا ، تاکہ تصویر کا دوسرا رخ بھی روشن ہوتا ۔ سر سید کی جانشینی کا مسئلہ مسٹر بیک کا اقتدار ، یورپین اسٹاف کی چالیں اور حاکمانہ رویہ ، محسن الملک ، وقارالملک اور حالی سے سر سید کا اختلاف ، اس طرح کے اور مسائل تھے جو خصوصی توجہ کے مستحق تھے اور یہیں سر سید کے مخالفین کا نقطہ واضح ہو سکتا تھا ۔

کتاب کی ترتیب اور اسلوب کے متعلق بعض باتیں کھٹکتی ہیں ۔ اعادہ اور تکرار کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ۔ حالی نے پہلے واقعات کو مختصر تبصرے کے ساتھ

---

(١) خط بنام حبیب الرحمن خاں شیروانی ٢٣ فروری ١٩٠٢ء نقوش مکاتیب نمبر جلد اول ص ١٤٣ ، ١٤٤ (حبیب الرحمن خاں شیروانی کا یہ ریویو انسٹی ٹیوٹ گزٹ ٢٠ فروری ١٩٠٢ء کو شائع ہوا تھا ۔ بعد میں ملاقات شیروانی میں شائع ہو گیا ہے) ۔

بیان کیا ہے ، پھر سر سید کی ترقی کے اسباب کے ذیل میں ان پر تبصرہ کیا ہے ۔ اس طرح طوالت اور تکرار کا پیدا ہو جانا یقینی تھا ۔ چونکہ 'حیاتِ جاوید' کے ہیرو کی داستان طویل تھی ، اس لیے حالی نے لمبے لمبے جملوں میں اس دفتر کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے ۔ جس کی وجہ سے لیکن ، چنانچہ ، چونکہ ، اگر ، اور مگر ، کی ایک ہی صفحہ پر تکرار نظر آتی ہے ۔ مزید انگریزی الفاظ کی بھتات بھی ناگوار گزرتی ہے ۔ مانوس اور غیر مستعمل الفاظ کا سلسلہ نظر آتا ہے ، مثلاً ڈسپاٹک ، سلف ہلپ ، سکنڈ لنگویج ، پبلک فیلنگ ، ایفلیٹیڈ ، کنٹری بیوشن ، وغیرہ ۔ لیکن اسلوب کے اس نقص کے باوجود 'حیاتِ جاوید' میں حالی کا ایک ترقی یافتہ اسٹائل ملتا ہے ، جس میں سادگی ، صفائی ، سلاست کی خوبیوں کے ساتھ متاثر ہو کر پرزور عبارتیں لکھی گئی ہیں ۔

حالی بحیثیت نقاد

مقدمہ شعر و شاعری

یہ مقدمہ دیوانِ حالی کے ساتھ ۱۸۹۳ء میں نامی پریس کانپور سے شائع ہوا ۔ اس کا موضوع جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے شاعری کا مقدمہ ہے ۔ چونکہ یہ حالی کے دیوان کے ساتھ شائع ہوا تھا ، اس لیے اس کی پہلی حیثیت حالی کے کلام اور جواز سے متعلق ہے ۔ مقدمہ کے پہلے حصہ میں شعر کا تاثر ، ماہئیت ، یعنی شاعری اور اس کے لوازم سے بحث کی گئی ہے ۔ دوسرے حصہ میں اردو اصنافِ سخن پر تبصرہ کیا گیا ہے ، بہت سے سوالات اٹھائے گئے ہیں ۔ اعتراضات کیے ہیں اور ان کے جواب دے کر پرانے اندازِ شاعری کو بدلنے کی کوشش کی ہے ۔ اس سے قبل وہ 'مسدسِ حالی' اور 'مجموعہ نظم حالی' میں بھی شعر و ادب کی دنیا میں تبدیلی کی ضرورت پر متوجہ کر چکے تھے ۔ لیکن مقدمہ میں انہوں نے باضابطہ اصول مرتب کر کے شاعری کی بنیادی حیثیتوں سے بحث کی ہے ۔ چونکہ اردو میں پہلی بار تنقیدی مسائل سے سوال و جواب کا سلسلہ وجود میں آیا تھا ، اس لیے اسے اردو کی پہلی باضابطہ تنقیدی کتاب کہا جاتا ہے ، بلکہ مقدمہ سے ہی اردو تنقید کی ابتدا ہوتی ہے ۔

مقدمہ کے پہلے حصہ میں حالی نے وقتی ضروریات سے متاثر ہو کر بعض مباحث اٹھائے ہیں ، مثلاً شعر کی تاثیر ، اس کی مقصدی حیثیت ، دنیا کے ادبیات سے شاعری کی تاثیر ، اور جادو کی مثالیں ، اغنی سے رود کی اور بائرن اور دیگر انگریز ادباء سے حوالے دے ہیں ۔ ایسے واقعات انتخاب کیے ہیں جو ان کے نقطہ نظر کی وضاحت کر سکیں ۔ ان تمام مباحث سے صرف یہ واضح ہوتا ہے کہ ابتدا ہی سے حالی کے ذہن میں شعر کی مقصدیت اور افادیت کا تصور جاگزیں تھا اور اردو شاعری میں اس کی کمی انہیں بری

طرح کھٹک رہی تھی ۔ اسی نظریہ کے غلبہ نے حالی کو شعر کی اس وجدانی کیفیت تک نہیں پہنچنے دیا ، جہاں سے عظیم اور آفاقی شاعری جنم لیتی ہے ۔ بلا شبہ شعر کا کام تاثیر پیدا کرنا ہے لیکن یہ تاثیر رفتہ رفتہ پیدا ہوتی ہے اور انسانی تمدن کو زیادہ شائستہ اور مکمل بناتی ہے ۔ چونکہ زندگی مجموعۂ حساسات بھی ہے اس لیے شاعری میں ایک طرف عقل کی سنجیدگی ضروری ہے تو ساتھ ہی جذبات کا ابھار اور اس کی سیّال کیفیت بھی اہم ہے ۔ غرض یہ حصہ نظریات کا ایک مرکب ہے ۔ لہذا شعر و ادب کے ایسے نظریہ کی تشکیل میں مدد نہیں دیتا ۔ لیکن اردو شاعری کی دنیا میں یہ تصور پہلی بار واضح طور پر سامنے آیا کہ ادب کا کچھ مقصد ضرور ہے اور زندگی سے اس کا رشتہ کس قدر گہرا ہے ۔ پھر بھی اس بات سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ حالی کی اصلاحات ، ادبی کم ، اخلاقی اور مقصدی زیادہ ہیں ۔ کیونکہ حالی کے ذہن میں ایک مقصد اور تہذیبی و تمدنی اثرات کام کر رہے تھے اور تہذیب کی تشکیل اور فرد کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے میں شعر سے کام لینا چاہتے تھے ۔

'مقدمۂ شعر و شاعری' کے پہلے حصہ کا دوسرا رخ شاعری کی تعریف اور اس کی ماہیت سے بحث کرتا ہے ۔ ادبیاتِ عالم میں شعر کی بہت سی تعریفیں کی گئی ہیں ۔ حالی نے بھی عربی انگریزی اور اپنے معلومات کے ذخیرہ کی مدد سے شعر کی تعریف کرنے کی کوشش کی ہے ۔ حالی ایک عرب محقق کے قول کو دہراتے ہیں کہ شعر کی تعریف یہ ہے کہ ''خیال ایک ایسے عجیب معمول اور نرالے طور پر لفظوں کے ذریعہ ادا کیا جائے ، کہ سامع کے دل اس کو سن کر خوش یا متاثر ہوں'' شعر ہے خواہ نظم میں ہو یا نثر میں لیکن عرب ، نثر کو خواہ جیسی ہی شاندار کیوں نہ ہو اسے شعر کہنے کے لیے تیار نہیں ۔ حتیٰ کہ قرآنِ مجید کی فصیح عبارت کو بھی شعر نہیں کہتے ۔ اردو کے قدیم شعری نظام میں الفاظ کو معنی پر فوقیت حاصل تھی ۔ حالی اس رنگ کو بدلنا چاہتے ہیں وہ الفاظ کے قائل ہوتے ہوئے بھی معنی پر زیادہ زور دیتے ہیں ۔ انہوں نے اپنے نظامِ شعری میں سادگی ، اصلیت اور جوش شعر کی خوبیاں بیان کی ہیں ۔ سادگی سے ان کی مراد اس کلام سے ہے جو ہر درجہ کے لوگوں کو برابر سمجھ میں آئے ۔ لیکن اس میں عامیانہ کیفیت نہ ہو ، اگرچہ ایسا کلام سر انجام ہونا مشکل ہے تا ہم شاعر کو ژولیدہ بیانی اور ابہام سے گریز کرنا چاہیے ۔ جہاں تک ممکن ہو کلام کو روز مرہ کی بول چال کے قریب ہونا چاہیے ۔ ابنِ رشیق (العمدہ ص ۱۰۳) کے نزدیک بہترین شاعری وہ ہے جو مطلب کو پہنچا دے ۔ در اصل سادگی سے مراد اظہارِ بیان کی سادگی اور خیالات کی سادگی دونوں ہیں ۔ یعنی دونوں صورتوں میں الجھاؤ کلام کو سادگی سے دور کر دے گا ، لیکن شعراء کی انفرادیت اور دقّتِ نظر بسا اوقات اس اصول کو برتنے سے قاصر نظر آتی ہے ۔

کیونکہ انہیں اپنے نئے خیالات کے لیے نئے سانچوں کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ اس طرح شاعر کی زبان سمجھ میں آ جانے کے باوجود عوام کی زبان سے الگ رہتی ہے۔ اصلیت سے مراد بھی یہ ہے کہ کلام کا رجحانِ غالب صداقت جذبات کی طرف ہونا چاہیے۔ اصلیت سے اس کا مفہوم ادا نہیں ہوتا، کیونکہ حالی کے یہاں یہ تصور simple ملٹن کے اس فقرے سے آیا تھا⁽¹⁾ Poetry is simple, sensuous and passionate۔

ملٹن کے نزدیک اصلیت سے وہ بے ساختگی مراد ہے جس میں اثر پذیری ہو اور اس کی بنیاد رنگینی پر ہو، چونکہ شاعر کی شاعری میں اس کا وجدان بھی شامل ہوتا ہے، اس لیے اس کی تخلیقی صلاحیت جذبات و احساسات کو اصلیت کا رنگ دینے کے لیے واقعات میں رومانیت کی روح کو بیدار کرتی ہے اور یہی اس کی انفرادیت ہے۔ ایک حقیقی شاعر رومانی بھی ہوتا ہے اور فلسفی بھی۔ حالی کے نظریۂ شعر میں سب سے بڑی خامی یہی ہے کہ وہ احساسی تاثر یعنی رنگینی کو نظر انداز کر جاتے ہیں، جو شاعرانہ کیفیت پیدا کرنے میں بہت ضروری ہے۔ لیکن حالی اس نکتہ تک ضرور پہنچ گئے کہ اردو شعراء مبالغہ کی کثرت سے شعر کی اثر پذیری کو کم کر دیتے ہیں، اور اس طرح sensuous کے غلط ترجمہ کے باوجود وہ شعر میں واقعیت کے مفہوم کو کسی حد تک واضح کرنے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ اس فقرہ کا تیسرا لفظ passionate ہے جس کا ترجمہ حالی نے جوش کیا ہے۔ لفظ یہ بھی در اصل تاثیر کے بجائے استعمال ہوا ہے، جس سے مراد بیانِ واقعہ میں مقتضائے فطرت اور نفسِ موقع کا لحاظ رکھنا اور اندازِ بیان میں سچے جذبات کو برتنا ہے۔ انہوں نے اپنے خیالات کا نچوڑ نیچرل شاعری کے نظریہ میں پیش کر دیا ہے۔ ان کے نزدیک "نیچرل شاعری سے مراد وہ شاعر ہے جو لفظاً و معناً دونوں حیثیتوں سے نیچرل یعنی فطرت و عادت کے موافق ہو، یعنی خیالات الفاظ اور اندازِ بیان میں کسی قسم کی الجھن نہ ہو جو سمجھنے میں رکاوٹ بنے۔ اس طرح حالی کی نیچرل شاعری وہ شاعری ہے، جس میں سادگی، سوز و گداز، دل کشی اور حسن کا امتزاج نظر آئے۔

مقدمہ کا دوسرا حصہ اصنافِ سخن کی اصلاح سے متعلق ہے اس میں غزل، قصیدہ، مرثیہ اور مثنوی کے قدیم سرمایہ پر نظر ڈالی گئی ہے اور اس کی اصلاح و ترقی کے لیے مشورے دے گئے ہیں۔ ان تمام اصناف میں سب سے زیادہ توجہ غزل کی طرف دی گئی ہے، کیونکہ غزل ہی اردو شاعری کی سب سے اہم صنف سمجھی جاتی تھی اور اسی پر سب سے زیادہ برے اثرات پڑے تھے۔ حالی نے جب یہ فیصلہ کیا تھا کہ "ہماری شاعری

---

(۱) Mathew Arnold نے Keat پر جو مضمون لکھا ہے اس میں ملٹن کے قول کو اس طرح لکھا ہے "Poetry Simplesensous and impassioned" (Essays in Criticisom second series)

بگڑی اور خوب بگڑی اور اس کا اثر ہمارے اخلاق پر وہی ہوا جیسا ہوائے سمی کا اثر صحتِ جسمانی پر ہوتا ہے"، تو ان کی مراد غزل ہی سے تھی ۔ حالی نے جب ۱۸۵۷ء کی تبدیلی کے بعد حالات کے بدلنے کے ساتھ غزل پر نگاہ ڈالی تو انھیں بعض باتیں نا قابلِ عمل ، بلکہ بحیثیتِ مجموعی یہ سارا میدان بہت تنگ نظر آیا ۔ اس لیے حالی کی اصلاحِ غزل کی تحریک کو اسی بدلتے ہوئے رجحانات کی روشنی میں دیکھنا چاہیے ۔ ان کے مشوروں کا لبِ لباب یہ تھا کہ غزل کو بہ اعتبارِ اسلوب اور مضامین زندگی کی طرح وسیع اور متنوع ہونا چاہیے ۔ غالباً حالی کا سب سے بڑا اعتراض روایتی عشق پر تھا ۔ ویسے اگر ان اعتراضات کا دائرہ آگے بڑھایا جائے ، تو حالی کے اس فیصلہ پر مشکل سے عمل در آمد ہوا ۔ زندگی کیسی ہی سائنسی اور تکنیکی ہو جائے ، جذبات سے خالی نہیں رہ سکتی ۔ حالی کے ان مشوروں پر مختلف قسم کے ردِ عمل ہوئے ۔ یعنی ایک طرف غزل کا دائرہ وسیع ہو گیا ، اس میں تنوع اور رنگا رنگی پیدا ہوئی ، اس کی علامتیں زیادہ جامع حیثیت سے برتی گئیں ، دوسری طرف ان کے اس نظریہ کو نا قابلِ التفات بھی سمجھا گیا ۔ 'اردو غزل' کے مصنف ڈاکٹر یوسف حسین خان ان کے نظریہ کو سطحی سمجھتے ہیں ۔ وہ لکھتے ہیں : "مولانا حالی نے غزل پر جو نکتہ چینی کی ہے ، وہ اصلاحی محرکات کے تحت تھی ۔ انھیں ادبی معاصرین کے تحت غزل پر سب سے بڑا اعتراض یہ تھا ، کہ یہ حسن و عشق کے معاملات کی شاعری ہے ، عشق ، عمل اور اخلاق کو خراب کرنے والی چیز ہے اس سے جتنا بھی اجتناب کیا جائے ، اتنا ہی قوائے صالح کی ترقی کا موجب ہوگا ، کہ یہ بیکاری کا مشغلہ ہے ۔ لیکن یہ نقطۂ نظر بالکل صحیح نہیں تسلیم کیا جا سکتا ، کیونکہ غزل ایک سانچہ بھی تسلیم کیا جا سکتا ہے جس میں متنوع مضامین اور تجرباتِ حیات کا مؤثر بیان سما سکتا ہے" ۔

مرثیہ

اردو میں مرثیہ کا اطلاق زیادہ تر شہدائے کربلا اور ان کے مصائب کے بیان پر ہے ۔ ان مراثی کے لکھنے کا محرک مذہبی جذبہ اور عقیدہ ہے یہ مراثی ایک مخصوص روایت اور انداز سے لکھے گئے ، صرف مصائب ہی نہیں بلکہ بے شمار مضامین اس کا جزو بن گئے ۔ لیکن حالی کا مرثیہ کے سلسلہ میں نقطۂ نظر یہ ہے کہ مرثیہ میں فضائلِ انسانی کے بیان میں مافوق الفطرت عناصر سے کام لینے کے بجائے ، انسانی سطح پر اظہار کرنا چاہیے ۔ گویا حالی مرثیہ برائے گریہ کے قائل نہیں تھے ۔ متوفی کے فضائل لوگوں کے لیے سبق کا کام دے سکیں ، اگرچہ وہ میر انیس اور مرزا دبیر کی ان کاوشوں کے قائل تھے جو انھوں نے مرثیہ کے فن میں انجام دی ہیں ۔ کہتے ہیں : "بہر حال ہم میر انیس کے

مرثیہ اور نئی طرز کی مرثیہ گوئی کو دل سے داد دیتے ہیں ۔ لیکن نئی دھن کے شاعروں کو ہرگز یہ صلاح نہیں دیتے کہ مرثیہ گوئی میں ان کا با اور مرثیہ گویوں کا اتباع کریں"۔ یہ صحیح ہے کہ انیس جیسے صاحب کمال مشکل سے پیدا ہوتے ہیں ، لیکن حالی کا اصل منشا کسی شخصیت سے متاثر ہونے کی بجائے ان کمالات اور فضائل سے تاثر لینا تھا جو مرنے والے کے ساتھ وابستہ تھے ۔ حالی کی نگاہ میں عربی مراثی کا طرۂ امتیاز ان کا خلوص اور جوش تھا ۔ سعدی کا مرثیہ زوال بغداد پر جو در حقیقت مسلمانوں کے لٹے ہوئے قافلہ اور اسلام کی گذشتہ شوکت کا ماتم تھا ، ان کے لیے بصیرت اور عبرت کا سامان رکھتا تھا ۔ وہ اردو مرثیہ میں بھی یہی لے پیدا کرنا چاہتے تھے اور اس کے اخلاقی اور افادی پہلو پر زیادہ نظر رکھتے تھے نہ کہ جذباتی پہلو پر ۔

حالی مرثیہ کی طوالت اور لمبی لمبی تمہیدوں کے قائل نہیں ، وہ تو در اصل تہذیبی قدروں اور انسانی فضیلتوں کا ماتم کرتے ہیں ۔ خود انہوں نے مرزا غالب ، حکیم محمود خاں اور سر سید احمد خاں کے بے مثال مراثی لکھے ہیں ، جن کی بنیاد درد و غم ، دنیا کی بے ثباتی ، قدروں کا ماتم ، ذاتی تعلقات ، شخصی فضائل اور ملت کے عروج و زوال اور اس کے احساس پر رکھی ہے ۔ یہ مراثی وقت کے اہم تقاضے کو پورا کرتے ہیں اور آنے والی نسلوں پر اثرات بھی چھوڑ جاتے ہیں ۔ اقبال نے داغ دہلوی اور سر راس مسعود کے ، عزیز لکھنوی نے نواب وقار الملک کا ، سید سلیمان ندوی نے اپنے استاد مولانا شبلی کا ، اسماعیل میرٹھی ، احسن مارہروی ، سید ہاشمی فرید آبادی اور حفیظ جالندھری نے خود حالی کے سے درد انگیز مرثیے لکھے ۔ یہ سلسلہ آگے بڑھتا رہا اور بہت سے عالموں ، شاعروں ، ادیبوں اور مشاہیر قوم کے مراثی لکھے گئے اور آنے والی نسلوں نے ان کے اثرات قبول کیے ۔

مثنوی

مسلسل واقعات بیان کرنے کے لیے یہ صنف سب سے زیادہ آمدکار ہے ۔ وہ جب اردو مثنوی پر نگاہ ڈالتے ہیں تو انہیں مایوسی ہوتی ہے ۔ کیونکہ بجز دو ایک کے ساری مثنویوں کا موضوع عشقیہ ہے ۔ چونکہ یہ صنف تاریخی ، تمدنی ، اخلاقی ، مذہبی اور سیاسی مسائل بیان کرنے کے لیے نہایت موزوں ہے ، اس لیے وہ چاہتے ہیں کہ اس میں ربط کلام ، نیچرل کیفیت ، مبالغہ سے اجتناب ، برجستگی ، صفائی بیان اور مقتضائے حال کا خیال رکھنا ضروری ہے ۔ انہوں نے اشعار کے حوالوں سے قدیم مثنویوں اور خاص کر 'گلزار نسیم' کے حسن و قبح پر بحث کی ہے اور یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اردو مثنویوں کا سرمایہ کچھ زیادہ قابل اطمینان نہیں ۔ حالی کے بعد شوق قدوائی ، اقبال ، جوش اور حفیظ جالندھری نے بعض قابل قدر نمونے چھوڑے ہیں ۔ بقول مولانا احسن مارہروی "نئی مثنوی میں

مبالغہ کا دور ختم ، استعارے ندارد اور تمام قدیم تمہیدیں (حمد و نعت) نکال دی گئیں ، بلکہ معنوی خوبیوں پر زور دیا گیا ۔ اخلاقی ، فطری ، تاریخی ، اور قومی عنوانوں کو موضوعِ کلام بنایا گیا" ۔

مجموعی تاثر

'مقدمۂ شعر و شاعری' کی اہمیت کا عام طور پر اعتراف کیا جاتا ہے ۔ یہ اردو میں پہلی تنقیدی کتاب ہے ۔ باوجود مغربی علوم و فنون کے چرچے کے اب تک کسی نے اس سے بہتر تنقیدی صحیفہ پیش نہیں کیا ۔ یہی اس کی عظمت ہے ۔ حالی سے بعض فروگذاشتیں ضرور ہوئی ہیں ، لیکن ان کا مقصد اردو شاعری کے لیے اصلاحی تجاویز پیش کرنا تھیں ، خوبیاں گنانا نہیں ۔ تاہم مقدمہ کے اس رخ کی کمزوری پر نگاہ ضرور جاتی ہے کہ اردو میں صوفیانہ شاعری ، طنزیہ شاعری ، مذہبی شاعری ، نظیر اکبر آبادی کی شاعری اور دکنی شاعری کا ایک حصہ ضرور ایسا تھا جو قابلِ اعتنا سمجھنا چاہیے تھا ۔ شاید اس طرح حالی کو اپنی بات سمجھانے میں زیادہ آسانیاں پیدا ہو جاتیں ۔ پھر بھی 'مقدمہ' کو حالی کی تنقیدی بصیرت کا مظہر ہونے کے ساتھ ساتھ جدید اردو تنقید کا منشور سمجھنا چاہیے ، جس کے سہارے اردو تنقیدی بصیرت کے لیے راستہ کی تلاش کا شعور پیدا ہوا اور اس پر ایک بلند عمارت کی تعمیر شروع ہوئی جو برابر اونچی اٹھتی جا رہی ہے ۔

مقالہ نگاری

اردو میں مقالہ نگاری کے باوا آدم سر سید ہیں ۔ انہوں نے سب سے پہلے مختلف موضوعات پر مقالے لکھے اور اردو زبان کو ایک نئے اسلوب اور امکان سے آشنا کیا ۔ انہوں نے 'تہذیب الاخلاق' کے ذریعہ نہ صرف خود مختلف موضوعات پر قلم اٹھایا ، بلکہ مقالہ نویسی کے فن کو آگے بڑھایا ۔ حالی اور دوسرے مشاہیرِ ادب کا تعاون بھی حاصل کیا ، حالی نے جو مقالات لکھے ان میں بھی موضوع کا تنوّع موجود ہے ۔ یہ مقالے دو حصوں میں انجمنِ ترقیٔ اردو سے ۱۹۳۵ء میں شائع ہو گئے تھے ۔ ان مقالات کو بہ اعتبارِ موضوع کئی حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ۔ علمی ، ادبی ، سوانحی لیکن ان کا مرکزی خیال قومی اور اخلاقی مسائل ہیں ۔ یہ مقالات انیسویں صدی کے نصف آخر کی تمدنی تاریخ کو سمجھنے کے لیے بہت ضروری ہیں ۔ ان میں زمانہ ، مزاج ، الدین یسر ، زبان گویا[1] ،

---

(۱) حالی کا زبان گویا ۱۸۹۸ء میں شائع ہوا ، محمد علی طبیب کا ناول جعفر و عباسہ ۱۸۹۱ء میں شائع ہوا ، اس کے پہلے باب میں زبان ، کے متعلق اظہار خیال کیا گیا ہے ۔ "اسی زبان سے آدمی آدمی کا دوست اسی سے اچھا اسی سے ہے اسی سے مومن اور اسی سے کافر ہو جاتا ہے" ۔ موضوع اور خیالات کی کہیں کہیں مماثلت کے باوجود دونوں کے انداز بیان میں بہت بڑا فرق ہے ۔ حالی کے یہاں جو آمد اور سلاست ہے وہ محمد علی طبیب کے یہاں نہیں ۔

پر ہماری نگاہیں ٹھہر جاتی ہیں - 'الدین یسر' میں حالی نے دین کی سہولتوں پر زور دیا ہے، لیکن اس میں آیات و حوالوں کی کثرت کی وجہ سے روانی باقی نہیں رہی - 'زبان گویا' ایک تمثیلی مضمون ہے، جس میں مصنف کی خیال انگیزی قابل داد ہے جس میں قوت گویائی کے جوہر کو بڑی خوبی سے اجاگر کیا ہے - مضمون کی ابتداء اس طرح ہوتی ہے:
"اے میری ہزار داستان، اے میری بلبل ہزار داستان، اے میری طوطیٔ شیریں بیان، اے میری قاصد، اے میری ترجمان، اے میری وکیل، اے میری زبان سچ بتا تو کس درخت کی ٹہنی اور کس چمن کا پودا ہے . . . . کبھی تو ایک ساحر فسوں ساز ہے، جس کے سحر کا نہ درد، نہ جادو کا اتار، کبھی تو ایک افعیٔ جانگداز ہے، جس کے زہر کی دارو، نہ کاٹنے کا منتر" ! یہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے اردو میں واحد مضمون ہے اور ادبی خوبیوں کے لحاظ سے اردو میں اہم چیز ہے -

مقالات کے دوسرے حصہ میں تبصرے، خطبات اور لیکچر شامل ہیں - تبصروں میں آزاد کی 'آب حیات' اور 'نیرنگ خیال'، 'حیات النذیر' اور ذکاء اللہ کی 'تاریخ ہندوستان' اہم ہیں - 'آب حیات' اور 'نیرنگ خیال' پر تبصرے علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ میں شائع ہوئے تھے - آزاد کی جانب داری اور طرز انشائیہ، طبقہ پنجم کا مومن اور میر ممنون کے ذکر سے خالی ہونا، انہیں تبصروں میں سب سے پہلے ظاہر ہوا - ہمدردی پر لیکچر ایجوکیشنل کانفرنس کراچی منعقدہ ۱۹۰۷ء کا خطبۂ صدارت جس میں مسلمانوں کی تعلیمی حالت پر روشنی ڈالی گئی ہے - قابل ذکر ہیں -

خطوط نویسی

حالی کے مکاتیب ان کے فرزند، خواجہ سجاد حسین نے مولوی عبدالحق کے مقدمہ کے ساتھ شائع کر دیے ہیں - حالی کے خطوط میں وہی سادگی، محبت اور توازن ملتا ہے جو ان کی شخصیت اور اسلوب کی خصوصیت ہے - ان خطوط میں اگرچہ نجی حالات، خاندانی کوائف، دوستوں اور شاگردوں کا ذکر ملتا ہے، اس سلسلہ سے حالی کے خط اور سر سید کے خط ایک ہی زمرہ میں شمار کیے جا سکتے ہیں، کیونکہ حالی کے خطوں میں رازہائے دروں اور ذاتی تاثرات کی کیفیت نہیں، بلکہ قومی دل سوزی، درد مندی زیادہ ہے - یہ خط خلوص کا مرقع ہوتے ہوئے بھی ان میں وہ تاثیر نہیں جو خطوط کو مقالہ اور مضمون سے الگ کرتی ہے - پھر بھی جب دو آدمی آپس میں باتیں کرتے ہیں اور اپنا حال دل بیان کرتے ہیں تو اس میں کچھ نہ کچھ ذاتی عنصر داخل ہو جاتا ہے - اس خصوصیت کی بناء پر حالی کے خطوط بھی خطوط کے دائرہ میں آ جاتے ہیں - اگرچہ ان میں شخصی جذبات نہیں ہیں، پھر بھی وہ حالی کی روح کے ترجمان ہیں -

۱۳۔

اسلوب بیان

بحیثیت صاحب طرز ادیب کے حالی اس زمرہ میں نہیں آتے جس میں آزاد ، نذیر احمد اور شبلی کا شمار ہوتا ہے ۔ ان میں آزاد کی رنگینی ، نذیر احمد کی شوخی اور شبلی کی لطافت نہیں ، لیکن ایک چیز ایسی ضرور ہے جو ان میں سے کسی میں نہیں ، وہ ہے حالی کی سادگی اور صفائی بیان ۔ اگر نثر کا مقصد یہ ہے کہ وہ انسان کے خیالات کی صحیح ترجمان بنے ، یعنی جو کچھ دل میں ہو وہی کاغذ پر اترے تو پھر حالی کو بھی ایک صاحب طرز نثر نگار تسلیم کرنا پڑے گا ۔ حالی نے ہماری علمی نثر کے لیے جو راستہ ہموار کیا اس پر چل کر ہم اپنی زندگی کی تمام ضرورتوں کو پورا کر سکتے ہیں ۔ حالی نے 'حیات سعدی' ، 'یادگار غالب' ، 'مقدمہ شعر و شاعری' اور 'حیات جاوید' میں جو زبان لکھی ہے اس میں ایک ارتقائی کیفیت موجود ہے ۔ 'یادگار' کی زبان 'حیات سعدی' کے مقابلہ میں زیادہ صاف اور واضح ہے ۔ 'مقدمہ' کی زبان در اصل تنقید کی معیاری زبان ہے ۔ اس میں اصطلاحات کے استعمال کے باوجود حالی نے نہ تو بے کیفی پیدا ہونے دی ، نہ سنجیدگی اور متانت پر حرف آنے دیا اور نہ زبان کسی جگہ الجھنے پائی ہے ۔ 'حیات جاوید' میں بعض فنی نقائص پیدا ہو گئے ہیں ، جملوں کی طوالت ، الفاظ کی تکرار ، ان میں سب سے نمایاں ہے ، پھر بھی پختگی اور وضاحت کی صفات اس میں پوری طرح موجود ہیں ۔ بے نمکی ، یکسانیت حالی کی نثر کی بڑی کمزوریاں بتائی جاتی ہیں ، لیکن جوں جوں زمانہ گزرتا جائے گا اور ہمارے ادبی ذوق پر رنگین اور دلفریب اسالیب کا اثر کم ہوتا جائے گا اور ہماری علمی ضرورتیں بڑھتی جائیں گی ۔ ہم حالی کی نثر کے نہ صرف قائل ہوتے جائیں گے بلکہ اس سے قریب ہوتے جائیں گے ۔ حالی کی نثر ہمارے لیے مستقبل میں ایک اچھے اسلوب نگارش کے لیے راستہ ہموار کرتی ہے اور یہی اس کی سب سے بڑی عظمت ہے ۔

پانچواں باب

سید اکبر حسین اکبر

سید اکبر حسین اکبر ۱۸۴۶ء میں الہ آباد کے ایک قصبہ بنام بارہ میں پیدا ہوئے ۔ باپ کا نام سید تفضّل حسین تھا ۔ انہیں علومِ مشرقیہ پر کافی دسترس حاصل تھی اور اکبر کی ابتدائی تعلیم ان ہی کی زیرِ نگرانی گھر پر ہوئی ۔ سید تفضّل حسین انگریزی بالکل نہیں جانتے تھے ، اور اکبر نے جو کچھ انگریزی سیکھی ، وہ بطورِ خود حاصل کی ۔ بعد میں دورانِ ملازمت انہیں اس پر اتنا عبور حاصل ہو گیا تھا کہ بحیثیتِ جج عدالتی فیصلے انگریزی میں لکھ لیتے اور اعلیٰ درجے کی انگریزی تصانیف کے مطالب اخذ کر لیتے ۔

اکبر ابھی پندرہ سال ہی کے تھے کہ ان کی شادی ہو گئی اور انہیں ملازمت کی تلاش ہوئی ۔ پہلے پہل ۱۸۶۶ء میں معمولی مشاہرے پر محکمۂ ریلوے میں بحیثیتِ کلرک ملازم ہوئے ۔ ایک سال بعد وکالت درجہ سوم کا امتحان پاس کیا اور تقریباً دو سال وکالت کی ۔ ۱۸۶۹ء میں عارضی طور پر نائب تحصیلدار ہوئے اور پھر ہائی کورٹ میں مثل خوان ہو گئے ۔ یہاں نجی طور پر انگریزی اور قانون کا مطالعہ جاری رکھا اور ۱۸۷۳ء میں ہائی کورٹ کی وکالت کا امتحان پاس کر لیا ۔ تھوڑے عرصے بعد منصف ، پھر سب جج اور پھر جج کے عہدہ پر فائز ہوئے ۔ ۱۹۰۵ء میں بعہدہ ججی عدالتِ خفیفہ سے پنشن پر سبکدوش ہوئے ۔ ۱۹۰۷ء میں ان کی سرکاری خدمات کے صلے میں خان بہادر کا خطاب ملا ۔ ۱۹۱۰ء میں ان کی بیوی کا انتقال ہوا اور تین سال بعد ان کا چھوٹا بیٹا ہاشم ، جو اب ان کی زندگی کا واحد سہارا تھا ، بعارضۂ چیچک چل بسا ۔

اس سے اکبر کو ، ظاہر ہے بہت صدمہ ہوا ۔ اس کے بعد زندگی کے آخری آٹھ سال رنج و محن اور علالت کی ایک مسلسل داستان ہیں ۔ اس کا اندازہ نہ صرف ان کی زندگی کے آخری دس سال کے کلام سے ہوتا ہے جس میں ان کا مخصوص مذاحیہ رنگ قریباً قریباً ناپید ہے ۔ دنیا کی بے ثباتی اور صبر و رضا کے مضامین بکثرت ملتے ہیں بلکہ ان کے مکاتیب سے بھی ہوتا ہے ۔ جن میں افسردگی اور علالت کے طویل بیانات کے سوا اور کچھ نہیں ملتا ۔

ان کا انتقال ۹ دسمبر ۱۹۲۱ء میں الہ آباد میں ہوا اور وہیں مدفون ہوئے ۔

جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے ، اکبر کی زندگی کے آخری سال تنہائی میں گذرے ۔ پرانے احباب و رفقاء یا تو مر چکے تھے یا بہت دور تھے اور انہیں غم غلط کرنے کے بہت کم مواقع میسر تھے ۔ ان کے بڑے بیٹے حسین سرکاری ملازم تھے اور قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ باپ بیٹے میں وہ بے تکلفی اور وہ گہرا تعلق نہ تھا جس سے تنہائی کے شدید احساس کا تدارک ہو سکے ۔

اکبر کی شاعری کے مجموعی تاثر سے یہ گمان ہوتا ہے کہ انہیں مذہب سے فطری لگاؤ تھا اور اس نے انہیں شروع ہی سے زندگی کے سنجیدہ مسائل میں انہماک رہا ہوگا ۔ لیکن ان کی زندگی کے واقعات سے اس کی توثیق نہیں ہوتی ۔ معلوم ہوتا ہے کہ اکبر کے ایام جوانی رنگین مشغلوں میں گذرے ۔ اس کا ثبوت نہ صرف معاصر شواہد سے ملتا ہے ، بلکہ ان کے ابتدائی کلام میں بھی اس کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں ۔ یہ مشاغل جن میں طوائف سے راہ و ربط کے اشارے بھی آئے ہیں ، بیس سال کی عمر تک جاری رہے اور پھر ان کی طبیعت میں متانت آنے لگی اور وہ آہستہ آہستہ ان مشاغل سے دست بردار ہو گئے ۔ ان کے ابتدائی کلام میں مغربی تہذیب کی مذمت یا تضحیک میں کوئی گہرا جذبہ یا اعتقاد کار فرما نہ تھا ۔ بلکہ ایسے اشعار محض تفنن طبع کے طور پر کہے جاتے تھے ۔ جیسا کہ آگے چل کر بتایا جائے گا ان دنوں تعلیم یافتہ لوگوں کی ایک بڑی جماعت کا یہی ڈھنگ تھا اور ان کی دیکھا دیکھی اکبر نے بھی ان ہی کا شعار اختیار کر لیا تھا ۔

اکبر کے ماحول کا ذکر بعد میں آئے گا ۔ یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں وہ 'اودھ پنچ' سے بہت متاثر ہوئے ۔ یہ اخبار سیاست میں آزاد خیالی اور حکومت پر حرف گیری اور تہذیب و معاشرت میں تنقید کا حامی تھا ۔ اس کا لب و لہجہ مذاحیہ تھا ۔ جس میں معاشرت ، ذاتیات اور تمسخر کو دخل تھا ۔ اکبر کی شاعری کا آغاز اس اخبار کے زیر اثر ہوا اور ان کے اشعار مدت تک اس میں چھپتے رہے ۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ اکبر کا مذاحیہ رنگ اس اخبار کی پیداوار ہے بلکہ یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ ان کے مذاحیہ رنگ طبیعت کو اس اخبار میں جولانیاں دکھانے کے موقعے میسر آئے ۔ اکبر نے اپنی لمبی نظم 'نامہ بنام اودھ پنچ' میں اس اخبار کی سیاسی ، سماجی اور ادبی خدمات کا بر زور الفاظ میں اظہار کیا ہے ۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں :

یہ خلقِ خدا قتیل اس کی

حاسد کا حسد دلیل اس کی

معقول مزاح ہے تو یہ ہے
شرعاً جو مباح ہے تو یہ ہے

ہر چند کہ زجر بیشتر ہے
گو فتنۂ طعن بیشتر ہے

لیکن وہ قید میں کھلا ہے
یہ آبِ حیات میں دھلا ہے

وہ شربتِ حفظِ عقل و ایمان
یہ مردہ دلوں کو ہے رگِ جان

بگڑے ہوئے بن گئے ہیں
حکمت ہے تو ایسی دل لگی میں

ہر چند کہ سرمہ در گلو ہے
تاہم سر گرمِ گفتگو ہے

پھندگیوں میں حرفِ رل ہے
شانہ کشِ گیسوئے سخن ہے

واں شاخِ شجر پہ ہے ترانہ
یاں دبدبہ و دام آشیانہ

کیوں کر نہ ہو ادعائے اعجاز
کھولے ہیں قفس میں بالِ پرواز

ہے نوکِ لساں پہ نقش پرواز
رقصاں دمِ تیغ پر بصد ناز

ایک اور واقعہ جس نے انہیں مغرب سے دل برداشتہ کر دیا ، ان کے بیٹے عشرت کی انگلستان میں طویل اقامت تھی ، جو باپ کے لیے صبر آزما بلکہ متوحش ثابت ہوئی ۔ عشرت کو وہاں بغرض تعلیم بھیجا گیا تھا ۔ وہاں انہیں ایک انگریز خاتون سے محبت ہو گئی اور ان کی دلچسپی اس میں اتنی بڑھ گئی کہ وہ کامل چھ سال تک وہیں مقیم رہے ، حالانکہ انہیں صرف تین سال کے لیے بھیجا گیا تھا ۔ اس سے نہ صرف والد کو صدمہ ہوا ، بلکہ مغربی تہذیب کی بابت ان کے شبہات اور زیادہ مستحکم ہو گئے ۔ انگریز لڑکیوں کی عیاریاں اور ہوش ربا دلفریبیوں کی بابت جو اشارات اور بیانات ان کے کلام میں ملتے ہیں ، بیشتر اسی تلخ تجربہ کا ثمر ہیں ۔

طبیعت کا رنگ

اگر اکبر کی طبیعت کا غور سے تجزیہ کیا جائے، تو اس میں مختلف النوع عوامل یا رجحانات مصروف کار دکھائی دیتے ہیں، جن کے عمل اور ردِ عمل سے اس کی طبیعت تشکیل ہوتی ہے۔ ان اجزائے ترکیبی میں تصوّف کو مرکزی مقام حاصل ہے۔ تصوف کیا ہے؟ اس موضوع پر اس تصنیف کی پہلی جلد میں سیر حاصل بحث ہو چکی ہے، اور اس کے اعادے کی یہاں ضرورت نہیں۔ فقط یہ بتا دینا ضروری ہے کہ حقیقتِ عالم کے انکشاف کے لیے صوفیہ عقل و استدراک کی بجائے بصیرت، جذبہ اور وجدان کا سہارا لیتے ہیں۔ نظرِ ظاہر بین کو موجودات میں صرف مادہ ہی مادہ دکھائی دیتا ہے اور وہ سمجھتی ہے کہ مادہ ہی سب کچھ ہے۔ اس کے برعکس وجدان کی حالت میں صوفیہ پر یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ مادہ سے ماورا ایک روحانی عمل ہے، جو ہر جگہ جاری و ساری ہے اور در حقیقت وہی روحِ کائنات ہے۔

اکبر کا تصوف کی طرف شروع ہی سے رجحان رہا اور جوں جوں وقت گزرتا گیا، اس میں ان کا انہماک ترقی کرتا چلا گیا۔ حسن نظامی کو اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

> "تصوف اور بے خودی کے ذکر میں جو لذت ہے اسی کی گود میں میرا خیال پلا ہے اور میرے نزدیک تو سارے معانی اسی میں ہیں۔ کوئی فلسفہ اس کے خلاف ہو تو ہم کو ہرگز اس سے دلچسپی نہیں ہو سکتی اور ہم اس کو صریح غلط سمجھیں گے"۔

اکبر کی رائے میں اسلام سراسر تصوف ہے بلکہ جب اقبال نے 'اسرارِ خودی' میں تصوف پر معاندانہ تنقید کی اور اسے مسلمانوں کے انحطاط کا سبب قرار دیا تو اکبر کو بڑا صدمہ ہوا۔

تصوف دراصل عقلیت کے خلاف احتجاج ہے۔ اکبر کو عقلیت یعنی سائنس اور فلسفہ کی خدمات کا احساس ہے، بشرطیکہ وہ اپنے معیّن احاطہ میں سرگرمِ عمل رہیں۔ لیکن جب وہ عالمِ محسوسات سے متجاوز ہو کر روحانیات میں مداخلت کرتے ہیں، تو حقیقت پر پردے پڑ جاتے ہیں اور اس کا نتیجہ تشکک اور انکار کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ اکبر نے فلسفہ اور سائنس کی سیاہ کاریوں کا ذکر بار بار اور نہایت پر زور الفاظ میں کیا ہے:

کچھ نہیں کارِ فلک حادثہ پاشی کے سوا
فلسفہ کچھ نہیں الفاظ تراشی کے سوا

انکشافِ رازِ ہستی عقل سے ممکن نہیں
متصل ہو سطح باہر سے یہ وہ باطن نہیں

☆ ☆ ☆

ادراک نے آنکھیں شبِ اوہام میں کھولیں
واقف نہ ہوئی روشنی صبحِ ازل سے

☆ ☆ ☆

حواس و فہم میں الجھے ہوئے ہیں
برات و سہم میں الجھے ہوئے ہیں
خدا تک ہے رسائی سخت دشوار
ہم اپنے وہم میں الجھے ہوئے ہیں

اکبر مغربی تہذیب کو ایک صوفی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں ۔ اس لیے انہیں اس کی کوتاہیوں کا شدت سے احساس ہے ۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ مغربی تہذیب سراسر مادی ہے اور اسے روحانیت سے کوئی واسطہ نہیں ۔ بات یہ ہے کہ یورپ میں انیسویں صدی میں عقلیت کا دور دورہ تھا اور جب مغربی تہذیب کا ہمارے ہاں رواج ہوا تو اس کا مادی پہلو پیش پیش تھا چنانچہ اس کا ہماری ذہنیت پر گہرا اثر پڑا ۔

اکبر کی نظر میں سائنس اور فلسفہ کی ترقی اور اس کا ہماری اخلاقی اقدار اور وجدانات سے تصادم اور ان پر غلبہ ، ہماری زندگی کا سب سے بڑا المیہ ہے ۔ لہذا انہوں نے اپنی تمام تر توجہ اپنی قوم کو اس کے خطرات سے آگاہ کرنے میں صرف کی :

خضر سمجھے ہو جسے غولِ بیابانی ہے
غلط امید کے جنگل میں تھکا مارے گا

اس قسم کے بیسیوں اشعار میں انہوں نے اپنی قوم کو مادیت کے آنے والے خطروں سے آگاہ کیا ۔ قوم کی ذہنیت پر مغربی تہذیب کے اثرات سے جو ناخوشگوار نتائج مرتب ہوئے، ان کا ذکر ذیل کے اشعار میں ہوتا ہے :

ہیں ہوا پر کفر کے بازو پریشاں ان دنوں
کوئے دل میں کیوں کر آئے نورِ ایماں ان دنوں

علمِ دین مقصود ہے گم ہے صراطِ مستقیم
خضرِ راہ بنتا ہے ہر غولِ بیاباں ان دنوں

شارحِ دیوانِ ہستی ہے قیاسِ مغربی
حسنِ فطرت بے حجاب روئے یزداں ان دنوں

تصوف کا تعلق صرف مافوق الطبیعات اور اعتقادات ہی سے نہیں، اس کا اخلاقیات سے بھی گہرا رشتہ ہے اور تکمیلِ حیات اور عروجِ روحانی کے لیے اسے اولیت حاصل ہے۔ تصوف کا ایک اہم پہلو مبالغہ سے اجتناب ہے۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ انسان دنیا کو تج کر گوشہ نشینی اختیار کر لے، جیسا کہ انحطاط دورِ تصوف نے اس کی تعبیر (میر کی دنیاداری سے) کی ہے۔ اسی طرح ضروریاتِ حیات کی تحصیل اور بقا سے خود داری کے اہتمام کے لیے سرگرمِ عمل ہونا لازمی ہے، لیکن ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے اور دنیا میں شدید انہماک اور مادی فوائد کے لیے اخلاق اقدار کو نظر انداز کرنا نہایت معیوب ہے۔ اکبر دنیا میں تگ و دو کے حامی ہیں وہ حصولِ دولت، کامرانی، شہرت، خطابات، حکومت سے دوستانہ تعلقات کے خلاف نہیں، لیکن ان کے حصول کی سعی میں عزتِ نفس، خود داری کی پرواہ نہ کرنا، اس کے نزدیک انسانیت کے اعلیٰ معیار سے گر جانے کے مترادف ہے۔ ان کی تعلیمات کا لبِ لباب یہ ہے:

شہوات کی پیروی کا منصوبہ نہ ہو
دولت تری خادمہ ہو محبوبہ نہ ہو
شہرت جو کمال سے ہو پیدا ہو جائے
لیکن یہ تعلقات مطلوبہ نہ ہو

☆ ☆ ☆

خلقت جو کہیں ذلیل ہو جاتی ہے
بے عزت و بے دلیل ہو جاتی ہے
گو جسم میں ظاہرہ توانائی ہو
اخلاق میں وہ علیل ہو جاتی ہے

جس چیز سے اکبر کو روحانی کرب ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ انسان محض حصولِ جاہ و مرتبت کے لیے اپنے آپ کو ذلیل کرے اور پھر اسے موجبِ عزت و افتخار خیال کرے۔ دیکھیے

ان طنزیہ اشعار میں درد کا پہلو کتنا واضح ہے :

مرتبہ اس سے بھی دنیا میں سوا ہو آپ کا
یاد رکھیے گا کہ میں بھی ہوں دعا گو آپ کا

☆ ☆ ☆

کچھ نہ ہاتھ آئے مگر عزت تو ہے   ہاتھ اس مِس سے ملانا چاہیے

☆ ☆ ☆

مشتاق تھا ہوں در پہ حاضر ہوں میں
منظور نہیں کہ بارِ خاطر ہوں میں
حضرت کو جو فرصتِ ملاقات نہ ہو
بوسے پر آستاں کے شاکر ہوں میں

☆ ☆ ☆

کوئی کہتا نہیں سیاح ہوں خطرات کا ماہر ہوں
یہیں تک فخر کی حد ہے میں ڈپٹی ہوں میں ناظم ہوں

اکبر کو ہمیشہ اپنی عزتِ نفس کا پاس رہا :

اٹھی نگاہ دیر میں لیکن جھکا نہ سر
پیشِ صنم بھی ہم تو مسلمان ہی رہے

☆ ☆ ☆

ملک میں مجھ کو ذلیل و خوار رہنے دیجیے
آپ اپنی عزتِ دربار رہنے دیجیے

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اکبر کی رائے میں تصوف اور اعتقادات اور اخلاقیات سے براہِ راست تعلق ہے ۔ اکبر نے دیکھا کہ فلسفہ اور سائنس کی ترقی اور حصولِ مقام و دولت کی اندھا دھند کوشش اس کے ہم عصروں کو انسانیت کے ارفع مقام سے گرا رہی ہے، اس لیے انہوں نے قوم کو ان خطرات سے آگاہ کرنا اپنا فرض مقرر کر لیا ۔

اکبر کی طبیعت کا ایک اور اہم پہلو بھی ہے جس پر قنوطیت کا گمان ہو سکتا ہے ۔ ان کے کلام اور مکاتیب سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ زندگی کے خوش آئند پہلوؤں سے

کم متاثر ہوتے تھے ۔ ان کی نظر اکثر انسانی کمزوریوں ، کوتاہیوں اور زندگی کے غم آگیں پہلوؤں پر پڑتی ہے اور یہ احساس بڑھتے بڑھتے ایک آفاقی شکل بھی اختیار کر لیتا ہے ، اور وہ محسوس کرتے ہیں کہ دنیا دارالمحن ہے ، چنانچہ خوشی اور کامرانی کی حالت میں بھی ان کی طبیعت کا یہ رجحان نامرادی اور افسردگی کے مناظر سے دو چار ہو جاتا ہے ۔ اور پھر یہ احساس ان کی ذات تک محدود نہیں رہتی ، بلکہ انہیں اپنے گرد اس عالمِ کون و مکان میں فساد ہی فساد نظر آتا ہے اور تباہی کے مایوس کن مناظر ہی نظر آتے ہیں ۔ مثلاً :

زینت مقدمہ ہے مصیبت کے دہر میں
سب شمع دو جلاتے ہیں سانچے میں ڈھال کے

☆ ☆ ☆

دائرۂ گل پھول کر اس باغ سے کیا لے گئے
ہو گئے وقفِ خزاں اور داغ حسرت دے گئے

☆ ☆ ☆

نہ رہا یاد انہیں کیا ابرِ خزاں　　کیا جوانانِ چمن پھر ہیں سنورنے والے

زندگی کا کوئی سا شعبہ لے لیجیے اکبر کو اس کے قابلِ ملامت پہلو ہی نظر آئیں گے ، مگر یہ عمل سراسر اضطراری ہے ، لہٰذا اکبر کی تنقید عموماً محلِ نظر ہے ۔ ایک تو اکبر کے بیانات مبالغہ آمیز ہوتے ہیں ، بدیں وجہ ان کی تنقید کی صحت پر شبہ ہوتا ہے ۔ دوسرے اگر ان کی تنقید کو درست بھی مان لیا جائے ، پھر بھی چونکہ وہ زندگی کے صرف ایک ہی رخ پر مبنی ہے ، اس لیے اس کی تنقید یک رخی اور مبالغہ آمیز ہو جاتی ہے ۔

اکبر کے دور میں نہایت برگزیدہ ہستیاں تھیں جنہوں نے قومی خدمت اور اصلاح کا بیڑہ اٹھایا تھا اور وہ اپنے کام میں نہایت دیانت داری سے سرگرمِ عمل رہے ، مصیبتیں جھیلیں ، تکلیفیں اٹھائیں ، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اکبر کو صرف ان کی کمزوریوں کا احساس ہے ، اور ان کی وحید المثال قربانیوں میں انہیں خود غرضی اور نام و نمود کی خواہش نظر آتی ہے ۔ سیاسی بنا پر انہیں صرف گاندھی سے عقیدت ہو گئی تھی باقی سب موردِ الزام یا نشانۂ تضحیک بنائے گئے ہیں ۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اکبر کی تنقید ایک صحت مند شخص کی تنقید نہیں ۔ یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ ان الفاظ کو استعارتاً استعمال نہیں کیا گیا ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اکبر کی حساسیت کبھی کبھی اعصابی کمزوری کا رنگ اختیار کر لیتی ہے اور زندگی کے آخری ایام میں تو ان کی حالت واقعی ایک اعصابی مریض کی سی ہو گئی تھی ۔

اکبر کے مزاج کا بغور مطالعہ کرنے پر یہ شک ہوتا ہے کہ وہ اس دور کے بدلتے ہوئے حالات سے خوفزدہ رہتے تھے اور بڑھاپے میں یہ خوف حراس کی حد تک بڑھ گیا تھا اور جیسے ایک خوف زدہ شخص تو اپنے قوائے پر اختیار نہیں ہوتا اور وہ کوئی سہارا ڈھونڈتا ہے، یا اپنے آپ کو کسی طاقت سے وابستہ رکھنا چاہتا ہے ، اور نئے تجربوں یا قسمت آزمائی ، یا مخالف حالات سے مقابلہ کرنے سے گریز کرتا ہے اور مستقبل کے مقابلہ میں ماضی کا سہارا لیتا ہے ، اس لیے کہ ماضی واقعی اور موجود ہے اور مستقبل مبہم ، اور بدلتے ہوئے حالات سے اسے وحشت ہوتی ہے اسی طرح اکبر الہ آبادی شاید نئے حالات اور نئے تقاضوں سے خائف تھے ۔ اکبر کا ماضی سے رشتہ جائز بلکہ مستحسن ہے ، لیکن ان کا یہ خیال کہ صرف ماضی ہی میں سلامتی ہے اور مستقبل میں خطرہ ہے ، درست نہیں تھا ۔ اور ان کا یہ نظریہ کہ قوم کے لیے احتیاط لازمی ہے ، انسان کی تخلیقی قوتوں سے انکار کے مترادف ہے ۔ اکبر کے کلام سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک ماضی میں سب کچھ ہے اور وہ ہر عہد اور ہر حالت میں انسانی ضروریات کا کفیل اور مداوا ہو سکتا ہے ۔

اکبر میں جذبہ ہے اور وہ نامساعد حالات پر اظہارِ تاسف بھی کرتے ہیں ، لیکن آنسو بہانا ان کی طبیعت کا عمومی رنگ نہیں ۔ اس کا عام ردِ عمل مزاح کی طرف ہے ۔ اس خصوصیت اور طرزِ اظہار کا ذکر بعد میں آئے گا ۔

اکبر کی شاعری کا مطالعہ کرتے وقت ان کے ماحول کو وہ وقعت نہیں دی جاتی جس کی ضرورت ہے ۔ اور کچھ ایسا خیال ہوتا ہے جیسے انہوں نے محض بطورِ خود ، اپنے حالات گرد و پیش سے متاثر ہوئے بغیر تہذیبِ جدید اور مغرب کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا تھا ۔ اکبر کو لسان العصر کہا گیا ہے ۔ عام طور پر ایسے اعزازی خطابات مداحوں کی خوش اعتقادی کا مظہر ہوتے ہیں اور انہیں حقائق یا مصنف کی ذات ، اس کے طرزِ فکر سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا ۔ لیکن جہاں تک 'لسان العصر' کا تعلق ہے ، یہ خطاب اکبر کے اندازِ فکر کی صحیح ترجمانی کرتا ہے ۔ اکبر ان وسیع معانی میں لسان العصر نہیں کہ وہ اپنے عہد کی تمامتر خصوصیات یا فکری اور سیاسی تحریکات کا مظہر ہیں ، لیکن یہ درست ہے کہ وہ ہندوستان کی ایک بڑی اکثریت کے نمائندہ تھے ۔

اکبر کے عہد میں دو زبردست تحریکیں بیک وقت مصروفِ کار تھیں ۔ ایک علی گڑھ تحریک جس کا مسلک مغرب کے سود مند رجحانات یا اداروں کا اتباع تھا ۔ دوسری طرف خالص ہندوستانی تہذیب کی قدر و منزلت ۔ یہ ایسے لوگوں کا رجحان تھا جو بقولِ خود مغربی تہذیب کے طلسم میں گرفتار نہ تھے ، اور اپنے 'سرابِ مغرب' سے تعبیر کرتے تھے ۔ یہ لوگ فعلاً نہیں تو قولاً مغربی تہذیب اور حکومتِ ہند سے بیزار تھے ۔ مؤخرالذکر گروہ میں اس دور کے بہت سے صحافی ، مذہبی اور سیاسی پیشوا اور تعلیم یافتہ لوگ شامل تھے ۔ ان اخباروں اور رسالوں نے جنہوں نے مغرب یا حکومتِ ہند پر معاندانہ اور طنز آمیز تنقید کو اپنا مسلک بنایا ۔ 'علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ' ، 'اودھ پنچ' ، 'رفیقِ ہند' ، 'شوکتِ اسلام' خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں ۔ اکبر تو اس پر زمانی لحاظ سے تقدم حاصل نہیں ۔ در حقیقت یہ تمام اخبارات روح العصر کے ترجمان تھے ۔

ان اخبارات کے پرانے شمارے دیکھیے تو ان میں انگریزی حکام کی سفاکی ، ان کی اپنے ہم وطنوں کو ناجائز اور غیر قانونی مراعات ، رعایا سے ناجائز اور ناقابلِ برداشت محاصل کی فراہمی ، اہلِ ہند سے نفرت اور 'کالا لوگ' کہہ کر ان کی تضحیک ، اور اسی قسم کی دیگر شکایات کا نہایت طنز آمیز انداز میں نظم اور نثر دونوں میں اظہار ملتا ہے ۔ اور تو اور 'علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ' میں انگریز عمال کی فرعونیت اور تنگ دلی کی نہایت تند الفاظ میں مذمت کی جاتی تھی ۔ یہ قومی جذبہ اتنی سرعت سے ملک کے طول و عرض میں سرایت کر گیا تھا کہ اخبار 'انجمنِ پنجاب' میں بھی ، جو ایک نیم سرکاری اخبار تھا ، اس تنقید کی متعدد مثالیں ملتی ہیں ۔

حکومت کی بےدردی اور ہوس ناکیوں پر اس تنقید کا ایک بڑا سبب سیاسی بیداری تھا ۔ اور اس کا باعث وہ نئی تعلیم تھی جس کی وجہ سے خود اعتمادی اور خود اختیاری ، آزادیٔ ضمیر اور آزادیٔ خیال کے تصورات عام ہوتے جا رہے تھے ۔ انگلستان اور یورپ کی تاریخ کا مطالعہ ، اس میں جمہوری نظام کا ارتقاء ، حکومت اور رعایا میں تصادم اور حقوق طلبی کی جدو جہد ، خصوصاً انقلابِ فرانس اور اطالیہ کی جنگِ آزادی ، مغربی ممالک کی باہمی کش مکش اور مناقشات جن سے مغرب کی عظمت کو شدید صدمہ ہوا ، خود ہندوستان میں حکومت کو رعایا پر تشدد ، ہندوستان کی قدیم تہذیب کی عظمت کی جانب انکشافات جن کی سب سے پہلے مغرب کے محققین ، جنہیں ماہرِ ہندوستانیات کہتے ہیں ، نے نشاندہی کی ۔ ان سب کے متفقہ عمل سے ایک ایسی رائے عامہ معرضِ ظہور میں آئی ، جو مشرق کی حرمت سرائی اور مغرب کی مخالفت پر مشتمل تھی ۔ ان میں سے سب سے زیادہ ناگوار حکمرانوں کا غرور اور ہندوستانیوں سے ذلت آمیز سلوک تھا ۔ جتنا

بیداری کا احساس ترقی کرتا گیا ، اتنا ہی اس جذبہ کی شدت اور گہرائی میں اضافہ ہوتا چلا گیا ۔ حکمرانوں کے اس غرور و نخوت اور دست درازیوں جن سے ہندوستانیوں کے دلوں میں انگریزوں کے خلاف نفرت کا جذبہ بیدار ہوتا تھا ۔ اس کا ذکر اوپر آ چکا ہے ۔ اکبر مغربی سائنس اور فلسفہ اور طرزِ معاشرت سے بیزار تھے ، لیکن میری ذاتی رائے ہے ، اور اس کی اکبر کے کلام سے توثیق ہوتی ہے ، کہ اکبر کی مغرب دشمنی کا اصلی سبب حکمرانوں کا غرور و نخوت ، ہندوستانیوں کی تذلیل ان سے جانبدارانہ سلوک سیاسی تحکم اور اقتصادی غارت گری تھا ۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ اس جذبہ نے مغربی مادیت سے نفرت میں ایک غیر معمولی شدت پیدا کر دی ۔ مثلاً کہتے ہیں :

موقعِ بحث نہیں صاحبِ اقبال ہیں آپ

میری ہر بات بری آپ کی ہر بات اچھی

محض مغربی تہذیب کی تنقید کی بنا پر اکبر اپنے دور میں کوئی منفرد حیثیت نہیں رکھتے انگریزی رسوم و رواج اور لباس کی نقالی اپنے ادب اور تہذیب سے بے اعتنائی ۔ ان سب کا ان دنوں خوب مضحکہ اڑایا جاتا تھا اور مزاح نگار ان مغرب زدہ لوگوں کو خوب آڑے ہاتھوں لیتے تھے ۔ مثال کے طور پر 'مسدسِ حالی' پر جو منظوم تنقید ہوئی ، اس میں مغرب زدہ لوگوں کا خصوصیت سے ذکر آتا ہے ۔

اکبر کو اپنے معاصر مزاح نگاروں پر جو تفوق حاصل ہے ، یہ ہے کہ ان کی نگاہ جتنی وسیع ہے اتنی ہی گہری بھی ہے اور مغرب کے تمام اثرات پر محیط ہے ۔ پھر اگرچہ بظاہر ان کا کام شکست و ریخت دکھائی دیتا ہے ، لیکن درحقیقت اس کی تہہ میں مثبت اخلاقی اقدار کام کرتی دکھائی دیتی ہیں ۔ در اصل ان کا کلام ایک مکمل اخلاقی نظام کی دعوت ہے ۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ فنی اعتبار سے ان کا کلام اتنا بلند ہے کہ معاصر شعراء میں سے کسی کا بھی ان کے ساتھ مقابلہ نہیں کیا جا سکتا ۔ حقیقت یہ ہے کہ اکبر نہ ہی مادیت اور نہ ہی جمہوریت یا جدید نظامِ تعلیم کے خلاف تھے ۔ بحیثیت ہجو نگار ان کی نگاہ اپنے عہد کی کمزوریوں پر پڑتی ہے ، اور بظاہر یوں معلوم ہوتا ہے کہ انہیں ان کی افادیت کا سرے سے انکار ہے ، اور وہ انہیں ملک کے لیے مضرت رساں خیال کرتے ہیں ۔ مگر صحیح بات یہ ہے کہ انہیں نہ تو مادیت کی افادیت سے انکار ہے اور نہ ہی جدید تعلیم کے فوائد سے ۔ ان کا مؤقف یہ ہے کہ ان پر غیر ضروری توجہ نہیں دینی چاہیے اور مذہب اور اخلاق سے جو بے اعتنائی برتی جاتی ہے وہ قوم کے لیے مضر ہے ۔

ذرا غور سے دیکھیں تو اکبر میں مثبت اقدار صاف صاف دکھائی دیتی ہیں - اگر اکبر سے یہ سوال کیا جاتا کہ اپنے عہد کی مخالفت سے آپ کا کیا مطلب ہے ، کیا جدید تہذیب تمام تر شر ہے اور اس میں خیر کا کوئی پہلو نہیں ، تو اکبر کچھ اس قسم کا جواب دیتے : زندگی کے بہت سے پہلو ہیں اور ایک مکمل زندگی کے لیے ہر ایک پہلو کا پیش نظر ہونا ضروری ہے - لیکن زندگی کی اقدار میں مدارج ہیں اور اس کا لائحہ عمل تجویز کرتے وقت حفظ مراتب کی اشد ضرورت ہے - دیکھنا یہ ہے کہ ان تمام اقدار میں اہم ترین کون سی ہیں ؟ کس کو دوسروں پر فوقیت حاصل ہے - اکبر زندگی کی مادی ضروریات ، دماغی قویٰ کے نشو و نما ، طرز حکومت کی خوبی اسلوبی اور امادیت کے قائل ہیں - لیکن اخلاقی تربیت کو وہ ان سب پر ترجیح دیتے ہیں - کیونکہ اس کے بغیر کسی چیز کو خواہ وہ کیسی ہی کارآمد کیوں نہ ہو ، دوام حاصل نہیں - خود غرضی خواہ وہ شخصی ہو ، خواہ اجتماعی ، اپنے اندر تباہی کے اسباب رکھتی ہے اور اسے کبھی دوام حاصل نہیں ہو سکتا - اکبر نے مغربی تہذیب پر اسی انداز فکر سے تنقید کی ہے :

جس روشنی میں لوٹ ہی کی آپ کو سوجھے
تہذیب کی میں اس کو تجلی نہ کہوں گا

لاکھوں کو مٹا کر جو ہزاروں کو ابھارے
اس کو تو میں دنیا کی ترقی نہ کہوں گا

☆ ☆ ☆

ترقی مستقل وہ ہے جو روحانی ہے اے اکبر
اڑا جو ذرۂ عنصر وہ پھر سوئے زمیں آیا

☆ ☆ ☆

گر جیب میں زر نہیں تو راحت بھی نہیں
بازو میں سکت نہیں تو عزت بھی نہیں

گر علم نہیں تو زور و زر ہے بے کار
مذہب جو نہیں تو آدمیت بھی نہیں

اکبر کا کہنا ہے کہ مال و دولت ، شہرت ، ناموری ، ایک عمدہ نظام حکومت اور تعلیم سب ضروری ہیں - ان میں سے کسی کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا - لیکن اصلی

عروج عروجِ روحانی ہے اور عروجِ روحانی سے مراد یہ کہ انسان اپنے سفلی جذبات کو اور خواہشات کو قابو میں رکھے ۔ سچائی ، راست بازی ، ہمدردی ، اخوت ، انہیں کے احترام اور تحفظ پر زندگی کا دار و مدار ہے ۔ ہمارا فرضِ اولین قانونِ الٰہی کو رائج کرنا ہے ۔ اگر یہ نہیں تو ہماری ترقی نقش بر آب ہے ۔

جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے ، اکبر کی نظر میں وسعت ہے ۔ وہ صرف کسی تہذیب ہی پر تنقید نہیں کرتے ، انہیں پرانی تہذیب اور اس کے مویدین سے بھی گلا ہے ۔ تعلیم ہی کو لیجیے ۔ ایک طرف تو وہ نئی تعلیم کو نسلی بخش قرار دیتے ہیں اور دوسری طرف وہ مسلمانوں کی تعلیم سے بے پروایی کا مذاق اڑاتے ہیں اور انہیں ہدفِ ملامت بناتے ہیں :

خدا حافظ مسلمانوں کا اکبر
مجھے تو ان کی خوش حالی سے ہے یاس

یہ عاشق شاہدِ مقصود کے ہیں
نہ جائیں گے و لیکن سعی کے پاس

سناؤں تم کو اک فرضی لطیفہ
کیا ہے جس کو میں نے زیبِ قرطاس

کہا مجنوں سے یہ لیلیٰ کی ماں نے
کہ بیٹا تو اگر کر لے ایم اے پاس

تو فوراً بیاہ دوں لیلیٰ کو تجھ سے
بلا دقت میں بن جاؤں تیری ساس

کہا مجنوں نے یہ اچھی سنائی
کجا عاشق کجا کالج کی بکواس

کجا یہ فطرتی جوشِ طبیعت
کجا ٹھونسی ہوئی چیزوں کا احساس

بڑی بی آپ کو کیا ہو گیا ہے
ہرن پر لادی جاتی ہے کہیں گھاس

یہ اچھی قدردانی آپ نے کی
مجھے سمجھا ہے کوئی ہرچرن داس

دل اپنا خون کرنے کو ہوں تیار
نہیں منظور مغزِ سر کا آماس

اسی طرح مسلمان علماء کے مناقشات ، تنگ نظری اور تکفیر کی گرم بازاری کی بھی پرلطف ہجو نگاری کی گئی ہے :

شیخ تلبیس کی ترئید تو کرتے ہیں کچھ
گھر میں بیٹھے ہوئے ضالّین پڑھا کرتے ہیں

☆ ☆ ☆

فرہاد سے کہا کہ مناسب ہے تجھ یہ صبر
کہنے لگا بنائیے تیشے کو کیا کریں

☆ ☆ ☆

حالِ دنیا سے بے خبر ہیں آپ
گو تقدس مآب بے شک ہیں

شیخ جی پر یہ قول صادق ہے
چاہِ زمزم کے آپ مینڈک ہیں

☆ ☆ ☆

خلافِ شرع کبھی شیخ تھوکتا بھی نہیں
مگر اندھیرے اجالے میں چوکتا بھی نہیں

☆ ☆ ☆

کہاں دلوں سے شریعت کا کام چلتا ہے
فقط زباں سے بزرگوں کا نام چلتا ہے

سوئے طریق بزرگاں کی پیروی مفقود
بس ان کے نام سے لٹھ صبح و شام چلتا ہے

☆ ☆ ☆

سر رشتہ اتحاد ہم سے چھوٹا
آپس ہی کی خانہ جنگیوں نے ہم کو لوٹا

قرآن کے اثر سے روک دینے کے لیے
ہم لوگوں پہ راویوں کا لشکر ٹوٹا

اکبر اور سیاسیات

ہندوستان کے سیاسی حالات پر اکبر نے بہت کچھ لکھا ہے۔ بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ ہندوستانی سیاست پر جتنا اکبر نے لکھا ہے اور جس خوبی، تفصیل اور جامعیت سے لکھا ہے، اردو کے کسی شاعر نے نہیں لکھا۔ اردو کے تین بڑے شاعر ہیں جنہوں نے کسی نہ کسی رنگ میں ہندوستانی سیاست کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ اکبر، چکبست اور اقبال۔ اقبال نے اپنے ابتدائی دور میں ہندوستانی سیاست کو اپنا موضوع بنایا، لیکن جلد ہی وہ اس سے دستبردار ہو گئے۔ البتہ ان کی شاعری میں عالمی سیاست پر نہایت خیال افروز نکات ملتے ہیں جن میں انہوں نے مغربی اقوام کی چیرہ دستیوں، مظالم اور جوع الارض پر، اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں نہایت پر زور الفاظ میں تنقید کی ہے۔ چکبست کا ایک ایسے زمانہ سے تعلق تھا، جب کانگریس کی ابتدا ہوئی، اور وہ آنے والی آزادی کے دور کے سہانے خواب دیکھتا اور خوش ہوتا ہے۔ اکبر نے عالمی سیاست پر کچھ زیادہ نہیں لکھا۔ لیکن ہندوستانی سیاست، اس کے مراحل، اس کے مد و جزر، اور ہندو مسلمان کے باہمی تنازعات، ہمیشہ اس کے پیش نظر رہے، اور وہ ان پر اپنے مخصوص انداز میں اظہار خیال کرتے رہے۔

اکبر کی یہ دلچسپی محض زبانی جمع خرچ تک محدود رہی۔ انہوں نے ہندوستانی سیاست میں کبھی عملی حصہ نہیں لیا۔ بات یہ ہے، کہ سیاست میں انہماک یا دلچسپی جو آزاد دنیا میں ایک مشغلے کی حیثیت رکھتی ہے، ہمارے ہاں انگریزی راج میں ایک جانکاہ اور جرأت آزما اقدام تھا۔ جس کے عواقب عموماً نظر بندی، جرمانہ اور ضبطی جائیداد کی صورت میں ظاہر ہوتے تھے۔ اور اکبر ان سخت جان بیمہ ور سیاستدانوں میں سے نہ تھے، جو نتائج سے بے پرواہ، ''ہر چہ بادا باد ما کشتی در آب انداختیم'' پر

عمل کرتے ہوئے میدان سیاست میں کود پڑتے تھے ۔ اکبر کے دل میں تمام عمر انگریزی راج کے خلاف آگ بھڑکتی رہی ، لیکن انھوں نے ہمیشہ سیاست میں عملی حصہ لینے سے گریز کیا ۔ دوران ملازمت تو اس کا امکان ہی نہ تھا ۔ پنشن ہونے کے بعد ، کچھ تو پنشن بند ہونے کے خوف سے کچھ اس لیے بھی کہ ان کی سیاسی سرگرمیوں سے عشرت بحیثیت سرکاری ملازم کو نقصان نہ پہنچے ، وہ سیاسی اقدامات سے کتراتے رہے ، اور تمام عمر ہندوستان کی سیاسی سرگرمیوں کو شوق و اضطراب کے ملے جلے جذبات سے دیکھا کیے ۔ لیکن باوجود اپنی محتاط طبیعت کے جب بھی انھیں موقع ملتا ، وہ دشمن پر وار کرنے سے نہیں چوکتے تھے ۔ لیکن ان کی سعید ایسے الفاظ میں ہوتی جن پر گرفت کے امکانات بہت کم ہوں ، اور اگر ہوتی بھی تو اس سے راہ فرار مل جائے ۔ ان ناخوشگوار عواقب کی پیش بندی کے لیے ان کا کامیاب ترین حربہ کنایہ یا پہلودار زبان کا استعمال تھا ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگر ان کے اشعار کے قابل اعتراض مطالب کی طرف ان کی توجہ دلائی جاتی ، تو وہ اپنی تربیت میں اس کے دوسرے معانی بنا دیتے ۔ یا مصنوعی استعجابات یا تاسف انگیز لہجے میں کہتے کہ اس شعر کو کہتے وقت یہ مطلب ہرگز میرے پیش نظر نہ تھا ۔ ذیل کا قطعہ ان کی طرز تحریر کا ایک عمدہ نمونہ ہے ، جس میں انگریزوں کی اقتصادی لوٹ کھسوٹ ، مادی ذرائع پر اعتقاد ، خود بینی اور ہندوستانیوں پر انگشت نمائی کو کنایہ کے رنگ میں پیش کیا گیا ہے :

محو اضافہ وہ بت کھیوٹ پرست ہے — کہتا ہے آخرت یہی بندوبست ہے
اپنی عیوب پر تو ذرا بھی نہیں نظر — اوروں پہ اعتراض میں ہر وقت مست ہے

یہاں ”بت کھیوٹ پرست“ سے مراد انگریز قوم ہے :

گائیں سبزہ نہ کیں ڈر کے کہیں
اونٹ کانٹوں پر لپکتے ہی رہے

مراد یہ ہے کہ مسلمان (اونٹ) سیاست میں سست رفتار اور پس ماندہ ہیں ۔ اس کے برعکس ہندو (گائے ۔ کانگرس) جرأت آزما ہیں اور سیاست میں جارحانہ اقدامات کی اہلیت رکھتے ہیں ۔

نپولین نے کہا تھا انگریز دوکانداروں کی قوم ہے ۔ اکبر نے کہا ہے :

درسی تخت عزت کی کہاں ان کیل کانٹوں میں
توقع شہسواری کہ رکھو نعل بندوں سے

کنایہ کے کامیاب استعمال کی اکبر کے ہاں بے شمار مثالیں ملیں گی ۔ ان کا ذکر بالتفصیل آگے آئے گا ۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ وہ اپنے خیالات کا کھلم کھلا اظہار بھی کرتے ۔ لیکن ایسے اشعار اخباروں یا رسالوں میں نہیں چھپتے تھے ۔ انہیں ان کے خاص الخاص احباب تک محدود رکھا جاتا ، اور تاکید کی جاتی کہ انہیں ان سے منسوب نہ کیا جائے ۔ لیکن بات اکثر چل نکلتی ۔ جب ان سے باز پرس ہوتی تو وہ ان کی تصنیف سے انکار کر دیتے ۔ اس کی ایک عمدہ مثال ذیل کا مشہور شعر ہے ۔ جس میں برطانوی خبر رساں ایجنسی پر بھر پور چوٹ کی گئی ہے :

ہمیں رپوٹر کی خبروں سے یہ بس یہ ہی پتا ہے
فتح انگلش کی ہوتی ہے قدم جرمن کا بڑھتا ہے

ہندوستان کی سیاسی تاریخ اور معاشرتی حالات کا کوئی ایسا پہلو نہیں جن پر اکبر نے طبع آزمائی نہ کی ہو ۔ تمام ادارے ، عام تحریکیں ، تمام سر بر آوردہ اشخاص ، تمام اہم واقعات جن کا کسی طرح بھی ہندوستان ، اسلام ، اقوام یورپ کی سامراجیت سے ہو ، عدم تعاون ، تمام مذہبی منافقات ، ہندو مسلم صف آرائی یا اتحاد ، کانگرس ، مسلم لیگ ، اردو ہندی جھگڑا گائے پرستی ، یہ سب کے سب اکبر کے پیش نظر رہے اور ان پر انہوں نے بڑے پتے کی باتیں کہیں ۔ ان سب میں ان کا رنگ خالص قومی تھا ۔

اسی قومی نقطۂ نظر کی وجہ سے وہ مسلم لیگ سے ہمیشہ شاکی رہے ۔ اس کا خوشامد پسندانہ رویہ انہیں پسند نہ تھا ۔ نیز اس کا دائرۂ عمل مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ تک محدود تھا :

میدان عمل لیگ کا محدود ہے بے شک
ہاں رقبہ کی کوئی کمی نہیں ہے

لیکن جب لیگ اور کانگرس کا سمجھوتہ ہو گیا تو انہوں نے یہ شعر کہے :

آب زمزم سے کہا میں نے ملا گنگا سے کیوں
کیوں تیری طینت میں اتنی ناتوانی آ گئی

وہ لگا کہنے کہ حضرت آپ دیکھیں تو ذرا
بند تھا شیشی میں اب مجھ میں روانی آ گئی

اکبر کو کانگرس پر اعتماد تھا۔ لیکن انہیں اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ محض مضمون نویسی اور پر جوش تقاریر سے مخالف کے آہنی پنجہ سے نجات نہیں ملے گی۔ لہذا وہ ان خیال پرست لوگوں کا خاکہ اڑاتے ہیں، جو سمجھتے تھے کہ محض عدم تعاون سے پارٹ سیاسی مقاصد کی عمدہ نشانی ہو سکتی ہے۔ وہ گاندھی کے مداح تھے لیکن ان کی مقاومت مجہول پر انہیں اعتبار نہ تھا۔

اکبر حقیقت پسند تھے اور ان میں ایک حقیقت پسند شخص کی تمام خوبیاں اور نقائص موجود تھے۔ ان کا طرز استدلال یہ تھا کہ انگریزوں کی حکومت کا راز ان کی مادی طاقت میں مضمر ہے۔ اس طاقت کو شکست دینے کے لئے طاقت کی ضرورت ہے۔ طاقت سے ان کی مراد مادی وسائل اور جسمانی طاقت تھی۔ انہیں خیال تھا کہ جو کام ہاتھ سے ہو سکتا ہے، محض زبان سے نہیں ہو سکتا۔ لیکن جیسا کہ بعد کے واقعات سے ان پر منکشف ہو گیا۔ وہ غلطی پر تھے۔ جب تک انہیں یہ معلوم نہ ہو سکا کہ لفظ سے جذبہ کو تحریک ہوتی ہے۔ اور جذبہ میں بارود کی سی طاقت ہے۔ آخرکار جب گاندھی کی تحریک بہت زور پکڑ گئی اور انگریزوں کے پاؤں اکھڑنے لگے، تو انہیں یقین آ گیا کہ گاندھی کی تحریک بھی ایک زبردست طاقت کی مظہر ہے۔ اب ان کا طبعی خوف جاتا رہا۔ اور انہوں نے فاتحانہ انداز میں دشمن پر اپنے چنے تیر برسانے شروع کر دیے:

یہ جو ہنگامہ ہے جس کی ہر طرف تائید ہے
آپ کی تعلیم ہے اور آپ کی تقلید ہے

☆ ☆ ☆

ڈاکٹر کہتے ہیں ہرگز نہیں بھٹنے کا دست
ساری دنیا کو یہ سمجھے ہیں نگل جائیں گے

ہم وہ لقمہ ہیں کہ ہرگز نہ بچیں گے ان کو
مونہہ جو اس زعم میں مارا ہے تو پچھتائیں گے

☆ ☆ ☆

اس ترک موالات کے کپڑے یہ پڑے کیوں
اتنا ہی بس اس کا ہے جو اب آپ سڑے کیوں

☆ ☆ ☆

کیوں دل گاندھی سے صاحب کا ادب جاتا رہا
بولے، کیوں صاحب کے دل سے خوف رب جاتا رہا

اکبر کی طاقت پرستی کا ذکر اوپر آ چکا ہے ۔ یہ اس دور کے بیشتر مفکرین کی صفت مشترک ہے ۔ اقبال اور اس سے پہلے سوامی ویوکانند ، سوامی دیانند اور تلک ۔ سب طاقت کے پرستار تھے ۔ طاقت کی مدح اکبر کا نہایت مطبوع مضمون تھا اور انہوں نے اس پر بیسیوں لاجواب اشعار کہے ہیں :

دنیا میں قدرت زور کی ہے اور آپ میں مطلق زور نہیں
یہ صورت حال رہی قائم تو اس کی جا جز گور نہیں

☆ ☆ ☆

بلا طاقت دعا افلاک انساں کی نہیں چلتی
وہاں دو ریل چلتی ہے ، یہاں روٹی نہیں چلتی

☆ ☆ ☆

جب قوت تھی سب دعوے تھے ، قوت ہوئی گم اب کچھ بھی نہیں
طاقت کے سارے کرشمے ہیں کہ ریز کا مذہب کچھ بھی نہیں

اکبر ہندوستانی قومیت کے حامی تھے اور انہوں نے اپنی ماحول کے مطابق اور اپنی مجبوریوں کے باوجود اس کی ترجمانی کی ۔ ہم نے اور عوامل کا ذکر بھی کیا ہے جس نے انہیں حکومت اور مغربی تہذیب کی مخالفت پر آمادہ کیا ۔ میری رائے میں ان سب عوامل کی تہ میں غیر شعوری طور پر ایک جذبہ ہمیشہ کام کرتا رہا اور اس نے انہیں ہر ایک مغربی چیز سے بیزار کر دیا اور جس کی وجہ سے انہیں مغرب کی خوبیاں بھی برائیاں نظر آتی تھیں ۔ یہ خود داری کا جذبہ تھا جسے غلبۂ مغرب نے شدید طور پر مجروح کر دیا تھا ۔ شعرائے اردو میں اکبر انگلستان کی غاصبانہ حکومت اور اس کی اقتصادی غارت گری کے سب سے پرزور نقاد تھے :

عزت کبھی وہ تھی کہ بھلائے سے نہ بھولے
تحقیر اب ایسی ہے جسے سہ نہیں سکتے
ہم ہوں جو کلکٹر تو وہ ہو جائیں کمشنر
ہم ان سے کبھی عہدہ برآ ہو نہیں سکتے

اسالیب اکبر

اکبر نے اپنے تاثرات یا خیالات کا اظہار تین مختلف اسالیب میں کیا ہے ۔ اول رباعی جس کا رنگ عموماً واعظانہ یا ناصحانہ ہے اور جس میں وہ براہ راست اپنی مثبت

اقدار کا اظہار کرتے ہیں ۔ اگرچہ یہاں بھی بعض اوقات طنزیہ مضامین آ گئے ہیں ۔ دونم کئی ایک غزلیں یا اشعار جن میں حزن و رنگ غالب ہے اور جن میں وہ پرانی تہذیب کے بتدریج مٹتے ہوئے نقوش کا جدیدیت کے بڑھتے ہوئے سیلاب پر ماتم پیش کرتے ہیں ۔ لیکن ان کی عالمگیر شہرت اور قبولیت کی باعث ان کا مزاحیہ طرزِ اظہار ہے ۔ اردو شاعری میں ان کا خاص مقام ایک ہجو نگار کا ہے ۔ اکبر کی ہجو ذاتی یا شخصی نہیں ، اگرچہ اس میں کبھی کبھی ایسے اشخاص کا ذکر بھی آتا ہے ، جن کے نظریات سے انہیں اتفاق نہیں ۔ لیکن یہ اشخاص زمانہ کے چند جدید رجحانات کے نمائندہ یا علامت کی صورت میں آئے ہیں ۔

مزاح

مزاح در حقیقت احساسِ تناسب کا نام ہے اور صحیح معنوں میں مزاح نگار اس شخص کو کہتے ہیں ، جو عقلِ سلیم کی روشنی میں ہمارے رسوم و قواعد ، اخلاق ، عقاید ، طرزِ زندگی ، اندازِ فکر ، عادات وغیرہ کا جائزہ لے کر ہماری بے راہ روی یا غلط روی کو ہم پر ظاہر کرتا ہے ۔ اس کے سامنے ایک مبسوط ، آزمودہ ، معیّن اور حیات پرور نظام حیات ہوتا ہے اور وہ دیکھتا ہے کہ ہم کس طرح اپنی حماقت ، خود غرضی ، لاعلمی ، خود پسندی یا ہٹ دھرمی کی وجہ سے اس اعلیٰ معیار سے گر رہے ہیں ۔ یہ ایک نہایت سنجیدہ کام ہے ، لیکن اسے سرانجام دینے کے لیے اکبر ہمارے سامنے ایک معلّمِ اخلاق کی صورت میں نہیں بلکہ ایک ظریف کا روپ دھار کر آتے ہیں اور اپنے انوکھے اور مضحک انداز سے ہمیں محفوظ بھی کرتے ہیں اور چونکا بھی دیتے ہیں ۔ درحقیقت اس کا مقصد وہی ہے جو کسی معلّمِ اخلاق کا ہوتا ہے ۔ لیکن انسانی طبع عموماً نصیحت کے کڑوے گھونٹ یا جھڑکے شربت سے دبا کرتی ہے ۔ نیز اس سے ہماری اندرونی مقاومت کے جذبے کو تحریک ہوتی ہے ۔ اسی لیے معلّمِ اخلاق کی براہ راست تلقین عموماً ناکام رہتی ہے ۔ اس کے برعکس ہم مزاح نگار کے دوستانہ ، دل پذیر اور بے تکلف انداز سے اتنے محفوظ ہوتے ہیں کہ شروع شروع میں ہمیں اس بات کا مطلقاً احساس نہیں ہوتا کہ جو کچھ کہا جا رہا ہے وہ در حقیقت ہماری اپنی تنقید پر مشتمل ہے ۔ اکبر کا مقصد ہمیں ایک خوشگوار لیکن غیر محسوس طریقے میں اپنی کمزوریوں اور کوتاہیوں سے آگاہ کرنا ہے ۔ عرصۂ دراز سے یہ اصلاح اخلاق و عادات ، رسوم و قواعد کا ایک نہایت مؤثر طریقہ ثابت ہوا ہے ۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ وہ کام جو تبر و تفنگ اور دار و رسن اور قوانین کے انتقامی دار و گیر سے سرانجام نہ ہو سکا ، مزاح نگار اسے اپنی بظاہر معصوم ہنسی سے سرانجام دے سکتا ہے ۔ متمدن اقوام میں یہ اصلاح کا ایک

زبردست آلۂ کار رہا ہے :

ملعی بھی ریاکاری کی کھلتی رہے اکبر
طعنوں سے مگر طرزِ مہذب بھی نہ بھولے

اکبر کی مزاح خندۂ دنداں نما نہیں ۔ جس سے دبٹ میں بل پڑ جائیں یا ہم زمین پر لوٹنے لگیں ۔ وہ ایک ہلکا سا تبسم ہے جس سے لبوں پر ایک نا معلوم سی شکن پڑ جاتی ہے ، یا آنکھوں میں چمک سی آ جاتی ہے ۔ البتہ یہ درست ہے کہ جب انہیں ہماری غلط کاریوں کا شدید احساس ہوتا ہے تو یہ تنقید ایک درست تمسخر کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے ۔

ہجو

اکبر کے ہجویہ اشعار کی ایک نمایاں خصوصیت اختصار ہے ۔ میں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ہجویہ اشعار بارود کی طرح ہیں ، ان میں جتنا دباؤ ہوگا اتنا ہی مزا ان کا اثر ہوگا ۔ اکبر کے بہترین اشعار میں بجلی کی سی چمک ہے اور اس کے حالات حیرت انگیز تیزی سے قاری کے دماغ پر مرتسم ہو جاتے ہیں ۔ مثال کے طور پر ذیل کے شعر لیجیے جس میں مولانا شوکت علی اور ڈاکٹر ضیاء الدین کا مقابلہ کیا گیا ہے :

ایک شوکت اور ضیاء الدین وضع و خو میں ہیں
فرق اتنا ہے کہ وہ جنگل میں اور وہ زو (ZOO) میں ہے

اکبر کی رائے میں ان دونوں کے طبعی میلانات اور قابلیتوں میں کوئی فرق نہیں ۔ ایک آزاد ہے اور دوسرا علی گڑھ کی چار دیواری میں محصور ہے جہاں سیاسی گھٹن کی وجہ سے سانس تک لینا دشوار ہے ۔ یہاں 'جنگل' اور 'زو' نہ صرف حیرت انگیز حد تک پر معنی اور خیال انگیز ہیں ، بلکہ 'زو' کے تلازمات سے احساس مزاح کو بے حد تحریک ہوتی ہے ۔ قوافی کی مناسبت اور انوکھا پن ان سب پر مستزاد ہیں ۔

اکبر کی ہجو کی ایک اور دل پذیر خصوصیت رمز و کنایہ کا استعمال ہے ۔ اکبر اپنے تاثرات یا خیالات کھلے الفاظ میں بیان نہیں کرتے ، بلکہ انہیں اشارتاً ظاہر کرتے ہیں مثلاً مغربی تہذیب کے لیے انجن یا پتلون کا اشارہ ، ہندوؤں کے لیے گائے یا دیوتا ، مسلمانوں کے لیے اونٹ یا تہمد ، سید احمد کے لیے پیرِ نیچر ، پیر نابالغ ، کول کا بوڑھا ، قدیم خیال علماء کے لیے شیخ وغیرہ ۔ اس کنایہ کے استعمال کو عموماً ان کی مصلحت پر محمول کیا جاتا ہے ۔ لیکن یہ صرف اس حد تک درست ہے کہ کبھی کبھی وہ حکام پر تنقید کرتے وقت مبہم یا ذو معنی الفاظ استعمال کرتے ہیں ، تاکہ مواخذہ یا پرسش کی حالت میں وہ اپنی بریت ثابت کر سکیں ۔ لیکن یہ استدلال درست نہیں ۔ درحقیقت اس

اشارات کا استعمال ایک لطف سی خوبی پر دلالت کرتا ہے - یہ ایک عام حقیقت ہے کہ طبعِ انسانی میں تلاش ، تجسس اور حقیقتِ اشیا معلوم کرنے کی فطری خصوصیت ہے - اسے ان چیزوں سے جو ظاہر ہیں وہ لطف حاصل نہیں ہوتا جو ان چیزوں سے جو تلاش و جستجو سے حاصل ہوتی ہیں - اکبر کے ان اشارات سے طبیعت پر ایک لطف انشراح ہوتا ہے - یہی خوبی جو ایک معمہ کو حل کرنے سے حاصل ہوتی ہے - ہر قاری کو اپنی ذکاوت کا محسوس اشد احساس ہوتا ہے - دوسری بات یہ ہے کہ محض الفاظ ہمارے لیے جوڑے معانی پر دلالت کرتے ہیں - مثال کے طور پر پھر سمجھو سے سید احمد کی 'نیچر' کی حمایت ، فوق العادت واقعات اور معجزوں سے انکار ، بالفاظِ دیگر ان کی عقاید ، پیر نابالغ سے اکبر کی رائے ہے باوجود دہر سنی کے ان کی فلاح کی نا رسائی اور معاملات سیاست اور مذہب میں ناسمجھی ، سب سامنے آ جاتے ہیں - بالکل یہی حال اونٹ ، گائے ، میں ، انجن وغیرہ کا ہے - یہ سیدھے سادے چیزوں کے نام ہیں جو سمجھے جو ہیں کہ باوجود ظاہر و باہر بھی ہیں اور باوجود انتہا اختصار کے اپنے اندر ایک دفترِ معانی رکھتے ہیں ، مثلاً :

انہیں شعروں میں آ جاتے ہیں سب معانی کا ادا کرنا
مجھے لفظوں میں مشکل ہے بیانِ مدعا کرنا

☆ ☆ ☆

دیکھیے ہیں اکبر یہ میری عقل ہی کا پھیر ہے
طبع میری اس نئی تہذیب سے کیوں سیر ہے

عرض کرتا ہوں کہ میں بھی ہوں گا حاضر عنقریب
ہو چکا ہوں پیر بس نابالغی کی دیر ہے

ایک اور شعر ملاحظہ ہو :

کامیابی کے سندیسی دیر تک در بستہ ہے
جوش طوطا رام نے کھولی مگر پر بستہ ہے

کانگرس جس نے حکومت پر زور و شور سے مہم شروع کر رکھی تھی مگر ، جنہیں آزادی حاصل نہیں - اسی سلسلے میں اکبر کے شعر متنوع ، لیکن برجستہ قوافی کا استعمال بھی قابلِ تعریف ہے - ان کے استعمال سے حیرت آمیز مسرت کا احساس ہوتا ہے :

'من العلم قلیلاً' کو بھی دیکھو بعد 'او تیتم'
نہ مانو گے تو اک دن بھائیو کھاؤ گے جوتی تم

☆ ☆ ☆

طفلِ دل محو طلسم رنگ کالج ہو گیا
ذہن کو نپ آ گئی مذہب کو فالج ہو گیا

☆ ☆ ☆

شیخ کی وہ دہج نہیں وہ شیخ کی ڈاڑھی نہیں
دوستی مذہب سے ہے سر اسقدر گاڑھی نہیں

☆ ☆ ☆

بکا لین بس کر دو روٹیاں تھوڑے سے جو لانا
ہماری کیا ہے اے بھائی نہ مسٹر ہیں نہ مولانا

☆ ☆ ☆

زمانہ کہہ رہا ہے سب سے پھر جا
نہ مندر جا ، نہ مسجد جا ، نہ گرجا

☆ ☆ ☆

رہ گئے نا آسنا احباب غائب ہو گئے
ہم نفس دو ایک جو باقی تھے صاحب ہو گئے

☆ ☆ ☆

واسطہ کم ہو گیا اسلام کے قانون سے
دب گئی آخر مسلمانی میری پتلون سے

☆ ☆ ☆

ڈنڈے سے کب مرتا ہے یہ موپلا
واسطے اس کے رفل لا توپ لا

☆ ☆ ☆

نہایت حکمت آگیں آپ کی اسپیچ ہوتی ہے
مزا شربت کا دے جاتی ہے گو وہ پیچ ہوتی ہے

یہاں پیچ سے مراد غالباً وہ برائے نام مراعات و مواعید ہیں جن سے حکومت حقوق طلبوں کی اشک شوئی کیا کرتی تھی :

کہتے ہیں مغلوب آدمی نے خیال حضور سے
کہدو یہ بہتر ہے جوٹھے بسکٹوں کے حور سے

یہاں 'حور' سے مراد مذہبی ایمان ہے اور 'جوٹھے بسکٹوں کے حور' سے مغرب کی گھٹیا قسم کی نقالی ، مراعات ، خطابات ، اور انعامات ہیں جن سے مقلدین درگاہ کو نوازا جاتا تھا ۔

طنزِ ملیح

اکبر کے طنزیہ کلام کی ایک اور خصوصیت اس صنعت کا استعمال ہے جسے انگریزی میں (irony) کہتے ہیں ۔ اس میں شاعر اپنے خیالات کا اظہار ایسے الفاظ میں کرتا ہے جو اس کے خیال کے بالکل برعکس ہوتے ہیں ۔ اس کے الفاظ میں طنز کی سی سختی یا درشتی نہیں ہوتی بلکہ بوجہ کنایہ یا الفاظ کے بالواسطہ استعمال سے ان کی چبھن بہت تیز ہو جاتی ہے ۔ ذیل کی نظم اس صنعت کی ایک عمدہ مثال ہے ۔ یہاں فقط چند اشعار پر اکتفا کیا جاتا ہے :

چاہا جو میں نے ان سے طریقِ عمل نہ وعظ
بولے کہ بس دلیل کو بر اوہام کیجیے

پیدا ہوئے ہیں ہند میں اس عہد میں جو آپ
خالق کا شکر کیجئے آرام کیجیے

بے انتہا مفید ہیں یہ مغربی علوم
تحصیل ان کی بھی سحر و شام کیجیے

یورپ میں پھرئیے پیرس و لنڈن کو دیکھیے
تحقیقِ ملکِ کاشغر و شام کیجیے

ہو جائیے طریقۂ مغرب سے مطمئن
خاطر سے محو خطرۂ انجام کیجیے

دیران بے فروغ کا گل ہو چکا چراغ
تا حق نہ دل کو تابعِ اوہام کیجیے

رکھیے نہ دل کو دیر و کلیسا سے منحرف
متروک قیدِ جامۂ احرام کیجیے

رکھیے نمود و شہرت و اعزاز در نظر
دولت کو صرف کیجیے اور نام کیجیے

سامان جمع کیجئے کوٹھی بنائیے
با صد خلوص دعوتِ حکام کیجیے

اندازِ بیان

قصیدہ اور ہجو دو متخالف کیفیات کے مظہر ہیں۔ ایک کی اساس تعریف و خدمت ہے اور دوسرے کا موضوع نقائص کا پوست کنندہ بیان، اس لیے ہجو میں قصیدہ کی پرشکوہ زبان اور تخیل کی پرواز کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ غزل بھی جہاں تک وہ محبوب کے حسن و جمال کی تعریف سے متعلق ہے ایک قسم کا قصیدہ ہے۔ اس لیے ہجو نگار فطرتاً ایسی زبان اور ایسی تشبیہات، استعارات استعمال کرتا ہے جو ہماری روزمرہ زندگی کے قریب تر ہیں۔ اکبر اپنے ہجویہ اشعار میں عام بول چال، محاورے، تمثیلات اور مضحک تشبیہات استعمال کرتے ہیں، تاکہ قاری بھی شاعر کے دلچسپ مشغلے میں شامل ہو کر اپنے ارد گرد کی دنیا کو اسی حقیقت پسند نظر سے دیکھے، جس سے شاعر نے اس کا مشاہدہ کیا ہے۔ ذیل کے اشعار سے اس نظریہ کی تائید ہوتی ہے:

فرق پیدا کر دیا بنگلے کا اور بنلون کا
وہ حال ہے کہ مفلسی میں آٹا گیلا ہو گیا

☆ ☆ ☆

گولیوں کے زور سے کرتے ہیں وہ دنیا کو ہضم
اس سے بہتر اس غذا کے واسطے چورن نہیں

☆ ☆ ☆

پوچھتے کیا ہو مسلمانوں کا حال
منتشر اجزا سب ان کے ہو گئے

☆ ☆ ☆

معتصم کب ہیں یہ حبل اللہ ہے
دیکھ لو جھاڑو کے تنکے ہو گئے

☆ ☆ ☆

میرے سازِ سخن سے بست فطرت کو تنغض ہے
یہ جانورے سرا سمجھا گیا بزم شغالان میں

☆ ☆ ☆

دنیا ہی اب درست ہے قائم نہ دین ہے
زر کی طلب میں شیخ بھی کوڑی کا تین ہے

☆ ☆ ☆

پردہ کا مخالف جو سنا بول اٹھی بیگم
اللہ کی مار اس پہ علی گڑھ کے حوالے

اس اکھاڑے میں اڑنگے دیکھ کر قانون کے
شیخ نے تہمد سے ہجرت کی طرف پتلون کے

☆ ☆ ☆

درگاہ کے چراغ کو چھوڑا برائے لمپ
سب کی نظر میں گھی ہے مگر تیل ہو گئے

☆ ☆ ☆

شوق لیلائے سول سروس نے اس مجنون کو
اتنا دوڑایا لنگوٹی کر دیا پتلون کو

☆ ☆ ☆

کہاں ہم میں اطاعت اور جماعت
شکستہ ہو گئے سابق کے رشتے
نہیں ہے کچھ شکایت لیڈروں کی
کہ جیسی روح ہے ویسے فرشتے

اکبر نے اپنی ہجویات میں انگریزی الفاظ کا استعمال بھی کیا ہے، مثلاً:

باغوں میں نو بہار درختوں کی دیکھ لی
کالج میں آ کے کانوکیشن کو دیکھیے

لیمونیڈ کاغذی کو بہت دیکھے آپ نے
اس کاغذی سرٹی فیکشن کو دیکھیے

ایسے الفاظ کی تعداد سو کے لگ بھگ ہے اور وہ بیشتر غیر مانوس الفاظ ہیں ، ایسے الفاظ جو عام استعمال سے زبان کا حصہ نہیں بن سکے ۔ اور کہا گیا ہے کہ مزاح کا ایک مشہور سرچشمہ ان مانوس اور بے جوڑ اشیاء کا غیر متوقع تقابل ہے ۔ نثر میں ہمارے ہاں انگریزی الفاظ عام طور پر رائج ہیں اور چونکہ عام بول چال میں بھی یہ لفظ استعمال ہوتے ہیں ۔ اس لیے ہمیں ان کے عدم تناسب یا غیر معقولیت کا احساس نہیں ہوتا ۔ لیکن شاعری کی زبان پاک رہی ہے ۔ اکبر نے انگریزی الفاظ کو تحریک مزاح کے لیے استعمال کیا ہے ۔ سوال یہ ہے کہ کیا ان سے 'عجوبگی' اور ڈھیلے پن کا وہ احساس پیدا ہوتا ہے جو مزاح کے لیے ضروری ہے ۔ میری رائے میں یہ سوال الفاظ کے عام استعمال سے علیحدہ نہیں ہے ۔ اگر کلام میں آورد کا احساس ہو تو اس کا مزا جاتا رہتا ہے ۔ اس کے برعکس اگر ہمیں یہ احساس ہو کہ ان کا استعمال سراسر آمد ہے اور انہیں کوشش یا کھینچ تان کر نہیں لایا گیا ، تو خواہ وہ الفاظ ہندی ہوں یا انگریزی یا کسی اور زبان کے ، ان کا استعمال ضرور پر لطف ہوگا ۔ اکبر کے ہاں آمد کی بجائے آورد زیادہ ہے ۔ ذیل کے اشعار سراسر تکلف ہیں :

کیا کہوں اس کو میں بد بختی نیشن کے سوا
اس کو آتا نہیں اب اسٹیشن کے سوا

☆ ☆ ☆

اسہال نہیں گریٹ ہونا اچھا
دل ہوتا ہرا ہے بیٹ ہونا اچھا
پنڈت ہو کہ مولوی ہو دونو بیکار
انسان کو گریجویٹ ہونا اچھا

☆ ☆ ☆

چرچے ہیں نہ مذہب کے نہ وہ قصہ دل ہے
چرچے ہیں اب اخبار کے اور آرٹیکل ہے
اس عہد میں مائل ہوئے الحاد پہ جو دل
اس کی نو گورنمنٹ ہی رسپانسیبل ہے

اس کے برعکس ان اشعار میں بے ساختہ پن ہے اور ہم ان سے محظوظ ہوتے ہیں :

مسجد کا ہے خیال نہ پروائے چرچ ہے
جو کچھ ہے اب تو کالج و ٹیچر پر خرچ ہے

کالج میں دھوم مچ رہی ہے پاس پاس کی
عہدوں سے آ رہی ہے صدا دور دور کی

☆ ☆ ☆

لیڈروں کی دھوم ہے اور نامور کوئی نہیں
سب تو جنرل ہیں یہاں آخر سپاہی کون ہے

☆ ☆ ☆

کوٹھی میں جمع ہے نہ ڈپازٹ ہے بنک میں
قلاش کر دیا مجھے دو چار تھینکس میں

ذیل کی تراکیب بہت پر لطف ہیں :

یک سیر ڈنر خوردہ و ہر سو نہ دیدہ
آخر ز دکان کارے نہ بست
نہ ہر کہ ہیٹ بپوشد مسٹری دارد

میری رائے میں ذیل کے اشعار اکبر کی مخصوص طرزِ نگارش کی نہایت عمدہ مثالیں ہیں :

خلق اسی سمت صف بہ صف جاتی ہے
یعنی عود و رباب چنگ و دف جاتی ہے
ہے نورِ خدا بھی طالبِ رزق کا دست
داڑھی بھی تو پیٹ کی طرف جاتی ہے

☆ ☆ ☆

اے خدا مجھ کو کر دے صاحب لوگ
دور ہوں مجھ سے اس جنم کے روگ

☆ ☆ ☆

میرا قالبِ ہو قالب حربی
بھول جاؤں زبان بھی اپنی

☆ ☆ ☆

رنگ چہرے کا میرے جائے بدل
کروں ایجاد میں بھی توپ و رفل

☆ ☆ ☆

سو کے اٹھوں جو آج صبح کو میں
لوگ سمجھیں کہ لاٹ صاحب ہیں

☆ ☆ ☆

مسلمانوں کو لطف و عیش ہے جینے نہیں دیتے
خدا دیتا ہے کھانا شیخ جی لینے نہیں دیتے

☆ ☆ ☆

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جاجا کے تھانے میں
کہ اکبر ذکر کرتا ہے خدا کا اس زمانے میں

☆ ☆ ☆

تماشا دیکھیے بجلی کا مغرب اور مشرق میں
کلوں میں ہے وہاں داخل یہاں مذہب پہ گرتی ہے

آخر میں مجھے ایک عام غلط فہمی کا ازالہ کرنا ہے ۔ اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ اکبر اپنے مخصوص مزاحیہ اسلوب کے موجد تھے ۔ انہوں ہی اس اسلوب کو پروان چڑھایا اور انہیں کے ساتھ یہ اسلوب ختم ہو گیا ۔ یہ نظریہ حقیقت میں اردو شاعری کے روایات سے لا علمی پر محمول ہے ۔ اردو شاعری کے تاریخی مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس مزاحیہ طرز میں اکبر کے بہت سے پیش رو تھے ۔ اب سب کا طریق کار وہی ہے جو اکبر کا ۔ ان سب کی مثالیں اکبر کے سامنے تھیں اور وہ ان سے متاثر ہوئے ۔ اردو میں اس قسم کی شاعری کا آغاز جعفر زٹلی سے ہوتا ہے ۔ یہ درست ہے کہ اس کے کلام میں فارسی عنصر زیادہ ہے ۔ لیکن اس کے وسائل مزاح وہی ہیں جو اکبر کے ۔ مثلاً فارسی میں اردو اور اردو میں فارسی الفاظ کا استعمال ، فارسی اور اردو کے الفاظ کا توڑ پھوڑ ، اردو میں فارسی گرامر اور فارسی میں اردو گرامر ۔ قواعد کی تطبیق جس سے کلام مضحکہ خیز اور پر لطف ہو جاتا ہے ۔ یہ روایت سودا ، انشا ، رنگین ، میر ضاحک ، صمد الشعراء ، جان صاحب سے اکبر تک پہنچتی ہے اور کچھ اسی آب و تاب سے ظفر علی ، مجید لاہوری ، راجہ مہدی علی خان میں

ظاہر ہوتی ہے ۔ اکبر کی تمام خصوصیات جن کا اوپر ذکر آ چکا ہے ، ان شعراء میں بکثرت موجود ہیں ۔ روزمرہ کا استعمال (ریختی گو عورتوں اور طوائف کی زبان استعمال کرتے ہیں) مضحکہ خیز تشبیہات ، صنائع بدائع کا استعمال ۔ ان مل اور مختلف النوع الفاظ کا تلازم ' ان سب کو ان شعراء نے حسب ضرورت نہایت جابکدستی سے استعمال کیا ہے اور وہ شخص شدت سے اکبر پرست ہوگا ۔ جو اس بات پر اصرار کرے کہ ان خصوصیات میں اکبر کو اپنے پیش روؤں پر بہت فضیلت حاصل ہے ۔ اکبر اور اس کے پیش رو شعراء میں بڑا فرق یہ ہے اور یہی اس کی عظمت کا سبب ہے کہ یہ سب شاعر ، بہ استثنائے سودا ان باتوں کو محض تفنن اور تمسخر کے لیے استعمال کرتے ہیں ۔ اس کے سامنے کوئی اعلیٰ اخلاقی یا اصلاحی نصب العین نہیں اور اکبر کی شاعری کا بیشتر حصہ اعلیٰ اخلاقی اصولوں کی ترجمانی پر مشتمل ہے ۔ خلاصہ یہ کہ اردو شاعری میں مزاح کی ایک غیر منقطع روایت رہی ہے ۔ اکبر نے اپنے ایسے پیش روؤں سے بھی بہت کچھ سیکھا اور اس پر نہایت بیش قیمت اضافے کرکے آنے والوں کے لیے طنز و مزاح کی نئی راہیں کھول دیں ۔

اکبر اور سید احمد خان

اکبر کے لیے مغربی تہذیب اور سید احمد خان مرادف الفاظ ہیں ۔ جب وہ مغربی تہذیب پر تنقید کرتے ہیں ان کے دماغ کے عقب میں اکثر و بیشتر سید احمد خان کا تصور ہوتا ہے اور جب وہ براہِ راست سید احمد خان کو شعر کا موضوع بناتے ہیں تو وہ در حقیقت مغربی تہذیب کے نقائص بیان کرتے دکھائی دیتے ہیں ۔ ایک نقاد نے یہ بھی کہہ دیا ہے کہ اگر اکبر کے کلیات سے سر سید اور کالج کے الفاظ نکال دیے جائیں تو باقی ماندہ شاعری پھیکی اور بے نمک رہ جائے گی مگر یہ کہنا زیادتی ہے ۔

یہ امر کہ اکبر نے سید احمد خان کو اپنی شاعری کا محور بنایا ہے یا اسے ہر پہلو سے نشانہ تضحیک بنایا ہے ، کسی ذاتی عناد پر محمول نہیں کیا جا سکتا ۔ حقیقت یہ ہے ، کہ سید احمد خان کی شخصیت اتنی متنوع اور جامع تھی کہ وہ اپنے دور کی تمام زندگی پر حاوی نظر آتے ہیں ۔ سیاسیات ، ادب ، تعلیم ، مذہب ، معاشرتی اصلاح ، زندگی کا وہ کون سا شعبہ ہے جس میں سید احمد خان صفِ اول میں نہ تھے ؟ اور ان میں سے ہر ایک میں ان کا اپنا مخصوص انداز فکر و عمل تھا ۔ سیاست میں وہ حکومتِ برطانیہ سے تعاون کے حامی تھے ، کیونکہ انہیں اپنی قوم کی بقا اور ترقی کا یہی ایک طریقہ نظر آتا تھا ۔ تا ہم یہاں یہ بتا دینا ضروری ہوگا کہ یہ کسی عقیدت مندی کی وجہ سے نہیں تھا ۔ یہ وفاق در حقیقت ایک سمجھوتا ، بلکہ سودا بازی تھی ۔ کانگریس کی مخالفت اور روز افزوں طاقت سے تنگ آ کر حکومت یہ چاہتی تھی کہ مسلمانوں کا جو

اب تک مطعون تھے ، تعاون حاصل کیا جائے ۔ تا کہ ہندوستان کی ایک کثیر آبادی ہندوؤں سے علیحدہ ہو جائے ۔ سید احمد خوب جانتے تھے کہ گورنمنٹ کی طرف سے یہ مخلصانہ اقدام نہیں ، وہ محض حکمت عملی ہے ۔ اسی طرح بحیثیت ایک مشتاق ناظر سید احمد خان نے مؤقف یہ تھا کہ کیوں نہ اس سیاسی کش مکش سے پورا فائدہ اٹھایا جائے ، خصوصاً جب کہ واقعات کے رجحان سے انہیں اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ ہندو مسلم اتحاد ایک ناقابل عمل چیز ہے ۔ اس میں کسی ذاتی مفاد کا شائبہ تک نہ تھا اور نہ ہی انگریزی حکام کی جانب وہ کسی خوش فہمی کا شکار تھے ۔ انھوں نے انگریزی حکام کے نخوت ، بے جا غرور کا ذکر اخبار سائنٹفک سوسائٹی میں جس طرح کیا ہے ، اس کی مثالیں اس دور کی صحافت میں مشکل سے ملیں گی ۔ لیکن اکبر اسے حصول جاہ ، منفعت پسندی اور خوشامد سے تعبیر کرتے تھے ۔

علاوہ ازیں سید احمد خان ،غربی تہذیب کے خوش آئند پہلوؤں کو پسند کرتے تھے اور مسلمانان ہند میں ان کی قبولیت اور ترویج ان کا نصب العین رہا ۔ مذہب میں وہ عقلیت کے علم بردار تھے ۔ ان کی خواہش تھی کہ مذہب اور سائنس میں تطابق پیدا کیا جائے تا کہ اس تشکیک کا سدباب کیا جائے ، جس نے یورپ میں لاکھوں کے مذہبی عقائد کو متزلزل کر دیا تھا ۔ ان تمام اہم مسائل میں اکبر کو سید احمد خان کے ساتھ کسی ایک بات پر بھی اتفاق نہ تھا ، بلکہ شدید اختلاف تھا ۔ اکبر تقلید مغرب کا شدت سے مخالف تھے ، اور مشرق کی بہترین اقدار کے ترویج اور استحکام کے حامی ۔ اسی طرح وہ مغرب کی عقلیت کے خلاف تھے ۔ انہیں اس بات کا اقرار تھا کہ عقل کی وساطت سے دنیاوی امور کی گروہ کشائی میں مدد ملتی ہے ، لیکن مذہبی عقائد میں جن کا تعلق وجدان سے ہے ، عقل کی مداخلت بے جا ہے اور وہ بے راہ روی ، اور بے یقینی کا سبب بنتی ہے ۔ وہ جدید علوم کے بھی اس لیے مخالف تھے کہ ان سے عقل کو جلا ضرور ہوتی ہے لیکن روح مر جاتی ہے ۔ جہاں تک سیاست کا تعلق ہے ، وہ اسی کے مرد میدان نہ تھے ۔ کچھ ملازمت کی وجہ سے اور بیشتر اپنی طبیعت کی افتاد کی وجہ سے وہ اس معرکۂ کار زار کے دور کے تماشائی رہے ۔ لیکن ایک طرح سے وہ کانگرسی مؤقف کے حامی تھے ، اور برطانوی حکومت اور اس کے اعمال سے ایسے شدید نفرت تھی ۔ لہذا جس نقطۂ نظر سے بھی دیکھا جائے ، ان دونوں کی راہیں مختلف نظر آتی ہیں ۔ جدید علوم کی بابت اکبر کے خیالات اور نظریات کا ذکر اوپر آ چکا ہے ۔ اکبر نے انہیں ہمیشہ نشانۂ تضحیک بنایا ۔ اور اگر کبھی قبول کیا تو با دل نخواستہ ۔ علی گڑھ یونیورسٹی کے تاسیس پر اس نے جن خیالات کا اظہار کیا ، وہ یہ ہیں :

ابتدا کی جناب سید نے   جن کے کالج کا اتنا نام ہوا

انتہا یونیورسٹی یہ ہوئی   قوم کا کام اب تمام ہوا

اگر وہ چار و ناچار مغربی تعلیم کو قبول کرتے ہیں ، تو ان الفاظ میں :

مفر نہیں ہے ہمیں خانقاہِ سید سے
اڈے کو مگر چھوڑ جائیں کہاں

اکبر کا سیاسی مسلک یہ تھا کہ مسلمانوں کو ہندوؤں کے ساتھ تعاون کر کے آزادی کے لیے جد و جہد میں حصہ لینا چاہیے - ذیل کے اشعار میں سید کی مصلحت اندیشی اور سیاسیات سے علیحدگی پر چوٹ ہے :

اگرچہ پولیٹیکل بحث میں ہوئے ہیں سریک ،
جناب پنڈت جی چند و بابو آسو توس
مگر ہمیں ہے سرا سر سکوت اس مد میں
سمجھا گئے ہیں یہ مضمون سیّدِ ذی ہوش
رموز مملکت خویش خسروان دانند
گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش

اگر انہیں حکومت سے کھلم کھلا مخالفت نہیں ہے تو وہ تعاون سے بھی گریز کرتے ہیں :

شاگردِ سوزنہ تو خدا ہی نے کر دیا
اکبر مگر نہیں ہے حواری کے ہاتھ میں

✡ ✡ ✡

جب اپنے ہاتھ میں لی غیر نے عنانِ کمند
تو پھر سوار سے اکبر پیادہ پا اچھا

اسی طرح بعد کی مذہبی اصلاحات اور عقلیت پرستی سے بھی انہیں اتفاق نہیں :

حاضر ہوا میں خدمتِ سید میں ایک رات
افسوس ہے کہ ہو نہ سکی کچھ زیادہ بات

بولے کہ تجھ پہ دین کی اصلاح فرض ہے
میں چل دیا یہ کہہ کے کہ آداب عرض ہے

اور سید کی مذہب اور سائنس سے تطابق سے متاثر ہو کر کہا :

سحر مسلم شکایت با خدا کرد   کہ نفسیرس بما دہدی چہا کرد

نظریات اور اعتقادات میں فرق نہ مخالف کی خوبیوں پر پردہ ڈال دیتے ہیں بلکہ انہیں بدترین شکل میں ظاہر کرتے ہیں ۔ سید احمد خان کی مفروضہ مادہ پرستی کی بابت اکبر نے کہا ہے :

کتا جیسے بفکرِ جیفہ دوڑے
یوں دہر سے نیچری خلیفہ دوڑے

جب مر کے چلے ہیں سوئے جنت حضرت
لٹھ لے کے امام ابو حنیفہ دوڑے

غرض یہ کہ اکبر کی شاعری کا موضوع مغربی تہذیب کی مادی اقدار اور ان کی کورانہ تقلید کے خلاف اعلانِ جنگ تھا ۔ یہ جنگ تقریباً نصف صدی تک جاری رہی ۔ لیکن اس کے نتائج کی بابت وہ کسی خوش فہمی میں مبتلا نہ تھے ۔ ان پر یہ ڈر ہمیشہ غالب رہا کہ یہ سیلاب کسی کے روکے نہیں رک سکتا ۔ انہوں نے خود کہا ہے :

رک نہیں سکتی کبھی آئی ہوئی   ہوگا تو وہی جو ہونا ہے

تو کیا اس سے یہ مراد لی جائے کہ اکبر ناکام رہے ، اور ان کے کلام کا ہماری ذہنیت یا تاریخ پر کوئی مثبت اثر مرتب نہیں ہوا ؟ اس نظریے سے بھی اتفاق نہیں کیا جا سکتا اکبر کی شاعری کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ ان کی مزاحیہ تنقید کی وجہ سے مغرب کی طاقت و عظمت کا وہ زبردست احساس جو ایک کابوس کی طرح ہمارے دل و دماغ پر طاری تھا ، اور جس نے ہمارے ذہنی اور عملی قویٰ کو مضمحل بلکہ معطل کر دیا تھا ، آہستہ آہستہ مفقود ہو گیا ۔ اس کی وجہ سے مغرب کی کمزوریوں اور نقائص کا ہمیں علم ہوا ، اور ہم میں خود اعتمادی کا جذبہ پیدا ہو گیا ۔ یہ در حقیقت ایک بڑا کارنامہ ہے ، اور مغرب کا جؤا اتار پھینکنے میں ایک مؤثر حربہ ثابت ہوا ۔ بات یہ ہے ، کہ اگر یہ مان لیا جائے کہ مغربی تہذیب اور اس کے نمائندے ہر طرح کامل اور قابلِ تقلید ہیں ،

تو ان کے خلاف احتجاج یا بغاوت کا کوئی اخلاقی پہلو نہیں رہتا ۔ بلکہ ان کی تقلید اور تتبع کا پہلو ایک فریضہ کی شکل اختیار کر لیتا ہے ۔ لیکن اگر یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ جسے ہم پانی سمجھ رہے ہیں در حقیقت سراب ہے ، اور مغرب کی اساسی اقدار اخلاق اور روحانی نہیں بلکہ تمام تر مادی ہونے کی وجہ سے خود غرضی اور ہوس پر مبنی ہیں ، تو ان سے نجات کی جد و جہد ایک اخلاقی اور قومی فرض کی صورت اختیار کر لیتی ہے ۔ جس سے کوئی مفر نہیں ۔

اکبر کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے مغربی تہذیب کے کمزور اور بد نما پہلوؤں سے پردہ اٹھا کر اور ہماری اپنی تہذیب کی حوصلہ افزا خصوصیات کی طرف ہماری توجہ منعطف کر کے ، ہمیں ذہنی آزادی اور خود اعتمادی کا سبق دیا ۔ انہوں نے ہمیں یہ بتایا کہ مشرق اور مغرب کی آویزش حق و باطل کی جنگ ہے ، اور اس وجہ سے وہ احساس کمتری جو ہماری طبائع پر بری طرح سوار تھی غائب ہوتی چلی گئی ۔ سیاست اپنی کامیابی اور اپنی برتری کے لیے ہر قدم پر اعتماد ہمارا ڈھونڈتی ہے ۔ انگریزوں کی عدیم المثال کامیابی کا ایک بڑا راز اینگلو سیکسن تفوق کا وہ نام نہاد تصور تھا ، جس کا اثر ان کی رگ و پے میں سرایت کر گیا تھا ، اور جسے وہ ہر موقع پر بطور حربہ استعمال کرتے تھے ۔ اکبر نے یہی تفوق کا جذبہ اپنے ہم وطنوں میں پیدا کر دیا ۔ یہ درست ہے کہ ہماری ذہنیتوں کو غلامیٔ مغرب سے آزاد کرنے میں اکبر اکیلے نہیں تھے ۔ اس جنگ میں چھوٹے بڑے ، ہندو مسلمان ، سکھ ، عیسائی برادروں کی تعداد میں شامل تھے ، اور ان کی شاندار خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ، لیکن جہاں تک اردو ادب کا تعلق ہے انہیں سالارِ کارواں کہنا بے جا نہ ہوگا ۔

آخر میں ایک اور بات کہنی ضروری ہے ۔ یعنی اگر یہ نظریہ مان لیا جائے ، کہ اکبر کی شاعری ایک خاص دور کی پیداوار ہے اور وہ ایک خاص قسم کے واقعات کے سدِّ باب یا ایک لائحہ عمل کی ترویج کے لیے معرضِ وجود میں آئی تھی ، تو اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ چونکہ وہ دور مکمل طور پر ختم ہو چکا ہے ، اور ہمیں اپنے عزائم میں فتح و نصرت حاصل ہو چکی ہے ، اس لیے اکبر کی شاعری اپنا فرض انجام دے چکی ہے ، اور ہمیں اب اس کی ضرورت نہیں ۔

لیکن یہ استدلال درست نہیں ۔ یہ ٹھیک ہے کہ تاریخ کبھی مکمل طور پر اپنے آپ کو نہیں دہراتی ، اور کوئی دو مواقع بالکل ایک جیسے نہیں ہوتے ، پھر بھی ان میں ایک عام مماثلت ہوتی ہے ۔ حیاتِ انسانی کی اساسی اقدار کبھی نہیں بدلتیں ۔ انہیں ابدیت کا مقام

حاصل ہے - افراد اور اقوام خود غرضی ، نا عاقبت اندیشی یا محض کشمکشِ حیات کی وجہ سے ان اخلاقی اقدار کو وقتی طور پر فراموش کرتی چلی آئی ہیں - وہ یہ سمجھتی آئی ہیں کہ مادی وسائل سب کچھ ہیں اور ان کے علاوہ ہر ایک چیز خواب و خیال ہے - لیکن پچھلے پچاس سال کی دو عالمی جنگوں نے یہ حقیقت واضح کر دی ہے کہ صرف مادیت اور خود غرضی کو مآلِ زندگی بنا لینا ایک خطرناک نظریہ ہے - اور انسان کی ترقی اور ابدی خوش حالی کا راز قوانینِ قدرت اور اخلاقیات کی پابندی میں مضمر ہے -

اکبر کی شاعری ان حقائق کی ایک زندۂ جاوید مثال ہے -

چھٹا باب

شبلی نعمانی

سوانح حیات

محمد شبلی نام ، نعمانی لقب[1] ، نسلاً راجپوت تھے - مئی ۱۸۵۷ء میں ضلع اعظم گڑھ کے نواح میں موضع بندول میں پیدا ہوئے - اپنے والد شیخ حبیب اللہ کے زیر سایہ پرورش پائی - شیخ صاحب ایک کامیاب وکیل ، کھاتے پیتے زمیندار اور تجارت پیشہ رئیس تھے - شبلی نے ابتدائی کتابیں اپنے گاؤں میں پڑھیں - کچھ عرصہ اعظم گڑھ کے عربی مدرسے میں بھی علم سیکھا - اس کے بعد غازی پور میں مولینا محمد فاروق چڑیا کوٹی سے فلسفہ و ادب کی چند کتابیں پڑھیں - کچھ مدت دیوبند میں رہے - چندے رامپور میں قیام کیا اور مولانا عبدالحق خیر آبادی سے معقول اور مولوی ارشاد حسین سے حدیث و فقہ کے اسباق لیے - مزید علم کی جستجو میں لاہور پہنچے اور مولانا فیض الحسن سہارنپوری (پروفیسر اورینٹل کالج لاہور) سے حماسہ پڑھا اور عربی ادب کا صحیح مذاق حاصل کیا - آخر میں حدیث کی طرف توجہ کی اور سہارنپور میں مولانا احمد علی سہارنپوری سے 'سنن ترمذی' کا درس لیتے رہے مگر تکمیل سے پہلے ہی ان کی اجازت سے اپنے والد کے ہمراہ ۱۸۷۶ء میں حج پر روانہ ہوئے - واپسی پر اعظم گڑھ میں کچھ عرصے کے لیے درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا - اہل حدیث کی رد میں دو رسالے لکھے - جن میں 'اسکات المعتدی' مشہور ہے - والد کے اصرار پر وکالت کا امتحان پاس کیا[2] ، مگر اس پیشہ میں دل نہ لگا - اسے ترک کرکے کلکٹر ضلع کی کچہری میں نقول نویس کی اسامی فروری ۱۸۸۲ء میں قبول کر لی - بہت جلد قرق امین کی اسامی پر ان کی تعیناتی ہوگئی ، مگر ان کا دل ملازمت سے اچاٹ ہو گیا - چندے تجارت میں مصروف رہے مگر کامیابی نصیب نہ ہوئی - ۱۸۸۲ء میں علی گڑھ میں عربی کے اسسٹنٹ پروفیسر کی اسامی خالی ہوئی تو شبلی نے اس کے لیے عرضی ارسال کی اور اپنے استاد مولانا فیض الحسن سے سفارش بھی کرائی - سر سید نے انھیں منتخب کر لیا - فروری ۱۸۸۳ء میں چالیس روپیہ ماہوار پر فارسی اور عربی کے استاد مقرر ہوئے اور سولہ (۱۶) سال تک اسی خدمت پر مامور رہے -

---

(۱) مولانا ابتدا میں سخت حنفی تھے - لہذا ان کے استاد محمد فاروق نے ان کا لقب نعمانی رکھ دیا -

(۲) ۱۸۸۰ء میں وکالت کا امتحان پاس کیا -

قیامِ علی گڑھ

شبلی کو علی گڑھ میں سر سید ، حالی ، پروفیسر آرنلڈ اور دوسرے بہت سے اہلِ علم اصحاب سے ملنے او رعلمی مجلسوں میں شامل ہونے کے مواقع بکثرت و بتواتر ملتے رہے اور یوں افادہ و استفادہ ہوتا رہا ۔ انہوں نے سر سید کے عظیم الشان کتب خانہ سے خوب استفادہ کیا ۔ یورپ کی تصانیف سے روشناس ہوئے ۔ مصری مطبوعات ملاحظہ کیں ۔ پروفیسر آرنلڈ سے فرنچ سیکھی اور انہیں عربی سکھائی ۔ علی گڑھ ہی میں انہیں مشاہیرِ اسلام کی مستند سوانح عمریاں لکھنے کا خیال آیا ۔ 'المامون' اور 'سیرہ النعمان' اسی زمانہ کی یادگار ہیں ۔ مئی ۱۸۹۲ء میں چھ ماہ کے لیے بلادِ اسلامیہ کے سفر پر روانہ ہوئے ۔ واپس آکر ۱۸۹۴ء میں 'سفر نامہ' شائع کیا ۔ جنوری ۱۸۹۴ء میں حکومت کی طرف سے انہیں شمس العلماء کا خطاب ملا ۔

حیدر آباد دکن

۱۸۹۶ء میں نواب وقار الامراء کے عہدِ وزارت میں کچھ مدت کے لیے حیدر آباد دکن میں قیام کیا ۔ ریاست نے تصنیفی کاموں کے لیے ان کا وظیفہ جاری کیا ۔ مئی ۱۸۹۸ء میں علی گڑھ سے ترکِ تعلق کرکے اعظم گڑھ چلے گئے ۔ 'الفاروق' مکمل کی ۔ ۱۹۰۱ء میں حیدر آباد پہنچے اور ناظم محکمۂ تعلیم مقرر ہوئے ۔ دو سو روپیہ ماہوار مقرر ہوئے ، بعد میں ترقی پائی ۔ چار برس تک محکمۂ تعلیم میں مختلف حیثیتوں سے خدمات سر انجام دیں ۔ سلسلہ کتبِ آصفیہ میں 'الغزالی' ، 'سوانح مولانا روم' ، 'علم الکلام' اور 'الکلام' ، 'موازنہ انیس و دبیر' شائع کیں ۔ ۱۹۰۳ء میں انجمنِ ترقی اردو کے پہلے سیکرٹری مقرر ہوئے ۔

ندوۃ العلماء

عام مسلمانوں کی اصلاح اور علماء کے اختلاف کو دور کرنے کے لیے ۱۸۹۴ء میں چند علماء کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا گیا ۔ مولانا شبلی اور مولانا عبدالحق صاحب دہلوی نے اس کے قواعد و ضوابط مرتب کیے ۔ ۱۸۹۶ء میں شبلی کی تحریک پر اس جماعت کے زیرِ اہتمام ایک دارالعلوم کی بنیاد رکھی گئی ۔ شاہجہان پور کے رؤسا نے اس کے قیام میں مدد دی ۔ مولانا ۱۹۰۵ء میں ندوہ کے معتمد مقرر ہوئے ۔ ۱۹۰۷ء میں ندوہ کی مالی اور انتظامی حالت ابتر ہو رہی تھی ۔ مولانا شبلی نے اپنی کوششوں سے ریاست رام پور اور بھوپال سے مالی مدد حاصل کی ۔ گورنمنٹ نے بھی مدد کی ۔ دارالعلوم کا سنگِ بنیاد یوپی کے گورنر سر جان ہیوٹ نے ۲۸ نومبر ۱۹۰۸ء کو رکھا ۔ مولانا سے اہلِ ندوہ مکمل

اتفاق نہ کر سکے ۔ معمولی معمولی باتوں پر ان کی مخالفت ہوتی رہی ۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ انہیں جولائی ۱۹۱۳ء میں مجبوراً ندوہ سے فارغ ہونا پڑا ۔ اسی ماہ اپنے گھر اعظم گڑھ چلے آئے ۔

شبلی کی بدولت ندوۃالعلماء نے بہت سے مفید کام کیے ۔ قدامت پرست علماء کو جدید علوم سے روشناس کرایا ۔ اشاعتِ اسلام کی ، دہلی آگرہ اور راجپوتانہ کی حدود میں مسلمان راجپوتوں اور جاٹوں کو آریہ ساجیوں کے لائے ہوئے فتنہ ارتداد سے بچانے میں جد و جہد کی ۔

اعظم گڑھ

لکھنؤ سے واپس ہو کر شبلی نے اعظم گڑھ میں قیام کیا اور اپنی تمام کوششیں سیرت النبیؐ کی تکمیل میں صرف کرنے لگے ۔ مصنفین کی ایک ممتاز جماعت قائم کرنے کا جو خیال انہیں ایک عرصے سے تھا اب اسے عملی صورت دی اور اپنی ذاتی جائیداد یعنی ایک مکان اور باغ نیز اپنا بیش بہا کتب خانہ دارالمصنفین کے لیے وقف کر دیا ۔

وفات

شبلی معدہ کی مختلف شکایتوں میں ایک عرصے سے مبتلا تھے ۔ اسی بیماری سے ۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء مطابق ۲۸ ذالحج ۱۳۳۲ھ بروز چہار شنبہ وفات پائی اور شبلی منزل کے ایک گوشہ میں سپردِ خاک کیے گئے ۔

شخصیت

'عجم کا حسنِ طبیعت عرب کا سوزِ دروں'

شبلی جامع الحیثیات شخصیت کے مالک تھے ۔ وہ قدیم و جدید کے ایک ایسے مخزن تھے جن کی دماغی وسعتوں میں اسلامی اقدار کی بالا دستی کے ساتھ جدید سائنس و فلسفہ کے انکشافات کی عظمت بھی پوری طرح موجود تھی ۔ وہ محقق تھے ، ادیب و شاعر تھے ، خطیب تھے ، متکلم تھے ، ان کی فلسفیانہ موشگافیاں قابلِ داد ہیں ۔ سیاست کے خار زار میں وہ کانگریس کے ہم نوا تھے ۔ تعلیم کے میدان میں وہ قدیم و جدید کے حسین امتزاج کے داعی تھے ۔ غرضیکہ انہوں نے مختلف موضوعات پر قلم اٹھایا ہے اور گونا گوں علمی مسائل سے بحث کی ہے ۔ علم کے میدان میں وہ کسی کے مقلد نہیں ہیں ۔ ان کی طبعِ سلیم میں تفوق پسندی کا ایک شدید جذبہ موجود تھا جو انہیں ہر مرحلے میں ایک انفرادی حیثیت دیتا

ہے اور ان کی رائے ہمیشہ آزاد ہوتی ہے ۔ وہ اپنے دعووں کے ثبوت میں مستند شواہد اور معقول دلائل پیش کرتے ہیں اور ان کا پر زور طرزِ بیان ان دلائل کو ایک ایسی تاثیر عطا کرتا ہے جو ان ہی کا حصہ ہے ۔

رنگِ طبیعت

شبلی کا رنگِ طبعت ان کے ماحول کے علمی تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے بخوبی معلوم کیا جا سکتا ہے ۔ انگریزی اقتدار میں مسلمانوں کو من حیث القوم جن خطرات کا سامنا کرنا پڑا ان کی تفصیل سر سید کے حالات میں بیان کی جا چکی ہے ۔ یہاں اختصاراً صرف اتنا کہنا کافی ہوگا کہ اس زمانے میں مسلمانوں کے مصائب کا جو علاج سر سید کے صوابدید کے موافق کیا گیا تھا اسے متوسط طبقے میں قبولیت حاصل ہو چکی تھی اور اس کے مفید نتائج بھی ظاہر ہو رہے تھے ۔ مثلاً جدید تعلیم سے بہرہ مند مسلمان مختلف سرکاری عہدوں پر فائز تھے اور ان کی معاشی حالت میں نمایاں ترقی ہو رہی تھی ۔ مگر یہ حقیقت بھی روزِ روشن کی طرح آشکارا ہو رہی تھی کہ مسلمانوں نے جدید تہذیب و تمدن کو اختیار کرکے جو فائدے حاصل کیے ہیں وہ ان نقصانات کے مقابلہ میں نہایت حقیر ہیں جو انہیں اپنی سابقہ روایات سے ہٹ جانے کی وجہ سے ہو رہے ہیں ۔ خود سر سید مرحوم کو اپنی زندگی میں اس کا احساس ہو چکا تھا کہ جدید تعلیم یافتہ اصحاب مذہب سے بیگانہ ہوتے جاتے ہیں ۔

اس زیاں کا احساس شبلی کو بڑی شدت کے ساتھ ہوا ۔ چونکہ اس زمانے میں عیسائی مشنریوں اور آریہ سماجیوں کے حملے اسلام پر بدستور جاری تھے ، نیز یورپ کے مستشرقین مسلمانوں کے علوم ، تاریخ اور تمدن کو اپنے اعتراضات کا نشانہ بنانے میں بڑی شدت اختیار کر رہے تھے اور ان کے اعتراضات انگریزی تعلیم کے رواج کے ساتھ ساتھ بسرعت پھیل رہے تھے ، لہذا شبلی نے ان تقاضوں کے پیشِ نظر اسلام کی حمایت میں قلم اٹھانا ضروری سمجھا ۔

اس زمانے کے علماء کا زورِ قلم تصوّف ، فقہ کے اختلافی مسائل اور فرقِ باطلہ کی تردید پر صرف ہوتا تھا ۔ ان پر مدرّسیت غالب تھی ۔ مگر شبلی نے جو قدیم علماء کی صحبت سے بھی فیض یاب ہو چکے تھے اور جدید تعلیم کے ارکان سے بھی مستفید ہوئے تھے بڑی دانشمندی کے ساتھ افراط و تفریط کے درمیان ایک ایسا متوسط راستہ اختیار کیا جو ملتِ اسلامیہ کے لیے دور رس کامیابیوں کا ضامن تھا ۔ مثلاً مذہب کی رو سے انہوں نے جارحانہ جنگ کی تردید کی مگر جہاد کی اہمیت کے قائل رہے ۔ پردہ اور تعلیمِ نسواں دونوں کی حمایت کی ۔ فقہی مسائل پر بحث کرتے وقت روایت یا درایت کے درمیان یک جہتی

ثابت کی[1]۔ اسی طرح انھوں نے اسلاف کے علمی کارناموں پر غائر نظر ڈالنے کے بعد ابتدا ہی میں یہ معلوم کر لیا تھا کہ اسلامی تاریخ کے درخشندہ پہلوؤں کو مسلمانوں کے سامنے پیش کرنا چاہیے - تاکہ ان کے دل میں اسلام اور مسلمانوں کے کارناموں سے محبت پیدا ہو - اس مقصد کے لیے انھوں نے یہ سکیم تیار کی کہ :

۱ - فلسفۂ حال کے اصول اس کا معتدبہ حصہ اردو زبان میں منتقل کیا جائے -

۲ - یہ بتایا جائے کہ فلسفہ حال کے کون کون سے مسائل مذہب کے خلاف ہیں - پھر ان مسائل کو یا رد کیا جائے یا مذہب سے انہیں تطبیق دی جائے -

۳ - جس قسم کے مضامین پر یورپ میں تصنیفات ہو رہی ہیں اور جن پر اسلامی تصنیفات بھی موجود ہیں ان میں موازنہ کیا جائے -

۴ - خالص اسلامی علوم مثلاً کلام ، فقہ ، اصول اور تفسیر کی تاریخ لکھی جائے اور ان پر ریویو کیا جائے -

۵ - مسلمانوں کی تہذیب و تمدن پر مضامین لکھے جائیں -

شبلی نے انہی خطوط پر مقالے لکھے ہیں اور کتابیں تصنیف کی ہیں - نیز 'دارالمصنّفین' کا قیام ، عمدہ کتابوں کی اشاعت اور ندوہ کا اہتمام انہی مقاصدِ جلیلہ کی خاطر عمل میں لایا گیا ہے -

اسلامی تہذیب کے خوش آیند پہلوؤں کا انکشاف

شبلی نے اسلامی طرزِ حکومت کی صحیح تصویر کشی کے لیے حضرت عمر فاروقؓ کی حیاتِ مبارکہ (الفاروق) کا انتخاب کیا اور یہ حقیقت ہے کہ انھوں نے محنت ، تلاش حقائق ، نکتہ سنجی اور دقیقہ رسی سے عہدِ حاضرہ کے اقتضا کے مطابق یہ تصویر ایسی عمدہ کھینچی ہے کہ دیکھنے والے کی زبان سے بے ساختہ سبحان اللہ اور ماشاء اللہ نکل جاتا ہے - انھوں نے بجا طور پر دنیا کے تاریخ دانوں کو یہ چیلنج دیا ہے کہ اس جامع شخصیت کی مثال اگر ان کے کسی مرقع میں ہے تو پیش کریں - گویا اس طرح شبلی نے اسلامی نظامِ سلطنت کی برتری ثابت کی ہے -

'علم الکلام' ، 'الکلام' اور 'الغزالی' میں مسلمانوں کی علمی سرگرمیاں زیرِ بحث آئی ہیں - 'شعر العجم' میں ان کی علم پروری ثابت کی ہے ، 'المامون' میں مسلمان خلفاء کی علم دوستی

---

(۱) شبلی نعمانی ، سیرہ النعمان -

کی تصویر ہے۔ علاوہ ازیں ان کے متعدد مقالات انہی باتوں پر مشتمل ہیں۔ اور متعصب معترضین کے ناروا الزامات کی تردید کرتے ہیں۔ مثلاً ہندوؤں کی طرف سے یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ مسلمانوں نے مذہبی تعصب کی وجہ سے ہندی علم و ادب پر کبھی توجہ نہیں کی۔ شبلی نے اس کا جواب 'مسلمانوں کی علمی بے تعصبی'[1]۔ 'بھاشا زبان اور مسلمان'[2] میں دیا ہے اور یہ ثابت کر دیا ہے کہ مسلمانوں نے سنسکرت اور بھاشا کی بہت خدمت کی ہے اور بھاشا میں ان کی متعدد تصانیف ہیں۔ 'موبدانِ مجوس'[3] میں یہ بحث کہ سلاطینِ ہند نے پارسی قوم کی سرپرستی کی ہے۔ تاریخ کا طالبِ علم جانتا ہے کہ جادوناتھ سرکار نے تاریخِ ہند میں اورنگ زیب عالمگیر پر الزامات کی بوچھاڑ کر دی ہے اور اس نیک دل حکمران کے خلاف دل کھول کر زہر اگلا ہے۔ شبلی نے 'اورنگزیب عالمگیر پر ایک نظر'[4] میں عالمگیر کے علمی، تمدنی اور انتظامی کارناموں کو جس خوبی سے پیش کیا ہے اس کے مطالعہ کے بعد اس قسم کی بے سرو پا باتیں کسی اہمیت کے قابل نہیں رہتیں۔ آرمینیا کے جھگڑے میں ترکوں پر بہت الزامات لگائے گئے تھے۔ ابھی ان کی تحقیق ہو رہی تھی کہ یورپین اہلِ قلم نے دنیا کو یہ غلط تاثر دینا شروع کر دیا تھا کہ مسلمانوں کے مذہب میں عیسائی رعایا سے ہر قسم کا ناجائز سلوک روا ہے۔ ۲ جنوری ۱۸۹۵ء کے ٹائمز میں پادری ملکم میکال نے لکھا کہ مذہبِ اسلام عیسائیوں کے حق میں ایک نہایت سخت اور ظالمانہ قانون ہے۔ اسلامی سلطنتوں میں ہمیشہ اس پر عمل درآمد ہوتا رہا ہے۔ اس مضمون کا ترجمہ کر کے جب دلی کے مشنریوں نے اسے ہندوستان میں خوب مشہور کیا۔ تو شبلی نے اس کا مدلل جواب 'حقوق الذمیین'[5] کے عنوان سے شائع کیا۔ اور تاریخی شواہد کی رو سے یہ ثابت کر دیا کہ اسلامی مملکتوں میں ذمیوں کے حقوق محفوظ رہے ہیں اور ان کے ساتھ فیاضی برتی گئی ہے۔ 'الجزیہ'[6] میں بھی یہی مسئلہ زیرِ بحث ہے۔

'تراجم' کے زیرِ عنوان ایک مفصّل مضمون یہ ثابت کرنے کے لیے لکھا ہے کہ عہدِ وسطیٰ میں مسلمانوں نے دنیا کی تمام قوموں کا علمی سرمایہ اپنی زبان میں منتقل کر لیا تھا۔ اگر دنیا میں مسلمانوں کا قدم نہ آتا تو یونان، مصر، ہند اور فارس کے علوم آج برباد ہو چکے ہوتے۔ 'اسلامی کتب خانے'[7]، 'اسلامی حکومتیں اور شفا خانے'[8]۔

---

(۱) مقالات شبلی، جلد دوم - ص ۲۱۷ - ۲۳۳ -
(۲) ایضاً، جلد دوم - ص ۷۹ - ۹۱ -
(۳) ایضاً، جلد پنجم - ص ۹۸ - ۱۰۵ -
(۴) مطبوعہ ۱۹۰۸ء -
(۵) مقالات شبلی، جلد اول - ص ۱۸۸ - ۲۲۶ -
(۶) ایضاً - ص ۲۲۷ - ۲۳۸ -
(۷) ایضاً - جلد ششم - ص ۱۵۲ - ۱۷۵ -
(۸) ایضاً - ص ۱۷۶ - ۱۹۳ -

'ہندوستان میں اسلامی حکومت کے تمدن کا اثر'(1) - 'مکنکس اور مسلمان'(2) - 'فلسفہ یونان اور اسلام'(3) - 'مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم'(4) - 'مدرسے اور دارالعلوم'(5) میں انہی حقائق کی وضاحت کی گئی ہے -

یورپ کی طرف سے یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ سلاطین اسلام غفلت شعار، عیش پرست اور بدکار تھے - شبلی نے 'جہانگیر اور تزک جہانگیری'(6) کے عنوان سے یوں تصریح کی ہے کہ اس روزنامچے میں نہایت جزئی کے ساتھ ایسے حقائق بیان ہوئے ہیں جن سے اس 'عیش پرست' سلطان کی امور ملکی سے دلچسپی، شغف انسانی تحقیقات، علم الحیوانات، مصوری، صناعی، سپہ گری، اور سیاحت کی انفرادی حیثیت موضوعات پر ایسی روشنی پڑتی ہے کہ اس کی عیش پرستی کا خیال تک نہیں رہتا -

'ابن رشد'(7) میں یہ حقیقت ثابت کی گئی ہے کہ ابن رشد اندلسی کا فلسفہ یورپ میں ایک مدت تک مقبول رہا ہے اور اس مسلمان عالم کی بدولت یورپ کی درسگاہیں علمی روشنی حاصل کرتی رہی ہیں - یورپ میں یہ الزام ضرب المثل کی صورت اختیار کر گیا تھا کہ مصر فتح کرنے پر مسلمانوں نے اسکندریہ کا کتب خانہ حضرت عمرؓ کے حکم سے جلا دیا تھا - شبلی نے 'کتب خانہ اسکندریہ' کے عنوان سے ایک تحقیقی مضمون لکھ کر اس الزام سے مخترع ابوالفرج یہودی کے ماخذ پر ایک کاری ضرب لگائی ہے اور تاریخی شواہد سے یہ ثبوت دیا ہے کہ یہ کتب خانہ مسلمانوں سے بہت پہلے روما کے بادشاہ جولیس سیزر کے حکم سے جلا دیا گیا تھا - مسلمانوں کے زمانے میں اس کا نام و نشان تک نہ تھا(8) -

ہم الزام اس کو دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا

جرجی زیدان نامی ایک عیسائی مؤرخ نے جو شام کا باشندہ تھا - پانچ جلدوں میں 'تاریخ تمدن اسلامی' مرتب کی تھی - اس میں ایسا اسلوب اختیار کیا تھا کہ بظاہر ایک بات اسلام کا حسن نظر آتی تھی مگر در پردہ ایک مکروہ الزام ہوتی تھی - اس کتاب کا

---

(۱) مقالات شبلی - ص ۱۹۳ - ۲۱۶ -
(۲) ایضاً - جلد ششم - ص ۲۳۵ - ۳۰۰ -
(۳) مقالات شبلی جلد ہفتم - ص ۱ - ۲۸ -
(۴) ایضاً - جلد سوم - ص ۱ - ۳۶ -
(۵) مقالات شبلی - جلد سوم - ص ۳۷ - ۷۷ -
(۶) ایضاً - جلد چہارم - ص ۸۲ - ۱۱۴ -
(۷) مقالات شبلی جلد پنجم - ص ۱۹ - ۶۳ -
(۸) مقالات شبلی جلد ششم - ص ۱۱۳ - ۱۵۱ -

انگریزی اور اردو میں ترجمہ ہوا اور اس کے کچھ حصے مولوی فاضل کے امتحان میں بھی رکھے جانے کا اہتمام کیا جا رہا تھا کہ شبلی نے اس کی فریب کاریوں کی طرف توجہ کی اور 'الانتقاد علی التمدن الاسلامی' کے نام ایک رسالہ عربی میں لکھا ۔ بعد میں اس کا ترجمہ "تمدنِ اسلامی مصنفہ جرجی زیدان کی پردہ دری"[1] کے زیرِ عنوان شائع کیا ۔

گبن نے اپنی تاریخ 'رومن امپائر' میں اختصاراً اس الزام کی تردید کی ہے ۔ مگر تفصیل کے ساتھ تاریخی شواہد کی روشنی میں شبلی ہی نے اس الزام کا رد کیا ہے ۔ اس مقالے میں معترض کی فریب کاریاں ، دجل و تلبیس ظاہر کی گئی ہے ۔ جرجی صریح کذب و دروغ سے کام لیتا ہے ۔ روایات کے متن میں خیانت و تحریف کا مرتکب ہوتا ہے ۔ غلط استنباط کرتا ہے ۔

تصانیف

شبلی کی تصانیف حسب ذیل ہیں ۔

(الف) تاریخی سوانح عمریاں

المامون (۱۸۸۷ء)

سر سید نے اس کا دیباچہ لکھا ہے ۔ اس میں شخصی جزئیات بیان کی گئی ہیں ۔ مامون الرشید کے ماحول کی عمدہ تصویر کھینچی ہے ۔ اس ماحول کو پیش نظر میں رکھ کر صاحبِ سوانح کی زندگی کے مختلف واقعات کی جو مفصل بیان ہوئی ہے وہ عمدہ ہے ۔

امین کی عیاسیوں کے مرقعے اور اس کا انجام اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ دلچسپی کے ساتھ ساتھ عبرت پذیری بھی موجود ہے ۔ مامون کی کمزوریوں اور غلطیوں کی تاویل کی گئی ہے ۔ گویا شبلی نے اپنے ہیرو سے اپنی محبت کا ایک غیر معتدل اظہار کیا ہے ۔ اس کے بعض عیوب کو عظیم ملکی اور سیاسی مصلحتوں کے تابع بنایا ہے ۔ یہ کتاب اس زمانے کی معاشرت اور بغداد کی تہذیب کا ایک بہترین مرقع ہے ۔

یہ تصنیف مولانا کی پہلی تصنیف ہے جو ان کے نامور فرمانروادانِ اسلامی کی پہلی کڑی ہے ۔ اس میں تاریخ 'بنی العباس' کا نچوڑ موجود ہے ۔ پادری پامر نے اپنی انگریزی کتاب 'ہارون الرشید کی لائف' میں مسلمان حکمرانوں پر مذہبی تعصب کا جو الزام لگایا تھا ۔ شبلی نے اس تصنیف میں ضمناً اس کا جواب تحریر کر دیا ہے ۔

---

(۱) مقالات شبلی جلد چہارم ۔ ص ۱۳۳ ۔ ۱۷۶ ۔

الفاروق (۱۸۹۹ء)

یہ کتاب ہندوستان کے کتب خانوں اور مصر و روم و شام کے علمی خزانوں سے استفادہ کرنے کے بعد لکھی گئی ہے - شبلی اپنی تمام تصانیف میں اسے زیادہ پسند کرتے تھے - اس میں فاروقِ اعظمؓ کے حالاتِ زندگی کے ساتھ ان کے عہدِ خلافت کی انتظامی، معاشرتی اور تمدنی خصوصیات تفصیل کے ساتھ بیان کی گئی ہیں - غیر مسلم رعایا سے متعلق جو احکامات حضرت عمرؓ نے صادر فرمائے تھے - انہیں یورپ کے مصنّفین نے غلط رنگ دے کر اسلام پر جو بہت سے ناروا حملے کیے ہیں - شبلی نے ان احکام سے متعلق ضروری شرائط بیان کرکے یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ احکام نہایت معقول تھے - حضرت عمرؓ کی دس سالہ خلافت کی ساری معاشرت، ملکی انتظامات، علمی، مذہبی اور ادبی زندگی کی جملہ خصوصیات درج کرکے یہ ثابت کیا ہے کہ تاریخ صرف جنگ و جدل کے واقعات یا سیاسی جوڑ توڑ اور محل سرائی سازشوں کا نام نہیں بلکہ انسانی تہذیب کی تصویر کا دوسرا نام ہے - بقول سید عبداللہ صاحب :

> "الفاروق میں تمدنی جزئیات کا جو متواجِ سمندر موجزن ہے اس سے مؤرخ کے عمیق مطالعہ، ذہانت، انتخاب، پرخلوص اور پرسوز محنت کا پورا پورا پتہ چلتا ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شبلی دورِ جدید کے ذہنی و علمی مذاق اور مطالبات سے اس قدر گہری واقفیت رکھتے تھے - جس سے یہ بھی نظر آتا ہے کہ ان کو قدیم چیزوں کو جدید رنگ میں پیش کرنے کی ضرورت کا کتنا احساس ہے"[1] -

چونکہ شبلی نے جا بجا جدید اصطلاحات استعمال کی ہیں اس لیے بعض لوگ ان پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ انہوں نے فاروقی عہد کے تمدن اور انتظام کی تصویر کشی میں مبالغہ سے کام لیا ہے - یہ اعتراض غلط فہمی پر مبنی ہے - شبلی نے اس وقت کے انتظامی ڈھانچے کے مختلف حصوں کو اگرچہ جدید اصطلاحوں کی رو سے بیان کیا ہے مگر ایسا کرتے وقت جزئیات کے بیان میں کوئی بات خلافِ واقعہ و سند نہیں لکھی ہے -

مسلمانوں کی فتوحات کی اسلامی اساس ظاہر کرنے کے بعد فاروقی فتوحات کا سکندر اور چنگیز کی فتوحات سے مقابلہ کرکے یہ ثابت کیا ہے کہ فاروقی فتوحات میں قانون اور انصاف سے سرمو تجاوز نہیں ہے اور یہ فتوحات دیگر فاتحین کے کارناموں کے برعکس دیرپا اور مستقل ہیں - حضرت عمرؓ کے نظامِ عسکری کا 'رومن امپائر' کے فوجی نظام سے اور

---

(۱) سید عبداللہ، ڈاکٹر، سر سید احمد خان اور ان کے نامور رفقاء - ص ۱۵۷ -

قوانینِ ملکی کا 'رومن امپائر' کے 'قوانینِ دوازدہ' (۱۲) سے مقابلہ کرکے اپنے محبوب ہیرو کی برتری دکھائی ہے ۔ مجموعی حیثیت سے یہ کتاب سیرۃ النبی کے بعد شبلی کی بہترین تصنیف ہے ۔ سوانحی لحاظ سے مکمل اور مفصل ہے ۔ مؤرخانہ غیر جانبداری نمایاں ہے ۔ چند مواقع پر صاحبِ سوانح کے مزاج کی تیزی کا اعتراف بھی کیا گیا ہے ۔ بقول مہدی حسن "یہ عمروں کی کہانی ہے"[1] ۔ اس کے ترجمے فارسی ، عربی اور انگریزی میں ہو چکے ہیں ۔ سر سید اس کتاب کے لکھے جانے کے حق میں نہیں تھے ۔ انہیں یہ خدشہ تھا کہ کہیں اس کی بدولت شیعہ سنی تنازعہ دوبارہ شدت نہ اختیار کر لے ۔ ان کی یہ رائے تھی کہ 'الفاروق' کے لکھنے والا ایسا شخص ہو جو شیعہ اور سنّی دونوں مذہبوں کی قید سے اپنے تئیں آزاد سمجھے[2] ۔

سیرۃ النعمان (۱۸۹۱ء)

سلسلہ ناموران اسلام کی یہ کڑی حضرت امام اعظم ابو حنیفہ نعمان بن ثابتؒ کی سوانح عمری ہے ۔ حصہ اول میں ان کے حالات و سوانحِ حیات کی تفصیل ہے ۔ حصہ دوم میں تدوینِ فقہ اور امام صاحب کے طریقِ اجتہاد کی وضاحت ہے ۔ آخر میں ان کے نامور تلامذہ کے حالات ہیں ۔ اس میں امام صاحب کی تصویر بشری عادات و اطوار کی مظہر اور سادہ ہے ۔ خوش اعتقادی سے علیحدہ رہ کر ان کی بعض بشری کمزوریوں کو بھی دکھایا گیا ہے ۔ ان کے فقہی اجتہادات سے متعلق لکھتے ہیں "ہم یہ عام دعویٰ نہیں کرتے کہ ان کے سب مسائل یقینی اور صحیح ہیں"[3] ۔ شبلی نے اس کتاب میں فقۂ حنفی کی عقلی اور تمدنی بنیاد کی وضاحت کی ہے اور امام صاحب کی رائے اور قیاس کو حدیث سے متفق بنایا ہے ۔

الغزالی (۱۹۰۲ء)

امام غزالی کی یہ سوانح عمری شبلی کے سلسلۂ کلامیہ کی ایک کڑی ہے ۔ اس میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ ان کے کمالات میں فلسفہ کو بڑا دخل ہے اور ان کی ذہنی اور روحانی تکمیل میں تصوّف کو خاص اہمیت ہے ۔ اس میں اجتہاد اور آزادیٔ رائے کی اہمیت واضح کی گئی ہے ۔ اگرچہ سوانحی لحاظ سے اس کتاب میں خامیاں بھی ہیں مگر علمی نقطۂ نظر سے یہ کتاب عمدہ ہے ۔ اس میں شبلی نے کلامی حالات بخوبی واضح ہیں ۔ اس کتاب کے لکھنے کی تحریک سر سید نے ۱۸۹۳ء میں کی تھی ۔

---

(۱) مہدی ، افادات مہدی ۔ ص ۴۴ ۔

(۲) مکتوب شبلی بنام نواب عماد الملک مرقومہ ۲۰ مارچ ۱۸۸۹ء ۔

(۳) حیات شبلی ، حصہ دوم ۔ ص ۲۶۲ ۔

سوانح مولانا روم (۱۹۰۳ء)

یہ کتاب بھی سلسلۂ کلامیہ سے متعلق ہے۔ اس میں مولانا رومی رح کو ایک حکیم کی حیثیت سے اور ان کی 'مثنوی معنوی' کو عقائد اور کلام کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ اگرچہ اس میں صاحبِ سوانح کی زندگی کے بعض دلچسپ واقعات درج کیے گئے ہیں تاہم زیادہ تر تعلق مطالب سے ہے جو ادبیات کا مکھن ہے۔ کتاب کا وہ حصہ نہایت قیمتی علمی سرمایہ رکھتا ہے جہاں رومی کا فلسفۂ حیات، جذب و مستی، سعئ دوام، ارتقاء روحانی بیان کیا گیا ہے۔ مہدی حسن افادی کی یہ رائے واقعی ہے کہ "شبلی نے بالکل ایک جدید حیثیت سے اس مثنوی پر نظر ثانی کی ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ تصوف یعنی فلسفۂ ظن کے سوا کلام و عقائد کی یہ بہترین تصنیف ہے جو اسلامی لٹریچر کی طرف سے پیش کی جا سکتی ہے"[۱]۔

سیرت النبی ؐ[۲] (۱۹۱۲ء)

سیرت النبی ؐ کے چھ حصے ہیں۔ حصہ اول کا مقدمہ نہایت جامع اور بصیرت افروز ہے۔ فنِ روایت پر جو محققانہ بحث کی گئی ہے وہ قابلِ قدر ہے۔ مصنف نے فنِ روایت کے بعد سیرت کے فن اور مقام پر تبصرہ کرکے سیرت پر جو یورپین تصانیف ہیں ان کی حقیقت واضح کی ہے۔ عرب کی تاریخ قبل از اسلام بیان کرکے حضور ؐ کا سلسلۂ نسب درج کیا ہے۔ ظہور قدسی، ہجرت اور غزوات مثلاً بدر، احد، صلح حدیبیہ وغیرہ پر تفصیل سے اظہارِ خیال کیا ہے مختلف سلاطینِ وقت کے نام حضور ؐ کے گرامی نامے لکھنے کی وضاحت کی ہے۔ فتح مکہ کے حالات و واقعات پر تبصرہ کیا ہے۔

حصہ دوم۔ اسلام کی امن کی زندگی، تاسیس حکومتِ الٰہیہ، وفات، متروکات، شمائل، معمولات، خطابت، عبادات، اخلاق، ازواجِ مطہرات اور ان کے ساتھ معاشرت ایسے عنوانات پر مشتمل ہے۔

حصہ سوم میں دلائل و معجزات، فلسفۂ قدیم، علمِ کلام اور معجزات، معجزات اور فلسفۂ جدید، امکانِ معجزات، یقینِ معجزات، غایتِ معجزات، معجزات اور قرآن،

---

(۱) مہدی، افادات مہدی۔ ص ۱۳۰۔

(۲) ۱۹۰۶ء میں شبلی جب بروڈہ گئے تو محمد علی صاحب (مدیر کامریڈ) نے انہیں سیرۃ النبی ؐ کی تالیف اور اس میں پروفیسر مارگولیوتھ کے اعتراضات کے جوابات لکھنے پر آمادہ کر لیا۔ اس عظیم کام کے لیے علمی معاونت اور سرمایہ کی ضرورت تھی۔ نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ فرمانروائے بھوپال نے مالی مدد دی۔ اور جون ۱۹۱۲ء میں یہ عظیم کام شروع کیا گیا۔

معراج ، شق صدر ، حضورؐ کی پیشگوئیاں ، مختلف معجزات اور خصائل نبویؐ کے عنوانات ہیں ۔ ان موضوعات پر مؤلف کی تحقیق قابل ستائش ہے ۔

حصہ چہارم میں منصب نبوت ، بعثت نبوی کے وقت دنیا کی اخلاقی حالت ، ظہور اسلام کے وقت عرب کی حالت مذہبی ، عربوں کی خصوصیات ، تبلیغ نبویؐ اور اس کے اصول ، کامیابی کے اسباب ، تعلیمات نبوی کی ہمہ گیری ، عقائد یعنی اللہ ، فرشتوں ، رسولوں ، کتاب الٰہی ، آخرت پر ایمان ، برزخ ، قیامت ، دوزخ اور جنت ، قضا و قدر اور ایمان کے نتائج پر مفصل اور مدلل بحثیں شامل ہیں ۔ اس حصہ میں نہایت نازک اور دقیق فلسفیانہ مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے ۔

حصہ پنجم میں عمل صالح ، عبادات بدنی و مالی مثلاً زکٰوۃ ، روزہ ، حج ، جہاد ۔ نیز عبادات قلبی مثلاً تقویٰ ، اخلاص ، توکل ، صبر اور شکر کے عنوانات پر مباحث ہیں ۔

حصہ ششم میں تعلیمات نبویؐ کے اثرات سے اس طرح بحث کی ہے کہ پہلے اسلام اور اخلاق حسنہ کا باب ہے ۔ اس کے بعد دنیا کے معلمین اخلاق میں حضورؐ کا امتیاز واضح کیا گیا ہے ۔

اس کے ساتھ ہی فلسفۂ اخلاق ، اسلام کی اخلاقی تعلیم کا تکمیلی کارنامہ ، حقوق و فرائض اور فضائل اخلاق کے موضوعات پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے ۔ اس کے بعد رذائل مثلاً شراب نوشی ، بغض و کینہ وغیرہ کی خرابیاں گنائی ہیں ۔ آخر میں آداب پر اظہار خیال کیا ہے ۔

'سیرت النبی' کی پہلی دو جلدیں مولانا شبلی کے اپنے قلم سے ہیں ۔ انہوں نے اس عظیم کام کے لیے ۱۹۱۲ء میں مجلس تالیف سیرت کے نام سے ایک کمیٹی بنائی تھی ۔ ریاست بھوپال کی نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ نے اس کار خیر کے لیے مالی مدد دی ۔ شبلی نے ۱۹۱۲ء میں اس تالیف کو شروع کیا ۔ جنوری ۱۹۱۳ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں ''سیرت النبیؐ بقدر امکان ہوتی جاتی ہے ۔ یہ عمر بھر کا حاصل اور وسیلۂ نجات ہے''[1]۔ یہ جلد ۱۹۱۳ء میں تیار ہو گئی تھی[2]۔ بقیہ جلدوں کا خاکہ طریق کار اور اہم تنقیدی باتیں بھی شبلی کے افکار کا ماحصل ہیں ، مگر ان جلدوں کی زبان اور اسلوب بیان

---

(۱) مکاتیب شبلی - حصہ اول - ص ۱۰۸ -

(۲) ایضاً - ص ۲۱۴ - سید سلیمان نے اسی جلد اول کو دو حصوں میں تقسیم کر کے جلد اول اور جلد دوم کی صورت میں شائع کیا ہے - ۱۹۱۷ء -

شبلی کے نامور شاگرد مولانا سید سلیمان ندوی کا ہے ، جس کی تصریح انہوں نے جلد اول کے دیباچہ میں کر دی ہے اور جہاں کہیں اپنے استاد شبلی سے اختلاف کیا ہے اسے بھی ظاہر کر دیا ہے ۔

ہم بلا خوفِ تردید یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اس موضوع پر اس درجہ کی کوئی مستند اور جامع تالیف سیرت کی کسی زبان میں آج تک نہیں لکھی گئی ۔ شبلی نے یہ تالیف اس غرض سے شروع کی تھی کہ اس سے اخلاق کی اصلاح اور تربیت کا کام لیا جائے ۔

شبلی کا نظریہء تاریخ

شبلی اسلامی تاریخ کے مطالعے اور مغربی مؤرخین کے افکار پر غور و فکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ تاریخ چیدہ چیدہ واقعات کے بیان کے ساتھ ساتھ انسانی تہذیب و تمدن کی سرگذشت بھی ہے ۔ اس کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ تہذیبِ انسانی کے ارتقاء کو واضح کرے ۔ وہ اس بات پر ایمان رکھتے تھے کہ اسلامی تہذیب کا عہدِ ماضی انسانی تمدن کا ایک درخشاں دور تھا ۔ لہذا آج بھی انسانی تہذیب کی آخری انتہائی ترقی اسی ماضی سے رجوع کرنے میں ہے ۔ یہی وہ مقام ہے جہاں شبلی کا تصورِ تاریخ سرسید سے مختلف ہو جاتا ہے ۔ سرسید کی یہ رائے تھی کہ زمانہ ترقی کر رہا ہے اور جو لوگ اسے تنزّل پذیر قرار دیتے ہیں وہ غلطی پر ہیں ۔ شبلی کے نزدیک ترقی اور کمال کا انحصار نیک جذبات پر ہے ۔ یہ نیک جذبات جس وقت بھی پیدا ہو جائیں انسانیت تنزّل سے نکل کر ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہو سکتی ہے ۔ لہذا وہ حال اور مستقبل کی تعمیر کے لیے ماضی کے تجربات سے فائدہ اٹھانے کے حامی ہیں ۔ علاوہ ازیں ان کا یہ نظریہ بھی ہے کہ کسی ملک و قوم کے جغرافیائی اور طبعی حالات اس کی تاریخ کے مدّ و جزر میں ایک نمایاں حیثیت رکھتے ہیں ۔

شبلی مغربی مؤرخین میں سے کارلائل کے نظریات سے کافی متاثر ہیں ۔ کارلائل کا یہ نظریہ ہے کہ تاریخ غیر معمولی افراد و نامور اشخاص کے لائے ہوئے تغیّرات و انقلاب کا نام ہے ۔ دوسرا مغربی مصنف جو شبلی کو زیادہ پسند ہے وہ گبن ہے ۔ گبن کی کتاب 'رومن امپائر' میں، جس بین الاقوامیت کی ترجمانی کی گئی ہے وہ ان کے مزاج کے موافق ہے ۔ علاوہ ازیں اس نے مسلمانوں کو مہذب اقوام میں شمار کر کے متعصب مغربی مؤرخین سے اختلاف کیا ہے ۔ اس کی یہ انصاف پروری بھی شبلی کے نزدیک قابلِ احترام ہے ۔ ان دو مشہور مؤرخین کے علاوہ شبلی بکل کی تاریخ 'تمدنِ انگلستان' سے بھی متاثر نظر

آتے ہیں - بکل نے معاشرت پر طبعی حالات کے اثرات بڑی خوبی سے ثابت کیے ہیں - شبلی اس اثر پذیری کے معترف ہیں اور وہ اپنی تصانیف میں انہی نظریات کی روشنی میں عمل پیرا دکھائی دیتے ہیں - علاوہ ازیں شبلی تاریخ میں شاعری کرنے کے مخالف ہیں اور حقیقت نگاری پر زور دیتے ہیں - یہی وجہ ہے کہ ان کے خیال میں تاریخ ادب سے زیادہ سائنس کی ایک شاخ ہے - انہوں نے اسلامی تاریخ پر گہری نظر ڈالی ہے اور روایت و درایت کے مسلمہ اصولوں کی خوبیاں ہمیشہ اپنے پیش نظر رکھی ہیں - انہوں نے یہ کہا ہے کہ سچائی اور جامعیت اسلامی تاریخ کے دو واضح کمالات ہیں - یورپین مصنفین نے مسلمانوں کے طریق نگارش کو نہ سمجھتے ہوئے کہیں دانستہ اور کہیں تعصب کی بنا پر تاریخ اسلام بالخصوص حضور علیہ الصلوٰۃ و السلام کی سیرت پاک بیان کرنے میں سخت نا انصافیاں کی ہیں - وہ جان بوجھ کر سیرت کی کتابوں سے کم اور 'مغازی' کی کتابوں سے زیادہ استفادہ کرتے ہیں اور مسلمان سیرت نگاروں کے ان اصولوں کی پروا نہیں کرتے جنہیں وہ جرح و تعدیل کرتے وقت شروع سے ملحوظ رکھتے چلے آئے ہیں -

مغربی مؤرخین ایک رائے پہلے سے قائم کر لیتے ہیں اور پھر واقعات کو اس کے مطابق ڈھالتے چلے جاتے ہیں - ان واقعات کے انتخاب میں ضعیف اور بے بنیاد روایتوں سے زیادہ مدد لیتے ہیں - اپنی بدنیتی کی بدولت اپنی رائے کو واقعات میں شامل کر کے دانستہ طور پر غلط بیانی اور جانبداری کے مرتکب ہوتے ہیں - حالانکہ بقول شبلی ایک مؤرخ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہونی چاہیئے کہ وہ ہر حال میں غیر جانبدار رہے - وہ حقائق کا ادراک کرے اور ان کی روشنی میں نتائج کا استنباط کرے -

یورپین مؤرخوں کی غلط بیانیوں کی ایک بڑی وجہ صلیبی جنگوں کا پیدا کردہ تعصب بھی ہے - جدید دور کی محدود اور تنگ نظر قومیت کا بھوت اس راسخ تعصب کے اثرات زائل نہیں ہونے دیتا -

شبلی بحیثیت سیرت نگار

سیرت نگاری میں بھی شبلی کا انداز ایک مؤرخ کا سا ہے - وہ سوانح عمریوں کو پھیلا کر تاریخ بنا دیتے ہیں اور وہ صاحب سیرت کے عہد کی ایک جامع تاریخ بن جاتی ہے - واقعات کی صداقت اور سچائی پر زور دیتے ہیں - اگرچہ وہ اپنے ہیرو کے بشری خط و خال دکھانے ضروری قرار دیتے ہیں - مگر وہ بالعموم ایسے بزرگ اشخاص کی سیرت لکھتے ہیں جن کی بشری کمزوریوں کا تذکرہ نہ کرنا بھی قابل ملامت نہیں ہوتا - اس کے

باوجود وہ اپنی مؤلفہ سیرت کی کتابوں میں فطرتِ انسانی کی جھلکیاں دکھانے میں کامیاب ہیں ۔

شبلی کے نزدیک سیرت کی کتابوں کا واضح مقصد ہونا چاہیے ۔ وہ اس مقصد کو اصلاحِ اخلاق اور تربیت سے موسوم کرتے ہیں ۔ ان کی تمام تصانیف اس معیار پر پوری اترتی ہیں ۔ اگرچہ وہ بنیادی طور پر ایک مناظر ہیں مگر مغربی علوم سے استفادہ کے بعد انہوں نے مناظرہ کا رنگ بدل دیا ہے ۔ اور زمانے کے مطابق اسے نہایت دلنشین صورت عطا کی ہے ۔ وہ حریفِ مقابل پر الزامی جوابات سے قطع نظر کر کے اسے مقبول مشاہیر کے سوانح حیات کو تحقیق اور سند کے ساتھ اس خوبی سے پیش کرتے ہیں کہ معترض کے زہر کا تریاق میسر آ جاتا ہے ۔

(ب) تنقیدی کتابیں

موازنۂ انیس و دبیر (۱۹۰۶ء)

حیدر آباد دکن کے زمانۂ قیام کی تصنیف ہے ۔ اس زمانے میں مولانا کلامیات کے ساتھ ساتھ ادبیات میں بھی خاصی دلچسپی لیتے نظر آتے ہیں ۔ انہوں نے شعری کی تنقید سے متعلق اصول و قواعد بیان کرنے کے بعد انیس و دبیر کے شاعرانہ کمالات کا موازنہ کیا ہے اور اس میں انیس کے محاسن دل کھول کر بیان کیے ہیں ۔ انیس کے اشعار کا انتخاب بھی عمدہ ہے ۔ یہی وہ مقام ہے جہاں شبلی کے اعلیٰ مذاقِ سخن کا معترف ہونا پڑتا ہے ۔ چودھری نظیر الحسن رضوی نے اس کتاب کا جواب 'المیزان' کے عنوان سے لکھا ہے اور وہ تمام خصوصیات جو شبلی نے انیس کے کلام میں دکھائی ہیں ۔ رضوی صاحب نے دبیر کے ہاں بھی ان کی موجودگی ثابت کی ہے ۔ شبلی نے اس سنجیدہ جواب کو پسند کیا ہے[1] ۔ اگرچہ یہ درست ہے کہ موازنہ در اصل معتدل موازنہ نہیں ہے اور اس میں مرثیہ گوئی کی تاریخ بھی مجمل اور سرسری ہے ۔ دبیر پر نقد و جرح بھی ادھوری ہے ۔ تاہم شبلی کے فیصلے اکثر و بیشتر صحیح ہیں اور 'المیزان' کی موشگافیاں انہیں غلط ثابت نہیں کر سکتیں ۔

شعرالعجم[2] (۱۹۰۹ء)

مولانا شبلی نے ۱۹۰۶ء میں چند ماہ کے لیے بنارس میں قیام کیا ۔ فرصت کے لمحات میں انہیں شعرائے عجم کی باتوں سے جی بہلانے کا کافی موقع ملا ہے ۔ بقول سید سلیمان ندوی

---

(۱) مکاتیب شبلی جلد اول ۔ ص ۳۲۷ ۔

(۲) حصہ اول ۱۹۰۹ء میں طبع ہوا ۔ (حصہ چہارم ۱۹۱۲ء میں ۔ پنجم ۱۹۱۸ء میں) ۔

انہیں اسی عرصے میں فارسی شاعری کی تاریخ یعنی 'شعر العجم' کی تالیف کا خیال آیا اور وہ ۱۹۰۷ء سے اس کام میں باقاعدگی کے ساتھ مصروف ہو گئے ۔

اس سے پہلے مولانا شبلی موازنہ لکھ چکے تھے ، جس سے ان کے تنقیدی ذوق اور مذاقِ سخن کا اندازہ اہلِ علم کو ہو چکا تھا ۔ 'شعرالعجم' نے ان کے تنقیدی رجحانات کو تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے ۔ جہاں تک شعراء ایران کے تذکروں کا تعلق ہے وہ بہت سی زبانوں میں شرح و بسط کے ساتھ موجود ہیں ، لیکن جو چیز 'شعرالعجم' کو ان پر ترجیح دیتی ہے وہ مولانا کی سخن فہمی کی حسن آفرینی ہے ۔ شعراء کے کلام پر ریویو کرتے وقت وہ ان کے اشعار جس خوبی کے ساتھ پیش کرتے ہیں وہ انہی کا حصہ ہے ۔ ان اشعار کا جب کسی دوسری زبان میں ترجمہ کیا جاتا ہے تو سارا لطف جاتا رہتا ہے ۔ اسی امتیازی وصف کی بنا پر 'شعرالعجم' کا پانچواں حصہ جو ان کی تحقیقات کا نچوڑ ہے فارسی میں ترجمہ ہو کر مقبول ہو چکا ہے ۔

'شعرالعجم' کی ہم عصر تصانیف میں مولانا محمد حسین آزاد کی 'سخندانِ فارس' اور پروفیسر براؤن کی 'تاریخِ ادبیاتِ ایران' کو بڑی اہمیت حاصل ہے ۔ 'سخندانِ فارس' میں مختلف موضوعات پر مضامین کو یکجا کر دیا گیا ہے ۔

پروفیسر براؤن کی 'تاریخِ ادبیاتِ ایران' فارسی نظم و نثر کی تفصیل ، تحقیق اور جزئیات کے بیان میں بے مثال تنقیدی سرمایہ رکھتی ہے ۔ پروفیسر براؤن اپنی تمام کاوش اور دقتِ نظر کے باوجود شبلی کا سا مذاقِ سخن نہیں رکھتے ۔ تاہم موصوف کی یہ فراخدلی قابلِ تحسین ہے کہ انہوں نے اپنے ایک ہم عصر یعنی شبلی کی عظمت تسلیم کی ہے اور ان کی 'شعرالعجم' سے طویل اقتباسات اپنی کتاب کی آخری جلدوں میں شامل کرکے صحیح مذاقِ سخن کی داد دی ہے ۔

حافظ محمود خان شیرانی نے 'شعرالعجم' پر مبسوط تنقید کی ہے اور اس میں تاریخی غلطیاں دکھائی ہیں[1] تاہم انہیں یہ تسلیم کرنا پڑا ہے کہ فارسی نظم کی تاریخ و تنقید پر

---

(۱) حافظ شیرانی کے یہ مضامین پہلے رسالہ اردو میں شائع ہوئے بعد میں انجمن ترقی اردو نے انہیں 'تنقید شعرالعجم' کے نام سے شائع کیا ۔ شیرانی صاحب نے چند ناموں اور تاریخوں کی اغلاط واضح کی ہیں ۔ وہ کسی قسم کا تنقیدی سرمایہ بطور اضافہ نہیں پیش کر سکے ۔ کئی مقامات پر ان کا قلم غیر محتاط ہو گیا ہے اور انہوں نے شبلی سے متعلق جلی کٹی باتیں بھی لکھ دی ہیں ۔ اہل علم کے نزدیک شیرانی صاحب کی ان نگارشات کی بدولت شبلی کی فضیلت علمی میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی اور شعرالعجم بدستور مقبول اور پسند خاطر ہے ۔

فارسی اور اردو میں اب تک جس قدر کتابیں لکھی گئی ہیں 'شعرالعجم' ان میں بغیر کسی استثنا کے بہترین تالیف مانی جا سکتی ہے۔

'شعرالعجم' کا چوتھا اور پانچواں حصہ اس لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ انہیں جلدوں میں شبلی کی وسعتِ نظر، بلندیٔ ذوق، جامعیت اور صحیح مذاقِ سخن کے جوہر نمایاں ہیں۔ ان کی خوبیٔ بیان اور انشا پردازی کا نقطۂ کمال ہوتا ہے اور 'شعرالعجم' کے امتیازی اوصاف آشکارا ہوئے ہیں۔

'شعرالعجم' کے مصنف نے مغربی تنقید کے اصولوں سے استفادہ بھی کیا ہے مگر اس کی بنیادی وضع قطع مشرقی ہے۔ اس کے اصول 'مقدمہ شعر و شاعری' کے مقابلے میں زیادہ مانوس ہیں اور یہ مصنف مغرب کے بڑے بڑے تنقید نگاروں کے ناموں کی بھرمار سے پاک ہے۔

'شعرالعجم' کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کے مطالعہ سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ شبلی کا ادبی ذوق مکمل اور پختہ ہے۔ ان کی لطافتِ طبع، روشن دماغی، رنگین مزاجی، جمالیاتی ذوق اور آرائشِ جمال کا خیال ہمیں مسحور کر دیتا ہے۔ اشعار کا انتخاب حسین ہے۔

شبلی بحیثیت نقاد

شبلی شاعری میں پیغام کی تلاش کرتے ہیں اور ایک اخلاقی روح کو ضروری سمجھتے ہیں۔ گویا اسے اعلیٰ انسانی شرافتوں اور کمالات کو ابھارنے کا کام سرانجام دینا چاہیے۔ آزادی، انقلاب اور حریت کا مبلّغ اور ترجمان ہونا چاہیے۔ ان کا یہ عقیدہ ہے کہ شاعری کا نصب العین یہ ہونا چاہیے کہ وہ مقصدیت کے باوجود فطرت کی تکمیل کرے اور حسن کے اعلیٰ اور مثالی پیکروں کی مصوّری کرے۔ گویا وہ جمالیت پر فریفتہ ہیں مگر افادیت سے قطع نظر کرنا گوارا نہیں کرتے۔

ان کے تنقیدی خیالات سے جو 'شعرالعجم'[۱]، 'عربی اور فارسی کا موازنہ'، 'موازنہ انیس و دبیر' اور 'شعرالعجم' کی صورت میں ہمارے پیشِ نظر ہیں، یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ شاعری کی قدیم تقسیم کے مخالف ہیں۔ ان کے نزدیک شعر کی حقیقت مصوری، جذبات و تخیل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ شاعری کی معنوی تقسیم کرتے ہیں۔ یعنی رزمیہ، عشقیہ،

---

(۱) مقالات شبلی، جلد دوم - ص ۲۹ - ۳۸ -
(۲) مقالات شبلی، جلد دوم - ص ۴۹ - ۵۶ -

فخریہ اور اخلاق وغیرہ اور اس تقسیم میں نفس ِ مضمون کے مقابلے میں جالیاتی اور تاثراتی عناصر پر زیادہ زور دیتے ہیں ۔ اس کی بدولت ان کی تنقیدیں انسانی فکر و تخیّل کے حسین مرقعوں کا الم بن جاتی ہیں ۔

(ج) کلامیات

شبلی بحیثیت متکلّم

شبلی نے سوانح مولانا روم میں رومی‌رح کو ایک حکیم کی حیثیت سے زمرۂ متکلمین میں شامل کیا ہے اور ان کی 'مثنوی' معنوی' کو عقائد اور کلام کی ایک عمدہ ترین کتاب ثابت کیا ہے ۔ انہوں نے جس طرح رومی‌رح کے اشعار سے علم ِ کلام کے بنیادی مسائل پر روشنی ڈالی ہے اس سے جہاں شبلی کی نکتہ آفرینی کا ثبوت ملتا ہے وہاں یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ انہیں علم ِ کلام سے ایک خاص قسم کا فطری لگاؤ تھا ۔ ان کا یہ شغف اور انہاک ان کی دو اہم مذہبی تصانیف 'علم الکلام' اور 'الکلام' میں بخوبی محسوس کیا جا سکتا ہے ۔

علم الکلام (۱۹۰۳ء)

یہ کتاب مسلمانوں کے علم ِ کلام یعنی مذہب کو فلسفہ سے تطبیق دینے کی مساعی کی ایک مفصّل تاریخ ہے ۔ چونکہ شبلی کے زمانے میں ملک کا مذاق اور حالت بھی اس بات کی مقتضی تھی کہ فلسفہ آمیز علوم کے مسائل قوم کے سامنے پیش کیے جائیں اور اجتہاد و آزادیٔ رائے کی تحریک کو صحیح بنیادوں پر چلایا جائے اس لیے شبلی نے 'الغزالی' میں بھی اسی مقصد سے فلسفیانہ مسائل پر دل کھول کر بحث کی ہے اور امام غزالی کی صرف انہی تصانیف پر خاص توجہ کی ہے جن میں عقلیات کے مباحث ہیں ۔

ہمارے نزدیک شبلی سے پہلے اس میدان میں سر سید کی جو مساعی ہیں انہیں نظر انداز کر دینا قرین ِ انصاف نہیں ۔ شبلی نے اپنے سلسلۂ کلامیہ میں علم ِ کلام سے متعلق جن مسائل کو چھیڑا ہے ان میں سے اکثر پر سر سید اپنی تصانیف میں طبع آزمائی کر چکے تھے ۔ مگر شبلی نے انہیں در خور ِ اعتنا نہیں سمجھا ۔ ہمارے نزدیک اس کی وجہ شبلی کی غیر معمولی احتیاط ہے جو انہوں نے سر سید کی نسبت علماء کے خیالات کو جانتے ہوئے روا رکھی ہے ۔ اگر شبلی اپنے سلسلۂ کلامیہ میں سر سید کا ذکر اہتمام سے کرتے تو علماء کا ان سے بدکنا ایک فطری امر تھا ۔ شبلی کی اس احتیاط کے باوجود قدامت پسند علماء نے شبلی کی مخالفت کی ۔

شبلی کی مخالفت علماء کے طبقہ کی جانب سے سر سید کے مقابلہ میں بہت کم ہوئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سر سید نے مسائلِ کلامیہ پر بحث کرنے وقت جدید کو بہت زیادہ اہمیت دی تھی اور قدیم سے صرف نظر کرنے میں ضرورت سے زیادہ جرأت دکھائی تھی۔ ان کے برعکس شبلی نے متوسط راستہ اختیار کیا تھا۔ 'علم الکلام' میں لکھتے ہیں:

"مدت سے میرا ارادہ تھا کہ 'علم الکلام' کو قدیم اصول اور موجودہ مذاق کے مطابق مرتب کیا جائے۔ لیکن میں نے اس کے لیے ضروری سمجھا کہ پہلے علمِ کلام کی تاریخ لکھی جائے"(۱)۔

چونکہ وہ قدیم سے اپنا رشتہ منقطع کرنا مضر سمجھتے تھے لہذا انہوں نے 'علمِ کلام' کو از سرِ نو مرتب کرتے وقت بزرگانِ سلف کے مقرر کردہ اصول سے حتی الامکان انحراف نہیں کیا۔ تاہم جہاں کہیں انہوں نے اجتہاد سے کام لیا ہے اپنی مخالفت کا سامان پیدا کیا ہے۔

اس تصنیف سے ظاہر ہے کہ شبلی کے نزدیک علمِ کلام کے دو شعبے ہیں۔ پہلا اسلامی فرقوں کے باہمی اختلافات سے متعلق ہے دوسرا فلسفہ و حکمت کے مقابلے میں ایجاد ہوا ہے۔ وہ ان دونوں شعبوں کو ضروری قرار دیتے ہیں اور ان کی تعلیم کو ضروریاتِ دینی میں شمار کرتے ہیں۔ انہوں نے اس کی وضاحت کی ہے کہ فلسفہ و حکمت کے مسائل اسلامی تاریخ کے ہر دور میں خاصے مقبول رہے ہیں اور مسلمانوں میں عقائد کا اختلاف اکثر سیاسی اسباب کی بنا پر ہوتا رہا ہے۔ انہوں نے یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ مسلمانوں کے فلسفہ کو تمام تر یونانی فلسفہ کی خوشہ چینی قرار دینا نا انصافی ہے۔ مسلمانوں نے فلسفۂ یونان سے بلا شبہ استفادہ کیا ہے، مگر انہوں نے اپنی طرف سے اس کے خزائن میں جو اضافے کیے ہیں وہ بھی اہم بلکہ عظیم تصور کیے جا سکتے ہیں۔

شبلی، امام غزالیؒ، امام ابن تیمیہؒ اور شاہ ولی اللہؒ سے بہت متاثر ہیں۔ اور وہ ان کے فیض سے اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ جہاں دین میں سنّت کے اتباع کو بڑی اہمیت اور اساسی حیثیت حاصل ہے وہاں دین کے اسرار و حکم کو عقل کی رو سے سمجھنا اور سمجھانا بھی دین کی ایک بہت بڑی خدمت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علم الکلام اور الکلام اس دور کی ذہنی کشمکش کا ایک حسین مرقّع ہیں۔

---

(۱) شبلی، علم کلام - ص ۴ -

الکلام (۱۹۰۴ء)

اس کتاب میں ان دو اصول سے مفصل بحث ہے : (۱) وجود باری (۲) نبوّت۔ باقی مباحث تبعاً اور ضمناً بیان کیے گئے ہیں۔ اس میں شبلی کے فلسفۂ مذہب کی وضاحت ہوتی ہے۔ ابتدا ہی میں وہ اس نقطے کی وضاحت کر دیتے ہیں کہ جدید علم کلام قدیم سے اس صورت میں مختلف ہے کہ قدیم میں صرف عقائد سے بحث ہوتی ہے مگر جدید میں عقائد سے کہیں زیادہ مذہب کے قانونی، اخلاق اور تمدنی مسائل کو عقل کی رو سے صحیح ثابت کرنا ضروری ہے مثلاً تعدّدِ نکاح، طلاق، غلامی، جہاد وغیرہ[1]۔ لہذا وہ ان مسائل پر مفصل بحث کرتے ہیں۔ وہ ثابت کرتے ہیں کہ اسلام تمدن و ترقی کا مانع نہیں، بلکہ اس کی راہِ عمل تمدن اور ترقی کی موّید ہے۔ اس سلسلے میں وہ مساوات، مذہبی بے تعصبی، حکومتِ جمہوری، تقسیمِ عمل، علمی ترقی کی انتہا نہ ہونا، رہبانیت کا مٹانا اور دنیا کا مرتبہ جیسے عنوانات پر اسلامی نقطۂ نظر سے روشنی ڈالتے ہیں۔ اسلام میں عورتوں کے حقوق اور 'رومن لا' کا موازنہ کر کے اسلامی اصولوں کی فوقیت جتاتے ہیں۔

شبلی کا یہ پختہ ایمان ہے کہ علومِ جدید سے ایمان متزلزل نہیں ہو سکتا۔ مذہب ایک فطری جذبہ ہے لہذا انسان اس سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ اسے ایک نہ ایک مذہب ضرور اختیار کرنا پڑتا ہے۔ اسلام چونکہ فطری مذہب ہے لہذا شبلی کے نزدیک اسلام میں سلیم الطبع انسانوں کے لیے بڑی جاذبیت ہے۔ انہوں نے اسلام کے اصولوں کو عقل کے مطابق ثابت کرتے وقت بہت سے مقامات پر اپنے دلائل کو مغربی مفکّرین کے افکار سے مربوط کیا ہے۔ عقل کو حقائق کے ادراک کا ایک مسلّم ذریعہ قرار دیا ہے، مگر ہر مرحلے پر اس کی بالادستی اور فوقیت کے مدعی نہیں بنتے ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سر سید سے الگ ہو جاتے ہیں۔ گویا ان کی روش معتدل ہے، مثلاً معجزہ کے باب میں وہ اشاعرہ اور معتزلہ کے بین بین ہیں۔ وہ فرقِ عادت کو مانتے ہیں لیکن ان کی یہ رائے ہے کہ اس کے لیے بھی اسباب ہوتے ہیں جو نظر نہیں آتے۔

'علم الکلام' اور 'الکلام' لکھ کر شبلی نے اردو ادب کو ایک نئے علم سے روشناس کیا ہے اور مذہب کی بہت بڑی خدمت کی ہے۔ اس زمانے میں مغربی علوم کی اشاعت اور فلسفۂ جدید کی شہرت کی بدولت مسلمانوں کے دلوں میں بہت سے شکوک پیدا ہو رہے تھے اور یہ بدگمانی پھیل گئی تھی کہ سائنس کے مسلّمات کو ماننے کے لیے مذہب سے انکار ضروری ہے۔ مسلمان علومِ جدیدہ کے گونا گوں فوائد کا احساس رکھنے کے باوجود مذہب کے دائرۂ عمل میں کسی ایسی مداخلت کو نقصانِ عظیم سمجھتے ہیں۔ لہذا اس امر کی

---

(۱) شبلی، الکلام - ص ٦ -

ضرورت کہ ان کے سامنے مذہب اور سائنس کا تصادم بھیانک صورت میں پیش کرنے کی
بجائے حکیمانہ رنگ میں بیان کیا ہے -

شبلی کی ان کتابوں کے دقیق مطالعہ میں یہ حقیقت بھی آشکار ہوتی ہے کہ دینِ اسلام
میں ہر نئی یلغار کا مقابلہ کرنے کی قوت اور استعداد موجود ہے - یہ یلغار علوم و فنونِ
جدیدہ کی ہو یا کسی تہذیب و تمدن کی اس کو روکنے کے لیے اسلام کے ترکش میں
تیروں کی کمی ہے ، مگر ہمت اور آزمائش شرط ہے -

(د) سفر نامہ

۱۱ - سفر نامہ مصر و روم و شام (۱۸۹۳ء)

شبلی مئی ۱۸۹۲ء میں ممالکِ اسلامیہ کے سفر پر روانہ ہوئے - قسطنطنیہ ، بیروت ،
بیت المقدس اور قاہرہ کے علمی خزانوں سے استفادہ کیا - نایاب کتب کے اقتباسات لیے -
وہاں کی علمی اور تعلیمی فضا سے متاثر ہوئے - ہندوستان واپس آ کر اس سفر کے تفصیلی
حالات 'سفر نامہ' کے عنوان سے شائع کیے - جامع ازہر کے طلبہ کی خستہ حالت اور ان کی
غلط تربیت پر اس کتاب میں خوب روشنی ڈالی گئی ہے - شبلی کو ترکوں سے جو محبت
تھی وہ اس کتاب سے بخوبی ظاہر ہوتی ہے - اس سفر کی بدولت شبلی کے خیالات میں جو
تبدیلی اور ترقی واقع ہوئی اس کا نتیجہ ندوہ کے تعلیمی نظام کی صورت میں نکلا -

(ہ) شعر و سخن

۱۲ - کلیاتِ اردو قصائد

(منظومات سیاسی و مذہبی وغیرہ) -

۱۳ - کلیاتِ فارسی

(اس میں دستۂ گل ، بوئے گل اور برگِ گل شامل ہیں) -

شبلی بحیثیت ایک شاعر

شبلی شاعرانہ دل و دماغ کے مالک تھے - انہوں نے اردو میں بھی شعر کہے ہیں
اور فارسی میں بھی - اردو میں ان کی نظمیں اعلیٰ درجہ کی ہیں - ان کی ابتدائی نظموں میں

'مثنوی صبحِ امید'[1] ایک ایسی مثنوی ہے جس میں مسلمانوں کی حالت اور سر سید کی تحریک کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ سر سید کا پاکیزہ کردار نہایت حسین پیرائے میں بیان کرکے ان کی جد و جہد کی اہمیت بتائی ہے۔ 'تماشائے عبرت'[2]، 'مسدسِ حالی' کے رنگ میں ہے۔

۱۹۱۱ء میں تقسیمِ بنگال پر مسلمان غیر معمولی طور پر مضطرب تھے کہ جنگِ بلقان[3] نے اس اضطراب میں اور اضافہ کر دیا۔ اس زمانے میں شبلی نے ایک نظم بعنوان 'شہر آشوبِ اسلام' لکھی ہے۔ اس نظم میں بڑا درد و اثر ہے۔ ان کی یہ مشہور نظم 'چراغِ کشتۂ محفل سے اٹھے گا 'دھواں کب تک' آج بھی جذبات میں ایک تلاطم پیدا کر دیتی ہے۔ جب ۱۹۱۳ء میں مسجد کانپور کا دردناک واقعہ پیش آیا تو انہوں نے 'ہم کشتگانِ معرکۂ کانپور ہیں' کے عنوان سے نظم لکھ کر مسلمانوں میں ایک نئی تڑپ اور زندگی پیدا کر دی۔

سیاسی نظمیں

ان کی سیاسی نظمیں ہندوستان اور اسلامی ممالک کے حالات پر ایک پر جوش تبصرہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان میں ہندوستان کی غلامی پر رنج و غم کا اظہار ہے اور عالمِ اسلام کی زبوں حالی پر دلگداز نوحے ہیں۔ ان نظموں نے پست ہمتی کو دور کیا ہے اور جذبات کو ابھارا ہے۔ کلام کا مجموعی اثر حوصلہ افزا ہے یاس انگیز نہیں۔ کانگریس کی حمایت اور مسلم لیگ کی مخالفت میں جو نظمیں ہیں ان میں طنز کا عنصر زوردار ہے۔

مذہبی نظمیں

ان نظموں کا ماحصل یہ ہے کہ اسلام کے زوال کا سبب، مذہب سے بیزاری اور بے عملی ہے۔ قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی طرح آج بھی ہم مذہبی تعلیمات پر عمل کرکے قعرِ مذلت سے نکل سکتے ہیں۔ ان کے نزدیک پستیٔ قوم کا سبب:

'ترکِ پابندیٔ اسلام ہے اسلام نہیں'

گویا وہ حالی اور سر سید کے بر عکس مسلمانوں کی پستی کا سبب ان کا مادی امور میں پیچھے رہنا نہیں بلکہ اصول اور روایاتِ اسلامی سے انحراف بتاتے ہیں۔

---

(۱) ۱۸۸۵ء۔
(۲) ۱۸۹۳ء۔

تاریخی نظمیں

ان کی تاریخی نظمیں واقعہ نگاری ، تحقیق ، تصویر کشی اور تاثیر کے کامیاب مرقعے ہیں -

طنزیہ نظمیں

ان نظموں میں بھی وہ بڑے کامیاب رہے ہیں - ان کے طنزیہ نشتر تیز اور پر تاثیر ہیں - مثلاً جنگِ بلقان کے موقعہ پر سر آغا مرحوم نے ترکوں کو یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ یورپ کو چھوڑ دیں تا کہ آئے دن کی لڑائیوں اور مصائب سے نجات پا کر امن میں آ جائیں - ان کے اس مضمون پر مسلمان بہت آزردہ ہوئے تھے - شبلی نے ایک طویل نظم میں اس مشورہ پر جو طنزیہ تبصرہ کیا ہے وہ قابلِ مطالعہ ہے - 'یونیورسٹی اور الحاق' ، 'لیگ کی دائم المرضی کی علتِ اصلی' ، 'بمبئی کی وفادار انجمن' طنزیہ شاعری کے عمدہ نمونے ہیں -

کلام کی خصوصیات

ہمت و جرأت ، سامراج پر چوٹیں ، سیاسیات کی مخالفت ، آزادی کی لگن ، انگریز پرستوں کی مخالفت ، علماء کو میدان میں آنے کی دعوت ، ان کی نظموں کی واضح خصوصیات ہیں - یہ باتیں ایسی مؤثر اور واضح طور پر بیان کی گئی ہیں کہ ان کا اثر ابھی دلوں سے زائل نہیں ہوا - شبلی نے واقعی ادبی اردو شاعری کی بدولت ایک طرف ایک ہندوستانی کی حیثیت سے تحریکِ آزادی کو تقویت دی ہے اور دوسری طرف بحیثیت ایک مسلمان کے عالمِ اسلام کی خدمت کو اپنا شعار بنایا ہے اور اہتمام کے ساتھ ترکوں کی بھرپور حمایت کی ہے - مثلاً :

مراکش جا چکا فارس گیا اب دیکھنا یہ ہے
کہ جیتا ہے یہ ٹرکی کا مریضِ سخت جاں کب تک

زوالِ دولتِ عثماں زوالِ شرع و ملت ہے
عزیزو فکرِ فرزند و عیال و خانماں کب تک

حالی اور آزاد نے اردو شاعری کے دائرہ خیال کو یقیناً وسیع کیا ہے ، لیکن سیاسی اور تاریخی نظموں پر شبلی نے سب سے پہلے کامیاب طبع آزمائی کی ہے - ان کی یہ نظمیں اردو شاعری میں قابلِ قدر اضافہ ہیں -

شیخ محمد اکرام نے 'شبلی نامہ' میں اور ڈاکٹر وحید قریشی نے 'شبلی کی حیات معاشقہ' میں جس لب و لہجہ میں شبلی کے ملکۂ حسن پرستی کی تصویر کشی کی ہے اور جس طرح بعض نا مناسب اشارے کرکے ان کی عفت و پاک دامانی پر شک و شبہ کو جنم دینے کی سعی کی ہے، ہم اس سے پوری طرح اتفاق نہ کر سکنے کے باوجود اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ شبلی زاہد خشک نہیں تھے۔ انھوں نے کبھی معصوم ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ نہ مجتہد ہونے کا اعلان کیا نہ امامت کا اور نہ وہ مسیح الکل ہونے کے مدعی ہوئے۔ بات صرف اتنی ہے کہ ہمارا یہ عظیم ادیب ایک حساس انسان تھا جس کے سینے میں ایک دل درد آشنا تھا۔ اس کے قلب و نظر میں مجازی حسن سے متاثر ہونے کی استعداد بھی تھی۔ یہ حسن جہاں کہیں بھی اسے نظر آتا ہے وہ اسے پسند کرتا ہے۔ کبھی نفیس اور کامل کتابوں کی صورت میں، کبھی مشاہیر عالم کے زندہ کارناموں کی صورت میں اور کبھی عطیہ زہرا کے نسوانی پیکروں میں حسن و کمال کی ضیا پاشیاں اسے متاثر کرتی ہیں۔ غرضیکہ شبلی کی حسن پرستی آسوب گاہ بمبئی تک محدود نہیں ہے:

گرچہ من مرد ہوسبازی و رندی نیستم
این چنین ہم گاہ گاہم اتفاق افتادہ بود

ان کی فارسی غزلیں واقعی بہت گرم اور پر تاثیر ہیں۔ اہل زبان کی سی فارسی اور نادر الکلام فارسی شعراء کے درجہ کی خوبیٔ بیان ملاحظہ کیجیے:

رد کردہ ساعی است بہ بازار محبت
آں داغ کہ اے لالہ ترا در جگر افتاد

☆ ☆ ☆

از سراپائے تنم آنچہ بجا ماندہ بہ ہجر
دیدۂ ہست و درو حسرت دیدارے ہست

☆ ☆ ☆

من فدائے بت شوخے کہ بہنگام وصال
بمن آموخت خود آئین ہم آغوشی را

☆ ☆ ☆

شبلی بیا کہ گرمیٔ بازار بمبئی
امسال نیز ہست بہ رنگے کہ پار بود

☆ ☆ ☆

ناوک نبرد بہ غمر و مرا بر جگر نشست
قربان شوم خطائے نگہ ہائے ناز را

۱۴ - مکاتیبِ شبلی - مکتوب نگاری

شبلی کے مکتوبات کے تین مجموعے ہو چکے ہیں -

(۱) مکاتیبِ شبلی حصہ اول ۱۹۱۶ء -

(۲) مکاتیبِ شبلی حصہ دوم ۱۹۱۷ء -

(۳) خطوطِ شبلی -

ان خطوط میں جو انھوں نے وقتاً فوقتاً اپنے وقت کے عالموں ، عزیزوں ، دوستوں ، شاگردوں اور چند شناسا خواتین کے نام ہیں مذہبی ، علمی ، تدریسی ، سیاسی اور اصلاحی مسائل کا بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے - مسلّم ہے کہ مشاہیر کے خطوط میں خصوصی طور پر ان کی زندگی کا روزنامچہ ایسے رنگ میں مرتب ہوتا ہے کہ اس میں ان کے دلی جذبات ، آزادی ، سچائی اور بے تکلفی کے ساتھ ظاہر ہوتے ہیں - سید سلیمان لکھتے ہیں :

> ''صرف ایک ہی شے انسان کی حقیقی شکل و صورت کا آئینہ ہو سکتی ہے ، اور وہ اس کے ذاتی اور نجی خطوط اور مکاتیب کا ذخیرہ ہے''(۱) -

مولانا عبدالحق صاحب خطوطِ شبلی کے دیباچہ میں اس حقیقت کی جانب یوں اشارہ کرتے ہیں -

> ''یہاں انسان بچپن کی سی سادگی سے بلا تصنع اپنے خیالات کو بیان کرتا ہے - گویا وہ کاغذ کے صفحے پر اپنا دل اور دماغ کھول کر رکھ دیتا ہے جس میں حرکت ، ہر خیال اور ہر تمنا جیتی جاگتی اور گھٹتی بڑھتی نظر آتی ہے''(۲)-

اردو ادب میں غالب کے خطوط کو بڑی اہمیت حاصل ہے - ان کا ایجاز اور بے تکلفی ، بذلہ سنجی اور نکتہ آفرینی قابلِ داد ہے - شبلی کے مکاتیب عموماً مختصر ہوتے ہیں - القاب و آداب کی بالعموم پروا نہیں کرتے ، اکثر بلا تمہید مطلب شروع کر دیتے ہیں - ان میں ادبیت کوٹ کوٹ کر بھری ہے - خوش طبعی اور شوخی نمایاں ہے - نکتہ آفرینی اور طنزیہ فقرہ بازی جو علمی کتابوں میں ہنگامہ پیدا کر دیتی ہے یہاں پر لطف اور حسین ہے - شبلی کے مقاصد علمی و قومی کے علاوہ ان کے فنی اور تنقیدی

---

(۱) مکاتیب شبلی - ص ۲ دیباچہ -

(۲) خطوط نویسی - مقدمہ -

اصولوں پر سفید روشنی پڑتی ہے ۔ ان کی گوناگوں مصروفیتیں معلوم ہوتی ہیں ۔ وہ جس طرح علمی راہنمائی کرنا چاہتے ہیں اس کا سراغ ملتا ہے ۔

"ان کے مکتوبات کا دائرۂ کار نہایت وسیع ہے ۔ اور ان کا دقیق مطالعہ شبلی کی زندگی کے بہت سے پوشیدہ گوشوں کو بے نقاب کرنا ہے ۔ بقول سید عبداللہ صاحب اگر ان مکاتیب میں کاروباری مطالب کی بھرمار نہ ہوتی تو یہ خطوط غالب کے مکاتیب کی صف میں رکھے جا سکتے"[1] ۔

ہماری ذاتی رائے یہ ہے کہ اگر ان خطوط کا انتخاب ان کے علمی ، سیاسی اور تعلیمی مباحث کی رو سے کیا جائے تو یہ مجموعہ اپنی وسعت علمی کی رو سے کسی مشہور شخصیت کے مجموعۂ مکاتیب سے ہرگز کمتر حیثیت کا نہیں ہوگا ۔

(و) صحافت ۔ الندوہ[2]

سر سید کے 'تہذیب الاخلاق' نے ملک میں جدید نظریات کی ترویج میں بڑا اہم کردار ادا کیا ۔ عقلی پسندی کا ذوق بڑھانے ، مسائل کی تحقیق میں واقعیت سے رغبت اور جذبات سے علیحدہ رہنے کا مذاق پیدا کیا ۔ اس رسالے کے مضامین بالعموم بے حد متین اور سنجیدہ ہوتے تھے ۔ ان میں منطق کا ردِ عمل دخل زیادہ ہے اور رنگینی کی کمی محسوس ہوتی ہے ۔

اس دور میں 'تہذیب الاخلاق' کے بعد شبلی کے 'رسالۂ الندوہ' کو بڑی اہمیت حاصل ہے ۔ ندوۃ العلماء کا یہ ترجمان قومی ، ادبی ، تعلیمی اور سیاسی مسائل پر شبلی کے افکار کی اشاعت کرتا رہا ۔ اس رسالے کی ادبی حیثیت بلند تھی اور اس کا نصب العین یہ تھا کہ ملک میں ایسا علمی اور ذہنی انقلاب پیدا ہو جس کی روح عین اسلامی ہو اور اسے مسلمانوں کے شاندار ماضی سے گہرا ربط و تعلق ہو ۔ اس کے مقالہ نگار اسلام کی عظمت کے جذبہ سے سرشار تھے اور وہ مذہب کے معاملے میں منفی نقطۂ نظر کی بجائے اثباتی انداز کے علمبردار تھے ۔

یہ رسالہ ۱۹۰۴ء سے ۱۹۱۲ء تک نکلتا رہا ۔ مولانا حبیب الرحمان خان شروانی ، مولانا شبلی ، مولانا ابوالکلام آزاد ، سید سلیمان ندوی اور عبدالسلام ندوی نے مختلف

---

(۱) سید عبداللہ ، ڈاکٹر ، سر سید احمد خاں اور ان کے نامور رفقا ۔ ص ۲۰۰ ۔

(۲) اس کی لوح پر یہ مقصد تحریر تھا ۔ "علوم اسلامیہ کا احیاء ، تطبیق معقول و منقول ، اور علوم قدیم و جدید کا موازنہ" ، ۳۲ صفحات کا یہ جریدہ اگست ۱۹۰۴ء میں منظر عام پر آیا ۔

اوقات میں اس کی ادارت کی - اس رسالے نے ملک میں جو علمی نتائج پیدا کیے ہیں - وہ حسب ذیل ہیں :

۱ - علماء کو جدید مسائل سے روشناس کیا -

۲ - اسلام اور تاریخ اسلام سے بہت سے اعتراضات دور کیے -

۳ - عربی علوم کی ضرورت سمجھائی گئی -

۴ - اسلام کے مذہبی اور علمی کارناموں کی وضاحت کی -

۵ - سرسید نے اردو زبان میں جو علمی مباحث شروع کیے تھے ، ان میں تنوع اور وسعت پیدا کی -

(ز) مقالات

شبلی بحیثیت مقالہ نگار

شبلی کی زندگی ہی میں ان کے چند تاریخی اور علمی مضامین 'رسائل شبلی' اور 'مقالات شبلی' کے نام سے شائع ہوئے - ان کی وفات کے بعد سید سلیمان ندوی نے ۸ جلدوں میں ان کے تمام مقالات اور مضامین موضوعات کی رو سے ترتیب دے کر 'مقالات شبلی' کے نام سے شائع کیے - پہلی جلد ۱۹۳۰ء میں اور آخری جلد ۱۹۳۸ء میں شائع ہوئی - ان جلدوں کے مقالات مذہبی ، ادبی ، تعلیمی ، تنقیدی ، تاریخی ، فلسفیانہ اور سیاسی مضامین پر مشتمل ہیں - ان کی تعداد ۱۲۹ ہے - یہ مقالے معارف علی گڑھ ، دکن ریویو ، انسٹی ٹیوٹ گزٹ ، تہذیب الاخلاق ، مسلم گزٹ اور الندوہ کی پرانی فائلوں سے تلاش کر کے یکجا کیے گئے ہیں - ان میں بہت سے مقالات سابقہ مطبوعہ مجموعوں کے بھی شامل ہیں - شبلی کے مندرجہ ذیل مقالات نہایت اہم ہیں - اور ان کی افادیت آج بھی بدستور ہے :

مقالہ	جلد
۱ - تاریخ ترتیب قرآن	جلد اول
۲ - حقوق الذمیین	ایضاً
۳ - الجزیہ	ایضاً
۴ - شعر العرب	جلد دوم
۵ - مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم	جلد سوم

۶ - تزکِ جہانگیری جلد چہارم
۷ - تمدنِ اسلامی جرجی زیدان ایضاً
۸ - المعتزلہ و الاعتزال جلد پنجم
۹ - ابنِ رشد ایضاً
۱۰ - علامہ ابنِ تیمیہ ایضاً
۱۱ - متنبّی ایضا
۱۲ - کتب خانۂ اسکندریہ جلد ششم
۱۳ - اسلامی کتب خانے ایضا
۱۴ - تراجم ایضا
۱۵ - فلسفۂ یونان اور اسلام جلد ہفتم
۱۶ - اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر مطبوعہ ۱۹۰۸ء

ان مقالات میں مسلمان حکمرانوں کا انتظامِ عدالت ، ان کے عہد کی تعمیرات ، حسنِ معاشرت اور نظم و نسق کی خوبی واضح ہوتی ہے ۔ مستشرقین کی بے اعتدالی ، نا انصافی ، اور ناروا تہمت تراشی کے کئی شواہد ملتے ہیں ۔ اسلام کے شاندار ماضی سے دلچسپی پیدا ہوتی ہے ۔ اور مغربی استعمار کا لایا ہوا احساسِ کمتری دور ہونے لگتا ہے ۔ شبلی کی قوتِ استدلال ، زور دار طرزِ تحریر ، علمیّت اور تحقیق کی بدولت ان کے دعووں کو تسلیم کرنا پڑتا ہے ۔ اور یہی ایک اعلیٰ مقالہ نگار کی کامیابی کا بیّن ثبوت ہوتا ہے ۔ شبلی کے مقالات نے ہندوستانی مسلمانوں کے اندر ملّی احساس پیدا کرنے میں بڑی مدد دی ہے ۔

شبلی کا اسلوبِ بیان

شبلی کی تحریریں جوشِ بیان سے لبریز ہیں ۔ اس کی ایک وجہ ان کی طبیعت میں شدید احساسِ فخر ہے ۔ ان کی قوتِ بیان مسلمہ اور ان کی تحریروں کا ظاہری منطقی ڈھانچہ چست اور منظم ہے ۔ ان کی علمیت ، مقصدیت اور خلوص ، ان کی تحقیق اور تاریخی شواہد ۔ ان کی تحریروں کو پر رعب اور با وقار بنا دیتے ہیں ۔ ان کی نثر بظاہر سادہ ہوتی ہے مگر اس میں حسن و پرکاری کی ایک شان ہوتی ہے ۔ فقرے چست ، جملے منظم ، تشبیہیں کم

مگر جہاں ہیں موقع محل کی رو سے نفیس ہیں ۔ استعارے لطیف اور کنائے دلپذیر ہیں ۔ فارسی کی رنگین ترکیبیں ، اردو کے بر محل محاوروں کے ساتھ مل کر کلام میں رعنائی پیدا کرتی ہیں ۔ انہیں ترکیبوں سے ان کی نثر میں چستی بھی ہے اور چمک بھی ۔ اختصار اور ایجاز بھی ہے اور لطف و جوش بھی ۔ جب مبالغہ آرائی سے کام لیتے ہیں تو بیان کی اثر انگیزی بڑھ جاتی ہے ۔ یہ الگ بات ہے کہ یہی مبالغے اور استعارے کبھی کبھی تاریخی حقیقت پسندی کی راہ میں رکاوٹ بھی بن جاتے ہیں ۔

شبلی افراط و تفریط میں انتہا تک پہنچ جانے کے عادی نہیں ہیں ۔ ان کی نثر میں شاعرانہ رمزیت بھی حسن پیدا کرتی ہے ۔ ان کی ترکیبیں ان کی خوش مذاق اور ذوقِ سلیم کی آئینہ دار ہیں ۔ وہ الفاظ اور تراکیب کی مدد سے صوتی اثرات پیدا کر کے عبارت میں اثر اور جوش پیدا کرنے پر بخوبی قادر ہیں ۔ ان کی یہی خوبی اسلام کے ماضی کی شاندار تصویریں کھینچنے میں انہیں کامیابی بخشتی ہے ۔ بلا ضرورت الفاظ و مترادفات ان کے ہاں نہ ہونے کے برابر ہیں اور وہ معقولیت اور موضوع سے خلوص کی بدولت ان لفظی تکلفات میں نہیں پڑے ۔ الفاظ کی تکرار سے ایک بے ساختگی پیدا کر لیتے ہیں ۔ اس بے ساختگی میں خشکی نہیں ہوتی اور تصنّع اور تکلف کا احساس بھی نہیں ہوتا ۔ یہ بے ساختگی سر سید اور حالی کی تحریروں کی بے ساختگی سے مختلف ہے ۔ سر سید کے ہاں یہ اس طرح ہے کہ وہ عبارت کی صفائی اور رعنائی کا کوئی خاص اہتمام نہیں کرتے اور ان کا اندازِ بیان فطرتی معلوم ہوتا ہے ، مگر بعض عبارتیں ادبی شان سے معرّا ہوتی ہیں ۔ بعض میں صوتی ناگواری اور بے جا طوالت ہوتی ہے اور بعض بےحد پیچیدہ ہو جاتی ہیں ۔ حالی کی تحریر اگرچہ سر سید کی تحریر سے زیادہ شستہ اور ہموار ہے ، مگر ان کی عبارت کہیں کہیں سست اور بے مزہ محسوس ہوتی ہیں ، ان میں بے ساختگی کے باوجود وہ لطف نہیں ہوتا جو شبلی کی نثر کا خاصہ ہے ۔ شبلی کی عبارتیں حسین سانچوں میں ڈھلی ہوئی معلوم ہوتی ہیں اور اس کے باوجود کسی قسم کے تصنّع اور تکلف کا اہتمام نظر نہیں آتا ۔ ان میں موضوع اور بیان کا تعلق نہایت خوبصورت انداز میں موجود ہے ۔

شبلی کی نثر کی ایک نمایاں خصوصیت ان کی طنز نگاری ہے ۔ وہ بالعموم فارسی یا اردو کا کوئی بر محل شعر لکھ کر اپنے مخالف پر اسے پیرائے میں طنز و تعریض کر جاتے ہیں کہ ان کی چابکدستی اور حاضر دماغی کی داد دینی پڑتی ہے ۔ ان کا وار بالعموم انگریزی تعلیم یافتہ گروہ ، کوتاہ نظر مسلم علماء ، یورپ کے متعصّب مؤرخین اور مطلب پرست سیاست دانوں پر ہوتا ہے ۔ ان کی طنز میں ظرافت کم اور شوخی زیادہ ہے ۔ یہ حقیقت ہے کہ شبلی سب سے پہلے ایک مؤرخ ہیں ، اس کے بعد ایک فلسفی یا حکیم ۔ انہوں نے جو کچھ

لکھتا ہے اس میں وضاحت ، صراحت ، سادگی اور سلاست نمایاں ہے ۔ ان کے دعوے واضح ، دلائل محکم ، منطقی طرزِ استدلال واضح اور صاف ہے ۔ ان کی بیانیہ نثر میں شاعرانہ ایمائیت کی بدولت خیال کا عنصر بڑھ جاتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا سارا انداز بیان ایک مؤرخ کا اندازِ بیان نہیں رہتا بلکہ ایک پرجوش خطیب کے خطبے کا سا رنگ و آہنگ اختیار کر لیتا ہے ۔

شبلی کی منظر نگاری ان کی بیانیہ نثر سے عمدہ ہے ۔ یہ بات 'المامون' اور 'الفاروق' میں نمایاں ہو گئی ہے ۔ ان کے مکالمے بر محل اور توجہ خیز ہوتے ہیں ۔ جہاں ان کا اندازِ بیان شاعرانہ ہو جاتا ہے وہاں دانائی کے ساتھ اس امر کا خیال رکھتے ہیں کہ تاریخی حقائق کے اظہار میں ان کی جزئیات تک صحیح اور مستند رہیں اور صحیح صورتِ حال تشبیہ و استعارہ کی نذر نہ ہو جائے ۔

سر سید احمد خان کے نقطۂ نظر سے اختلاف

سر سید کے افکار و خیالات کی مخالفت میں مختلف علمی حلقوں میں جو تحریک پیدا ہوئی اسے مسلمانوں کے ذہنی و نقلی تاریخ لکھنے والے بالعموم رَدِّ عمل کا نام دیتے ہیں ۔ اس رَدِّ عمل میں بعض مخالفین مدت العمر تک بے اصولی کے مرتکب ہوتے رہے ۔ بعض مخالفین ایسے بھی تھے جو صدقِ دل کے ساتھ سر سید کی پالیسی کو مسلمانوں کے لیے نقصان رساں سمجھتے تھے ۔ اس گروہ میں شبلی کو شامل کرتے ہوئے ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ وہ سر سید کے با اصول مخالفین کی صفِ اول میں ممتاز شخصیت تھے ۔ شبلی نے جو مخالفت کی اس نے آگے چل کر سر سید کے خیالات کو کافی حد تک پھیلایا اور ان کے مقصد یعنی احیاء ملتِ اسلامیہ کو پورا کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا ۔ سر سید اور شبلی میں جو اختلاف تھا اس کو ان دونوں عظیم انسانوں کے پرستاروں نے اپنے اپنے مزاج اور نقطۂ نظر کی رو سے بالعموم غلط رنگ دینے کی کوشش کی ہے[1] ۔ ہماری دیانتدارانہ رائے یہ ہے کہ ان دونوں کا اختلاف ان کی شخصیت کا اختلاف ہے ۔ دونوں کے مدارج مختلف تھے ۔ اصلاح کرنے کا طریقِ کار لازماً مختلف ہو گیا ۔ شبلی علی گڑھ آنے سے پہلے غالی حنفی تھے ۔ انہوں نے جن علما سے فیض اٹھایا تھا ان کا رنگ ان پر غالب تھا ۔ اس زمانے کی تصانیف مثلاً 'اسکات المعتدی' اور رسالہ 'قرأت فاتحہ خلف الامام' اس وقت کے حنفی علماء کے مذاق کے عین مطابق ہیں ۔ گویا ان کا رنگ مناظرانہ تھا ۔ علی گڑھ میں قیام کے زمانے میں ان کے خیالات میں وسعت پیدا ہوئی ۔ تاریخ کے مطالعہ کا شوق پیدا ہوا ۔ یورپین تصانیف کی بدولت تحقیق کی نئی منزلیں ان پر واضح ہوتی رہیں ۔ یہیں انہوں نے ناموران اسلام کے

(۱) شیخ محمد اکرام صاحب نے 'شبلی نامہ' میں اور سید سلیمان ندوی مرحوم نے 'حیات شبلی' میں ۔

سوانح حیات لکھنے کی ابتدا کی ۔ ان کی شاعری نئے خیالات و موضوعات سے آشنا ہوئی ۔ ان میں انگریزیت کا مادہ موجود تھا اور ایسے انہوں نے علی گڑھ کے ماحول سے اثر قبول کیا ۔ اگر وہ یہیں تک رک جاتے تو ان کا شمار سرسید کے پیرو اور ایک ادیب کی حیثیت سے ہوتا رہتا جو سرسید کی تحریک کا ایک جزو تھا اور بس ۔ مگر انہیں اسلام کی حرمت اور مسلمانان ہند کی حمیت مخفی سمجھتے ہیں ۔ شبلی کے اندر ہمدردی کے ساتھ ساتھ اثر اندازی کا جوہر بھی موجود تھا ۔ انہوں نے بہت جلد علی گڑھ کے ماحول پر ناقدانہ نظر ڈالی شروع کر دی ۔ مولوی محمد سمیع صاحب کو ۱۸۰۰ء میں لکھتے ہیں :

> "یہاں آ کر میرے تمام خیالات مضبوط ہو گئے ۔ معلوم ہوا کہ انگریزی خوان فرقہ نہایت مہمل فرقہ ہے ۔ نہیں کرنا چاہئے دو ۔ خیالات کی وسعت، ہمی آزادی، بلند ہمتی، ترقی کا جوش برائے نام نہیں ۔ بس خالی کوٹ پتلون کی نمائش کہ ہے"[1] ۔

اگرچہ شبلی بہت سے امور میں سرسید کے معاون رہے مگر ان کی طبیعت کا اختلاف ان کی انفرادیت کو اجاگر کرتا رہا ۔ لکھتے ہیں :

> "رائے میں ہمیشہ آزاد رہا ۔ سرسید کے ساتھ ۱۶ برس رہا، مگر پولیٹکل مسائل میں ہمیشہ ان سے مخالف رہا اور کانگرس کو پسند کرتا رہا اور سرسید سے بارہا بحثیں رہیں"[2] ۔

اگرچہ دنیوی جاہ و اعزاز، ناموری و شہرت کے لیے علی گڑھ کا میدان بہت اچھا تھا مگر وہ اپنے ارادوں، ولولوں اور ارمانوں کو پورا کرنے کے لیے علی گڑھ سے علیحدہ ہو گئے ۔

شبلی کے علمی کارناموں کو دیکھتے ہوئے سرسید اور ان کے طریق کار میں حسب ذیل تفاوت معلوم ہوتا ہے ۔ ہمارے خیال میں اسی فرق کی بدولت شبلی تعلیم اور سیاست میں سرسید سے اختلاف رکھتے تھے :

۱ ۔ شبلی نے مغربی اقدار پر اسلامی نقطۂ نظر سے تنقید کی :

سرسید مغربی علوم اور جلوۂ دانش افرنگ سے اتنے متاثر ہوئے کہ انہوں نے اس پر مناسب تنقید نہیں کی ۔

---

(۱) مکاتیب شبلی ۔ ص ۵۰ ۔
(۲) مکتوب مطبوعہ معارف نومبر ۱۹۲۳ء ۔ ص ۳۹۴ ۔

۲ - سر سید ترقی کے شوق میں اسلامی پس منظر سے کٹ گئے تھے - اسلام سے محبت رکھنے کے باوجود مغرب سے مسحور تھے - شبلی نے اسلام کے ماضی کی طرف صرف اشارے ہی نہیں کیے بلکہ اس کی عظمت کو واضح کرکے اس سے قلبی تعلق پیدا کرنے میں رہبر کا کام کیا -

۳ - سر سید عقل پرست تھے - شبلی نے عقل و دلیل کو مذہب کا خادم تصور کیا -

۴ - سر سید تعلیم کے میدان میں جدید کو فوقیت دیتے تھے - شبلی قدیم و جدید میں امتزاج کے خواہاں تھے -

ماہرِ تعلیم

شبلی ہندوستان میں ایک ایسے نظامِ تعلیم کی داغ بیل ڈالنے کے خواہشمند تھے جو مسلمانوں کی قومی ضرورتوں کا پورا پورا خیال رکھتے ہوئے انہیں علومِ جدیدہ سے بھی بہرہ مند کر سکتے - اس مقصد کے لیے انہوں نے اصلاحِ تعلیم پر متعدد مضامین لکھے - ان میں مروجہ نصابِ تعلیم کی خرابیاں بتائیں - علاوہ ازیں ایک ماہرِ تعلیم کی حیثیت سے عربی مدارس کی اصلاح کے لیے ایک تحریک شروع کی - ان کی اس تحریک کی سر سید کی تحریک اصلاح سے کچھ کم مخالفت نہیں ہوئی - حکومت ان سے بدظن تھی - بہت سے علماء ان کے اصلاحی طریق کار نصاب کے مخالف تھے - لیکن شبلی نے علماء کی مخالفت کی چنداں پرواہ نہیں کی - ان کے نزدیک قدامت پرستی کا مرض لاعلاج تھا - ۱۸۹۶ء میں ان کی کوششوں سے لکھنؤ میں دارالعلوم ندوہ کی بنیاد رکھی گئی[1]- ان کے پیشِ نظر جدید علماء کا ایک ایسا طبقہ تیار کرنا تھا جو قدیم و جدید کا جامع ہو - اس مقصد کے لیے مروّجہ درسِ نظامی کے نصاب میں ضروری تبدیلیاں ناگزیر تھیں - یہ اصلاح کی طرف پہلا قدم تھا - جو جتنا ضروری تھا اتنا ہی خطرناک بھی تھا - شبلی اپنی تمام کوششوں کے باوجود جدید نصاب کو پوری طرح رائج نہ کر سکے - انگریزی اور سنسکرت کو بڑی مشکلوں سے داخلِ نصاب کرایا - تا کہ یورپین مصنفوں کے اعتراضات کا جواب دینا آسان ہو، نیز آریہ سماجیوں کا منہ بند کیا جا سکے - دینی مدرسوں سے قطع نظر شبلی جدید سکولوں اور کالجوں کے اجرا کے بھی حامی تھے - انہوں نے اعظم گڑھ میں ایک ہائی سکول 'شبلی سکول' کے نام سے جاری کیا - ان کی یہ پختہ رائے تھی کہ سکولوں اور کالجوں میں اسلامی فقہ، تاریخ اور عقائد کی کتابیں پڑھائی جانی چاہیئیں - بالخصوص امام غزالیؒ، ابنِ رشدؒ اور شاہ ولی اللہؒ کی تعلیمات کو رواج دینا وہ ضروری سمجھتے تھے -

---

(۱) شبلی ۱۹۰۵ء سے ۱۹۱۳ء تک دارالعلوم کے معتمد رہے -

گویا شبلی نے بدلے ہوئے حالات میں جب کہ قوم مغرب سے مرعوب ہو کر شدید قسم کی ذہنی غلامی میں مبتلا ہو چکی تھی ایک قابلِ قدر اور مفید طریقِ کار وضع کیا جس کے دو گونہ مقاصد تھے - پہلا یہ کہ قدیم و جدید کی خوشگوار آمیزش کر کے ترقی کی منزل کی طرف بڑھا جائے - دوسرا یہ کہ علومِ اسلامیہ کو نئی زندگی دے کر سارے ملک میں ایک علمی اور ذہنی انقلاب لایا جائے - ان کی مساعی جمیلہ کافی حد تک بار آور ہوئی ہیں - ان کے تلامذہ نے 'دار المصنفین' کے زیرِ اہتمام ان کی روایات کو زندہ رکھا - اگرچہ شبلی علماء کو ایک مرکز پر جمع کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے تاہم قدیم و جدید کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے میں انہوں نے نمایاں کردار ادا کیا -

شبلی اور سیاست

سر سید کے سیاسی افکار پر دوسرے باب میں مفصل بحث موجود ہے - یہاں اختصاراً صرف اتنا لکھنا کافی ہوگا کہ وہ کسی ایک تحریک کے حق میں نہیں تھے جو مسلمانوں کو ۱۸۵۷ء کی طرح کسی نئے عذاب میں مبتلا کر دینے والی ہو - وہ ہمیشہ انگریزوں کے خیر خواہ رہے اور ان کی سیاست بمنشہ انگریز حکمرانوں کی خوشنودی کی ہمنوا رہی - ان کے برعکس شبلی بالعموم انگریزوں کے مخالف رہے - انہوں نے کانگرس کی حمایت کی - 'پان اسلام ازم' کو تقویت دی ، مسلم لیگ کی مخالفت میں نظمیں لکھیں ، اس کے طریقِ کار پر تنقید کی ، جنگِ بلقان کے موقع پر ترکوں کی حمایت کی - مسجد کانپور[1] کے حادثے پر دل ہلا دینے والی نظمیں لکھیں - مولانا کے سیاسی مضامین 'مسلم گزٹ' لکھنؤ میں شائع ہوتے رہے - ان میں 'مسلمانوں کی پولٹیکل کروٹ' بہت مشہور ہے - ان کے دوسرے مضامین تقسیم بنگال کی تنسیخ ، بلقان کی جنگ ، مسلم یونیورسٹی کے مطالبات ، کانپور کی مسجد ، مسلم لیگ کی اصلاح اور مسلمانوں میں صحیح پالیٹکس کا مذاق پیدا کرنا وغیرہ موضوعات سے متعلق شائع ہوئے - ان کی یہ رائے تھی کہ "مسلم لیگ نہ آج ، بلکہ ہزار برس کے بعد بھی پالٹکس میں ماہر نہیں بن سکتی - . . . مسلم لیگ کا نظامِ ترکیبی کیا ہے وغیرہ وغیرہ"[2]-

شبلی نے مسلم کی اصلاح کے لیے جو کچھ لکھا - اس پر بعض لوگوں نے ان سے خط و کتابت کی - اور ترقی و اصلاح کی ضرورت کو محسوس کیا - لکھتے ہیں :

"قوم کے بعض نہایت ممتاز لیڈروں نے ہم کو یقین دلایا ہے کہ آپ کے سالانہ اجلاس میں لیگ کا نظام قریباً بدل دیا جائے گا اور جو تجویزیں ہم نے

---

(۱) یہ واقعہ ۱۳ - اگست ۱۹۱۳ء کو پیش آیا - اسے ہندوستان کی سیاست میں بڑی اہمیت حاصل ہے -

(۲) سلیمان ندوی ، حیات شبلی - ص ۶۱۸ - ۶۱۹ -

لیگ نے اصلاح کی پیش کی ہیں قریب قریب لیگ اسی قالب میں ڈھل جائے گی اگر یہ صحیح ہے تو پھر ہم کو لیگ کی مخالفت کی کوئی وجہ نہیں ہوگی اور اور ہم سب سے پہلے اس کے آگے گردن جھکا دیں گے"[1]۔

گویا شبلی ہندو مسلمانوں کی مصالحانہ اتحاد کے مسئلے میں کوشاں تھے اور وہ مسلمانوں کو عظیم مقاصد کی جانب لے جانا چاہتے تھے۔

☆ ☆ ☆

کتابیات

نمبر شمار	نام مصنف	نام کتاب	مطبع	سن اشاعت
۱	ندوی ، سید سلیمان	حیات شبلی	معارف اعظم علی گڑھ	۱۹۴۳ء
۲	شیخ محمد اکرم	موج کوثر	مرکنٹائل پریس لاہور	۱۹۴۰ء
۳	ایضاً	شبلی نامہ	تاج آفس بمبئی	سن ندارد
۴	سید عبداللہ ، ڈاکٹر	سر سید احمد خان اور ان کے نامور رفقاء کی اردو نثر کا فکری اور فنی جائزہ	مکتبہ کاروان ، لاہور	۱۹۶۰ء
۵	عبداللطیف اعظمی	شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں	حیدر آباد دکن	۱۹۴۵ء
۶	شبلی نعمانی	سیرۃ النبیؐ حصہ اول	مطبع معارف اعظم گڑھ	۱۹۱۴ء
۷	ایضاً	علم الکلام	عمدۃ المطابع لکھنؤ	۱۹ ۴ء
۸	ایضاً	الکلام	ایضاً	۱۹۰۶ء
۹	ایضاً	مکاتیب شبلی	مطبع معارف اعظم گڑھ	۱۹۲۸ء
۱۰	ایضا	سیرۃ النعمان	ایضا	۱۹۳۶ء

---

(۱) سلیمان ندوی ، سید ، حیات شبلی - ص ۶۲۲ -

١١	ایضا	مقالاتِ شبلی	ایضا جلد اول	١٩٣٠ء
	,,	,,	جلد دوم	١٩٣١ء
	,,	,,	جلد سوم	١٩٣٢ء
	,,	,,	جلد چہارم	١٩٣۴ء
	,,	,,	جلد پنجم	١٩٣٦ء
	,,	,,	جلد ششم	١٩٣٧ء
	,,	,,	جلد ہفتم -	
	,,	,,	ہشتم	١٩٣٨ء
١٢	مہدی، حسن افادی	افاداتِ مہدی	ایضا	١٩٢٣ء

ساتواں باب

دوسرے مصنّفین

اس عہد کی نثر کا مختصر جائزہ

اردو زبان اپنی ابتدائی منازل اور مختلف مراحل سے گزرنے کے بعد جب انیسویں صدی کی ابتدا میں فورٹ ولیم کالج کے ایوان میں داخل ہوئی تو اس نے ایک کروٹ لی اور پرانی روش کو پوری طرح خیر باد کہا ۔ اس نے تکلّف و تصنّع کے راستہ سے ہٹ کر مقفیٰ و مسجع عبارت سے اپنے دامن کو بچانے کی کوشش کی اور سادگی و سلاست کو اپنی بقا و نشو و نما کے لیے ضروری سمجھا ۔ اردو کی اس اہم ضرورت اور تبدیلی کے لیے فورٹ ولیم کالج کے اندر اور باہر دوسرے لوگوں نے اردو کو تکلّف و تصنّع سے آزاد کرانے کی کوشش کی ۔ پھر بھی میر امن اور دوسرے مصنّفین کی کوششوں کے باوجود انیسویں صدی کے نصف اول میں ایک حد تک تکلّف و تصنّع اور مقفیٰ و مسجع عبارت کا اعتبار اور رواج قائم رہا ۔ پھر غالب نے اس روایت کے خلاف کھلم کھلا علمِ بغاوت بلند کیا اور اپنے رقعات کے ذریعہ اردو کو سلاست اور سادگی سے ہمکنار کرنے کی بھرپور کوشش کی ۔ غالب اپنی اس کوشش میں کامیاب تو ہوئے ، لیکن اردو کو مسائلِ زندگی اور علمی حقائق سے روشناس نہ کرا سکے ۔ اس کام کو سر سید نے بطریقِ احسن انجام دیا ۔ انہوں نے مغربی اثرات سے متاثر ہوکر اردو نثر کو رنگینی ، تصنع اور عبارت آرائی کے راستہ سے ہٹا کر سادگی کی ایک نئی راہ دکھائی ۔

سر سید سے پہلے اردو کا دائرۂ مذہب ، تصوف ، تاریخ اور تذکرہ نویسی تک محدود تھا ۔ سائنس ، فلسفہ اور دوسرے علوم و فنون کو اس میں سمونے سے لوگ دامن بچاتے تھے ۔ اس لیے اردو نثر دنیا کے مسائل کی ترجمانی سے قاصر تھی ۔ سر سید نے پہلی مرتبہ اس روایت سے ہٹ کر اردو نثر کو مادیت ، عقلیت اور مقصدیت سے روشناس کرایا اور خیالی دنیا کے گورکھ دھندے سے نکال کر حقائق نگاری کی راہ پر گامزن کیا ۔ ان کی اس تحریک سے ان کے رفقاء اور بعد میں آنے والے خاصے متاثر ہوئے اور انہوں نے سر سید کے مکتبِ فکر سے وابستگی اور اس روش کے اپنانے کو ہی اردو کی نشو و نما کے لیے ایک نیک فال تصور کیا ۔

اس دور کی نثر نے اپنے دامن کو اتنا وسیع کیا کہ نہ صرف مضمون نویسی ، مقالہ

نگاری ، صحافت اور قصہ نویسی پر غالب آئی بلکہ ٹھوس سائنسی مسائل ، ریاضی ، کیمیا اور طبیعیات کو بھی اپنی جولانگاہ بنایا ، جس کی بدولت اردو کا نو عمر پودا دیکھتے دیکھتے ایک تناور درخت بن گیا اور وہی اردو جسے بے مایہ یا کم مایہ ہونے کا طعنہ دیا جا رہا تھا ایک سرمایہ دار زبان بن گئی ۔ اب اردو نثر کا میدان نگارش ، طرزِ ادا ، رنگینی اور عبارت آرائی تک محدود نہ رہا بلکہ مدعا اور مطالب نگاری اس کا اصلی اور بنیادی مقصد بن گیا ۔

انیسویں صدی کے نصف آخر کے مصنفین نے خاص طور پر طرزِ بیان کو اولیت کا درجہ دینے کی بجائے مضمون اور مواد کو اہمیت دی اور تکلف و تصنع کے خلاف آواز اٹھائی ۔ اس اجتماعی کوشش نے جہاں اردو نثر کو سر سید تحریک کے زیر اثر مقصدیت بخشی وہاں اردو نثر ٹھوس علمی و ادبی مسائل کے اظہار کا ذریعہ بننے کے ساتھ ساتھ کاروباری اور روزمرہ کی زندگی میں پیش آنے والے مسائل کی زبان بھی بنی ۔ اب اسے بچوں کے لیے ہلکے پھلکے ادب کی تخلیق کا ذریعہ بننے کا بھی موقع ملا اور مختلف درجوں کے نصابوں کا ذریعۂ اظہار اور ذریعۂ تعلیم بننے میں بھی اس نے نمایاں حصہ لیا ۔ ذیل میں ہم اس دور کے دیگر نثر نگاروں کا ذکر کریں گے ۔

نواب محسن الملک سید مہدی علی

آپ کا نام سید مہدی علی اور باپ کا نام میر ضامن علی تھا ۔ سلسلۂ نسب سادات بارہہ سے جا کر ملتا ہے ۔ اس خاندان کی ایک شاخ اٹاوہ میں آ کر آباد ہو گئی تھی ۔ اٹاوہ کے اس معزز خاندان میں سید مہدی علی ۹ دسمبر ۱۸۳۷ء کو پیدا ہوئے[1] ۔ ابتدائی تعلیم گھر میں ہوئی ۔ پھر عربی و فارسی کی تعلیم بعض علماء سے حاصل کر کے تفسیر و حدیث میں خاص مہارت حاصل کی ۔ اگرچہ انگریزی کی تعلیم باقاعدہ حاصل نہ کی تھی ، لیکن خدا داد ذہانت اور علم سے فطری لگاؤ ہونے کی وجہ سے ذاتی محنت اور دلچسپی کی بدولت اتنی انگریزی سیکھ لی تھی کہ انگریزی اخبارات کا مطالعہ آسانی سے کر لیتے تھے ۔

تعلیم سے فراغت کے بعد سترہ اٹھارہ برس کی عمر میں سب سے پہلے دس روپے ماہانہ پر کلکٹری میں ملازم ہوئے ۔ ۱۸۵۷ء میں اہلمد اور پھر سر رشتہ دار ہو گئے ۔ غیر معمولی ذہانت اور محنتِ شاقہ کی وجہ سے ۱۸۶۱ء میں تحصیلدار ہوئے ۔ اس دوران میں انہوں نے قانون کی دو کتابیں 'قانونِ مالی' اور 'قانونِ فوجداری' لکھیں ، جن کی اشاعت سے ان کی

---

(۱) زبیری ، محمد امین ، تذکرۂ محسن ، مطبوعہ جامع برقی پریس دہلی و نقوش شخصیات نمبر ۲ ، ص ۔ ۱۳۹۶ ۔

قابلیت اور قانون دانی کی دھوم مچ گئی - ۱۸۶۳ء میں ڈپٹی کلکٹری کے مقابلہ کے امتحان میں کامیابی حاصل کرکے ۱۸۶۷ء میں مرزا پور کے ڈپٹی کلکٹر مقرر ہوئے -

حیدر آباد کے وزیر اعظم سر سالار جنگ نے ان کی شہرت سنی تو ۱۸۷۴ء میں ان کی خدمات حاصل کرکے بارہ سو روپے ماہانہ پر ناظم بندوبست اور صیغۂ مال کا انسپکٹر جنرل مقرر کیا اور پھر محکمۂ بندوبست کا کمشنر بنا دیا گیا اور ۱۸۷۶ء میں ریونیو سیکرٹری اور ۱۸۸۴ء میں سر سالار جنگ کے انتقال کے بعد فنانشل سیکرٹری اور پولیٹیکل سیکرٹری بنائے گئے - اب ان کی تنخواہ تین ہزار روپے ماہانہ تھی اور محسن الدولہ ، محسن الملک کا خطاب بھی عطا ہو چکا تھا -

ریاست حیدر آباد میں بیس سال تک بڑی حسن اسلوبی سے خدمات انجام دینے کے بعد ۱۸۹۳ء میں آٹھ سو روپے ماہانہ پنشن لے کر علی گڑھ آ گئے اور بقیہ عمر کالج کی ترقی اور قومی خدمت میں بسر کی - ۳۱ جنوری ۱۸۹۹ء کو کالج کے سکرٹری منتخب ہوئے - ۱۶ اکتوبر ۱۹۰۷ء کو شملہ میں انتقال کیا اور شملہ سے آپ کی میت علی گڑھ لائی گئی اور سر سید کے پہلو میں دفن کیے گئے -

محسن الملک کی ادبی زندگی مختلف شکلوں میں ہمارے سامنے آتی ہے - سر سید سے تعلق کی وجہ سے انہوں نے 'تہذیب الاخلاق' میں سلسلۂ مضامین شروع کیا - ۲۰ مضامین کا ایک مجموعہ ملک فضل الدین صاحب نے ترتیب دے کر انڈین اسٹیم پریس لاہور سے شائع کرایا تھا - اس مجموعہ میں مختلف موضوعات پر مضامین ملتے ہیں جن سے ان کی اسلام دوستی ، ملّی درد مندی اور علوم و فنون سے گہرے شغف کا پتہ چلتا ہے - اپنے دعوے کو ثابت کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

> ''پس اب ہم مسلمانوں کو یہ اعتقاد کرنا چاہیے کہ در حقیقت آسمان کوئی وجود مجسم مثل گول گنبد یا چورس چھت کے نہیں ہے ، بلکہ تمام ستارے ، چاند اور سورج جن میں زمین بھی ایک ستارہ ہے فضائے بسیط میں معلق ہیں اور قدرتی قانون کے ذریعہ سے جس کو ہم نہیں دیکھ سکتے اور جس کا نام لسان شروع میں عہد غیر مرئی اور زبان اہل علم میں جذب ہے ، اپنی اپنی جگہ پر قائم ہے جو کہ ہمارے سر کے اوپر ہے اس کا نام آسمان ہے - جس طرح کہ ہم اپنے سر پر کی چیزوں کو جو حقیقت میں امریکہ کے رہنے والوں کے تحت قدم ہیں آسمان کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں - اسی طرح امریکہ کے رہنے والے اپنے سر پر کی چیزوں کو جو در حقیقت ہمارے تحت قدم ہیں آسمان کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں''[1] -

(۱) مضامین تہذیب الاخلاق حصہ اول - ص ۱۰۷ ، مطبوعہ انڈین اسٹیم پریس لاہور -

محسن الملک کے ان مضامین کے مطالعہ کے بعد ان کی ادبی حیثیت کا اندازہ ہوتا ہے ۔ ان مضامین میں جو انہوں نے مذہبی ، اخلاقی ، تعلیمی ، تاریخی اور اصلاحی مسائل پر روشنی ڈالی ہے ۔ جن میں ان کا خاص ادبی رنگ جھلکتا ہے اور قدم قدم پر ان کا جوش اور خلوص ان تحریروں میں نظر آتا ہے ۔

یوں تو محسن الملک کی ادبی زندگی کا آغاز قانون کی ان دو کتابوں سے ہو چکا تھا جن کا ذکر پچھلے صفحات میں کیا گیا ہے ۔ لیکن ۱۸۷۰ء میں انہوں نے خالص مذہبی موضوع پر اپنے قلم کو جنبش دی اور 'آیاتِ بینات' کے نام ایک کتاب لکھی جو اسی سال مرزا پور کے مشن پریس کے ٹائپ میں شائع ہوئی ۔ جس کے ذریعہ انہوں نے شیعہ مذہب کو ترک کرنے اور اہلِ سنت و الجماعت کے مسلک کو اختیار کرنے کی خبر دی ۔

ابھی اس کتاب کی تین جلدیں ہی لکھنے پائے تھے کہ سر سید سے ان کے مراسم قائم ہو گئے ۔ چونکہ سر سید سے تعلقات کا انحصار محض قومی خدمت اور خدمت پر تھا اس لیے اس مذہبی بحث کو قومی مسلک کے خلاف سمجھتے ہوئے کتاب کو ادھورا چھوڑ دیا اور صرف تین جلدیں لکھنے پر اکتفا کیا ۔

چونکہ 'آیاتِ بیّنات' کا موضوع خالص مذہبی ہے اس لیے اس میں زبان بھی مولویانہ مگر پھر بھی سادہ اختیار کی گئی ہے ۔ ایک اقتباس سے ان کے اس انداز کا پتہ چلے ، جس میں کسی فرقہ کے مسلک کا ذکر نہیں بلکہ ایک عام بات بیان کی گئی ہے :

> "یہ سب مسلمان جانتے ہیں کہ سب سے پہلے لڑائی بدر کی ہے اور جو لوگ اس جنگ میں پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ و سلّم کے ساتھ تھے ، ان کا بڑا رتبہ ہے ۔ اس لیے اللہ جلِ شانہ' نے فرشتوں کو مدد کے لیے بھیجا اور آیاتِ قرآنی نازل فرما کر اپنے احسان کو ظاہر کیا ۔ اسی واسطے تمام اصحابِ نبوی میں وہی لوگ بڑے رتبے کے شمار ہوتے تھے جو کہ اس جنگ میں شریک تھے"[1] ۔

ان سب مضامین کے علاوہ محسن الملک نے وقتاً فوقتاً کچھ تقریریں کی ہیں اور لیکچر دیے جن کی مجموعی تعداد ۸۴ ہے ، جن میں ۸۰ تقریریں ہیں اور چار لیکچر ۔ ان تقریروں اور لیکچروں کا مجموعہ نولکشور گیس پرنٹنگ ورکس پریس لاہور سے 'مجموعہ لیکچر و اسپیچز' کے نام سے شائع ہوا تھا ۔ یہ تقریریں اور لیکچر ۲۳ مئی ۱۸۷۲ء تا

---

(۱) آیات بینات ، جلد دوم ، مطبوعہ گلزار عالم پریس ، لاہور ۔

یکم جنوری ۱۹۰۳ء کے عرصہ پر مشتمل ہیں جو مختلف مقامات پر مختلف تاریخوں میں کی گئی ہیں ۔

سب سے پہلی تحریر ۲۳ مئی ۱۸۷۲ء کو مرزا پور کے ہائی سکول کے جلسہ تقسیمِ انعامات کی تقریب میں کی گئی تھی جس میں انہوں نے حاضرین سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا :

''اے میرے عزیزو ! ذرا ہارون الرشید اور خلفائے عباسیہ کے عہدِ دولت پر خیال کرو ۔ برامکہ کی علمی مجالس کو دیکھو کہ انہوں نے علم کی ترقی اور معمولات کی تحقیق میں کیا کیا کوششیں کیں اور انہوں نے اس عرف کی بدولت اسلام کی کیسی عزت ظاہر کی ۔ غزالی اور رازی ، بو علی اور فارابی اور جیسے کیسے کیسے نامور ہوئے کہ جن کا نام اب بھی غیر قوم کا کوئی محقق بغیر تعظیم کے نہیں لیتا ۔ مگر افسوس ہزار افسوس کہ وہ لوگ مر گئے ۔ ان کی جگہ ہم پیدا ہوئے ۔

حریفان بادہا خوردند و رفتند تہی خمخانہا کردند و رفتند''[1]

ان تقریروں اور لیکچروں کے علاوہ محسن الملک نے کچھ مکاتیب بھی یادگار چھوڑے ہیں جن میں سے ۶۰ خطوں کو محمد امین زبیری صاحب نے ترتیب دے کر شمسی مشین پریس آگرہ سے شائع کیا تھا یہ خطوط وقتاً فوقتاً وقار الملک ، مولوی عبد اللہ جان صاحب وکیل ، محمد امین صاحب ، مولوی بشیر الدین صاحب ، انوار احمد صاحب زبیری مارہروی ، حاجی محمد موسیٰ خانصاحب ، طلباء مدرسۃ العلوم علی گڑھ اور دوسرے احباب کے نام ہیں ۔ ایک خط میں مرزا شجاعت علی بیگ صاحب سے یوں مخاطب ہیں :

''جنابِ من ۔ غالباً آپ دہلی تشریف لاویں گے اور کیمپ میں قیام فرمائیں گے ۔ خوب سیر و تفریح کریں گے ۔ مگر یہ فرمائیے کہ قومی کانفرنس میں بھی کچھ حصہ لیں گے یا اسے خدا پر چھوڑ دیں گے ۔ اگر آپ ذرا توجہ فرمائیں تو سو پچاس آدمی اس کے ممبر ہو سکتے ہیں جن کو پانچ روپیہ فیس ممبری دینے چنداں گراں نہ ہوں گے اور کانفرنس کو اس سے بہت مدد مل سکتی ہے''[2]۔

---

(۱) مجموعہ لیکچر و اسپیچز ۔ ص ۴ - ۵ ، مطبوعہ نولکشور گیس پرنٹنگ ورکس ، لاہور ۔
(۲) محمد امین زبیری ، (مرتب) مکاتیب حصہ اول - ص ۵۴ ، مطبوعہ شمسی مشین پریس آگرہ

محسن الملک کے ان مکاتیب کی زبان تحریروں اور مضمونوں کے مقابلہ میں زیادہ سلیس اور آسان معلوم ہوتی ہے ۔ انہوں نے ان مکاتیب میں سادگی کو پیش نظر رکھا ہے اور بات کو پیچدار بنانے کی بجائے سیدھے سادے انداز میں کہا ہے اور یہ کوشش کی ہے کہ مکتوب نویسی کے پرانے انداز کو ترک کرتے غالب کے بنائے ہوئے راستہ پر گامزن ہوں ۔

سر سید کی 'تبیین الکلام' شائع ہونے کے بعد دوسرے علماء کی طرح محسن الملک بھی سر سید سے سخت برہم ہوئے تھے اور ان کے عقائد کو کفر و ارتداد کے مترادف قرار دینے لگے تھے ۔ لیکن سر سید سے ملاقات کے بعد وہ طلسم ٹوٹا اور حقیقت سے با خبر ہو کر سر سید کے مداح نہ صرف بنے ، بلکہ قومی اور ملی کاموں میں ان کا ہاتھ بٹا کر اپنے آپ کو ان کا زبردست معاون اور سرگرم رفیق ثابت کیا ۔

جب سر سید کو 'خطبات احمدیہ' کی اشاعت کے سلسلہ میں مالی مشکلات درپیش تھیں تو محسن الملک نے ان کی مالی اعانت کر کے اس کام کو آسان بنایا ۔ محسن الملک کا 'تہذیب اخلاق' میں مضامین لکھنا بھی قومی اور ملی خدمت کی ایک کڑی تھی ۔ ان مضامین کے ذریعہ انہوں نے مسلمانوں کی قومی ، تہذیبی اور معاشرتی زندگی کی طرف خاص توجہ دی اور مسلمانوں کے قومی اتحاد اور ملی عروج کی خاطر مختلف مجالس کے لیے نہ صرف چندے جمع کیے بلکہ اپنی جیب خاص سے بھی ایک گراں قدر رقم چندوں کی شکل میں دی ۔ ۱۸۷۵ء میں جب مدرسۃ العلوم ، ایم ۔ اے ۔ او کالج کا افتتاح ہوا تو ہر مد میں انہوں نے چندہ دیا ۔

۱۹۰۱ء میں اپنی سیاسی بصیرت کی بنا پر دور رس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ مسلمانوں کو اپنے سیاسی حقوق کے تحفظ کے لیے کیا تدابیر اختیار کرنی چاہیئیں ۔ اس سلسلہ میں انہوں نے بعض مضامین لکھ کر مسلمانوں کو غور و فکر کی دعوت دی تھی ۔ جب مسلمانوں نے انگریزوں کی سیاست اور ہندوؤں کی حکمت عملی سے مایوس ہو کر ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ قائم کی تو محسن الملک نے بھی اس آواز پر لبیک کہا اور اس کے جائنٹ سکرٹری منتخب ہوئے ۔ حالانکہ ان کی صحت اس بار کی متحمل نہ تھی ، لیکن ملی مفاد کی خاطر انہوں نے اس خدمت سے بھی پہلو تہی نہ کی ۔

نواب اعظم یار جنگ، مولوی چراغ علی

مولوی چراغ علی نام اور اور نواب اعظم یارجنگ بہادر خطاب تھا ۔ آپ کے والد کا نام مولوی محمد بخش تھا ۔ ان کے آبا و اجداد سرینگر (کشمیر) کے رہنے والے تھے ۔

وہاں سے ہجرت کر کے پنجاب آئے جہاں ان کے دادا ایک مدت تک ملازم رہے۔ وہاں سے میرٹھ آئے اور پھر مستقل طور پر میرٹھ میں آباد ہو گئے۔ مولوی محمد بخش پہلے میرٹھ میں ملازم ہوئے پھر ان کا تبادلہ سہارنپور ہو گیا جہاں وہ کلکٹری میں ایک عرصہ تک ہیڈ کلرک رہے اور محمد بخش کرانی کے نام سے مشہور ہے۔ کرانی کا لفظ اس زمانے میں کلرک کے لیے استعمال ہوتا تھا[1]۔ ۱۸۴۹ء میں پنجاب و صوبہ سرحد میں مہتمم بندوبست رہے۔

مولوی محمد بخش کو خدا تعالیٰ نے ۱۸۴۶ء میں ایک فرزند عطا فرمایا جس کا نام چراغ علی رکھا گیا۔ ابھی مولوی چراغ علی دس سال ہی کے تھے کہ عین شباب میں جب ۲۵ سال کی عمر ہوئی تو مولوی محمد بخش کا انتقال ہو گیا۔ مولوی چراغ علی کے تین بھائی اور بھی پیدا ہوئے لیکن بھائیوں میں سب سے بڑا ہونے کا انہیں ہی شرف حاصل ہے[2]۔

باپ کا سایہ سر سے اٹھ جانے کی وجہ سے ان کی تعلیم کا خاطر خواہ انتظام نہ ہو سکا اس لیے با قاعدہ کوئی امتحان نہ پاس کر سکے۔ البتہ اردو، فارسی اور انگریزی کی معمولی تعلیم حاصل کی۔ ابھی تعلیم سے فراغت نہ پائی تھی اور طالبِ علمی کے مراحل سے گذر رہے تھے کہ ضلع بستی میں بیس روپے ماہانہ پر خزانے میں کلرک ہو گئے۔ لیکن جلد ہی ترقی کر کے ۱۸۷۲ء میں اسّی روپے ماہانہ پر لکھنؤ میں نائب منصرم ہو گئے۔ قدرت کو مولوی چراغ علی کو عہدۂ جلیلہ پر سرفراز فرمانا تھا اس لیے اسی زمانے میں ان کی ملاقات سر سید سے ہوئی اور دونوں کے درمیان دوستانہ مراسم قائم ہو گئے۔ 'تہذیب الاخلاق' میں ان کے بعض مضامین شائع ہو چکے تھے۔ کچھ عرصہ بعد جب ریاست حیدر آباد سے ترجمہ کا کچھ کام سر سید کے پاس آیا تو انہوں نے مولوی چراغ علی کو اس کام کے لیے موزوں سمجھ کر ان کے سپرد یہ کام کیا۔ چنانچہ وہ سرکاری ملازمت سے رخصت لے کر علی گڑھ آئے اور اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ ۱۸۷۷ء میں جب نواب سر سالار جنگ اعظم نے محسن الملک کی وساطت سے سر سید سے ایک فاضل اور لائق شخص طلب کیا تو قرعۂ فال مولوی چراغ علی کے نام نکلا اور انہیں حیدر آباد بھیج دیا گیا جہاں وہ چار سو روپے ماہانہ پر اسسٹنٹ ریوینیو سیکرٹری مقرر ہوئے۔ اس کے بعد سات سو روپے تنخواہ ہو گئی پھر ترقی کرتے کرتے گلبرگہ اور ورنگل کے صوبہ دار بنے اور دو سال بعد نواب محسن الملک کے سبکدوش ہونے کے بعد معتمد مال و فنانس مقرر ہوئے۔ انہوں نے ریاست میں رہ کر ایسی محنت، دیانت، تدبّر اور قابلیت سے

---

(۱) تذکرۂ محسن۔ ص ۸۳۔

(۲) مولوی عبدالحق، چند ہمعصر۔ مطبوعہ اردو اکیڈمی سندھ، کراچی ۱۹۵۹ء۔

یہ خدمات انجام دیں کہ ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انہیں ریاست کی طرف سے نواب اعظم یار جنگ بہادر کا خطاب عطا کیا گیا ۔

مولوی چراغ علی ایک محنتی اور جفا کش انسان تھے ۔ انہوں نے نہ صرف عربی ، فارسی کی تعلیم حاصل کی بلکہ انگریزی ، عبرانی ، لاطینی اور یونانی زبانوں میں بھی خاص مہارت حاصل کر لی تھی ۔ حتیٰ کہ ان کی انگریزی دانی کے تو بڑے بڑے انگریز بھی معترف ہو گئے ۔

مولوی چراغ علی ایک سچے انسان تھے اور تعصب کو تو اپنے پاس تک نہ پھٹکنے دیتے تھے ۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنی ذات کو کسی فرقہ کے ساتھ منسلک نہ کیا تھا ۔ چنانچہ مردم شماری کے موقع پر فرقہ کے خانے میں اپنی بیوی کے نام کے سامنے تو شیعہ لکھ دیا لیکن اپنے اور بیٹوں کے نام کے آگے خانے خالی چھوڑ دیے ۔

ابھی ان کی عمر پچاس برس کی ہوئی تھی کہ ذیابطیس کی بیماری کے آپریشن سے جانبر نہ ہو سکے اور ۱۵ جون ۱۸۹۵ء کو اچانک بمبئی میں انتقال فرمایا ۔

مولوی چراغ علی نے بہت سی کتابیں لکھیں جن میں سے اکثر انگریزی زبان میں ہیں ۔ سر سید کی ملاقات سے پہلے ان میں بھی اس وقت کے قاعدہ کے مطابق مناظرہ کا بہت شوق تھا اور دوسرے مذاہب کے مطالعہ میں وقت صرف کرتے تھے ۔ چنانچہ انہوں نے سب سے پہلے پادری عماد الدین کی کتاب 'تاریخِ محمدی' کے ماخذ کو غلط قرار دیتے ہوئے اس کے ردّ میں 'تعلیقات' کے نام سے ایک کتاب لکھی جو ۱۸۷۲ء میں لکھنؤ سے شائع ہوئی ۔ جس کے ذریعے یہ ثابت کیا کہ اسلام کو دوسرے مذہب پر کیوں ترجیح اور فوقیت حاصل ہے اور اسلام ہی اللہ تعالیٰ کے نزدیک سچا دین ہے ۔

انہوں نے ایک اور کتاب 'اسلام کی دنیوی برکتیں' کے نام سے لکھی جسے بہت پسند کیا گیا ۔ اسی لیے وہ بار بار شائع ہوئی ۔ اس میں یہ بتایا گیا تھا کہ قرآنِ کریم نے انسان کو اصلاحِ معاش کا کس طرح سبق دیا اور ایک انسان کو دوسرے انسان کے ساتھ پیش آنے کی راہ دکھائی ۔ اسلام نے معاشرتی اصلاح کے لیے کیا قدم اٹھایا اور کس طرح بنی نوع انسان کا احترام کرنا سکھایا ۔ کس طرح طبقاتی فرق کو مٹایا اور کائنات میں بسنے والے تمام انسانوں کو صلح و آشتی کا پیغام دیا اور امن و امان کے ساتھ زندگی گذارنے کا طریقہ سکھایا ۔

'تحقیق الجہاد' انہوں نے عیسائیوں کے اس اعتراض کے جواب میں لکھی کہ اسلام تلوار کے زور سے دنیا میں پھیلا - اس کتاب میں انہوں نے جہاد کی حقیقت پر روشنی ڈالتے ہوئے یہ ثابت کیا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ و سلم کے زمانے میں جتنی جنگیں ہوئیں ان کا مقصد کفار کا قتل کرنا اور انہیں زبردستی مسلمان بنانا نہ تھا بلکہ وہ تمام لڑائیاں مجبوری کی حالت میں اپنی مدافعت کے لیے لڑی گئیں جن میں اسلامی اصولوں کو پیش نظر رکھا گیا اور کسی کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی نہیں کی گئی -

ایک کتاب 'قدیم قوموں کی مختصر تاریخ' کے نام سے لکھ کر یہ ثابت کیا کہ قرآن کریم میں، جن پہلی قوموں کا ذکر آتا ہے ان کے حالات پر تاریخ کیا روشنی ڈالتی ہے - انہوں نے بڑی کاوش سے قدیم اقوام کے حالات تاریخوں میں سے تلاش کر کے عیسائیوں کے اس اعتراض کا مسکت جواب دیا کہ قرآن کریم میں جن قوموں کا ذکر آتا ہے اس کا سرے سے وجود ہی نہیں -

مذکورہ بالا کتابوں کے علاوہ انہوں نے اردو میں 'تاریخ بی بی ہاجرہ' ، 'ماریہ قبطیہ' ، 'تحقیق تنازناسہ' لکھیں اور انگریزی میں 'ریفارمز انڈر مسلم رول' اور 'محمد دی ٹرو پرافٹ' کے نام سے دو کتابیں تصنیف کیں - ایک کتاب 'پروپوزڈ پولیٹیکل لیگل اینڈ سوشل ریفارمز انڈر مسلم رول' کے نام سے لکھی جس کا ترجمہ مولوی عبدالحق صاحب نے 'اعظم الکلام فی ارتقاء الاسلام' کے نام سے اردو میں کیا -

'رسائل چراغ علی' کے نام سے ان کے چار رسالے بھی شائع ہوئے تھے انہوں نے سیتاپور اور لکھنؤ کے قیام کے دوران تقریباً ۴۵ رسالے لکھے تھے جو مسوّدوں کی شکل میں باقی رہے - ان میں صرف چار رسالے مولوی عبد اللہ خان ٹونکی نے ۱۹۱۸ء میں کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد سے شائع کیے[1]-

ایک کتاب 'العلوم الجدیدہ و الاسلام' کے نام سے لکھ رہے تھے اور اس 'تہذیب الاخلاق' میں اس کی تمہید ہی چھپنے پائی تھی کہ آپ کا انتقال ہو گیا اور یہ ادھورا رہ گیا -

آپ نے رسالہ 'تہذیب الاخلاق' کے ایک اہم مضمون نگار کی حیثیت سے بہت مضامین لکھے - ان مضامین کے مطالعہ سے آپ کی علمی و ادبی حیثیت کا اندازہ ہوتا ہے یہ مضامین کتابی شکل میں فضل الدین تاجر کتب قومی و مالک اخبار اشاعت السنہ

---

(۱) قادری ، حامد حسن ، داستان تاریخ اردو - ص ۳۷۲ -

بازار لاہور نے ۱۸۹۶ء میں شائع کیے ۔ مثلاً تصویر کھنچوانے کے بارے میں انہوں نے دوسرے علماء سے ہٹ کر جو نقطہ نظر قائم کیا اسے بڑی بیباکی سے لوگوں کے سامنے پیش کیا ہے ۔ اس طرح 'یورپ اور قرآن' کے مضمون میں انہوں نے قرآن کریم کو ایک سچی کتاب ثابت کرتے ہوئے بتایا کہ اس کے سچے ہونے کی یہ علامت ہے اور اس کا یہ معجزاتی انداز ہے کہ اس نے یورپ کے لوگوں سے بھی اپنی صداقت کا لوہا منوایا ۔ اس مضمون میں کاغذ کی ایجاد پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

> ''قدیم زمانہ میں مصریوں نے کتابت کے واسطے پپائرس کا بنا ہو کاغذ ایجاد کیا ۔ اہل مصر اس کاغذ کو جو ایک درخت کے پتوں سے بنایا جاتا تھا پاپو کہتے تھے ۔ وہیں سے اہل یونان کے پیپرس کہنا شروع کیا ۔ عبری زبان میں اسے گومی کہتے تھے ۔ شاید یہ لفظ قبطی زبان سے لیا گیا ہے کیونکہ وہ لوگ کتاب کی جلد کو گوم کہتے ہیں اور عربی جدید میں اس کا نام بردی ہے۔''[۱]

مولوی چراغ علی اپنے ہمعصروں میں سب سے زیادہ محقق تھے ۔ اسی لیے ان کی تحریریں فضول لفاظی یا عبارت آرائی معلوم نہیں ہوتیں ، بلکہ تحقیق و تجسس کی آئینہ دار ہیں ۔

نواب وقار الملک

آپ کا نام مشتاق حسین ، باپ کا نام شیخ فضل حسین اور دادا کا نام شیخ محبوب علی تھا[۲] ۔ ۱۸۳۹ء کو امروہہ ضلع مراد آباد یو ۔ پی ۔ میں پیدا ہوئے[۳] ۔ ابھی ۶ ماہ ہی کے تھے کہ سایۂ پدری سے محروم ہو گئے ۔ نیک دل ماں نے آپ کی تربیت کی ۔ ۶ سال کی عمر میں قرآن کریم ختم کیا ۔ پھر فارسی کی مکمل تعلیم حاصل کی اور عربی بھی پڑھی اس رسمی تعلیم کے بعد اسی مدرسہ میں جہاں آپ نے تعلیم حاصل کی تھی دس روپے ماہانہ پر مدرس ہو گئے ۔ اس کے بعد انکم ٹیکس میں محرری کی اور پھر واصل باقی نویس ہو گئے ۔ کچھ عرصہ کے بعد علی گڑھ میں سرشتہ دار اور منصرم ہو گئے ۔ یہاں تک کہ ۱۸۷۳ء میں نائب تحصیلدار کے عہدہ پر فائز ہوئے ۔

۱۸۷۴ء میں جب حیدر آباد کے مدارالمہام سالار جنگ اول کو دکن کی سلطنت کے انتظام کے لیے بہترین مدبروں کی ضرورت تھی تو سر سید کی سفارش پر حیدر آباد چلے گئے ۔

---

(۱) مضامین تہذیب الاخلاق جلد سوم ۔ ص ۱۴۰ شائع کردہ فضل الدین تاجر کتب کشمیری بازار لاہور ۔

(۲) سکندر علی خان حیات مشتاق ، مطبوعہ خادم التعلیم پریس ، لاہور ۱۹۰۹ء ۔

(۳) مولانا غلام رسول مہر نے تاریخ پیدائش ۱۴ مارچ ۱۸۴۱ء تحریر کی ہے (نقوش شخصیات نمبر ص ۷۲۳) ۔

اور ۱۸۷۵ء سے ۱۸۷۶ء تک ریاست میں مختلف حیثیتوں سے خدمات سرانجام دیتے رہے لیکن اپنے حسن تدبر کی وجہ سے سیاسی سازشوں سے اپنی ذات کو بچائے رکھا - چار سال حیدر آباد رہنے کے بعد وہاں کی ملازمت سے سبکدوش ہو کر علی گڑھ آ گئے - تین چار سال بعد جب ریاست کے حالات سازگار ہوئے تو سالار جنگ نے انہیں پھر حیدر آباد بلا لیا - اس کے بعد دس بارہ سال تک ریاست کی خدمات انجام دیتے رہے اور سات سو روپے ماہانہ پنشن لے کر ریاست سے واپس آئے - ان کی شاندار خدمات کو سراہتے ہوئے حضرت نظام الملک آصف جاہ میر محبوب علی خان بہادر نے ۱۸۸۵ء میں خان بہادر او انتصار جنگ اور ۱۸۹۰ء میں وقار الدولہ وقار الملک کے خطابات عطا کیے - اسی کے ساتھ ساتھ ان کی قدردانی کے لیے حکومت ہند نے بھی انہیں نواب کا خطاب دیا اور لارڈ منٹو نے انہیں اپنے ہاتھ سے ایک سرٹیفکیٹ عطا کیا -

وقار الملک ایک باوقار شخصیت کے مالک تھے - غرور و تکبر سے انہیں نفرت تھی - سادگی کے وہ دلدادہ تھے اور انسانی ہمدردی ان کی شخصیت کا جزو اعظم تھی - مذہب کو وہ ہر چیز پر ترجیح دیتے تھے - نماز کے اس قدر پابند تھے کہ کچہری میں جب ظہر کی نماز کا وقت آتا تو سب کام چھوڑ کر نماز پڑھنے چلے جاتے - علی گڑھ میں ۱۸۷۵ء میں جب کالوں کلکٹر نے انہیں اس فرض کی ادائگی سے روکا تو انہوں نے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا ، لیکن دین میں کلکٹر کی مداخلت کو پسند نہ کیا - ضابطہ اور آئین کی پابندی کو وہ بہت اہمیت دیتے تھے - اس سلسلہ میں کسی رو رعایت یا مروت کے قائل نہ تھے - وقار الملک کی ذات قدیم اور جدید کا ایک سنگھم تھی - اسی لیے پرانے علماء اور جدید انگریزی دان طبقے میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے -

اگرچہ ان کی آمدنی معقول تھی ، لیکن اس میں سے زیادہ رقم غریبوں ، ناداروں اور عزیزوں پر خرچ کرتے اور خود بڑی سادہ زندگی بسر کرتے - ان کی انسان دوستی میں کبھی ان کی ذات ، حیثیت یا عہدہ حارج نہ ہونے پائے - ان کی زندگی کا یہ واقعہ بہت مشہور ہے کہ کسی نابینا کو ان کے یہاں سے کھانا جایا کرتا تھا - ایک مرتبہ زوردست بارش ہوئی ملازم نے رات کا کھانا نابینا کو نہ پہنچایا - جب انہیں معلوم ہوا تو خود کھانا لے کر گئے - نابینا انہیں نوکر سمجھ کر بہت ناراض ہوا ، لیکن انہوں نے اس پر یہ ظاہر نہ ہونے دیا کہ میں ملازم نہیں بلکہ خود وقار الملک ہوں -

۲۸ جنوری ۱۹۱۷ء کو امروہہ میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور وہیں دفن ہوئے -
وقار الملک نے سر سید کے قومی کاموں میں ہاتھ بٹایا اور جب بھی یہ محسوس کیا کہ قوم کو ان کی خدمات کی ضرورت ہے تو اس سے پہلو تہی نہیں کی - علی گڑھ کالج کو وہ

مسلمان قوم کے لیے ایک پناہ گاہ اور معراج ترقی سمجھتے تھے ، چنانچہ کالج کا کوئی شعبہ ایسا نہ تھا جس میں انہوں نے چندہ نہ دیا ہو - ۱۹۱۰ء میں جب سر آغا خان نے کالج کو یونیورسٹی بنانے کی تجویز پیش کی تو ڈیڑھ سال کی قلیل مدت میں اس کام کے لیے لاکھوں روپیہ جمع کیا - جنگ بلقان و طرابلس کے وقت طرابلس کے زخمیوں کے لیے اپنے گاؤں کا ایک حصہ فروخت کرکے ایک ہزار روپے چندہ دیا -

مسلمانوں کی سیاسی پسماندگی کو محسوس کرتے ہوئے انہوں نے ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کے قیام کے لیے زبردست کوشش کی اور اس کے سیکرٹری مقرر ہوئے اور انہوں نے پہلی مرتبہ کالج کو انگریزی اثرات سے محفوظ کرنے کی بھرپور کوشش کی اور اس کوشش میں وہ کامیاب بھی ہوئے -

اگرچہ وقار الملک نے اپنے پیچھے باقاعدہ کوئی تصنیف نہیں چھوڑی ، لیکن وہ سر سید کی قائم کردہ سائنٹفک سوسائٹی کے ممبر اور معاون ضرور تھے جس کا کام تالیف و ترجمہ تھا - چنانچہ وقار الملک نے بھی انگریزی کی کتاب 'ورخ ریوولیوشن اینڈ نپولین' کا ترجمہ 'سرگذشت نپولین بونا پارٹ' کے نام سے کیا تھا جو ۱۸۹۰ء میں مطبع نولکشور سے شائع ہوا تھا - چونکہ وقار الملک واجبی سی انگریزی جانتے تھے اس لیے اپنے دو اسسٹنٹوں منشی گلزاری لال اور بابو گنگا پرشاد سے انگریزی کا ترجمہ سن کر اسے اپنی عبارت میں لکھتے جاتے تھے -

اس ترجمہ کے علاوہ انہوں نے 'تہذیب الاخلاق' میں بہت سے مذہبی ، اخلاقی ، معاشرتی اور تحقیقی مضامین لکھے ، جنھیں ۱۸۹۰ء میں کتابی شکل میں فضل الدین تاجر کتب قومی و ملک اخبار اشاعت کشمیری بازار لاہور نے شائع کیا تھا - اس میں بعض مضامین کے عنوانات یہ ہیں - 'ہیئت جدیدہ' ، 'توکل' ، 'تقویٰ' ، اعتدال' ، 'مہمان و میزبان' ، 'انسان کی زندگی' ، 'تمدن و شائستگی' وغیرہ - 'مہمان اور میزبان' میں سے ایک اقتباس درج ذیل ہے :

"مہمانی اور میزبانی کی خوبیاں اور برکتیں ایسی صریح اور صاف ہیں کہ ان کے بیان کی کچھ حاجت نہیں ہے - آپس میں محبت اور ارتباط بڑھانے کے واسطے یہ رسم بہت ہی مؤثر ثابت ہوئی - اس رسم سے غیر بھی اپنے ہو جاتے ہیں بلکہ دشمن بھی دوست بن جاتے ہیں اور اس کے جاری نہ رہنے سے قریب تر عزیزوں کی قدرتی محبت میں بڑی کمی آ جاتی ہے"(۱) -

---

(۱) مضامین تہذیب الاخلاق - ص ۳٦ -

ان کے ان مضامین کے مطالعہ کے بعد دو تین باتیں ہمارے سامنے آتی ہیں ۔ وقار الملک کے دل میں اپنی قوم کے لیے خلوص کے جذبات موجزن ہیں ۔ وہ مسلمانوں کو صحیح مسلمان دیکھنا چاہتے ہیں ۔ وہ اسلامی معاشرت کے اس قدر گرویدہ ہیں کہ اسے عام کرنا چاہتے ہیں ۔

ان مضامین کے لیے انھوں نے سر سید کی تحریک کا رکن ہونے کی وجہ سے سادہ اور سلیس زبان استعمال کرنے کی کوشش کی ہے ۔

ان مضامین کے علاوہ ان کے ۳۶ مکاتیب کا وہ مجموعہ بھی ملتا ہے جسے محمد امین زبیری صاحب نے ترتیب دے کر شمسی پریس آگرہ سے شائع کیا تھا ۔ یہ خطوط وقتاً فوقتاً سر سید ، محسن الملک ، حالی ، صاحبزادہ آفتاب احمد خان ، چودھری اطہر علی وکیل لکھنؤ ، مولانا عبدالباری فرنگی محل اور دوسرے احباب و اعزہ کے نام ہیں ۔ ان خطوط میں انھوں نے سادگی و سلاست کو برقرار رکھا ہے اور غالب کی روایت کو برتنے کی کوشش کی ہے ۔

مولوی ذکاء اللہ

مولوی ذکاء اللہ یکم ابریل ۱۸۳۲ء کو کوچہ بلاقی بیگم دہلی میں پیدا ہوئے ۔ باپ کا نام ثناء اللہ تھا ۔ سلسلۂ نسب حضرت ابوبکرؓ سے جا ملتا ہے ۔ ابتدائی تعلیم گھر میں حاصل کرنے کے بعد ۱۲ سال کی عمر میں دلی کالج میں داخل ہوئے ۔ ریاضیات کے مضمون سے خاص لگاؤ تھا ۔ اس مضمون سے ان کی دلچسپی کی وجہ سے دلی کالج کے استاد ماسٹر رام چندر ان کی طرف خاص توجہ دیتے تھے ۔ اس خاص توجہ کا نتیجہ تھا کہ وہ ہمیشہ امتحانات میں اعلیٰ نمبروں سے کامیاب ہو کر وظائف پاتے رہے اور دو تمغے بھی حاصل کیے ۔

تعلیم سے فراغت کے بعد دلی کالج ہی میں وہ ریاضی کے استاد مقرر ہوئے ۔ اس کے بعد ۷ سال تک آگرہ کالج میں اردو فارسی پڑھاتے رہے ۔ ۱۸۵۵ء ڈپٹی انسپکٹر مدارس بنے ۔ ۱۱ سال یہ خدمت انجام دینے کے بعد ۱۸۶۶ء میں نارمل سکول دہلی کے ہیڈ ماسٹر ہو گئے ۔ تین سال کے بعد اوریئنٹل کالج لاہور سے پروانۂ تقرر آیا ۔ ابھی وہ وہاں جانے کے بارے میں سوچ ہی رہے تھے کہ اسی دوران میں میور سنٹرل کالج الہ آباد کی طرف سے پروفیسری کی پیشکش کی گئی جسے آپ نے اوریئنٹل کالج پر ترجیح دی اور وہاں ۱۵ سال تک فارسی کے پروفیسر رہے ۔ ۱۸۸۵ء میں پنشن لے کر دہلی واپس آ گئے اور باقی عمر تصنیف و تالیف میں بسر کی ۔ ۱۷ نومبر ۱۹۱۰ء کو دہلی میں انتقال ہوا ۔

سترہ برس کی عمر میں انہوں نے ریاضی کی ایک کتاب اردو میں لکھی جو بہت مقبول ہوئی اور چند دن ہی میں فروخت ہو گئی ۔ اس کتاب سے انہیں بتیس (۳۲) روپے آمدنی ہوئی ۔ اس کے بعد انہوں نے ریاضیات اور طبیعات کی بہت سی کتابیں لکھیں جو سرکاری نصاب میں داخل کی گئیں ۔ ان کی حوصلہ افزائی اور قدردانی کے لیے حکومت نے اس خدمت کے صلے میں انہیں پندرہ سو روپے بطور انعام دیے اور شمس العلماء و خان بہادر کے خطابات سے سرفراز فرمایا ۔

اس کے علاوہ انہوں نے تاریخ ، جغرافیہ ، سائنس ، اخلاقیات اور سیاست پر بہت سی کتابیں لکھیں اب وہ کتابیں زمانہ والوں کی بے قدری کا شکار ہیں ۔ چونکہ یہ کتابیں اردو میں تھیں اس لیے جب ذریعہ تعلیم انگریزی ہوا تو ان کی مانگ ختم ہو گئی اور اس طرح ان کی اشاعت کا سلسلہ بھی بند ہو گیا ۔ البتہ بعض درسی کتابوں میں ان کے مضامین کہیں کہیں نظر آ جاتے ہیں ۔

مولوی ذکاء اللہ نے کل ۱۴۳ کتابیں لکھیں جن میں سے ۱۲۹ تو شائع ہوئیں لیکن ۱۴ طباعت کی منزل سے ہی نہ گزریں اور غیر مطبوعہ رہ گئیں ۔ ان کتابوں میں ان کی سب سے اہم کتاب 'تاریخ ہندوستان' ہے جو دس جلدوں اور سات ہزار آٹھ صفحات پر مشتمل ہے ۔ ۱۸۹۷ء میں مطبع مرتضوی دہلی سے شائع ہوئی[1] ۔ اس تاریخ کے علاوہ 'سوانح عمری ملکہ وکٹوریہ' ، 'کرزن نامہ' ، 'سوانح عمری مولوی سمیع اللہ' ، 'تاریخ عہد انگلشیہ' اور 'آئین قیصری' ان کی یادگار تصانیف ہیں ۔

ان کتابوں کے علاوہ انہوں نے مختلف اخباروں اور رسالوں میں مضامین بھی لکھے ۔ 'مخزن' لاہور ، 'زمانہ' کانپور ، 'انسٹی ٹیوٹ' گزٹ علی گڑھ ، 'رسالہ حسن' حیدر آباد ، 'شمس' کلکتہ اور 'صبح بہار' میسور میں ان کے بہت سے مضامین شائع ہوئے ۔ انہوں نے اپنی کتابوں اور مضامین کے ذریعہ اردو کی بیش بہا خدمات انجام دیں اور اپنے تراجم کے ذریعہ یہ ثابت کر دیا کہ اردو زبان میں جدید مغربی علوم کی تعلیم دی جا سکتی ہے ۔ اسی بنا پر وہ اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کے لیے برابر کوشاں رہے ۔

جب ۲ دسمبر ۱۸۷۰ء کو 'تہذیب الاخلاق' جاری ہوا تو سر سید کی فرمائش پر انہوں نے مضامین لکھنے شروع کیے ۔ وہ ہر دور میں 'تہذیب الاخلاق' کے لیے مضامین لکھتے رہے ۔ اس حقیقت سے 'تہذیب الاخلاق' کے مضمون نگاروں کی فہرست

---

(۱) مضمون اختر وقار عظیم ، ماہ نو کراچی مئی ۱۹۶۸ء ۔ یہ صحیح تحقیق کے مطابق ہے ۔ حامد حسن قادری ، مولوی محمد یحییٰ تنہا اور دوسرے لوگوں نے جلدوں کی تعداد زیادہ بتائی ہے ۔

میں مولوی ذکاء اللہ کا نام سرِ فہرست نظر آتا ہے - کتابوں کی طرح ان کے مضامین اور مقالات کا دائرہ بھی بہت وسیع ہے - انہوں نے علمی ، ادبی ، تہذیبی ، تاریخی ، سیاسی اور تنقیدی ہر طرح کے مضامین لکھے ہیں ، لیکن تنقیدی مضامین بہت کم نظر آتے ہیں - ۱۸۸۰ء میں انہوں نے 'تہذیب الاخلاق' میں 'ذہانت اور آزادی' ، 'کیسا غلط خیال ہے کہ زمانہ ہر سرِ منزل ہے' اور 'تبصرہ بر مسدس مد و جزر' کے عنوانات سے مضامین لکھے -

مولوی ذکاء اللہ کی تصانیف کو ادب و انشاء کی کسوٹی پر نہیں پرکھا جا سکتا - ان کے ہاں وہ علمی و ادبی شان نظر نہیں آتی جس سے شبلی ، حالی ، آزاد اور نذیر احمد کی نثر مزین معلوم ہوتی ہے - ان کے ہاں اعلیٰ افکار و احساسات کا بھی فقدان ہے جس کی وجہ سے ان کی تصانیف وقتی بن کر رہ گئیں اور انہیں وہ مقبولیت حاصل نہ ہوئی جس کی بناء پر وہ دوام حاصل کر سکتیں - اس کی وجہ ان کی بسیار نویسی ہے - وہ روزانہ کچھ نہ کچھ لکھنے کے عادی تھے - انہیں اس سے غرض نہ تھی کہ وہ ادبی معیار برقرار نہیں رکھ رہے جو ان کے معاصرین کا طرۂ امتیاز تھا -

مولوی سید احمد دہلوی

سید احمد دہلوی سادات کے ایک معزز خاندان میں ۸ جنوری ۱۸۴۶ء کو دہلی میں پیدا ہوئے - باپ کا نام سید عبدالرحمٰن تھا - ابتدائی تعلیم مشہور اساتذہ سے مکتبوں میں حاصل کرکے پھر سرکاری مدرسہ میں داخل ہوئے - اس کے بعد دہلی کے نارمل اسکول میں تعلیم حاصل کی -

ابتداء ہی سے انہیں تصنیف و تالیف کا شوق تھا - ابھی طالبعلم ہی تھے کہ ایک فارسی نظم 'طفلی نامہ' کے عنوان سے لکھی جو بہت پسند کی گئی - اس پسندیدگی نے مہمیز کا کام کیا اور انہیں لکھنے کی رغبت دلائی ، چنانچہ ۱۸۶۸ء میں 'انشائے تقویۃ الصبیان' کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں بچوں کو خط و کتابت کے طریقے سکھائے گئے تھے - اگلے سال 'کنز الفوائد' کے نام سے ایک کتاب شائع کی جس میں تقدیر و تدبیر کی بحث دکھائی گئی تھی - اس کتاب پر انہیں حکومت کی طرف سے ڈیڑھ سو روپیہ انعام ملا -

ان کتابوں کی اشاعت کے بعد وہ علمی و ادبی دنیا سے متعارف ہو چکے تھے اور اپنی شہرۂ آفاق لغت 'فرہنگِ آصفیہ' کی تدوین کا کام شروع کرچکے تھے - چنانچہ مسٹر

فیلن انسپکٹر مدارس نے اپنی مشہور 'اردو لغت' کی ترتیب میں بٹانے ہاتھ کے لیے سید احمد کو بلا لیا ۔ انہوں نے ۷ سال دینا پور میں رہ کر اس لغت کو ۱۸۸۰ء میں مکمل کیا ۔ اس عرصہ میں وہ صرف اسی لغت کے ہو کر نہ رہ گئے بلکہ اپنے تصنیف و تالیف کے کام کو بھی جاری رکھا جس کے نتیجے میں انہوں نے 'انشائے ہادی النساء' کے نام ایک کتاب شائع کی ۔

'اردو لغت' کی تکمیل کے بعد مہاراجہ الور نے اپنا سفر نامہ لکھوانے کے لیے انہیں اپنے ہاں بلوایا ۔ چھ مہینے میں اس کام کو ختم کیا اور معقول معاوضہ و انعام حاصل کیا ۔ اس کے بعد گورنمنٹ پنجاب بکڈپو لاہور میں نائب مترجم کی آسامی پر فائز ہوئے اور اس خدمت کو بڑی خوبی سے انجام دیتے رہے ۔ لاہور اور دہلی کے اسکولوں میں سرکاری ملازمت بھی کی اور حکومت کی جانب سے پنشن اور خدمات کے صلے میں ۲۲ جون ۱۹۱۴ء کو 'خانصاحب' کا خطاب بھی ملا ۔ ۱۹۰۵ء میں پرنس آف ویلز کی آمد کے موقع پر ایک نظم 'خیر مقدم' کے عنوان سے لکھ کر اور ایک کتاب 'رسوم دہلی' کے نام سے ان کی خدمت میں پیش کی ۔ ۱۱ مئی ۱۹۱۸ء کو دہلی میں انتقال کیا اور قطب روڈ کی باغیچی میں دفن کیے گئے ۔[1]

مولوی سید احمد صاحب نے تقریباً دو درجن کتابیں لکھی ہیں جن میں انہوں نے دو باتوں پر زور دیا ہے ۔ ایک عورتوں کی تعلیم و تربیت اور دوسرے اردو زبان اور دہلی کے محاورہ اور روز مرہ کی اشاعت ۔ ان دو باتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے انہوں نے دلی کی ٹکسالی زبان اور محاورے استعمال کیے ہیں ۔ بر محل اور برجستہ فقرے ، مدلّل اور سلجھی ہوئی عبارت ان کی نثر کی خصوصیات ہیں ۔ ان سب کتابوں میں ان کی 'فرہنگ آصفیہ' سب سے مشہور ہے ۔ اس لغت کو انہوں نے ۱۸۶۸ء میں لکھنا شروع کیا تھا اور ۱۸۷۸ء میں 'ارمغان دہلی' کے نام سے بطور نمونہ بعض اجزا شائع کیے تھے اور اس کی ترتیب جاری تھی ۔ رات دن کی محنت شاقہ کے بعد ۱۸۹۲ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچایا ۔ سرمایہ کی کمی کے باعث شاید یہ لغت اشاعت کے مراحل طے نہ کر پاتی ، لیکن قدرت نے غیب سے ایک سبب پیدا کر دیا ۔ ہوا یوں کہ جب مولوی صاحب موصوف ۱۸۸۸ء میں شملہ میں مدرس تھے انہیں دنوں سر آسمان جاہ وزیر اعظم حیدر آباد شملہ تشریف لائے ۔ مولوی صاحب نے اپنی لغت کا مسوّدہ ان کی خدمت میں پیش کیا وہ اسے اپنے ساتھ لے گئے اور مولوی سید علی بلگرامی کے مشورہ اور سفارش کے بعد انعام کا وعدہ کیا ۔ جب ۱۸۹۲ء

(۱) برنی ، صباح الدین احمد ، عظمت رفتہ ۔ ص ۱۲۱ ۔ مطبوعہ تعلیمی مرکز کراچی ۔ حامد حسن قادری نے سن وفات ۱۹۱۹ء لکھا ہے جو درست معلوم نہیں ہوتا ۔

میں یہ لغت مکمل ہوئی تو دولت آصفیہ کی طرف سے پانچ ہزار روپیہ بطور انعام اور پچاس روپے ماہانہ وظیفہ عطا کیا گیا ۔ حکومتِ پنجاب نے بھی اس کی حوصلہ افزائی کے لیے پانچ سو روپے انعام دیے اور بطور اعانت ایک ہزار روپے کی کتابیں خریدیں ۔

'فرہنگِ آصفیہ' ایسی ضخیم لغت ہے کہ اس سے پہلے اردو میں ایسی ضخیم لغت نہ لکھی گئی تھی ۔ اس کی چار جلدیں ہیں جن میں ۵۵ ہزار الفاظ و محاورات شامل کیے گئے ہیں ۔ ان الفاظ و محاورات کی صحت کے لیے مؤلف نے جا بجا حوالوں اور اسناد سے کام لیا ہے ۔

چونکہ مولوی صاحب کو عورتوں کی تعلیم و تربیت کا حد درجہ خیال تھا اس لیے انہوں نے دوسری کتابوں کے علاوہ 'تحریر النساء' کے نام سے ایک کتاب اس لیے لکھی کہ معمولی لکھی پڑھی عورتوں کو خط و کتابت کا طریقہ معلوم ہو سکے اور وہ اپنے محرموں کو خط لکھوانے کے لیے غیر محرموں کی محتاج نہ بنیں ۔ ان خطوط میں انہوں نے ہر عمر اور رشتہ کے مطابق لب و لہجہ کے فرق کا استعمال کیا ہے ۔

انہیں یہ احساس تھا کہ مسلمان عورتیں فضول رسوم ، اوہام پرستی اور بد اعتقادیوں کا شکار ہیں ۔ اس سلسلہ میں انہوں نے 'راحت زمانی' کی مزیدار کہانی کے نام سے ناول کے رنگ میں ایک کتاب لکھی تاکہ کہانی کے انداز میں ان تمام باتوں پر روشنی ڈالیں جسے وہ عورتوں کے حق میں مہلک سمجھتے ہیں تاکہ خواتین ہنستے کھیلتے اس سے ایسا اثر قبول کریں کہ کہانی کے پردہ میں ان کی اصلاح ہو جائے ۔

'رسومِ دہلی' ان کا ایک اور کارنامہ ہے جس میں انہوں نے ان تمام رسوم کا ذکر کیا ہے جو دہلی کے ہندو اور مسلمانوں میں ہندوؤں سے آئی ہیں اور اب ان کے عقائد کا ایک حصہ بن چکی ہیں ۔ ان رسوم کو انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے ، خود برتا ہے اور بزرگوں سے سنا ہے اس لیے ان پر مبالغہ کا احتمال نہیں کیا جا سکتا ۔

سید علی بلگرامی

مولوی سید علی بلگرامی ، یو ۔ پی کے ایک مردم خیز خطے بلگرام میں ۱۰ نومبر ۱۸۵۱ء کو پیدا ہوئے ۔ والد کا نام سید زین الدین حسین خان تھا جو ایک مشہور عالم و فاضل شخص تھے ۔ ان کا سلسلۂ نسب حضرت امام حسین علیہ السلام تک

ا ہے ۔ ان کے آباو اجداد بارھویں صدی عیسوی میں شہر واسط (عراق) سے ہندوستان آ کر اودھ میں سکونت پذیر ہوئے ۔ ان کی خاندانی فضیلت اور تبحّرِ علمی کا یہ عالم تھا کہ سید علی کے دادا سید کرامت حسین(۱) وائسرائے کے دربار میں شاہِ اودھ کی طرف سے سفارت کے فرائض بجا لانے پر مامور تھے ۔ ان کے والد سید زین الدین خان بنگال اور بہار کے مختلف اضلاع میں ڈپٹی کلکٹر اور مجسٹریٹ رہے اور چچا سید اعظم الدین حسن خان لارڈ ولیم بینٹنگ کے اے ۔ ڈی ۔ سی اور اسد سرحد کے ترجمان اور بعد میں سندھ کے پولیٹیکل ایجنٹ رہے ۔

سید علی ۱۵ سال کی عمر میں عربی اور فارسی کی تعلیم مکمل کر کے کیننگ کالج سے بی ۔ اے کا امتحان پاس کیا ۔ اس کے بعد تین سال تک قانونِ ملکی کے مطالعہ میں مصروف رہ کر ڈپٹی سول سروس کے امتحان میں پورے صوبۂ بہار میں اول آئے ۔ اس کے بعد رڑکی کے طامسن انجینرنگ کالج میں اسکالر شپ پا کر داخل ہوئے ۔ چھ ماہ بعد ہی نواب مختار الملک سر سالار جنگ بہادر اول نے انہیں حیدر آباد بلا کر اپنے پرسنل اسٹاف میں شامل کیا ۔ جب وہ لندن گئے تو انہیں بھی اپنے ہمراہ لے گئے ۔ وہاں انہیں لندن کے شاہی مدرسہ معدنیات میں داخل کیا ۔ جہاں سے انہوں نے دو سال میں ایسوسی ایٹ کا امتحان پاس کرنے کے ساتھ ساتھ علمِ طبقات الارض میں تمغہ بھی حاصل کیا ۔

وطن واپس آتے ہوئے فرانس ، سپین اور جرمنی کی سیاحت بھی کی ۔ حیدر آباد واپس پہنچنے پر انسپکٹر جنرل معدنیات کے عہدہ پر فائز ہوئے اور کچھ عرصہ کے لیے ناظمِ تعلیمات اور ہوم سیکرٹری بھی رہے ۔

مرحوم عربی ، فارسی ، اردو ، سنسکرت ، بنگالی ، مرہٹی ، تلگی ، گجراتی ، انگریزی ، لاطینی ، جرمنی اور فرانسیسی زبانیں خوب جانتے تھے ۔ کئی سال تک مدرس یونیورسٹی میں ایم ۔ اے سنسکرت کے ممتحن بھی رہے تھے ۔ نومبر ۱۸۹۱ء میں حکومتِ ہند نے انہیں شمس العلماء کا خطاب عطا کیا ۔

۱۹۰۲ء میں کیمبرج یونیورسٹی میں مرہٹی زبان کے ریڈر مقرر ہوئے اور اسی سال انڈیا آفس میں عربی ، فارسی کے قلمی نسخوں کی فہرست مرتب کرنے کا کام ان کے سپرد ہوا ۔ ۱۹۰۷ء میں بیرسٹری کا امتحان بھی پاس کیا ۔ ۱۲ مئی ۱۹۱۱ء کو ہردوئی میں انتقال کیا ۔

---

(۱) قادری ، حامد حسن ، داستان تاریخ اردو ۔ ص ۵۹۳ نے ان کے دادا کا نام سید کرم حسین لکھا ہے ۔

اگرچہ مولوی سید علی مرحوم مختلف زبانوں کے ماہر تھے اور انہیں بہت سے علوم پر قدرت حاصل تھی ، لیکن وہ کوئی قابلِ یادگار تصنیف نہ چھوڑ سکے ۔ ایک تو انہیں علمی کام سے شغف نہ تھا دوسرے وہ محنت کے عادی نہ تھے اس لیے ان کا زیادہ تر کام تراجم تک محدود ہے جس میں سے بعض یہ ہیں :

۱ ۔ 'اصولِ قانون متعلق بہ طب' ۔

۲ ۔ 'رسالہ در تحقیق تالیف کتاب کلیلہ و دمنہ' ۔

۳ ۔ 'فارسی کی تعلیمی قدر و قیمت بمقابلہ سنسکرت پر ایک نوٹ' ۔

۴ ۔ 'غارہائے الور کا گائڈ' ۔

۵ 'تمدنِ عرب' ، موسیو لیبان کی فرانسیسی کتاب کا اردو ترجمہ ، عربی اسلامی تمدن پر بہت دلچسپ و مفید کتاب ہے ۔

۶ ۔ 'تمدنِ ہند' ۔ یہ بھی موسیو لیبان کی فرانسیسی کتاب کا اردو ترجمہ ہے جس میں ہندوؤں کے زمانہ کے تمدن کو بڑی خوبی سے بیان کیا گیا ہے ۔

مرحوم کو کتابیں جمع کرنے کا بہت شوق تھا ۔ اسی لیے ان کا کتب خانہ نایاب کتابوں کا مخزن تھا ۔ اس تعلق کی وجہ سے وہ اہلِ علم کی بڑی قدر و منزلت کرتے تھے ۔ علیگڑھ کالج کو یونیورسٹی بنانے کی اسکیم میں برابر کوشاں رہے ۔

آخر زمانہ میں بعض وجوہ کی بنا پر انہیں حیدر آباد کو خیر آباد کہہ کر ہردوئی میں سکونت اختیار کرنا پڑی ۔ اسی زمانہ میں انہیں کلکتہ یونیورسٹی نے ایم ۔ اے اور ڈی لٹ کی اعزازی اسناد عطا کی تھیں ۔

'تمدنِ عرب' اور 'تمدنِ ہند' ان کے ایسے دو شاہکار ہیں جن کی وجہ سے ہمیشہ ان کا نام زندہ رہے گا ۔ ان ترجموں سے تصنیف کی شان ظاہر ہوتی ہے ۔ تراجم کی زبان نہایت سلیس اور عام فہم ہے ۔ حکمت و فلسفہ کے مسائل کو ایسے عام فہم انداز میں بیان کیا ہے کہ بڑی آسانی سے سمجھ میں آ جاتے ہیں ۔ علمی و فنی اصطلاحات کے لیے آسان الفاظ کا انتخاب ان کا ایک ادبی کارنامہ ہے ۔ ترجمہ کا نمونہ درج ذیل ہے :

> "آگرہ میں بہت سی مثالیں ہند و ایران و عرب کی مرکّب طرزِ تعمیر کی موجود ہیں ۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور تاج بی بی کا روضہ ہے جس کے بیان کے لیے ایک جلد چاہیے ۔ اس عمارت کو شاہ جہان نے ۱۶۳۱ء میں اس غرض سے شروع کیا تھا کہ یہ اس کی چاہیتی بی بی کا جس کے مرنے کا قلق کبھی اس

کے دل سے دور نہیں ہوا ، ایک بے نظیر مقبرہ اور یادگار ہو جس کا مثل دنیا میں نہ نکلے"(۱)۔

صفیر بلگرامی

سید فرزند احمد نام ، والد کا نام سید عبدالحئی عرف میر سید احمد۔ احمد تخلص تھا۔ ۷ اپریل ۱۸۳۴ء کو ضلع اٹہ میں پیدا ہوئے(۲)۔ پانچ سال کی عمر میں اپنے والد صاحب کے ہمراہ آرہ آئے اور پھر یہاں ہی مستقل سکونت اختیار کر لی۔ ایک مدرسہ میں محمد خان نامی استاد سے ۱۲ سال تک فارسی پڑھی اور دوسرے اساتذہ سے دیگر علوم و فنون کی تعلیم حاصل کی۔

ان کا آبائی وطن بلگرام تھا۔ لیکن آبا و اجداد بعد میں بہار منتقل ہو گئے۔ صفیر کو ورثہ میں شاعری ملی تھی ، چنانچہ ۱۴ سال کی عمر سے انہوں نے شعر کہنا شروع کیے۔ جب ہنگامۂ غدر رونما ہوا تو مرثیہ کی طرف طبیعت راغب ہوئی اور صفیر مرزا دبیر سے پٹنہ میں اپنے کلام میں اصلاح لیتے رہے۔ اس دوران یہ تخلص بدلے۔۔ قلب ، آثم ، اثیم ، صبا ، نالاں ، احقر اور صغیر۔ لیکن لفظ صغیر کو مقبولیت حاصل ہوئی ور اسی نام سے مشہور ہوئے۔

۱۸۶۳ء میں اپنی فارسی و اردو غزلیں غالب کو اصلاح کے لیے بھیجیں اور اس طرح پہلی مرتبہ غالب سے ان کا تعارف ہوا۔ ۱۸۶۰ء میں بنفسِ نفیس اپنے ماموں شاہ عالم شائق کے ہمراہ غالب کی خدمت میں رہے اور ان سے استفادہ کرتے رہے۔ غالب کے انتقال کے بعد غلام حسین قدر بلگرامی کو کلام دکھاتے رہے۔ ۱۱ مئی ۱۸۹۰ء کو پٹنہ میں انتقال ہوا اور آرہ میں دفن کیے گئے۔

۲۰ سال کی عمر سے مسلسل ۱۲ سال تک امان علی کے شاگرد دبیر سے اصلاح لیتے رہے۔ وہ ایک نغز گو اور قادر الکلام شاعر تھے۔ ابتداء میں نثر سے زیادہ رغبت تھی اور نظم سے بچتے تھے۔ لیکن فطری طور پر ذہین اور فطین تھے اس لیے وہی صنفِ نظم جس سے رغبت نہ تھی ایسی پسند آئی کہ آخر دم تک اسے سینہ سے لگائے رکھا۔

صفیر نے بہت سی کتابیں لکھیں جن میں سے 'جلوۂ خضر' ان کی یادگار تصنیف ہے۔ جس کے حصہ اول میں اردو نظم پر بحث کی ہے اور دوسرے حصہ میں اردو نثر سے بحث

---

(۱) سید علی بلگرامی تمدن عرب ، ص ۔ ۲۷۴ ۔ مطبوعہ مقبول اکیڈمی ، لاہور ۔
(۲) حکیم سید احمد اللہ ندوی تذکرہ مسلم شعرائے بہار ، حصہ سوم ، ص ۔ ۳۹ ، مطبوعہ انٹرنیشنل پریس ، کراچی ۔ مالک رام نے تاریخ پیدائش اپریل ۱۸۳۴ء لکھی ہے ۔ تلامذۂ غالب ۔ ص ۱۹۴ مطبوعہ مرکز تصنیف و تالیف نکودر ۔

کرتے ہوئے اردو زبان کی تاریخ اور اس کے ارتقاء پر روشنی ڈالی ہے ۔ مختلف ادوار کے شعراء کا تذکرہ کرتے ہوئے دہلی اور لکھنؤ کی زبان کے فرق کو بھی بیان کیا ہے ۔ 'جلوۂ خضر' اپنی افادیت اور اہمیت کے اعتبار سے اردو تذکروں میں خاص اہمیت کا حامل ہے ۔ اس میں 'آبِ حیات' کی غلط بیانیوں کی تصحیح کی کوشش کی گئی ہے ۔

اس تذکرہ کے علاوہ 'رشحاتِ صفیر' تذکیر و تانیث کے سلسلہ میں لکھی اور 'بوستانِ خیال' کی کچھ جلدوں کا اردو میں ترجمہ کیا ۔ انہوں نے ۸ دیوان مرتب کیے جن میں سے دو 'صفیرِ بلبل' اور 'خم خانۂ صفیر' ان کی زندگی میں شائع ہوئے ۔ تین فارسی کے دیوان چار فارسی کے اور ۲۶ اردو کی مثنویاں نیز قصائد ، رباعیات ، قطعات اور واسوختوں کے مجموعے بھی انہوں نے اپنی یادگار چھوڑے ہیں ۔ نمونۂ کلام ذیل میں درج ہے :

قتل کیا تو خجلت کبھی چھپ سکتا تھا خون کہیں
جس نے سنا احوال ہمارا اس نے تمہارا نام لیا

دیکھنے مجھ کو آ جاتے تو بات تو ہوتی کہنے کو
عمر تو آخر ہو ہی چکی تھی تم نے عبث الزام لیا

☆ ☆ ☆

آئے وہ میرے گھر تو رقیبوں کو لے کے ساتھ
یا رب قبول یوں بھی کسی کی دعا نہ ہو

امداد امام اثر

شمس العلماء خان بہادر سید امداد امام اثر ۱۷ اگست ۱۸۴۹ء کو نیورہ ضلع آرہ (بہار) میں پیدا ہوئے ۔ ان کے آبا و اجداد پہلے مغلوں کے دربار اور پھر سلطنتِ انگلیشیہ سے منسلک رہے ۔ ان کے اکثر بزرگوں نے لائق اور فاضل اساتذہ اور اتالیقوں سے مختلف زبانوں اور علوم و فنون کی تعلیم حاصل کی ۔ ۱۹۳۴ء میں آپ کا انتقال ہوا ۔

امداد امام اثر کی طبیعت میں ایک تنوع تھا ۔ یہ بات ان کی مختلف تصانیف مثلاً 'کتاب الاثمار' ، 'کیمیائے زراعت' ، 'ہدیۂ قیصریہ' اور 'معیار الحق' سے ثابت ہوتی ہے لیکن ان کا اصلی ذوق شاعری میں کھلتا ہے جس کے اصول و فروغ پر انہوں نے ایک ہزار صفحے کی مبسوط کتاب 'کاشف الحقائق' ۱۸۹۷ء میں لکھی تھی جس میں یونانی ، لاطینی ، انگریزی ، فارسی اور عربی کے شہرۂ آفاق شعراء کے کلام کی خوبیاں واضح کی ہیں ۔

'کاشف الحقائق' بہ یک وقت تذکرہ بھی ہے ، تاریخ ادب بھی اور تنقید کا دستورالعمل بھی - مولانا حالی کا 'مقدمہ شعر و شاعری' ذوقِ تنقید کو بیدار کرنے کا ایک ذریعہ سمجھا جاتا ہے اور تنقید کے میدان میں اسے ایک سنگِ میل کی حیثیت حاصل ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ حالی کا مقدمہ 'کاشف الحقائق' کے مقابلہ میں بڑی حد تک مختصر اور نا تمام تصنیف ہے - ذیل کے اقتباس سے اثر کے اسلوبِ نگارش اور شاعرانہ ذوق کا اندازہ ہوتا ہے :

> "حقیقت یہ ہے کہ جب تک شاعری مصوری کا تماشا نہیں دکھاتی ، بلکہ جب تک جان آفرینی کا کمال اس سے نمایاں نہیں ہوتا تب تک شاعری کا حکم نہیں رکھتی - شاعرِ باکمال کا یہ کام ہے کہ غیر مجسم شے کو مجسم کرکے دکھا دے اور بے جان کو اعجازِ بیانی سے 'با جان' بنا دے - ملٹن نے گناہ اور موت کو با جسم اور با جان کرکے دکھایا ہے - اسی طرح میر انیس کے اس مصرع : جب زلف کو کھولے ہوئے لیلائے شب آئی - سے صاف ادراک ہوتا ہے کہ شب کوئی زندہ اور مجسم شے ہے"[1] -

ارسطو نے اپنی تصنیف 'بوطیقا' میں شاعری کو مصوری سے تعبیر کیا ہے - عزیز احمد نے 'بوطیقا' کا ترجمہ ۱۹۴۴ء میں کیا ، لیکن نصف صدی پہلے اثر نے شاعری کی اس بنیادی صفت کا ذکر جس واضح انداز میں کیا ہے اس سے ان کے ذوقِ شعری اور ذوقِ تنقید کا ثبوت ملتا ہے -

وحید الدین سلیم

مولانا وحید الدین سلیم پانی پت کے محلہ افغاناں کے ایک معمولی اور غریب سید گھرانے میں ۱۸۶۷ء میں پیدا ہوئے[2] - آپ کے والد سید فرید الدین بو علی شاہ قلندر کی درگاہ کے مجاور تھے ، جنھوں نے قناعت کو اپنا مسلک بنا لیا تھا - باپ کے اثر کی وجہ سے وحید الدین سلیم نے بھی اپنی زندگی عسرت اور پریشانیوں میں گزاری -

سب سے پہلے ایک استانی شمس النساء سے قرآنِ کریم حفظ کیا پھر علی نقی حزیں سے فارسی پڑھی - اس کے بعد ۱۸۸۲ء میں مڈل کا امتحان اعزاز کے ساتھ پاس کیا اور سارے صوبہ میں اول رہے - اس کے بعد لاہور اورینٹل کالج میں حصولِ تعلیم کے لیے چلے گئے -

---

(۱) اثر ، امداد امام ، کاشف الحقائق ، حصہ دوم - ص ۲۶۳ ، مطبوعہ لاہور ۱۹۵۶ء -

(۲) نقوش شخصیات نمبر - ص ۶۳ - ڈاکٹر عبدالوحید نے ان کا سن ولادت اپنی کتاب جدید شعرائے اردو ، حصہ دوم - ص ۱۳۱ مطبوعہ فیروز سنز لاہور ۱۹۶۰ء میں ۱۸۶۹ء تحریر کیا ہے -

وہاں مولانا فیض الحسن سہانپوری سے عربی پڑھی اور اول درجہ میں منشی فاضل کا امتحان بھی پاس کیا ۔ پھر میٹرک کا امتحان بھی پاس کیا ۔

ان کی طبیعت ہمہ گیر واقع ہوئی تھی جس کی وجہ سے قانون کی تعلیم کا خیال دل میں پیدا ہوا ۔ اس لیے کالج میں داخل بھی ہوئے ، لیکن افلاس اور ناداری نے اس آرزو کو پورا نہ ہونے دیا ۔ اس لیے تعلیم سے دست بردار ہو کر تلاشِ معاش کی فکر ہوئی ، چنانچہ سب سے پہلے ایجرٹن کالج بھاولپور میں معلّمی کی خدمت انجام دی ۔ پھر رام پور ہائی اسکول میں ہیڈ مولوی کے عہدہ پر فائض ہوئے ۔ جب ان کے مربی و محسن جنرل عظیم الدین خان قتل کر دیے گئے تو رام پور سے پانی پت واپس آ گئے ۔ حالی کی وساطت سے سر سید احمد خان تک رسائی ہوئی ۔ وہ ان کی شخصیت سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انہیں اپنا ادبی معاون بنا لیا ۔ علی گڑھ کے قیام میں رسالہ 'معارف' نکالا ۔ مسلم گزٹ لکھنؤ اور علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کی ادارت بھی اپنے ذمہ لی جن میں ان کے مضامین چھپتے رہے ۔ پھر دکن چلے گئے اور حیدر اباد میں دارالترجمہ سے منسلک ہو گئے ۔ اس کے بعد ۸ سال تک عثمانیہ یونیورسٹی میں اردو کے استاد کی حیثیت سے تا دمِ آخر خدمات انجام دیتے رہے ۔ ۲۹ جولائی ۱۹۲۸ء کو ملیح آباد میں انتقال کیا ۔

وہ مزاج کے اعتبار سے زندہ دل ، سادگی پسند ، صاف گو اور بے پروا آدمی تھے ۔ سر سید ، حالی اور فیض الحسن صاحب سے فیضیاب ہونے کے باوجود مذہب سے زیادہ شغف نہ رکھتے تھے ۔ ہندو مسلم اتحاد کے زبردست حامی تھے ۔ ہندو دیو مالا سے اتنے واقف تھے کہ کوئی برہمن بھی کیا ہوگا ۔ اگرچہ انگریزی کی تعلیم میٹرک تک پائی تھی لیکن انگریزی اصطلاحوں کے اردو متبادل گھڑنے کا ایک خاص ملکہ رکھتے تھے ۔

شعر کہنے پر بھی انہیں دسترس حاصل تھی ۔ ۱۹۳۸ء میں 'افکارِ سلیم' کے نام سے ان کے کلام کا مجموعہ شائع ہوا تھا ، جس میں ہندو مسلم تاریخ کے واقعات بعض انگریزی نظموں کے ترجمے اور قوم کے نام تبلیغی پیغام ہیں ۔ ایک نظم کا ایک بند ذیل میں درج کیا جاتا ہے[1] :

فرزند ہو تم ملّتِ ذیشان کے اٹھو
ملّت کا جو ہے فرض وہ پہچان کے اٹھو

اللہ کا جو حق ہے اسے جان کے اٹھو
جو حکمِ پیمبر ہے اسے مان کے اٹھو

---

(۱) وحید الدین سلیم ، افکار سلیم - ص ۲۹۲ ، مطبوعہ پانی پت ۱۹۳۸ء -

داسن کو ذرا عزم کے گردان کے اٹھو
جو دل میں ارادہ ہے اسے ٹھان اٹھو

سلیم کا خاص میدان نثر ہے جہاں ان کی قوتِ متخیلہ شاعری سے زیادہ جولاں دکھائی دیتی ہے ۔ انہیں اسلامی ، ایرانی اور ہندی تلمیحات ازبر تھیں ۔ 'افاداتِ سلیم' میں ان کی تشریح و تفصیل نظر آتی ہیں ۔ یہاں ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے :

"شیش ناگ سانپوں کا راجہ ہے ۔ پاتال کے ساتویں طبقے میں رہتا ہے ۔ جب دنیا فنا ہوتی ہے تو وشنوجی اس کو اپنا بنا کر پانی پر تیرتے ہیں اور یہ اپنے ہزار سروں سے ان پر سایہ کرتا ہے ۔ زمین اس پر ٹکی ہوئی ہے ۔ جب وہ جمائی لیتا ہے زلزلہ آتا ہے ۔ جب دنیا کے خاتمہ کا وقت آتا ہے تو اپنی پھنکار سے آگ نکالتا ہے اور دنیا کو نیست و نابود کرتا ہے" ۔

عربی و فارسی کے عالم ہونے کے ساتھ اردو زبان و ادب پر ان کی بڑی نظر تھی نئی نئی اصطلاحات وضع کرنے میں انہیں خاص ملکہ حاصل تھا ۔ ان کی اس خصوصیت کا اندازہ ان کی کتاب 'وضع اصطلاحاتِ علمیہ' سے ہوتا ہے ۔ اس علم و فضیلت کے باوجود انہیں آرائشِ الفاظ یا عبارت آرائی پسند نہ تھی ۔ وہ دبستانِ علیگڑھ کے زیرِ اثر سلیس مدعا نگاری پر مائل تھے ۔ ان کی سب سے دلچسپ تحریریں وہی ہیں جو تلمیحات اور دیو مالا کی تشریح کرتی ہیں ۔ 'افاداتِ سلیم' میں یہ رنگ جا بجا نمایاں معلوم ہوتا ہے ۔

مولوی عزیز مرزا

۱۸۶۵ء میں دہلی میں پیدا ہوئے ۔ جب علیگڑھ میں ایم ۔ اے او کالج قائم ہوا تو دس سال کی عمر میں کالج میں داخل ہونے والے پہلے گروپ میں آپ بھی شامل تھے ۔ ۲۲ سال کی عمر میں علیگڑھ کالج سے بی ۔ اے آنرز کا امتحان پاس کرکے حیدر آباد میں ملازم ہوئے علیگڑھ کی طالبعلمی کے زمانہ سے انہیں انشا پردازی کا شوق تھا ۔ لیکن تعلیمی مصروفیتوں کی وجہ سے تصنیف و تالیف کے لیے وقت نہ نکال سکتے تھے اگرچہ حیدر آباد کی ملازمت کے زمانے میں وہ لکھنے پڑھنے کے لیے کچھ نہ کچھ وقت ضرور نکال لیتے تھے ۔

ابتداء میں وہ معمولی آسامی پر ملازم ہوئے ، لیکن جلد ہی ترقی کرکے ۱۸۹۰ء میں اسسٹنٹ ہوم سیکرٹری مقرر ہوئے ۔ اس کے ساتھ ساتھ کورٹ آف وارڈ کے کام کی نگرانی بھی آپ کے سپرد ہوئی ۔ اس خدمت کے لیے جب آپ کو تین سو روپے ماہانہ الاؤنس دیا گیا تو اسے یہ کہہ کر لینے سے انکار کر دیا کہ یتیموں کے مال سے میں اپنا پیٹ بھرنا مناسب

نہیں سمجھتا ۔ ۱۸۹۵ء میں فرسٹ اسسٹنٹ ہوم سیکرٹری اور ۱۸۹۶ء میں ہوم سیکرٹری بنا دیے گئے ۔

اس اہم عہدہ کی وجہ سے ریاست کا نظم و نسق آپ کے سپرد ہوا ۔ جس کی وجہ سے برصغیر میں اصلاحیں کرنے کے مواقع میسر آئے ۔ ۱۹۰۲ء میں ضلع بھیڑ کی کلکٹری پر تعینات کیے گئے ۔ اس خدمت کو بھی انہوں نے بڑے اچھے طریقے سے انجام دیا ۔ اس عرصہ میں ایک عظیم کتاب خانہ کی بنیاد رکھی ۔ صنعت و حرفت کا اسکول قائم کرایا ۔ لوگوں میں تعلیم کا ذوق عام کرنے کی طرف خاص دھیان دیا ، جس کی بدولت حیدر آباد کے طلباء علیگڑھ کالج میں داخل ہونے لگے ۔ ۱۹۰۶ء میں حیدر آباد ہائی کورٹ کے جج مقرر ہوئے ۔ حالانکہ انہوں نے قانون کا امتحان پاس نہیں کیا تھا ، لیکن اس کام کو بھی انہوں نے بڑی خوش اسلوبی سے نبھایا ۔ اس کے بعد انہیں پھر ہوم سیکرٹری کے عہدہ پر منتقل کر دیا گیا ۔ اس عرصہ میں انہوں نے حیدر آباد کی تعلیم پر خاص توجہ دی اور تعلیم کے شعبہ میں بہت سی اصلاحات نافذ کرائیں ۔

انہیں مطالعہ کا بہت شوق تھا ۔ اس میں کبھی ناغہ نہ کرتے ۔ بڑی پابندی سے مطالعہ میں مصروف رہتے ۔ ہندوستان کے مشہور اردو رسالوں میں ان کے مضامین چھپتے تھے ۔ محسن الملک کے 'سفر نامہ انگلستان' کا ترجمہ 'گلگشت فرنگ' کے نام سے ایسی خوبی سے کیا اور اپنی ذہانت کے جوہر دکھائے کہ ترجمہ اصل تصنیف معلوم ہونے لگا ۔ علم تاریخ سے خاص دلچسپی ہونے کی وجہ سے محمود گاواں کی سیرت پر ایک کتاب 'سیرت المحمود' کے نام سے لکھی جس کا مقصد یہ تھا کہ عماد الدین محمود گاواں وزیر سلاطین بہمنیہ اور اس زمانہ کی سچی تصویر لوگوں کے سامنے پیش کر کے مسلمان نوجوانوں کے لیے عموماً اور اہل دکن کے لیے خصوصاً اس کی سیرت کے ایسے نقوش پیش کیے جن سے انہیں رہنمائی حاصل ہو سکے ۔ اس سلسلہ میں 'سیرت المحمود' کا ایک اقتباس ذیل میں درج کیا جاتا ہے :

> ''اگرچہ خواجہ جہان محمود گاواں کی پرائیویٹ لائف کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک صاف شفاف سیمیں چشمہ ہے کہ نہایت خاموشی سے بہہ رہا ہے اور خود تو زور شور سے پاک ہے مگر جس طرف اس کا گذر ہوتا ہے اس کے کناروں پر ہری ہری کھیتیاں موجود ہو جاتیں اور خوشنما پھول اس کے شفاف پانی میں اپنی دلربا تصویر دیکھ کر جوش مسرت سے ہلتے ہیں''[1]۔

---

(۱) عزیز مرزا ، سیرہ المحمود - ص ۵۲ - مطبوعہ مطبع مفتن حیدر اباد -

انہوں نے سنسکرت زبان سیکھ کر کالی داس کے مشہور ڈرامہ 'وکرم اروسی' کا اردو میں ترجمہ کیا اور شروع میں ایک فاضلانہ مقدمہ تحریر کیا جس میں سنسکرت کے ڈرامہ کے فن پر بہت سی مفید باتیں لکھیں۔ 'وکرم اروسی' کے اردو میں اور لوگوں نے بھی ترجمے کیے ہیں چونکہ عزیز مرزا نے سنسکرت سے ترجمہ کیا تھا وہ ترجمہ در ترجمہ کے تکلف اور نقائص سے پاک ہے۔ پھر اس مقدمہ نے قاری کے لیے ڈرامہ کے فن کو سمجھنے میں سہولت بہم پہنچائی ہے۔

آپ کے جو مضامین وقتاً فوقتاً مختلف رسالوں میں شائع ہوئے تھے وہ وقار الملک کے دیباچہ کے ساتھ 'خیالاتِ عزیز' کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔

مولوی عزیز مرزا ۱۹۰۹ء میں ریاست کی ملازمت سے سبکدوش ہو کر علی گڑھ آئے اور قومی کاموں میں وقار الملک کا ہاتھ بٹایا۔ قومی کاموں سے دلچسپی کی وجہ سے ۱۹۱۰ء میں مسلم لیگ کے سیکرٹری چنے گئے۔ انہیں عوام اور غریبوں سے اس قدر ہمدردی تھی کہ سیلابِ حیدر آباد کے زمانے میں دن رات کام کرنے سے بیمار ہو گئے۔ ۱۹۰۸ء میں حکومتِ ہند نے اس خدمت کے صلہ میں تمغۂ قیصرِ ہند عطا کیا۔ قومی کاموں کی زیادتی اور دن رات کی محنت کا صحت پر بہت برا اثر پڑا۔ چنانچہ ۲۶ فروری ۱۹۱۲ء کو ۱۱ بجے دن دردِ گردہ میں مبتلا رہ کر اس دارِ فانی سے کوچ کیا۔

امراؤ مرزا حیرت دہلوی

مرزا حیرت ۱۸۳۷ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کا تعلق ایران کے ایک ذی جاہ خاندان سے تھا۔ جس کے افراد وزارت و امارت پر سرفراز رہے تھے۔ مرزا کی عمر ابھی چار سال ہی ہونے پائی تھی کہ باپ کے سایہ سے محروم ہو گئے۔ سترہ سال کی عمر میں شاہِ ایران نے انہیں گیلان کی صوبہ داری پیش کی، لیکن انہوں نے اسے قبول نہ کرتے ہوئے سیاسی ہنگاموں سے دامن بچایا اور تحصیلِ علم پر متوجہ رہے۔ ۱۹ سال کی عمر میں وہ ادیبوں، شاعروں اور فاضلوں کی صحبت میں بیٹھتے تھے۔ حافظہ بے حد قوی تھا۔ عربی اور فارسی کے ہزار ہا اشعار یاد تھے۔ گویا معلومات کے لحاظ سے انسائیکلوپیڈیا تھے۔ اس عہد کے مشہور شاعر قانی سے ان کی بڑی گہری دوستی تھی اور دوسرے شاعر یغما سے ان کے دیرینہ مراسم تھے۔

مذاہب کی چھان بین کا بہت شوق تھا۔ سیاحت کے گرویدہ تھے، چنانچہ ایشیائے کوچک اور عرب کے علاقہ میں گھومتے رہے۔ عدن میں تھے کہ حکومتِ انگلشیہ نے

انہیں روس کا جاسوس سمجھ کر گرفتار کر لیا اور بمبئی کی ایک رجمنٹ میں بطور نظر بند بھیج دیا ۔ یہاں انہوں نے انگریز افسروں کو فارسی پڑھائی اور ان سے انگریزی سیکھی قوت حافظہ کی بدولت تھوڑے ہی عرصہ میں انگریزی زبان پر قدرت حاصل کر لی ۔ یہاں سے رہا ہو کر مئی ۱۸۷۲ء میں الفنسٹن کالج بمبئی میں فارسی کے پروفیسر کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوا ۔ اور ۲۲ سال تک اس اسامی پر فائز رہ کر اکتوبر ۱۸۹۹ء میں انتقال کیا ۔ مرتے وقت وصیت کی کہ میرا کتب خانہ کالج کو دے دیا جائے ۔

حیرت کے مزاج میں گمنامی و گوشہ گیری تھی ۔ شعر بھی کہتے تھے ، لیکن اپنا مجموعۂ کلام خود تلف کر دیا ۔ ان کی شاعری ایک تبرک کی حیثیت رکھتی ہے جو شاعرانہ حسن سے یکسر عاری تھی کیونکہ ایک ایرانی النسل انسان سے اردو زبان میں اس سے بہتر شاعری کی اور کیا امید کی جا سکتی ہے :

نیم وحشی لقب ملا تجھ کو	کر دیا تجھ کو ادھ موا اے قوم
وہ کڑک اور چمک دمک تیری	برق مانند کوندنا اے قوم
تیری چتون کی شوخیاں بے ہے	تیرا وہ ناز اور ادا اے قوم
غل ہے چاروں طرف یہی اب تو	قدم آگے کو بھی بڑھا اے قوم[1]

سجاد مرزا بیگ

آپ کے حالاتِ زندگی دستیاب نہیں ہیں ۔ حتیٰ کہ ان کی ولادت اور وفات کے بارے میں بھی کچھ پتہ نہیں چلتا ۔ یہ مولوی عزیز مرزا کے بیٹے تھے ۔ تعلیم سے فارغ ہو کر گلبرگہ میں صدر مہتمم تعلیمات کے عہدے پر فائز رہے ۔ پھر حیدر آباد تبادلہ ہو گیا ۔ وہاں صدر مہتمم تعلیمات ، پرنسپل ٹیچرز ٹریننگ کالج ، ناظمِ تعلیمات ، معتمد تعلیمات رہ کر پنشن حاصل کی ۔ ایک ماہرِ تعلیم اور دانشور ہونے کی بنا پر آپ کو یونسکو میں مشیرِ تعلیم کے عہدہ پر سرفراز کیا گیا ۔ اس اہم خدمت کو آپ نے بڑے احسن طریق سے انجام دیا ۔

علمی مسائل سے بڑی دلچسپی رکھتے تھے ۔ اردو سے محبت ہونے کی وجہ سے اس کی ترقی کے لیے برابر کوشاں رہے اور ہر طرح سے اس کی مالی اعانت کی ۔ 'المعلم' کے نام سے ایک علمی مجلہ بھی نکالتے تھے ۔ سودیشی کی تحریک کا ان

(۱) حیرت ، مشکل کشا ترجیع بند ۔ ص ۲ ۔ مطبع رائے بھوانی پرشادبہارگیو ۔

پر اس قدر اثر تھا کہ نہ صرف ترکِ موالات کے زمانہ میں کھدر پوشی ہی اختیار کی تھی بلکہ ہر سودیشی چیز کا استعمال ضروری سمجھتے تھے - 'المعلم' کی اشاعت کے لیے انہوں نے ہمیشہ دیسی کاغذ استعمال کیا بلکہ اپنے ذاتی استعمال کے لیے لفافے اور کاغذ بھی دیسی ہی استعمال کرتے تھے -

وہ مجسمۂ اخلاص تھے - شگفتہ مزاجی ، معاملہ فہمی ، احباب نوازی ، رواداری اور وضع داری ان کی ایسی صفات تھیں جو انہیں دوسروں سے ممتاز کرتی ہیں - تعلقات کو نبھانا خوب جانتے تھے اور نام و نمود کی زندگی سے ہمیشہ پرہیز کرتے تھے -

ان کی تین کتابیں 'حکمتِ عملی' ، 'تسہیل البلاغت' اور 'الفہرست' ان کے ادبی ذوق کی علامات ہیں -

حکمتِ عملی

ایک ایسی کتاب ہے جس میں انہوں نے انسانوں کے روحانی ارتقاء کی تدابیر کے ساتھ ساتھ قومی ترقی کے ذرائع سے بھی بحث کی ہے - ان فلسفیانہ مسائل کو ان کے شگفتہ طرزِ بیان نے آسان بنا دیا ہے -

تسہیل البلاغت

علمِ معانی و بیان پر ایک مبسوط اور جامع کتاب ہے - علمِ معانی و مسائل کو ایسے سادہ اور آسان انداز میں بیان کیا ہے کہ ایک مبتدی بھی انہیں آسانی سے سمجھ سکتا ہے - کتاب کے آخر میں مضامین اور افسانے لکھنے کے طریقے بتائے ہیں -

الفہرست

اس کتاب میں انہوں نے ہر علم و فن کی اردو میں شائع شدہ کتابوں کی مکمل فہرست پیش کی ہے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ کسی فن میں کس قسم کی کتابوں کا ذخیرہ موجود ہے - ہر فن اور مضمون کی کتابوں کو علیحدہ علیحدہ درج کیا ہے جن میں ادب ، صرف و نحو ، لغت ، تفسیر ، حدیث ، فنِ تعلیم ، مذہب ، علمِ اخلاق ، طب ، قیافہ ، قواعدِ فوج ، صنعت و حرفت اور تعلیمِ نسواں وغیرہ شامل ہیں -

---

(۱) محمد ایوب ، تواریخ عجیب - ص ۳۰ - مطبوعہ سلیمان اکیڈمی کراچی - ستمبر ۱۹۶۲ء -

محمد جعفر تھانیسری

محمد جعفر نام ۔ باپ کا نام مبون تھا ۔ قصبہ تھانیسر ضلع انبالہ میں ۱۸۳۸ء میں پیدا ہوئے[۱] ۔ ابتدا میں تعلیم سے رغبت نہ تھی ، لیکن جب کمسنی میں باپ کا انتقال ہو گیا تو تعلیم کی طرف متوجہ ہوئے ۔ اپنی خدا داد ذہانت اور ذکاوت کی وجہ سے جلد ہی تعلیم سے بہرہ ور ہوئے ۔ مذہبی تعلیم کے ساتھ ساتھ طب کی تعلیم بھی حاصل کی ۔ قرآن و حدیث سے شغف رکھتے تھے ۔ بہت سی احادیث حفظ تھیں ۔ تین سیپارے بھی حفظ تھے ۔ بچپن ہی سے صوم و صلواۃ کے پابند تھے ۔

ابتدائی اور مروّجہ تعلیم کے بعد ۱۸۵٦ء میں عدالتوں میں عرائض نویسی کا پیشہ اختیار کیا جس کی بدولت قانون سے واقفیت حاصل ہوئی اور پھر ایسی مہارت حاصل کی کہ بہت جلد وکلاء اور عرائض نویس قانونی معاملات میں ان سے مشورہ لینے لگے ۔ قانون سے واقفیت کی وجہ سے خود ہی اپنے مقدموں کی پیروی کرتے تھے ۔

ان کے والد کا ذریعہ معاش کھیتی باڑی تھا ۔ جعفر نے اپنے حصہ کی زمین بیوی کے مہر میں لکھ دی تھی اور پھر تھانیسر سے ایک میل کے فاصلہ پر اپنی محنت سے بہت سی جائیداد خریدی ۔

جب سید احمد شہید نے تحریکِ جہاد شروع کی تو محمد جعفر نے ایک سرگرم کارکن کی حیثیت سے اس میں حصہ لیا اور بہت سی صعوبتیں اور تکلیفیں برداشت کیں ۔ تحریکِ جہاد میں وہ پیرو خاں کے نام سے مشہور تھے ۔ حکومت کو جب یہ شبہ ہوا کہ جعفر کے ذریعہ مجاہدین کو روپیہ اور آدمی فراہم کیے جاتے ہیں تو ۱۲ دسمبر ۱۸٦۳ء کو ان کی خانہ تلاشی لی گئی ، لیکن وہاں سے فرار ہو گئے ۔ حکومت نے ان کی گرفتاری کے لیے دس ہزار روپے کے انعام کا اعلان کیا ۔ چنانچہ وہ علیگڑھ سے گرفتار ہوئے اور ۱۸٦۴ء میں ان کے خلاف بغاوت کا مقدمہ چلا ۔ ۲ مئی ۱۸٦۴ء کو مقدمہ کا فیصلہ سنایا گیا جس کی رو سے تمام جائداد کی ضبطی اور انہیں پھانسی کی سزا دی گئی ، لیکن اپیل کرنے پر یہ سزا عبور دریائے شور میں تبدیل ہو گئی ۔ پہلے انبالہ جیل میں رکھا گیا ۔ پھر لاہور جیل میں رہے اس کے بعد کراچی اور بمبئی کے راستہ ۱۱ جنوری ۱۸٦٦ء کو انڈمان پہنچے ۔ اس وقت ان کی عمر ۲۷ سال تھی ۔ وہاں ایک کشمیری خاتون سے نکاح کیا ۔ ان کے انتقال پر الموڑہ کی ایک برہمن زادی کو مسلمان کرکے اس سے شادی کی ۔

انڈمان کی اسیری کے دوران میں ملازمت اختیار کی اور ایک شخص رام سروپ سے انگریزی پڑھی ۔ ایک سال کی قلیل مدت میں اتنی مہارت حاصل کر لی کہ درخواست وغیرہ لکھنے

لگے ۔ سترہ سال دس مہینے کے بعد مع اہل و ایال وطن واپس آئے اور کرایہ کے مکان میں مقیم ہوئے ۔ ریاست ارتولی میں ملازمت اختیار کی ۔ بالآخر ۱۹۰۵ء میں انتقال ہوا ۔

جعفر صاحب کو ابتداء ہی سے تصنیف و تالیف کا خاص شوق تھا ۔ ان کی تصنیفات میں 'نصائح جعفری'، 'ترجمہ آئین پورن لیٹر'، 'تواریخ عجیب یا کالا پانی'، 'سوانح احمدی'، 'رسالہ رد قادیانیت' اور 'مکتوبات سید احمد شہید' قابل یادگار ہیں ۔ ان کا طرز تحریر سادہ تھا ۔ عربی و فارسی کا عالم ہونے کے باوجود انہوں نے عربی اور فارسی کے مشکل الفاظ کے استعمال سے پرہیز کیا ہے ۔ ان کی طرز تحریر کا نمونہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے :

"دو مئی تاریخ سنانے کے حکم پھانسی سے ۱۶ ستمبر تک ہم پھانسی گھروں میں بند رہے ۔ اہالیان جیل ہمارے پھانسی دینے کا سامان کر رہے تھے اور ادھر ہم انگریزوں کا تماشا بن رہے تھے صدہا صاحب لوگ اور میم روزانہ ہمارے دیکھنے کو پھانسی گھروں میں آتے تھے مگر بخلاف دوسرے عام پھانسی والوں کے ہم کو نہایت شاداں و فرحاں پا کر یہ یورپین بہت تعجب کرتے ۔ اکثر ہم کو پوچھتے تھے کہ تم کو بہت جلد پھانسی ہوگی ۔ تم خوشی کس واسطے کرتے ہو ۔ ہم اس کے جواب میں صرف اس قدر کہہ دیتے کہ ہمارے مذہب میں خدا کی راہ میں ایسے ظلم سے مارے جانے پر درجہ شہادت کا ملتا ہے اس واسطے ہم کو خوشی ہے"[1] ۔

پیارے لال آشوب

آپ ۱۸۳۸ء میں دہلی میں پیدا ہوئے ۔ سلسلہ نسب راجہ ٹوڈر مل تک پہنچتا ہے ۔ مرحوم دہلی کالج کے نامور اساتذہ میں ان کا شمار ہوتا ہے ۔ ماسٹر رام چند اور مولانا صہبائی سے ان کا خاص تعلق تھا اور مرزا غالب بھی انہیں بہت عزیز رکھتے تھے ۔ دلی کالج سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد ۱۸۵۷ء میں آگرہ گئے ، وہاں سے سند حاصل کرکے ۱۸۵۸ء میں بریلی میں سرکاری ملازم ہوئے ۔ ایک سال کے بعد پنجاب چلے گئے اور لاہور میں سر رشتہ تعلیم میں کیوریٹر کے فرائض انجام دیے ۔ کچھ عرصہ دہلی اور گوڑگاؤں میں ہیڈ ماسٹر رہے ۔ لاہور کے دوران قیام میں ایک سرکاری اخبار کے اڈیٹر بھی رہے ۔ ان کی استعداد ، علمی فضیلت اور علمی و ادبی مشاغل کی وجہ سے میجر فلر اور سائم انہیں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے ۔ ۱۸۹۲ء میں انہیں رائے بہادر کا خطاب ملا اور اسی سال

---

(۱) محمد جعفر ، تواریخ عجیب ۔ ص ۱۰۲ ۔

فیلو بھی بنے - ۱۸۹۵ء میں ۳۶ سال کی ملازمت کے بعد پنشن لے لی اور کبھی دہلی اور کبھی لاہور میں قیام کرنے لگے -

آپ کے اوصافِ حمیدہ اور اخلاقِ حسنہ کی وجہ سے ہندو مسلمان آپ کا بہت احترام کرتے تھے - وہ ایک خلیق ، ملنسار ، سلیم الطبع اور ذکی و فہیم انسان تھے - روا داری ، خلوص اور مروّت کو اپنا شعار بنا لیا تھا - ۱۹۱۴ء میں انتقال ہوا -

آپ نے اردو کی بہت سی کتابیں لکھیں جن میں 'رسومِ ہند' کے پہلے تین ابواب ، 'قصصِ ہند حصہ اول' ، 'اردو کی تیسری کتاب' ، 'ترجمہ تاریخِ انگلستان کلاں' ، 'ترجمہ دربارِ قیصری' ، اور 'رسالہ اتالیق' کے اکثر مضامین قابلِ یادگار ہیں - ان علمی خدمات کے صلے میں انہیں حکومت کی جانب سے ایک تمغہ بھی ملا تھا - ۱۸۸۱ء کے بعد انسپکٹری کے کام کی زیادتی کی وجہ سے کچھ نہ لکھ سکے -

'قصصِ ہند' اور 'رسومِ ہند' میں انہوں نے زبان اور طرزِ تحریر کی سلاست اور سادگی کو پیشِ نظر رکھا ہے - 'رسومِ ہند' زبان کی حلاوت اور سلاست کے اعتبار سے ایک خاص مقام رکھتی ہے اور آج بھی وہ اردو ادب سے ذوق رکھنے والوں کے لیے اہمیت کی حامل ہے - اس خصوصیت کے پیشِ نظر ۱۸۶۸ء میں سر رشتۂ تعلیم پنجاب نے اسے شائع کیا تھا - نمونہ ذیل میں دیا جاتا ہے - ایک اقتباس اردو کی تیسری کتاب سے سومنات کے مندر کے بیان سے لیا گیا ہے - نثر ملاحظہ ہو کتنی شفاف ہے :

> ''قلعے میں سینکڑوں برس کا ایک عالی شان اور وسیع مندر تھا - اس کی چھت کو چھپن ستون سنبھالے کھڑے تھے جو رنگ برنگ کے نقش و نگار اور جواہرات کے بیل بوٹوں سے مرصّع تھے - یہی سومنات جی کا مندر تھا - اس میں رات دن صرف ایک چراغ جلتا تھا - اس کی روشنی جواہرات پر پڑتی تھی - ان کی جوت سے سارا مکان جگمگ جگمگ کرتا تھا - سونے کی ایک بھاری زنجیر میں گھنٹے لٹکتے تھے - پوجا کے وقت اسے ہلاتے تھے کہ سب کو خبر ہو جائے - دو ہزار برہمن پجاری تھے ، پانچ سو عورتیں ، تین سو مرد گانے بجانے والے تھے - تین سو نائی تھے کہ جاتریوں کا بھدرا کیا کرتے تھے - گرہن کے وقت دو لاکھ سے زیادہ جاتری جمع ہو جاتے تھے - راجاؤں نے جو گاؤں مندر کے نام پر دیے تھے وہ دو ہزار کے قریب تھے - راجا ، مہا راجہ اپنی لڑکیاں خدمت کے لیے بھیجتے تھے اور زیور ، جواہرات ، بھاری بھاری

کپڑے چڑھاوا چڑھاتے تھے ۔ غرض مندر میں اتنی دولت تھی کہ کچھ حساب نہ تھا''[1] ۔

دوسرا اقتباس ہم 'من سکھی اور سندر سنگھ' کے قصے سے لیتے ہیں ۔ یہ 'رسوم ہند' کا تیسرا باب ہے :

''ایک دفعہ بہار کے موسم میں جبکہ جاڑا گزر گیا اور جنگل میں طرح طرح کے پھل بوٹے اور رنگ رنگ کے پھول کھلنے لگے ۔ امیر پور گاؤں میں سیتلا کا بڑا میلا ہوا ۔ وہاں کی تمام عورتیں اور مرد باجوں میں بجا بجا لے اپنے اپنے گھروں سے باہر نکلے ۔ راستے میں ہم عمر لڑکیاں آپس میں ہنستی بولتی سیتلا سہسلے گاتی جاتی تھیں ۔ ان میں ایک امیر کی لڑکی جس کا نام 'من سکھی' تھا اپنے چچا سجان سنگھ نمبردار جو جی جندر کنور کے ساتھ گھر سے باہر نکلی ۔ اسی وقت ان کا بروہت گیان چند مشر بھی اپنی بیٹی پاربتی کو ہمراہ لیے ، ماتا جی کی پوجا کرنے ان کے ساتھ ہوا ۔ من سکھی نے پاربتی کو دیکھتے ہی اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور دونوں کی باتیں ہونے لگیں''[2] ۔

---

(۱) آزاد ، محمد حسین اردو کی تیسری کتاب ۔ ص ۳۰ ، ترقی اردو بورڈ کراچی ۱۹۶۳ء ۔

(۲) پیارے لال آشوب ، رسوم ہند ۔ ص ۲۶ مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۱ء ۔

آٹھواں باب

(الف) غزل گو شعراء

سیاسی نقطۂ نظر سے انیسویں صدی عیسوی کا نصف اول وہ زمانہ ہے جب شمالی ہند پر انگریزوں کا مکمل تسلط ہو گیا اور دیسی حکومتیں اتنی کمزور ہو گئیں کہ ان کے فرماں رواؤں کی حیثیت شاہِ شطرنج کی سی رہ گئی ۔ چھوٹی چھوٹی ریاستوں اور رجواڑوں کے علاوہ شمالی ہند میں دیسی حکومتوں کے دو بڑے مرکز دہلی اور لکھنؤ تھے ۔ لکھنؤ کی سلطنت یا نوابی کا علاقہ بہت وسیع تھا اور اس کے سالانہ محاصل دو کروڑ کے قریب تھے ۔ لیکن سیاسی نقطۂ نظر سے لکھنؤ کے سلاطین کمزور فرماں روا تھے ، جو انگریز ریزیڈنٹ کے چشم و ابرو کے اشاروں پر حکومت کرنے میں عافیت سمجھتے تھے ۔ چنانچہ جب فروری ۱۸۵۶ء میں واجد علی شاہ کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے گورنر جنرل لارڈ ڈلہوزی نے معزولی کا فرمان بھیجا تو اس بد نصیب تاجدار نے بے چون و چرا اس حکم کی تعمیل کی[1] ۔ واجد علی شاہ جو ناٹک ، رہس ، موسیقی اور شاعری کے دلدادہ تھے ، لکھنؤ سے جلا وطن ہو کر مٹیا برج (کلکتہ) چلے گئے جہاں وہ انگریزوں کے عطا کردہ وظیفے سے اپنے شوق پورے کرتے رہے ۔ انہوں نے اسی حقیر رقم سے اپنے گرد چند شاعروں ، موسیقاروں اور ذی علم اشخاص کا ایک حلقہ قائم کر لیا اور اپنی سلیقہ مندی سے مٹیا برج کو لکھنؤ کا نمونہ بنا دیا[2] ۔

دلی کی سلطنت مرزا غالب کے بقول کچھ سخت نہ تھی ۔ ۸ مئی ۱۸۰۳ء کو لارڈ لیک نے سیندھیا کی فوجوں کو مختلف محاذوں پر شکست دینے کے بعد شہرِ دہلی پر قبضہ کر لیا ۔ مگر انگریز مدبّروں نے شاہ عالم کو مصلحتاً لال قلعے کی بساطِ سیاست پر قائم رکھا اور اس کی نام نہاد 'شاہی' کا احترام کرتے رہے ۔ یہی صورت کم و بیش شاہ عالم کے بیٹے اور پوتے یعنی اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ ثانی (سراج الدین ظفر) کے زمانے میں قائم رہی ۔ ان آخری مغل بادشاہوں میں تیمور اور اکبر کا سا ولولہ اور حوصلہ تو ہرگز نہ تھا ، لیکن تباہی و زوال کی راکھ کے نیچے امید اور آرزو کی کچھ چنگاریاں ضرور باقی نہیں ۔ یہ آخری مغل بادشاہ بھی اپنی تباہ شدہ زندگی میں بھی اپنی تہذیب کی تمام نفاستوں کو پورے اہتمام سے قائم رکھتے رہے ۔ سلطنت جا چکی تھی، لیکن جی چاہتا تھا کہ جھوٹا شاہانہ

---

(۱) عبدالحئی ، گل رعنا ۔ ص ۔

(۲) شرر ، مشرقی تمدن کا آخری نمونہ ۔ ص ۲۰۸ ۔

ٹھاٹھ قائم رہے - چنانچہ اکبر اور شاہجہان کے زمانے کے عہدے بدستور قائم تھے - دربار لگتا ، منصب دار ، سردار اور امرا اپنی اپنی جگہ آ کر کھڑے ہوتے ، نقیب اور چاؤش کی آوازیں دیوانِ خاص میں گونجتیں ، سواروں اور پیادوں کی صفیں سلامی کے لیے کھڑی ہوتیں - عید ، بقرا عید ، بسنت ، تخت نشینی (جلوس) اور سالگرہ کے جشن منائے جاتے[۱] - شاعر قصیدے پڑھتے ، امراء اپنی نذریں پیش کرتے ، بادشاہ سلامت انہیں انعام اور خطاب سے نوازتے اس حکومت کا بھرم رکھنے کی کوشش کرتے جو کبھی کی رخصت ہو چکی تھی -

اس زمانے میں انگریز حکام نے سیاسی مصلحتوں اور اپنی روایت پرستی کے تحت ان نام نہاد مغل بادشاہوں کو زیادہ پریشان کرنا مناسب نہیں سمجھا - انہوں نے آدابِ شاہی کو اس حد تک قائم رکھا کہ تہنیت اور تعزیت کے موقعوں پر انگریز بادشاہ لندن سے مبارک باد اور ماتم پرسی یا افسوس کے پیغام گورنر جنرل کی معرفت دہلی بھیجتے تھے - دہلی کے برائے نام بادشاہ بھی یہی رسمیں ادا کرتے تھے - چنانچہ جب ولیم چہارم کی وفات کے بعد ملکہ وکٹوریہ تخت نشین ہوئی (۱۸۳۷ء) تو اکبر شاہ ثانی نے وائسرائے ہند لارڈ آکلینڈ کی معرفت تعزیت اور تہنیت نامہ تخت نشینی ارسال کیے - اسی طرح اکبر شاہ ثانی کی وفات پر فرمان روائے انگلستان کی طرف سے سر چارلس مٹکاف کی معرفت بہادر شاہ ظفر کے نام تعزیت نامہ بھیجا گیا[۲] -

لال قلعے میں حکومت کی یہ نمود و نمائش یقیناً جھوٹی تھی ، لیکن لال قلعے میں جو جلسے ، ٹھاٹھ ، راگ رنگ ، شاہانہ نمود ، شعر و شاعری کا چرچا تھا اس کی بدولت اب بھی لال قلعے کو شمالی ہند کی تہذیب کا مرکز مانا جاتا تھا - آٹھ سو سال کے تہذیبی تسلسل کی وجہ سے دہلی (اور دہلی میں قلعۂ معلیٰ) کو رفتار و گفتار ، خوراک ، لباس ، آداب و رسوم ، نشست و برخاست المختصر پوری تہذیب کا معیار تسلیم کیا جاتا تھا - یہاں تمام تیوہار اور رسمیں باقاعدگی کے ساتھ منائی جاتی تھیں - یہیں وہ مشاعرے ہوتے تھے جن میں حکیم آغا جان عیش ، شاہ نصیر ، غالب ، ذوق ، مومن ، ولیعہد مرزا فخرو اور نواب مرزا داغ جیسے نو عمر صاحبزادے شریک ہو کر سخن سنجی کی داد دیتے تھے - مرزا غالب کا ایک مطلع اسی قسم کے ایک مشاعرے کی یادگار ہے :

حضورِ شاہ میں اہلِ سخن کی آزمائش ہے
چمن میں خوشنوایانِ چمن کی آزمائش ہے

یہاں جو زمزمے ، راگ رنگ اور خوش باشی کے مظاہرے ہوتے رہتے ہیں ان کا تذکرہ

---

(۱) Garrett : Legacy of India, p. 303.

(۲) بشیر الدین احمد ، واقعات دارالحکومت ، ج ۱ - ص ۳۹۹ -

منشی فیض الدین نے 'بزمِ آخر' میں سید وزیر حسن نے 'دلی کا آخری دیدار' میں اور ناصر نذیر فراق نے اپنی متعدد تصانیف میں کیا ہے جس کا مختصر سا اقتباس یہاں پیش کرنا مناسب ہے :

"قلعے میں گو نام کی بادشاہت رہ گئی تھی مگر بجھتا ہوا چراغ تھی ۔ اس گئی گزری حالت میں بھی بہار دے گئی ۔ اس موت میں بھی تحفہ زندگی کا نمونہ بنی رہی ۔ سارے شہر میں اسی کی مثال لی جاتی ۔ اس لیے جسے دلی دیکھنی ہو وہ پہلے ان دنوں کا قلعہ دیکھے ۔ شہری زندگی کا یہی سجل نمونہ کبھی عطر زندگی تھا"[۱] ۔

شمالی ہند کے دوسرے تہذیبی مرکز یعنی لکھنؤ کی بھی یہی کیفیت تھی ۔ شجاع الدولہ کا دارالحکومت فیض آباد تھا ۔ آصف الدولہ نے لکھنؤ کو دارالسلطنت بنایا ۔ اس وقت سے لے کر واجد علی شاہ کے زمانے تک یہ شہر با کمالوں کا مرکز بنا رہا ۔ مرزا رجب علی بیگ سرور نے فسانۂ عجائب کے دیباچے میں سر سید احمد خان کی طرح اپنے زمانے کے لکھنے والوں کی تعریف کی ہے اور اس عہد کے ممتاز اشخاص اور ان کی ہنرمندی کا بیان کیا ہے ۔ فدا علی خنجر، عبدالحلیم سرر اور منشی فیض بخش (مصنف تاریخ فرح بخش) کی تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانے کا لکھنؤ شمالی ہند میں تہذیب، خوش اطواری، خوش گفتاری، رونق، نفاست اور ہنرمندی کا مخزن تھا ۔ اطوار کی شائستگی اور خوش گفتاری کا یہ عالم تھا کہ لکھنؤ کا معمولی آدمی بھی اپنی شستگی اور خوش بیانی سے دوسرے شہروں کے تعلیم یافتہ اشخاص کو حیران کر دیتا تھا[۲] بعض شعراء کے اشعار بھی اس حقیقت کا اشارہ کرتے ہیں :

کیا اور مصحفی میں کروں وصفِ لکھنؤ
روئے زمیں پہ اب یہ صفاہاں ہے دوسرا

☆ ☆ ☆

امیر افسردہ ہو کر غنچۂ دل سوکھ جاتا ہے
وہ میلے ہم کو قیصر باغ کے جب یاد آتے ہیں

امیر مینائی (قیامِ رام پور میں)

☆ ☆ ☆

---

(۱) وزیر حسن، دلی کا آخری دیدار ۔ ص ۹ ۔
(۲) عبدالحئی، گل رعنا ۔ ص ۳۸۳ ۔

امیر ایسی ادائیں حور و غلماں میں کہاں ہوں گی
رہے گا خلد میں بھی یاد ہم کو لکھنؤ برسوں

دلّی والوں کی طرح اہلِ لکھنؤ بھی خوش باشی اور لطفِ زندگی کے عاشق تھے ۔ مختلف تیوہاروں ، تقریبوں ، شادی بیاہ ، میلے ٹھیلوں میں یہ لوگ جس شوق سے شریک ہو کر زندگی میں رس گھولتے تھے اس کا تذکرہ خنجر ، سرو اور مرزا محمد ہادی رسوا اور ڈاکٹر محمد احسن فاروقی (مصنف شام اودھ) نے تفصیل سے کیا ہے ۔ بعض شعراء نے بھی لکھنؤ والوں کی وضعداری ، بانکپن ، خوش کلامی اور خوش باشی کا بیان اپنے اشعار میں کیا ہے :

میلہ ٹھیلا کوئی نہ بچتا تھا
کھانا بے دال لگی نہ بچتا تھا

(نواب مرزا شوق)

☆ ☆ ☆

کس کے چمکے چاند سے رخسار قیصر باغ میں
چاندنی ہے سایۂ دیوارِ قیصر باغ میں

☆ ☆ ☆

بلبلِ شیراز کو ہے رشک ناسخ کا سرور
اصفہاں اس نے کیے ہیں کوچہ ہائے لکھنؤ

زمزموں ، چہچہوں اور بہاروں کا یہ رنگین زمانہ بہت جلد ختم ہو گیا ۔ فروری ۱۸۵۶ء میں واجد علی شاہ معزول کر دیے گئے اور بیشتر اشخاص جو اودھ کی سرکار سے توسل رکھتے تھے ، بے روزگار ، بے وطن اور بے وقار ہو گئے ۔ اگلے سال ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ ہوا جس میں دوسرے شہروں کی طرح لکھنؤ نے بھی حصہ لیا اور اس کے بعد لکھنؤ میں وہ چہل پہل نہ رہی ۔ اکثر اہلِ لکھنؤ آبرو اور جان کے خوف سے شہر چھوڑ کر باہر چلے گئے اور ہر طرف سناٹا چھا گیا ۔

فنونِ لطیفہ کے ماہروں ، دانش وروں اور شرفا پر جو آفتیں آئیں ان کی تفصیل سے اودھ کی تاریخیں بھری پڑی ہیں ۔ اس بربادی کا ماتم مختلف شاعروں کے کلام میں ہے، لیکن نواب مرزا داغ دہلوی نے جو اپنے والد نواب شمس الدین

کے رنگ محل میں پلے بڑھے تھے اور جن کا لڑکپن اور نوجوانی لال قلعے کی رنگین فضا میں بسر ہوئے تھے ، اپنے مسدّس 'شہر آشوب' میں اس تباہی کا ذکر بڑے مؤثر انداز میں کیا ہے :

فلک نے قہر و غضب تاک تاک کر ڈالا
تمام پردۂ ناموس خاک کر ڈالا

یکا یک ایک جہاں کو ہلاک کر ڈالا
غرض کہ لاکھ کا گھر اس نے خاک کر ڈالا

جلی ہیں دھوپ میں شکلیں جو ماہتاب کی تھیں
کھنچی ہیں کانٹوں میں جو پتّیاں گلاب کی تھیں

☆ ☆ ☆

خدا پرستوں کا شیوہ جفا پرستی ہے
جو مال مست تھے اب ان کو فاقہ مستی ہے

بجائے ابرِ کرم مفلسی برستی ہے
بتنگ جینے سے ہیں ایسی تنگ دستی ہے

غضب میں آئی رعیّت بلا میں شہر آیا
یہ پوربیے نہیں آئے خدا کا قہر آیا

دہلی اور لکھنؤ کی تباہی کے بعد ان شہروں کے شرفا ، ہنر وروں اور فن کاروں نے دیسی ریاستوں کا رخ کیا ۔ الور ، ٹونک ، جے پور اور گوالیار وغیرہ میں ان کو سر چھپانے کی جگہ ملی ۔ لیکن جس ریاست نے سب سے زیادہ ان کو پناہ دی وہ رام پور تھی ۔

یہاں لکھنؤ کے شعراء اور شرفاء میں سے مظفر علی خان اسیر ، امیر مینائی ، آفتاب الدولہ قلق ، منیر شکوہ آبادی ، امداد علی بحر ، ذکی ، عروج ، جلال ، تسلیم ، وغیرہ معقول تنخواہوں پر مقرر ہوئے ۔ دلی والوں میں سے تسکین ، آہی ، داغ ، شاغل ، رسا ، حیا وغیرہ نے بھی یہاں آ کر اعزاز و اکرام سے زندگی بسر کی ۔

مرزا غالب اور مومن نے رام پور کا سفر کیا اور بڑے احترام سے ان کی پذیرائی کی گئی۔

حیدر آباد دکن کی ریاست بجائے خود ایک مملکت تھی مگر نظام دکن اور ان کے ذیجاہ امرا کی قدر دانناں ملک کے گوشے گوشے سے اہل ہنر کو کھینچ لاتی تھیں۔ مرتبہ شناسی کا یہ حال تھا کہ انیس جیسے خود دار اور گوشہ گیر شاعر نے بھی آخر عمر میں نواب آسمان جاہ کی تحریک پر حیدر آباد کا سفر کیا۔ ایک ملاقات کے بعد جب انیس پالکی میں سوار ہو کر رخصت ہونے لگے تو آسمان جاہ جیسے ذی رتبہ نواب نے ان کی جوتیاں اٹھا کر پالکی میں رکھی تھیں[1]۔ اس قدر دانی اور فیاضی نے شمالی ہند کے لیے بے شمار علماء، شعراء، فضلا اور دیگر فنون کے ماہروں کو دکن میں کھینچ لیا تھا۔ مولوی حیدر علی، مولوی عبدالحلیم فرنگی محلی، مولانا امین الدین، لطف اللہ، مسیح الزمان، مہدی علی محسن الملک، مشتاق حسین وقار الملک، چراغ دہلوی، شمس العلماء سیّد حسین اور سید علی بلگرامی، ڈپٹی نذیر احمد، شبلی، عزیز مرزا، گرامی، عبدالحئی، عبد الحق، حالی، داغ، سرشار، سلیم پانی پتی، جوش ملیح آبادی، ہوش، فانی بدایونی غرض ہزارہا اہل ہنر تھے جن کی تربیت و پرورش حیدر آباد دکن نے کی اور اس طرح کی کہ جب کوئی شخص سازش یا سیاسی جوڑ توڑ کے زیر اثر برخاست بھی ہوا تو ملک بدر کر دینے کے باوجود اس کا وظیفہ بحال رکھا[2]۔ مولانا ظفر علی خان مرحوم اور ڈپٹی نذیر احمد گھر بیٹھے پنشن لیتے رہے۔ محبوب علی خان نظام دکن کا یہ قول مشہور تھا کہ نوکر کو پیٹھ کی مار دو۔ پیٹ کی مار نہ دو۔

نظام دکن کے علاوہ ان کے وزیر اور امراء بھی ارباب ہنر کی سرپرستی کرتے تھے۔ مہاراجہ چندو لال شاداں جنہوں نے ذوق کے لیے زاد راہ کی رقم بھیجی تھی، اہل ہنر کی اتنی قدر دانی کرتے تھے کہ لوگ حیدر آباد دکن کو 'چندو لال کا حیدر آباد' کہنے لگے تھے[1]۔ میر محبوب علی خان نظام دکن کے وزیر اعظم مہاراجہ گردھاری لال باقی کی سرکار سے بہت سے عالم فاضل اور شاعر وابستہ تھے۔ انہی مہاراجہ کی وساطت سے داغ کا پہلا قصیدہ نظام دکن میر محبوب علی خان کی خدمت میں پیش ہوا تھا۔ مہاراجہ کشن پرشاد شاد جو میر عثمان علی خان نظام دکن کے وزیر اعظم اور مدار المہام تھے، ایسے ہی علم دوست معارف پرور امیر تھے کہ علامہ اقبال کے ساتھ ان کی دوستانہ خط و کتابت رہتی تھی۔

---

(۱) عبدالحئی، گل رعنا۔ ص ۲۷۸۔

اس قدر دانی اور متوسّل پروری کا یہ اثر تھا کہ جو اہلِ ہنر جس سرکار سے وابستہ ہو جاتے وہیں ان کی بلکہ ان کی اولاد کی عمریں بسر ہو جاتی تھیں۔

انیسویں صدی کے نصفِ آخر کے یہ شعراء افتادِ طبع کے اعتبار سے اپنے پیشروؤں سے مختلف نہیں ہیں۔ شوقین مزاجی، تکلف، شوقِ آرائش، حسن پرستی اور ذوقِ جمال میں یہ طبقہ ہمیشہ پیش پیش رہا ہے اور انہی رجحانات کے سبب بدنام بھی ہوا ہے۔ یہ لوگ خوش پوشی، خوش خوراکی، لطفِ صحبت، حسنِ گفتار اور علم و ہنر کو حاصلِ زندگی سمجھتے تھے۔ داغ کی زندگی بہت سے حادثات کے باعث پرسکون ماحول میں نہیں گزری اور وہ علمِ متداولہ پر عبور حاصل نہ کر سکے اس کمی کی تلافی ان کی ذہانت اور براقی طبع نے کر دی۔ لیکن منیر، رشک، ضامن علی جلال اور امیر مینائی نے عربی، فارسی شاعری اور مذہبی علوم کی باقاعدہ تحصیل کی تھی۔ ان لوگوں کو مذہب سے گہرا لگاؤ بھی تھا جس کا ثبوت ان کے کلام سے ملتا ہے۔ خصوصاً امیر مینائی کو اس معاملے میں اتنا شغف تھا کہ غزلوں کے پانچ دواوین کے ساتھ ایک دیوان محامد خاتم النبیّین تمام و کمال نعت گوئی پر مشتمل ہے۔ تصوّف کا اثر بھی ان پر گہرا ہے کیونکہ براہِ راست شاہِ مینارہ کے خاندان سے ہیں۔ اگرچہ ان کی ساری عمر دربار داری میں گزر گئی لیکن مذہبی تعلیم اور تصوف کی بدولت ان کے مزاج میں غیرت، معرفتِ الٰہی، فقر و استغنا، خود داری، توکّل اور صلح کل کا مادہ موجود رہا۔ ذیل کے اشعار اسی رجحان کے آئینہ دار ہیں:

دل مرا کشتہ ہے یا رب کس شہادت گاہ کا
ہر شگافِ زخم دروازہ ہے بیت اللہ کا

شیخ کعبے سے اسے پہنچا، برہمن دیر سے
ایک تھی دونوں کی منزل پھیر تھا کچھ راہ کا

میرے دل کے آئینے میں منہ جو دیکھے برہمن
قشقہ ماتھے کا نظر آئے الف اللہ کا

ہم کہاں دلیا کہاں، کچھ یوں ہی دل میں آ گئی
دیکھتے چلیے تماشا اس تماشا گاہ کا

کھل گیا جب یہ کہ دل بھی جلوہ گاہِ یار ہے
کون چکر کھائے پھر دیر و حرم کی راہ کا

☆ ☆ ☆

ظاہر میں گو گرفتہ حسنِ بتاں کے ہیں
پر کیا کہیں نگاہ میں جلوے کہاں کے ہیں

داغ اس کوچے سے نا بلد ہیں پھر بھی تصوف کے بعض مسائل کا پرتو ان کے کلام میں نظر آ جاتا ہے۔

مذہب سے اپنے لگاؤ کا اظہار بھی کرتے ہے۔ یوں بھی آخر عمر تک وہ نماز روزہ کے پابند رہے تھے۔ ضعف اور بیماری کے زمانے میں البتہ روزہ رکھنے سے معذور ہو گئے تھے۔ ۱۸۷۲ء میں جب نواب کلب علی خاں سفرِ حج کے لیے گئے تو داغ نے بھی ان کے ہمراہ یہ سعادت حاصل کی۔ مدینۂ منورہ میں حرمِ رسول کی زیارت سے بھی مشرف ہوئے۔ اس مبارک فریضے کا ذکر انہوں نے کئی اشعار میں کیا ہے اور کہیں کہیں اپنی طبیعت کی شوخی بھی دکھانے سے باز نہیں رہے:

یہ آرزو ہے آنکھ میں سرمہ لگائیں گے
اے داغ خاکِ پائے رسولِ خدا سے ہم

☆ ☆ ☆

اے داغ شکر کر کہ شرف باب تو ہوا
دل کی مراد حج و زیارت میں مل گئی

☆ ☆ ☆

ہزار شکر ہمیں داغ حج نصیب ہوا
قصور وار گئے بے قصور ہم آئے

حمدِ الٰہی میں وہ مشہور غزل جس کے چند اشعار ذیل میں درج ہیں۔ داغ نے بیت اللہ کی دیوار کے سائے میں بیٹھ کر کہی تھی:

سبق ایسا پڑھا دیا تو نے
دل سے سب کچھ بھلا دیا تو نے

داغ کو کون دینے والا تھا
جو دیا اے خدا تو دیا تو نے

شاعر ہونے کے سبب امیر مینائی اور جلال بھی جمال پرست تھے، لیکن انہوں نے لکھنؤ کی متانت اور ثقاہت کو نباہا اور داغ کی طرح کسی بکھیڑے میں

گرفتار نہیں ہوئے۔ اس کے باوجود ان کے کلام میں حسن کی مختلف ادائیں اور جلوے بکثرت موجود ہیں۔

دبستانِ لکھنؤ کی یہ رنگینی جلال کے کلام میں بھی نمایاں ہے۔ اساتذۂ لکھنؤ کی طرح ان کے اشعار میں بھی حسن کی تفصیل، حسن کی ادائیں، لباس و آرائش کا بیان اور معاملاتِ الفت کا مذکور ہے۔

داغ نے قلعۂ معلّیٰ کی رنگ رلیوں میں ہوش سنبھالا تھا اس لیے ان کے اشعار میں بھی حسن اور حسینوں کا بیان ہے، لیکن ذرا مختلف انداز سے۔ دبستانِ دہلی کے اساتذہ کا اصول بالعموم یہ رہا ہے کہ وہ لباس و آرائش یا اعضائے جسمانی کی خوشنمائی کا ذکر کرنے کے بجائے اس مجموعی تاثر کا ذکر کرتے ہیں جو حسن و جمال کو دیکھ کر دیکھنے والے پر طاری ہوتا ہے۔ داغ مجموعی طور پر جرأت کی معاملہ بندی کے پیرو ہیں۔ ان کے کلام میں وہ ستھرا پاکیزہ انداز نہیں جو میر، مصحفی، غالب اور مومن کے کلام کا وصفِ خاص ہے۔ وہ حسن کی اداؤں کا بیان کھل کر کرتے ہیں اور اس میں بھی چھین جھپٹ کا طریقہ برتتے ہیں۔ تا ہم دبستانِ دہلی کی تقلید میں وہ حسن کی تفصیل اور لباس و زیورات کے ذکر کے بجائے مجموعی تاثر کا بیان کرتے ہیں۔ اس بیان میں پردہ داری کے بجائے وضاحت بلکہ عریانی کا رنگ ہے اور صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ ان کا محبوب پردہ نشین نہیں بلکہ بازار کی طوائف معلوم ہوتا ہے جس کے ساتھ چھلیں کر رہے ہیں۔

ہر ادا مستانہ سر سے پاؤں تک چھائی ہوئی
اف تری کافر جوانی جوش پر آئی ہوئی

☆ ☆ ☆

کسی کی شامت آئے گی کسی کی جان جائے گی
کسی کی تاک میں وہ بام پر بن ٹھن کے بیٹھے ہیں

ایک چیز جو امیر، داغ اور جلال کے کلام میں مشترک ہے وہ زبان کی صفائی اور سلاست ہے۔ اس کی وجہ پوچھی جائے تو کہنا چاہیے کہ یہ تینوں شاعر اس زمانے کے ہیں جب اردو زبان، ڈھائی سو سال کی مشق اور منجھائی کے بعد صاف اور فصیح ہو چکی تھی۔ لکھنؤ میں ناسخ کی اصلاحِ زبان کی تحریک نے بھدے، بد آواز اور ثقیل الفاظ کو

چھانٹ کر متروک قرار دے دیا تھا ۔ انیس اور دبیر نے مرثیے کے پردے میں زبان کی صفائی کو عروج پر پہنچا رکھا تھا اور دلی میں شاہ نصیر اور ذوق کے سلسلے کے شعراء نے لطفِ زبان اور سلاستِ محاورہ کو شاعری کا حاصل قرار دیا تھا ۔ لکھنؤ میں انیس کو اپنے روزمرہ پر ناز تھا اور ان کی تقلید میں بیشتر اساتذۂ لکھنؤ نے صفائی و سلاست کو اپنا شعار بنایا تھا ۔ بالخصوص انس اور ان کے بعض شاگردوں مثلاً رند ، صبا ، نسیم اور خلیل نے اتنی صاف زبان لکھی کہ بقول عبدالسلام ندوی " ان شعراء کا کلام آبِ رواں کی موج بن گیا"[۱] ۔ دہلی میں غالب کے بعض شاگردوں نے اگرچہ فارسی تراکیب اور فارسی الفاظ کا شوق قائم رکھا ، لیکن اکثر شاگردوں مثلاً میر مہدی مجروح ، حالی ، ناظم وغیرہ نے سلیس زبان لکھی ۔ ذوق کا سلسلہ تو لطفِ زبان کے لیے دہلی میں مشہور ہی تھا اور ذوق ہی کے شاگرد تعداد میں سب سے زیادہ تھے ۔ قلعے کے تمام شہزادے اور دہلی کے اکثر شاعر ذوق کے انداز کو چاہتے تھے ۔ مومن کے شاگرد مثلاً شیفتہ ، سالک ، تسکین ، آہی ، وحشت وغیرہ بھی زبان کی صفائی و سلاست کے عاشق تھے ۔ غرض صفائی و سلاست کو اس دور کے تمام شعراء اختیار کر چکے تھے ۔ امیر اور داغ بھی اسی روش پر چلتے تھے ۔

زبان کے معاملے میں یہی بلکہ اس سے بہتر حیثیت امیر مینائی کی ہے جو خاص لکھنؤ کے باشندے تھے اور خاندانِ شاہ مینا کے رکن تھے ۔ بچپن اور نوجوانی میں انہوں نے علومِ متداولہ کی تعلیم اچھی طرح حاصل کی تھی ۔ ان کے خاندانی حالات داغ کی طرح پرآشوب نہیں رہے ۔ ان کی ولادت نصیر الدین حیدر کے عہد میں ہوئی (۱۸۲۹ء) جب لکھنؤ امن و اطمینان کا گہوارہ بنا ہوا تھا ۔ شعر گوئی کے شوق نے سارے شہر کو خوش بیانی و خوش گوئی کا عاشق بنا دیا تھا ۔ خاندانِ مینائی میں علم و فضل کا اتنا چرچا تھا کہ گھر کی عورتیں بھی تعلیم یافتہ تھیں[۱] ۔ امیر مینائی کی زندگی اول سے آخر تک مظفر علی خان اسیر جیسے استاد اور واجد علی شاہ اختر ، یوسف علی خان ناظم اور کلب علی خان جیسے نوابوں کی صحبت میں بسر ہوئی ۔ ان کی زبان میں سلاست و فصاحت کیوں نہ ہوتی ۔ بلکہ اتنا کہنا مناسب ہے کہ لکھنؤ کی تہذیب و ثقافت کے اثر سے ان کی زبان میں قدرتی حلاوت اور یک با وقار دل آویز متانت بھی ہے جس سے داغ کی زبان محروم ہے ۔ ذیل کے اشعار سے امیر کی دلفریب زبان کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے :

پھنسی جو دام میں بلبل تو کن نگاہوں سے
کبھی قفس کو کبھی سوئے آسیاں دیکھا

☆ ☆ ☆

---

(۱) دبدبۂ امیری ۔ ص

پہلو میں میرے دل کو نہ اے درد کر تلاش
مدت ہوئی غریب وطن سے نکل گیا

طاؤس نے دکھائے جو اپنے بدن کے داغ
روتا ہوا سحاب چمن سے نکل گیا

☆ ☆ ☆

افسوس تجھ کو رحم نہ آیا کچھ اے اجل
مارا کہاں امیر غریب الدیّار کو

☆ ☆ ☆

نہ کر اے یاس یوں برباد میرے خانۂ دل کو
اسی گھر میں جلانا ہے چراغِ آرزو برسوں

قضا کے بعد ایسے بیکسوں کو کون پوچھے گا
مگر اے بیکسی رویا کرے گی ہم کو تو برسوں

ایک اور صورتِ حال جس نے داغ ، امیر اور ان کے معاصروں کو زبان کی صفائی اور فن میں ریاض کرنے پر مائل کیا ، یہ تھی کہ غدر کے بعد رام پور میں شاعروں کا بہت بڑا گروہ جمع ہو گیا تھا جن میں سے چند اشخاص دہلی کے تھے اور باقی سب لکھنؤ کے تھے ۔ یہ اشخاص اپنے اپنے وطن اور دبستانِ شاعری کی سربلندی کے لیے سعر کہتے وقت بڑی کاوش کرتے تھے ۔ اس جذبۂ مسابقت نے ان کو ریاضی اور کاوش و کوشش میں مصروف رکھا ۔ مشاعروں میں طرحی مصرعوں پر جو غزلیں کہی جاتی تھیں ان میں یہ حال ہوتا تھا کہ کوئی مضمون کسی کے حصے میں آ گیا ، کوئی قافیہ کوئی نکال لے گیا اور کسی محاورے کو کسی نے سلیقے سے ادا کر دیا[1] ۔ ان مقابلوں سے شاعروں کی طبیعتوں میں تحریک پیدا ہوتی تھی اور جذبۂ مسابقت کی بدولت یہ حضرات غزل ، قصیدے اور مثنوی میں پورا زورِ طبع صرف کرتے تھے ۔ امیر اور داغ کے وہ دیوان جو قیامِ رام پور کے زمانے کی کمائی ہیں ، حاصلِ عمر ہیں ۔ لیکن جب داغ حیدر آباد چلے گئے اور وہاں جگت استاد بن کر ملکِ سخن کے بادشاہ بن گئے تو جذبۂ مسابقت ختم ہو جانے کے سبب ان کے کلام میں وہ زور اور براق نہ رہی جو رام پور میں تھی ۔ چنانچہ 'یادگارِ داغ' کی غزلیں اس زوال فن کی شہادت دیتی ہیں جو 'گلزارِ داغ' ، 'آفتابِ داغ' اور 'مہتابِ داغ' سے کم رتبہ ہیں ۔

---

(۱) سری رام ، خمخانۂ جاوید ، ج ۲ - ص ۲۸۱ -

رام پور کے ان 'حریفانِ بادہ پیما' کی ایک اور امتیازی خوبی ان کی خوش دلی اور خوش مزاجی ہے - امیر احمد تو خانوادۂ مینائی کی یادگار تھے - توکل صبر و رضا اور خوش مزاجی کے اصول ان سے زیادہ اور کون جان سکتا ہے - ان خوبیوں کو ان کے طبعی انکسار نے اور چمکا دیا تھا - رام پور میں اپنی عمرِ عزیز کے تقریباً تیس سال انھوں نے اس طرح گزار دیے کہ شاید ہی کسی کو ان سے آزردگی ہوئی ہو - نواب کلبِ علی خان نے بھی ان کی قدردانی کا حق ادا کر دیا - انھیں بھائی اور دوست بنا کر رکھا - امیر مینائی کی طبیعت میں جو انکسار اور متانت کا ملا جلا رنگ تھا اس کے پیشِ نظر یقین ہے کہ نہ انھیں کسی سے رنجش ہوئی ہوگی نہ کسی کو ان سے -

داغ

دہلی کی فضا شاعری کے غلغلوں سے گونجی ہوئی تھی کہ نواب شمس الدین خان کے گھر میں بہ تاریخ ۲۵ مئی ۱۸۳۱ء میں داغ پیدا ہوئے - چھوٹی بیگم ان کی والدہ تھیں - انھی نے ان کا نام مرزا رکھا[1] - عیش و عشرت کے گہوارے میں پل کر کچھ بڑے ہوئے تھے کہ ان کے والد نواب شمس الدین خان پر ولیم فریزر ریذیڈنٹ دہلی کے قتل (۲۲ مارچ ۱۸۳۵ء) کا مقدمہ چلا اور آٹھ نو ماہ کی تحقیقات کے بعد ۸ اکتوبر ۱۸۳۵ء کو انھیں پھانسی کی سزا دی گئی[2] - ان کی والدہ چھوٹی بیگم اپنے دہلی کے مکان سے نکل کر نہ جانے کن کن مرحلوں سے گزرتی رہیں - خالہ عمدہ خانم کے پاس پرورش پاتے رہے - پھر جب ۱۸۴۴ء میں مرزا فخر الملک بہادر رمز ولیعہد بہادر شاہ نے چھوٹی بیگم کو اپنی زوجیت میں لے لیا تو یہ بھی لال قلعے میں چلے گئے جہاں ان کی تعلیم و تربیت کا معقول انتظام ہو گیا - یہاں انھوں نے مردانہ مشاغل کے بطور شہسواری ، تیغ زنی ، تفنگ اندازی اور پھنکیتی کے فن سیکھے - شاعری ان دنوں شرفا کا شعار تھا - یہ بھی استاد ذوق کے حلقے میں داخل ہوئے - پہلی مرتبہ نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کے مشاعرے میں غزل پڑھی جس کے مطلع نے لوگوں کو ان کی طرف متوجہ کیا :

شرر و برق نہیں ، شعلہ و سیماب نہیں

کس لیے پھر یہ ٹھہرتا دل بیتاب نہیں

---

(۱) احسن مارہروی ، جلوۂ داغ - ص ۱۰ ، تمکین کاظمی ، داغ - ص ۲۲ ، لالہ سری رام نے خمخانۂ جاوید ، ج ۳ - ص ۱۰۴ پر تاریخ ولادت ۲۴ مئی لکھی ہے جو غلط ہے -

(۲) تمکین کاظمی ، داغ - ص ۲۶ -

کچھ عرصے بعد ایک اور مشاعرے میں غزل پڑھی ۔ جب مقطع پڑھا :

لگ گئی چپ تجھے اے حزیں کیوں اتنی
مجھ سے کچھ حال تو کمبخت بتا تو اپنا

تو امام بخش صہبائی نے گلے لگا لیا ۔ اسی طرح ایک شعر پر بہادر شاہ ظفر نے بھی ان کی پیشانی پر بوسہ دیا ۔ اس طرح یہ نوخیز نو عمر صاحب زادہ شاعری کی منزل طے کرتا رہا ۔ ابھی عمر کی چھبیس بہاریں دیکھی تھیں کہ غدر کا ہنگامہ برپا ہو گیا ۔ فتح دہلی کے بعد انگریزوں نے اہل ملک سے جس طرح انتقام لیا اور بقیۃ السیف دلی والے آوارہ وطن ہو کر جس طرح منتشر ہوئے اس کا بیان بہت دردناک ہے ۔ داغ بھی مختلف مقامات سے ہوتے ہوئے بالآخر ۲۷ اپریل ۱۸۵۸ء کو رام پور پہنچے ۔ یہاں راقم الدولہ ظہیر دہلوی پہلے سے موجود تھے ۔ انہوں نے تقریب کر کے داغ کو نواب رضا محمد خان کی سرکار میں ملازمت دلوائی ۔ تھوڑے ہی عرصے بعد نواب یوسف علی خان ناظم نے انہیں اپنی سرکار میں جگہ دی ۔ گاڑی خانہ ، کنول خانہ ، شتر خانہ اور اصطبل وغیرہ کا اہتمام ان کے سپرد ہوا جسے داغ نے ہوشمندی سے انجام دیا ۔ یوسف علی خان جب تک زندہ رہے ، عمدہ خانم اور قلعۂ معلّیٰ کی رعایت سے داغ کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آتے رہے ۔

یوسف علی خان کے انتقال ۱۸۶۵ء کے بعد ان کے بیٹے نواب کلب علی خان تخت نشین ہوئے ۔ انہوں نے بتاریخ ۱۳ اپریل ۱۸۶۶ء داغ کو اپنی ملازمت میں داخل کیا ۔ یہ سرکاری خدمات بھی ادا کرتے تھے اور درباری شاعر کی حیثیت سے نواب کی غزلوں کی اصلاح بھی کرتے تھے ۔ رام پور کی ملازمت میں بالعموم یہ دونو پہلو دوش بدوش قائم رہتے تھے اور اسی ترکیب سے نواب کلب علی خان نے رام پور جیسی چھوٹی ریاست میں اتنے زیادہ اربابِ علم و ہنر کی پرورش کا انتظام کر رکھا تھا ۔ یہاں شاعروں کے زمرے میں جتنے اشخاص تھے ان سب کی خدمات یوں ہی دوگانہ تھیں ۔ منشی امیر احمد مینائی ، مفتی عدالت دیوانی بھی تھے اور محملِ شعر و سخن میں بھی شامل تھے ۔ اسیر ، بحر ، عروج ، تسلیم ، ذکی ، امیر ، حیا ، منیر جلال جیسے شاعروں کی وجہ سے رامپور میں دہلی اور لکھنؤ دونوں دبستانوں کے با کمال جمع ہو گئے تھے ۔ طرحی مشاعروں میں یہ لوگ اپنی اپنی غزلیں پڑھتے تھے اور کوشش یہ ہوتی تھی کہ مضمون کی ندرت ، زبان کی صفائی اور بندش کی چستی میں ایک دوسرے کے شانہ بشانہ چلیں ۔ مقابلہ و مسابقت کے جذبے نے طبیعتوں کو بسّراق کر دیا تھا ۔ فی الحقیقت یہ صحبتیں ان شعراء کی طبیعتوں کو تیز کرنے میں سان کا کام کرتی تھیں ۔

نواب کلب علی خاں نے دوسرے شعراء کی طرح داغ کی بے حد قدردانی کی ۔ دیگر سرکاری خدمات کے علاوہ نواب کے ذاتی مشاعرے کا اہتمام بھی داغ کے سپرد ہوتا تھا ۔ اہتمام میں مصروف ہونے کے سبب داغ کو غزل کہنے کی فرصت نہ ملتی تھی ، لیکن عین وقت کے وقت بیس بائیس شعر کی غزل کہہ بیتے تھے اور سب سے داد وصول کرتے تھے ۔ دربار میں لکھنؤ کے شعراء کا مجمع تھا ، لیکن داغ جو دبستان دہلی کے نمائندے تھے ، ان سب پر چھائے رہتے تھے ۔ رام پور میں داغ نے تقریباً دس سال بڑی عزت سے بسر کیے ۔

جب ۱۸۸۷ء میں نواب کلب علی خاں خلد آشیاں کا انتقال ہوا تو رام پور کی ہوا بدل گئی ۔ نئی انتظامی کونسل قائم ہوئی جس کے رکن اعظم جنرل اعظم الدین تھے ۔ داغ کی ان سے نہ بن سکی اور وہ قسمت آزمائی کے لیے وہاں سے نکلے ۔ لاہور ، کشن کوٹ (امرتسر) آگرہ ، جے پور اور مانگرول (کاٹھیا وا) کی سیر کرتے ہوئے ۷ اپریل ۱۸۸۸ء کو حیدر آباد دکن پہنچے اور مہا راجہ گردھاری لال باقی کی وساطت سے وہ مشہور قصیدہ جس کا مطلع درج ذیل ہے ، محبوب علی خاں نظام دکن کی خدمت میں پیش کیا :

من ہوا بادیہ پیما طرف ملک دکن
سرمۂ چشم غزالاں ہوئی گرد دامن

امیدوار انتظار کے کئی ماہ گزر جانے کے بعد یہ دوبارہ دہلی آئے ۔ وہاں سے پھر دکن پہنچے ۔ بالآخر ۳ اکتوبر ۱۸۹۱ء کو ان کا تقرر بحیثیت شاعر ۴۵۰ روپے ماہوار پر ہوا اور اسی حساب سے تاریخ آمد سے اس وقت تک کی کل رقم انہیں یک مشت ادا کر دی گئی ۔ داغ نے اس سے اپنا سامان درست کیا اور دلجمعی سے رہنے لگے ۸ ستمبر ۱۸۹۴ء کو ان کی تنخواہ ایک ہزار روپے ہو گئی اور اس کا بقایا بھی تاریخ آمد ہی سے ادا کیا گیا ۔ اسی طرح داغ کو تقریباً باسٹھ ہزار روپے بطور بقایا ملے ۔ تنخواہ الگ تھی (اس زمانہ کی ارزانی ملحوظ رہے ۔) تقریبوں اور جشنوں کے انعام اس کے علاوہ سمجھیے ۔ غرض اعزاز و اکرام کے لحاظ سے برّ صغیر کا کوئی شاعر اس عروج پر نہیں پہنچا ۔ استاد شاہ ، جگت استاد ، فصیح الملک وغیرہ خطابات عطا ہوئے ۔

نومبر ۱۸۹۸ء میں داغ کی بیوی فاطمہ بیگم کا انتقال ہوا جس سے ان کی زندگی بے لطف ہو گئی ۔ اکثر خطوں میں اپنی دلگیری و پریشانی کا ذکر کیا ہے ۔ دسمبر ۱۸۹۹ء میں یہ نظام کے ساتھ کلکتے گئے اور وہاں کے شعراء نے ان کا جاہ و جلال ملاحظہ کیا ۔ منی بائی حجاب جس سے داغ کو رام پور کے بے نظیر کے میلے میں محبت ہو گئی تھی (۱۸۷۹ء) داغ کی یہ شان دیکھ کر ایسی للچائی کہ شوہر سے طلاق لے کو

۱۸ - ۱۹ جنوری ۱۹۰۱ء کو حیدر آباد دکن چلی آئی - داغ کے گھر میں ان کی متبنیٰ بیٹی لاڈلی بیگم زوجہ نواب سراج الدین احمد سائل نے وہ جوڑ توڑ کیے کہ منی بائی کو حیدر آباد سے کلکتے واپس آنا پڑا - تاہم داغ وضعداری کے تقاضے سے منی بائی کو دو سو روپے ماہوار بھیجتے رہے[۱] -

ضعفِ پیری اور بعض نا خوشگوار خانگی حالات کے سبب آخر داغ کی صحت خراب ہو گئی - اگرچہ علاج معقول ہوئے ، لیکن صحت گرتی چلی گئی - ۱۴ فروری ۱۹۰۵ء/ ۹ ذی الحجہ ۱۳۲۲ھ[۲] کو دبستانِ دہلی کا یہ شاعر جو شوخیٔ مضمون ، شگفتہ بیانی ، جرأت کی معاملہ بندی اور لال قلعے کی ٹکسالی زبان کا یہ نمونہ تھا ، دنیا سے رخصت ہوا - نواب نے تجہیز و تکفین کے لیے پانچ ہزار روپے عطا کیے - ان کے شاگرد رشید احسن مارہروی نے تاریخ کہی :

چل بسا حیف داغ بلبلِ ہند ۱۳۲۲ھ

داغ کی طبیعت میں احباب نوازی ، اقربا پروری ، خوش باشی اور دور اندیشی کے جوہر تھے - انھی کی بدولت وہ معزز و محترم رہے - شاگردوں میں احسن مارہروی ، علامہ اقبال ، بے خود دہلوی ، سائل دہلوی ، نسیم بھرتپوری ، اختر نگینوی کے نام ممتاز ہیں -

داغ کی تصانیف یہ ہیں :

گلزارِ داغ - ۳۴۹۳ اشعار ، آفتابِ داغ - ۱۷۵۶ اشعار ، مہتابِ داغ - ۳۱۷۶ اشعار ، یادگارِ داغ - ۱۷۷۲ اشعار ، ضمیمہ یادگار داغ - ۱۳۶ اشعار ، کل تعداد ۱۴۷۸۳ اشعار -

ان کے علاوہ ایک دیوان غدر میں تلف ہو گیا تھا - ایک دیوان مرنے کے بعد نظام کے کتبخانے میں مل گیا اور ابھی طبع نہیں ہو سکا -

کلام کا رنگ

داغ کی شاعری کا عام انداز شوخی بیان ، معاملہ بندی اور تیکھا پن ہے جو بالعموم لاگ ڈانٹ ، چھین جھپٹ ، جلی کٹی ، طعن و تشنیع اور مقابلہ و مبارزہ تک پہنچ جاتا ہے - محبوب کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کی زیادتی اور مسلسل چھین جھپٹ کا رنگ ان کی غزلوں

---

(۱) تمکین کاظمی ، داغ - ص ۱۵۱ -
(۲) خمخانۂ جاوید ، داغ ، گل رعنا وغیرہ میں مختلف تاریخیں لکھی ہیں جو غلط ہیں -

میں اتنا زیادہ ہے کہ ان کی شاعری عشق و الفت کی نمائندہ ہونے کے بجائے بوالہوسی کی آئینہ دار بن جاتی ہے ۔ ان کا محبوب باوقار پردہ نشین فرد نہیں بلکہ بازار کی طوائف ہے جس سے وہ ہر وقت ہاتھا پائی ، طعن و تشنیع اور نیز کلامی پر اترتے ہیں ۔ بعض غزلیں سراسر یہی پہلو رکھتی ہیں ۔ ذیل کے اشعار سے ان کے اس رجحان کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے :

پہلے گالی دی سوالِ وصل پر
پھر ہوا ارشاد کیوں کیسی کہی

☆ ☆ ☆

دلوں پر سینکڑوں سکے تیرے جوبن کے بیٹھے ہیں
کلیجوں پر ہزاروں تیر اس چتون کے بیٹھے ہیں

کسی کی شامت آئے گی کسی کی جان جائے گی
کسی کی تاک میں وہ بام پر بن ٹھن کے بیٹھے ہیں

یہ اٹھنا بیٹھنا محفل میں ان کا رنگ لائے گا
قیامت بن کے اٹھیں گے بھبوکا بن کے بیٹھے ہیں

یہ گستاخی یہ چھیڑ اچھی نہیں ہے اے دلِ ناداں
ابھی پھر روٹھ جائیں گے ابھی وہ من کے بیٹھے ہیں

قسم دے کر انہی سے پوچھ لو تم رنگ ڈھنگ ان کا
تمہاری بزم میں کچھ دوست بھی دشمن کے بیٹھے ہیں

☆ ☆ ☆

جس کی بغل میں شب کو وہ ہو اس کو دیکھیے
جس وقت آنکھ کھل گئی دیدار ہو گیا

☆ ☆ ☆

رات دن نامہ و پیغام کہاں تک ہوں گے
صاف کہہ دیجیے ملنا ہمیں منظور نہیں

☆ ☆ ☆

دعا مانگ لو تم بھی اپنی زبان سے
کہ پورا ہو جو مدعا ہے کسی کا

☆ ☆ ☆

بزمِ دشمن میں نہ کھلنا گلِ تر کی صورت
جاؤ بجلی کی طرح آؤ نظر کی صورت

یہی شوخی اور لاگ ڈانٹ جب کبھی معشوق سے ہٹ کر واعظ و زاہد کی طرف رخ کرتی ہے تو تمسخر اور فقرے بازی صفائی زبان کے ساتھ مل کر عجب بہار دکھاتی ہے۔ غالباً واعظ، زاہد اور شیخ کو جتنا داغ نے جلایا ہے کسی اور شاعر نے نہیں جلایا ہوگا:

حضرت زاہد ہر اک نشے کو عادت شرط ہے
مر نہ جائیں گے شرابِ چشمۂ کوثر سے آپ

حضرتِ زاہد نکل آیا فلک پر آفتاب
پیر و مرشد اب تو اٹھیے میکدے کے در سے آپ

☆ ☆ ☆

رندانِ بے ریا کی ہے صحبت کسے نصیب
زاہد بھی ہم میں بیٹھ کے انسان ہو گیا

☆ ☆ ☆

حور کے واسطے زاہد نے عبادت کی ہے
سیر تو جب ہے کہ جنت میں نہ جانے پائے

☆ ☆ ☆

ملے زاہدِ پیر کو حور توبہ
وہاں ہوں گے رعنا جواں کیسے کیسے

☆ ☆ ☆

مے پی تو سہی توبہ بھی ہو جائے گی زاہد
کمبخت قیامت ابھی آئی نہیں جاتی

اس کے باوجود یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ صفائی زبان ، لطفِ محاورہ اور بندش کی چستی میں کوئی ہمعصر داغ کی ہمسری نہیں کر سکتا ۔

حقیقت یہ ہے کہ ان کا کلام شوخی ، شگفتگی اور بانکپن کا مرقع ہے ۔ صفائی زبان اور چستیٔ بندش کے سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ دریا بہہ رہا ہے ۔ معاملاتِ الفت کے بیان نے اس میں دو آتشہ شراب کا سرور بھر دیا ہے ۔

ذیل کے اشعار پڑھ کر داغ کی یہ خصوصیت آئینے کی طرح روشن ہو جاتی ہے :

حضرتِ دل آپ ہیں جس دھیان میں
مر گئے لاکھوں اسی ارمان میں

جس نے دل کھویا اسی کو کچھ ملا
فائدہ دیکھا اسی نقصان میں

عشق جس کشتی کا ہو تو نا خدا
وہ نہ آئے کس طرح طوفان میں

کس نے آنے کا کیا وعدہ کہ داغ
آج ہو تم اور ہی سامان میں

☆ ☆ ☆

مل گئی بے خودیٔ شوق سے راحت کیسی
ہو گئی دونوں جہان سے مجھے فرصت کیسی

اب تو دو چار ہی نالوں کا رہا تھا جھگڑا
ہار دی حضرتِ دل آپ نے ہمت کیسی

آپ ہی جور کریں آپ ہی پوچھیں مجھ سے
یہ تو فرمائیے ہے آج طبیعت کیسی

دھمکیاں دیتے ہو تم جذبۂ دل کی اے داغ
بندہ پرور یہ محبت میں حکومت کیسی

☆ ☆ ☆

خط میں لکھے ہوئے رنجش کے پیام آتے ہیں
کس قیامت کے یہ نامے مرے نام آتے ہیں

رہرو راہِ محبت کا خدا حافظ ہے
اس میں دو چار بہت سخت مقام آتے ہیں

معاملہ بندی کا رنگ ان کے کلام میں خوب ہے ۔ اگرچہ اس میں وہ متانت اور تہذیب نہیں جو مومن کی خصوصیت ہے :

تھے کہاں رات کو آئینہ تو لے کر دیکھو
اور ہوتی ہے خطا وار کی صورت کیسی

☆ ☆ ☆

یہ ملا ذکرِ قیامت پر قیامت کا جواب
کیا اٹھے گی وہ ہماری ٹھوکریں کھائی ہوئی

ٹوک کر رستے میں پیار آ ہی گیا اس شوخ پر
وہ نظر حیرت زدہ وہ بات گھبرائی ہوئی

☆ ☆ ☆

قابلِ رحم ہے اس شخص کی رسوائی بھی
پردے ہی پردے میں کمبخت جو رسوا ہو جائے

☆ ☆ ☆

تم نے بدلے ہم سے گن گن کے لیے
ہم نے کیا چاہا تھا اس دن کے لیے

چاہنے والوں سے گر مطلب نہیں
آپ پھر پیدا ہوئے کس کے لیے

کچھ نرالا ہے جوانی کا بناؤ
شوخیاں گہنا ہیں اس سن کے لیے

'گلزارِ داغ' اور 'آفتابِ داغ' میں ان کی زبان کی صفائی اور سہلِ ممتنع کا حسن انتہائی عروج پر ہے ۔ بعض غزلیں سراسر ایسی ملتی ہیں کہ صفائی و سلاست میں جواب نہیں رکھتیں ۔

اس کے باوجود زبان میں متانت اور دلنشینی کا جوہر بھی جلوہ گر ہے - اس منزل میں آ کر ان کے اشعار ضرب المثل کی طرح زبانوں پر چڑھ گئے ہیں - بعض غزلیں ایسی بھی ہیں جن میں سچی محبت کا عکس نظر آتا ہے اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ داغ کی بے چین طبیعت میں ایک طرح کا ٹھہراؤ پیدا ہو گیا ہے اور خواہشات کا سیلاب بلند ترین سطح پر آنے کے بعد ایک جگہ قائم ہو گیا ہے - ذیل کے اشعار سے ان خصوصیات کا کچھ پتہ لگایا جا سکتا ہے :

تدبیر سے قسمت کی برائی نہیں جاتی
بگڑی ہوئی تقدیر بنائی نہیں جاتی

آنسو نہ پیے جائیں گے اے ناصحِ ناداں
ہیرے کی کنی جان کے کھائی نہیں جاتی

لے دے کے یہاں دل میں ہے بس ایک تمنا
سو تابہ زباں خوف سے لائی نہیں جاتی

پھر داغ ملا جا کے اسی دشمنِ جاں سے
ناداں ترے دل کی صفائی نہیں جاتی

☆ ☆ ☆

شوخی سے ٹھہرتی نہیں قاتل کی نظر آج
یہ برقِ بلا دیکھیے گرتی ہے کدھر آج

کل تابِ فغاں تھی تو یہ تاثیر کہاں تھی
کیا کیا لبِ خاموش پہ قرباں ہے اثر آج

وعدے پہ مرے ان کے قیامت کی ہے تکرار
اور بات ہے اتنی کہ ادھر کل ہے ادھر آج

اندیشۂ فردا نہ رہے حضرتِ واعظ
میخانے میں پی لیجیے تھوڑی سی اگر آج

قصیدوں میں انہوں نے اس فن کے تقاضے یعنی شکوہِ الفاظ ، بلندیٔ مضامین اور چستیٔ تراکیب کا خیال رکھا ہے - رباعیاں بھی دیوانوں میں بہت ہیں - مثنوی 'فریادِ داغ' جو ۸۳۸ اشعار پر مشتمل ہے انہوں نے سفرِ کلکتہ ۱۸۸۲ء کے بعد دو دن میں کہی تھی - قادر الکلامی اور صفائی زبان کے اعتبار سے صرف امیر مینائی ان کے حریف ہیں - دوسرا کوئی معاصر ان کی برابری نہیں کر سکتا -

امیر مینائی

امیر احمد مینائی ولد کرم محمد مینائی لکھنوی کی تاریخِ ولادت ۲۱ فروری ۱۸۲۹ء مطابق ۱٦ شعبان ۱۲۴۴ھ ہے[1] ۔ سلسلۂ نسب شاہ مینا تک پہنچتا ہے اور اسی نسبت کا اثر ہے کہ امیر کی طبیعت اور کلام میں فقر و استغنا ، صبر و توکل اور انکسار و زہد کا رنگ آ گیا ۔ بڑے ہو کر انہوں نے سلسلۂ چشتیہ صابریہ میں امیر شاہ سے بیعت کی تھی اور تصوف کا ذوق ان کے مزاج میں رچ گیا تھا ۔

امیر نے عربی اور فارسی کی تعلیم فرنگی محل میں حاصل کی جہاں مفتی سعداللہ جیسے عالم ان کے استاد تھے ۔ فنِ شعر میں مظفر علی خان اسیر کا تلمذ اختیار کیا ۔ موزونیٔ طبیعت اور علمی استعداد کی بدولت بہت جلد شعر گوئی میں کمال حاصل کر لیا اور اپنے استاد کے لیے باعثِ فخر ہو گئے ۔ ۱۸۵۳ء میں واجد علی شاہ سلطانِ اودھ کی ملازمت اختیار کی اور دو کتابیں 'ارشاد السلطان' اور 'ہدایت السلطان' تصنیف کر کے پیش کیں ۔ اب یہ کتابیں ناپید ہیں ۔ تین سال بعد اودھ کی سلطنت ضبط ہو جانے سے امیر بے روزگار ہو گئے ۔ اس حادثے سے نہ سنبھلے تھے کہ اگلے سال غدر کا ہنگامہ برپا ہو گیا ۔ انہوں نے اپنے دوست محسن کاکوروی کے پاس کاکوری میں پناہ لی ۔ جب یہ سیلاب فرو ہوا تو مظفر علی خان اسیر کی تحریک سے نواب یوسف علی خان ناظم نے ۱۸۵۸ء میں انہیں رام پور طلب کیا جہاں یہ عدالتِ دیوانی کے مفتی مقرر ہوئے ۔ ناظم کے انتقال پر ۱۸٦۵ء میں کلب علی خان مسند نشین ہوئے تو منشی امیر احمد کا اعزاز و اکرام اور بڑھ گیا ۔ ۲۱٦ روپے ماہوار تنخواہ کے علاوہ چار پانچ ہزار روپے سالانہ انعام کے بطور مل جاتے تھے اور خصوصیت کا یہ حال تھا کہ نواب مغفور انہیں دوست اور بھائی کی حیثیت سے دیکھتے تھے ۔ صاحب منزل میں اسیر ، منیر ، قلق ، بحر ، داغ ، حیا ، جلال ، تسلیم ، رسا ، عروج جیسے شاعروں کا جمگھٹا رہتا تھا ۔ امیر مینائی کی استعدادِ شعری جو پہلے ہی پختہ اور کامل تھی ، رامپور کی شاعرانہ صحبتوں میں اور چمک اٹھی ۔ لکھنؤ اور دہلی کے گلزار اجڑ گئے تھے لیکن ان باغوں کے پودے رامپور کی سر زمین پر اپنی بہار دکھا رہے تھے ۔ کلب علی خان نے مزید اعزاز یہ بخشا کہ منشی صاحب کو اپنا استاد مقرر کیا ۔

رام پور میں امیر مینائی کی شاعری کو دوستانہ مقابلوں کی وجہ سے بہت فروغ ہوا ۔ دوسرے دیوان 'صنم خانۂ عشق' میں جو رام پور کی کمائی ہے ، ان کی زبان کا حسن ، مضمون کی پاکیزگی اور اندازِ بیان کی پاکیزگی بہت نمایاں ہے ۔ بعض نقادوں کی رائے ہے

---

(۱) عبدالحئی - گل رعنا - ص ۳۰۲ - سری رام خمخانۂ جاوید ، ج ۱ - ص ۳۲۲ ۔

کہ نواب مرزا داغ دہلوی نے زبان میں صفائی و سلاست کا سکہ ایسا چلایا تھا کہ امیر نے بھی اپنی روش ترک کرکے داغ کا رنگ اختیار کر لیا ۔ لیکن لالہ سری رام اور عبدالسلام ندوی کا یہ خیال یکسر غلط ہے[۱] ۔ در اصل ہر شاعر کے کلام کا یہی انداز ہے کہ عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ زبان میں صفائی اور گھلاوٹ بھی بڑھتی جاتی ہے ۔ یہی خفیف سا فرق پہلے دیوان 'مرآۃ الغیب' اور 'صنم خانۂ عشق' میں ہے جسے امیر نے اس مقطع میں بیان کیا ہے :

پہلا کلام بھی جو ہے اس میں شریک امیر
دیوان میں اب کا رنگ کہیں ہے کہیں نہیں

یورپین نقادوں نے 'اب کا رنگ' سے داغ کا رنگ مراد لیا ہے ۔ ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی اس مغالطے کو رفع کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"اب کے رنگ کو طرزِ داغ کی پیروی سمجھنا خوش خیالی ہے ۔ اس سے امیر کی مراد ما قبل کے دورِ شاعری سے انحراف بھی نہیں بلکہ شاعری کی ارتقاء کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے"[۲] ۔

امیر کی علمی استعداد کامل تھی ۔ شاعری سے خدا داد مناسبت کے سبب نیز تازگیٔ مضمون ، پاکیزگیٔ زبان اور متانتِ انداز کی وجہ سے ان کے کلام میں ایک خاص پھبن ہے جس کی بدولت ان کی غزلوں میں دلنشینی کا جوہر ہے ۔ اس پر مزید لطف یہ ہے کہ ان کا کلام رطب و یابس سے خالی اور نا ہمواری سے محفوظ ہے ۔ تخّیل کی رنگینی اور خلاقی سے حسن و عشق کے معاملات اور شاعرانہ مضامین کو کمال لطافت سے ادا کرتے ہیں ۔

امیر کی زبان لکھنؤ ، کی فصیح ، سلیس اور آراستہ زبان ہے جس کی سادگی میں بھی بناؤ ہیں ۔ وہ الفاظ کے مختلف معانی سے فائدہ اٹھا کر مضمون نکالتے ہیں جو دبستانِ لکھنؤ کا معمول ہے ۔ اکثر معاملات اور کیفیتوں کو تشبیہہ و استعارہ کے انداز میں ادا کرتے ہیں جنھیں ان کے تخّیل کی خلاقی بڑے رنگین پیکروں میں دکھاتی ہے ۔ دبستانِ لکھنؤ کی تقلید میں نسوانی آرائش اور زیورات کا بیان بھی ان کے اشعار میں ملتا ہے ۔ ایک دو غزلوں سے ان امور کا اندازہ ہو سکتا ہے :

---

(۱) سری رام ، خمخانۂ جاوید ، ج ۱ - ص ۳۲۲ -
عبدالسلام ، شعر الہند ، ج ۱ - ص ۳۱۲ -
(۲) آفتاب احمد صدیقی ، صہبائے امیر - ص ۱۳۷ -

نہیں ممکن ہے سونا ہجر میں نیند آ نہیں سکتی
طلایہ پھر رہا ہے آنکھ میں طوقِ طلائی کا

☆ ☆ ☆

تیرے جگنو کا اگر آنکھوں میں بندھتا ہے خیال
کرمکِ شب تاب بن کر صاف اڑ جاتی ہے نیند

☆ ☆ ☆

عجب عالم ہے اس کا وضع سادی شکل بھولی ہے
کھبی جاتی ہے دل میں کیا رسیلی نرم بولی ہے

گھٹا کی سیر حجرے سے نکل کر دیکھ اے زاہد
نہانے کو یہ چوٹی حور نے جنت میں کھولی ہے

☆ ☆ ☆

انگور میں تھی یہ مے پانی کی چار بوندیں
ہر جب سے کھنچ گئی ہے تلوار ہو گئی ہے

☆ ☆ ☆

ٹھہر گیا ہے ہمارے دل میں ہزار منت سے دردِ الفت
مگر یہ ڈر ہے نکل نہ جائے مکاں کی تنگی سے تنگ ہو کر

☆ ☆ ☆

کرے گا یاد اے غم ہم کو بعدِ مرگ تو برسوں
کھلایا ہے جگر برسوں پلایا ہے لہو برسوں

فنا کے بعد ایسے بیکسوں کو کون پوچھے گا
مگر اے بیکسی رویا کرے گی ہم کو تو برسوں

مری حالت پہ ہجرِ یار میں مر مر گئی حسرت
دلِ بیتاب سے روئی لپٹ کر آرزو برسوں

وہ بلبل ہوں کہ یوں صیّاد نے جی میرا بہلایا
لگایا ڈھیر پھولوں کا قفس کے رو برو برسوں

نہ کر اے یاس یوں برباد میرے خانۂ دل کو
اسی گھر میں جلایا ہے چراغِ آرزو برسوں

کوئی میرے برابر کیا کرے گا ضبط الفت کو
نہیں آتا زباں تک دل سے حرفِ آرزو برسوں

امیر ایسی ادائیں حور و غلماں میں کہاں ہوں گی
رہے گا خلد میں بھی یاد ہم کو لکھنو برسوں

☆ ☆ ☆

روشن چراغ برق سے رہتا ہے رات بھر
چمکے ہوئے نصیب مرے آشیاں کے ہیں

وہ اور وعدہ وصل کا قاصد نہیں نہیں
سچ سچ بتا یہ لفظ انھی کی زباں کے ہیں

☆ ☆ ☆

اے برق نو ذرا کبھی تڑپی ، ٹھہر گئی
یاں عمر کٹ گئی ہے اسی اضطراب میں

دامن پہ ان کے خون کی چھینٹیں پڑیں امیر
بسمل سے پاس ہو نہ سکا اضطراب میں

☆ ☆ ☆

مرغانِ باغ تم کو مبارک ہو سیرِ گل
کانٹا تھا ایک میں سو چمن سے نکل گیا

طاؤس نے دکھائے جو اپنے بدن کے داغ
روتا ہوا سحاب چمن سے نکل گیا

دبستانِ لکھنؤ سے تعلق کی بنا پر منشی صاحب کے کلام میں رنگینی اور مرصّع کاری ہے ۔ وہ مضمون آفرینی اور پیکر تراشی سے بہت شوخ تصویریں بناتے ہیں ۔ انتخابِ الفاظ میں بھی وہ نازک اور لطیف اسماء مثلاً صبہا ، شبنم ، دخترِ زر ، عروس ، نگار ، انشاں ، گیسو وغیرہ کے استعمال سے حسن کاری ، رنگینی اور شوخی کا حق ادا کرتے ہیں :

کلیاں یہ سرخ سرخ نہیں لالہ زار میں
مہندی لگی ہے دستِ عروسِ بہار میں

☆ ☆ ☆

تم بھی بناؤ کرکے چلو سیرِ باغ کو
نکھرا ہوا ہے رنگ عروسِ بہار کا

☆ ☆ ☆

موباف کھل گیا ہے کسی گلعذار کا
دامن لٹک رہا ہے عروسِ بہار کا

☆ ☆ ☆

چھڑکی افشاں زلف میں شب کو چراغاں ہو گیا
ہو گئے روشن میانِ کوچۂ گیسو چراغ

مندرجہ بالا اشعار سے امیر کی زبان کی گھلاوٹ واضح ہوتی ہے ، لیکن جہاں ان کی تیغِ زبان اور زیادہ منجھ ہو گئی ہے وہاں ان کا کلام صفائی اور چستیٔ بندش میں نواب مرزا داغ کے پہلو بہ پہلو چلتا ہے ۔ اس میں اتنی خوبی اور ہے کہ داغ کے یہاں جو کہیں کہیں ابتذال کے دھبے لگ جاتے ہیں ، امیر کے یہاں نہیں لگتے ۔ اس کے بجائے ان کی صفائی و سلاست میں ایک طرح کی لطافت و متانت پائی جاتی ہے :

رتبہ شہیدِ عشق کا گر جان جائیے
قربان ہونے والے کے قربان جائیے

پہچان پر ہے ناز تو پہچان جائیے
کیا ہے ہمارے دل میں بھلا جان جائیے

آخر ہوئے نہ حضرتِ دل آپ واں ذلیل
ہاں اور دوڑ دوڑ کے مہمان جائیے

مانی ہیں میں نے سینکڑوں باتیں تمام عمر
آج آپ ایک بات مری مان جائیے

کہتے ہیں آ کے در پہ مرے پائیے گا کیا
یاں خاک چھانی ہے گر چھان جائیے
کیا ہند میں کمی ہے و معشوق کی امیر
شیراز جائیے نہ خراسان جائیے

کلب علی خان کے انتقال ۱۸۸۷ء کے بعد ان کا دل رام پور میں نہ لگا ۔ بالآخر داغ کی دعوت پر ۵ ستمبر ۱۹۰۰ء کو حیدر آباد دکن پہنچے ۔ یہاں یکایک مختلف امراض میں مبتلا ہو کر ۱۵ اکتوبر ۱۹۰۰ء کو فوت ہو گئے ۔ داغ نے دعائیہ قطعہ میں یہ تاریخ کہی :

قصرِ عالی پائے جنت میں امیر

جلیل کی تاریخ بھی خوب ہے

امیرِ کشور معنی امیر مینائی

امیر کی تصانیف میں غزلوں کے دو دیوان 'مرآۃ الغیب' اور 'صنم خانۂ عشق' مشہور ہیں ۔ 'گوہرِ انتخاب' اور 'جوہرِ انتخاب' دو خلاصے بھی ہیں جن میں سب سے پہلے دیوان کے جستہ جستہ اشعار ہیں جو غدر میں ضائع ہو گیا تھا ۔ 'مضامینِ دل آشوب' اور 'مجموعۂ واسوخت' دو مزید مجموعے ہیں ۔ مثنویاں سب مذہبی رنگ رکھتی ہیں یعنی 'ابرِ کرم'، 'نورِ تجلی'، 'لیلۃ القدر'، 'صبح ازل'، 'شامِ ابد' ۔ ایک مثنوی میر حسن کی 'سحر البیان' کے جواب میں بھی کہی تھی ۔ 'دیوانِ فارسی' ان کے علاوہ ہے ۔ مذہبی میلان کی برکات سے 'محامد خاتم النبیین' نام کا پورا دیوان نعتیہ ہے جس میں سرکارِ دو عالم ؐ کی ولادت، تبلیغِ اسلام اور ہجرت وغیرہ کے حالات نثر میں ہیں ۔ باقی حصے میں نعتیہ غزلیں، 'مخمس'، 'مسدس' 'ترکیب بند'، 'ترجیع بند' وغیرہ ہیں جن سے امیر کا جوشِ عقیدت نمایاں ہے یہ ایک نعت ملاحظہ ہو :

نعت[1]

دلِ درد مند کی داستاں نہ کہوں جو تم سے تو کیا کروں
تمہیں غم زدوں کے ہو قدرداں نہ کہوں جو تم سے تو کیا کروں
تمہیں بیکسوں کے شفیق ہو تمہیں بے بسوں کے رفیق ہو
جو گزرتی دل پہ ہے جانِ جاں نہ کہوں جو تم سے تو کیا کروں

---

(۱) اضافہ از مدیر عمومی ۔

مرے حال پر بھی کرم کرو جو کروں میں عرض وہ سن تو لو
تمھیں باپ ماں سے ہو مہرباں نہ کہوں جو تم سے تو کیا کروں

ہوئی جس تڑپ میں مرے بسر جو گزر گئی مری جان پر
شہ انس و جان مہ دو جہاں نہ کہوں جو تم سے تو کیا کروں

تمھیں داد گر ہو یتیم کے تمھیں چارہ گر ہو سقیم کے
ہمہ تن ہوں درد میں ناتواں نہ کہوں جو تم سے تو کیا کروں

مجھے در بدر یہ پھرائے گا نہ کبھی یہ راہ پر آئے گا
مجھے بےبس ڈالے گا آسماں نہ کہوں جو تم سے تو کیا کروں

مرا ہمدم ایک تھا دل مرا اسے بھی غموں نے گھلا دیا
نہیں ملتا اس کا بھی اب نشاں نہ کہوں جو تم سے تو کیا کروں

نہ زمین سنے نہ فلک سنے نہ بشر سنے نہ ملک سنے
نہیں سنتا کوئی مری فغاں نہ کہوں جو تم سے تو کیا کروں

کوئی دل نواز یہاں نہیں مجھے تاب ضبط فغاں نہیں
مرے دل میں ہے جو غم نہاں نہ کہوں جو تم سے تو کیا کروں

جو امیر دیکھیں نبیؐ ادھر تو کہوں یہ ہاتھوں کو جوڑ کر
کہ تڑپ کو دل کی ہیں نیم جاں نہ کہوں جو تم سے تو کیا کروں

ترکیب بند

سر تا بقدم حسن خدا ساز تو دیکھو
دل پستے ہیں حوروں کے یہ انداز تو دیکھو

اللہ بھی ہے شیفتہ یہ ناز تو دیکھو
اس نرگس مستانہ کا اعجاز تو دیکھو

دل کو مرے تسخیر کیا اس عربی نے
مکی مدنی ہاشمی و مطلبی نے

ایک مسدس میں یہ جدت کی ہے کہ اردو کے دو شعر لکھ کر ہندی کے مشہور دوہروں کو تضمین کر دیا ہے۔ مثلاً :

نہیں غم گرفتا کر دے کوئی سر تا بہ پا مجھ کو
کہ ہجر یار میں ہے خود مری ہستی بلا مجھ کو
مگر آنکھیں ہیں پیاری جان اور دل سے سوا مجھ کو
انہی سے اک اظہار دیدار کا ہے آسرا مجھ کو

☆ ☆ ☆

کاگا سب تن کھائیو چن چن کھائیو ماس
دو نیناں مت کھائیو پیا ملن کی آس

نثر میں 'انتخاب یادگار' ان شعراء کا تذکرہ ہے جو دربار رام پور سے متعلق تھے ۔ اس کی زبان پر تکلف اور مقفّٰی ہے ۔

'امیر اللغات' فن لغت میں ہے ۔ دو جلدوں میں صرف 'الف ممدودہ' اور 'الف مقصورہ' تمام ہوئے ہیں ۔ باقی نا تمام رہی ۔ 'معیار الاغلاط' الفاظ کی صحت و تحقیق سے متعلق ہے ۔ یہ تمام تصانیف امیر کے علم و فضل اور ہمہ گیر طبیعت کی گواہ ہیں ۔ امیر کے شاگردوں میں ریاض ، جلیل ، مظفر ، کوثر ، صفدر ، نواب (کلب علی خان) سرشار ، حفیظ جونپوری اور اختر نگینوی ممتاز ہیں ۔

جلال لکھنوی

ضامن علی جلال ابن حکیم اصغر علی - ۱۸۳۴ء سال ولادت ہے ۔ مدرسۂ آصفیہ میں تعلیم پائی ۔ فن شعر میں اول امیر علی خان ہلال سے اصلاح لی ۔ پھر ان کے استاد رشک کو کلام دکھانے لگے ۔ رشک کربلائے معلیٰ چلے گئے تو محمد رضا برق سے اصلاح لیتے رہے ۔ ان دنوں آفتاب الدولہ قلق کے مکان پر محفل شعر و سخن برپا ہوتی تھی جس میں بحر ، سحر ، اسیر ، امیر ، بیخود وغیرہ شریک ہوتے تھے ۔ یہ بھی سات آٹھ برس تک شریک رہ کر اپنا ذوق سخن سنوارتے رہے ۔

غدر کے بعد جب لکھنؤ کے زمزمے ختم ہو گئے تو ان کے والد اصغر علی نے جو دربار رامپور میں داستان گو تھے ، نواب یوسف علی خان ناظم سے کہہ کر انہیں بھی وہیں بلوا لیا ۔ ان کے بعد کلب علی خان نے انہیں سو روپے ماہوار پر اعزاز و احترام سے رکھا ۔ یہ بار بار مستعفی ہو کر لکھنؤ آتے اور نواب انہیں بلا لیتے ۔ کلب علی خان کے انتقال (۱۸۸۷ء) کے بعد یہ مانگرول کاٹھیا وار بھی گئے جہاں کئی سال تک نواب حسین میاں کے پاس رہے ۔ آب و ہوا کی نا سازگاری سے لکھنؤ واپس آ گئے ۔ نواب نے ۲۵ روپے وظیفہ

مقرر کر دیا ۔ قصیدے پر سو روپے ملتے تھے ۔ ۲۰ اکتوبر ۱۹۰۹ء کو لکھنؤ میں فوت ہوئے[1] ۔

جلال کے کلام میں صحتِ الفاظ ، مضمون آفرینی ، شوخ بیانی کا ہلکا سا رنگ ہے ۔ انہیں اپنی زبان دانی پر ناز تھا ۔ عروض ، لغت اور فنونِ شاعری میں کامل تھے ۔ غزلوں اور قصیدوں کے چار دیوان ہیں ۔ 'سرمایۂ زبان' اردو میں محاوروں اور اصطلاحوں سے بحث کی ہے ۔ تذکیر و تانیث پر ایک رسالہ 'مفید الشعراء' ہے ۔ 'قواعد المنتخب' بھی الفاظ کی تحقیق سے متعلق ہے ۔ ذیل کے اشعار سے ان کا اندازِ کلام واضح ہوتا ہے :

مدت کے بعد منہ سے لگی ہے جو چھوٹ کر
توبہ بھی مے پہ گرتی ہے کیا ٹوٹ ٹوٹ کر

☆ ☆ ☆

وائے اس دردِ رسیدہ کی بھی تنہائی پر
بیکسی پوچھتی ہو جس سے کہ حال اچھا ہے

☆ ☆ ☆

حشر میں چھپ نہ سکا حسرتِ دیدار کا راز
آنکھ کمبخت سے پہچان گئے تم مجھ کو

☆ ☆ ☆

شغل گر ڈھونڈتے ہو دل کے بہلنے کے لیے
دل میں آ بیٹھو کلیجا مرا ملنے کے لیے

☆ ☆ ☆

ڈھونڈ دیتے ہمیں اس بت کو کہیں سے اے شیخ
تم خدا ترس تھے اک کام ہمارا کرتے

☆ ☆ ☆

اکیلے کا کہیں دو سرکشوں سے زور چلتا ہے
دوپٹہ لاکھ سینے پر سنبھالو کب سنبھلتا ہے

☆ ☆ ☆

---

(۱) علی احمد ، کاملان رام پور ۔ ص ۱۷٦ ۔

اک قدم جانا جنہیں دشوار تھا
شوق لے کر سیکڑوں منزل گیا

☆ ☆ ☆

دلِ بیتاب کو ہم کھو کے بہت پچھتائے
کام اس سے بھی نکل آتے تھے بیکار نہ تھا

الفاظ کی معنوی دلالتوں سے مضمون پیدا کرنے کی صلاحیت دبستانِ لکھنؤ میں عام ہے۔
ذیل کے اشعار اسی رجحان کو واضح کرتے ہیں:

بیٹھے کسی کا تیر ہی آکر خدا کرے
تنہا دلِ حزیں ہے کوئی ہم نشیں نہیں

☆ ☆ ☆

سی لیں گے گریباں کو ہم، یہ سو بنا دو
کس طرح رفو اس میں ہو دل تم سے جو پھٹ جائے

☆ ☆ ☆

بہت بہار کی آمد سے خوش ہیں مرغِ چمن
شگوفے دیکھیں انہیں کیا نہال کرتے ہیں

☆ ☆ ☆

آنسو رکے تو کیا، نہیں چھپنے کا رازِ عشق
حسرت ٹپک پڑے گی ہماری نگاہ سے

☆ ☆ ☆

خوبرویوں کے بگڑنے میں بھی ہیں لاکھ بناؤ
نہیں اچھوں کی کوئی بات بری ہوتی ہے

لیکن جہاں وہ تمام آرائش و ابہام سے الگ ہو کر سیدھی سادھی زبان میں بات کہتے ہیں
تو ان کے کلام میں داغ اور امیر کی سی صفائی پیدا ہو جاتی ہے:

وہ دل نصیب ہوا جس کو داغ بھی نہ ملا
ملا وہ غمکدہ جس کو چراغ بھی نہ ملا

گئی تھی کہہ کے کہ لاتی ہوں زلفِ یار کی بو
پھری تو بادِ صبا کا دماغ بھی نہ ملا

بتوں کے عشق میں کیا ہوتی ہم سے یادِ خدا
کہ دل بھی تھا نہ ٹھکانے، فراغ بھی نہ ملا

بھر آئے محفلِ ساقی میں کیوں نہ آنکھ اپنی
وہ بے نصیب ہیں خالی ایاغ بھی نہ ملا

اسیر کرکے ہمیں کیوں رہا کیا صیاد
وہ ہمصفیر بھی چھوٹے وہ باغ بھی نہ ملا

جلال باغِ جہاں میں وہ عندلیب ہیں ہم
چمن کو پھول ملے ہم کو داغ بھی نہ ملا

(ب) دیگر شعراء

۱۸۵۷ء کے ہنگامے سے مسلمانوں کو بحیثیت مجموعی نقصان پہنچا ۔ صوبہ پنجاب نے اس پر آشوب زمانے میں حکومت برطانیہ کی ہوا خواہی کی تھی اس لیے انگریزی سیاست نے اس صوبے کو کچھ رعایتیں دیں ۔ دہلی کے خانماں برباد ادیب مثلاً حالی ، آزاد ، اشرف اور ارشد گورگانی وغیرہ بھی لاہور میں پناہ گزین ہوئے ۔ انگریزی تہذیب اور تعلیم نے دہلی یا صوبہ جات متحدہ کے بہ مقابلہ پنجاب میں اچھی طرح قدم جمائے تھے اس لیے لاہور جدید ادبی تحریکوں کا مرکز بنا ۔ ۱۵ اگست ۱۸۶۷ء کو انجمن پنجاب کی بنیاد رکھی گئی جس میں محمد حسین آزاد نے پہلی بار 'نظم اور کلام موزوں' کے باب میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ۔ ۸ مئی ۱۸۷۴ء کو کرنل ہالرائڈ کے ایماء سے باقاعدہ مناظمہ ہوا جس میں آزاد نے 'شام کی آمد' اور 'رات کی کیفیت' پر اپنی نظم پڑھی ۔ اس کے بعد مختلف شعراء نے جن میں حالی اور آزاد پیش پیش تھے ، وقتاً فوقتاً مختلف موضوعات پر مربوط مسلسل خیالات قلمبند کیے ۔ جنہیں 'نظم' قرار دیا گیا ۔ حالی کی نظمیں 'حب وطن' ، 'برکھا رت' ، نشاط امید' اور 'مناظرہ رحم و انصاف' انہی جلسوں کی یادگار ہیں ۔ آزاد نے بھی 'وطن کی محبت' ، 'برسات' ، 'موسم زمستان' اور دیگر موضوعات پر نظمیں لکھیں ۔

ان ادبی محفلوں یعنی مناظموں کے علاوہ انگریزی تعلیم کے رواج سے بھی اردو کے ساتھ ہی ادیبوں اور شاعروں کے طرز فکر پر اثر پڑا ۔ ۱۸۷۵ء میں علی گڑھ کالج کھلا ۔ اور یونیورسٹیاں قائم ہوئیں ۔ انگریزی ادب نے جس میں 'نظم' ، 'نثر' ، 'ڈراما' سب کچھ شامل تھے ، اردو زبان کو نئے خیالات سے آشنا اور نئے راستوں پر گامزن کیا[۱] ۔ شاعری کا دائرہ وسیع ہوا ۔ نئے مضامین ، خیالات اور موضوع سامنے آئے جس کے اظہار کے لیے نئی طرزیں اور صورتیں اختیار کی گئیں ۔ ایجاد و اختراع کے شوق میں کچھ ایسے لوگ بھی میدان میں آ گئے جنہوں نے انگریزی لفظوں کی بعض بحریں اردو میں داخل کرنے کی یاوہ گوئی کوشش کی ۔ نفس شعر میں یہ تغیّر پیدا ہوا کہ یاوہ گوئی اور مبالغہ آمیز باتیں ترک کر دی گئیں ۔ سادگی ، صفائی اور واقعیت کو شعر کی جان سمجھا گیا ۔ اسی لیے اس زمانے کی نظمیں بہت مؤثر اور جذبات سے بھری ہوئی ہیں[۲] ۔

---

(۱) ڈاکٹر عبادت بریلوی کی رائے میں یہ مناظمہ اردو نظم کے عالم میں ایک انقلاب اور زبان کی تاریخ میں ایک عمدہ یادگار سمجھا جائے گا ۔

(۲) رام بابو سکسینہ ، تاریخ ادب ۔ ص ۳۵۹ ۔

اس دور کے بعض ایسے شعراء بھی جو لاہور کے ادبی مرکز سے دور تھے ، انگریزی ادب اور تعلیم سے متاثر ہوئے - نادر کاکوروی ، سرور جہاں آبادی ، شرر لکھنوی ، نظم طباطبائی ، بے نظیر شاہ ، اوج ، شوق قدوائی ، علمدار حسین واسطی ، سید احمد کبیر ، علی سجاد ، عظمت اللہ خاں حیدر آبادی ، چکبست ، ںلوک چند محروم ، ظفر علی خاں ، غلام مصطفیٰ حزیں ، پروفیسر شہباز وغیرہ نے بہت سی طبع زاد نظمیں لکھیں اور بعض نے انگریزی نظموں کے ترجمے کیے - بعض ترجمے دلکش اور تاثیر کے اعتبار سے اصل نظموں کے ہم پلہ سمجھے گئے اور بعض اصل سے بھی زیادہ دلکش و مؤثر ثابت ہوئے - ان ترجمہ کرنے والوں نے انگریزی مضامین کو بہت خلوص اور دیانت سے اردو میں منتقل کیا -

لیکن انگریزی تعلیم کے اثرات سے قطع نظر انیسویں صدی کے آغاز میں آگرہ اور لکھنؤ میں بھی نئے ادبی رجحانات ظاہر ہو رہے تھے - غزل کی فرسودہ ، رسمی اور بے جان فضا بعض جدید صحت مند اور جاندار میلانات کا اظہار کر رہی تھی جس کا تجزیہ عبدالقادر سروری نے یوں کیا ہے :

> ''لیکن زندہ زبان اور زندہ ادب مخالف ماحول اور ہمت شکن فضا میں بھی کہیں کہیں اپنی حیات کا ثبوت دینے پر مجبور ہے - رسمی مضامین اور معیّن اسالیب کے درمیان سے میاں نظیر اکبر آبادی کا اٹھنا اور ایسے وقت میں جب اردو شاعری کی قلمرو قطعاً محدود نظر آ رہی تھی اور انیس و دبیر کا رزمیہ شاعری کا علم بلند کرکے اٹھ کھڑا ہونا ، ہماری زبان اور ہماری شاعری کی زندگی کے منتشر ثبوت ہیں''[1] -

نظیر ، انیس اور دبیر نے اردو کو بہت قیمتی سرمایہ دیا - نظیر کی نظمیں ہندوستان کے مختلف موسموں ، تیوہاروں ، میلوں ٹھیلوں کے علاوہ نفسیاتی موضوعات پر بھی حاوی ہیں - انیس اور دبیر نے زبان کو رزمیہ شاعری کے بیش قیمت شاہکار عطا کیے - با ایں ہمہ یہ حقیقت ہے کہ جدید شاعری بالعموم انگریزی تعلیم اور ادب کی مرہونِ منت ہے جس نے مضامین و موضوعات کے علاوہ اسلوب اور ہیئت پر بھی اثر ڈالا - عبدالحلیم شرر جنھوں نے فرانسیسی زبان سیکھی تھی ، اپنے معاصروں سے آگے قدم رکھا اور پہلی بار نظم 'معرّیٰ' لکھی[2] - اسمٰعیل میرٹھی نے بھی غیر مقفیٰ نظم لکھی - اس طرح اردو ادب کا یہ ارتقائی سفر جاری رہا - دہلی ، رام پور ، پٹنہ اور حیدر آباد دکن کو اس جدید رجحان سے

---

(۱) عبدالقادر سرور ، جدید اردو شاعری - ص ۴۷ -

(۲) دلگداز مئی ۱۹۰۰ء - شرر کا غیر مقفیٰ ڈراما -

چنداں سروکار نہ ہوا ۔ وہاں قدامت قدم جمائے رہی اور وہاں کے با کمال غزل گوئی اور دیگر قدیم اصناف سخن میں محو رہے ۔ تاہم ملک کے طول و عرض میں بے شمار ایسے شعراء نمودار ہوئے جنھوں نے اپنی نظموں میں حبِّ وطن ، ملکی اور قومی امور ، قدرتی مناظر ، اقتصادی مسائل ، اصلاحی رجحانات اور اتحادِ قومی کے موضوعات کو جگہ دی ۔ ان میں جوش ملیح آبادی پیش پیش ہیں ، جنھوں نے مناظرِ فطرت ، سیاسی حالات ، وطن پرستی اور بغاوت و مقاومت پر نظمیں لکھ کر اردو ادب میں بے حد قیمتی سرمایہ فراہم کر دیا ۔ 'شعلہ و شبنم' ، 'نقش و نگار' ، 'حرف و حکایت' اور 'سرود و خروش' ان کے بہت بیش قیمت مجموعے ہیں ۔

بیسویں صدی کے آغاز میں یہ رجحانات اور قوی ہو گئے ۔ انگریزی تعلیم کی عام اشاعت کی وجہ سے انگریزی خیالات ہمارے ادب میں اور زیادہ جگہ پانے لگے ، نہ صرف مضمون اور موضوع بلکہ ہیئت کے اعتبار سے بھی کچھ تبدیلیاں واقع ہوئیں ۔ مولوی اسمٰعیل میرٹھی نے تاروں پر غیر مقفیٰ نظم لکھی ۔

مئی ۱۹۰۰ء کے 'دلگداز' میں عبدالحلیم شرر کا غیر مقفیٰ ڈراما شائع ہوا ۔ کچھ عرصے بعد عظمت اللہ خان حیدر آبادی نے نئی بحروں کے تجربے کیے ۔ سیاب ، اقبال ، اسمعیل میرٹھی ، مہا راج نرائن ، برق ، سورج نرائن مہر ، چکبست ، حامد اللہ افسر ، مظفر علی خان ، اندر جیت شرما وغیرہ نے سیاسی ، مذہبی ، حبِ وطن ، اتحادِ قومی جیسے موضوعات پر قلم اٹھایا ۔

بعض مسلمان ادیبوں مثلاً مقبول حسین احمد پوری نے بھاشا آمیز اردو لکھی جو ہندو مسلم اتحاد کے سلسلے میں ایک مفید قدم سمجھا گیا ۔ نفیس خلیلی نے اسی سلسلے میں رام چندر جی اور کرشن مہا راج کے متعلق بہت سی نظمیں کہیں اسی طرح رامائن اور مہا بھارت کے کئی واقعات کو گونج دار نظموں میں پیش کیا ۔ ظفر علی خان نے "ایک رشی کے داغِ جگر کی کہانی" میں راجا دشرتھ کے شکار کا واقعہ نظم کیا ۔ محسن کاکوروی کے نعتیہ قصیدے کی تشبیب میں کاشی ، متھرا ، گنگا جل کے الفاظ اور سری کرشن جی کے واقعات کی تلمیحیں مسلسل آئی ہیں ۔ خواجہ دل محمد نے 'گیتا' کا منظوم ترجمہ کیا ۔ علامہ اقبال کی بعض نظمیں مثلاً 'رام' ، 'آفتاب' ، 'صدائے درد' ، 'تصویرِ درد' وغیرہ کے پس منظر میں بھی ہندو مسلم اتحاد کی کوشش صاف جھلکتی ہے ۔ بیسویں صدی کے آغاز میں ہمارے شاعروں کو سیاسی معاملات بالخصوص وطن کی آزادی اور فلاح و بہبود سے دلچسپی بڑھ چلی تھی ۔ چکبست نے 'رامائن' کا تھوڑا سا حصہ نظم کرکے انیس کے رنگ میں بہت عمدہ مسدّس پیش کیا ۔ اس میں مذہبی میلان کارفرما تھا ، لیکن ان کی اور بہت

سی نظمیں 'حب وطن'، 'مشاہیر قوم' کی تعریف اور 'ہوم رول' کی ولولہ انگیز تبلیغ کی حامل ہیں۔ عبدالقادر سروری کے بقول :

"جدید شاعری کی سب سے نمایاں خصوصیت ہر صنف شعر سے تغزل یا عاشقانہ رنگ کا مفقود ہونا ہے۔ قومیت اور وطنیت کا احساس اور آزادی کی روح جدید شاعری کا بڑا وصف ہے۔ جدید دور میں تاریخی نظمیں لکھی گئیں اور یہ ہیئت بھی عام ہو گئی"(۱)۔

ان جدید رجحانات کو ایک اور وجہ سے بھی تقویت پہنچی۔ غزل کی گرم بازاری ختم ہو جانے سے گلدستوں کے چھپنے کا رواج کم ہو گیا۔ ان کی جگہ علمی و ادبی رسالے جاری ہوئے۔ بعض اخبار مثلاً 'اودھ پنچ' اور 'اودھ اخبار' در حقیقت ادبی رسائل کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان کے ایڈیٹر دور حاضر کے تقاضوں سے با خبر تھے۔ بعض رسالوں کے مدیر انگریزی تعلیم یافتہ اشخاص تھے، جن میں سے بعض نے یورپ کا سفر بھی کیا تھا اور وہاں کی ادبی تحریکوں سے متاثر بھی ہوئے تھے۔ ان کے رسالوں میں یہ جدید رنگ آنا لازمی تھا۔ شیخ عبدالقادر جو قیام یورپ کے زمانے میں علامہ اقبال کے رفیق تھے، جدید شاعری سے اردو ادب کی توسیع کے خواہاں تھے۔ اقبال نے اسی 'مدیر مخزن' کو یہ نکتہ سمجھایا تھا کہ :

جو کام کچھ کر رہی ہیں قومیں انہیں مذاق سخن نہیں ہے

تاہم اقبال کو یہ احساس تھا کہ شاعری سے بہت مفید کام بھی لیے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے لندن سے اپنے دیرینہ رفیق کے نام جو منظوم پیغام بھیجا، اس کے یہ چند اشعار اسی حقیقت کے آئینہ دار ہیں کہ وہ انہیں نظم و نثر کے ذریعے قوم کی اصلاح و تعمیر اور اتحاد اہل وطن کی ترغیب دینا چاہتے ہیں :

اٹھ کہ ظلمت ہوئی پیدا افق خاور پر
بزم میں شعلہ نوائی سے اجالا کر دیں

ایک فریاد ہے مانند سپند اپنی بساط
اسی فریاد سے محفل تہ و بالا کر دیں

---

(۱) جدید اردو شاعری - ص ۷۷، ۷۸، ۸۰ - طبع لاہور ۱۹۲۵ء۔

جلوۂ یوسفِ گم گشتہ دکھا کر ان کو
تپش آمادہ تر از خونِ زلیخا کر دیں

بادہ دیرینہ ہو اور گرم ہو ایسا کہ گداز
جگرِ شیشہ و پیمانہ و مینا کر دیں

ان رسائل میں شیخ عبدالقادر کے رسالہ 'مخزن' کو بہت اہمیت حاصل ہوئی جو لاہور سے اپریل ۱۹۰۱ء میں جاری ہوا ۔ دیا نراین نگم کا رسالہ 'زمانہ' ۱۹۰۳ء اور الہ آباد سے پیارے لال شاکر میرٹھی کا رسالہ 'ادیب' ۱۹۱۰ء میں یہ سب بہت وقیع جریدے تھے جو جدید ادبی تحریکوں اور رجحانات کے علم بردار تھے ۔ عبدالحلیم شرر کا رسالہ 'دلگداز' اور ظفرالملک علوی کا 'الناظر' اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں ۔ کچھ عرصے بعد لاہور سے متعدد رسائل جاری ہوئے جن میں 'ہزار داستان'، 'شباب اردو'، 'ہمایوں'، 'ادبی دنیا'، 'نیرنگِ خیال'، 'عالمگیر'، 'کارواں' اور زیادہ معروف ہیں ۔ ان سب رسالوں میں خالص ادبی مضامین کے دوش بدوش سیاست، حبِ وطن، مناظرِ قدرت، قومی اور تاریخی واقعات کی نظمیں شائع ہوتی تھیں اور انگریزی نظموں کے ترجمے بھی چھپتے تھے ۔ بیسویں صدی کے آغاز کے اکثر ادیب اور شاعر مثلاً ظفر علی خان، احمد علی شوق، اکبر الہ آبادی، نادر کاکوروی، نوبت رائے نظر، برج نراین چکبست، درگا سہائے سرور، تلوک چند محروم، خوشی محمد ناظر، غلام بھیک نیرنگ وغیرہ، اول اول انہی اخباروں اور رسالوں کے ذریعے عوام سے روشناس ہوئے ۔ محمد اسمٰعیل میرٹھی کا میدان مختلف تھا ۔ ان کی بیشتر صلاحیتیں اسکولوں کے لیے ریڈریں لکھنے میں صرف ہوئیں اور یہ کام انہوں نے نہایت ہی عمدگی سے انجام دیا ۔ ان کی نظمیں جن میں سے بعض افادیت، اصلاح اور تعمیر کے علاوہ ادبی نقطۂ نظر سے بھی بہت اہم ہیں، انہی ریڈروں میں شائع ہوتی رہیں ۔

اس دور میں غزل گوئی پر زوال آ گیا ۔ عصرِ حاضر کے تقاضے اتنے شدید تھے کہ بقولِ حالی اکثر ذی فہم اور حساس شاعروں نے یہ 'دھرپت' الاپنے سے ہاتھ اٹھا لیا ۔ اگرچہ رسمی انداز میں کم و بیش تمام شعراء نے غزلیں کہیں لیکن ان میں وہ سوز و گداز، دلباختگی اور سپردگی نہیں پیدا ہوئی جو میر، درد، مصحفی اور قائم وغیرہ سے مخصوص ہے ۔ غالب کا سا سلیقۂ فن اور مومن کی سی معاملہ بندی بھی ممکن نہ ہو سکی ۔ یہ دور کچھ ایسا تھا کہ ہر شخص زندگی کے مسائل و مصائب کا سرگرمی سے مقابلہ کرنا سیکھ گیا تھا اور اپنی ذات اور حقوق کا عرفان اتنا بڑھ گیا تھا کہ کسی حقیقی یا فرضی معشوق کے آستانے پر مسلسل ناصیہ فرسائی ممکن نہ رہی تھی ۔ وطن کی سربلندی، قوم کی اصلاح، ملت کی تعمیر، مشاہیر اور اکابر کی تعریف، سیاسی مسائل کا ذکر، مناظرِ قدرت کے

بیان نیز انگریزی نظموں کے ترجمے کرنے میں شعراء ایک قسم کی ادبی عظمت محسوس کرنے لگے تھے ۔ علاوہ ازیں تہذیب و تمدن کی ترقی اور مشینی ایجادات کی زیادتی نے زندگی کی ضرورات بڑھا کر اخراجات میں اضافہ کر دیا تھا ۔ غم دوراں کی شدت نے غم جاناں کو بھلا دیا تھا ۔ قومی ، ملّی اور ذاتی مسائل اس طرح سامنے آئے کہ ادیبوں اور شاعروں کے لیے ان کا مقابلہ کرنا مشکل ہو گیا اور ان سے عہدہ برآ ہونے کو انہوں نے اپنا فرض سمجھا بعض شعراء نے اس کی طرف واضح اشارے بھی کیے ہیں :

غزل کہنے کو تو اس بزم میں آیا نہیں نادر
تجھے یاں وعظ کہنا ، پند سود آمیز کرنا ہے

☆ ☆ ☆

طبع رنگیں نغمہ زار شوق تھی میری مگر
حادثات دھر نے اس کو بیاباں کر دیا
(چکبست)

ان حضرات کی غزلوں میں بھی حسن و عشق کے ترانوں کے بجائے بالعموم آفاقی حقیقتیں ، پند و نصائح اور تعمیری رجحانات نمایاں ہیں ۔ کہیں کہیں سیاست کا رنگ بھی آ گیا ہے ۔ مثلاً :

اک سلسلہ ہوس کا ہے انساں کی زندگی
اس ایک مشت خاک کو غم دو جہاں کے ہیں
(چکبست)

☆ ☆ ☆

درد دل ، پاس وفا ، جذبۂ ایماں ہونا
آدمیّت ہے یہی اور یہی انساں ہونا

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب
موت کیا ہے انھی اجزا کا پریشاں ہونا
(چکبست)

☆ ☆ ☆

کاش شیخ و برہمن مل کر کریں کچھ روک تھام
ورنہ بھارت پر کوئی بھاری عذاب آنے کو ہے

(ناظر)

شاعروں کی صلاحیتیں غزل کی بجائے نظم کی طرف متوجہ ہو گئیں ۔ بعض شعراء نے نہایت عمدہ وصفیہ نظمیں لکھیں جن میں غیر ملکی موضوعات کے بجائے اپنے ہی ملک کی چیزوں کی خصوصیات تحریر کیں ۔ شوق قدوائی نے 'مور'، 'تتلیاں'، اقبال نے 'جگنو'، اسمٰعیل نے 'ہندوستان کے پھول'، سرور نے 'بیر بہوٹی'، 'کویل'، 'جمنا'، شاکر نے 'کنول کا پھول' ہادی نے 'جوہی'، سے نظیر نے 'دیوالی'، 'عید کی دھوم' وغیرہ وصفیہ نظمیں لکھ کر شاعری میں رنگ کو چمکا دیا ۔ بعض شعراء نے تاریخی واقعات کو اپنا موضوع بنایا ۔ محروم نے 'ملکۂ نور جہاں کا مزار'، سرور نے چتوڑ کی 'رانی پدمنی'، اسمٰعیل میرٹھی نے 'قلعہ اکبر آباد' لکھ کر ہندوستان کی تاریخ کے مرقعے دکھلائے ۔ عظمت اللہ خان حیدر آبادی نے 'بانی بیوی' اور 'مجھے پیت کا یاں کوئی پھل نہ ملا'، جیسی نظمیں لکھ کر ہمارے سماج کے بعض دلچسپ اور بعض دردناک پہلو نمایاں کیے ۔

قومی شاعری بھی اس زمانے میں خوب چمکی ۔ ہندوؤں نے کم لیکن مسلمانوں نے اس میں زیادہ حصہ لیا ۔ کیونکہ وہ بحیثیت قوم ۱۸۵۷ء کے بعد سے بہت زیادہ تباہ ہوئے تھے ۔ اکبر نے ظریفانہ انداز میں قوم کو جگایا اور طنز سے چٹکیاں لیں ۔ نذیر احمد شاعر نہ تھے لیکن انجمن حمایت اسلام لاہور کے جلسوں اور دیگر قومی اجتماعات میں اپنے غیرت افروز اشعار پڑھا کرتے تھے[۱] ۔ اسمٰعیل نے بھی یہ فرض انجام دیا ۔ مولانا حالی نے ۱۸۷۹ء میں اپنا مسدس 'مد و جزر اسلام' تصنیف کیا جسے سر سید احمد خان ذریعۂ بخشش سمجھتے تھے ۔ مولانا شبلی نے علیگڑھ کی محمڈن ایجوکیشنل کانفرنسوں میں کئی دردمندانہ اور ولولہ انگیز نظمیں سنائیں ۔ علامہ اقبال نے 'خطاب بہ جوانانِ اسلام'، 'سسلی'، 'شمع و شاعر'، 'شکوہ' اور 'جوابِ شکوہ' لکھ کر قوم کے افسردہ جسم میں غیرت و حمیت کی گرمی پیدا کی ۔

سب سے زیادہ توجہ مناظرِ قدرت کی طرف کی گئی ۔ نظیر اکبر آبادی اور انیس نے اس فن کی ابتدا کی تھی ، لیکن اس کی انتہا اسی دور کے شعراء کے یہاں ہوئی جنھوں نے بے شمار نظمیں لکھ کر قدرتی مناظر کی کیفیتوں کو خوب واضح کیا ۔ 'مخزن'، 'زمانہ' اور 'ادیب' میں اس قسم کی نظمیں شائع ہوتی رہیں ۔ کچھ عرصے بعد جوش ملیح آبادی نے

---

(۱) عبدالسلام ندوی ، شعرالہند ، ج ۲ ۔ ص ۴۷۰ ۔

تنہا قدرتی مناظر پر متعدد بلند پایہ اور دلفریب نظمیں لکھیں جو سلیقۂ الفاظ ، حسنِ معنی اور محاکات (تصویر کاری) کے لحاظ سے بے مثال ہیں ۔ مختصر فہرست ان نظموں کی یہ ہے :

چاندنی رات	بے نظیر شاہ
چاندنی	اوج گیاوی
پچھلی رات	بے نظیر شاہ
نور کا تڑکا	علمدار حسین واسطی
صبح چمن	علمدار حسین واسطی
صبح کی آمد	محمد اسمٰعیل میرٹھی
صبحِ بنارس	بے نظیر شاہ
بند رابن کی صبح	تلوک چند محروم
جاڑے کی بارش	وجاہت
فضائے پرتگال	سرور جہاں آبادی
برسات کی شام	شوق قدوائی
بارش	ظفر علی خان
دھرہ دون کی سیر	چکبست
صحرا	تلوک چند محروم
گنگا جی	مقبول
آبشار	شوق قدوائی
فوارہ	عزیز لکھنوی
دھان کے کھیت	شہاب الدین خان

یہ شعراء جنھوں نے اردو ادب میں نئے رجحانات کو نشو و نما دے کر آزاد اور حالی کے لگائے ہوئے پودے کو سرسبز کیا ۔ محمد اسمٰعیل اور نادر کاکوروی کے سوائے سب علامہ اقبال کے ہمعصر ہیں ۔ ان میں سے بعض حضرات اندازِ فکر ، موضوعِ سخن بلکہ بحروں اور زمینوں کے انتخاب میں بھی اقبال کے مقلّد ہیں ۔ یہ سب انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے نصف اول کے ہیں ۔ ان میں محسن کاکوروی زمانی ترتیب کے اعتبار سے بہت مقدّم ہیں ۔ اتنے مقدّم کہ انھیں عمر اور موضوعِ شاعری کے لحاظ سے ذرا پہلے کے دور میں جگہ ملنی چاہیے تاہم اپنے مشہور نعتیہ قصیدے کے مناظرِ قدرت اور اس میں مقامی رنگ بلکہ ہندو قوم کی دیو مالا اور تاریخی مضامین کی بدولت جدید شعراء کے زمرے میں شامل کر لیا گیا ہے ۔اب ان شعراء کے مختصر حالاتِ زندگی جو ان کی شاعری پر

اثر انداز ہوئے اور جن میں اس دور کے معاشرتی ، سیاسی ، تاریخی اور قومی رجحانات کا عکس ملتا ہے ، تحریر کیے جاتے ہیں ۔

محسن کاکوروی (۱۸۲۷ء تا ۲۴ اپریل ۱۹۰۵ء)

محمد محسن ولد مولوی حسن بخش علوی کاکوروی کے ایک پرہیزگار و دیندار گھرانے کے چشم و چراغ تھے ۔ علوم متداولہ یعنی عربی ، فارسی ، صرف و نحو ، منطق وغیرہ کے علاوہ ، انگریزی پڑھی ۔ پھر وکالت کا امتحان دے کر آگرے میں وکالت کرنے لگے ۔ حکام نے منصفی کی خدمت دینی چاہی ، لیکن انہیں پسند نہ آئی ۔

فنِ شعر میں انہوں نے مولوی ہادی علی اشک سے اصلاح لی تھی ۔ شروع ہی سے موزوں طبیعت تھے اور بہاریہ مضامین لکھنے سے رغبت تھی ۔ سولہ سال کی عمر میں پہلا نعتیہ قصیدہ کہا جس کا مطلع یہ ہے :

پھر بہار آئی کہ ہونے لگا صحرا گلشن
غنچہ ہے نامِ خدا نافۂ آہوئے ختن

ان کی زیادہ شہرت اس نعتیہ قصیدے سے ہوئی جس میں انہوں نے سری کرشن جی کے واقعات کی تلمیحیں اور جمنا کے کنارے گوکل و بندرابن کی برسات کے مناظر بہت دلکش انداز میں نظم کیے ۔ محسن کی طبیعت مضمون آفرینی پر مائل تھی اس لیے قدرتی مناظر کے بیان میں واقعیت کے دوش بدوش تخیل کی جولانی اور اندازِ بیان کی بے ساختگی بہت دلفریب معلوم ہوتی ہے ۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں :

سمتِ کاشی سے چلا جانبِ متھرا بادل
برق کے کاندھے پہ لاتی ہے صبا گنگا جل

گھر میں اشنان کریں سرو قدانِ گوکل
جا کے جمنا پہ نہانا تو ہے اک طولِ امل

خبر اڑتی ہوئی آئی ہے مہابن سے ابھی
کہ چلے آتے ہیں تیرتھ کو ہوا پر بادل

کالے کوسوں نظر آتی ہیں گھٹائیں کالی
ہند کیا ساری خدائی میں بتوں کا ہے عمل

نہ کھلا آٹھ پہر میں کبھی دو چار گھڑی
پندرہ روز ہوئے پانی کو منگل منگل

کبھی ڈوبی کبھی اچھلی مہ نو کی کشتی
بحرِ اخضر میں تلاطم سے پڑی ہے ہلچل

شاہدِ کفر ہے مکھڑے سے اٹھائے گھونگھٹ
چشمِ کافر میں لگائے ہوئے کافر کاجل

جس طرح دیکھیے بیلے کی کھلی ہیں کلیاں
لوگ کہتے ہیں کہ کرتے ہیں فرنگی کونسل

صاف آمادۂ پرواز ہے شاما کی طرح
پر لگائے ہوئے مژگانِ صنم سے کاجل

اس قصیدے میں مقامی رنگ بہت لطف دے رہا ہے ۔ محسن کو نعت گوئی سے شغف تھا ۔ انہوں نے چار قصیدے اور پانچ مثنویاں جناب رسالت مآب کی خدمت میں کہی ہیں ۔ مثنویوں میں مضمون آفرینی ، آیات و احادیث کے حوالے بلکہ تضمینیں بڑی پاکیزگی کے ساتھ آئے ہیں ۔ اس بنا پر امیر مینائی نے ان کے متعلق کہا تھا کہ ''ان کا کلام ایک عالم ہے خیالاتِ نادرہ کا ، کہ اس کو دیکھ کر انسان حیران ہو جاتا ہے''[1] ۔ مثنویوں میں اسلامی رنگ اور تلمیحات کی باریکیاں بہت گہری ہیں جنہیں سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ قرآن و احادیث کے مشہور حصے اچھی طرح نگاہ میں ہوں ۔ 'صبح تجلّی' میں جو رسولِ مقبول کے میلاد پر مشتمل ہے ۔ مناظرِ صبح کے ساتھ تخیل کی رفعت اور اسلامی اصطلاحات و تلمیحات کی آمیزش بہت خیال افروز ہو گئی ہے :

بیضاویٔ صبح کا سماں ہے
تفسیرِ کتابِ آسماں ہے

آثارِ سحر ہوئے نمایاں
سیپارہ لیے ہوئے ہے دوراں

واللیل کو ختم کر چکا ہے
آمادۂ وردِ والضحیٰ ہے

اطرافِ بیاضِ مطلعِ صاف
والفجر کے حاشیے پہ کشاف

گردوں کے غلاف میں ہے پنہاں
مشکوٰۃ شریف مہر تاباں

کیفیتِ وحی میں ہے بلبل
ہے وقتِ نزولِ مصحفِ گل

سبزہ ہے کنارِ آبجو پر
یا خضر ہے مستعد وضو پر

سوسن کی زبان پر مناجات
جاری لبِ جو سے التحیات

تسبیحِ شگوفہ یا مصور
تحریمۂ تاکِ ربِ اغفر

---

(۱) عبدالحئی ، گل رعنا ۔ ص ۳۵۷ ۔

مثنوی 'چراغِ کعبہ' میں رات کا نقشہ کھینچا ہے - ستاروں ، شبنم اور رات کی تاریکی کا بیان استعاروں میں بڑے تکلف سے کیا ہے اور مضمون آفرینی بدستور قائم ہے :

بھیگی ہوئی رات آبرو سے   داخل ہوئی کعبے میں وضو سے
اوڑھے ہوئے لیلائے گلِ اندام   شبنم کی ردا بہ قصدِ احرام
گویا کہ نہا کے آئی فی الحال   جھک جھک کے نچوڑتی ہوئی بال

ان اشعار میں خیالات و مضامینِ عالیہ کی ندرت و نزاکت یقیناً قابلِ تعریف ہے - لیکن اتنا کہنا ضروری ہے کہ بلند خیالی کی وجہ سے قدرتی مناظر کے بیان میں حقیقت و واقعیت کا پہلو کمزور ہو گیا ہے -

محمد اسمٰعیل میرٹھی (۱۲ نومبر ۱۸۴۴ء تا یکم نومبر ۱۹۱۷ء)

ان کی ساری زندگی کو محنت ، استقلال ، ترقی اور تعمیر سے عبارت کیجیے تو بالکل مناسب ہے - معمولی تعلیم حاصل کرنے کے بعد سولہ سال کی عمر میں محکمۂ تعلیم میں ملازم ہو گئے - سہارن پور اور میرٹھ میں مدرسی کے بعد سنٹرل نارمل اسکول آگرہ میں صدر مدرس ہوئے - چالیس سال تک ملازمت کرنے کے بعد ۱۸۹۹ء میں پنشن لی[1] اور گھر آ کر بھی تدریسی تصانیف میں مشغول رہے - ان کی شاعرانہ صلاحیتیں اسکولوں کی ریڈریں تالیف کرنے میں صرف ہوئیں - اس میں کلام نہیں کہ انہوں نے جیسی سلسلہ وار ریڈریں تالیف کیں ویسی پھر نہ لکھی جا سکیں -

خان صاحب مولوی محمد اسمٰعیل دورِ سر سید کے آدمی ہیں - وہ سر سید کی تعلیمی تحریک کے رکن نہ تھے ، لیکن قوم کی اصلاح اور تعلیم کی ترقی میں انہوں نے قابلِ تعریف حصہ لیا - حالی و شبلی سے بہت متاثر تھے - انجمن پنجاب کے 'مناظموں' سے ان کا تعلق نہ تھا لیکن ساری عمر اسی روش پر نظمیں لکھتے رہے - معمولی چیزوں اور پیش پا افتادہ باتوں میں شاعرانہ حسن پیدا کرکے سبق آموز نتائج نکالنا ان کا شیوۂ خاص ہے - جن نظموں میں منظر نگاری کی ہے ان میں مقامی رنگ اور واقعیت نے دلکشی پیدا کر دی ہے - ایسی نظموں میں بھی ان کی اصلاحی و تعمیری مقصدیت برابر کارفرما ہے - وہ غزل گوئی کے فرسودہ انداز کو نا پسند کرتے تھے اور عمر بھر اپنی شاعری سے اصلاح ، حرکت ، سعی و کوشش اور جد و جہد کا سبق دیتے رہے - ایک نظم میں لکیر کے فقیر شاعروں کی بیہودہ

---

(۱) مشرف انصاری ، جدید شعرائے اردو - ص ۴۵ -

غزل گوئی کے متعلق انہوں نے جس طرح اظہارِ خیال کیا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ دورِ حاضر کے تقاضوں سے کتنے با خبر تھے :

سخنورانِ زماں کی بھی ہے یہی حالت
کہ اس قدیم ڈگر کو نہ چھوڑیے زنہار

سوائے عشق نہیں سوجھتا انہیں مضموں
سو وہ بھی محض خیالی گھڑت کا اک طومار

نہ لکھتے ہیں کبھی نیرنگِ حکمت و قدرت
نہ واقعات کے وہ کھینچے ہیں نقش و نگار

تمام اگلے زمانے کا ہے یہ پس خوردہ
کہ کر رہے ہیں جگالی وہ جس کی سو سو بار

ان کی غزل گوئی سے بے تعلقی و بیزاری نمایاں ہے ۔ انہوں نے اپنی بیشتر نظموں میں مناظر قدرت کے نقشے کھینچے ہیں جن میں اگرچہ شاعرانہ نازک خیالی اور فن کارانہ سلیقہ چنداں نہیں تاہم واقعیت و حقیقت کارفرما ہے[1] ۔ مثلاً شفق کے متعلق یہ نظم :

شفق پھولنے کی بھی دیکھو بہار — ہوا میں کھلا ہر طرف لالہ زار
ہوئی شام بادل بدلنے ہیں رنگ — جنہیں دیکھ کر عقل ہوتی ہے دنگ
طبیعت ہے بادل کی رنگت پہ لوٹ — سنہری لگائی ہے قدرت نے گوٹ
ذرا دیر میں رنگ بدلے کئی — بنفشی و نارنجی و چمپئی
فلک نیلگوں اس میں سرخی کی لاگ — ہرے بن میں گویا لگا دی ہے آگ

اب آثار ظاہر ہوئے رات کے
کہ پردے چھٹے لال بانات کے

ممکن ہے کہ اس قسم کی نظموں میں بعض ناقدوں کو طفلانہ سادگی اور بے مائگی نظر آئے لیکن اس سادگی و کم مائگی کی تلافی ان کے اصلاحی و تعمیری رجحان سے ہو جاتی ہے جس میں وہ قوم کے افراد بالخصوص نوجوانوں کو بیداری ، سعی و عمل اور جد و جہد کا سبق دیتے ہیں ۔ ان کی اکثر نظمیں مثلاً 'پن چکی' ، 'کیے جاؤ کوشش مرے دوستو' ، 'کیونکہ میرا خدا ہے میرے ساتھ' ، 'اٹھو سونے والو کہ میں آ رہی ہوں' وغیرہ ۔ بچوں

---

(۱) اعجاز حسین ، مختصر تاریخ ادب اردو ۔ ص ۱۶۲ ۔

اور نوجوانوں کے لیے پیغامِ عمل سے لبریز ہیں ۔ 'بارش کا پہلا قطرہ' تو اردو میں ہمت و جرأت کا استعارہ بن گیا ہے ۔ بعض نظموں کے ایک دو بند اس افادیت اور ترغیبِ عمل کو واضح کرنے کے لیے کافی ہیں :

جو پتھر پہ پانی پڑے متصل   تو بے شبہ گھس جائے پتھر کی سل
رہو گے اسی طرح گر مستقل   تو اک دن نتیجہ بھی جائے گا مل
کیے جاؤ کوشش مرے دوستو

☆ ☆ ☆
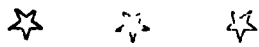
لشکروں کی جہاں چڑھائی ہو   شہسواروں نے باگ اٹھائی ہو
سخت گھمسان کی لڑائی ہو   واں بھی ہیبت نہ مجھ پہ چھائی ہو
کیونکہ میرا خدا ہے میرے ساتھ

غالباً اسی افادیت اور مقصدیت کے پیشِ نظر مولانا شبلی نے یہ کہا تھا کہ "حالی کے بعد اگر کسی نے سننے کے لائق کچھ کہا ہے تو وہ مولوی اسمٰعیل میرٹھی ہے"[1] ۔ بعض نظمیں ایسی بھی ہیں جو مقصدیت کے دوش بدوش شاعرانہ لطافتوں اور فنکارانہ سلیقے سے بھی معمور ہیں ۔ 'قلعہ اکبر آباد' میں اسمعیل نے مغلوں کی عظمت ، صلح کل ، بے تعصبی اور مروّت کا بیان کرکے مسلمانوں کو درسِ عمل دیا ہے بہت بلیغ نظم ہے ۔ پہلا بند یہ ہے :

یا رب یہ کسی مشعلِ کشتہ کا دھواں ہے
یا برہمی بزم کی فریاد و فغاں ہے
یا قافلۂ رفتہ کا پس خیمہ رواں ہے
یا گلشنِ برباد کی یہ فصلِ خزاں ہے
یاں دورِ گزشتہ کی سہابت کا نشاں ہے
بانئ عمارت کا جلال اس سے عیاں ہے
بجتا تھا یہاں کوسِ شہنشاہئ اکبر
اڑتا تھا یہاں پرچمِ جم جاہئ اکبر

---

(۱) رام بابو سکسینہ ، تاریخ ادب اردو مترجم ۔ ص ۳۸۴ ۔

ان نظموں کے علاوہ اسمٰعیل نے نظم معریٰ لکھ کر ہیئت کے نئے تجربے بھی کیے - ذیل کے اشعار اسی جدت کے نمونے ہیں :

ارے چھوٹے چھوٹے تارو	کہ چمک دمک رہے ہو
تمہیں دیکھ کر نہ ہووے	مجھے کس طرح تحیّر
کہ تم اونچے آسماں پر	جو ہے کل جہاں سے اعلیٰ
ہوئے روشن اس روش سے	کہ کسی نے جڑ دیے ہیں

گہر اور لعل گویا

کیفیتوں اور واقعات کو موزوں ترین الفاظ سے ظاہر کرنے کی صلاحیت ان کی نظم 'بادِ مراد' میں بہت نمایاں ہے - اس نظم میں انہوں نے ہوا کی مختلف کارگزاریوں کو مناسب استعاروں نیز الفاظ کی آواز سے ظاہر کیا ہے:

چل اے بادِ بہاری سمتِ گلزار	تمنائی ہے تیرا ہر گل و خار
نہال و نخل و سبزہ سب ہیں سنسان	گیاہِ مردہ میں تو ڈال دے جان
نہیں گلشن میں پتّے کا بھی کھڑکا	ذرا شاخیں ہلا ، طائر کو بھڑکا
لہک تیزی سے اے بادِ بہاری	کہ ہو جائے چمن پر وجد طاری
جو تو لہکے تو سبزہ لہلہائے	چمن کا بیل بوٹا سر ہلائے
ٹپک جائے جو ہو پتّا ہوا پھل	کہ شاخیں ہو رہی ہیں سخت بوجھل
سنا بادِ صبا کیا کیا ہنر ہے	قلمرو میں تری کل بحر و بر ہے
اٹھایا ہے سمندر تو نے سر پر	گھٹا کو لاد کر لائی کمر پر
کبھی بنتی ہے ایسی تند و پر شور	معاذ اللہ معاذ اللہ ترا زور
اگر تو خشمگیں اے تند خو ہو	تہ و بالا جہازِ جنگجو ہو
تری رفتار ہے بیباک کیسی	اڑاتی ہے زمیں کو خاک کیسی
نہیں کچھ تجھ کو خوفِ شانِ سلطاں	اڑایا پردۂ ایوانِ سلطاں
چرا لیتی ہے تو پانی کو چپ چاپ	نظر آتا نہیں جب بن گیا بھاپ
برودت کی پولیس نے تجھ کو گھیرا	تو کچھ کچھ مال مسروقہ بھی پھیرا

غرض دلچسپ تیری ہر ادا ہے
تری شوخی و چالاکی بجا ہے

اسمعیل نے غزل ، قصیدہ ، سلام ، مرثیہ بھی لکھے ہیں، لیکن ان کا اصلی میدان اور میلانِ نظم جدید ہی ہے - مومن کی زمین میں 'خالق باری' کے انداز کی ایک لغت لکھ کر اپنی طبیعت داری کا ثبوت یوں دیا ہے :

وہی کارواں وہی قافلہ ، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی منزل اور وہی مرحلہ ، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہی شکر ہے جو سپاس ہے ، وہ ملول ہے جو اداس ہے
جسے شکوہ کہتے ہیں ہے گلہ ، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

نوبت رائے نظر لکھنوی (۱۸۶۶ء تا ۸ اپریل ۱۹۲۳ء)

کایستھ گھرانوں کے عام دستور کے مطابق بچپن میں فارسی کی تعلیم حاصل کی ۔ کچھ انگریزی بھی پڑھی ۔ شاعری میں آغا مظہر لکھنوی سے استفادہ کیا ۔ ۱۸۹۷ء میں رسالہ 'خدنگ نظر' جاری کیا ۔ ۱۹۰۴ء سے 'زمانہ' کانپور میں اور ۱۹۱۰ء سے 'ادیب' الہ آباد میں ان کے ادبی مضامین چھپنے لگے ۔ ۱۹۱۴ء میں 'اودھ' اخبار کے ایڈیٹر مقرر ہوئے ۔ آخر عمر میں بیٹی اور نواسے کی موت کے باعث ملول رہتے تھے ۔ ان کی نظموں میں مقامی رنگ، اور منظر نگاری کے ساتھ تخیل کی خفیف سی آمیزش موجود ہے :

کہاں ہیں جرعہ کش لطف ابتدائے بہار
وہ آئے ابر کے ٹکڑے چلی ہوائے بہار

وہ جھوم جھوم کے چاروں طرف گھٹا چھائی
ہوا نے کھول دی وہ زلف مشک سائے بہار

گیا فلک پہ پپیہا وہ پی کہاں کہتا
نقیب موسم گل پیک خوشنوائے بہار

ہوا میں آئی وہ اڑتی قطار بگلوں کی
کھلا ہے بیلے کا تختہ کوئی برائے بہار

نادر علی خان نادر کاکوروی (۱۸۶۷ء تا ۲۰ اکتوبر ۱۹۱۲ء)

حامد علی عباسی کے بیٹے تھے ۔ تعلیم کا حال معلوم نہ ہو سکا ۔ لیکن اتنا ان کے کلام سے ظاہر ہے کہ فارسی کی اچھی استعداد تھی اور انگریزی کا مطالعہ معقول تھا جس میں ٹامس مور اور بائرن سے انہیں خصوصی شغف تھا ۔ ان کی نظمیں 'زمانہ' اور 'مخزن' میں چھپتی رہیں جن کا خاص جوہر ، صحیح مذاق شعری ، لطیف احساسات ، تخیل کی رفعت ، احساس کی شدت اور تاثیر ہیں ۔ زبان ستھری اور رواں ہے جس کی سادگی

میں پرکاری بھی ہے اور ترنم بھی - کلام کا مجموعہ 'جذباتِ نادری' کے نام سے ۱۹۱۰ء میں چھپتا تھا - اردو اکیڈمی سندھ نے ۱۹۶۱ء میں پھر شائع کیا ہے -

نادر کی رفیقۂ حیات کا انتقال عالمِ شباب ہی میں ہو گیا تھا - شاعر کے دل میں دورِ عشرت کی غمناک یادیں ہمیشہ باقی رہیں جن کا اظہار بعض نظموں میں ہوا ہے - مثلاً 'مرحومہ کی یاد میں' جو در اصل انگریزی نظم کا ترجمہ ہے :

رات کے پچھلے پہر روتی ہے جب چشمِ نجوم
الفتِ دیرینہ کی وادی میں اڑ جاتا ہوں میں

اور اس وادی میں مرحومہ جو یاد آتی ہو تم
محو ہو جاتا ہوں کچھ ایسا مزہ پاتا ہوں میں

☆ ☆ ☆

اس سکوت اس محویت میں پھر یہ آتا ہے خیال
روحیں منڈلاتی ہیں اسر اوجِ فضائے عرش پر

اور چھپ کر آتی ہیں اس خاکدانِ عشق میں
تاکہ دیرینہ علائق دیکھ لیں پھر اک نظر

نادر کی سب سے زیادہ پر تاثیر نظم 'گزرے ہوئے زمانے کی یاد' ہے یہ نظم آئرلینڈ کے انگریزی شاعر ولیم راجرز کی (oft in the stilly night) کا ترجمہ ہے - اس کی ترنم خیز بحر ، جذبات کا خلوص اور احساس کی شدت بہت ہی اثر آفرین ہیں - اس کا غیر مقفّیٰ ہونا انگریزی ادب کے بڑھتے ہوئے اثر کی شہادت دیتا ہے - ایک دو بند ملاحظہ ہوں :

اکثر شب تنہائی میں	کچھ دیر پہلے نیند سے
گزری ہوئی دلچسپیاں	بیتے ہوئے دن عیش کے
بنتے ہیں شمع زندگی	اور ڈالتے ہیں روشنی

میرے دلِ صد چاک پر

☆ ☆ ☆

جب آہ ان احباب کو	میں یاد کر اٹھتا ہوں جو
یوں مجھ سے پہلے اٹھ گئے	جس طرح طائر باغ کے
یا جیسے پھول اور پتیاں	گر جائیں جب قبل از خزاں

اور خشک رہ جائے شجر

اسی بنا پر مشرف انصاری کا یہ قول صحیح ہے کہ نادر نے انگریزی خیالات کو بڑی خوبی سے اردو میں سمویا ہے[1] ۔ قدیم تغزل کے رنگ میں ان کا یہ شعر ، جسے وہ آخر عمر میں اکثر پڑھا کرتے تھے ، ان کے جذبات کا آئینہ دار ہے :

نوا سنجی کو کیا کچھ بلبلیں اس باغ میں کم تھیں
مجھے تکلیف دی ناحق چمن پیرائے عالم نے

نادر کی بے وقت موت پر تلوک چند محروم نے مرثیہ لکھا تھا ۔ یہ دو شعر نادر کی رفعتِ خیال اور خلوصِ جذبات کا اشارہ کرتے ہیں :

تیرے جذباتِ مصفّا تھے جواہر نادر
کوئی دن اور بھی دولت یہ لٹائی ہوتی

ندرت آمیز یہ تصویرِ تخیّل افسوس
دستِ بیداد اجل نے نہ مٹائی ہوتی

درگا سہائے سرور (۱۸۷۳ء تا ۳ دسمبر ۱۹۱۰ء)

جہان آباد ضلع پیلی بھیت یو ۔ پی ان کا وطن تھا ۔ وہیں منشی کرامت حسین بہار سے فارسی سیکھی ۔ انگریزی زبان اور طب کی تعلیم بھی پائی تھی ۔ شیریں زبان ، زندہ دل ، بے تکلف آدمی تھے ۔ اول اول غزلیں کہیں پھر جدید رنگ اور ملکی حالات سے متاثر ہو کر نظمیں لکھیں جو 'وطن کی محبت' ، 'قدرتی مناظر' اور ملکی موضوعات سے متعلق ہیں ۔ ہندوستان کے پھل پھول ، چرند پرند کا ذکر اور بھاشا کے رسیلے الفاظ سلیقے سے استعمال کرکے مقامی رنگ پیدا کیا ہے ۔ بعض نظمیں مثلاً 'مرغابی' ، 'موسمِ گرما کا آخری گلاب' ، 'کار زارِ ہستی' انگریزی سے ترجمہ کی ہیں ، 'بیر بہوٹی' اور 'کوئل' در ان کی نظمیں بہت تخیل انگیز ہیں ۔ وہ 'بیر بہوٹی' کو کبھی 'نازشِ صحرا' کبھی 'ننھا سا گلِ رعنا' اور کبھی 'خونِ عشق' کا قطرہ قرار دیتے ہیں جو حسن کا گریبان گیر ہو گیا ہے ۔

سرور کی نظموں کا بڑا حصہ تاریخی اور مذہبی موضوعات پر مشتمل ہے ۔ مثلاً 'پدمنی کی چتا' ، 'دسرتھ کی بیقراری' ، 'نور جہاں کا مزار' ، 'دمینتی کی حسرتِ دیدار' ، 'جمنا' ۔ ان تمام نظموں میں ان کی زبان سلیس ، سبک ، رواں اور نرم ہے ۔ رام بابو سکسینہ کے بقول ''انھوں نے پرانے اور نئے رنگوں میں جو جو باتیں قابلِ غور تھیں لے لیں ۔ ان کے

---

(۱) مشرف انصاری ، جدید شعرائے اردو ۔ ص ۱۹۷ ۔

کلام میں جدید رنگ کے تازہ مضامین اور حبِ وطن کے جذبات نہایت خوبی کے ساتھ ملے جلے ہیں" ۔ ڈاکٹر اعجاز حسین کی رائے ہے کہ "سرور نے گونا گوں مسائل سے کلام میں ندرت و جدت پیدا کی ہے ۔ ایران کی 'بلبل و قمری' کے دوش بدوش ہندوستان کی 'کویل' 'بھونرا' ، 'سارس' اور 'مرغابی' بھی موجود ہیں ۔ گویا سودیشی مال کو بدیسی مال کے پہلو بہ پہلو سجا دیا ہے"(۱) ۔

سرور عین جوانی میں مغموم و محروم اس دنیا سے رخصت ہوئے ۔ انہوں نے پہلے اپنی جوان بیوی کا پھر بیٹے کا داغ اٹھایا ۔ جس سے ان کی طبیعت پر غم و ملال چھا گیا ۔ اس سے بچنے کے لیے انہوں نے شراب کے دامن میں پناہ لی جس نے بہت جلد ان کی زندگی کا خاتمہ کر دیا ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی بعض نظموں میں غم و اندوہ کے مضامین بہت پر تاثیر ہیں ۔ 'دیوار کہن' ، 'مرغانِ قفس' ، 'ماتمِ آرزو' ، 'یادِ طفلی' اسی پہلو کی نمائندہ اور جذبات نگاری کا عمدہ نمونہ ہیں ۔ کلام کے دو مجموعے 'خمخانۂ سرور' اور جامِ سرور' کے نام سے شائع ہوئے تھے ۔ اب کمیاب ہیں ۔ جذبات کی دلگدازی ، زبان کی سلامت و صفائی ، فارسی اور بھاشا کے الفاظ کا حسین امتزاج ان کے اسلوب کی خصوصیات ہیں ۔ 'بھونرے کی بیقراری' کے یہ اشعار ان کے اندازِ کلام کا نمونہ ہیں :

نہ وہ کیتکی کی پھبن رہی — نہ وہ موتیا کی ادا رہی
نہ وہ نسترن نہ سمن رہی — نہ وہ گل رہے نہ فضا رہی
نہ گلوں کے اب ہیں وہ قہقہے — نہ وہ بلبلوں کے ہیں چہچہے
نہ غزل سرا وہ کوئی رہے — نہ وہ قمریوں کی صدا رہی
نہ وہ سرو ہیں نہ وہ آبجو — نہ وہ ہم صفیر ہیں خوش گلو
نہ وہ کیتکی نہ وہ ناز بو — نہ وہ جعفری نہ حنا رہی

ایک نظم 'زنِ خوشخو' میں معصوم خانگی محبت کا نقشہ کھینچا ہے ۔ فارسی الفاظ و تراکیب نیز اسلامی عقائد اور مشرقی حیا و حجاب کا اثر اس سے ظاہر ہے :

بہتر نہیں غمخوار زنِ خوب و نکو سے
گھر سارا مہک اٹھتا ہے اس پھول کی بو سے

نور آنکھوں میں آ جاتا ہے آئینۂ رو سے
مٹ جاتی ہے قسمت کی سیاہی شبِ مو سے

---

(۱) اعجاز حسین ، مختصر تاریخ ادب اردو ۔ ص ۱۶۷ ۔

چھپرے میں سیہ زلف جو ہے بدر کا عالم
بھر جاتا ہے آنکھوں میں شبِ قدر کا عالم

ہوتی نہیں زیور کی طلبگار زیادہ
رکھتی نہیں تزئین سے سروکار زیادہ

کرتی نہیں شوخی دمِ رفتار زیادہ
ملبوس پہنتی نہیں زر تار زیادہ

توام جو نہیں شوخیٔ رفتار قدم سے
پازیب کے گھنگھرو کبھی بجتے نہیں چھم سے

الماس کو ہر چند کہ کاوش ہو گہر سے
اور گل عرق آلودہ ہو شبنم کے اثر سے

چادر کبھی خلوت میں سرکتی نہیں سر سے
بیگانہ نظر رہتی ہے شوہر کی نظر سے

خلوت میں نگاہوں سے نگاہیں نہیں ملتیں
دل ملتے ہیں دل ملنے کی راہیں نہیں ملتیں

سرور کی جواں مرگی پر تلوک چند محروم نے مرثیہ لکھا تھا جو رسالہ 'زمانہ' دسمبر ۱۹۱۰ء میں چھپا - یہاں اس کا ایک بند درج کیا جاتا ہے جس سے اقبال کی تقلید کا رنگ نمایاں ہے :

شاعران خوش بیاں ہیں اور کئی ہوں گے یہاں
فکرِ عالی بھی نہیں کمیاب زیرِ آسماں

حسن و الفت کی بھی سنتے جائیں گے ہم داستاں
نل دمن کا بھی نکل آئے گا کوئی ترجماں

شعر کو دے گا مگر خونِ جگر سے رنگ کون
حسنِ فطرت کے دکھائے گا ہمیں ارژنگ کون

خوشی محمد ناظر (۱۸۷۲ء تا اکتوبر ۱۹۴۴ء)

باپ کا نام مولوی داد خان ہے - ضلع گجرات وطن تھا جہاں انہوں نے اسکول کی تعلیم کے ساتھ کتب میں فارسی بھی سیکھی - پھر ۱۸۹۳ء میں علیگڑھ کالج سے بی - اے

گیا ۔ ریاست کشمیر میں گورنر رہے ۔ اس سے سبکدوشی کے بعد اپنی جائداد واقع چک جھمرہ ضلع لائل پور میں رہنے لگے ۔

ناظر نے حالی کو اپنا ابتدائی کلام دکھایا تھا ۔ علیگڑھ میں سر سید اور پروفسر آرنلڈ کے اثر سے نیچرل شاعری کا شوق ہوا ۔ وہاں کالج یونین کلب اور ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسوں میں قومی نظمیں لکھتے رہے ۔ قومی خدمات کا بہت شوق تھا ۔ لاہور میں انجمن حمایت اسلام کے جلسوں میں شریک ہوتے تھے اور مسلمانوں کی ترقی کے آرزومند تھے ۔ دسمبر ۱۹۳۸ء کے آل انڈیا مشاعرہ لاہور میں صدر مشاعرہ نے ان کی غزل ساغر نظامی سے پڑھوائی (ناظر کی آواز پست تھی) خود نہیں پڑھتے تھے قد لمبا تھا اس لیے ساغر نظامی نے جب ان کا یہ شعر پڑھا تو اونٹ کا لفظ کہتے وقت ہاتھ سے ان کی طرف بھی اشارہ کر دیا :

گائے تو مالک ہے سب گھر بار کی   اونٹ کو بھی کچھ ٹھکانا چاہیے

کشمیر میں انہوں نے حسن فطرت کی خوب سیر کی تھی ۔ اس کے آثار نظموں میں ملتے ہیں ۔ پروفیسر مشرف انصاری کی رائے ہے کہ "انہیں قدرت کے مناظر سے انتہائی شیفتگی ہے ۔ عینی مشاہدات کو اس قدر دلکش انداز میں پیش کیا ہے کہ پڑھنے والا مسحور ہو جاتا ہے"[1] ۔ 'جوگی' میں ان کی شاعری ساحری کی حد سے مل گئی ہے ۔ شیریں بندی الفاظ ، مترنم وجد آور بحر اور کوہستان کی فضا نے اس نظم میں بڑی تاثیر بھر دی ہے :

کل صبح کے مطلع تاباں سے جب عالم بقعۂ نور ہوا
سب چاند ستارے ماند ہوئے خورشید کا نور ظہور ہوا

مستانہ ہوائے گلشن تھی ، جانانہ ادائے گلبن تھی
ہر وادی وادیٔ ایمن تھی ہر کوہ پہ جلوۂ طور ہوا

جب باد صبا مضراب بنی ہر شاخ نہال رباب بنی
شمشاد و چنار ستار بنے ، ہر سرو و سمن طنبور ہوا

سب طائر مل کر گانے لگے ، عرفان کی تانیں اڑانے لگے
اشجار بھی وجد میں آنے لگے دلکش وہ سماع طیور ہوا

---

(۱) مشرف انصاری ، جدید شعرائے اردو ۔ ص ۳۹۰ ۔

تھا دلکش منظرِ دشت و جبل اور چال صبا کی مستانہ
اس حال میں ایک پہاڑی پر جا نکلا ناظر دیوانہ

بعض نظموں میں سیاسی ، مذہبی اور اقتصادی مسائل بھی نظم کیے ہیں ۔ 'انقلاب' کے یہ اشعار اسی رجحان کا نمونہ ہیں :

دورِ گردوں میں نیا اک انقلاب آنے کو ہے
میکدے میں محتسب مستِ شراب آنے کو ہے

اہلِ تقویٰ اہلِ دیں اہلِ یقیں کی شان میں
سادہ لوحاں کا زمانے سے خطاب آنے کو ہے

دل کہ شمع طور تھا بے نور ہو جانے کو ہے
جوہرِ سیع و زباں میں آب و تاب آنے کو ہے

خانہ جنگی سے کٹے مرتے ہیں بھارت کے سپوت
ناظر اس منظر سے با چشمِ پر آب آنے کو ہے

غلام بھیک نیرنگ (ستمبر ۱۸۷۶ء تا اکتوبر ۱۹۵۲ء)

دورانہ ضلع انبالہ وطن تھا ، گورنمنٹ کالج لاہور سے بی ۔ اے کیا ۔ یہاں اقبال ، میاں عبدالعزیز ، سر فضل حسین ، ٹیک چند بخشی جیسے ممتاز اشخاص ان کے ہمدرس تھے ۔ ۱۹۲۰ء میں وہ تحریکِ خلافت میں شامل ہو گئے ۔ قوم کے تہذیبی ، اصلاحی اور مذہبی جلسوں میں سرگرمی سے شریک ہوتے تھے ۔ انجمن حمایتِ اسلام کے ممبر تھے ۔ ندوۃ العلما لکھنؤ ، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علیگڑھ اور علیگڑھ کی ایگزیکیوٹو کونسل کے جلسوں میں حصہ لیتے تھے ۔ انبالہ کی انجمن تبلیغِ اسلام کے بانی تھے ۔ ۱۹۵۰ء میں پاکستان کے دستور ساز اسمبلی کے ممبر بنے[1] ۔

کالج کی تعلیم کے زمانے میں بھاٹی گیٹ بازار حکیماں والے مشاعرے میں ، جہاں اقبال کا نام پہلی بار چمکا تھا ، شریک ہوا کرتے تھے ۔ پھر بہت جلد ان کی شاعرانہ سرگرمیاں قومی اور مذہبی کاموں کے لیے وقف ہو گئیں ۔ اشعار کے دو مجموعے 'کلامِ نیرنگ' اور 'غبارِ افق' کے نام سے چھپے ہیں ۔ ان کی شاعری میں دورِ جدید کے مسائل یعنی اقتصادی مشکلات اور قومی تقاضے کارفرما ہیں ۔ مناظرِ قدرت کی نقاشی بھی ۔ ان کی زبان فصیح ہے جس میں

---

(۱) مشرف انصاری ، جدید شعرائے اردو ۔ ص ۳۷۶ ۔

فارسی تراکیب خوش اسلوبی کے ساتھ ملی ہوئی ہیں ۔ آراستہ زبان میں وہ سبزہ و گل اور کوہ و دشت کی رنگین تصویریں کھینچتے ہیں ۔ کلام کا نمونہ یہ ہے : ۔

انسان کی فریاد

جو میری حاجتیں ہیں ساری مصیبتیں ہیں
نکبت کی ابتدا ہوں شامت کی انتہا ہوں

صیاد حادثے کا کرتا ہے میرا پیچھا
مرغِ بریدہ پر ہوں صیدِ شکستہ پا ہوں

مجبوریوں نے ڈالا گردن میں میری پھندا
خو کردۂ وفا ہوں جاں دادۂ رضا ہوں

نے مجھ کو جائے ماندن ، نے مجھ کو پائے رفتن
میں راندۂ قدر ہوں آوارۂ قضا ہوں

کوہستان

ہاں مبارک تجھے اے دید کی مشتاق نظر
ایک باغِ گل نظارہ ہے شملے کا سفر

سبزہ ہی سبزہ ہر اک سمت نظر آتا ہے
ایک دریائے زمرد ہے کہ لہراتا ہے

یاں جو پودا ہے سو ہے سرو کی صورت آزاد
خوشنوایانِ چمن کو نہیں خوفِ صیاد

نخلبندِ چمنِ دھر ہے مالی اس کا
گل سے دامن کبھی رہتا نہیں خالی اس کا

چنی ہیں پھولوں نے خوشرنگ قبائیں کیا کیا
دل لبھاتی ہیں پرندوں کی صدائیں کیا کیا

ہائے اس حسن کے مسکن میں بھی آفت ہے وہی
اس گلستاں میں بھی انساں کی مصیبت ہے وہی

پیش ہر وقت وہی پیٹ کا دھندا اس کو
جبرِ حالات کا ہردم وہی رونا اس کو

وہی محنت وہی ذلّت ہے مقدر اس کا
وہی حرماں وہی حسرت ہے مقدر اس کا

تغزل میں ان کا انداز قدیم اساتذہ کا سا ہے :-

پھر وہی ہم ہیں خیالِ رخِ زیبا ہے وہی
سرِ شوریدہ وہی عشق کا سودا ہے وہی
پھر لگی رہنے تصور میں وہ مژگانِ دراز
رگِ جاں میں خلشِ خارِ تمنّا ہے وہی
پھر ہوئی لیلیٰ و مجنوں کی حکایت تازہ
ان کا عالم وہی نیرنگ کا نقشہ ہے وہی

☆ ☆ ☆

کتابیات

آزاد ، محمد حسین	نظمِ آزاد	لاہور ۱۹۲۸ء
اسمٰعیل میرٹھی	کلیاتِ اسمٰعیل	میرٹھ ۱۹۱۰ء
اعجاز حسین	مختصر تاریخِ ادبِ اردو	اردو اکیڈمی کراچی ۱۹۵۶ء
پیارے لال شاکر	ادیب	الہ آباد دسمبر ۱۹۱۲ء
حامد حسن قادری	تاریخ و تنقید	آگرہ ۱۹۵۸ء
دیا نراین نگم	زمانہ	کانپور دسمبر ۱۹۱۰ء
رام بابو سکسینہ	تاریخِ ادبِ اردو مترجم طبع دوم نولکشور لکھنؤ	
سرور درگاسہائے	خمخانۂ سرور	
عبدالحلیم شرر	دلگداز	مئی ۱۹۰۰ء
عبدالحئی	گلِ رعنا	اعظم گڑھ ۱۳۷۱ھ
عبدالسلام	شعر الہند حصہ دوم	اعظم گڑھ ۱۹۵۱ء
عبدالغفار سروری	جدید اردو شاعری	حیدر آباد ۱۹۳۶ء
عظمت اللہ خان	سریلے بول	حیدر آباد دکن ۱۹۳۰ء
غلام محی الدین	دو آتشہ	لاہور پرنٹنگ پریس ۱۹۲۴ء
مشرف انصاری	جدید شعرائے اردو	فیروز سنز طبع اول
نادر کاکوری	جذباتِ نادر	اردو اکیڈمی کراچی ۱۹۶۱ء
نیاز فتح پوری	نگار ، جدید اردو شاعری نمبر	کراچی ۱۹۶۵ء

(ج) قومی اور ملی شاعری

اردو شاعری ایک طرح سے ہند اسلامی تہذیب کا تخلیقی اظہار ہے ۔ اس اظہار کا باطن وہ تصورات اور عقائد ہیں جنہیں بنا اسلامی تمدن کی بنیاد قرار دیا جا سکتا ہے ۔ تہذیب و تاریخ کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے یہ امر دلچسپ حقیقت کا درجہ رکھتا ہے کہ اردو شاعری ابتدائی نشو و نما کے مراحل طے کرکے ترقی یافتہ اسلوب کے دور میں اس وقت داخل ہوئی جب مغلیہ تمدن ارتقاء کے ترقی یافتہ مراحل کو حاصل کرنے کے بعد زوال کے آسیب کی گرفت میں آ چکا تھا ۔ گویا ایک مربوط اور منظم معاشرہ اپنی اقدار کی وجہ سے رو بہ انحطاط تھا ۔ اس تمدنی اور معاشرتی تنظیم نے بکھرتے بکھرتے کئی صدیوں کا عرصہ لیا ۔ منظم اقدار کا شیرازہ اتنی جلدی بکھرنا بھی نہیں ، اس کے لیے وسیع تر تاریخی اور زمانی پھیلاؤ کی ضرورت ہوتی ہے ۔ بہر حال مندرجہ بالا تاریخی اور زمانی تناظر کی موجودگی میں کلاسیکی اردو شعراء ، خاص طور پر شمالی ہند کے شعراء کا تہذیبی کردار یہ رہا کہ وہ ایک سطح پر تو مذکورہ تہذیبی اور تمدنی زوال کا ادراک کریں اور دوسری سطح پر اقدار کے اس نظام کو اپنی شاعری میں محفوظ کرنے کی کوشش کریں جو اس طرزِ معاشرت کی اساس تھا ۔

شاعر کے لہجے اور اس کی فکر کی تشکیل میں اس کے انفرادی وجود کے ساتھ ساتھ اجتماعی شعور اور اجتماعی لا شعور بھی اہم کردار ادا کرتے ہیں ۔ اسی وجہ سے شاعری کو ایک مخصوص تہذیب اور تمدن کی آواز بھی سمجھا جا سکتا ہے ۔ اس نظریہ کی روشنی میں اردو شاعری کی مدد سے ہندی مسلمانوں کے اجتماعی شعور کی مختلف تبدیلیوں اور طرزِ احساس کے مختلف پیرایوں کی تاریخ مرتب کی جا سکتی ہے ۔ اس وسیع تر مفہوم میں تو تمام اردو شاعری کسی نہ کسی طرح قومی اور ملّی شعور سے منسلک ہے ، لیکن فی الحال ہمارا زیادہ سروکار اس شاعری سے ہے جس میں قومی اور ملّی شعور کا براہِ راست اظہار کیا گیا ہے ۔

اردو شاعری کا ابتدائی دور دکن کی شاعری کو تسلیم کر لیا گیا ہے ۔ دکنی شاعری فارسی اثرات کے ساتھ ساتھ ہندی اثرات کی بھی واضح طور پر نشان دہی کرتی ہے ۔ دکنی شاعری میں پھولوں ، پھلوں موسموں وغیرہ کا تذکرہ ایک مستقل موضوع کے طور پر وارد ہوتا ہے اور اس شاعری میں دکنی ثقافت کے بنیادی اجزاء پوری طرح موجود

بلکہ اس میں خارجیت کا وہ براہِ راست اسلوب بھی موجود ہے جس سے دہلی کا دبستانِ شاعری بڑی حد تک خالی ہے ۔ تاہم دکنی شاعری کو قومی یا نسلی شعور کی شاعری قرار نہیں دیا جا سکتا ۔ اس شاعری کو مقامیت یا علاقائیت کے عناصر کا ترجمان کہا جا سکتا ہے ۔ دکن میں مقامی جغرافیائی ماحول کی مناسبت سے جو ثقافت موجود تھی اور جس میں فارسی تہذیب کے عناصر بھی موجود ہیں ، دکنی شاعری اسی کی عکاس ہے ۔ قلی قطب شاہ اور دکن کے دوسرے شعراء کو اسی ثقافتی پس منظر کا حصہ سمجھنا چاہیے ۔ ان شعراء کے ہاں جہاں ایک طرف عجمی اسلامی روایت کو مقامی ماحول میں ڈھالنے کا رویہ کارفرما ہے وہیں ہندی گیتوں ، دوہوں اور نظموں سے کسبِ فیض بھی کیا گیا ہے ۔

دکنی شاعری کے بعد اردو کی شعری روایت کا ارتقائی مرحلہ شمالی ہند کی شاعری ہے ۔ دہلی میں ، اردو شاعری کو بڑی ترقی نصیب ہوئی ۔ مختلف اصنافِ سخن میں نمائندہ شاعر پیدا ہوئے اور اسلوب کے ترقی یافتہ نمونے سامنے آنے لگے ۔ دہلوی شعری روایت میں غزل کو مقبول ترین صنفِ سخن ہونے کا شرف حاصل رہا ہے ۔ اٹھارویں صدی کے بتدریج سیاسی انتشار اور اس کے زیر اثر معاشرتی اقدار کی کم ظرفی نے دہلی کے شاعر کو المیاتی کشف اور اس کشف کو حزنیہ لہجہ دیا ۔ سماجی عدم تحفظ ، حملہ آوروں کا خوف ، لوٹ مار اور بکھرتی ہوئی اقدار ، یہ وہ مناظر ہے جس میں دہلوی شعری روایت کا تجزیہ کیا جا سکتا ہے ۔ دہلی کے نمائندہ شعراء کے ہاں مٹتی ہوئی تہذیب کے نقش اور ابتری کی تصویریں نظر آتی ہیں ۔ کہیں کہیں اس صورتِ حال کا اظہار براہِ راست ہوا ہے اور اکثر جگہوں پر غزل کی تشبیہیں ، استعاروں اور تلازمات کے ردے میں مذکورہ واردات کا بیان کیا گیا ہے ۔ دہلوی شاعر کا منظرنامہ اجڑی بستیوں ، بجھتے ہوئے چراغوں ، لٹتے ہوئے قافلوں ، گزرتے ہوئے لشکروں اور بہتے ہوئے خون سے عبارت ہے ۔ یہ مناظر مل کر ایک مٹتی ہوئی تہذیب کا نقش تیار کرتے ہیں ۔ معاشرتی احساس تاریخی جبر کے طور پر دہلوی شعراء کا مقدّر ہے ۔ میر ، سودا ، درد اور دیگر دہلوی شاعروں کے کلام سے ایسے شعروں کی لمبی فہرست تیار کی جا سکتی ہے جن میں 'لمحۂ موجود' کی ابتری کا ماجرا بیان کیا گیا ہے ۔ دہلوی شاعر کا بنیادی طرزِ احساس فنا اور ناپائیداری کے ادراک سے متشکل ہوتا ہے ۔ دہلی کے شعراء نے خارجی ماحول کے انتشار کو داخلی واردات بنانے کی کوشش بھی کی ہے ۔ دہلوی شعری روایت کا ایک بہت بڑا حصہ اس دنیا کا تذکرہ کرتا ہے جسے اصطلاحاً 'انفس' کا نام دیا گیا ہے ۔ اس کے باوجود معروضی اور واقعاتی دنیا کی واردات کا شدید دباؤ بار بار خارج میں پھیلی ہوئی ابتری کی طرف مائل کرتا ہے ۔ دہلی میں لکھی جانے والی غزل میں تلازمات ، تشبیہوں اور استعاروں کا وسیع نظام اس بات کے ثبوت کے لیے کافی ہے ۔

کلاسیکی اردو شاعری جس ما بعد الطبیعاتی نظام کا حصہ تھی اس میں کائنات عالم مثال کا عکس تھی ۔ اشیاء یا مظاہر کی سطح مجازی تھی ، لیکن یہ مجازی سطح عالم حقیقی کا استعارہ تھی اس طرز احساس کی وجہ سے رمزیہ اسلوب کے لیے کافی گنجائش موجود تھی اور غزل میں تلازمات اور استعارے یہ اسلوب تیار کرتے تھے ۔ چونکہ غزل کو اردو کی شعری روایت میں مرکزی حیثیت حاصل رہی ۔ اس لیے اردو شاعری میں رمزیہ لہجہ غالب رہا مگر جیسا کہ پہلے بھی ذکر کیا جا چکا ہے ۔ براہ راست اظہار کی مثالیں بھی کافی ملتی ہیں ۔ براہ راست اظہار کے لیے غزل سے زیادہ بعض دیگر اصناف کو موزوں سمجھا گیا ، قصیدے میں تو مبالغہ ایک خوبی سمجھا گیا ۔ پھر اس کی حدود علیحدہ تھیں لیکن ہزلیات ، ہجویات اور شہر آشوب میں مبالغے کے باوجود اس عہد کے متعلق معلومات کا بہت بڑا ذخیرہ ہی موجود نہیں بلکہ اس قسم کی شاعری اس قومی احساس اور درد کی نشاندہی کرتی ہے جو ہمارے شعراء کا ہمیشہ سے طغرائے امتیاز رہا ہے ۔ ان اصناف میں لہجے کی تلخی اور تندی جذبات کی شدت کو سامنے لاتی ہے ۔ پرانے تہذیبی اور سیاسی نظام کی بنیادی علامتوں کو نشانۂ تضحیک بنایا گیا ہے ، یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ معاشرتی تنظیم کی گرفت کمزور پڑ چکی تھی اور فرد اس تنظیم سے منحرف ہو رہا تھا ۔ سودا کے ہجویہ قصیدے اور شہر آشوب اس کی نمائندہ مثال ہیں ۔ شہر آشوب میں اقتصادی بد حالی ، اقدار کے زوال ، نظم و نسق کی ابتری ، لشکروں کی بے تدبیری اور اہل حرفہ کی کسمپرسی کا واضح نقشہ نظر آتا ہے ۔ شہر آشوب تاریخی دستاویزات کی حیثیت نہیں رکھتے اور نہ ہی شاعر اس واقعہ کا اسیر ہوتا ہے ، مگر شاعر واقعاتی صداقتوں کو تخیلاتی یا امکانی صداقتوں میں تبدیل کر سکتا ہے ۔ شہر آشوب میں واقعاتی صداقتیں بھی موجود ہیں اور بات میں شدت پیدا کرنے کے لیے مبالغے سے بھی کام لیا گیا ہے ۔ لہجے کی تندی کا عالم یہ ہے کہ بادشاہ وقت کو جو پرانے سیاسی نظام کی مرکزی علامت تھی ، نشانۂ تضحیک بنایا گیا ہے ۔ بادشاہ جو کبھی خدا کا عکس تصوّر کیا جاتا تھا ، قائم کے مخمس میں شیطان کے ظلّ کا لقب پاتا ہے :

کیسا یہ شہ کہ ظلم پہ اس کی نگاہ ہے

ہاتھوں سے اس کے ایک جہاں داد خواہ ہے

لٹوا ایک آپ ، ساتھ لٹیری سپاہ ہے

ناموس خلق ، سائے میں اس کے تباہ ہے

شیطان کا یہ ظلّ ہے نہ ظلّ اللہ ہے

حاتم کے شہر آشوب میں مختلف طبقات اور پیشوں سے منسلک افراد کی زبوں حالی کا نقشہ کھینچا گیا ہے اور انقلابِ زمانہ کی کیفیت دکھائی گئی ہے :

حرام خور جو تھے اب حلال خور ہوئے
جو چور تھے سو ہوئے ساہ ، شاہ چور ہوئے

جو زیر دست تھے سو ان دنوں میں زور ہوئے
جنہوں کو زور تھا سو اب مثالِ مور ہوئے

جو خاک چھانتے پھرتے تھے سو ہوئے زردار

سودا کے ایک بند اور بعض دوسرے شعراء کے چند مصرعے صورتِ حال کی مزید وضاحت کے لیے کافی ہیں :

سخن جو شہر کی ویرانی سے کروں آغاز
تو اس کو سن کے کریں ہوش چغد کے پرواز

نہیں وہ گھر نہ ہو جس میں شغال کی آواز
کوئی جو شام کو مسجد میں جائے بہرِ نماز

تو واں چراغ نہیں ہے بجز چراغِ غول

(سودا)

☆ ☆ ☆

نہیں ہے مرثیے سے کم جہان آباد کا حال
اگر لکھوں تو قلم نالہ زن ہوئے کی مثال

(جعفر علی حسرت)

☆ ☆ ☆

زندگانی ہوئی ہے سب پہ وبال
کنجڑے جھینکیں ہیں روتے ہیں بقّال

پوچھ کچھ مت سپاہیوں کا حال
ایک تلوار بیچے ہے ایک ڈھال

بادشاہ و امیر سب قلّاش

(میر تقی میر)

شہر آشوب میں بادشاہ، وزیر اور دنیاوی شوکت کی عمومی علامتیں کیری کیچر (caricature) کی شکل اختیار کر لیتی ہیں -

عام طور پر لکھنوی تہذیب اور لکھنوی شاعری کو دہلوی تہذیب اور شاعری سے بالکل الگ چیز تصوّر کیا جاتا ہے اور دونوں کو متضاد اصولوں کا نمایندہ فرض کیا جاتا ہے، حالانکہ یہ محض ایک التباس ہے - لکھنؤ کسی علیحدہ تہذیبی اکائی کا نام نہیں، دہلوی تہذیب کی توسیع کا نام ہے - کیونکہ دونوں کے تہذیبی اصولوں میں بنیادی فرق نہیں ہے - معاشرتی حالات کے فرق کی وجہ سے البتہ تہذیبی ساخت اور مزاج میں فرق ضرور ملتا ہے، لکھنؤ میں ما بعد الطبیعات کی گرفت ڈھیلی پڑتی ہوئی دکھائی دیتی ہے - اشیاء اور مظاہر کے جوہر کی بجائے ان کا وجود اہمیت حاصل کر لیتا ہے، خارج کے ساتھ حواس کی مدد سے رابطہ استوار ہوتا ہے - مادے کے ساتھ وابستگی کئی سطحوں پہ ہو سکتی ہے - اعلیٰ سطح پر یہ وابستگی معاشرتی انقلاب کا باعث بنتی ہے اور ادنیٰ سطح پر یہ سطحی لذتیت کا رویہ سامنے لاتی ہے - لکھنوی شاعری میں اس لذتیت کی مثالیں جگہ جگہ نظر آتی ہیں کہیں انہوں نے البتہ اس لذتیت سے ماوراء جانے کی کوشش بھی ہے - مادیت کا جو شعور ۱۸۵۷ء کے بعد پیدا ہوا، لکھنوی شاعری اس کا اولین نقش ہے - مگر اس کی سطح ۱۸۵۷ء کے بعد پیدا ہونے والے شعور کی سطح سے مختلف ہے -

نظیر اکبر آبادی کی شاعری میں 'آفاق' کا بھرپور ادراک ہے اگرچہ نظیر قدیم ما بعد الطبیعاتی رویّوں کی نفی نہیں کرتے - تاہم ان کی شاعری اردو کی شعری روایت کو ایک بالکل نئی مظہریات عطا کرتی ہے - نظیر دہلی اور لکھنؤ سے الگ اپنا جہان بساتے ہیں - لکھنؤ میں مرثیے نے خصوصیت کے ساتھ فروغ حاصل کیا - مرثیے ایک طرف زندگی کے المیہ احساس کے مظہر تھے، دوسری طرف انسانی رشتوں کی حرمت کے آئینہ دار تھے - سب سے بڑھ کر یہ کہ مذہبی عقائد کی سطح پر یہ اسلامی تاریخ کے مختلف جذباتی سانچوں کو سامنے لاتے ہیں - مرثیے کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان میں عربی فضا کو مقامی ماحول کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی گئی ہے - یہ بھی ہند اسلامی تہذیب کے طرزِ احساس کی ایک شکل ہے -

۱۸۵۷ء تک معاشرتی اور تہذیبی زوال اپنے انجام کو پہنچتا ہے - غیر ملکی اقوام کے غلبے کے خلاف حیدر علی، ٹیپو سلطان، سراج الدولہ وغیرہ مزاحمت کے استعارے ہیں - لیکن ہندی مسلمانوں کے نفاق نے ان کی شکست کو تاریخی طور پر مقدر کر دیا تھا - ۱۸۵۷ء سے پہلے اردو شاعری میں ایک آدھ ایسی مثال بھی ملتی ہے کہ شاعر نے

اپنے آپ کو باقاعدہ کسی تحریک کے ساتھ ذہنی طور پر وابستہ کرنے کی کوشش کی ہو۔
مومن نے سید احمد شہید کی تحریک سے ذہنی وابستگی کا اظہار کیا ہے۔

غالب کی شاعری اردو کی شعری روایت میں کئی وجوہات کی بناء پر بے حد اہم ہے۔ غالب کی شاعری میں ایک طرف تو قدیم ما بعد الطبیعاتی فکری روّیوں کا آخری مرتبہ بھرپور اظہار ہوا دوسری طرف بکھرتے ہوئے ٹکڑوں کو سمیٹنے کی آخری کوشش ہے۔ ۱۸۵۷ء انگریزوں کے ہندوستان پر باقاعدہ قبضے کا سال ہے اور عموماً اپنی سہولت کے لیے اسی کو نئے طرزِ احساس کا نقشِ اول قرار دے دیا جاتا ہے۔ حالانکہ اس طرزِ احساس کی ابتدا کا سراغ اس سے پہلے بھی لگایا جا سکتا ہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد وہ ما بعد الطبیعات ختم ہوئی ہے جس میں عالم حلقۂ دامِ خیال تھا۔ جاگنے کی حدیں خواب کے ساتھ ملی ہوئی تھیں اور شہود غیب کا مظہر تھا۔ اب نئے تقاضے تھے، نئے حاکموں کے پاس طاقت بھی تھی اور مادی رویوں کی چمک دمک بھی۔ ان حالات میں ہندوستانی مسلمانوں کے ایک با شعور طبقے نے مفاہمت کے روّیے کو نجات کی راہ سمجھا۔ سر سید احمد خان اور ان کے رفقاء نے اس خلیج کو پاٹنے کی کوشش کی جو ہندی مسلمانوں اور انگریز حاکموں کے درمیان حائل تھی۔ پرانے ما بعد الطبیعاتی تصوّرات کو ردّ کرکے نئے حالات کے لیے نیا فکری نظام پیدا کیا جو پرانے علامتی نظام سے بالکل علیحدہ تھا۔ نئے فکری نظام میں شعور کو مادے کے تابع کیا گیا۔ عقل اور منطق کو مرکزی حیثیت دی گئی اور کائنات کو موجود سمجھ کر اپنے حالات کی اصلاح کی کوششیں شروع ہوئیں۔ اس نئے شعور کو تمام لوگوں نے قبول نہیں کیا۔ اس لیے اس کی شدید مخالفت بھی ہوئی۔ سر سید تحریک میں اصلاح کا ہمہ گیر منصوبہ تیار کیا گیا۔ مذہبیات، علم الکلام، ادب غرض زندگی کے ہر شعبے میں اصلاح کی کوشش کی گئی۔ حالی اور آزاد نے قدیم اردو شاعری کو عقلی روّیوں اور اصلاحی رجحان کی کسوٹی پر پرکھا تو انہیں اس شاعری میں بہت سی خامیاں نظر آئیں اور ایسا ہونا بالکل فطری تھا کیونکہ اردو کی کلاسیکی شعری روایت منطق اور اصلاح کے روّیوں کی پابند نہیں تھی۔ نئی شعریات کے علمبرداروں کے نزدیک پرانی شاعری میں ہندوستان کی جھلک نظر نہیں آتی تھی۔ یہ شاعری مصنوعی جذبات کی پیداوار تھی اور اس میں سچائی کا عنصر کم تھا۔ دیکھا جائے تو یہ سب کچھ طرزِ احساس کے اختلاف کے سبب تھا۔ قدیم شاعر مظاہر اور موجودات کو علامتیں فرض کرتے تھے، مگر نئی منطق کا تقاضا تھا کہ مظاہر اور موجودات کو فی نفسہٖ شاعری میں جگہ دی جائے۔ نئی شعریات استعارے کے حسن کی منکر تھی اس کا مطالبہ تھا کہ معروض کو براہِ راست سامنے لایا جائے۔ یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ زندگی کے تخیلاتی روّیے ختم ہو رہے ہیں اور منطقی روّیے سامنے آ رہے ہیں۔ اب گویا حقیقت اور تاریخی صورتِ حال

کا براہِ راست ادراک کیا جانا ضروری تھا ۔ حالی ، آزاد اور ان کے ہم عصروں کی شاعری کا منظرنامہ ایک طرف مظاہرِ فطرت اور موجودات کی عکاسی سے تیار ہوتا ہے تو دوسری طرف یہ شاعری ایک تہذیبی اور ملّی آشوب کا تذکرہ کرتی ہے ۔

تہذیبی آشوب کا واضح عکس ۱۸۵۷ء کے بعد لکھے گئے شہر دہلی کے مرثیوں میں نظر آتا ہے ۔ دلی کی 'موت' ایک تہذیب کی موت تھی ۔ شہر صرف آبادی ، بام و در اور بازاروں ہی سے تشکیل نہیں پاتا ۔ اس کے باطن میں مخصوص فکری روّیے پوشیدہ ہوتے ہیں اور ان فکری روّیوں کی موت ہی کو شہر کی موت کہا گیا ہے :

لے کے داغ آئے گا سینے پہ بہت اے سیّاح
دیکھ اس شہر کے کھنڈروں میں نہ جانا ہرگز

چپے چپے پہ ہیں یاں گوہرِ یکتا تہِ خاک
دفن ہوگا کہیں اتنا نہ خزانہ ہرگز
(حالی)

☆ ☆ ☆

یہ وہ جگہ ہے کہ عبرت یہ عبرت آتی ہے
یہ وہ جگہ ہے کہ شامت پہ شامت آتی ہے

یہ وہ جگہ ہے کہ آفت پہ آفت آتی ہے
یہ وہ جگہ ہے کہ حسرت پہ حسرت آتی ہے

یہ وہ جگہ ہے جہاں بے کسی بھی ڈر جائے
یہ وہ جگہ ہے اجل خوف کھا کے مر جائے
(داغ)

یہ تہذیبی آشوب حالی کی شاعری میں وسعت اور پھیلاؤ اختیار کرتا ہوا نظر آتا ہے ۔ حالی شہر آشوب کو قومِ آشوب بلکہ ملّتِ آشوب بنا دیتے ہیں ۔ حالی کی دو نظمیں 'شکوۂ ہند' اور 'مسدس مد و جزر اسلام' اس سلسلے کی نمائندہ مثالیں ہیں ۔ 'شکوۂ ہند' ایک تہذیبی واسوخت ہے، اس میں حالی شہر کے آشوب کی داستان کو قوم کے آشوب تک پھیلاتے ہوئے نظر آتے ہیں ۔ اس نظم کا ایک ایک بند خوف ناک اور ڈراؤنے روپ کا مظہر ہے ۔ حالی کے آشوب کی شناخت اور تفسیر کے لیے ماضی کی جانچ بھی شروع کی گئی ، اس عہد میں تاریخ سے مختلف دانش وروں کی دلچسپی اسی رجحان کی آئینہ دار ہے ۔ یہ تاریخی شعور حالی کی

شاعری میں بھی نظر آتا ہے ، وہ ملی آشوب کو تاریخی تناظر مہیا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اسی تناظر میں ماضی اور حال کے تضاد کو واضح کرتے ہیں ۔ ماضی ان کے نزدیک شوکت کا نشان ہے اور حال بے وقعتی کا ۔ دہلی کے مرثیے لکھنے والے شعراء اور حالی کے لہجے کی ایک سطح 'عہد نامہ' قدیم' کی بعض تحریروں کے مشابہ ہے جن میں یروشلم کی تباہی کا ذکر ہے ۔ مگر ہمارے شعراء کی نظموں میں کہیں کہیں امید افزا دعائیں بھی موجود ہیں ۔ حالی کو پڑھتے وقت بعض اوقات ہمیں محسوس ہونے لگتا ہے جیسے ادبار کی گھٹا اب ملت کی دائمی تقدیر بن چکی ہے اور اس سے بچنے کی کوئی راہ باقی نہیں رہی ، مایوسی کی تاریکی بے حد گہری ہے اور امید کا کہیں گزر نہیں ، یہ اس عہد کے دانش وروں کا مشترکہ احساس ہے ، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کو قوم کی نشاۃ الثانیہ کا بالکل یقین نہیں تھا اگر ایسا ہوتا تو وہ عملی طور پر اصلاح کی کوشش ہی کیوں کرتے ۔ امید کا ایک سہارا ہر طور موجود تھا ۔ اردو کی قومی اور ملی شاعری میں یہ بات بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ اس عہد کے شاعروں نے آشوب کی انتہا کے دوران بھی رجائیت اور امید کے احساس کو گم نہیں کیا ۔ اپنی طویل نظم 'مسدس مد و جزر اسلام' میں حالی نے مذکورہ بالا تمام رجحانات کی نمائندگی کی ہے ۔ مسدس میں تاریخی احساس ، حال کے آشوب کا بھرپور اظہار اور ماضی و حال کا تضاد ، سب چیزیں نمایاں ہیں ۔ شوکتِ رفتہ کا رجز بھی ہے اور حال کی بے وقعتی کا ماتم بھی :

وہ ملت کہ گردوں پہ جس کا قدم تھا
ہر اک کھونٹ میں جس کا برپا علم تھا

وہ فرقہ جو آفاق میں محترم تھا
وہ امت لقب جس کا خیر الامم تھا

نشاں اس کا باقی ہے صرف اس قدر یاں
کہ گنتے ہیں اپنے کو ہم بھی مسلماں

وگرنہ ہماری رگوں میں لہو میں
ہمارے ارادوں میں اور جستجو میں

دلوں میں زبانوں میں اور گفتگو میں
طبیعت میں فطرت میں عادت میں خو میں

نہیں کوئی ذرہ نجابت کا باقی
اگر ہو کسی میں تو ہے اتفاق

مولانا محمد حسین آزاد نئی شاعری کے محرک تھے ، انہوں نے جدید شاعری کے اصولوں کی تفسیر کی ، آزاد کی شاعری میں اخلاق لہجہ نمایاں ہے ۔ اولوالعزمی ، بہادری اور نیک چلنی کی تلقین ہے ۔ قومی درد بھی نمایاں ہے مثنوی 'حبِ وطن' کے چند شعر دیکھیے :

کچھ ہو گیا زمانے کا الٹا چلن یہاں
حب الوطن کے بدلے ہے بغضِ وطن یہاں

کب تک شبِ سیاہ میں عالم تباہ ہو
اے آفتاب ادھر بھی کرم کی نگاہ ہو

الفت سے گرم سب کے دلِ سرد ہوں بہم
اور جو کہ ہم وطن ہوں وہ ہم درد ہوں بہم

تا ہو وطن میں اپنے زر و مال کا وفور
اور مملکت میں دولت و اقبال کا وفور

نئی شعریات میں اشیاء کے وجود کو ان کے جوہر پر تقدیم حاصل ہوئی اس کے ساتھ ہی اخلاقی نقطۂ نظر کی تبلیغ کا کام شروع ہوا ، چنانچہ تمثیل کا اسلوب بھی مقبول ہوا ۔ نیک نیتی ادب کی تخلیق کا بنیادی محرک ٹھہری ۔ اخلاقی اقدار اور نیک نیتی کی تبلیغ کرتی ہوئی شاعری اس وقت موضوع کے دائرے سے کچھ باہر ہے ۔ البتہ اس سے طرزِ احساس کی تبدیلی پر روشنی ضرور پڑتی ہے ، اگر پرانے طرزِ احساس کی روشنی میں دیکھا جائے تو یہ منظومات اکھری اور سپاٹ نظر آتی ہیں ۔ بالکل اسی طرح جیسے نئے طرزِ احساس کی طرف کھڑے ہو کر دیکھنے سے کلاسیکی شاعری مصنوعی نظر آتی ہے ۔ کلاسیکی شعریات اور جدید شعریات کے تحت تخلیق کی گئی شاعری کی تحسین دونوں کے اپنے اپنے اصولوں اور تقاضوں کے تحت ہی ہو سکتی ہے ۔

سر سید کی تحریک میں معاشرتی اصلاح کا محور تعلیم کو قرار دیا گیا تھا اور ہندوستانیوں کی پسماندگی کا اصل سبب جہالت کو ٹھہرایا گیا تھا ۔ چنانچہ تعلیم کے فروغ کے لیے عملی اقدام کیے گئے ، خاص طور پر انگریزی کی تعلیم کا منصوبہ تیار کیا گیا تاکہ زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دیا جا سکے ۔ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ جلسے اس عہد میں قومی مزاج کے مختلف پہلوؤں کے عکاس ہیں ۔ ان جلسوں میں پڑھی گئی نظمیں قومی اور ملّی شعور کی آئینہ دار ہیں ۔ ان جلسوں میں نظمیں پڑھنے والے شعراء میں حالی ، شبلی ، ڈپٹی نذیر احمد ، خوشی محمد ناظر ، احمد علی شوق ، اسماعیل میرٹھی ، مولوی امجد علی اشہری ، وحید الدین سلیم ، فضلِ حق ، آزاد ، نہال الدین سنجر طہرانی ، مولوی عبدالمجید لاہوری ، مولانا ظفر علی خان اور بے شمار دوسرے شاعر شامل ہیں ۔

ان جلسوں میں پڑھی جانے والی نظموں میں ظاہر ہے کہ مقصدیت کا غلبہ ہے، ان نظموں کی تخلیق ہی اصلاحی مقاصد کے تحت ہوئی، اس لیے ان میں براہِ راست اظہار کا اسلوب اختیار کیا گیا ہے، سادگی سے کام لیا گیا ہے تاکہ نظم کے مفاہیم کا فوری ابلاغ ہو سکے۔ ان نظموں میں بہت سی نظمیں ہیں جو اپنے دامن میں شعری تاثیر بھی لیے ہوئے ہیں۔ بہت سی نظمیں ایسی بھی ہیں جن کا فنی پہلو کمزور ہے اور صرف قومی درد اور نیک نیتی ان کی خصوصیات ہیں۔ بعض نظمیں فارسی زبان میں ہیں۔ ان نظموں کا مجموعی رویہ خطابت کا ہے، سامعین کی موجودگی شاعر کو مجبور کرتی تھی کہ وہ اجتماعی احساسات کو قلمبند کرے اور خطابت سے کام لے، ان نظموں کا اسلوب ان تمام عناصر سے تشکیل پاتا ہے جو اچھی خطابت کے لیے ضروری ہیں۔ طنز طعنے، درد، رقت وغیرہ کے عناصر ان نظموں میں موجود ہیں۔ ہیئت کے لحاظ سے ان تخلیقات میں یکسانیت نہیں پائی جاتی بلکہ تنوع نظر آتا ہے۔ غزل، رباعی، مسدس، مثنوی، قطعہ وغیرہ کی ہیئتوں کو مقاصد کے اظہار کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔

مولانا حالی قومی مسائل پر نظمیں لکھنے والوں میں سرِ فہرست ہیں انہوں نے علی گڑھ تحریک کے مشن کے لیے اپنی شاعری کا رخ ہی تبدیل کر لیا تھا اور اس تحریک کے مقاصد ان کے لیے جزوقتی مشغلہ نہیں اسلوبِ زیست بن چکے تھے۔ ان کی بعض نظموں کا حوالہ دیا جا چکا ہے۔ کانفرنس کے جلسوں میں پڑھی جانے والی منظومات میں انہوں نے علم کی اہمیت پر زور دیا ہے۔ 'درس گاہ' حالی کی نظموں میں قوم کی نشاۃ الثانیہ کا مظہر ہے:

یہ دارالعلم سدِّ راہ آسیبِ زماں ہوگا
اسی دارالشفاء میں بختِ پیر اپنا جواں ہوگا

نہیں صورت ابھرنے کی ہماری کوئی پستی سے
اگر ہوگا اسی گھر سے بلند اپنا نشاں ہوگا

کمی نے کر دیا ہے علم کی ہم کو سبک سب سے
اسی پاسنگ سے ہوگا تو یہ پلہ گراں ہوگا

یہ بیت العلم روز افزوں ترقی کا ہے سرچشمہ
اسی چشمے سے دیکھو گے کہ اک دریا رواں ہوگا

مولانا شبلی نے فارسی اور اردو دونوں زبانوں کو ذریعۂ اظہار بنایا ہے۔ شبلی کی شاعری میں عظمتِ رفتہ کا احساس، تاریخی شعور اور عمل کے لیے بیداری کے رویے نمایاں ہیں۔ شبلی فارسی کا رچا ہوا شعور بھی رکھتے تھے ان کی فارسی منظومات دامن کشِ دل ہیں۔

ڈپٹی نذیر احمد کی نظموں میں نثریت نمایاں ہے ۔ وحید الدین سلیم کی شاعری کی بھی یہی کیفیت ہے ۔ کچھ شاعروں نے محاسنِ شعری کی طرف بھی توجہ کی ہے ۔ اسماعیل میرٹھی اور خوشی محمد ناظر کے نام اس سلسلے میں اہم ہیں ۔ ان شاعروں نے تشبیہوں ، استعاروں اور منظر نگاری سے کام لیا ہے ۔ اس رجحان کی مثالیں بعض دوسرے شاعروں کے ہاں بھی نظر آتی ہیں ۔ چند مثالیں اس بات کی وضاحت کے لیے کافی ہوں گی ۔ یہ مثالیں ایسی منظومات سے لی گئی ہیں جو قومی اور مسلکی موضوعات پر لکھی گئی ہیں لیکن شعری اسلوب کا رنگ یہ ہے :

چاندنی رات تھی کل پیرِ فلک کی مہماں
کہ سرِ شام سے تھا صبحِ منوّر کا گماں

سطحِ غبرا پہ تھا اس طرح پڑا عکسِ قمر
صاف دھوئی ہوئی جس طرح بچھی ہو چادر

عالم نور وہ ہر شے پہ نظر آتا تھا
جلوۂ تابشِ خورشید کو شرماتا تھا

چرخ پر عقدِ ثریا کی نمایاں تھی بہار
جس طرح گردنِ مہوش میں جڑاؤ کوئی ہار

منتشر چرخ پہ ہر ایک طرف سے اختر
جس طرح ہار کے ٹوٹے ہوئے موتی اکثر

(ارتضیٰ علی کاکوروی)

☆ ☆ ☆

کل خوابِ گراں جو مجھ پہ آئی — اک صورت پاک دی دکھائی
چہرے پہ برس رہے تھے انوار — بشرے پہ جلال بادشاہی
سر پہ تھی کلاہ خسروانہ — عطر اور عبیر میں بسائی
تھی اس کی رضا میں جوئے رضواں — تھا پیراہن اس کا سبزکائی
تھی ریش دراز پیراہن پر — یا قلعۂ کوہ پہ برف چھائی
قامت تھا کہ شاخِ نخل طوبیٰ — صورت تھی کہ شانِ کبریائی
تھی آنکھ ستارۂ ہدایت — ماتھا مہتاب رہ نمائی

(خوشی محمد ناظر)

سر سید کی تحریک کا بھرپور ردِ عمل اکبر الہ آبادی کی شاعری کی صورت میں ظاہر ہوا ۔ اکبر کی شاعری مادیت اور عقلیت کے رویوں سے متشکل ہونے والے جدید شعور کی نفی کرتی ہے ۔ اکبر نے مادیت کی علامتوں اور جدیدیت کے استعاروں کو تمسخر کا نشانہ بنایا ہے ۔ اکبر نے اپنے لیے مزاحیہ اسلوب کو منتخب کیا ۔ اکبر کا خیال تھا کہ مسلمان جدید ایجادات اور مغرب کی مادی ترقی سے مرعوب ہو کر اپنی تہذیب کے باطنی تصورات کو فراموش کر رہے ہیں اور مغربی تمدن کا مضحکہ خیز چربہ اتار کر ابن الوقتی کا مظاہرہ کر رہے ہیں :

اک برگ مضمحل نے یہ اسپیچ میں کہا
موسم کی کچھ خبر بھی ہے اے ڈالیو تمہیں

اچھا جواب خشک یہ اک شاخ نے دیا
موسم سے با خبر ہوں تو کیا جڑ کو چھوڑ دیں

اکبر کو اردو کی طنزیہ شاعری کا امام اسی لیے قرار دیا جاتا ہے کہ ان کا طنز کسی محدود تناظر کی بجائے وسیع تر تہذیبی صورت حال سے پیدا ہوتا ہے ۔ اکبر نے اپنے طنز کو تہذیبی مسائل کی تفتیش کا ذریعہ بنایا ہے ۔ اکبر نے عقلیت اور منطق پسندی کی حد سے بڑھتے ہوئے رجحان کی نفی کی ہے ۔ ان کے نزدیک ہماری تہذیب کی جڑ مذہب میں تھی اور اس جڑ سے کٹ جانا ان کے لیے تہذیبی موت کا درجہ رکھتا تھا ۔ اکبر کا قومی اور ملی شعور اسی نظریے سے پیدا ہوتا ہے :

کون کہتا ہے تکلف سے نہ کر زیست بسر
کون کہتا ہے نہ کر وضع میں جوبن پیدا

بس یہ کہتا ہوں کہ ملت کے معانی کو نہ بھول
راہ قومی کا تو خود ہی نہ ہو رہزن پیدا

قوم قوم آٹھ پہر سنتے ہیں ہم قوم کہاں
تار باقی نہیں تو کرتا ہے دامن پیدا

مذہبی شاخ فقط ہے تیری قومی ہستی
یہ جو ٹوٹی تو نہیں کوئی نشیمن پیدا

اکبر مادی ترقی کے بالکل منکر نہ تھے وہ نوجوانوں کو تہذیب ، صنعتیں ، ہنر سیکھنے کا مشورہ بھی دیتے ہیں اور دوسری اقوام کے تجربات سے فائدہ اٹھانے کی نصیحت بھی کرتے

ہیں ، مگر وہ یورپ کے اثرات کی اندھا دھند تقلید کو جڑ سے کٹ جانا قرار دیتے ہیں :

ہم نے مانا کہ کہیں تیز چلی ہیں لیکن

آپ شہتیر نہیں ہیں کہ چرے جاتے ہیں

سر سید اور اکبر دونوں کا قومی درد نیک نیتی اور خلوص پر مبنی ہے گو دونوں کی راہیں بالکل الگ ہیں ۔

بیسویں صدی کے آغاز میں وطن پرستی کا جذبہ پیدا ہوا ۔ یہ وہ دور ہے جس میں سیاسی سطح پر ہندو مسلم اتحاد کی کوششیں ہو رہی تھیں اور جغرافیائی یگانگت کی بنیاد پر ذہنی یگانگت پیدا کرنے کی سعی ہو رہی تھی ۔ آگے چل کر یہ کوششیں بے ثمر ثابت ہوئیں اور تہذیبوں کا اختلاف ایک حقیقت ٹھہرا ۔ اقبال کی ابتدائی شاعری میں وطنیت کا رویہ نمایاں ہے ، لیکن اقبال کی شاعری کو وسیع تناظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے کیونکہ بیسویں صدی کی قومی اور ملّی شاعری میں اقبال کی حیثیت مرکزی ہے ۔

سر عبدالقادر کے رسالے 'مخزن' کو جدید اردو نظم کے فروغ میں خصوصی اہمیت کا حامل سمجھا جاتا ہے ۔ 'مخزن' کے شاعروں میں بلا شبہ اقبال کا نام سرِ فہرست ہے ۔ اقبال کی ابتدائی شاعری مناظرِ فطرت کے ساتھ شغف ، وطنیت کے شعور اور انگریزی منظومات سے اخذ و استفادے کی مظہر ہے اور یہی 'مخزن' کے شعراء کی بنیادی خصوصیات ہیں ۔ 'مخزن' میں شائع ہونے والی شاعری کو 'نیچرل شاعری' ، 'رومانی شاعری' ، 'وطنیت پسندی کی شاعری' اور 'اخذ و ترجمہ' کی ذیل میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ۔ 'مخزن' کے شعراء میں بہت سے ایسے شاعر تھے جن کا تذکرہ پہلے کیا جا چکا ہے ، بہت سے ایسے شعراء ہیں جن کا نام اردو نظم میں خاصا مشہور ہے ، لیکن وہ زیرِ نظر موضوع کی حدود سے باہر ہیں ۔ 'مخزن' میں قومی اور ملّی شعور نے زیادہ تر وطن پرستی کے رجحان ہی میں اپنا اظہار کیا ہے ۔ اس سلسلے میں ہندو مسلم اتحاد کی تلقین بھی بار بار سامنے آتی رہی اور یہ تلقین مسلمان اور ہندو دونوں فرقوں سے تعلق رکھنے والے شاعر کرتے رہے ۔ ان شعراء کا بنیادی لہجہ اقبال کے 'نیا شوالہ' سے مماثل تھا :

اے گلشن وطن ہے وہ فردوس عام تو

اسلام و کفر سے نہیں رکھتا ہے کام تو

(محمد حسین اختر)

ناقوس اور اذاں میں نہیں قید کفر و دیں
اس کے لیے کہ جس کا پرستش کدہ ہے تو
(سرور کانپوری)

حالی ، اکبر الہ آبادی اور اقبال کے علاوہ 'مخزن' کے ان شاعروں میں جنھوں نے قومی موضوعات پر لکھا ، بے شمار مشہور اور گمنام شعراء شامل ہیں - چند نام درج ذیل ہیں :

شاہ دین ہمایوں ، غلام بھیک نیرنگ ، آغا حشر ، محمود شیرانی ، سید نذیر حسین ، قمرالدین قمر ، عبدالرشید چشتی وغیرہ -

آغا حشر کی نظم 'شکریہ یورپ' ، محمود شیرانی کی 'ٹیپو سلطان' ، ہمایوں اور نیرنگ کی متعدد منظومات ، عبدالرشید چشتی کی 'سپوت بیٹا' ، محمد حسن اختر کی 'حب وطن' ، سید نذیر حسین کی صدائے قومی' اور دیگر شعراء کی کئی نظمیں مذکورہ بالا رجحانات کے عملی نمونے ہیں -

نواں باب

محمد حسین آزاد

سوانح

محمد حسین آزاد بتاریخ ۱۰ جون ۱۸۳۰ء بروز جمعرات دہلی میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام محمد باقر تھا، جن کا شمار دہلی کی ممتاز شخصیتوں میں ہوتا تھا۔ آپ ایک مشہور صحافی تھے جنہوں نے ۱۸۳۶ء میں 'دہلی اردو اخبار' جاری کرکے شمالی ہند میں اردو صحافت کی بنیاد ڈالی۔

ابتدائی تعلیم کے بعد آپ ۱۸۴۶ء کے قریب دہلی کالج میں اماسیہ جماعت میں داخل ہوئے اور چار سال بعد فارغ التحصیل ہو کر صحافت میں اپنے والد کا ہاتھ بٹانے لگے۔

اگرچہ آزاد نے زمانۂ طالب علمی میں انگریزی تعلیم حاصل نہیں کی، لیکن فلسفہ اقتصادیات، تاریخ وغیرہ کی مستند تصانیف کے تراجم کی مدد سے جو داخلِ نصاب تھیں آپ نے علومِ مروّجہ میں اچھی خاصی استعداد پیدا کر لی تھی۔ یہیں سے ان کی اس وسعتِ نظر اور جدید رجحانات میں دلچسپی کا آغاز ہوتا ہے، جنہیں بعد میں لاہور کی علم دوست فضا میں مزید نشو و نما کے مواقع میسر آئے۔

تعلیم

دہلی میں آزاد کے زمانۂ تعلیم کے ایک اہم واقعہ کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اگرچہ اس کا آزاد سے بلا واسطہ کوئی تعلق نہیں۔ ہماری مراد اس مناقشہ سے ہے جس میں آزاد کے والد مولوی محمد باقر اور قاری جعفر علی جو کسی وقت مولوی محمد باقر کے رفقاء میں سے تھے اور ان دنوں دہلی کالج میں بحیثیت اسناد ملازم تھے، دو متخالف علمائے دین کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتے ہیں۔ یہ بات اب پایۂ ثبوت تک پہنچ چکی ہے کہ اس نزاع کی بنیاد چند فقہی مسائل تھے جن کی روداد یہاں ضروری معلوم نہیں ہوتی۔ صرف یہ بتا دینا ضروری ہے کہ مولوی محمد باقر ایک روشن خیال اور وسیع المشرب عالم تھے۔ اور انہیں انتہا پسند شیعہ حضرات کے بعض رسوم و رواج اور اعتقادات سے اتفاق نہ تھا۔ اس کے برعکس قاری جعفر علی پرانی وضع کے راسخ العقیدہ عالم تھے۔ رفتہ رفتہ ان مباحث نے

مناقشہ کی صورت اختیار کر لی ، جس کی وجہ سے دہلی کی شیعہ آبادی دو گروہوں میں بٹ گئی ۔ معاملہ نے یہاں تک طول کھینچا کہ مخالف گروہ نے مولوی محمد باقر کو خارج از اسلام قرار دے کر ان کی تکفیر کا فتویٰ چھپوا دیا ۔

دہلی کالج

جیسا کہ متوقع تھا ، ان مباحث میں آزاد نے اپنے والد کا ساتھ دیا ۔ یہ ان کا دہلی کالج میں تعلیم کا زمانہ تھا اور چونکہ فارسی جعفر علی کالج میں ملازم تھے اس لیے مسائلِ زیرِ بحث پر گاہ بگاہ استاد اور شاگرد میں رد و قدح کی نوبت آ جاتی ۔ رفتہ رفتہ یہ معاملات اتنے ناگوار ہو گئے کہ پرنسپل نے آزاد کو امامیہ جماعت سے اہلِ سنت جماعت میں منتقل کر دیا ۔

آزاد کی طبیعت پر اس مناقشہ کا یہ اثر ہوا کہ انہیں مذہبی تعصب اور تنگ دلی سے نفرت ہوگئی ۔ چنانچہ آزاد کی تصانیف ، خصوصاً 'دربارِ اکبری' میں مذہبی رواداری نے ایک مستقل موضوع کی شکل اختیار کر لی[۱]

اوپر کہا گیا ہے کہ دہلی کالج میں تعلم کی وجہ سے آزاد کے خیالات کا رخ بدل گیا تھا اور ان میں تعلیم و تہذیب کے جدید رجحانات سے مناسبت پیدا ہو گئی تھی ، لیکن یاد رہے کہ مغربی تہذیب سے اثر پذیری ان کی طبیعت کا صرف ایک رخ ہے ۔ ان کی طبیعت کا دوسرا رخ جو ان کے اور اس دور کے دیگر مشہور ادباء ، مثلاً سید احمد خان ، حالی اور شبلی کے درمیان مابہ الاعتبار ہے ، ان کا ماضی سے یا پرانی تہذیب سے جذباتی لگاؤ ہے ۔ ماضی سے یہ جذباتی تعلق آزاد کی طبیعت کا ایک مستقل رنگ ہے ، جسے ان کا عہدِ جدید کی گونا گوں سرگرمیوں میں انہماک محو کرنے یا دبانے میں قاصر رہا ۔ دل و دماغ کی یہ کشمکش ماضی سے یہ جذباتی رشتہ اور عہدِ جدید سے فکری مناسبت ، نفسیاتی لحاظ سے آزاد کی تصانیف کی نمایاں ترین خصوصیت ہے ۔ آخر اس کا کیا سبب ہے کہ ان کی سب کی سب مستند تصانیف ماضی سے تعلق رکھتی ہیں ۔

تلمذ

بحیثیت شاعر آزاد کو ذوق سے تلمذ تھا اور ماضی میں اس صحت مند انہماک کو ذوق کی صحبت سے مزید تقویت پہنچی ۔ مولوی محمد باقر اور ذوق کے نہایت گہرے دوستانہ

---

(۱) محمد صادق ، ڈاکٹر ، آب حیات کی حمایت میں اور دوسرے مضامین ۔
ص ۳۸۲ ، ۳۸۳ ، مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۷ء ۔

تعلقات تھے اور آزاد کو بچپن ہی سے ان کی صحبت سے مستفید ہونے کے مواقع ملنے لگے تھے ۔ آزاد 'مقدمہ' دیوان ذوق' میں لکھتے ہیں :

"والد مرحوم کا اور ان کا آغاز تحصیل میں ساتھ ہوا تھا ۔ ساتھ پڑھے ، ساتھ بڑھے ، ہر معرکہ میں شریک حال رہے اور تھوڑے ہی فاصلہ میں دنیا سے رخصت ہوئے ۔ بیس برس تک اس طرح حضوری خدمت رہی کہ ہر وقت پاس بیٹھ کر ظاہر و باطن کے فوائد حاصل کرنا ، جو حال نہیں دیکھے، وہ بھی اس طرح سنے ہیں گویا سامنے گزرے ہیں"(۱) ۔

ذوق کو شعرائے قدیم اور معاصر شعراء کی معرکہ آرائیوں ، ان کی رقابتوں ، عداوتوں ، عادات و مشاغل کے قصے خوب یاد تھے ۔ خلوت و جلوت ، چھل قدمی اور مشاعروں و بحث و مباحث کے دوران ان کا ذکر رہنا اور ذوق انہیں خوب مزے لے لے کر بالتفصیل بیان کرتے ۔ اس کا ازاد کے ذہن پر گہرا اثر ہوا ۔ بعد میں جب زمانہ نے ورق الٹا اور پرانی تہذیب کے نقوش بتدریج مٹنے لگے تو یہی بدلتے ہوئے حالات اور پرانی روایات سے دل بستگی 'آب حیات' کی تصنیف کے باعث ہوئے ۔

۱۸۵۷ء کا ہنگامہ آزاد کی زندگی میں ایک خط فاصل کا کام کرتا ہے ۔ میں ایک اور تصنیف میں یہ ثابت کر چکا ہوں کہ ایام غدر میں مولوی محمد باقر نے عملی طور پر حریت پسندوں کا ساتھ دیا تھا ۔ نہ صرف یہ بلکہ ان کی قیادت بھی کی تھی ۔ بہت دیر تک یہی خیال رہا کہ مولوی محمد باقر بالکل بے قصور تھے ۔ انہوں نے غدر میں حصہ نہیں لیا تھا اور ہزاروں اور مسلمانوں کی طرح وہ فاتحین کے غیظ و غضب کا شکار ہوئے تھے ، لیکن اصل واقعہ یہ ہے کہ انہیں قلعہ سے گہرا تعلق تھا اور انہیں سزائے موت دینے میں انگریزوں کے لیے بحیثیت حکام وقت کچھ جواد تھا ۔

حکومت کی رائے میں آزاد بھی بغاوت میں شامل تھے ۔ چنانچہ ان کی گرفتاری کے احکام بھی جاری ہوئے ۔ لیکن انہیں بر وقت اطلاع مل گئی اور یہ راتوں رات روپوش ہو کر دہلی سے چل نکلے اور تین چار سال نہایت غربت ، ناداری اور خوف و ہراس کی حالت میں در بدر پھرتے رہے ۔ ۱۸۶۴ء میں لاہور پہنچے اور پنڈت من پھول(۲) کی سفارش پر انہیں سر رشتہ تعلیم میں ایک معمولی سی ملازمت مل گئی ۔

---

(۱) محمد صادق ، ڈاکٹر ، آب حیات کی حمایت میں اور دوسرے مضامین ۔ اردو کا پہلا صحافی ۔
(۲) دہلی کالج کے طالب علم تھے ۔ غدر کے بعد لیفٹیننٹ گورنر کے میر منشی ہو گئے تھے ۔

آزاد اور لاہور کا ماحول

لاہور میں ان دنوں مغربی تعلیم و تہذیب کا خوب چرچا تھا - پنجاب یونیورسٹی کے رجسٹرار ڈاکٹر لائٹنر ایک مستعد ، با حوصلہ اور صاحب بصیرت شخص تھے - انہوں نے پنجاب کی تعلیمی اور معاشرتی اصلاح کا بیڑا اٹھایا اور اپنے خیالات کو عملی شکل دینے کے لیے ۱۸۶۵ء میں انجمن پنجاب کی بنیاد ڈالی - آزاد اس کی سرگرمیوں میں حصہ لیتے رہے - یہاں تک کہ ۱۸۶۷ء میں ڈاکٹر لائٹنر کی تجویز پر انہیں انجمن پنجاب کا سیکرٹری مقرر کیا گیا -

وہ مضامین جو آزاد نے بالخصوص انجمن پنجاب کے لیے یا اس دوران میں لکھے ، ان میں سب سے پر مغز ان کا وہ مضمون ہے جو حکومت پنجاب کے اعلان انعام کے سلسلے میں انہوں نے 'انسداد دختر کشی' پر لکھا اور جس پر انہیں دوسرا انعام ملا -

بہت عرصہ تک ڈاکٹر لائٹنر کا آزاد سے مربیانہ سلوک رہا - بعد میں ان کے تعلقات بگڑ گئے - لیکن یہ اس واقعہ ہے کہ آزاد کی ترقی کا راز ڈاکٹر لائٹنر کی سرپرستی میں مضمر تھا -

چونکہ اس وقت پنجاب کے مدارس میں تعلیم جدید کا آغاز ہو چکا تھا ، اس لیے محکمۂ تعلیم کو نئی قسم کی درسی کتابوں کی ضرورت تھی - اس سلسلہ میں آزاد نے قابل قدر خدمات سر انجام دیں - اپنی ان کاوشوں کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں :

> ''بڑا حصہ عمر گراں بہا کا سر رشتۂ تعلیم کی ابتدائی کتابوں کی تصنیف میں صرف ہوا - وہ کتابیں نام کو ابتدائی ہیں مگر مجھ سے انہوں نے اس سے بڑھ کر محنت لی ہے - جاننے والے جانتے ہیں کہ جب تک انسان خود بچہ نہ بن جائے تب تک بچوں کے مناسب حال کتاب نہیں لکھ سکتا - پھر انہیں بار بار کاٹنا اور بنانا اور لکھنا اور مٹانا ، بڑا ہو کر بچہ بننا پڑتا ہے - مہینوں نہیں بلکہ برسوں صرف ہوئے ، جب وہ بچوں کے کھلونے تیار ہوئے''(۱) -

آزاد کی ان تصانیف کو ادبی مقام حاصل ہے - اور ان کی دلچسپی میں ذرا

---

(۱) مکتوبات آزاد - ص ۹۵ -

فرق نہیں آیا ۔ ان میں بہ اتفاقِ رائے 'قصصِ ہند' حصہ دوم کو ، ہمارے ادب میں ایک کلاسک کا درجہ حاصل ہے ۔

سیاحت

آزاد کی زندگی کا ایک قابلِ ذکر واقعہ ان کا ترکستان کا سیاسی سفر ہے[1] جو انہوں نے پنڈت من پھول کی قیادت میں ۱۸۶۵ء میں اختیار کیا ۔ اس سفر کا سبب یہ تھا کہ روس عرصہ" دراز سے ترکستان میں پیش قدمی کر رہا تھا اور اب اس کے جارحانہ اقدامات بہت تیز ہو گئے تھے ۔ چنانچہ اس نے خیوا ، بخارا اور خوقند کے بعض علاقوں پر قبضہ بھی کر کے اپنی عمل داری میں داخل بھی کر لیا تھا ۔ حکومتِ ہند کو خدشہ تھا کہ کہیں روس ہندوستان پر حملہ آور نہ ہو جائے ۔ چنانچہ اس خطرہ کے سد باب کے طور پر ایک خفیہ مشن ان ممالک میں بھیجا گیا تاکہ صورت حال کی بابت چشم دید اطلاعات فراہم ہو سکیں ۔ اس سفر کا آغاز جولائی ۱۸۶۵ء میں ہوا اور وہ مارچ ۱۸۶۶ء میں ختم ہوا ۔

اردو ادب کے طالب علم کے لیے یہ سفر اس لیے وقیع ہے کہ آزاد نے اپنے مشاہدات کو 'سخن دانِ فارس' میں نہایت عمدگی سے قلم بند کیا ہے ۔ عدیم الفرصتی کی وجہ سے اسے چھاپنے کی نوبت نہ آ سکی ۔ سفرِ ایران کے بعد جولائی ۱۸۸۶ء میں آزاد نے اس پر نظرِ ثانی کر کے مسودے کو مکمل کیا ، لیکن پھر بھی اشاعت میں دیر ہوتی رہی ، یہاں تک کہ آزاد ایک دماغی عارضہ میں مبتلا ہو گئے اور ۱۹۰۷ء میں اسے آپ کے صاحب زادے محمد ابراہیم نے شائع کیا ۔

۱۸۷۴ء کا مشاعرہ

خالص ادبی خدمات ، خصوصاً اصلاحِ شاعری کے باب میں آزاد کی زندگی میں ۱۸۷۴ء خاص اہمیت رکھتا ہے ۔ اسی سال اس مشہور مشاعرے کی بنیاد ڈالی گئی جس سے ہمارے ہاں جدید شاعری کا آغاز ہوتا ہے ۔

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس مشاعرے کے بانی خود آزاد تھے اور انہوں نے بطور خود اس کی بنیاد ڈالی ، لیکن واقعات سے اس کی تائید نہیں ہوتی ۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ اس کا آغاز حکومت کے ایماء سے ہوا تھا ۔ البتہ یہ

---

(۱) محمد صادق ، ڈاکٹر ، آب حیات کی حمایت میں اور دوسرے مضامین ۔ آزاد کا سفر ترکستان ۔

درست ہے کہ آزاد اس مشاعرہ کے سیکرٹری تھے۔ اس کا ثبوت "کوہ نور" مورخہ ١٦ جولائی ١٨٧٤ء کے ذیل کے اقتباس سے ملتا ہے :-

"یہ جلسہ اس لیے منعقد کیا جاتا ہے کہ نظم اردو جو چند عوارض کے سبب تنزل اور بدحالی میں پڑی ہے، اس کی ترقی کے سامان بہم پہنچائے جائیں۔ اس لیے جملہ رؤسا اور اہلِ علم اور ان لوگوں سے جو شعر و سخن اور تصانیف سے لذت اٹھاتے ہیں درخواست کی جاتی ہے کہ جہاں تک ہو سکے اس کی طرف توجہ کریں ..... نواب لفٹیننٹ گورنر بہادر کو اس امر کی طرف توجہ خاص ہے جیسا کہ صاحب سیکرٹری گورنمنٹ پنجاب کی تحریر سے واضح ہوتا ہے۔ جس کا ترجمہ یہ ہے :

> جناب لفٹیننٹ گورنر بہادر ایک اور امر کی نسبت ہدایت فرماتے ہیں جس کا کمیٹی نے کچھ ذکر نہیں کیا اور جو سر رشتہ تعلیم کے فروغ کے لیے قابل غور ہے اور وہ یہ ہے کہ اردو کی نئی کتابیں جو بالفعل رائج ہیں یا جن کے پڑھانے کی کمیٹی نے سفارش کی ہے، ان میں اردو نظم بالکل نہیں۔ مگر ان میں کچھ کلام نہیں کہ عمدہ نظم وسیلہ تعلیم کا ہے ..... نظر برآں حسب الہدایت آپ کو کہا جاتا ہے، یعنی آپ اس بات پر غور کریں کہ ہمارے دیہاتی اور ضلع کے مدارس میں ایک منتخبات اردو نظم جس میں اخلاق، صحبت اور ہر ایک کیفیت کی تصویر کھینچی ہو کیا پڑھائی میں داخل ہو سکتی ہے ...... اگر مدارس سرکاری کے وسیلہ سے ویسی نظم غیر مذہبی کی تہذیب ہو جائے اور واہیات نظم جو بالفعل بہت جاری ہے رفتہ رفتہ اس کی جگہ قائم ہو جائے تو بہت عمدہ بات ہوگی۔

نواب ممدوح جو فرماتے ہیں کہ نظم کا پڑھانا ضرور ہے اور انہیں امید ہے کہ غالباً مدرسوں سے جو طلباء پڑھ کر نکلیں گے یہ ایک پاکیزہ چشمہ ہوں گے، جو ہمارے ملک کو سیراب کریں گے۔ اب میں یہ تجویز پیش کرتا ہوں کہ جس طرح ہر شہر میں عموماً شاعری ہوا کرتی ہے آپ بھی ایک مشاعرہ مقرر کریں۔ مگر اتنا ہو کہ یہاں بجائے مصرع طرح کے کوئی مضمون خاص ملا کرے، کہ اس پر لوگ طبع آزمائی کر کے لایا کریں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ جب یہ سلسلہ جاری ہو جائے تو سال بھر کے بعد جس کے کلام سب سے انتخاب ہوں ان کے لیے ایک خاص طور پر انعام و اکرام بھی تجویز کیے جائیں۔ یہ تجویز جو میں نے آپ کے روبرو پیش کی ہے مگر وہ خاطر خواہ عمل میں آ جائے تو یہ دن ہندوستان کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا اور لوگ کہیں گے کہ اردو نظم کی طرز قدیم کن کن لوگوں

کی سعی و کوشش سے جاہ تنزل سے نکل کر ترقی پر پہنچی۔ میری رائے ہے کہ مہینہ بھر کے بعد یہ جلسہ ہوا کرے اور اب کی دفعہ جو جلسہ ہو سب اہل سخن ایک نظم 'برسات' کی تعریف میں لکھیں۔(۱) جہاں تک مشاعرے کا تعلق ہے، اہل پنجاب نے اس سے پورا اتفاق کیا، لیکن پنجاب کے باہر خصوصاً صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ میں پرانی شاعری کی حمایت میں بہت کچھ لکھا گیا اور کہا گیا کہ پرانی شاعری میں اتنی وسعت ہے کہ وہ ہر قسم کی تعلیمی اور اخلاقی ضروریات کی کفیل ہو سکتی ہے۔''

مثال کے طور پر اخبار 'سر رشتہ تعلیم اودھ' نے اپنے یکم جولائی ۱۸۷۴ء کے شمارے میں لکھا :

''اردو نظم کا حصہ مضامین عاشقانہ ہرگز نہیں۔ ہر قسم اور ہر رنگ کے مضامین اس عمدگی اور لطافت کے ساتھ نظم ہو چکے ہیں اور نظم ہوتے جاتے ہیں کہ اگر سو کمیٹیاں ایسی ایسی مقرر ہوں اور سو برس تک ایسی بے سود کوشش کریں، اور لاکھوں روپیہ انعام دیں تو بھی اس سے بہتر نظم نہ ہو سکے۔

پنجاب کے اخبارات کو 'مشاعرہ' کی افادیت میں کلام نہ تھا، لیکن اس میں سے اکثر نے آزاد کی منظومات پر نہایت کڑی تنقید کی۔ اس میں شک نہیں کہ آزاد کے اشعار اسقام سے خالی نہ تھے، لیکن باقی شعراء کو نظر انداز کر کے صرف آزاد کے اغلاط کو منظر عام پر لانا ذاتی عناد کی بنا پر تھا۔''(۲)

آزاد کو ایرانی ادب سے طبعی مناسبت تھی اور ایران میں سیر و سیاحت ان کی دیرینہ آرزو تھی۔ یہ سفر انہوں نے ستمبر ۱۸۸۵ء میں اختیار کیا اور دس ماہ کی سیر و سیاحت کے بعد جولائی ۱۸۸۶ء میں وہ لاہور واپس آئے۔ واپسی پر انہوں نے اپنی نئی معلومات کی بنا پر 'سخن دان فارس' کے مسودہ میں چند اضافے کیے۔ یہ نہایت صبر آزما اور دشوار کام تھا اور اس محنت شاقہ اور دماغی کوفت کا ان کی صحت پر برا اثر پڑا۔ ۱۸۸۹ء میں وہ ایک دماغی عارضہ میں مبتلا ہو گئے اور باوجود ہر قسم کے علاج کے روبہ صحت نہ ہوئے اور آخرکار ۱۹۱۰ء میں بیس سال کی مسلسل علالت کے بعد انتقال ہوا۔

---

(۱) محمد صادق، ڈاکٹر، 'آب حیات کی حمایت میں اور دوسرے مضامین' ۔ 'آزاد معاصرین کی نظر میں' ۔
(۲) ایضاً ۔

تصانیف

آزاد کی تصانیف میں مندرجۂ ذیل کتب خصوصیت سے قابل ذکر ہیں :

'قصص ہند' حصہ دوم جو غالباً ۱۸۶۱ء میں لکھی گئی ۔

'نیرنگ خیال' جس کا پہلا حصہ ۱۸۸۰ء میں چھپا ۔

'تذکرہ آب حیات' جس کا سن تصنیف ۱۸۸۰ء ہے ۔

میں نے اپنے مقالے 'آزاد اور تدوین دیوان ذوق' میں ناقابل تردید شواہد کی بنا پر ثابت کیا ہے کہ آزاد نے ذوق کی بہت سی غزلوں کی اصلاح میں قابل اعتراض جسارت سے کام لیا ہے ۔ 'سخن دان فارس' جس کا ذکر آ چکا ہے اور 'دربار اکبری' جسے آزاد پورے طور پر مکمل نہ کر سکے یا کم از کم نظر ثانی نہ کر سکے اور جسے مولوی امتیاز علی نے ۱۸۹۸ء میں شائع کیا ۔

آزاد کی آغاز ملازمت کا ذکر اوپر آ چکا ہے ، اول وہ ڈائریکٹری میں ۳۵ روپیہ ماہوار پر نائب سررشتہ دار مقرر ہوئے ۔ ترکستان سے واپسی پر سوا دو سال تک وہ یونیورسٹی کالج میں مدرس عربی و ریاضی رہے ۔ پھر تقریباً ایک سال گورنمنٹ سنٹرل ڈپو میں مترجم کا کام کرتے رہے ۔ جولائی ۱۸۶۹ء میں وہ گورنمنٹ لاہور میں اسسٹنٹ پروفیسر عربی مقرر ہوئے ۔ اکتوبر ۱۸۸۴ء میں وہ اسسٹنٹ پروفیسر اورینٹل کالج متعین ہوئے اور ۱۸۸۶ء میں وہ پھر گورنمنٹ کالج میں آ گئے اور ۱۸۸۹ء تک وہیں متعین رہے ۔

تصانیف پر تبصرہ

قصص ہند حصہ دوم

یہ ایک زندۂ جاوید کارنامہ ہے جو ہندوستان میں مسلمانوں کے عہد حکومت کے منتخب واقعات کی روداد پر مشتمل ہے ۔ اس کتاب میں واقعات کی ایسی عمدگی سے عکاسی کی گئی ہے کہ وہ من و عن ہمارے سامنے آ جاتے ہیں ۔ تاریخ اور تخیّل کے متوازی امتزاج کی اس سے بہتر مثال ہمارے ادب میں موجود نہیں ۔ پہلے ذکر آ چکا ہے کہ آزاد کا تخیّل عہد عتیق کے واقعات سے حیرت انگیز سرعت سے بیدار ہوتا ہے ۔ علاوہ ازیں ایک اور بات بھی یاد رکھنی چاہیے اور وہ یہ ہے کہ آزاد کے متخیّلہ کو ہنگامہ آرائی اور روحانی واقعات سے شدت سے تحریک ہوتی ہے ۔ ایسے واقعات کے بیان میں وہ خوب زور قلم دکھاتے

ہیں ۔ اگر محاکات سے مراد ان دیکھی یا دیکھی ہوئی چیزوں یا واقعات کو اس طور سے بیان کرنا مراد ہے کہ قاری کے متخیلہ کو تحریک ہو اور وہ ان واقعات کو بالکل اسی طرح صاف صاف دیکھ لے جیسے کہ مصنف نے انہیں دیکھا ہے تو اسے ہم آزاد کے اسلوب کی سب سے نمایاں خصوصیت کہہ سکتے ہے ۔

ان کہانیوں کی بابت ایک اور بات بھی قابل توجہ ہے ۔ یہ مصنف کی مصروفیت یا غیر متعلق انداز تحریر ہے[1]۔ غدر کے بعد خصوصاً مذہبی کش مکش کی وجہ سے خواہ ہندو ہوں یا مسلمان سب ماضی کے واقعات کو فرقہ دارانہ نظر سے دیکھتے دکھائی دیتے ہیں اور آپ بغیر معلوم کیے کہ مصنف کا کیا نام ہے حتمی طور پر جان سکتے ہیں کہ کسی تصنیف کا مصنف کس مذہب سے تعلق رکھتا ہے ۔ آزاد کے ہاں اس جانب داری کا نام تک نہیں ۔ انہوں نے سب سے انصاف کیا ہے ، سب کی خوبیوں کو اجاگر کیا ہے ۔ اگر مسلمان فرماں رواؤں میں انہیں نقائص نظر آتے ہیں تو وہ ان کے بیان سے ذرا نہیں جھجکتے ۔

اوپر کہا گیا ہے کہ ان کہانیوں کا رنگ امکانی ہے ۔ اس کلیہ سے دو کہانیاں مستثنیٰ ہیں[1] ۔ ان میں ایک 'محمد شاہ کا زمانہ' اور 'نادر شاہ کا آنا' ہے ۔ اس میں انہوں نے محمد شاہ پر ناقدانہ بلکہ طنزیہ نظر ڈالی ہے ۔ 'عالمگیر کا لشکر دکن پر جاتا ہے' کا رنگ سراسر طنزیہ ہے ۔ آزاد کی اورنگ زیب سے مخالفت کے اسباب صرف قیاساً بتائے جا سکتے ہیں ۔ آزاد شیعہ تھے اور اورنگ زیب کی گولکنڈہ اور بیجا پور کی شیعہ ریاستوں پر یورش ان کے مذہبی جذبات کو مجروح کرتی دکھائی دیتی ہے ۔ علاوہ ازیں اورنگ زیب کی اپنے والد 'شاہ جہاں' اور اپنے بھائیوں سے بد سلوکی (اگر اسے بد سلوکی کہا جا سکتا ہے) انہیں خود غرضی ، ریا کاری اور سقاوت دکھائی دیتی ہے ۔

سخن دانِ فارس

اگرچہ ہمارے ہاں 'سخن دانِ فارس' کو وہ قبولِ عام حاصل نہیں جو 'آبِ حیات' کو ہے ، لیکن اس کا سبب نہ ہی دلچسپی کا فقدان ہے اور نہ ہی ضعفِ بیان ۔ در حقیقت اس لحاظ سے یہ تصنیف کسی طرح بھی 'آبِ حیات' سے کم تر نہیں ۔ اس عدم اعتنا کا اصلی

---

(۱) اپنے قصہ میں دلچسپی بڑھانے کے لیے اور اپنے ڈرامائی انداز کو زور دینے کے لیے محمد حسین آزاد تاریخی حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں ۔ چنانچہ 'قصص ہند' میں محمود غزنوی کو ایک لٹیرے کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے ۔ اسی طرح راجپوتوں کی اصلیت جنگ و جدل کی ان کی عادت ایک دوسرے سے حسد کی روایت سے چشم پوشی کرتے ہوئے ان کا کردار بھی مثالی انداز میں بیان کیا گیا ہے . . . . مدیر عمومی

سبب یہ ہے کہ کتاب کا موضوع ایرانی 'ادب و تہذیب ہے - خود آزاد کے زمانہ میں ہمارے ہاں فارسی کا مطالعہ رو بہ زوال تھا ، اس لیے معلوماتی لحاظ سے ہمارے لیے وہ اتنی مفید نہیں جتنی 'آبِ حیات' - لیکن اگر خالص ادبی نقطہ نگاہ سے دیکھا جائے تو یہ کتاب اتنی ہی جاذبِ توجہ ہے جتنی 'آبِ حیات' - بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ اس میں بہت سے ایسے مقامات آتے ہیں جو آزاد کے اسلوب کی بہترین مثالیں ہیں اور جنہیں بحیثیت حسنِ اظہار 'آبِ حیات' کے عمدہ ترین مقامات پر فوقیت حاصل ہے تو اہل الرائے احباب اسے مبالغہ پر محمول نہیں کریں گے بلکہ عین حقیقت قرار دیں گے -

اس کتاب کے دو حصے ہیں - پہلے حصے میں دو لیکچر ہیں جن میں بہت سی مثالیں دے کر یہ ثابت کیا گیا ہے کہ سنسکرت اور فارسی قدیم متحدالاصل یا بہ الفاظِ دیگر ایک ہی قدیم زبان کی بدلی ہوئی شکلیں ہیں - یہ ابواب صرف ماہرینِ لسانیات کے لیے دلچسپی کا موجب ہو سکتے ہیں دوسرا حصہ ایران کے سیاسی ، ادبی ، ثقافتی حالات ، آثارِ قدیمہ ، شہری ، دیہی اور قبائلی زندگی اور طرزِ معاشرت اور فارسی نظم و نثر کے تنقیدی جائزہ سے متعلق ہیں -

غالباً یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ اس تصنیف میں آزاد نے اپنا معیار قائم رکھا ہے - ثقافتی اور سیاسی مسائل کو مقابلتہً زیادہ جگہ دی گئی ہے اور فارسی ادب کے دو ابواب کسی حد تک تشنہ رہ گئے ہیں - پھر بھی اختصار کے باوجود ، فارسی نثر پر ان کا لکچر بلحاظِ تنقید و معلومات ایک قابلِ تعریف کارنامہ ہے - فارسی نظم پر لکچر بے حد مختصر ہے - لیکن یہاں بھی قدم قدم پر آزاد کی بصیرت اور سخن فہمی کا ثبوت ملتا ہے البتہ آٹھواں لکچر جس کا موضوع 'فارسی زبان کا انداز اور زبانوں کے انداز سے کیا نسبت رکھتا ہے' کچھ سطحی سا ہے - یہ تقابلی لسانیات کا مسئلہ ہے اور یہاں ضروری ہے کہ نقاد یا محقق مشرق و مغرب کے لسانیاتی خاندانوں کی خصوصیات پر یکساں طور پر حاوی ہو اور اسے دوسری زبانوں پر وہی دسترس حاصل ہو جو فارسی پر ہے - یہی آزاد کی کمزوری ہے - علاوہ ازیں انہوں نے فارسی زبان کے جو محاسن گنائے ہیں ان میں سے چند محلِ نظر ہیں -

معلوماتی لحاظ سے یہ کتاب چنداں قابلِ اعتبار نہیں ، اور ایران کی معاصرانہ تہذیب اور سیاست کی صحیح ترجمانی نہیں کرتی - یہ لکچر ترکستان سے واپسی کے کچھ عرصہ بعد دئیے گئے تھے - اور حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ آزاد نے ترکستان میں دیکھا تھا انہوں نے اسے ایران کے چشم دید واقعات کی صورت میں پیش کر دیا ہے - یہ درست ہے کہ اس وقت ایران اور ترکستان کی تہذیب میں ایک گونہ مماثلت تھی - پھر بھی جزئیات کا فرق لازمی ہے - اس لیے آزاد نے جو کچھ ایران کی جانب لکھا ہے اسے مکمل طور پر قبول

نہیں کیا جا سکتا ۔[1]

یہاں اس حقیقت کا انکشاف بھی ضروری ہے کہ آزاد نے بہت سا مواد عیلکم کی 'تاریخ ایران' سے لیا ہے ۔ اور اسے ایسے پیش کیا ہے گویا وہ ان کا اپنا ذاتی مشاہدہ ہے ۔ عیلکم کی کتاب کا سن تصنیف ۱۸۰۰ء ہے اور آزاد اپنے لکچروں میں اس پرانے مواد کو جو کم و بیش ساٹھ سال پرانا ہے ایران کے حالات حاضرہ کی صورت میں پیش کرتے ہیں ۔ مانا کہ ان دنوں زندگی کی رفتار بہت سست تھی اور اٹھارھویں صدی کے آغاز کا ایران اسی صدی کے ربع سوم سے بہت مختلف نہ ہوگا پھر بھی ٹھوس تاریخی لحاظ سے 'سخندان فارس' کی تصریحات مکمل طور پر قابل اعتماد خیال نہیں کی جا سکتیں ۔

جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے اس کتاب کی اہمیت زیادہ تر ادبی ہے ۔ معلوماتی لحاظ سے ساتواں ، نواں اور دسواں لکچر آزاد کی وسعت معلومات پر دلالت کرتے ہیں ۔ یہی حال پہلے حصے کے ان اجزاء کا ہے جن میں لسانیات کے مبادیات پر اظہار خیال کیا ہے اور فارسی زبان میں معنوی اور صوتی تبدیلیوں کی مثالیں دی ہیں ۔ یہ اطلاعات آج کل ابتدائی معلوم ہوتی ہیں ، لیکن یاد رہے کہ آزاد پہلا شخص ہے جس نے ان پر توجہ کی ہے ۔ یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ یہ لسانیاتی اصول انگریزی تصانیف سے ماخوذ ہیں اور آزاد نے فارسی زبان سے ان کی تطبیق کی ہے ۔

نیرنگ خیال

یہ کتاب تیرہ تمثیلی مضامین کا مجموعہ ہے جو ۱۸۷۶ء کے لگ بھگ لکھے گئے تھے ۔ اور جن کا پہلا حصہ ۱۸۸۰ء میں کتابی شکل میں چھپا تھا ۔ دوسرا حصہ کچھ عرصہ بعد کی تصنیف ہے ۔ آزاد نے یہ کہیں نہیں لکھا کہ ان مضامین کا مواد انگریزی سے ماخوذ ہے ۔ البتہ کنایتہً اور مبہم الفاظ میں اپنے ماخذ کی طرف اشارہ ضرور کیا ہے ۔

معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے ان بیانات کو بغور نہیں دیکھا اور تقریباً ساٹھ سال تک یہی خیال رہا کہ یہ مضامین طبع زاد ہیں ، یا یہ کہ ان کا مواد ڈاکٹر لائٹز نے بہم پہنچایا تھا ۔ یہ خیال اس مفروضہ پر مبنی تھا کہ آزاد انگریزی نہیں جانتے تھے ، لیکن حقیقت یہ ہے کہ آزاد نے بطور خود انگریزی کا مطالعہ کرکے اس پر کافی دسترس حاصل کر لی تھی ، اور وہ اچھی خاصی مستند تصانیف کے مطالب اخذ کر سکتے تھے ۔

---

(۱) محمد صادق ، مضمون آب حیات کی حمایت میں ۔ سخن دان فارسی کے مآخذ پر مزید روشنی ۔

’نیرنگِ خیال‘ کے تمام مضامین اٹھارہویں صدی کے انگریز مصنّفین ، ایڈیسن ، جانسن اور سٹیل کے مضامین کے آزاد ترجمے ہیں ۔ انگریزی مضامین میں کلاسیکی اختصار ہے ، آزاد نے ان پر کہیں کہیں حاشیہ آرائی کی ہے ۔ اور گاہ بگاہ معمولی سے تصرفات بھی کیے گئے ہیں ۔ غالباً یہ اس لیے کہ پابند ترجمہ میں دیگر مشکلات کے علاوہ ابہام کا بھی خوف تھا ۔ ترجمے کا معیار کافی بلند ہے ۔ اگرچہ کبھی کبھی فقروں کی ساخت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مصنف براہِ راست اپنا مافی الضمیر نہیں ادا کر رہا ، بلکہ اجنبی محاورے سے عہدہ برآ ہونے کی ناکام کوشش کر رہا ہے ۔ چند مقامات ایسے بھی ہیں جہاں انہیں مصنّف کے صحیح مفہوم تک رسائی نہیں ہوئی اور وہ نفسِ مضمون سے ذرا ہٹ گئے ہیں ۔

’نیرنگِ خیال‘ کا سب سے کامیاب مضمون ’شہرتِ عام اور بقائے دوام کا دربار‘ ہے ۔ اس مضمون میں اصلی انگریزی مضمون کے مغربی مشاہیر کی جگہ آزاد نے مشرق کی سربرآوردہ شخصیتوں کی تصاویر پیش کی ہیں ۔ ان میں سعدی اور غالب کے مرقع ، اختصار اور بلاغت کے عمدہ نمونے ہیں ۔

ذیل میں ’نیرنگِ خیال‘ کے ماخذ کی نشان دہی کی جاتی ہے :

آغاز آفرینش میں باغِ عالم کا کیا رنگ تھا اور رفتہ رفتہ کیا ہو گیا ۔	‘An Allegorical History of Rest and Labour’—*Johnson.*
سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ ۔	‘Truth, Falsehood and Fiction, an Allegory’—*Johnson.*
گلشنِ امید کی بہار ۔	‘The Garden of Hope, A Dream’—*Johnson.*
سیرِ زندگی ۔	‘The Voyage of Life—*Johnson.*
انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا ۔	‘The Endeavour of Mankind to get rid of the Burdens, A Dream’ —Addison.
علوم کی بد نصیبی ۔	‘The Conduct of Patronage’—*Johnson*
علمیت اور ذکاوت کے مقابلے ۔	‘An Allegory of Wit and Learning’
جنت الحمق ۔	‘Paradise of Fools’—Parnell, *The Spectator*, No. 460. —*Johnson.*
خوش طبعی ۔	*The Spectator* No. 35—Addison.
نکتہ چینی ۔	‘An Allegory of Criticism’—*Johnson.*

مرقعِ خوش بیانی ۔	The Spectator No. 63—Addison.
سیرِ عدم ۔	The Spectator No. 501—Addison.
شہرتِ عام اور بقائے دوام کا دربار ۔	'Vision of the Tables of Fame' No. 81-- The Tatler.

آبِ حیات

وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ آزاد کو پہلے پہل تصنیفِ 'آبِ حیات' کا کب خیال آیا ۔ لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ مدرسے سے پہلے بھی انہیں اس موضوع سے دلچسپی تھی ۔ اس خیال کو ذوق کی صحبت سے بھی تقویت پہنچی ہو گی ، کیونکہ بقولِ مصنف وہ انہیں بر سبیلِ تذکرہ شعراء کی بات اپنے چشم دید واقعات یا قصے کہانیاں سنایا کرتے تھے ۔ اس موضوع میں آزاد کے انہاک کا ثبوت اس بات سے بھی ملتا ہے کہ غدر کے بعد جب وہ نہایت کس مپرسی کی حالت میں آوارہ و سرگرداں پھر رہے تھے ۔ ان کا یہ شوق برقرار رہا اور لکھنؤ میں شعراء کے حالات معلوم کرتے رہے[1]۔

پنجاب میں آنے کے بعد چند سال تک مالی مشکلات اور دیگر مکروہات کے سبب انہیں اپنے ادبی ذوق کی تسکین کے بہت کم مواقع حاصل ہوئے ۔ 'آبِ حیات' کی تصنیف کا باقاعدہ آغاز ۱۸۷۶ء میں ہوا ۔ اس کا ثبوت ان خطوط سے ملتا ہے جو انہیں جواباً بعض شعراء کے احباب یا لواحقین نے لکھے ۔ یہ سلسلہ چار پانچ سال جاری رہا اور 'آبِ حیات' ۱۸۸۱ء میں شائع ہوئی ۔

اس تصنیف کے محرکات کا ذکر دیباچۂ 'آبِ حیات' میں ان الفاظ میں کیا گیا ہے :

> "لیکن ساتھ ہی افسوس آیا کہ جن جواہریوں کے ذریعے یہ جواہرات مجھ تک پہنچے وہ تو خاک میں مل گئے ۔ جو لوگ باقی ہیں وہ بجھے ہوئے چراغوں کی طرح اپنے ویرانوں میں پڑے ہیں کہ ان کے روشن کرنے کی یا ان سے روشنی لینے کی کسی کو پرواہ نہیں ۔ پس یہ باتیں کہ حقیقت میں ابیات ان کے جوہر کمالات کے ہیں ۔ اگر اس طرح زبانوں کے حوالے رہیں تو چند روز میں صفحۂ ہستی سے مٹ جائیں گی ۔ ہر چند کلام ان کے کمال کی یادگار موجود ہیں ، مگر دیوان جو بکتے پھرتے ہیں بغیر ان کے تفصیل حالات کے اس مقصود کا حق پورا پورا ادا نہیں کر سکتے ۔ نہ اس زمانہ کا عالم اس زمانہ میں دکھا سکے ، اور یہ نہ ہوا تو کچھ بھی نہ ہوا ۔

---

(۱) آزاد ، محمد حسین ، آب حیات ۔ ص ۱۵۲ ۔

اب انصاف کرو کیا یہ تھوڑے افسوس کا موقع ہے کہ ہمارے بزرگ خوبیاں بہم
پہنچائیں، انہیں بقائے دوام کے سامان ہاتھ آئیں اور اس پر نام کی زندگی سے بھی محروم
رہیں۔ بزرگ بھی وہ جن کی کوششوں سے ہماری اگلی اور موجودہ زبان کا لفظ لفظ اور
حرف حرف گراں بار احسان ہو ان کے کارنامے اس گمنامی کے ساتھ صفحۂ ہستی سے
مٹنا بڑے حسرت کی بات ہے۔ جن کے مرنے پر ان کے اہل و عیال روئے وہ مرنا
نہ تھا۔ مرنا درحقیقت سخت عسان حادثہ ہے۔

اس کے علاوہ نئے تعلیم یافتہ جن کے دماغ میں انگریزی لالٹین سے روشنی پہنچی
ہے وہ ہمارے تذکروں کے اس قدر پر حرف رکھتے ہیں کہ ان سے کسی شاعر کی
زندگی کی سرگزشت کا حال معلوم ہوتا ہے۔ نہ اس کی طبیعت اور عادات و اطوار کا
حال کھلتا ہے، نہ اس کے کلام کی خوبی اور صحت و سقم کی کیفیت کھلتی ہے
اور نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے معاصروں میں اور اس کے کلام میں کن کن
باتوں میں کیا نسبت ہے۔ انتہا یہ ہے کہ سال ولادت اور سال وفات تک بھی نہیں
کھلتا۔ غرض خیالاتِ مذکورہ بالا نے مجھ پر واجب کیا کہ جو حالات ان بزرگوں
کے معلوم ہیں یا جہاں جہاں تذکروں میں متفرق مذکور ہیں انہیں جمع کرکے ایک جگہ
لکھوں اور جہاں تک ممکن ہو اس طرح لکھوں کہ ان کی زندگی کی بولتی چالتی،
پھرتی چلتی تصویریں سامنے آن کھڑی ہوں اور انہیں حیاتِ جاوداں حاصل ہو۔"

'آبِ حیات' اردو شاعری پر پہلی تصنیف ہے اور باوجودیکہ پچھلے اسّی نوے سالوں میں تنقید نے بہت سے نشیب و فراز دیکھے ہیں، اس کی اہمیت بدستور قائم ہے۔ مصنّف نے تمہید میں جو کچھ لکھا ہے اسے پورا کر دکھایا ہے۔ پرانے اساتذہ جن کے خد و خال مرورِ ایام سے دھندلے پڑ گئے تھے یا بالکل محو ہو چکے تھے نئی زندگی پا کر اپنے اصلی رنگ و روپ میں ہمارے سامنے آ گئے ہیں۔ جہاں تک تنقید کا سوال ہے، اس میں باوجود مسلمہ تنقیدی اصولوں کے ذاتی رجحانات کو بہت کچھ دخل رہا ہے اور رہے گا۔ لیکن یہاں بھی آزاد نے علی العموم ذوقِ سلیم کا ثبوت دیا ہے اور ان کے تنقیدی جائزوں سے انحراف کے بہت کم مواقع ملتے ہیں۔

'آبِ حیات' کے چھپتے ہی اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور اس پر بہت سے توصیفی مقالے لکھے گئے۔ ذیل میں ایک نہایت پر از معلومات تبصرے کی نقل دی جاتی ہے، جو اخبار 'انجمنِ پنجاب' مؤرخہ ۲۴ مئی ۱۸۸۱ء میں شائع ہوا:

"اس مصنف نے اردو زبان کی تاریخ کو جو مختلف رسالوں اور کتابوں میں بے ترتیب
اور غیر مسلسل لکھی ہوئی تھی، اچھی طرح اور علم زبان کے قواعد کے مطابق
زنجیر بند کرکے لکھا ہے، جس سے اس کی ترقی و تنزل کے درجے اور حالتیں آئینہ

ہو گئی ہیں - "بھاشا پر فارسی نے کیا اثر کیے" - اس فعل کو اس عمدگی کے ساتھ لکھا ہے کہ مصنف کی عام واقفیت کی کامل گواہی ملتی ہے - گو بعض ہندی الفاظ کی سنسکرت غلط لکھی گئی ہے . . . بہر حال مولوی صاحب نے جو اردو لفظوں اور محاوروں کی اصل اور شانِ نزول لکھی ہے وہ اردو زبان دانوں کے حق میں ایسی مفید ہے کہ وہ لوگ جس قدر اس کتاب کی قدر اور مولوی صاحب کا شکریہ ادا کریں تھوڑا ہے کیونکہ یہ عمدہ ذخیرہ ایک جگہ اسی کتاب میں مل سکتا ہے - نظمِ اردو کی تاریخ کا وہ جریدہ کھینچا ہے کہ گویا ناظموں اور ان کے قدردانوں کا جلسہ آنکھوں کے سامنے سماں باندھے کھڑا ہے - حقیقت یہ ہے کہ ہمارے انگریزی دانوں کے ان خیالات میں کہ ہندوستانیوں کو کیفیت لکھنی نہیں آتی اس کتاب کے دیکھنے سے کمی ہونی شروع ہو جائے گی -

اگرچہ مولوی صاحب نے زبان کے بڑے معاون اور ستون ان شاعروں کو قرار دیا ہے اور اسی سبب سے انہیں کا حال لکھا ہے - ہر زبان کے ترقی دینے والے سب سے بڑھ کر عام لوگ ہیں جن کے محاورات کو شعر میں صرف بٹھانے سے یہ ایسا ناز کرتے ہیں - البتہ جو شاعر نئے محاورے اپنے ہاں باندھ جائے یا نئے معنی لفظوں کو پہنا دے وہ بے شک زبان کا ترقی دینے والا ہے اور یہ بات ایک ایسے آگرہ والے میں پائی جاتی ہے جس کو مولوی صاحب نے بالکل قلم انداز کر دیا ہے اور کیوں نہ کرتے جب چراغ تلے اندھیرا - میاں مومن دہلی والے ہی شعرائے اردو کی فہرست سے خارج سمجھے گئے تو پھر میاں بیچارہ نام والے جن کے کلام کی بدولت ہزاروں آدمی روٹی کھائے کس گنتی میں تھے -

حق یہ ہے کہ میر تقی ، سودا ، ذوق ، غالب وغیرہ شاعروں کا ایسا عمدہ اور پورا پورا حال لکھا ہے کہ جی چاہتا ہے کہ اب جو کوئی کسی کا حال لکھنا چاہے وہ اس کتاب کو اپنا رہنما بنائے - جب لکھنے کو قلم اٹھائے ، تا کہ اردو تذکرہ نویسوں اور تاریخ لکھنے والوں کے اوپر بے حقیقت نہ لکھ سکنے کا دھبہ کم ہو جائے - مختلف بیانات کے دیکھنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جن خیالات کے ادا کرنے میں انگریزی دان یہ کہا کرتے تھے کہ ان کے واسطے اردو میں الفاظ نہیں - ان خیالات کو مولوی صاحب نے بغیر قیدِ زبان ایسے ڈھنگ سے ادا کیا ہے کہ ذرا سا غور کرنے سے وہ خیالات سمجھ میں آ جاتے ہیں اور ان کا لباس کچھ بہت نیا نہیں معلوم ہوتا - مگر روانی میں بعض مقررہ محاوروں اور متنوں کو نئے طرز پر لکھ گئے ہیں - چنانچہ ص ۱۱۲ 'باندھا ہے' کی جگہ 'بندھا ہوا' ہے - تعجب یہ ہے کہ ایسے مضمون کو محقق کاشی نے بھی بندھا ہوا لکھا ہے اور صفحہ ۲۲۵ میں خوشی کے مارے

پھولا نہ سماتا تھا کے بجائے خوشی کے مارے پھولوں نہ سماتا تھا لکھ دیا ہے۔ اس کے قطع نظر اور کئی جگہ اعمال کا بھی یہی حال پایا جاتا ہے۔ ح۔ ن۔ ل از نظام الدین دہلی''

مخالف گروہ کو سب سے بڑی شکایت یہ تھی کہ آزاد نے مومن جیسے بلند پایہ شاعر کو بلا وجہ قلم انداز کر دیا ہے۔ 'صادق الاخبار' مؤرخہ ۲۴ مارچ ۱۸۸۱ء میں مدیر کے نام ایک خط میں یہ اقتباس درج ہے :

''انہوں نے اپنے جواہر ریزے کو خذف ریزہ جان کر پھینک دیا اور اپنی کتاب 'آب حیات' میں جو ان کے خیال میں ہے کی دیگر شعرائے قدیم کے ساتھ نہ رکھا۔ حضرت آپ افسردہ خاطر نہ ہوں، بھلا۔ اجماع ضدین کہیں بھی ہو سکتا ہے . . . مومن تو نام پایا اور مذہب سنی۔ معاذ اللہ ایسے کئی اور سنی کہ اصحاب ثلثہ کرام کی تعریف و توصیف میں قصائد بھی لکھ دے اور ایسے دل سے لکھے کہ مقبول بھی ہوئے۔ مولوی آزاد کو کیا پڑی تھی کہ ایسے جیسی مومن کا حال زندگی لکھ کر اور اسے زمرۂ استادان میں شمار کرکے آپ بھی اسی کے پیرو ہوتے اور اپنی برادری سے خارج کیے جاتے اور اہل تشیع کی نظروں میں سبک ہوتے۔ ہاں آپ صبر کریں اور تعصب کی شان کو بغور دیکھتے رہیں۔ فرمائیے تو سہی جن شعراء کا ذکر 'آب حیات' میں ہے ان میں سے کسی ایک نے ایک رباعی بھی اصحاب ثلثہ کبار کی شان میں کہی ہے کہ ان میں سے اکثر اہل سنت ہیں۔ میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ مومن مرحوم کو عشق مذہب سنت اس امر کا مقتضی ہوا کہ وہ اس غیر کتاب میں داخل ہوتا۔ واللہ ہم تو یہ تعریف مومن مرحوم سمجھتے ہیں اور آج سے فرد میں اولیاء میں شمار ہوتے ہیں۔ اللہ جلشانہ نے فرمایا ہے لعنۃ اللہ علی الکاذبین اور اپنے دوست کے دشمن کو دشمن نہ سمجھے۔ ہم برابر دیکھتے ہیں کہ کتاب 'آب حیات' پر بہت سے ریویو لکھے جا رہے ہیں جس کو اس قدر عبارت لکھنی آتی ہے اور اس قدر مشق ہے المستعان چند روز بعد کوئی ریویو چھپے گا کہ تمام قلعی کھل جائے گی۔ والسلام''۔

'آب حیات' کی اشاعت کے بعد بہت دنوں یہی نظریہ پیش پیش رہا کہ مومن کو محض مذہبی تعصب کی بنا پر شعرائے اردو کی فہرست سے خارج کر دیا گیا ہے، لیکن یہ درست معلوم نہیں ہوتا۔ مشکل یہ ہے کہ کوئی اور قابل قبول توجیہہ بھی نہیں ملتی۔ علاوہ ازیں آزاد کی اپنی غداری بھی متضاد بیانات پر مشتمل ہے۔ ایک طرف تو وہ شکایت آمیز لہجہ میں لکھتے ہیں :

''پہلی دفعہ اس نسخہ میں مومن خاں صاحب کا حال نہ لکھا گیا ۔ وجہ یہ تھی کہ دورِ پنجم جس سے ان کا تعلق ہے . . . . . جو اہلِ کمال اس میں بیٹھتے ہیں کس لباس و سامان کے ساتھ ہیں ۔ مجلس میں بیٹھا ہوا انسان بھی زیب دیتا ہے کہ اس سامان و شان و وضع و لباس کے ساتھ ہو جو اہلِ محفل کے لیے حاصل ہے ، نہ ہو تو موزوں معلوم ہوتا ہے'' ۔ بالفاظِ دیگر آزاد کی رائے میں مومن اس قابل نہ تھے کہ انہیں معاصر شعراء کی جماعت میں داخل کیا جائے ۔ اس کے ساتھ ہی وہ لکھتے ہیں : ''میں نے ترتیب کتاب کے دنوں میں اکثر اہلِ وطن کو خطوط لکھے اور لکھوائے ۔ وہاں سے جواب صرف آیا . . . . . مجبوراً ان کا حال قلم انداز کیا'' ۔

پہلے غدر کی جانب کہا جا سکتا ہے کہ اگر مومن واقعی اس قابل نہ تھے کہ انہیں 'آبِ حیات' میں جگہ دی جاتی تو اس کا کیا سبب ہے کہ 'نیرنگِ خیال' میں شہرتِ عام اور بقائے دوام کا دربار میں ان کا ذکر جرأت کے ساتھ کیا گیا ہے ؟ مواد کی غیر موجودگی یا باوجود کوشش اس کا دستیاب نہ ہونا بھی قرینِ قیاس معلوم نہیں ہوتا ۔ خیر اس کا کیا سبب ہے کہ پہلی اشاعت کے لیے تو باوجود سعیٔ بلیغ انہیں خاطر خواہ مواد نہ مل سکا ۔ لیکن جب اس فرو گذاشت پر شدید ہنگامہ ہونے کے بعد جب دوسری اشاعت کی باری آئی تو آزاد کو مواد بکثرت مل گیا ۔ یہ ایک دقیق معاملہ ہے اور اس کی تہ تک پہنچنا دشوار ہے ۔ بہر حال یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہے کہ 'آبِ حیات' میں ہد ہد جیسے اوسط درجے کے شعراء کے لیے تو جگہ ہو اور مومن جو اپنے دور کے سر بر آوردہ شعراء میں سے تھے بالکل نظر انداز کر دیے جائیں ۔

تنقیدِ 'آبِ حیات' کا ایک ناخوشگوار پہلو وہ بے بنیاد اعتراضات اور الزامات ہیں جو عدمِ صحت کی بنا پر اس پر عائد کیے گئے ہیں ۔ ان الزامات میں چھوٹے بڑے دونوں شامل ہیں ۔ عام خیال یہ ہے کہ 'آبِ حیات' کے کئی ایک مندرجات جنہیں بطور واقعات پیش کیا گیا ہے آزاد کے اپنے تخیل کی پیداوار ہیں اور انہیں حقیقت سے کوئی علاقہ نہیں ۔ علاوہ ازیں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ واقعات کے بیان میں آزاد نے بے حد مبالغہ کیا ہے ۔ لہذا تاریخی لحاظ سے 'آبِ حیات' بہت حد تک ساقط الاعتبار ہے ۔ مولوی حبیب الرحمان شروانی نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ آزاد کی قیاس کی بلند پروازی نے طوطے مینا بنا بنا کر اڑائے ہیں[1] ۔

ان الزامات کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ 'آبِ حیات' میں بہت سے مندرجہ واقعات کے مآخذ نہیں ملتے تھے ۔ اور چونکہ معترضین ان کا سراغ لگانے میں قاصر رہے تھے اس لیے اس عدم توثیق سے یہ نتیجہ نکالا گیا کہ یہ آزاد کی اپنی اختراع ہیں ۔

---

(۱) عبدالحئی ، گل رعنا ۔

لیکن اب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ دیگر تذکروں کے علاوہ جن کی کتاب میں نشان دہی کی گئی ہے آزاد نے بہت سا مواد 'مجموعۂ نغز' (تذکرہ شعرائے اردو) مؤلفہ حکیم ابوالقاسم میر قدرت اللہ قاسم سے لیا ہے[1] ۔ علاوہ ازیں بہت سا مواد ان زبانی روایات پر مبنی ہے جو آزاد کو شعراء کے متعلقین اور احباب سے ملیں ۔ ایک اور اہم ماخذ وہ اطلاعات ہیں جو آزاد کے استفسارات کے جواب میں بذریعۂ خط و کتابت دستیاب ہوئیں ۔ میرے پاس پانچ چھ ایسے خطوط ہیں جو آزاد کے سوال ناسے کے جواب میں لکھے گئے ہیں ۔ میں نے ان خطوط کا بغور مطالعہ کیا ہے ۔ ان اطلاعات کے استعمال میں آزاد نے رنگ آمیزی یا حاشیہ آرائی سے بالکل کام نہیں لیا اور سوائے اس کے کہ کہیں مواد کی ترتیب میں فرق آ گیا ہے یا زبان میں اصلاح کر دی گئی ہے باقی اصل اور نقل میں کوئی فرق نہیں دکھائی دیتا[2] ۔ علاوہ ازیں ان پر یہ الزام بھی لگایا جاتا ہے کہ انھوں نے بعض بزرگوں سے ایسی باتیں منسوب کی ہیں جو ان کے وقار یا تقدس کے منافی ہیں ۔ مثال کے طور پر میر تقی میر کی بے دماغی یا جانِ جاناں مظہر کی حسن پرستی ۔ لیکن پرانے ماخذ سے ان کی حرف بہ حرف تائید ہوتی ہے[3] ۔

اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ 'آبِ حیات' اغلاط سے بالکل مبّرا ہے ۔ 'آبِ حیات' میں غلطیاں ہیں ، لیکن ان کی ذمہ داری آزاد پر نہیں بلکہ کتاب کے ماخذ پر ہوتی ہے خواہ وہ زبانی روایات ہوں یا تحریری مقالات ۔ علاوہ ازیں آزاد پر لاعلمی کا الزام لگاتے وقت یہ فراموش کیا جاتا ہے کہ بہت سے ماخذ جو آج دستیاب ہو چکے ہیں ۔ 'آبِ حیات' کی تصنیف کے وقت نایید تھے ۔ میرے خیال میں آزاد پر عائد کردہ مطاعن و الزامات کی بہترین تردید مولوی عبدالحق کے مندرجہ ذیل بیان سے ہوتی ہے :

> ''آزاد مرحوم کی آب حیات اپنی بعض واقعاتی غلطیوں کے باوجود اردو زبان میں ایک خاص پایہ رکھتی ہے ۔ تاریخ کی حیثیت سے نہیں افسانے کی حیثیت ہی سے اس کو دیکھیے ۔ اس کی زبان اور اسلوب، یہاں اس قدر شستہ و رفتہ ، سلیس و پاکیزہ اور دلچسپ ہے کہ ہمارے ادب میں اس کی بہت مثالیں ہیں ۔ آزاد مرحوم کا یہ کیا کم احسان ہے کہ اس نے سب سے پہلے تاریخِ ادب کے لکھنے کا ڈول ڈالا اور ہمیں یہ خیال سمجھایا ۔ بے شک آزاد کی غلطیوں کو دکھائیے ، لیکن اس پر لعن طعن کی بوچھار نہ کیجئے اور خصوصاً ناروا اور بے جا . . . .''
>
> (اردو جنوری ۱۹۳۳ء ص ۲۲۰)

---

(۱) محمود شیرانی (مرتب) آب حیات اور مجموعۂ نغز ۔ لاہور ۱۹۲۳ء ۔

(۲) محمد صادق ، ڈاکٹر ، آب حیات کی حمایت میں ۔ اس میں چار ایسے خط نقل کیے گئے ہیں ۔

(۳) محمد صادق ، ڈاکٹر ، آب حیات کی حمایت میں ۔ اس میں چار ایسے خط نقل کیے گئے ہیں ۔

لائق مؤلف آزاد مرحوم کی جن غلطیوں سے خفا ہیں ان میں سے اکثر آج صحیح ثابت ہو رہی ہیں ۔ اس کتاب میں 'آبِ حیات' کی جن غلطیوں کا ذکر کیا گیا ہے ان میں سے سوائے ایک آدھ کے سب صحیح ہیں ۔

دربارِ اکبری

'دربارِ اکبری' آزاد کی اکبر پرستی کی ایک روشن دلیل ہے ۔ یہ کتاب جس میں اکبر اور اس کے اہلِ دربار کے حالات مرقوم ہیں تقریباً ۸۵۰ صفحات پر مشتمل ہے ۔ اسلوب کے لحاظ سے یہ کتاب مصنف کے ذہنی انحطاط کی غمازی کرتی ہے ۔ اس کے دو بڑے ثبوت ہیں ۔ ایک تو متخیلہ کی بے جا دست اندازی جس کے شواہد آزاد کی تمام تصانیف حتیٰ کہ 'قصص ہند' میں بھی ملتے ہیں جو مبتدیوں کے لیے تصنیف ہوئی تھی اور جس میں بالتزام صاف ، سادہ اور سلس زبان استعمال کرنے کی ہدایت کی گئی تھی ۔ لیکن اس تصنیف میں متخیلہ ان کے ذہن پر سدت سے حاوی ہے اور معمولی معمولی باتوں کو بھی متخیلہ کی رنگ آمیزی سے متشاعرانہ زبان میں ادا کیا گیا ہے ۔ دوسری مصنف کی ذاتی آراء اور توجیہات کی مداخلتِ بے جا ۔ اگر تاریخ نویسی کی بڑی خوبی معروضیت اور خود فراموشی ہے تو آزاد کی متواتر اور اکثر اوقات مضحکہ خیز مداخلات اور رازدارانہ انکشافات اور توجیہات اس تصنیف کی تاریخی اہمیت کے منافی ہیں ۔ کتاب کا کارآمد حصہ وہ ہے جہاں آزاد دینِ الٰہی پر تنقید کرتے ہوئے اکبر کے علمائے سو کی تنگ نظری ، ابلہ فریبی ، تفرقہ پردازی اور باہمی حسد و عداوت اور ریاکاری سے نفرت پر محمول کرتے ہیں ۔

علمائے سو کی جو مکروہ اور ناگوار تصاویر اس کتاب میں دی گئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ قرونِ وسطی میں مذہبی استبداد کس خوفناک حد تک اذہان پر مسلط تھا اور مذہب کے نام پر کیسے کیسے گھناؤنے افعال معرضِ عمل میں آئے تھے ۔

بزمِ مشاعرہ

مروجہ روایتی تنقید میں بزمِ مشاعرہ کو اردو شاعری میں سنگِ میل کی سی حیثیت حاصل ہے ۔ کہا جاتا ہے کہ یہیں سے جدید اردو شاعری کا آغاز ہوتا ہے ۔ لیکن ادب کے باقاعدہ مطالعہ سے اس نظریہ کی بہت کم تائید ہوتی ہے ۔ درحقیقت یہ تحریک ، اگر گورنمنٹ کے دفتری قبیلہ کو اس نام سے تعبیر کیا جا سکتا ہے ، اردو شاعری کے لیے نئی راہیں تلاش کرنے کی ایک پیش از وقت کوشش تھی اور اس لیے وہ بار آور نہ ہو سکی ۔

یہ ایک مسلّمہ امر ہے کہ ہر ایک کامیاب تحریک کسی خود آگاہ طبقے کی متحدہ مساعی سے منتج ہوتی ہے۔ شاعری اندرونی تحریک یا وجدان سے پیدا ہوتی ہے خواہ وہ کسی فردِ واحد کے احساسات کی آئینہ بردار ہو یا کسی خاص طبقے کے مشترک نظریات یا احساسات کی۔ بزمِ مشاعرہ کسی قومی یا ملّی رجحان کی مظہر نہ تھی اور اسی لیے اس سے کوئی دائمی نتائج ظہور پذیر نہ ہوئے اور نہ ہی اسے ادب میں کوئی مستقل مقام حاصل ہے۔ آج کل ان نظموں کی حیثیت ان ازکار رفتہ نوادر کی سی ہے جنہیں ہم عجائب گھروں میں بہ نظرِ استعجاب دیکھتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ آخر ان کی تخلیق کی کیا ضرورت تھی۔ ان نظموں میں سے اگر کچھ زندہ ہیں تو انہیں محض مصنوعی طور پر زندہ رکھا گیا ہے یا زندہ رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ صرف حالی کی 'برکھا' ہے جس کے پیچھے جذبہ ہے۔ لیکن اس کی حیثیت مستثنیات کی سی ہے جن سے کسی کلیّہ کی تائید یا توثیق ہوتی ہے۔ جہاں تک آزاد کا تعلق ہے وہ شاعر نہ تھے، انہوں نے خود کہا:

''میں نثر کے میدان میں بھی سوار نہیں، پیادہ نہیں اور نظم میں تو بالکل خاک افتادہ ہوں''[1] اور یہ کسرِ نفسی نہیں بلکہ عینِ حقیقت ہے۔ آزاد کی نظمیں بیشتر قافیہ پیمائی ہیں۔

صحیح معنوں میں فنِ شاعری کا آغاز حالی کے مسدس سے ہوتا ہے اور یہ اس لیے کہ وہ مسلمانانِ ہند کے ترقی پسند طبقے کے خیالات و احساسات کا ترجمان ہے۔

رومانی مثالیت

آزاد کی طبیعت کی ایک نمایاں خصوصیت ان کی رومانی مثالیت ہے۔ اس پرانی تہذیب سے والہانہ تعلق ہے اور وہ اس کی محبت میں سرشار نظر آتے ہیں۔ ان کی رائے میں تہذیب بلحاظِ رسم و رواج، معاشرتی روابط، آدابِ نشست و برخاست، وسعتِ اخلاق، عمدگیٔ مذاق نہ صرف دلکش ہے بلکہ اخلاقی لحاظ سے بھی تہذیبِ جدید سے مدارج بہتر ہے۔ آزاد کی رائے میں تہذیبِ جدید کی بڑی خوبی اس کی افادیت پرستی ہے۔ جو ایک لحاظ سے نہایت مستحسن ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اسے اس بات کا بھی احساس ہے کہ ذاتی اغراض اور زندگی میں تگ و دو کی وجہ سے زندگی پھیکی اور بے رنگ ہوتی چلی جا رہی ہے۔ جذبہ جسے پرانی تہذیب میں ایک بلند مقام حاصل تھا۔ تہذیبِ جدید اس کو حصولِ مقاصد میں سدِ راہ خیال کرتی ہے۔ لہذا اس میں وہ وقار تمکنت اور وجاہت نہیں جو پرانی تہذیب کا طرۂ امتیاز تھی۔

---

(۱) نظم آزاد، مقدمہ۔

آزاد پرانے شعراء کی محبت میں سرشار نظر آتے ہیں اور ان کے حالات خوب مزے لے لے کر بیان کرتے ہیں اور چونکہ انہیں ان سے محبت ہے ۔ اس لیے ان کی خامیاں بھی انہیں بھلی معلوم ہوتی ہیں اور اگر کبھی کبھار ان کا ذکر بھی ہوتا ہے تو ایسی نرم زبان میں کہ ان کا بہت کم احساس ہوتا ہے ۔

عشق و محبت کی ایک خصوصیت مبالغہ اور رنگ آمیزی ہے اور اگر آزاد نے شعرائے قدیم کی خامیوں اور کوتاہیوں کا ذکر کیا ہے تو اس میں بھی مبالغہ آ گیا ہے ۔ بتانا یہ مقصود ہے کہ وہ ہر رنگ میں یکتا ہے ۔ جو لوگ آزاد کی طبیعت کے اس رومانی رنگ سے ناواقف ہیں وہ اس مبالغہ کو بالارادہ مخاصمت اور توہین پر محمول کرتے ہیں ، لیکن آزاد کی تصنیف خصوصاً 'آبِ حیات' سے ایسے نتائج اخذ کرنا سراسر غلط فہمی ہے ۔

آزاد کی طبیعت کی ایک اور خصوصیت ہے اور یہ درحقیقت ان کی رومانویت ہی کا ایک رخ ہے ۔ ان میں جذبہ کی فراوانی ہے اور وہ بار بار اس کی رو میں بہ جاتے ہیں ۔ زندگی اور ادب میں مدرکہ کا عمل غیر متعلق اشیاء یا اقدامات کی روک تھام ہے ۔ آزاد کے ہاں یہ ضبط بہت کم ہے اور قاری یہ محسوس کرتا ہے کہ آزاد ایک کمزور سوار کی طرح ہیں جسے اس کا موشہ زور رہوار جہاں چاہے لے جاتا ہے ۔ تاریخی واقعات کی روداد میں ذاتی تاثرات کا بیان ، قاری سے تخاطب اور راز دارانہ گفتگو اسی مدرکہ کی کمزوری اور جذبہ کی شدت کا نتیجہ ہیں ۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں ۔ شیخ عبدالقادر بدایونی کی بابت لکھا ہے :

> "باوجود ان باتوں کے جو کم نصیبی ان کی ترقی میں سنگِ راہ تھی ، وہ یہ تھی کہ زمانے کے مزاج سے اپنا مزاج نہ ملا سکتے تھے . . . قباحت یہ تھی کہ جس طرح طبیعت میں جوش تھا اسی طرح زبان میں زور تھا ۔ اس واسطے ایسے موقع پر کسی دربار اور کسی جلسے میں بغیر بولے رہا نہ جاتا ۔ اس عادت نے مجھ ناقابل کی طرح ان کے لیے بہت سے دشمن بہم پہنچائے"[1] ۔

اور خان زمان علی خان شیبانی کی موت پر یوں رقم طراز ہیں :

> "اس بد نصیب پر وہاں یہ گزری کہ فیل سکھ روند کر چلا گیا ۔ کوئی گم نام چھاؤنی کا چکریا وہاں جا نکلا اور مغل کو سسکتے دیکھ کر سر کاٹ لیا ۔ اتنے میں ایک بادشاہی چیلا پہنچا ۔ اس نے اس سے چھین لیا . . . . آپ آ کر اشرفی انعام لے لی ۔ زمانے کی گردش دیکھتے ہو یہ اس سیستانی رستم کا سر ہے ۔ اس پر کتنے

---

(۱) آزاد ، محمد حسین ، دربار اکبری ۔ ص ۲۰۴ ۔

لڑ رہے ہیں - الٰہی کتوں کا شکار نہ کروائیے - شکار بھی کروائیے تو شیر ہی کا کرائیے - نہیں نہیں! تیرے ہاں دنیا کی کمی ہے - شیروں کا پنجہ، سؤروں اور دنیا کے کتوں پر نہ رکھیو . . . . . . آزاد کو تیرے مرنے کا افسوس نہیں مرنا تو ایک دن سب کو ہے - ہاں اس بات کا افسوس ہے کہ خاتمہ اچھا نہ ہوا . . . . . خدا حاسدوں کا منہ کالا کرے جنھوں نے ایمانوں کی سنہری سرخ روئی پر روسیاہی کر دیا آزاد بھی ایسے ہی بے لیاقت بدذات حاسدوں کے ہاتھ سے داغ داغ بیٹھا ہے - پھر بھی شکر ہے، روسیاہی سے محفوظ ہے اور خدا محفوظ رکھے وہ ناپاک خود کچھ نہیں کر سکتے - اوروں کو ڈھونڈ ڈھونڈھ کر لاتے ہیں - مورچے باندھتے ہیں - دمدمے باندھتے ہیں اور افسروں سے لڑاتے ہیں - خیر آزاد بھی پروا نہیں کرتا - اپنے خدا اور انہیں زمانہ کے حوالے کرتا ہے - ان کے اعمال ہی ان سے سمجھا لیتے ہیں"(۲) -

آگے چل کر یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ آزاد کمزور سے کمزور روایات کو بآسانی قبول کر لیتے ہیں - درایت کے تقاضے نظر انداز ہو جاتے نظر آتے ہیں - اس کا سبب ان کی متخیلہ کی فراوانی اور مدرکہ کی کمزوری ہے - ہم تمام روداد میں عجیب و غریب واقعات کیوں قبول کرتے چلے جاتے ہیں - صرف اس لیے کہ اس وقت متخیلہ پر مدرکہ کا کوئی قابو نہیں رہتا اور مؤخرالذکر کی سب سرود داستان طرازی سراسر حقیقت معلوم ہوتی ہے - اسی طرح آزاد کی تخیل پروری اور ان کی زود اعتقادی انہیں ان روایات پر ناقدانہ نگاہ ڈالنے کی فرصت نہیں دیتی -

دیکھیے اس دور از خیال روایت کو وہ کیسے بلا تامل قبول کرتے ہیں:

"ہائے دلی، خدا تجھے بہشت نصیب کرے - کیسے کیسے لوگ تیری خاک سے اٹھے اور خاک میں مل گئے - استاد مرحوم نے ایک دن فرمایا کہ شیخ مضمون کے زمانہ میں کوئی باہر سے محل میں آئے اور پلنگ پر لیٹ گئے - ایک بڑھیا ماما نئی نوکر ہوئی تھی - وہ حقہ بھر لائی اور سامنے رکھا - نواب صاحب کی زبان پر اس وقت شیخ مضمون کا شعر تھا:

ہم نے کیا کیا نہ ترے عشق میں محبوب کیا
صبر ایوب کیا گریۂ یعقوب کیا

ماما سنکر بولی - الٰہی تیری اماں - اس گھر میں تو آتے ہی پیغمبری وقت پڑ رہا ہے - بیچارے نوکروں پر کیا گزرے گی - چلو بابا یہاں سے گویا یہ کافی نہ تھا -

فٹ نوٹ میں لکھتے ہیں: دیکھو - ایسی ایسی باتیں اس زمانہ میں اس قدر عام تھیں

---

(۱) آزاد، محمد حسین، دربار اکبری - ص ۲۲۴، ۲۲۵ -

کہ بڑھیاں ، عورتیں اور ماماٗیں ان سے اور لطیفے پیدا کرتی ہیں ۔ اب اللہ ہی اللہ ہے "(۱)۔

ماضی کی بابت بے حد خوش اعتقادی اور عہد جدید پر طنز آزاد کی طبیعت کے دو اہم پہلو ہیں اور ان دونوں کی یہ ایک عمدہ مثال ہے ۔ اسی طرح وہ مصحفی کے حال میں لکھتے ہیں :

"تعجب ہے ان لوگوں سے جو شکایت کرتے ہیں کہ پہلے بزرگوں کی طرح اب لوگ صاحبِ کمال نہیں ہوتے ۔ پہلے لوگ جو کتاب دیکھتے تھے تو اس کے مضمون کو اس طرح دل و دماغ میں لیتے تھے جس سے اس کے اثر دلوں میں نقش ہو جاتے تھے ۔ آج کل کے لوگ پڑھتے بھی ہیں تو اس طرح مضمون سے عبور کر جاتے ہیں گویا بکریاں ہیں کہ باغ میں گھس گئی ہیں ۔ جہاں مونہہ پڑ گیا بھر لیا ۔ ناق حمر نہیں ۔ ہوس کا حرواہا ان کے گھوروں پر سوار ہے ۔ وہ دبائے جاتا ہے یعنی امتحان پاس کرکے ایک سند لو نوکری لے بیٹھ رہو اور افسوس ہے کہ نوکری بھی نصیب نہیں"(۲) ۔

آزاد آپ کو ہر جگہ ماضی کے محاسن میں رطب اللسان نظر آئیں گے اور اگر لا محالہ کبھی ماضی کی خامیوں سے بھی دو چار ہونا پڑتا ہے تو جھٹ اس کا کوئی خوش آئند پہلو نکال لیتے ہیں ۔ اس کے برعکس عہد جدید کہیں بھی ان کی نظر میں جچتا نظر نہیں آتا اور موقعہ بے موقعہ اس کی تنقیص پر اتر آتے ہیں اور یہ سب کچھ جذبہ کی وجہ سے ہے ۔

لیکن یاد رہے کہ یہ آزاد کی طبیعت کا صرف ایک رخ ہے ، اگرچہ یہ اس کا اہم ترین رخ ہے ۔ ان کی طبعیت کا دوسرا رخ ان کی تنقیدی صلاحیت ہے ، جو انہیں عہد جدید سے منسلک کرتی ہے ۔ عقلی طور پر آزاد نے عہد جدید اور اس کی تہذیب کو قبول کر لیا تھا اور ان کی تمام عمر اس کی آبیاری اور توسیع و ترقی میں صرف ہوئی ۔ یہ ناقدانہ عمل ان کی تصانیف میں صاف صاف دکھائی دیتا ہے ۔ اگر وہ ایک طرف پرانی شاعری کے گرویدہ ہیں تو دوسری طرف اس کے نقائص بھی ان پر واضح ہیں اور وہ زندگی بھر اس کی اصلاح میں کوشاں رہے ۔

طرزِ نگارش

آزاد کے طرزِ نگارش کی بابت ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری معلوم ہوتا ہے ۔ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ ان کے اسلوب کی سب سے نمایاں اور قابل تعریف خصوصیت

---

(۱) آزاد ، محمد حسین ، آب حیات ۔ ص ۱۰۲ ۔
(۲) " " " آب حیات ۔ ص ۳۱۰ ، ۳۱۱ ۔

تخیل کی رنگ آمیزی ہے جس کے لیے تمثیل ، استعارہ اور تشبیہہ استعمال ہوتے ہیں - یہ درست ہے کہ آزاد کے اسلوب میں نقش امیجری کو بہت کچھ دخل ہے - لیکن اگر بغور دیکھا جائے تو اسے محض ایک ثانوی حیثیت حاصل ہے - آزاد کو اردو نثر میں جو بلند مقام حاصل ہے - اس کا اصلی سبب دہلی کے طبقہ شرفا کی بول چال کی زبان یا ایسا روزمرہ جس سے عامیانہ عناصر کو نکال دیا گیا ہے ، کا برجستہ اور ماہرانہ استعمال ہے -

آزاد کو اردو نثر میں جو بلند مقام حاصل ہے وہ بالخصوص بیانیہ اور وصفیہ نثر کی وجہ سے ہے - یہاں آزاد کا سب سے بڑا وصف محاکات ہے - وہ دیکھی یا ان دیکھی باتوں اور چیزوں کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ وہ اپنے اصلی رنگ روپ میں ہمارے سامنے آ جاتی ہیں - 'قصص ہند' کی بڑی خوبی یہی ہے اور یہی حال 'آب حیات' کا بھی ہے - 'سخن دان فارس' میں چشم دید واقعات یا اشیاء کی ایسی عمدہ مصوری ہوئی ہے کہ جو کچھ آزاد نے دیکھا تھا ہم بھی وہی دیکھتے ہیں اور جس طرح وہ ان واقعات سے متاثر ہوئے تھے - ہم بھی بالکل ایسے ہی ہیں متاثر ہوتے ہیں - اس لحاظ سے آزاد ایک مصور ہیں جو الفاظ کے رنگ و روغن سے جیتے جاگتے مرقعے تیار کر گئے ہیں - یہاں یہ یاد رکھنا از بس ضروری ہے کہ اس محاکات کے لیے صرف زبان پر قدرت ہی ضروری نہیں بلکہ مصنف کو نفسیات پر بھی دسترس ضروری ہے تاکہ اس کے کردار جو کچھ کریں یا کہیں یا موقع محل ہو انہیں نفسیاتی حقیقت نگاری میں آزاد کو خاص امتیاز حاصل ہے - آزاد میں آپ کو کہیں بھی یہ احساس نہیں ہوتا کہ کردار جو کچھ کہہ رہا ہے یا کر رہا ہے یا سوچ رہا ہے وہ اس کی شخصیت اور مقام کے منافی ہے اور در حقیقت یہ بہت بڑی بات ہے -

آزاد کی بہترین وصفیہ اور بیانیہ نثر میں امیجری موجود ہے - لیکن اس کا احساس نہیں ہوتا - سبب یہ ہے کہ وہ خالصاً ذریعۂ اظہار ہے جس طرح ایک تیز رفتار ندی بڑے بڑے پتھروں کو اپنے ساتھ بہا لیے جاتی ہے - بالکل اسی طرح ایک بند موضوع میں بھی نقوش کو جذب کرنے کی طاقت ہوتی ہے - ذیل کے اقتباس میں جذبہ اتنا تیز ہے کہ کی موجودگی کا ذرا احساس نہیں ہوتا - بات یہ ہے وہ اظہار کا جزو لاینفک ہیں اور ان میں سے کسی ایک کے تغیر بھی مضمون کی تاثر پذیری میں فرق آ جائے گا :

''غرض ان لق و دق میدانوں کو لپیٹ پلیٹ کر دفعتاً اجمیر پر جا پہنچا - اگرچہ کوئی راجہ محمود کے حال سے غافل نہ تھا مگر یہ بھی حال نہ تھا کہ ایسے میدان طے کرکے یہ طوفان یکایک بجلی کی طرح آن گرے گا - راجہ اور شہر کے لوگ جو بھاگ سکے وہ جان لے کر بھاگ گئے - مگر اس آندھی سے شہر میں چراغ اور باہر تنکا تک

نہ رہا ۔ تارا گڑھ کا قلعہ سامنے پہاڑ پر چمک رہا تھا ۔ مگر دیکھا کہ اس کے محاصرے میں خدا جانے کتنے دن لگیں اور کیا پیش آئے ۔ اس لیے سیدھا منزلِ مقصود کا رخ کیا ۔ راستے میں جو قلعے اور شہر نظر آئے انہیں ٹکراتا اور سامان خدا داد سمیٹتا ، وہ منزل بہ منزل کرتا چلا جاتا تھا کہ سمندر کے کنارے پر ایک قلعہ عالیشان نمودار ہوا جس کا ایک ایک برج سر بفلک تھا اور دریا کی لہریں پاؤں میں لوٹ رہی تھیں''(۱) ۔

یا 'سخن دان فارس' سے یہ اقتباس ملاحظہ ہو :

''دفعتاً ہوا بند ہوئی ۔ ابر ا گھر آیا ۔ دنیا دھواں دھار ہو گئی ۔ پھر سفید غبار سا برستا معلوم ہوا ۔ تھوڑی دیر بعد دیکھا تو زمین پر کونھوں پر دیواروں اور منڈیروں پر کوئی سفید آٹا چھڑک گیا ۔ غرض ایک جھکولا برف کا اور پڑا ۔ رات گزری ، صبح کو دیکھا تو تمام درختوں پر برگ ریز کا حکم پہنچ گیا ۔ دوسرے دن ایک جھکولا اور ۔ اور ساتھ ہی ایک سناٹا ہوا کا آیا ۔ پھر جو دیکھا تو درخت پر پتے کا نام نہیں ۔ جو درخت ہفتہ بھر پہلے پتوں سے بھری دیتے اب خالی جھاڑیاں کھڑے ہیں جیسے کسی نے کپڑے اتار لیے ہوں ۔ ہی سا رنگ جیسے تھی سارا لوہا ایک دو دن بعد برف برسی شروع ہوئی مگر کس طرح ؟ جیسے کوئی آسمان پر دھنیا روئی دھنک رہا ہے ۔ ایک دن رات چوبیس گھنٹے کا تار لگا تو درو دیوار ۔ زمین آسمان تمام سفید ۔ وہ سیاہ جھاڑیاں برف جم کر بلور کے درخت اور شیشہ کی ساخت بن گئیں''(۲) ۔

اوپر کہا گیا ہے کہ الفاظ ہوں یا نقوش دونوں آلاتِ اظہار ہیں اور ان کی خوبی کا واحد معیار موزونیت ہے ۔ کہ وہ اظہارِ مطالب میں معاون و مددگار ثابت ہوتے ہیں یا اس کی راہ میں حارج ہوتے ہیں ۔ آزاد کی بیانیہ نثر میں وہ اکثر مددگار ثابت ہوتے ہیں لیکن جب آزاد مجرد خیالات کو تخیل کا جامہ پہنا کر محسوسات کی شکل میں پیش کرتے ہیں تو بجائے اس کے کہ ان کے خیالات ظاہر ہوں ان پر ایک طرح کا پردہ پڑ جاتا ہے اور ان مطالب تک رسائی کے لیے قاری کو اس پردہ رنگین کو ہٹانے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے ۔ ایسے مواقع پر جو آزاد میں بکثرت ملتے ہیں ، وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ فکر کا تعلق دماغ سے ہے جس میں مجرد خیالات سے متاثر ہونے کی صلاحیت ہے اور جہاں متخیلہ کی بے جا مدافعت غیر موزوں دکھائی دیتی ہے ۔ ذیل کا اقتباس نقوش کے بے جا استعمال کی

---

(۱) آزاد ، محمد حسین ، قصص ہند ۔ حصہ دوم ۔ ص ۱۱ ، ۱۲ ۔

(۲) " " " سخن دان فارس ۔ ص ۱۸۸ ۔

ایک واضح مثال ہے :

"یہ نظم اردو کی نسل کا آدم جب ملک عدم سے چلا تو اس کے سر پر اولیت کا تاج رکھا گیا جس میں وقت کے محاورے نے اپنے جواہرات خرچ کیے اور مضامین کی رنگ آمیزی دستکاری سے مینا کاری کی"[1]

طبعی امتحان نا تنقیدی حاسہ کی کمزوری کی وجہ سے آزاد کو بے مصرف تشبیہات و استعارات کے استعمال کی عادت ہو گئی تھی اور وہ سیدھی سادھی باتوں کے لیے بھی تشبیہ اور استعارہ استعمال کرنے لگے ۔ مثال کے طور پر :

(۱) اگرچہ علوم نے اس کی آنکھوں پر عینک نہ لگائی تھی اور فنون نے دماغ پر دستکاری نہیں خرچ کی تھی پر اجداد کا عاسی تھا[2] ۔

(۲) ملا صاحب اس مقدمے کو بھی غصے کی وردی پہنا کر کتاب میں لائے ہیں[3] ۔

(۳) تحسین و آفرین کے طرے اس کے سر پر لگائے[4] ۔

ان سب مثالوں میں براہ راست اظہار کی ضرورت ہے اور نقوش بالکل غیر ضروری ہیں ۔ اس کے برعکس ذیل کی مثالوں میں وہ نہایت موزوں ہیں :

(۱) پورب کا ایک شیر شاہی سرکشوں سے افغانستان ہو رہا تھا اور ایک راجہ بکرماجیت اور راجہ دیوج بنا ہوا تھا[5] ۔

(۲) تمام ملک باغیوں سے بھڑوں کا چھتہ بنا ہوا تھا[6] ۔

(۳) جو ہم قوم ترک اس وقت ہمارے ساتھ ہیں وہ دو دھاری تلواریں ہیں جو جدھر فائدہ دیکھتے ادھر ہو گئے[7] ۔

ذیل کی اس تدبیری کی ایک اور مثال رعایات لفظی کا استعمال ہے ۔ تشبیہ اور استعارہ ، ایک شے کی کسی دوسری شے کے ایک یا زیادہ پہلوؤں کی بنا پر فرضی یا واقعی

---

(۱) آزاد ، محمد حسین ، آب حیات - ص ۸۸ -
(۲) " " " دربار اکبری - ص ۱۰۶ -
(۳) " " " دربار اکبری - ص ۵۵ -
(۴) " " " دربار اکبری - ص ۳۰ -
(۵) " " " دربار اکبری - ص ۲۲ -
(۶) " " " ایضاً - ص ۲۲ -
(۷) " " " ایضاً - ص ۶۲ -

مشابہت فراہم کی جاتی ہے ۔ رعایتِ لفظی میں الفاظ میں صوتی یا معنوی مماثلت کی تلاش ہوتی ہے ۔ آزاد کے پر زور متخیلہ کا یہ ایک اور اہم پہلو ہے ۔ جب کوئی خاص لفظ ان کے دماغ میں آتا ہے تو اس کے ساتھ ہی معنی اور ہم صورت الفاظ بھی یاد آتے چلے جاتے ہیں اور وہ انہیں بلا قصد استعمال کرتے چلے جاتے ہیں ۔ یہاں بھی صحیح معیار موزونیت اور بلاغت ہیں ۔ بہ حیثیت مجموعی اگر رعایات لفظی کا سلامت روی اور اعتدال سے استعمال کیا جائے اور آورد کے باوجود آمد کا احساس ہو تو وہ مطبوع ہے ورنہ نہیں ۔ مثال کے طور پر :

تمام دربار چمک اٹھا اور میاں جگنو مدہم ہو کر رہ گئے[۱] ۔
رعایت لفظی کی ایک عمدہ مثال ہے ۔ لیکن :

"جب ہمیوں نے سنا کہ آتش خانہ اس بے آبروی کے ساتھ ہے ہاتھ سے گیا تو دماغ نجکِ کی طرح اُڑ گیا ۔ دلی سے دھواں دھار ہو کر بڑھا[۲] ۔
سراسر آورد ہے اور اس لیے بے لطف ۔

آخر میں یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ بمقابلہ سید احمد خان ، شبلی اور حالی ، آزاد پرانے اسالیب سے بہت متاثر ہیں اور ان کے فقروں کی ترکیب میں فارسی نحو کا اثر صاف دکھائی علاوہ ازیں انہیں قوافی کے استعمال کا بہت شوق ہے اور ان کی تمام تصانیف میں اس کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں ۔ دیکھیے 'آب حیات' کا آغاز اس فقرہ سے ہوتا ہے :

"آزاد ہندی نہاد کے بزرگ فارسی کو اپنی تیغ زبان کا جوہر جانتے تھے"

بحیثیت مجموعی ان کے اسلوب میں قدامت کے نشانات بکثرت ملتے ہیں ۔ جن سے ان کے ہم عصر نثر نگاروں یعنی سید احمد ، حالی ، شبلی کا دامن مقابلۃً پاک دکھائی دیتا ہے ۔

آزاد کی تصانیف میں ان کی انفرادیت صاف طور پر دکھائی دیتی ہے ۔ انیسویں صدی کا نصف دوئم خالصۃً اصلاح کا دور تھا ۔ اور اس دور کے تمام تر مصنفین کا رجحان سماجی یا مذہبی اصلاح کی طرف تھا ۔ آزاد نے بھی اول اول 'انجمنِ پنجاب' کے زیر اثر چند اصلاحی مضامین لکھے ۔ کہیں انہیں موضوع سے کوئی طبعی رغبت نہ تھی اور نہ ہی ان مضامین کو کوئی ادبی یا معنوی خصوصیت حاصل ہے ۔ آزاد ایک خالص ادیب تھے ۔ ان کی بیشتر تصانیف احیائے ماضی سے تعلق رکھتی ہیں اور انہیں ادب میں جو بلند مقام حاصل ہے وہ انہیں تصانیف کی وجہ سے ہے ۔

---

(۱) آزاد ، محمد حسین ، آب حیات ۔ ص ۱۲۵ ۔
(۲) " " " دربار اکبری ۔ ص ۱۹ ۔

دسواں باب

مولوی نذیر احمد دہلوی

سوانحی خاکہ

نذیر احمد ۔ صدیقی شیوخ کے ایک بزرگ خانوادے سے تعلق رکھتے تھے جو نواح بجنور (یو ۔ پی، بھارت) میں آباد تھا ۔ ان کے اجداد سولھویں صدی عیسوی سے انیسویں صدی تک تصوف کے مسند رشد و ہدایت اور حکومت کے مناصب قضا و افتا پر فائز رہے ۔ نذیر احمد کا سلسلۂ نسب آٹھ واسطوں سے حضرت شیخ عبدالغفور اعظم پوری رح تک پہنچتا ہے جو حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی رح کے جلیل القدر خلفاء[1] اور علمائے مشاہیر وقت میں سے تھے[2] ۔ ان کے اخلاف میں سے شیخ ابوالفضل معروف بہ 'پیر فضل' قاضیٔ شہر بجنور کی اولاد آخر وقت تک بجنور کے محلہ پیر زادان میں آباد رہی ۔ پیر فضل ، ددھیالی اور ننھیالی رشتوں سے نذیر احمد کے جد تھے ۔ صاحب 'حیات النذیر' نے نذیر احمد کی تاریخ پیدائش ۶ دسمبر ۱۸۳۶ء بیان کی ہے[3] ۔ لیکن ان کی تعلیم و تربیت کے بارے میں جو تفصیلات درج کی ہیں ، ان کے پیش نظر نیز دیگر واقعات کے سنین جو بہ تحقیق معلوم ہیں ، ان کی بنا پر نذیر احمد کا سنہ پیدائش ۱۸۳۰ء متعیّن کیا جا سکتا ہے ۔ چار سال کی عمر میں نذیر احمد اپنے والدین کے ساتھ بجنور آ گئے جہاں ان کا جدّی مکان و جائداد تھی ۔ ان کے والد مولوی سعادت علی نے معلّمی کا پیشہ اختیار کیا ۔ نذیر احمد نے فارسی کی متداول کتابیں اپنے والد سے پڑھیں ۔ ۱۸۳۹ء میں مولانا نصراللہ خان خورجوی رح ، بجنور میں ڈپٹی کلکٹر ہو کر آئے[4] ۔ وہ عربی و فارسی کے عالم ، مصنّف ، شاعر اور ایک صاحب سلسلہ صوفی تھے ۔ اپنے فارغ اوقات ، مریدوں کی روحانی تربیت ، تصنیف و تالیف اور درس و تدریس میں صرف کرتے تھے ۔ نذیر احمد اور ان کے بھائی ڈپٹی صاحب سے عربی صرف و نحو در فلسفہ و منطق کا درس لینے لگے ۔ ۱۸۴۲ء میں ڈپٹی صاحب کا تبادلہ ہو گیا[5] ۔ نذیر احمد کے والد انہیں دہلی لے گئے (اور پنجابی کٹھرے کی مسجد میں مولوی عبدالخالق کے حوالے کر دیا ۔ اورنگ آبادی مسجد کا یہ مدرسہ ، دہلی

---

(۱) مولانا اعجاز الحق قدوسی ، شیخ عبدالقدوس گنگوہی اور ان کی تعلیمات ۔ ص ۵۷۳ ۔

(۲) رحمان علی خان ، تذکرۂ علمائے ہند ۔ ص ۱۲۵ ۔

(۳) افتخار عالم مارہروی ، حیات النذیر ۔ ص ۳ ۔

(۴) مولانا فرید احمد غازی پوری ، بیاض جان فزا خاتمہ بیاض دلکشا ۔ ص ۳۹ ۔

(۵) ,, ,, ,, بیاض جان فزا خاتمہ بیاض دلکشا ۔ ص ۳۹ ۔

کے بہترین مدارس میں شمار ہوتا تھا ، لیکن طلبہ کو محلے کے گھروں سے روٹی مانگ کر لانا پڑتا تھا ۔ نذیر احمد کی غیور و خود دار طبیعت مدرسے کی گدایانہ زندگی سے سخت بیزار تھی ۔) جنوری ۱۸۴۶ء[1] میں نذیر احمد اور ان کے بھائی دہلی کالج میں داخل ہوگئے جہاں تعلیم کا بہتر انتظام تھا اور طلبہ کو وظیفہ بھی ملتا تھا ۔ یہ کالج شمالی ہند میں جدید علوم کی نشر و اشاعت اور ترجمہ و تالیف کا اولین مرکز تھا ۔ نذیر احمد آٹھ سال تک دہلی کالج میں زیر تعلیم رہے ۔ یہیں وہ جدید علوم کی قدر و قیمت اور نئے دور کے تقاضوں سے آشنا ہوئے ۔ کالج کے ان اثرات کا ذکر وہ فخریہ طور پر اپنے لیکچروں میں کیا کرتے تھے[2] ۔ تعلیمی زندگی کے آخری زمانے میں انہوں نے راشدی کے رسوم و قیود سے بغاوت کرکے مولوی عبدالخالق کی پوتی سے عقد کیا اور دہلی میں مستقل سکونت اختیار کر لی ۔ ۱۸۵۴ء میں کنجاہ ضلع گجرات کے مدرسے میں معلم مقرر ہوئے ۔ ۱۸۵۶ء میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہو کر کانپور گئے ۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے شروع ہوئے تو دہلی چلے آئے ۔ جنگ آزادی کے ابتدائی مرحلے میں نذیر احمد اور ان کے سسرالی بزرگوں نے ایک انگریزی خاتون مسز لیسن کی جان بچائی ۔ اس خیر خواہی کے نتیجے میں ان کا خاندان تباہی سے بچ گیا ۔ نذیر احمد کی ملازمت بھی بحال ہو گئی اور وہ الہ آباد میں ڈپٹی انسپکٹر کے عہدے پر مامور ہو گئے ۔ یہاں انہیں ایک دیرینہ آرزو یعنی انگریزی سیکھنے کا موقع مل گیا ۔ اس زمانے میں حکومت کو سرکاری قوانین کے ترجموں کے لیے مترجمین کی ضرورت تھی ۔ نذیر احمد نے ترجمے کی مشق بہم پہنچائی ۔ ۱۸۶۰ء کے لگ بھگ جب 'انڈین پینل کوڈ' کے ترجمے کا کام شروع ہوا تو منشی عظمت اللہ اور مولوی کریم بخش کے ساتھ وہ بھی اس مہم میں شریک ہوئے اور اپنی فنی و لسانی مہارت کی بدولت شریک غالب قرار پائے ۔ اس خدمت کے صلے میں ۱۸۶۲ء میں تحصیلدار اور ۱۸۶۳ء میں ڈپٹی کلکٹر کے عہدے پر فائز ہوئے ۔ ۱۸۶۸ء میں حکومت نے معیاری کتابوں پر انعامی مقابلے کا اعلان کیا ۔ ۱۸۶۹ء میں انہوں نے اپنی کتاب 'مرآۃ العروس' مقابلے میں پیش کی اور اول انعام پایا ۔ ۱۸۷۲ء سے ۱۸۷۷ء تک وہ اعظم گڑھ میں کلکٹر رہے ۔ یہ ان کی ادبی زندگی کا سب سے کامیاب دور تھا ۔ اسی زمانے میں انہوں نے 'بنات النعش' ، 'توبۃ النصوح' اور 'مبادی الحکمت' پر حکومت سے انعامات حاصل کیے اور 'سماوات' کے نام سے جدید علم ہیئت پر ایک فرانسیسی تصنیف کے انگریزی ترجمے کو اردو میں منتقل کیا ۔ فروری ۱۸۷۷ء میں نذیر احمد کو سر سید احمد خان کی وساطت سے ریاست حیدر آباد دکن میں سالار جنگ کے ہاں ملازمت کی پیشکش ہوئی ۔ تنخواہ اور پنشن کے معاملات

---

(۱) افتخار احمد صدیقی ، ڈاکٹر ، نذیر احمد اور ان کا ادب (مقالہ پی - ایچ - ڈی پنجاب یونیورسٹی) - باب اول ۔

(۲) مولوی بشیر الدین احمد ، لیکچروں کا مجموعہ ، جلد دوم - ص ۴۱۹ -

حسبِ منشا طے کرکے وہ حیدر آباد چلے گئے ۔ سر سالارِ جنگ نے اپنے عہدِ اقتدار کے آخری زمانے میں نذیر احمد کو سترہ سو روپے ماہوار کے مشاہرے پر مجلسِ مال کا رکن مقرر کیا ۔ ۸ فروری ۱۸۸۳ء[1] کو سر سالارِ جنگ کی وفات کے بعد وزارت و اقتدار کی کشمکش شروع ہوئی ۔ ہر طرف سازشوں کے جال بچھ گئے ۔ چنانچہ ۲۵ فروری ۱۸۸۴ء[2] کو استعفیٰ دے کر دہلی چلے آئے ۔ چھ سو روپے ماہوار پنشن مقرر ہو گئی ۔

حیدر آباد کی ملازمت کے زمانے میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ منقطع ہو گیا تھا ۔ ۱۸۸۴ء میں جب وظیفہ یاب ہو کر دہلی آ گئے تو نذیر احمد کی تخلیقی صلاحیتیں پھر بروئے کار آئیں اور ان کی ادبی زندگی کے دوسرے دور کا آغاز ناول نگاری سے ہوا ۔ ۱۸۹۳ء سے مذہبی تصانیف کا سلسلہ قرآنِ مجید کے ترجمے سے شروع ہوا جو وفات سے چند سال قبل تک جاری رہا ۔ ۱۸۹۷ء میں حکومت کی طرف سے شمس العلماء کا خطاب ملا اور ۱۹۰۲ء میں ایڈنبرا یونیورسٹی نے ایل ۔ ایل ۔ ڈی کی اعزازی ڈگری عطا کی ۔ ۱۸۸۸ء میں نذیر احمد ، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اسٹیج پر قومی رہنما کی حیثیت سے نمودار ہوئے ۔ لیکن سر سید اور علی گڑھ تحریک سے ان کے روابط بہت پرانے تھے ۔ ۱۸۸۸ء سے ۱۹۰۵ء تک وہ قومی اسٹیج کے ہیرو بنے رہے اور ایجوکیشنل کانفرنس کے علاوہ انجمن حمایت اسلام لاہور اور مدرسہ طبیہ دہلی کے سالانہ جلسوں میں اپنی بلند آہنگ خطابت سے عوام و خواص کو مسحور کرتے ہیں ۔ نذیر احمد کے خطبات ان کی غیر معمولی ذہانت ، وسعتِ معلومات ، حقیقت پسندی اور زمانہ شناسی کے مظہر اور ان کی باغ و بہار شخصیت کی جلوہ گری کا بہترین وسیلہ ہیں ۔ لیکن کبھی کبھی ان کی شوخیٔ طبع ، تہذیب و ثقافت کی حد سے گزر جاتی تھی ۔ چنانچہ دو ایک جلسوں میں ان کے طنز و تمسخر سے ایسی نا خوشگوار صورتِ حال پیدا ہوئی کہ وہ قومی جلسوں سے ہمیشہ کے لیے کنارہ کش ہو گئے ۔ لیکن چند سال بعد ان کی شوخیٔ تحریر نے اور شگوفہ کھلایا ۔ ان کی تصنیف 'امہات الامہ' کے خلاف تکفیر کا ہنگامہ برپا ہوا اور اس کتاب کی تمام جلدیں جلا دی گئیں ۔ اس واقعے کے بعد تصنیف و تالیف کا سلسلہ ختم ہو گیا ۔ ۱۹۱۲ء میں چند ماہ کی علالت کے بعد ۲۷ اپریل کو فالج کا حملہ ہوا ۔ ۳ مئی کو بروز جمعہ وفات پائی اور گورستان حضرت خواجہ باقی باللہ میں مدفون ہوئے ۔

---

(۱) مولوی اکرام اللہ خان ندوی ، وقار حیات ص ۷۵ ، ۷۶ ۔

(۲) ،، ،، ،، وقار حیات ۔ ص ۷۵ ، ۷۶ ۔

ادبی خدمات

ناول نگاری

نذیر احمد کی ادبی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے - تراجم (قانونی ، علمی ، تاریخی ، مذہبی) کے علاوہ ان کی تصانیف ، مذہب ، تاریخ و سیرت ، در سیاست و اخلاقیات ، خطابت و مکتوب نگاری اور قومی شاعری جیسے متنوع موضوعات سے متعلق ہیں - لیکن اس میں شک نہیں کہ نذیر احمد کے ناول ہی ان کی تخلیقی صلاحیتوں کا بہترین مظہر ہیں - ان کی ناول نگاری کے بارے میں بعض بنیادی نکات کی وضاحت ضروری ہے جنھیں نظر انداز کر دینے سے بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہو سکتی ہیں - پہلی بات یہ کہ نذیر احمد کے ناول دو مختلف ادوار سے متعلق ہیں - ان کی ناول نگاری کا پہلا دور ۱۸۶۹ء سے ۱۸۷۴ء تک رہا - 'مرآۃ العروس' (۱۸۶۹) ، 'بنات النعش' (۱۸۷۲ء) اور 'توبۃ النصوح' (۱۸۷۴ء) اسی ابتدائی دور کے ناول ہیں - دوسرا دور دس سال کے طویل وقفے کے بعد ۱۸۸۴ء میں شروع ہوا اور ۱۸۹۳ء تک رہا - اس مدت میں محصنات 'فسانۂ مبتلا' (۱۸۸۵ء) ، 'ابن الوقت' (۱۸۸۸ء) ، 'ایامیٰ' (۱۸۹۱ء) اور 'رویائے صادقہ' (۱۸۹۳ء) شائع ہوئے - پہلے اور دوسرے دور کے معاشرتی پس منظر ، محرکات و رجحانات میں بڑا فرق ہے - فنی ارتقاء کے لحاظ سے یہ فرق اور نمایاں ہو گیا ہے - نذیر احمد کی اصلاحی کہانیوں کو عموماً سر سید کی تحریک کا ضمیمہ سمجھا جاتا ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ تقسیمِ کار کے اصول پر عمل پیرا ہو کر سر سید نے قومی زندگی اور نذیر احمد نے خانگی زندگی کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا - لیکن حقیقت یہ ہے کہ نذیر احمد کے ابتدائی دور کے ناول اصلاحِ نسواں کی جس تحریک سے وابستہ ہیں اس کا علی گڑھ تحریک سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں - اس دور میں نذیر احمد کی توجہ ان مسائل پر مرکوز رہی جن کا تعلق خانگی زندگی یا حسنِ معاشرت سے ہے - ان کی قصہ گوئی اور کردار نگاری کا انداز بھی مبتدیانہ ہے - لیکن دوسرے دور میں ان کی مقصدیت وسیع تر قومی و معاشرتی مسائل پر محیط ہے اور ان کا فن بھی نکھر گیا ہے - اس فرق کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ نذیر احمد کی مقصدیت اور فن کے بارے میں بحث و نظر کا دائرہ بالعموم ان کے ابتدائی دور کے خانگی ناولوں تک محدود رہ جاتا ہے -

ایک عام غلط فہمی جو خود نذیر احمد کے اقوال اور ان کے سوانح نگار کے بیانات سے پیدا ہوئی ، یہ ہے کہ ان کی ناول نگاری کا آغاز غیر شعوری طور پر ہوا - انہوں نے اپنی بچیوں کی تعلیم کے لیے ایک قصہ لکھا جو اتفاقاً مسٹر کیمپسن ، ڈائرکٹر سر رشتۂ تعلیمات کے ہاتھ آ گیا - کیمپسن نے کتاب چھپوائی اور سرکار سے انعام دلوایا - گویا اردو

کے پہلے ناول کا ظہور ایک اتفاقی حادثہ ہے جس کا تعلق کسی خارجی تحریک سے نہیں۔ لیکن تحقیقی مطالعے کے نتیجے میں اب اس کا پس منظر واضح ہو گیا ہے اور 'مرآۃ العروس' سے پہلے مقصدی اور واقعاتی کہانیوں کا ایک سلسلہ نظر آتا ہے جس کا آغاز ۱۸۵۰ء کے لگ بھگ ہوا تھا۔ اس زمانے میں انگریزی حکومت نے جا بجا نئے طرز کے مدارس قائم کیے۔ شعبۂ تعلیم کے انگریز حکام کی رہنمائی میں نئے مدارس کی درسی ضروریات کے لیے ایسی کہانیاں لکھی جانے لگیں جن میں واقعیت کے ساتھ اصلاحی اور اخلاقی نقطۂ نظر نمایاں تھا۔ مثلاً ۱۸۵۱ء میں 'دھرم سنگھ کا قصہ' اور ۱۸۵۲ء میں 'سورج پور کی کہانی' اور 'سبھودھی کبودھی' کا قصہ شائع ہوا[۱]۔ یہ تینوں اخلاقی اور واقعاتی کہانیاں محکمۂ تعلیم کے حکام کی فرمائش پر لکھی گئیں اور صوبہ شمال مغربی کے مدارس میں برسوں تک رائج رہیں۔ صوبہ پنجاب کے مدارس کے لیے مولوی کریم الدین نے بھی اسی قسم کے سبق آموز قصے لکھے۔ جدید نظامِ تعلیم کے قیام کے ساتھ حکومت کی طرف سے تعلیمِ نسواں کی تحریک بھی شروع ہوئی۔ گارساں دتاسی کا بیان ہے:

> ''حکومت کی طرف سے اس کا انتظام کیا گیا ہے کہ تقاریر کے ذریعے تعلیمِ نسواں کی تحریک کو فروغ دیا جائے۔ چنانچہ ۱۸۵۱ء سے جب سے حکومت نے اس جانب توجہ کی ہے عورتوں میں تعلیم کا رواج بڑھتا جا رہا ہے۔ حکومت اپنے خرچ سے معلّمات کے لیے نارمل اسکول قائم کرا رہی ہے''[۲]۔ ۔ ۔ ۔

۱۸۶۰ء کے بعد علم دوست انگریز حکام کی رہنمائی میں جا بجا ثقافتی اور علمی انجمنیں قائم ہونے لگیں۔ بنارس، شاہجہان پور، آگرہ، لکھنؤ اور دیگر مقامات کی انجمنوں نے معاشرتی اصلاح اور بالخصوص تعلیمِ نسواں کے لیے مسلسل جد و جہد شروع کی۔ چنانچہ مختلف مرکزی شہروں میں لڑکیوں کے مدارس کھل گئے۔ (سر ولیم میور (گورنر صوبہ شمالی مغربی) اور مسٹر کیمپسن (ڈائریکٹر تعلیمات) کو سرکاری مدارس اور خصوصاً مدارسِ نسواں کے لیے مفید اور دلچسپ کتابوں کی شدید کمی محسوس ہوئی۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے محکمۂ تعلیم سے وابستہ اہلِ قلم نے کچھ کتابیں لکھیں۔ خود مسٹر کیمپسن نے ۱۸۶۴ء میں 'داستان جمیلہ خاتون' کے نام سے ایک سبق آموز قصہ لکھا جس کا مفصل ذکر گارساں دتاسی نے ۱۸۶۵ء کے خطبے میں کیا ہے[۳])۔ لیکن

---

(۱) محمد عتیق صدیقی، صوبہ شمالی مغربی کے اخبارات و مطبوعات۔ ص ۱۵۶، ۱۵۷۔

(۲) خطبات گارساں دتاسی۔ ص ۹۲، ۶۹۱۔

(۳) ایضاً۔ ص ۴۳۴۔

درسی ضروریات کے ماتحت اب تک جتنی کہانیاں لکھی گئیں ان میں ابتدائی درجے کی واقعیت کے عناصر کم و بیش مشترک ہیں ، لیکن روزمرہ زندگی کا عکس کہیں نہیں ملتا ۔ البتہ 'رسومِ ہند' (۱۸۶۸ء) کے تین قصوں میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی معاشرتی زندگی کی صحیح عکاسی کی گئی ہے ۔ یہ قصے زبان و بیان کی سادگی اور حقیقت نگاری کے لحاظ سے جدید افسانوں سے بہت ملتے جلتے ہیں ۔ چونکہ یہاں قصہ گوئی کا مقصد محض یہ تھا کہ پیدائش سے لے کر موت تک تمام مذہبی و معاشرتی رسمیں بیان کی جائیں لہذا ان میں فنی تشکیل ، مرکزی تاثر ، نقطۂ نظر اور کردار نگاری کا فقدان ہے ۔

اس طرح جدید نظامِ تعلیم کے تقاضوں اور اصلاحِ نسواں کی تحریک کے زیرِ اثر جدید قصہ گوئی کا رجحان بڑھتا رہا ۔ اس رجحان کو حکومت کے اس اعلان سے مزید تقویت حاصل ہوئی کہ ہر سال بہترین مصنف ، مؤلف یا مترجم کو انعامات دیے جائیں گے ۔ (مولانا حالی کا بیان ہے کہ جب سر سید کی تجویز کے مطابق سر ولیم میور کی حکومت کی طرف سے ۲۶ اگست ۱۸۶۸ء کو انعامی اشتہار جاری ہوا تو "اس اشتہار کا اثر تمام گروہ میں جو دیسی زبانوں میں تصنیف و تالیف کی کم و بیش لیاقت رکھتا تھا . . . . برق رو کی طرح دوڑ گیا"[1] ۔) نذیر احمد محکمۂ تعلیم سے وابستہ رہ چکے تھے ۔ اس لیے جدید اصلاحی تحریکات اور تعلیمی ضروریات سے کما حقہٗ آشنا تھے ۔ انھیں اپنی دونوں بڑی لڑکیوں کی تعلیم کے سلسلے میں دلچسپ اور سبق آموز کتابوں کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی ۔ حکومت کے اس اشتہار نے ایک قومی محرک بن کر ان کی ادبی صلاحیتوں کو ابھار دیا ۔ ۱۸۶۹ء میں انھوں نے 'مرآۃ العروس' لکھ کر انعامی مقابلے میں پیش کیا جسے متفقہ طور پر اردو کا پہلا ناول تسلیم کیا جاتا ہے ۔ ممکن ہے تلاش و تحقیق سے انگریزی ناول کا کوئی ایسا ترجمہ دستیاب ہو جائے جو اس سے پہلے شائع ہوا ہو ، لیکن اردو کی کہانیوں میں یہ پہلی طویل واقعاتی کہانی ہے جس میں معاشرتی حقیقت نگاری کے ساتھ عام زندگی کے جانے پہچانے کردار ، ایک واضح نقطۂ نظر اور اس نقطۂ نظر کے مطابق روزمرہ زندگی کے واقعات پر مشتمل پلاٹ کی تشکیل ، برجستہ مکالمے ، غرض وہ تمام خصوصیات ابتدائی صورت میں موجود ہیں جو قدیم داستان اور جدید ناول میں حدِّ فاصل قرار دی جاتی ہیں ۔

نذیر احمد کے ابتدائی ناولوں کا جائزہ لیتے وقت ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ اگرچہ ان کا تعلق براہِ راست تعلیمِ نسواں کی نیم سرکاری تحریک سے تھا ، لیکن نذیر احمد کے فکری روابط کا سلسلہ ماضی میں تحریکِ اصلاحِ رسوم اور حال میں سر سید احمد خان کی

---

(۱) حالی ، الطاف حسین ، حیات جاوید ۔ ص ۳۹۸ ۔ (طبع جدید ۔ لاہور)

نوزائیدہ تحریک سے استوار تھا - یہی وجہ ہے کہ ابتدا ہی سے ان کے ناولوں میں ہمہ جہت مقصدیت کارفرما نظر آتی ہے -

تعلیمِ نسواں کے بارے میں نذیر احمد ایک بلند نصب العین رکھتے تھے - ان کے نزدیک عورت کا دائرۂ عمل صرف خانہ داری کے معمولی انتظامات تک محدود نہیں - 'مرآۃ العروس' کے دیباچے میں انہوں نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ عورتوں کو اپنے شوہر کی مونس و غم گسار اور زندگی کے تمام معاملات میں اس کا بہترین مشیر و معاون ہونا چاہیے[1] - ماں کی حیثیت سے اولاد کی اعلیٰ تربیت بھی ان کے فرائض میں شامل ہے جس کے لیے اعلیٰ تعلیم اور دیگر علوم سے واقفیت ضروری ہے - نذیر احمد نے اپنے ابتدائی ناولوں میں انہی مقاصد کو پیشِ نظر رکھا ہے - 'مرآۃ العروس' میں اصغری و اکبری کی کہانی سے اخلاق اور امورِ خانہ داری کی تعلیم مقصود ہے - 'بنات النعش' کا موضوع معلومات عامہ ہے اور 'توبۃ النصوح' کا تربیتِ اولاد ہے - انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد قدیم جاگیردارانہ نظام کی جگہ بتدریج ایک نیم صنعتی سرمایہ دارانہ نظامِ معیشت قائم ہونے لگا - علم و ہنر اور صنعت و تجارت کا دور شروع ہوا - معاشی خوش حالی کے لیے مسرفانہ رسوم و عادات سے انحراف اور محنت و مشقت ناگزیر ہو گئی - نذیر احمد نے عہدِ نو کے ان تقاضوں کے پیشِ نظر معاشرتی خرابیوں کا جائزہ لیا اور اسلام کی علمی و جمہوری اقدار کی بنیاد پر معاشرے کی تعمیرِ نو کا خاکہ مرتب کیا - 'مرآۃ العروس' میں اکبری اور اصغری کے روپ میں محض پھوہڑ پن اور سگھڑ پن کے مثالی نمونے ہی نہیں پیش کیے گئے بلکہ جاگیرداری عہد کی رسوم و روایات کو بھی ہدفِ تنقید بنایا گیا ہے - اصغری کی سسرال کے خانگی حالات اس بات کا ثبوت ہیں کہ متوسط گھرانے بھی جاگیردارانہ ذہنیت کی وجہ سے مالی بحران میں مبتلا تھے - اس کا نوجوان شوہر لہو و لعب میں وقت گزارتا ہے - شاہ خرچی اور رسم پرستی کی بدولت اقتصادی بد حالی انتہا کو پہنچی ہوئی ہے - گھر کا خرچ 'اچاپت' پر چلتا ہے - خاتونِ خانہ کی جہالت اور سادہ لوحی سے فائدہ اٹھا کر ماما عظمت جیسی عیّار خادمائیں خوب ہاتھ رنگی ہیں - اصغری نے اپنی کفایت شعاری اور حسنِ انتظام سے ایک مفلوک الحال گھرانے کی کایا پلٹ دی -

مادی خوش حالی کے علاوہ قوم کی ذہنی و اخلاقی اصلاح کی طرف بھی نذیر احمد کی توجہ یکساں طور پر مبذول رہی - شرفاء کام کرنے کو باعثِ ننگ و عار سمجھتے تھے اور محنت کش طبقوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے - امراء میں دولت کی نمائش کا شوق تو بہت تھا ، لیکن ایثار و ہمدردی کا جذبہ مفقود تھا - نذیر احمد نے 'بنات النعش' میں

---

(۱) نذیر احمد ، مرآۃ العروس - دیباچہ دوم از ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی - ص ۵۰ ، ۵۳ -

معاشرے کے ان ناسوروں پر نشتر زنی کی ہے ۔ حسن آرا امیری کے زعم میں مکتب کی لڑکیوں کے ساتھ بیٹھنا بھی گوارا نہیں کرتی اور دوسروں پر حکم چلانا اپنا پیدائشی حق سمجھتی ہے ۔ مکتب میں سب سے پہلے اسے انسانی مساوات کا درس دیا جاتا ہے اور یہ سمجھایا جاتا ہے کہ اگر انسان دولت کے گھمنڈ میں دوسروں کو حقیر سمجھے اور خدمتِ خلق کو اپنا فرض نہ جانے تو ''ایسی دولت دنیا کا جنجال ہے اور عاقبت کا وبال''[1] ۔ ایک غریب ہمسائی کی معاشرت کا نمونہ پیش کرکے یہ دکھایا گیا ہے کہ محنت و مشقت سے دلی سکون میسر آتا ہے[2]۔ ایک ملازمہ ، 'ماما' دیانت کی ، شرافتِ نفس کی مثال دے کر اس نکتے کی وضاحت کی گئی ہے کہ عزت و شرافت کا معیار حسب نسب یا دولت نہیں بلکہ انسان کا کردار ہے ۔ معاشرتی زندگی میں بے شمار جاہلانہ رسوم کو عورتوں کی شریعت میں دین و ایمان کا درجہ حاصل تھا ۔ قبر پرستی ، گنڈا تعویذ ، جھاڑ پھونک ، ٹونا ٹوٹکا غرض طرح طرح کے توہمات و بدعات کا رواج عام تھا ۔ 'مرأة العروس' و 'بنات النعش' میں ان مذہبی و معاشرتی گمراہیوں کی اصلاح کے لیے طنز و مزاح کے مؤثر حربوں سے کام لیا گیا ہے ۔ عورتوں کے حقوق کے سلسلے میں غیر اسلامی پردے کی سختیوں پر نکتہ چینی کی گئی ہے ۔ شادی بیاہ کے معاملے میں عورتیں اظہارِ رائے کی آزادی اور خلع و عقدِ ثانی کے حقوق سے محروم تھیں ۔ 'بنات النعش' کی چند ضمنی حکایتوں میں ان مسائل کو چھیڑا گیا ہے ۔ ایک انگریز گھرانے کو جس انداز سے حسنِ اخلاق اور حسنِ معاشرت کا نمونہ بنا کر پیش کیا گیا ہے اور انگریزوں کے ساتھ معاشرتی تعلقات کی حمایت کی گئی ہے ، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نذیر احمد ، علی گڑھ تحریک کے ابتدائی مرحلے ہی میں سر سید کے سیاسی اور تہذیبی نظریات کے حامی و مبلغ تھے ۔

ان اصلاحی مقاصد کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور تقریباً نصف صدی تک ان کہانیوں کو جو عدیم النظیر مقبولیت حاصل رہی ، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ نذیر احمد کو اپنے اصلاحی مقاصد میں غیر معمولی کامیابی بھی حاصل ہوئی ، لیکن مقصدیت کی گراں باری سے فن کے تقاضے اس طرح دب کر رہ گئے ہیں کہ بعض نقاد ان قصوں کو ناول کہنا بھی گوارا نہیں کرتے ۔ مقصدیت کی زد میں آ کر 'مرآة العروس' کا پلاٹ دو لخت ہو گیا ہے اور اکبری و اصغری کے قصوں میں کوئی واقعاتی ربط موجود نہیں ۔ قصے میں کشمکش و تصادم کا عنصر ، جس سے تذبذب اور تجسس کی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور قاری کی دلچسپی کو برقرار رکھتی ہے ، بہت کم ہے ۔ بہر حال 'مرآة العروس' میں ایک سپاٹ

---

(۱) نذیر احمد ، بنات النعش ۔ ص ۳۱ ۔

(۲) ایضاً ۔ ص ۲۹ ۔

اور بے کیف سا پلاٹ ہے تو سہی ، 'بنات النعش' میں تو وہ بھی نہیں ہے ۔ معلوماتِ عامہ کا ذخیرہ جمع کرنے کے لیے مصنّف نے اپنے پہلے ناول کے دو تین کردار لے کر ایک دبستان کھول دیا ہے جس میں ذہنی تربیت کے ساتھ کردار سازی کا بھی اہتمام ہے ، حسنِ عمل اور حسنِ معاشرت کے چند بکھرے ہوئے نمونے ہیں ، معاشرتی مسائل پر کچھ مکالمے اور حکایتیں ہیں ۔ گویا 'بنات النعش' متفرق تصویروں کا ایک حسین مرقع ہے ۔ ان ناولوں کے کردار بھی داستانوں کی قدیم روایت اور مقصدیت کے زیرِ اثر مثالی ہو گئے ہیں ۔ 'مرآۃ العروس' کے اہم کرداروں (اکبری اور اصغری) میں سے ایک برائی کا مجسمہ اور دوسرا محاسن کا مثالی پیکر ہے ۔ ضمنی کرداروں میں ماما عظمت ، بی حجن کٹنی اور حسن آرا کے کردار دلچسپ اور جاندار ہیں ۔ بہر حال یہ تمام اہم اور غیر اہم کردار اپنے جیتے جاگتے مکالموں سے ہی اپنے حقیقی وجود کا احساس دلاتے ہیں ۔ نذیر احمد کو بیگماتی زبان اور نسوانی محاورات پر جو قدرت حاصل ہے ، اس کا ثبوت ہمیں ان ابتدائی ناولوں میں ہر جگہ ملتا ہے ۔

'بنات النعش' کی اشاعت کے ایک ہی سال بعد نذیر احمد نے 'توبۃ النصوح' (سنہ تصنیف ۱۸۷۴ء[1]) میں قصے کی تشکیل اور کردار نگاری کی طرف زیادہ توجہ صرف کرکے اردو ناول کے فنی ارتقاء کی رفتار تیز کر دی ۔ جدید تحقیق کے مطابق 'توبۃ النصوح' کا قصہ ڈینئل ڈی فو کے ناول 'دی فملی انسٹرکٹر' (The Family Instructor) سے ماخوذ ہے لیکن 'توبۃ النصوح' کا سارا معاشرتی پس منظر ، بیشتر دلچسپ واقعات اور تمام اہم کردار نذیر احمد کی اپنی تخلیق ہیں ۔ ڈاکٹر محمد صادق 'توبۃ النصوح' کے انگریزی ماخذ کے موضوع پر اپنے مقالے میں لکھتے ہیں :

> ''نذیر احمد نے اپنا پلاٹ ڈی فو سے لیا ہے ، لیکن اس کا ناول ڈی فو کے قصے سے بدرجہا بہتر ہے ۔ جس طرح شیکسپیئر نے پیش پا افتادہ کہانیاں لے کر انہیں اپنے ڈراموں میں کہیں کا کہیں پہنچا دیا ہے ، اسی طرح نذیر احمد نے ڈی فو کے مدھم اور ادھورے نقوش میں ایک نئی جان ڈال دی ہے''[2] ۔

ا ۔ بیان کے ابتدائی فقرے سے یہ مغالطہ پیدا ہو سکتا ہے کہ نذیر احمد کا پلاٹ ڈی فو کی کہانی کا چربہ ہے ، لیکن دونوں ناولوں کے تفصیلی جائزے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جزئی تفصیلات و ضمنی واقعات کے علاوہ پلاٹ کے بنیادی خاکے میں بھی نذیر احمد نے

---

(۱) نذیر احمد ، توبۃ النصوح ۔ ضمیمہ (۱) مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور ۔ ص ۳۲۸ ۔
(۲) محمد صادق ، ڈاکٹر ، مقالہ ، توبۃ النصوح کا ماخذ ۔ ماہ نو دسمبر ۱۹۵۴ء ۔ ص ۱۷ ۔

بہت سی تبدیلیاں کی ہیں اور یہ اخلاقی پہلو قصے میں خاصی اہمیت رکھتے ہیں ۔ ڈی فو کے قصے کا اصل موضوع عیسائیت کی تبلیغ ہے اسی لیے اس نے قصے کی فنی تعمیر پر مطلق توجہ نہیں کی ۔ کتاب کے ہر باب کو مکالمہ (Dialogue) کا عنوان دیا گیا ہے ۔ مکالمے کی ابتدا میں واعظانہ تمہید کے بعد افرادِ قصہ کی گفتگو درج کی جاتی ہے اور مکالمے کے خاتمے پر (Notes on the Dialogue) کے عنوان سے مصنّف ان مسائل کی تشریح کرتا ہے جو متعلقہ مکالمے میں زیرِ بحث آئے ہیں ۔ اس طرح ڈی فو کا ناول مکالموں کی طوالت اور خالص مذہبی مسائل کی تبلیغ کے سبب سے بالکل غیر دلچسپ ہے ۔ 'توبۃ النصوح' میں شگفتہ مکالموں کے ساتھ ہر جگہ ایک نئی واردات یا نئے تجربات و مشاہدات کا ذکر ہے ۔ کشمکش و تصادم کی کیفیت بھی آخری باب تک قائم رہتی ہے ۔ ڈی فو کے افراد قصہ کی انفرادی شخصیت اور زندگی کے عام مسائل سے کوئی دلچسپی نہیں ۔ اس نے کرداروں کے نام تک نہیں رکھے بلکہ رشتے کی مناسبت سے افرادِ قصہ کے لیے (Father, Mother, Ist Brother, 2nd Sister) وغیرہ الفاظ استعمال کیے ہیں ۔ بر خلاف اس کے 'توبۃ النصوح' کے تمام کردار زندگی سے بھرپور ہیں ۔ خصوصاً کلیم اور ظاہر دار بیگ تو اپنی فنی تکمیل اور نمائندہ حیثیت کی بنا پر اردو ناول کے زندۂ جاوید کرداروں میں شمار کیے جاتے ہیں ۔ نذیر احمد نے جاندار کرداروں ، فطری مکالموں اور معاشرتی زندگی کے دلکش مرقعوں سے قصے کی جاذبیت میں بے حد اضافہ کر دیا ہے ۔ مختصر یہ کہ ڈی فو کا موضوع مذہب اور نذیر احمد کا موضوع زندگی ہے ۔ ڈی فو نے ناول کو دینی عقائد اور چند منفی تعلیمات کی تبلیغ کا ذریعہ بنایا ۔ لیکن نذیر احمد نے اسلامی فکر کی روشنی میں معاشرتی حالات کا جائزہ لیا اور دین کی اعلیٰ اقدار کو خانگی زندگی میں رچا بسا کر پیش کیا ۔ اس لحاظ سے نذیر احمد کو مشرقی فن کاروں میں اولیت کا شرف حاصل ہے ۔ کیونکہ بقولِ سر ولیم میور "سماجی اور خانگی زندگی میں مذہب کو ایک فعّال عنصر کی حیثیت سے پیش کرنا مسلمان مصنّفین کے لیے اچھوتا موضوع ہے"[1] ۔

'توبۃ النصوح' کی اشاعت کے بعد سے حیدر آباد کی ملازمت سے سبک دوشی تک ، دس برس کی مدت میں نذیر احمد نے کوئی ناول نہیں لکھا ۔ لیکن اس عرصے میں انہیں مطالعے اور غور و فکر کے وافر مواقع میسّر آئے ۔ وہ عصری تحریکات و نظریات کے بارے میں اپنی ایک مستقل و منفرد رائے رکھتے تھے ۔ ۱۸۸۳ء تک علی گڑھ تحریک کا ردِّ عمل مختلف صورتوں میں ظاہر ہو چکا تھا ۔ مذہبی ، تعلیمی اور تہذیبی مسائل کے بارے میں نظریاتی کشمکش زوروں پر تھی ۔ نذیر احمد نے اپنی ناول نگاری کے دوسرے دور میں ان تمام مسائل پر معتدل و متوازن آراء کا اظہار کیا ہے ۔ 'فسانۂ مبتلا' اور 'ایامیٰ' میں یہ

---

(۱) نذیر احمد ، توبۃ النصوح (مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور) ضمیمہ ۲ ۔ ص ۳۶۷ ۔

مسائل ضمناً زیرِ بحث آئے ہیں ، لیکن 'ابن الوقت' اور 'رویائے صادقہ' میں نظریاتی کشمکش کو بنیادی حیثیت حاصل ہے ۔ اس لحاظ سے اوّل الذکر دو ناولوں کو معاشرتی یا اصلاحی اور ثانی الذکر کو نظریاتی ناول قرار دیا جا سکتا ہے ۔ نذیر احمد کے ابتدائی قصوں کی تقلید میں اصلاحِ نسواں کے موضوع پر بہت سے ناول لکھے گئے تاہم اردو ناول فنی ارتقاء کی جس منزل پر 'توبۃ النصوح' کے ذریعے پہنچ چکا تھا ، اس سے آگے نہ بڑھ سکا ۔ البتہ سرشار کے ناول 'فسانۂ آزاد' (۱۸۸۰ء) میں قصہ گوئی اور معاشرتی زندگی کی بھرپور عکاسی کے نئے امکانات نظر آتے ہیں ۔ لیکن پلاٹ کی تنظیم و تشکیل اور کردار نگاری کے اعتبار سے 'فسانۂ مبتلا' یقیناً فنِ ناول کا بہترین نمونہ قرار دیا جا سکتا ہے ۔ بقول پروفیسر وقار عظیم ''فسانۂ مبتلا اردو کا پہلا ناول ہے جس نے صحیح معنوں میں زندگی اور فن دونوں کی انفرادی اہمیت اور باہمی رشتے کے احساس کی داغ بیل ڈالی''[1] ۔

فسانۂ مبتلا

پلاٹ میں جا بجا ڈرامائی کشمکش اور تذبذب کا عنصر موجود ہے ۔ نیز اس میں کچھ ایسے عناصر بھی شامل ہیں جو نذیر احمد کے ناولوں میں اس سے پہلے نظر نہیں آتے ۔ مثلاً دیہاتی زندگی کی عکاسی ، سید نگر کے زمینداروں کے باہمی مناقشوں اور مقدمہ بازی کی رودادیں ، افسرِ مال کی حیثیت سے نذیر احمد کے ذاتی مشاہدات و تجربات پر مبنی ہے ۔ دوسرا جدید عنصر جنسی کج روی اور ازدواجی زندگی کے مسائل ہیں جن کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیا گیا ہے ۔ قصے کی بنیاد تعدّدِ ازواج کے مسئلے پر ہے ۔ اس مسئلے کے معاشرتی پہلوؤں کے علاوہ ، قدیم و جدید طرزِ تعلیم کی خرابیاں ، خانگی رسوم و جاہلانہ توہمات ، تقسیمِ میراث میں عورتوں کی حق تلفی ، حقوق العباد کی اہمیت ، پولیس اور عدالت کی دھاندلیاں اور دیگر معاشرتی مسائل بھی مصنف کے پیشِ نظر رہے ، جس کے سبب سے ناول میں معاشرتی زندگی کا دائرہ خاصا وسیع ہو گیا ہے ۔ لیکن نفسیاتی کردار نگاری اس ناول کی اہم ترین خصوصیت ہے اور اس اعتبار سے اردو ناول کے ارتقا کی تاریخ میں اسے سنگِ میل کی حیثیت حاصل ہے ۔ غالباً مبتلا اردو ناول کا پہلا کردار ہے جس کے بچپن ، لڑکپن اور عنفوانِ شباب کا مکمل نفسیاتی تجزیہ کیا گیا ہے ۔ ناول کے ابتدائی حصے میں ہیرو کے تعارف کے بعد اس کی تعلیم و تربیت کے مختلف مراحل اور خانگی ماحول کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی گئی ہے تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ اس کی نفسیاتی تشکیل میں خانگی حالات اور خارجی اثرات کس حد تک کارفرما ہیں ۔ ہریالی ، غیرت بیگم ، حاضر اور ناظر کی سیرت کشی میں بھی نذیر احمد نے فنّی و نفسیاتی بصیرت کا ثبوت دیا ہے ۔ لیکن یہ کردار مصنف کے تشریحی بیانات کے محتاج نہیں ، بلکہ اپنے عمل اور مکالموں کے

---

(۱) سید وقار عظیم ، پروفیسر، داستان سے افسانے تک ۔ ص ۶۰ ۔

ذریعے مجسّم ہو کر ہمارے سامنے آتے ہیں ۔ بیشتر مکالمے کرداروں کی ذہنی و جذباتی کیفیات کے آئینہ دار ہیں ۔ لیکن میر تقی کی طویل گفتگو اور مبتلا کے مباحثے قصے کی روانی میں بے جا طور پر خلل انداز ہوتے ہیں ۔

ایامیٰ

'ایامیٰ' میں ہم پہلی کوئی اور سیرت نگاری کے ایک نئے اسلوب اور نئے تجربے سے دوچار ہوتے ہیں ۔ اس ناول کے پلاٹ میں واقعات اور عمل کا عنصر بہت کم ہے ، لیکن ہر عمل کے پیچھے ذہنی اور جذباتی کشمکش کا ایک سلسلہ موجود ہے ۔ گویا پورا ناول کرداروں کی داخلی کشمکش اور خیالات و محسوسات کے تانے بانے سے تیار ہوا ہے ۔ 'فسانۂ مبتلا' کے ہیرو کی طرح 'ایامیٰ' کے مرکزی کردار ، آزادی بیگم کی سیرت و شخصیت کی تشکیل میں بھی بچپن کے ماحول اور دیگر عوامل و اثرات کی نشاندہی کی گئی ہے ۔ آزادی بیگم کے قلب و ذہن میں احساس و فکر کی ابھرتی اور مٹتی ہوئی لہروں کا جس دقّتِ نظر سے مطالعہ کیا گیا ہے اور اس کے خیالات و جذبات کا جس تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے ، اس کی کوئی مثال اس سے پہلے اردو ناول میں نہیں ملتی ۔ نذیر احمد کے قصوں میں عشق و محبت کی خیالی اور رنگین وارداتیں تو یقیناً ناپید ہیں ۔ لیکن 'فسانۂ مبتلا' کی طرح 'ایامیٰ' میں بھی محبت کے رومانی اور واقعاتی پہلو کم و بیش موجود ہیں ۔ خصوصاً ازدواجی محبت اور اس کے مختلف کیفیات کی کامیاب عکاسی کی گئی ہے ۔ سنجاب اور آزادی کی شادی کے بعد باہمی نسبت اور سازگاری کی ابتدائی کیفیت رفتہ رفتہ ایک ایسی خاموش اور گہری محبت میں بدل جاتی ہے جس کا احساس بھی مفارقت سے پہلے نہیں ہوتا ۔ پھر محبوب شوہر کی جدائی کے پہلے شب و روز کی سادہ و مختصر روداد پیش کی گئی ہے ۔ شوہر کی موت کی خبر آنے کے بعد 'ایامیٰ' کے داخلی کرب و اضطراب اور جذبات کے خارجی اظہار کے محاکاتی بیانات نہایت مؤثر ہیں ۔

اس ناول میں معاشرتی زندگی کے بھی چند جدید پہلو نظر آتے ہیں ۔ مثلاً ناول نے ابتدائی ابواب میں خواجہ آزاد کی روشن خیالی اور ہادی بیگم کی کٹّر مذہبیت کا تضاد ۔ قدامت و جدت کی اس آویزش و کشمکش کا نمونہ ہے جو معاشرے کی بالائی سطح سے گزر کر اب عام خانگی زندگی پر اثر انداز ہو رہی تھی ۔ نذیر احمد کے ناولوں میں مذہبی کردار تو ہر جگہ ملتے ہیں ، لیکن 'ایامیٰ' میں انہوں نے گھر کے بھیدی کی طرح مولویوں کی خانگی زندگی اور ان کی پیشہ ورانہ نفسیات کا تجزیہ کیا ہے ۔ ذاتی تجربے کی صداقت اور طنز و تمسخر کی رنگ آمیزی سے ان کے بیانات نہایت دلچسپ ہو گئے ہیں ۔

ابن الوقت

'ابن الوقت' اور 'رویائے صادقہ' کا تعلق قومی زندگی کے اہم مسائل و رجحانات سے ہے - ان دونوں کے موضوع میں نمایاں فرق یہ ہے کہ 'ابن الوقت' میں مقصدیت کا دائرہ قومی زندگی کے تمام پہلوؤں پر محیط ہے اور 'رویائے صادقہ' میں صرف مذہبی مسائل اور قدیم و جدید فرقوں کی اویزش کا جائزہ لیا گیا ہے - 'ابن الوقت' کی اشاعت کے بعد بعض لوگوں نے یہ رائے ظاہر کی کہ 'ابن الوقت' کے پردے میں سر سید کی ذات پر حملہ کیا گیا ہے اور اب بھی جو لوگ سر سید اور نذیر احمد کے ذاتی تعلقات سے بے خبر ہیں، 'ابن الوقت' کو سر سید کی شخصیت کا چربہ قرار دیتے ہیں - سر سید سے نذیر احمد کی دلی عقیدت اور ان کے باہمی خلوص و اعتماد کے پیش نظر ذاتی حملے کا الزام بے بنیاد ہے - البتہ یہ حقیقت ہے کہ اس ناول میں پوری علی گڑھ تحریک کے تجزیے و تبصرے کو موضوع بنایا گیا ہے اور اس دور کی ذہنی و معاشرتی کشمکش کی تصویر کھینچی گئی ہے - لیکن نذیر احمد کا نقطۂ نظر حریف نہ یا مخاصمانہ نہیں بلکہ دوستانہ و مخلصانہ ہے - یوں سمجھنا چاہیے کہ جس طرح اس ناول میں 'حجۃ الاسلام' ناول کے ہیرو 'ابن الوقت' کا عزیز و خیر خواہ بھی ہے اور اس کا نکتہ چیں بھی، اسی طرح نذیر احمد علی گڑھ تحریک کے مبلّغ بھی تھے اور نقّاد بھی -

در اصل سر سید اور نذیر احمد کے اختلافات کی نوعیت اور حدود متعیّن کیے بغیر اس قسم کی غلط فہمیوں کا ازالہ ممکن نہیں - نذیر احمد کے اختلاف کی بنیاد یہ نہیں ہے کہ "نئے سائنسی انکشافات اور مادی ترقیوں سے وہ بے نیاز ہیں" یا "قدامت پسندی اور رسمِ کہن پر اڑے رہنے ہی میں وہ اپنی قوم کی نجات سمجھتے ہیں"[1] - جہاں تک جدید سائنسی علوم کا تعلق ہے، وہ نہ صرف ان کی اہمیت کے معترف تھے بلکہ انہوں نے ان علوم کے اکتساب کو مسلمانوں کا مذہبی فریضہ قرار دیا ہے - اسی طرح تقلیدِ جامد اور رسم پرستی کی مخالفت میں انہوں نے اپنی زبان و قلم کی پوری قوت صرف کی ہے - دیگر تصانیف سے قطعِ نظر صرف 'ابن الوقت' کے گہرے مطالعے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ سر سید اور نذیر احمد کے اختلافات کی نوعیت وہی ہے جو ایک ہی مکتبۂ فکر کے انتہا پسند اور اعتدال پسند مفکروں کے درمیان ہو سکتی ہے -

مغربی تہذیب و معاشرت کے بارے میں سر سید اور نذیر احمد کے اختلافات زیادہ نمایاں تھے - 'ابن الوقت' میں قصے کی بنیاد بھی معاشرتی مسائل پر رکھی گئی ہے - نذیر احمد کے بارے میں بعض نقّادوں کا خیال ہے کہ "انگریزوں کی طرح رہنا سہنا ان کی نظر میں مذہبِ اسلام کے خلاف ہے"[2] - لیکن انہوں نے سر سید کے تہذیبی نظریات کی

---

(۱) قمر رئیس، ڈاکٹر، پریم چند کی ناول نگاری - ص ۱۲۱ -
(۲) احسن فاروقی، ڈاکٹر، اردو ناول کی تاریخ و تنقید - ص ۴۳ -

مخالفت مذہبی تنگ نظری کی بنا پر نہیں کی ، بلکہ جن علماء نے ''من تشبّہ بقوم فھو منہ'' کی آڑ لے کر فتوے عائد کیے تھے ، ان کی مدلّل تردید کی ہے اور 'ابن الوقت' میں بھی اس قسم کے فتووں کا مضحکہ اڑایا ہے ۔ تمدن و معاشرت کے امور میں انہوں نے اسلامی شریعت کی وسعت و سہولت کا جا بجا ذکر کیا ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ تمدنی مسائل میں ان کا نقطۂ نظر اور ان کے اختلاف کی نوعیت خالص عقلی ، نفسیاتی ، اقتصادی اور معاشرتی ہے ۔ 'ابن الوقت' کے قصے میں انہوں نے یہ دکھایا ہے کہ جو لوگ انگریزوں کی اندھی تقلید میں مغربی معاشرت قبول کرتے ہیں وہ جسمانی آسائش اور ذہنی سکون سے محروم ہو جاتے ہیں ۔ وضع مغرب کی تقلید ، اسراف بے جا اقتصادی تباہی کا باعث ہے ۔ صاحب بہادر بننے کے بعد 'ابن الوقت' کا ذہنی خلجان اور اقتصادی بحران ، اس حقیقت کی عبرت ناک مثال ہے ۔ ناول میں اس پہلو پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے کہ جو لوگ انگریزی سوسائٹی میں گھل مل جانے کی کوشش کرتے ہیں وہ اس مقصد میں ناکام رہتے ہیں اور ان پر ''ازیں سو راندہ و زاں سو در ماندہ'' کی مثل صادق آتی ہے ۔ 'ابن الوقت' کی طرف سے مسٹر شارپ کی بدگمانی اور بے رخی ، عام انگریز حکّام کے رویے اور طرز عمل کی نمائندگی کرتی ہے جو دیسی لوگوں سے اختلاط رکھنا اپنی حاکمانہ شان کے خلاف سمجھتے تھے ۔ نذیر احمد اس غلامانہ ذہنیت کے شدید مخالف تھے جو اس طرز عمل کے پیچھے کارفرما تھی ۔ ان کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ ہمیں سطحی تہذیبی مظاہر کی نقّالی چھوڑ کر اہل مغرب کے حقیقی محاسن یعنی مجاہدہ و عمل اور علم و ہنر کو اپنانا چاہیے ۔ مختصر یہ کہ سر سید اپنی قوم کو سراپا انگریز بنا دینا چاہتے تھے اور نذیر احمد ، قومی تشخص ، قومی کردار اور قومی خود داری کو برقرار رکھتے ہوئے ایک معقول حد کے اندر اصلاح کے خواہاں تھے ۔ 'ابن الوقت' میں حجۃ الاسلام کے یہ الفاظ نذیر احمد کے نظریے کی صحیح ترجمانی کرتے ہیں :

> ''جب قوم کا مذہب نہ رہا ، لباس نہ رہا ، طرز تمدن نہ رہا ، علم نہ رہا ، زبان نہ رہی تو امتیاز قومی بھی گیا گزرا ہوا ۔ پھر کیسے رفارم اور کیسی خیر خواہی ۔ اگر ہم ایک گھر کی رفارم کرنا چاہیں تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اس جڑ کو بنیاد سے کھود کر پھینک دیں''[1] ۔

تعلیمی مسائل میں بھی سر سید کے مطمح نظر سے نذیر احمد کے اختلاف کی بنیاد یہ ہے کہ سر سید کے نزدیک نوجوانوں کا جنٹلمین بن جانا اور اعلیٰ عہدے حاصل کرنا قومی تعلیم کی معراج تھی ۔ لیکن نذیر احمد سائنسی علوم اور ٹیکنالوجی کی تعلیم کو قومی ترقی کے لیے ضروری سمجھتے تھے ۔ 'ابن الوقت' میں انہوں نے اس ناقص نظام تعلیم کو بیکاری و بے روزگاری کا سبب ٹھہرایا ہے :

> ''ہم کو درکار تھے وہ علوم جو صنعت و حرفت کو ترقی دیں اور اب لوگوں

---

(۱) ڈپٹی نذیر احمد ، ابن الوقت ۔ ص ۳۳۶ ۔

کو ایسی پٹی پڑھائی جاتی ہے کہ موروثی اور آبائی پیشوں اور حرفوں سے گریز اور نفرت کرتے ہیں بلکہ انہوں نے اسی عار سے بچنے کے لیے پڑھنا اختیار کیا تھا''(۱)۔

سر سید کے علم الکلام کے اثر سے تعلیم یافتہ نوجوانوں میں عقلیت وار نیابت کا رجحان عام ہو گیا ۔ اجتہاد کا دروازہ چوپٹ کھل گیا اور دین میں نئے نئے فتنے اٹھنے لگے ۔ نذیر احمد نے اس صورتِ حال کے خلاف شدید احتجاج کیا ہے ۔ 'ابن الوقت' میں وہ لکھتے ہیں :

''ایک ایک لونڈا جس کو دین سے سر نہیں ، بے خبر ، بر خود غلط ، چلا اسلام کا مجدّد اور ریفارمر بننے اور لگا اصول میں رائے زنی کرنے''(۲) ۔

ہر چند کہ سر سید کی مجتہدانہ کوشش اسلام کی حمایت کے جذبے پر مبنی تھیں ، لیکن سائنس سے ان کی مرعوبیت کا یہ عالم تھا کہ عقائد و ایمانیت میں جو بات تجرباتی عقل کی کسوٹی پر پوری نہ اتری ، اس کے وجود سے انکار کر بیٹھے اور اس طرح مذہب اور سائنس کے دائروں کو خلط ملط کرکے ہر پہلو سے مذہب پر سائنس کو مسلط کر دیا ۔ اگرچہ نذیر احمد تقلیدِ جامد سے بغاوت اور مادی ترقی کی حمایت میں سر سید سے بھی چند قدم آگے تھے ، لیکن خالص دینی عقائد کے معاملے میں وہ سر سید کی انتہا پسندانہ عقلیّت کا ساتھ نہ دے سکے ۔ انہوں نے 'ابن الوقت' کی فصل چہاردہم اور فصل بست و ہفتم میں سر سید کی عقلیت کے خلاف جدید علوم کو شاہد بنا کر پیش کیا ہے اور تجرباتی عقل کی نارسائی ثابت کی ہے ۔

یوں تو نذیر احمد کے تمام ناولوں کے پلاٹ ، زندگی کے حقیقی تجربات و مشاہدات پر مبنی ہیں ، لیکن 'ابن الوقت' میں سوانحی و تاریخی واقعیت کے عناصر سب سے زیادہ ہیں ۔ قصے کا آغاز ۱۸۵۷ء کے خون ریز ہنگامے سے ہوتا ہے ۔ نذیر احمد نے اس ہنگامے کے چشم دید مناظر کی تصویر کشی کی ہے اور مختلف کرداروں کے ذریعے ہر طبقے کا ردِّ عمل دکھایا ہے ۔ نوبل صاحب کی جان بچانے کا واقعہ مسز لیسن کے واقعے سے بالکل مشابہ ہے ۔ سیاسی انقلاب کے علاوہ قوم کی معاشرتی زندگی بھی تہذیبی کشمکش ، ذہنی و فکری رجحانات کے تصادم اور ہندو مسلم فرقوں کی باہمی آویزش سے کچھ کم ہنگامہ خیز نہیں تھی ۔ قومی زندگی کے ہنگامے تہہ در تہہ اسباب و محرکات کی وجہ سے اتنے پیچیدہ ہوتے ہیں کہ ان کے تجزیے اور تبصرے میں زمان و مکان کے بعد اور فکر و نظر کی رسائی و نا رسائی سے بڑا فرق پڑ جاتا ہے ۔ 'ابن الوقت' کے مصنف نے جس عہد اور جس معاشرے کی کہانی لکھی ہے وہ اس کا ناظر بھی تھا اور مبصر بھی . . . ایسا مبصر جس کی

---

(۱) ڈپٹی نذیر احمد ، ابن الوقت ۔ ص ۱۴۰ ۔
(۲) ایضاً ۔ ص ۳۴۶ ۔

دور رس نگاہیں ان تمام ہنگاموں کی مرکزی کشمکش سے آشنا تھیں ۔ اس نے ایک انقلاب آفرین عہد کے گوناگوں احوال و کوائف میں سے صرف انھی پہلوؤں کو چن لیا جو قومی زندگی میں بنیادی حیثیت رکھتے تھے ۔ موضوع کی اساسی اہمیت اور معاشرتی حقائق کے فن کارانہ اظہار نے 'ابن الوقت' کو روحِ عصر کا مرقع اور اپنے عہد کا ایک عظیم رزمیہ بنا دیا ہے ۔

رویائے صادقہ

'ابن الوقت' اور 'رویائے صادقہ' دونوں ناول عصری رجحانات و نظریات سے متعلق ہیں ، لیکن 'ابن الوقت' کا موضوع معاشرت ہے اور 'رویائے صادقہ' کا موضوع مذہب ۔ ناول کے پلاٹ کے لیے معاشرتی مسائل کی مناسبت بالکل واضح ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ 'ابن الوقت' میں ہمہ گیر مقصدیت کے غلبے کے باوجود ایک دلچسپ قصہ بھی ہے اور مختلف نظریات کے پیچ و خم میں الجھنے کے باوجود اس قصے کا ربط و تسلسل آخر وقت تک برقرار رہتا ہے ۔ اس کے کردار اپنی نمائندہ اور علامتی حیثیت کے باوجود جاندار اور متحرک ہیں ۔ خصوصاً 'ابن الوقت' نذیر احمد کے نمو پذیر اور مکمل کرداروں میں شمار کیا جا سکتا ہے ۔ لیکن 'رویائے صادقہ' ایک خالص مذہبی تصنیف ہے ۔ ناول کی ابتداء میں اگرچہ ایک قصے کا ڈول ڈالا گیا ہے اور دہلی کے قدیم معاشرتی پس منظر کے ساتھ علی گڑھ کالج کے نوجوانوں کی جدید ذہنی فضا کی عکاسی کی گئی ہے لیکن آخری نصف حصہ جو طویل مذہبی خواب پر مشتمل ہے محض ایک مناظرے کی حیثیت رکھتا ہے جس میں مذہب کے بنیادی عقائد اور مختلف فرقوں کے اختلافات پر بحث کی گئی ہے ۔ 'بنات النعش' کی طرح اس ناول میں بھی تبلیغی جذبے کے ہاتھوں ، پلاٹ کا سر رشتہ اس طرح گم ہو گیا ہے کہ اسے ناول کہنا ایک تہمت سے کم نہیں ۔

انشاء پردازی

نذیر احمد کی ناول نگاری کے اس سرسری جائزے سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف اردو کے ناول نگار تھے بلکہ انھوں نے اردو ناول میں واقعیت ، معاشرتی حقیقت نگاری ، نفسیاتی ژرف بینی اور زندگی کے مسائل پر حقیقت پسندانہ غور و فکر کی روایات بھی قائم کیں ۔ لیکن اردو ادب اور ناول کے فن پر غالباً ان کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ انھوں نے جدید طرز کی واقعاتی کہانیوں کے لیے ایک زندہ زبان اور شگفتہ اسلوب کی طرح ڈالی ۔ نذیر احمد کو نسوانی محاورات اور دہلی کی بیگماتی زبان کا بادشاہ کہا جاتا ہے ۔ اس میں شک نہیں کہ ان کو عورتوں کی زبان ، ان کی مخصوص اصطلاحوں اور محاوروں ، ان کے روزمرہ اور لب و لہجہ پر پوری دسترس حاصل ہے ، لیکن یہ وصف تو ہمیں نذیر احمد کے

مقلدوں کے یہاں بھی ملتا ہے ۔ نذیر احمد کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ٹکسالی زبان کے علاوہ بازاروں اور گلی کوچوں کی عوامی زبان، مسجد و مدرسہ کی مولویانہ زبان، اہلِ حرفہ کی زبان اور عدالتِ کچہری، بھانہ کی اصطلاحات پر بھی یکساں قدرت رکھتے ہیں ۔ انہوں نے الفاظ، اصطلاحات اور محاورات کا یہ وسیع ذخیرہ، معاشرتی زندگی کے گونا گوں پہلوؤں کی عکاسی اور مختلف طبقوں کے جیتے جاگتے کرداروں کی سیرت کشی میں بڑی ہنر مندی سے صرف کیا ہے ۔ عوامی زندگی سے گہرے لگاؤ کی بنا پر وہ زبان کے معاملے میں اشرافی تکلفات اور چھوت چھات کے قائل نہیں ۔ ان کی تحریروں میں عامیانہ محاورے، غلط العام بلکہ غلط العوام الفاظ، ترکیبیں اور بندشیں جابجا ملتی ہیں ۔ یہ الفاظ و محاورات، ادب و انشاء کے معیارِ فصاحت سے خواہ کتنے ہی گرے ہوئے ہوں، لیکن ناول میں ان کی مصورانہ و محاکاتی قدرو قیمت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ۔ یہی غیر ثقہ محاورات اور عوامی زبان کے بگڑے ہوئے الفاظ، موقع و محل کے لحاظ سے کسی مخصوص ماحول یا فضا کی واقعاتی تصویر کھینچ دیتے ہیں ۔ البتہ مذہبی نصانیف میں محاورہ بندی کا شوق اور اسلوب و زبان کی یہ عوامیت، اصولِ بلاغت کے خلاف اور "وضع شیئی فی محل غیرہ" کے مصداق ہے ۔

نذیر احمد کے اسلوب میں بے تکلف گفتگو کا رنگ غالب ہے ۔ یہ تکلمی اندازِ تحریر، جو ان کے فطری ذوقِ خطابت کا نتیجہ ہے، اگرچہ ناول میں قاری اور مصنف کے درمیان رفاقت کا رشتہ پیدا کر دیتا ہے اور طویل ناصحانہ مکالموں کی خشکی کو گوارا بنا دیتا ہے تاہم ان کی ابتدائی تصانیف میں مطالب کی بے لطف تکرار اور مترادفات کی بھرمار کا باعث بھی ہے ۔ دوسرے دور کے ناولوں میں بھی کبھی کبھی ایسے جذباتی لمحے آتے ہیں جہاں خطابت کی گھن گرج سنائی دیتی ہے ۔ مسلسل متوازن فقروں اور مترادف الفاظ میں خطیبانہ جوش اور ولولے کا اظہار ہوتا ہے ۔ طنز و تعریض کے تیر و نشتر چلتے ہیں ۔ محاوروں، تشبیہوں اور استعاروں کا انبار لگ جاتا ہے ۔ ایسے ہی موقعوں پر کہیں کہیں قافیہ پیمائی بھی ہوتی ہے ۔ مثلاً 'ابن الوقت' میں حجۃ الاسلام، جوشِ خطابت میں کہتا ہے :
"دین دوا ہے بیمار کی، تسلی ہے بے قرار کی، متاع ہے خریدار کی، بشارت ہے امیدوار کی، نجات ہے گنہگار کی، یعنی عنایت ہے پروردگار کی"[1] ۔ لیکن یہ لفاظی نذیر احمد کے اسلوب کا حسن نہیں، عیب ہے اور ان کے مقلدوں نے در اصل اسی عیب کی تقلید کی ہے ۔

نذیر احمد لفظوں کے مزاج داں اور ان کی انفرادی قدر و قیمت سے آشنا تھے ۔ ابتدا ہی سے قانونی تراجم کی بدولت وہ انتخابِ الفاظ کی کاوش کے عادی ہو چکے تھے ۔

---

(۱) ڈپٹی نذیر احمد، ابن الوقت ۔ ص ۱۳۰ ۔

'قانونی تراجم' کے علاوہ انہوں نے اپنی علمی تصانیف (مثلاً مبادی الحکمت ، سماوات اور ما یغنیک فی الصرف) میں کفایت الفاظ اور ایجاز و اختصار سے کام لیا ہے ۔ تحریر کا یہ محتاط انداز ناولوں میں نہیں ملتا ۔ لیکن یہاں بھی وہ اپنے کرداروں کی ذہنی کیفیات اور خارجی حالات کی ترجمانی کے لیے ہمیشہ موزوں ترین الفاظ استعمال کرتے ہیں ۔ لفظوں کی معنوی بلاغت اور صوتی کیفیات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے وہ بعض اوقات ، بقول مولوی عبدالحق ''ایسے ٹھیٹ ، جاندار اور چسپاں الفاظ استعمال کرتے ہیں کہ ان سے بہتر اس خیال کے اظہار کے لیے سمجھ میں نہیں آتے''[۱] ۔ نذیر احمد کے اس محاکاتی اسلوب نے ان کے ناولوں میں جا بجا معاشرتی زندگی کے دلکش مرقع سجا دیے ہیں ۔

شگفتگیِ بیان

نذیر احمد کے اسلوب کی سب سے نمایاں خصوصیت وہ شوخی و شگفتگی ہے جو ان کے ناولوں ، خطبوں اور مذہبی تحریروں میں ہر جگہ ، کہیں نکتہ آفرینی اور بذلہ سنجی کی صورت میں اور کہیں تمسخر ، پھبتی اور طنز و مزاح کی صورت میں جلوہ گر ہوتی ہے ۔ نذیر احمد اپنی مولویت اور مقصدیت کے باوجود ایک سچے فن کار کی طرح ذوقِ تماشا اور حسنِ ظرافت سے بہرہ ور تھے ۔ اسی ذوقِ تماشا نے انہیں پورے انہماک کے ساتھ معاشرتی زندگی کے مختلف پہلوؤں کے مشاہدے پر مجبور کیا اور اسی حسِ ظرافت کی بدولت ان کے مصورانہ بیانات اور زندگی کے روشن و تاریک مرقعے ، دلکشی ، حسن اور رنگینی سے بھرپور ہیں ۔ ڈاکٹر محمد صادق کی یہ رائے درست ہے کہ نذیر احمد کے ناولوں پر طربیہ رنگ چھایا ہوا ہے[۲] ۔ ''(It is comedy that presides over his fiction)''
نذیر احمد نے اپنے ناولوں میں مزاح و ظرافت کے مختلف وسیلے اختیار کیے ہیں ۔ کرداروں کی ذہنی نا ہمواریوں اور مضحک صورتِ حال کی عکاسی کے علاوہ وہ جا بجا لطیفوں اور چٹکلوں سے بھی کام لیتے ہیں ۔ لیکن بعد کے ناولوں میں مزاح پر طنز کا رنگ غالب آ گیا ہے ۔

تراجم

قانونی تراجم

نذیر احمد کی ادبی زندگی کا آغاز قانونی تراجم سے ہوا تھا ۔ 'تعزیراتِ ہند' کے ترجمے (۱۸۶۰ء) کے علاوہ انہوں نے ۱۸۵۹ء میں بابو شیو پرشاد کے ساتھ الکم ٹیکس ایکٹ کا

(۱) حیات النذیر ۔ مقدمہ از عبدالحق ۔ ص ۳ ، ۴ ۔
(۲) A History of Urdu Literature by Dr. M. Sadiq London, 1964, p. 321.

ترجمہ کیا - ۱۸۶۱ء میں ضابطۂ فوجداری کے ترجمے کی اصلاح کی - ۱۸۷۰ء میں قانون شہادت پر انگریزی کے ایک عالمانہ متن کا ترجمہ کیا - ان تراجم میں تعزیرات ہند کو خاص اہمیت حاصل ہے اور بحیثیت مترجم نذیر احمد کی شہرت کا انحصار اسی پر ہے - اگرچہ تعزیرات کے ترجمے میں دو اور مترجم بھی شریک تھے، لیکن نذیر احمد کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اصطلاحوں اور عبارتوں کی تراش خراش کا کام انھی کے سپرد تھا، کیونکہ ان کا "مقصد کریٹیسائزنگ یعنی نکتہ چینی کا تھا"[1] - دفعات کے خلاصے بھی انھی نے مرتب کیے اور انھی کی نگرانی میں 'تعزیرات ہند' کی طباعت کا کام مکمل ہوا - 'تعزیرات ہند' سے پہلے اردو میں قانونی کتب اور سرکاری مسودات قانون کے متعدد ترجمے شائع ہو چکے تھے - ان تراجم کی زبان بے حد ناقص تھی - لفظوں کی ترتیب اور فقروں کی ساخت میں مکتبی ترجموں کا سا انداز تھا - الفاظ بڑی بے احتیاطی سے استعمال کیے جاتے تھے - لیکن انڈین پینل کوڈ (Indian Penal Code) کے مترجمین اور بالخصوص نذیر احمد کے لسانی اجتہاد، ذہنی اپج اور خوش مذاق نے اردو زبان میں موزوں و معنی خیز اصطلاحات و مترادفات کا ایسا کارآمد ذخیرہ فراہم کر دیا کہ لارڈ میکالے جیسے ماہر فن کا مرتب کیا ہوا مسودۂ قانون، اردو میں انگریزی متن کی سی وضاحت و صراحت کے ساتھ منتقل ہو گیا - حقیقت یہ ہے کہ گزشتہ ایک صدی کی طویل مدت میں اردو زبان کے ارتقائی تغیرات کے باوجود، مجموعۂ قوانین 'تعزیرات ہند' کی اصطلاحات و عبارات کا اب تک رواج رہا یہ ایک ادبی و لسانی معجزے سے کم نہیں -

مصائب غدر

'مصائب غدر' نذیر احمد کے ابتدائی تراجم میں سے ہے، لیکن 'حیات النذیر' میں اس کا ذکر نہیں آیا - 'داستان تاریخ اور' اردو 'تاریخ ادب اردو' میں اس کا نام 'فسانۂ غدر' لکھا ہے[2] - اس کتاب کے مصنف ولیم ایڈورڈز، ہنگامۂ ۱۸۵۷ء سے پہلے بدایوں کے حاکم ضلع اور مجسٹریٹ تھے - انھوں نے یکم جون ۱۸۵۷ء سے ۳۰ اگست ۱۸۵۷ء تک ایام غدر کی آپ بیتی روزنامچے کی صورت میں لکھی تھی - نذیر احمد نے اس کا انگریزی سے اردو ترجمہ کیا جو ۱۸۶۳ء میں مطبع نول کشور لکھنؤ سے شائع ہوا[3] - ایڈورڈز ایک دور اندیش اور انصاف پسند حاکم تھا - اسے مقامی لوگوں کے مسائل و مشکلات سے

---

(۱) حامد حسن قادری لیکچروں کا مجموعہ - جلد دوم - ص ۴۳۲ -

(۲) " " " داستان تاریخ اردو ص ۴۷۴ -

تاریخ اردو ادب (مترجمہ مرزا محمد عسکری) - ص ۵۵۷ -

(۳) طبع اول (۱۸۶۳ء) کا ایک نسخہ رضا لائبریری رام پور میں محفوظ ہے -

ہمدردی تھی ۔ اس نے اپنے روزنامچے میں غدر کے اسباب و محرکات پر بھی روشنی ڈالی ہے اور تمام حالات بے کم و کاست بیان کیے ہیں ۔ لہذا اس کا یہ روزنامچہ انقلاب ۱۸۵۷ء کی تاریخ میں ایک خاص اہمیت رکھتا ہے ۔ زبان و بیان کے اعتبار سے نذیر احمد کا یہ ترجمہ جدید اردو نثر کے ارتقاء کے ابتدائی مراحل کی نشاندہی کرتا ہے ۔ ترجمے کی پابندیوں کے باوجود زبان کی سادگی و صفائی اور عبارتوں کی روانی ، عہدِ حاضر کی نثر سے قریب تر ہے اگرچہ کہیں کہیں عربی کی نامانوس تراکیب اور عوامی بول چال کے الفاظ و محاورات میں نذیر احمد کے اسلوب کے ابتدائی نقوش بھی نظر آتے ہیں ۔

سمٰوات

۱۸۷۲ء میں نذیر احمد نے جدید علمِ ہیئت پر ایک فرانسیسی عالم ، الیگزنڈر گلے من (Alexander Guillemin) کی کتاب کے انگریزی ترجمے (The Heavens) کو کتاب کے مترجم لے پوئرون (Le Poer Wynn) کی فرمائش اور انعامی اعلان کی ترغیب پر اردو میں 'سمٰوات' کے نام سے منتقل کیا[1] ۔ یہ ترجمہ شائع نہیں ہو سکا لیکن اس کے جو طویل اقتباسات 'حیات النذیر' میں درج ہیں ، ان کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ آج سے ایک صدی قبل نذیر احمد نے علمی تصانیف کے شگفتہ اور رواں ترجمے کا ایسا معیاری نمونہ پیش کیا جو آج بھی ہمارے لیے قابلِ تقلید ہے ۔ اپنے عام اسلوب سے ہٹ کر نذیر احمد نے لفظوں کے انتخاب اور محاوروں کے استعمال میں خاص احتیاط برتی ہے ۔ اندازِ بیان میں متانت اور وضاحت کے ساتھ ادبی حسن و لطافت کا امتزاج ملتا ہے ۔

تاریخ دربارِ تاج پوشی

شہنشاہ ایڈورڈ ہفتم کی تاج پوشی کا دربار یکم جنوری ۱۹۰۳ء کو دہلی میں منعقد ہوا تھا ۔ جشنِ تاج پوشی کی مفصل تاریخ انگریزی میں مرتب ہوئی تو حکومتِ ہند کی طرف سے نذیر احمد اس کے ترجمے پر مامور ہوئے ۔ بڑی تقطیع ($\frac{1}{2}$ ۱۰ × $\frac{1}{2}$ ۷) کے ۵۹۶ صفحات پر مشتمل اس ضخیم کتاب کے ترجمے میں انہوں نے اپنے دو شاگردوں سے مدد لی اور بقول مرزا فرحت اللہ بیگ کتاب کی عبارتوں میں ان کے بھی 'چند الفاظ' شامل ہیں[1] ۔

---

(۱) مقالاتِ گارسان دتاسی ۔ ص ۳۰۲ ۔

درسیات و اخلاقیات

منتخب الحکایات

مؤلف 'حیات النذیر' نے ، کئی کتابوں کے ساتھ اس کا سنہ بھی ۱۸۶۹ء درج کیا ہے[1] لیکن قرائن سے ظاہر ہوتا ہے کہ 'منتخب الحکایات' نذیر احمد کی اولین تصنیف ہے اور غالباً 'مرآۃ العروس' سے چند سال پہلے مرتب ہوئی ۔ اس میں چھوٹی بڑی ۷۷ حکایات ہیں ۔ ابتدائی حکایات جن کے کردار مختلف قسم کے جانور ہیں ، حکایاتِ حکیم لقمان سے ماخوذ ہیں ۔ پھر انسانی زندگی سے متعلق کچھ نصیحت آموز حکایات (parables) ہیں جن میں سے چند حکایتیں لطائف و ظرافت کی حیثیت رکھتی ہیں ۔ آخری حصے کی دس حکایتیں تاریخی یا نیم تاریخی روایات ، دہلی کی معروف شخصیات اور مصنف کے ذاتی مشاہدات سے متعلق ہیں ۔ ان تمام حکایتوں میں نذیر احمد کے بیانیہ طرزِ نگارش کے خاصے اپنی ابتدائی صورت میں موجود ہیں ۔ زبان سادہ و شگفتہ اور مکالمے مختصر و برجستہ ہیں ۔ انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد رفتارِ زمانہ کے ساتھ اردو نثر جس تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی ، اس کا اندازہ لگانے کے لیے نذیر احمد کی یہ ابتدائی تصانیف بہت اہمیت رکھتی ہیں ۔

چند پند

یہ کتاب درسی ضروریات کے پیشِ نظر لکھی گئی اور ڈائرکٹر تعلیمات کی ایک مختصر تقریظ کے ساتھ شائع ہوئی تھی ۔ 'مرآۃ العروس' کے ساتھ اس کے سبقاً سبقاً لکھے جانے کی روایت غیر معتبر ہے ۔ اندرونی شواہد کی بنا پر اس کا سنہ تصنیف ۷۱ - ۱۸۷۲ء کے مابین متعین کیا جا سکتا ہے ۔[2] مضامین کی ترتیب کے لحاظ سے کتاب تین حصوں میں منقسم ہے ۔ پہلے حصے میں آدابِ معاشرت اور اخلاقی مسائل کا بیان ہے ۔ دوسرے حصے میں ، جو مذہبیات سے متعلق ہے ، نبیوں اور پیغمبروں کے حالات درج ہیں ۔ اس تنوع اور ہمہ گیری کے باوجود کتاب کی ضخامت طبع پنجم (۱۹۲۹ء) کے مطابق کل ۸۴ صفحات ہے ۔ لیکن چونکہ موضوع اور بیان کے اعتبار سے اس کتاب میں دلچسپی کا عنصر کم ہے لہذا اسے زیادہ مقبولیت حاصل نہیں ہوئی ۔

---

(۱) حیات النذیر - ص ۱۶۹ - ۱۶۶ -

(۲) مفصل بحث کے لیے ملاحظہ ہو ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی ، کا مقالہ 'نذیر احمد اور ان کا ادب' - باب پنجم (غیر مطبوعہ مخزونہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری) -

مبادی الحکمۃ

سرکاری مدارس کے لیے علمِ منطق پر یہ کتاب، نذیر احمد نے حکومت کی طرف سے جاری کردہ اشتہار کے مطابق مرتب کر کے انعامی مقابلے میں پیش کی تھی۔ نذیر احمد کا بیان ہے کہ ”عربی اور انگریزی منطق کو ملا کر ایک نئی قسم کا رسالہ لکھا ۔۔۔ گیارہ رسالوں میں میرا رسالہ بازی لے گیا اور انعام کے ہاں سو جیتا ۔ کلکتہ یونیورسٹی نے اس کو کورس میں بھی لے لیا“(۱)۔ ’مبادی الحکمہ‘ کے تیسرے ایڈیشن (مفید عام پریس، آگرہ، ۱۹۲۰ء) کے سر ورق پر سنہ تصنیف ۱۸۷۱ء درج ہے۔

مایغنیک فی الصرف

’حیات النذیر‘ میں اس کا سنہ تصنیف ۱۸۹۳ء درج ہے۔ لیکن کتاب کے تیسرے ایڈیشن کے خاتمے کی تحریر سے ثابت ہوتا ہے کہ مصنف نے اپنے بیٹے کی تعلیم کے لیے یہ کتاب ۱۸۷۱ء میں لکھی(۲) اور حسبِ معمول محکمۂ تعلیم میں انعام کے لیے پیش کی۔ لیکن کتاب کی نئی ترتیب اور جدید اسلوب سے مولویوں کی مخالفت کا خدشہ پیدا ہوا لہذا حکومت نے اس کی اشاعت مناسب نہیں سمجھی۔ کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۸۷۷ء میں مطبع مفید عام آگرہ میں عربی میں چھپا۔ عربی صرف و نحو کی تسہیل کی یہ اوّلین کوشش نذیر احمد کی جودتِ طبع کی ایک روشن مثال ہے۔ مصنف نے جدید زمانے کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے، علمِ صرف کی پیچیدگیوں کو سلجھا کر، تمام ضروری کثیر الاستعمال مسائل، نئی ترتیب اور نئے انداز سے بیان کیے ہیں۔ اس علمی افادیت کے علاوہ، ایجاز و اختصار اور متانتِ تحریر کے لحاظ سے بھی اس کتاب کو نذیر احمد کی تصانیف میں ایک امتیازی مقام حاصل ہے۔ پوری کتاب لفظی و معنوی حشو و زوائد سے پاک ہے۔

نذیر احمد کی درسی تالیفات میں تین مختصر رسالے بھی شامل ہیں:

(۱) ’نصابِ خسرو‘ (منظوم لغت ۔ ۱۸۶۹ء) ۔ (۲) ’صرفِ صغیر‘ (قواعد ۔ تقریباً ۱۸۷۰ء) ۔ (۳) ’رسم الخط‘ (قواعد املا و کتابت ۱۹۱۲ء) ۔

---

(۱) لیکچروں کا مجموعہ ۔ جلد دوم ۔ ص ۳۳۱ ۔

(۲) ما یغنیک ۔۔۔ (علی گڑھ ۱۹۱۹ء) خاتمہ از مولوی بشیر الدین احمد ۔ ص ۶۸، ۶۹ ۔

متفرقات : (مکتوب نگاری ، خطابت اور شاعری)

مکتوب نگاری (موعظۂ حسنہ)

۱۸۸۷ء میں پروفیسر عبدالغفور شہباز نے نذیر احمد کے خطوط کا مجموعہ 'موعظۂ حسنہ' کے نام سے مرتب کر کے قومی پریس دہلی سے شائع کیا ۔ اس مجموعے کے بیشتر خطوط نذیر احمد نے اعظم گڑھ اور حیدر آباد دکن سے اپنے فرزند بشیر الدین احمد کے نام لکھے تھے ۔ چند سال بعد 'موعظۂ حسنہ' کا دوسرا ایڈیشن معہ نئے خطوط کے اضافے کے ساتھ خاص اہتمام سے شائع ہوا ۔ پہلے دور کے خطوط جو اعظم گڑھ سے لکھے گئے ، تعداد میں نصف سے زائد ہیں ۔ ان خطوط کا سلسلہ ۵ ، جنوری ۱۸۷۶ء تک باقاعدگی سے جاری رہا ۔ میاں بشیر جو اس سے پہلے نذیر احمد کے زیر سایہ تعلیم و تربیت حاصل کر رہے تھے ، دہلی اسکول کی ساتویں جماعت میں داخل ہو گئے ۔ لہذا معلّم باپ نے خطوط کو اصلاح و ہدایت کا ذریعہ بنایا ۔ ان خطوط کا موضوع درسی و اخلاقی مسائل اور حصول علم و کسب کمال کی ترغیب و تشویق ہے ۔ دوسرے دور کے خطوط اپریل ۱۸۷۷ء سے قیام حیدر آباد کے ابتدائی تین سال تک مختلف اوقات میں لکھے گئے ۔ ان خطوط میں حیدر آبادی زندگی کے مہمات و مشاغل و دیگر خانگی معاملات کا ذکر ہے ۔ مجموعے کے آخری دو درجن خطوط ، ذاتی عنصر کے فقدان کے سبب سے شذرات یا مختصر مضامین کی صورت رکھتے ہیں ۔ سوانحی نقطۂ نظر سے ان خطوط کی بڑی اہمیت ہے ۔ مکتوب نگار کی فطری سادگی ، شوخی اور بے تکلفی بیٹے کے خطوط میں بھی باپ کی شخصیت کو بے نقاب کر دیتی ہے ۔ اسلوب کے لحاظ سے ان تحریروں کا امتیازی وصف یہ ہے کہ نذیر احمد کی بسیار نویسی اور لفّاظی کے بجائے یہاں ہر جگہ اظہار و بیان میں کفایتِ الفاظ اور اختصار نمایاں ہے ۔

خطابت (لیکچروں کا مجموعہ)

نذیر احمد کے ابتدائی سات لیکچروں کا مجموعہ ۱۸۹۰ء میں لاہور سے شائع ہوا تھا ۔ ۱۸۹۸ء میں مولوی افتخار عالم نے چھبیس لیکچروں کا مجموعہ دو جلدوں میں دہلی سے شائع کیا ۔ بالآخر کل چوالیس لیکچروں کا مکمل مجموعہ دو جلدوں میں مرتب ہو کر مولوی بشیر الدین احمد کے زیر اہتمام ۱۹۱۸ء میں آگرہ سے شائع ہوا ۔ اس مجموعے میں وہ تمام نظمیں بھی شامل ہیں جو مختلف جلسوں میں پڑھی گئیں ۔

شاعری (نظم بے نظیر)

دنیائے ادب میں نذیر احمد ، ناول نگار ، مترجم ، ادیب اور خطیب کی حیثیت سے تو معروف ہیں لیکن ان کی شاعری کو بالعموم نظر انداز کر دیا جاتا ہے ۔ صحیح معنی میں انہیں شاعر کہا بھی نہیں جا سکتا ۔ وہ صرف نظم نگار تھے ۔ علی گڑھ تحریک کے زیرِ اثر قومی شاعری کا دور شروع ہوا تو نذیر احمد نے مجلس آرائی کا یہ حربہ بھی اختیار کیا ۔ ان کے لیکچروں کی طرح یہ منظوم خطبے بھی مقبول ہوئے ۔ لیکن ان کی شاعری موسمی اور فرمائشی چیز تھی ، موسم بدلتے ہی اس کا دور دورہ بھی ختم ہو گیا ۔ نذیر احمد کی قومی شاعری کا آغاز اس مسدس سے ہوا جو 'فسانۂ مبتلا' (۱۸۸۸۵) میں 'مرثیہ مبتلا' کے عنوان سے اور 'نظم بے نظیر' میں ، بہ خفیف تغیّر ، اتمامِ حجّت کے نام سے شامل ہے ۔ یہ نظم انہوں نے سر سید کی فرمائش پر لاہور کے اجلاس (دسمبر ۱۸۸۸ء) میں سنائی تھی ۔ پھر تو ہر جلسے میں تقاضے ہونے لگے اور لیکچروں کے ساتھ نظم خوانی کا سلسلہ بھی جاری رہا ۔ ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس میرٹھ (دسمبر ۱۸۹۶) میں نذیر احمد نے دو نظمیں سنائیں جو سر سید کو بہت پسند آئیں ۔ انہوں نے کانفرنس کی طرف سے ان نظموں کو رسالے کی صورت میں چھپوایا اور 'نظمِ بے نظیر' نام رکھا ۔ ۱۹۰۹ء میں جب مولوی افتخار عالم نے نذیر احمد کی نظموں کا مجموعہ مرتب کرکے شائع کیا تو اس کا نام بھی 'نظم بے نظیر' رکھا گیا ۔ ۲۰۲ صفحات کے اس مجموعے میں دو طویل مسدس (مرثیہ سید احمد خان اور اتمامِ حجت) آٹھ مثنویاں اور متعدد قطعات یا قصیدہ نما نظموں کے علاوہ عربی کی سات مختصر نظمیں بھی شامل ہیں ۔ نظموں کے موضوع تو وہی ہیں جو اس دور کی قومی شاعری میں عام تھے لیکن نذیر احمد نے علماء کی منفی تعلیمات ، صوفیہ کے رہبانی رجحانات اور تقلیدِ وضعِ مغرب کو خاص طور سے طنز کا نشانہ بنایا ہے ۔ محاورہ بندی کے لحاظ سے وہ نظم میں بھی دبستانِ ذوق سے وابستہ ہیں ۔

مذہبیات

ترجمۃ القرآن

نذیر احمد کی دینی خدمات میں 'ترجمۃ القرآن' کو اوّلیت حاصل ہے در اصل یہی ترجمہ ان کی مذہبی تصانیف کی اساس اور نقطۂ آغاز ہے ۔ اس ترجمے کی حیثیت ایک تخلیقی کارنامے سے کم نہیں ، لہذا اسے قانونی و علمی تراجم کے زمرے میں رکھنا مناسب معلوم نہ ہوا ۔ اس ترجمے کے سلسلے میں نذیر احمد نے ''مولویوں کے ایک بورڈ کا تعاون

بھی حاصل کیا اور اس طرح ڈھائی برس کی شبانہ روز محنت و کاوش سے ۱۸۹۵ء میں ترجمہ مکمل ہوا ۔

اس ترجمہ" نذیریہ" کی سب سے بڑی خصوصیت اس کی با محاورہ اور شگفتہ زبان ہے ۔ اس سے پہلے ایک صدی تک شاہ صاحبان کے ترجمے ملک میں رائج رہے ۔ شاہ رفیع الدینؒ کا ترجمہ تحت اللفظ تھا جس میں اردو محاورے کے بجائے الفاظ قرآن کی ترتیب کو ملحوظ رکھا گیا تھا ۔ شاہ عبدالقادرؒ کا ترجمہ قدرے صاف اور با محاورہ تھا ۔ تاہم ایک صدی بعد اس کی زبان بھی اجنبی اور خلاف محاورہ معلوم ہوتی تھی اور فہم مطالب میں الجھن پیدا ہوتی تھی ۔ نذیر احمد نے نہ صرف رواں شگفتہ اور با محاورہ زبان میں ترجمہ کیا بلکہ عبارت میں ربط و تسلسل قائم رکھنے یا ترجمے کو زیادہ واضح اور مربوط بنانے کے لیے حسب ضرورت قوسین میں اپنی طرف سے کچھ الفاظ اور فقرات بھی بڑھا دیے ۔ علاوہ ازیں قرآن کی بلیغ آیات کی ترجمانی کے لیے موزوں ترین اور معنی خیز الفاظ استعمال کیے ۔ بقول مولوی عبدالحق " . . . . . . یہ صرف دینی خدمت ہی نہیں بلکہ اردو ادب کی بھی ایک بڑی خدمت ہے" . . . .[1] ۔

ترجمے میں کہیں کہیں عامیانہ لہجہ یا سوقیانہ الفاظ و محاورات آ گئے ہیں ۔ جو ذوق سلیم پر نہایت گراں گزرتے ہیں ۔ زبان کے علاوہ مطالب کے لحاظ سے بھی بعض جگہ خامیاں موجود ہیں ۔ ان لغزشوں کے باوجود محاسن کا پلہ بھاری ہے ۔ اس ترجمے کی مقبولیت دیکھ کر بہت سے مترجم پیدا ہو گئے اور یکے بعد دیگرے متعدد ترجمے شائع ہوئے لیکن اس دور کے بیشتر مترجمین نذیر احمد کے خوشہ چین ہیں ۔ مولانا حالی اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"شاہ صاحبان کے خاندان کے بعد ہندوستان کے عام مسلمانوں کے لیے قرآن کریم کی جو خدمت اس بزرگ سے بن آئی ، ہمارے نزدیک آج تک کسی سے بن نہیں آئی"[2] ۔ 'ادعیة القرآن' (قرآن سے ماخوذ پیغمبرانہ دعاؤں کا مجموعہ) 'ہفت سورہ' اور 'دہ سورہ' ، 'ترجمة القرآن' کی ذیلی تالیفات ہیں ۔

الحقوق و الفرائض

اسلامی زندگی کے حقوق و فرائض کے بارے میں ایک ہزار صفحات کی تین جلدوں پر مشتمل اس جامع تصنیف کی تحریک بہ ظاہر مہدی الافادی کے ایک مضمون "علامہ

---

(۱) حیات النذیر (مقدمہ از عبدالحق) ۔ ص ۵ ۔

(۲) حیات النذیر (تنقید از مولانا حالی) ۔ ص ۱۰ ۔

نذیر احمد ایل ۔ ایل ۔ ڈی اور انسائیکلو پیڈیا آف اسلام" سے ہوئی جس میں قاموس الاسلام کے علاوہ ایک ایسی تالیف کی اہمیت بھی واضح ہو گئی تھی جو "جامع معقول و منقول ہو اور جس میں اسلام کے اصول و فروغ پر حصولِ اطلاعات کا وافر ذخیرہ موجود ہو"[1]۔

الحقوق کی تینوں جلدیں انسانی حقوق و فرائض کی تین قسموں سے متعلق ہیں ۔ پہلا حصہ حقوق اللہ کے بارے میں ہے جس میں عقائد ، ایمانیات اور ارکانِ مذہب کے تمام جزئی پہلوؤں ہر بحث کی گئی ہے ۔ یہ حصہ ۲۲۶ صفحات اور ۳۴۸ مضامین پر مشتمل ہے ۔ حصہ دوم حقوق العباد سے متعلق ہے اور ۹۲۴ صفحات میں ۶۰۵ مضامین زیرِ بحث آئے ہیں ۔ اس حصے میں معاشرتی زندگی کے تمام مسائل کا احاطہ کیا گیا ہے ۔ حصہ سوم کا موضوع حقوق النفس ہے اور اس میں اخلاقی مسائل اور آدابِ معاشرت سے متعلق پچاس پچاس عنوانات قائم کرکے تقریباً ۵۰۰ مضامین بیان کیے گئے ہیں ۔

'الحقوق و الفرائض' کی پہلی خصوصیت اس کی جامعیت ہے ۔ عقائد و معاملات ، آداب و اخلاق اور حقوق و فرائض کے تمام پہلوؤں پر دینی احکام اس شرح و بسط سے بیان کیے گئے ہیں کہ کوئی جزئی مسئلہ بھی ایسا باقی نہیں رہا جو زیرِ بحث نہ آیا ہو ۔ در حقیقت یہ اسلامی زندگی کا ایک جامع دستور العمل ہے ۔ دوسری خصوصیت اس کا حسنِ ترتیب ہے ۔ کتاب کے ہر حصے کو مختلف ابواب و فصول میں تقسیم کرکے ، ہر فصل میں متعدد عنوانات قائم کیے گئے ہیں ۔ ہر عنوان کے تحت اس مضمون سے متعلق جملہ آیاتِ قرآنی مع ترجمہ و حوالہ اور حاشیے میں حسبِ ضرورت فائدہ یا شانِ نزول درج ہے ۔ پھر معتبر احادیث مع ترجمہ و حوالہ نقل کی گئی ہیں اور آخر میں 'من المترجم' کا عنوان دے کر مؤلف نے بڑی تحقیق و تدقیق کے ساتھ مسئلہ زیرِ بحث کے تمام گوشوں پر روشنی ڈالی ہے ۔ تیسری خصوصیت یہ ہے کہ نذیر احمد کی دیگر تصانیف کی طرح اس میں بھی اصلاحی اور علمی پہلو نمایاں ہے ۔ مؤلف نے دینی تعلیمات کے معاشرتی پہلو یعنی معاملات پر زیادہ زور دیا ہے کیونکہ دین و شریعت کا مقصودِ اصلی ، دنیوی زندگی کی اصلاح و فلاح ہے ۔ حقوق العباد کے ضمن میں مؤلف نے معاشرتی زندگی کے ایسے بے شمار مسائل پر بحث کی ہے جو اب تک علماء و فقہا کی توجہ کے محتاج رہے ہیں ۔ الحقوق کی پانچویں خصوصیت ، اجتہادِ فکر کے ساتھ ، اس کے مؤلف کے نقطۂ نظر کا اعتدال و توازن ہے ۔ نذیر احمد نے عصری حالات اور جدید تقاضوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے قرآن و حدیث سے احکام کے استخراج و استنباط میں مجتہدانہ بصیرت کا ثبوت دیا ہے ، لیکن دینی حقائق کے بارے میں تجدد پسندوں کی ارتیابیت سے دامن بچاتے ہوئے اسلاف کے

---

(۱) افادات مہدی ۔ ص ۲۶ ۔

نقطۂ نظر کی پیروی کی ہے ۔ الغرض نذیر احمد نے جدید و قدیم افکار و نظریات سے یکساں طور پر استفادہ کرکے ایک معتدل و متوازن فقہی نظام مرتب کرنے کی کوشش کی ہے اور اسلامی فقہ کی تشکیل جدید کی یہ اولّین کوشش ہے ۔

بقول تمکین کاظمی اس کا انداز تحریر بھی بڑا شگفتہ اور دلکش ہے ۔ "الحقوق و الفرائض" جیسی مذہبی کتاب کو بھی نذیر احمد نے اپنی باغ و بہار طبیعت سے ایسا چمن زار بنا دیا ہے جو ہمیشہ ہی سرسبز و شاداب ہے ۔ اس میں بلا کی دلچسپی اور غیر معمولی سلاست اور بے انتہا سادگی ہے اور مصنف نے جگہ جگہ ایسی چٹکیاں لی ہیں کہ تلملانے والے تو تلملاتے ہوں گے مگر صاحبانِ ذوق کو لطف آ جاتا ہے ۔"[1]

اگرچہ الحقوق میں بعض جگہ مصنف کے اجتہادی نقطۂ نظر سے اختلاف کی گنجائش موجود ہے مثلاً جہاد کے بارے میں ان کی مصلحت کوشی ، انگریزی قانون کی حمایت میں ان کا استدلال اور ربٰو کے بارے میں ان کے تاویلات سے ایک غیر جانبدار مبصّر کا ذہن مطمئن نہیں ہوتا ۔ لیکن بحیثیت مجموعی یہ ایک ایسا جامع دینی دستور العمل ہے کہ گزشتہ نصف صدی میں بھی اس موضوع پر اس سے بہتر کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی ۔

اجتہاد

'حیات النذیر' میں اس کا سنہ تصنیف مذکور نہیں لیکن طبع اول کے سرورق پر محبوب المطابع دہلی میں چھپا تھا ، ماہ رمضان المبارک ١٣٢٥ھ/١٩٠٦ء لکھا ہے ۔ 'الحقوق و الفرائض' کی تکمیل (١٩٠٦ء) کے بعد ہی وہ اس کی طرف متوجہ ہو گئے ۔ یہ کتاب مذہبی حقائق کے بارے میں نذیر احمد کے مجتہدانہ غور و فکر اور تحقیق مذہب کے سلسلے میں ان کے ذہنی سفر کی مکمل روداد ہے ۔ اس کتاب کے ابتدائی حصّے میں اسلام کو دینِ فطرت ثابت کرنے کے لیے ، اس کے جملہ عقائد خصوصاً توحید و رسالت کو فطرت (یعنی انسانی عقل و شعور) کی کسوٹی پر پرکھا ہے ۔ کتاب کا دوسرا موضوع یہ ہے کہ اسلام دین الیسر ہے اور تکالیفِ شرعی ، فطرت انسانی کے عین مطابق ہیں ۔ اس سلسلے میں مصنف نے علماء اور صوفیہ کے مذہبی غلو اور خود عائد کردہ پابندیوں پر تنقید کی ہے ۔ تیسرا اہم

---

(١) مقالہ : ڈاکٹر نذیر احمد بحیثیت مصلح ، نقوش لاہور (نمبر ٥٨ - ٥٧) ص ٢٢٥ ۔

موضوع عام مسلمانوں اور مولویوں کے طبقے کی اصلاح ہے ۔ اسلام کو ترقی پسند مذہب قرار دیتے ہوئے ان تمام مروّجہ عقائد کا محاسبہ کیا گیا ہے جو ترقی کی راہ میں حائل ہیں ۔ اس سلسلے میں دین و دنیا کی تفریق ، زہد کی تعلیم ، تقدیر ، توکّل ، دعا وغیرہ کے مسائل پر عالمانہ بحث کی گئی ہے ۔ دینی مسائل میں نذیر احمد کا انداز نظر اور طریق استدلال مفکرانہ و مجتہدانہ ہونے کے باوجود سر سید کی عقلیّت سے مختلف ہے ۔ اپنے خطبات و دیگر مذہبی تصانیف کی طرح اس کتاب میں بھی انہوں نے سر سید کے جدید علمِ کلام کی تردید کی ہے ۔ 'اجتہاد' میں جو مسائل زیر بحث آئے ہیں ان سب پر نذیر احمد اپنے لیکچروں ، ناولوں اور 'الحقوق و الفرائض' میں جگہ جگہ اظہار خیال کر چکے ہیں لیکن یہاں انہوں نے اپنے دینی تصورات بڑی وضاحت اور منطقی ربط و تسلسل کے ساتھ پیش کیے ہیں ۔ اس اعتبار سے یہ کتاب ان کے فکری اجتہاد کی دوری ترجمانی کرتی ہے ۔ کتاب کے اسلوب میں بھی انہوں نے ادبی اجتہاد سے کام لے کر مذہبی حقائق کو مقالمے کی صورت میں (سوالاً جواباً) بیان کیا ہے ۔ اس طریقِ بحث سے مصنف کی زبان کو زیادہ شگفتہ اور ان کے لہجے کو زیادہ مانوس اور بے تکلّف بنا دیا ہے ۔ ان خصوصیات کی بنا پر دینی ادب میں اجتہاد کو ایک انفرادی مقام حاصل ہے ۔

امّہات الامہ

۱۸۹۷ء میں گوڑگاؤں کے پادری احمد شاہ شوق کی کتاب 'امہات مومنین' شائع ہوئی جس میں رسولِ کریم صلعم اور ازواج مطہرات کی شان میں جابجا گستاخانہ کلمات استعمال کیے گئے تھے ۔ مصنف کی دریدہ دہنی کے خلاف مسلمانوں نے سخت احتجاج کیا اور بالآخر یہ کتاب ضبط ہو گئی ۔ سر سیّد نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں اس کتاب کے جواب میں ایک عالمانہ مقالہ مرتب کرنے کی کوشش کی اور سر سید کی یہ آخری تحریر ، ان کی وفات کے بعد 'ازواج مطہرہ' کے نام سے ایک رسالے کی صورت میں تجارتی پریس علی گڑھ سے شائع ہوئی ۔ اس واقعے کے دس گیارہ سال بعد جب کہ 'امہات مومنین' کی ضبطی سے یہ فتنہ فرد ہو چکا تھا ، نذیر احمد نے اس موضوع پر قلم اٹھایا اور ۱۹۰۸ء میں ان کی کتاب 'امہات الامہ' شائع ہوئی ۔ پادری احمد شاہ نے رسوائے زمانہ کتاب میں لکھا تھا کہ انگریزی حکومت اور عیسائی مذہب کے زیر اثر مسلمانانِ ہند نے مہذب اور شائستہ ہو گئے ہیں کہ اب وہ بھی تعداد ازواج کی خرابیوں کو محسوس کرنے لگے ہیں ۔ اس دعویٰ کے

ثبوت میں اس نے نذیر احمد اور ان کی کتاب (فسانۂ مبتلا) کی مثال پیش کی ۔[۱] قیاس کہتا ہے کہ 'امہاتِ مومنین' کی ضبطی اور نایابی کے سبب سے نذیر احمد کو اس کے مطالعے کا موقع ذیر میں ملا اور پادری صاحب کا یہ سخن گسترانہ جملہ 'امہات الامہ' کی تصنیف کا محرک کی تصنیف کا محرک ہوا۔

امہات الامہ تاریخی تحقیق ، مواد کی ترتیب ، طریقِ استدلال اور اسلوب بیان کے اعتبار سے ایک علمی تصنیف کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتی ۔ سر سید نے جب اس موضوع پر قلم اٹھایا تو بقول وحید الدین سلیم ، تاریخ و سیر کی ۲٦ مستند کتابوں سے متعلقہ مواد فراہم کیا ۔[۲] پادری شوق کے ہر اعتراض کا مدلل جواب لکھانے کے بعد مسودے میں اپنے قلم سے اضافے کیے اور اپنی جسمانی معذوری و ذہنی کرب کے باوجود ایک علمی مقالے کی شرائط ملحوظ رکھیں ۔ لیکن 'امہات الامہ' میں اس قسم کی تحقیقی کاوش کا ثبوت نہیں ملتا ۔ غیر ضروری تفصیلات اور غیر متعلق مواد کی فراوانی اس کتاب کا دوسرا نقص ہے ۔ لیکن سب سے بڑا نقص مصنف کا غیر سنجیدہ لہجہ ، عامیانہ محاورات کا استعمال اور بے محل شوخی و ظرافت ہے ۔ یہ اسلوب تاریخی مباحث خصوصاً بزرگان دین کے ذکر کے لیے نہایت نا مناسب ہے ۔ نذیر احمد نے ازواجِ مطہرات ، اہلِ بیت اور خلفائے راشدین کی جلیل القدر ہستیوں کا ذکر ایسے انداز سے کیا ہے گویا وہ کسی ناول کے کردار ہیں ۔ حتیٰ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و سلّم کے بارے میں غیر محتاط زبان استعمال کی ہے ۔

کتاب شائع ہوتے ہی مخالفت کا ایک ایسا طوفان اٹھا کہ لوگ 'امہاتِ مومنین' اور اس کے گستاخ مصنف کو بھول گئے ۔ نذیر احمد نے رفعِ شر کے لیے کتاب کے تمام نسخے علماء کے حوالے کر دیے جو ایک جلسے میں جلا دیے گئے ۔

مطالب القرآن

یہ نذیر احمد کی پنجاہ سالہ ادبی زندگی کی آخری یادگار ہے ۔ اس کا سنہ تصنیف کہیں مذکور نہیں لیکن داخلی شواہد و دیگر قرائن سے ظاہر ہوتا ہے کہ

---

(۱) امہات مومنین (مخزونہ کتب خانۂ خاص انجمن ترقی اردو ۔ کراچی) ص ۱۳ ۔

(۲) ازواج مطہرہ ۔ دیباچہ از وحید الدین سلیم ۔ ص ۱ ۔ ۲ ۔

(۱) مقدمات عبد الحق (مقدمہ از مولانا حبیب الرحمان خان شروانی) مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی ۔ پہلا پاکستانی ایڈیشن ۔

'امہات الامہ' کی تکمیل کے بعد نذیر احمد نے 'مطالب القرآن' کے نام سے چھ حصوں میں ایک جامع تفسیر کی تدوین کا کام شروع کیا لیکن 'امہات الامہ' کے خلاف ہنگاموں سے بد دل ہو کر تصنیف و تالیف سے دست بردار ہو گئے اور کتاب کا حصۂ اول بھی نا مکمل رہ گیا ۔ کتاب کے نام اور حصۂ اول کی ترتیب سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس جامع تفسیر کا منصوبہ فہرست مطالب القرآن (جسے وہ ترجمہ القرآن کے سلسلے میں مرتب کر چکے تھے) کے عین مطابق تھا ۔ فہرست 'مطالب القرآن' چھ حصوں میں ہے اور ہر حصہ کئی ذیلی عنوانات یا ابواب میں منقسم ہے ۔ تفسیر کے حصۂ اول کے ابواب کی متن و ترتیب بھی بعینہ اسی نقشے کے مطابق ہے ۔ اس میں شک نہیں کہ اگر اس منصوبے کے مطابق یہ کتاب تفسیر مکمل ہو جاتی تو اپنی جامعیت کے اعتبار سے 'الحقوق و الفرائض' کی ہم پایہ ، ایک مکمل کتاب حوالہ ، نیز ترتیب کے لحاظ سے بالکل انوکھی تفسیر ہوتی ۔ اس تفسیر میں آیات کے ترجمے اور فوائد ، مؤلف کے ترجمہ القرآن سے ماخوذ ہیں ۔ تفسیری شذرات میں انداز فکر اور وسعت نظر کا وہی عالم ہے جو نذیر احمد کی دیگر مذہبی تصانیف میں ملتا ہے ۔ لیکن بیان میں وہ قوت اور تحریر میں وہ شگفتگی نہیں ہے ۔ اس کا خاص سبب یہ ہے کہ زندگی کے آخری دور میں رعشے کی وجہ سے وہ لکھنے سے معذور تھے ۔ چنانچہ اپنی کتابیں املا کراتے تھے ۔ 'مطالب القرآن' کی عبارتوں میں کہیں کہیں جو بے ربطی پیدا ہو گئی ہے اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ مسوّدے پر نظر ثانی کر کے اسے سنوارنے کا موقع نہیں مل سکا ۔

نذیر احمد کی مذہبی تصانیف میں کم از کم دو کتابیں : 'الحقوق و الفرائض' اور 'اجتہاد' ایک مستقل اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں کیونکہ یہ قدیم و جدید مکاتب فکر کے صالح عناصر پر مشتمل اور اسلام کے عادلانہ نظام حیات کی ترجمان ہیں ۔ لیکن بقول شیخ محمد اکرم ، ان کتابوں کی تعریف میں علماء نے کسی قدر بخل سے کام لیا ہے ۔[1] اس کا خاص سبب یہ ہے کہ نذیر احمد نے علماء کی منفی تعلیمات ، فکری جمود اور عملی کوتاہیوں پر بڑی بے باکی سے تنقید کی ہے ، اور ان کا لہجہ بھی کہیں تلخ اور کہیں بہت شوخ ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ اس شوخیٔ گفتار کی بدولت ان کی تصانیف کا علمی مرتبہ قدرے پست ہو گیا ۔

---

(۱) موج کوثر ۔

کتابیات

۱ - مرآة العروس ، مصنفہ نذیر احمد ، مرتبہ بیگم شائستہ اکرام اللہ ، شائع کردہ ترقی اردو بورڈ کراچی ۱۹٦۱ء

۲ - منتخب الحکایات ، مصنفہ نذیر احمد ، مرتبہ شاہد احمد دہلی

۳ - بنات النعش ، مصنفہ نذیر احمد دہلی ۱۹۵۱ء

۴ - توبۃ النصوح ، مصنفہ نذیر احمد مرتبہ افتخار احمد صدیقی ، شائع کردہ مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹٦۴ء

۵ - ابن الوقت ، مصنفہ نذیر احمد ، شائع کردہ مجلس ترقی ادب ، لاہور

٦ - ما یغنیک فی الصرف ، مصنفہ نذیر احمد ، طبع سوم ، علی گڑھ ۱۹۱۹ء

۷ - لیکچروں کا مجموعہ ، مصنفہ نذیر احمد ، مرتبہ مولوی بشیر الدین احمد طبع دوم ، دہلی ۱۹۱۸ء

۸ - امہات الامہ ، مصنفہ نذیر احمد ، طبع دوم ، دہلی

۹ - امہات مومنین ، مصنفہ پادری احمد شاہ شوق (مخزونہ کتب خانہ خاص انجمن ترقی اردو ، کراچی)

۱۰ - ازواج مطہرہ ، مصنفہ سر سید احمد خان ، طبع اول ، علی گڑھ ۱۸۹۹ء

۱۱ - مجموعہ لیکچرز و اسپیچز ، مصنفہ مولوی مہدی علی خان (محسن الملک) طبع اول ، لاہور

۱۲ - رویداد اجلاس محمڈن ایجوکیشنل کانگرس ، (مرتبہ سید احمد خان) بابت سال سوم و چہارم ۱۸۸۸ء و ۱۸۸۹ء

۱۳ - حیات النذیر ، مصنفہ مولوی افتخار عالم مارہروی ، طبع اول ، دہلی

۱۴ - حیات جاوید ، شائع کردہ اکادمی پنجاب ، طبع جدید ، لاہور

۱۵ - وقار حیات ، مصنفہ مولوی محمد اکرام اللہ خان ندوی ، علی گڑھ طبع اول ۱۹۲۵ء

۱٦ - شیخ عبدالقدوس گنگوہی اور ان کی تعلیمات ، مصنفہ مولانا اعجاز الحق قدوسی طبع اول ، کراچی ۱۹٦۱ء

١٧ - تذکرۂ علمائے ہند ، مصنفہ رحمان علی خان ، طبع دوم ، نول کشور پریس لکھنؤ ۱۹۱۴ء

١٨ - بیاض جانفزا ، خاتمہ بیاض دلکشا ، (تذکرۂ صوفیہ) مصنفہ مولانا فرید احمد غازی پوری (مملوکہ ڈپٹی نیاز اللہ خان خورجوی)

١٩ - خطبات گارسان دتاسی ، انجمن ترقی اردو ، اورنگ آباد ، طبع اول ۱۹۳۳ء

٢٠ - مقالات گارسان دتاسی ، انجمن ترقی اردو ، دہلی ، طبع اول ۱۹۴۳ء

٢١ - صوبہ شمالی مغربی کے اخبارات و مطبوعات ، مصنفہ محمد عتیق صدیقی ، طبع اول ، علی گڑھ

٢٢ - موج کوثر ، مصنفہ شیخ محمد اکرام ، طبع دوم لاہور

٢٣ - داستان تاریخ اردو ، مصنفہ حامد حسن قادری . طبع دوم ، آگرہ

٢٤ - تاریخ ادب اردو ، مصنفہ سکسینہ ، مترجمہ مرزا محمد عسکری ، نامی پریس لاہور

٢٥ - اردو ناول کی تاریخ و تنقید ، ڈاکٹر احسن فاروقی ، طبع اول ، لکھنؤ

٢٦ - A History of Urdu Literature by Dr. M. Sadiq, London, 1964.

٢٧ - پریم چند کی ناول نگاری ، ڈاکٹر قمر رئیس ، طبع اول ، دہلی

٢٨ - داستان سے افسانے تک ، سید وقار عظیم ، اردو اکیڈمی سندھ ، کراچی طبع اول ۱۹۶۰ء

٢٩ - مقالہ : 'نذیر احمد اور ان کا ادب' از ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی (غیر مطبوعہ - مخزونہ کتب خانہ پنجاب یونیورسٹی لاہور) -

٣٠ - مقالہ : 'توبۃ النصوح کا مآخذ' از ڈاکٹر محمد صادق ، ماہ نو دسمبر ۱۹۵۴ء

٣١ - مقالہ : ڈاکٹر نذیر احمد بحیثیت مصلح ، از تمکین کاظمی ، نقوش لاہور ، شمارہ نمبر ۵۷ ، ۵۸ -

گیارھواں باب

(الف) عبدالحلیم شرر

مولوی عبدالحلیم شرر ۱۷ جمادی الثانی ۱۲۷۶ ہجری/ ۱۰ جنوری ۱۸۶۰ء لکھنؤ کے محلہ جھوائی ٹولہ میں پیدا ہوئے۔[۱] بزرگوں کے بیان کے مطابق عباسی النسل ہیں۔ پہلے بزرگ سلطان محمد تغلق کے عہد میں ترکستان سے دہلی آئے۔[۲] ایک زمانے کے بعد ان کی نسل نے علاقۂ جونپور میں جگہ پائی۔ انہیں میں سے ایک بزرگ مولٰنا نظام الدین حصولِ علم کے شوق میں وطن چھوڑ کر دہلی آئے اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے حلقۂ درس میں شامل ہوئے۔[۳] والد کی وفات کے حادثے کی خبر سن کر چھ سات سال بعد واپس گئے، لیکن بھائی کی بے اعتنائی دیکھ کر پھر ترکِ وطن کیا اور لکھنؤ پہنچ کر علمائے فرنگی محل میں سے بعض کی شاگردی اختیار کی۔ لکھنؤ کے قیام میں مولانا شاہ نجیب اللہ کے روحانی کمال کی خبر سن نو کرسی[۴] پہنچ کر حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے۔ وہاں ان کی شادی کرسی کے خطیب کی بیٹی سے ہوئی اور خطیب صاحب کے انتقال کے بعد وہ لکھنؤ چلے آئے۔ مولوی محمد نظام الدین کے دو فرزند تھے۔ بڑے بیٹے کا نام 'محمد' تھا۔ ان کے ایک بیٹا پیدا ہوا جس کا نام عبدالرحیم رکھا گیا، لیکن والدہ نے بیٹے کا نام تفضل حسین رکھا اور وہ اسی نام سے مشہور ہوئے۔ یہی تفضل حسین شرر کے والد تھے۔[۵] مولوی تفضل حسین کی شادی کرسی کے ایک سربرآوردہ رئیس منشی محمد قمر الدین کی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔ یہ صاحب اودھ کے شاہی دربار میں ایک معزز خدمت پر مامور تھے۔ انتزاعِ سلطنتِ اودھ کے بعد جب واجد علی شاہ کلکتہ چلے گئے اور ایک شاہی وفد جس میں معزول بادشاہ کی والدہ، بھائی اور صاحبزادے شامل تھے، انگلستان گیا تو منشی قمر الدین بھی اس کے ساتھ گئے۔ اور جب اس وفد کو ناکامی ہوئی تو وہ قاہرہ اور بیت المقدس کی زیارت اور حجِ بیت اللہ کرتے ہوئے

---

(۱) مولانا شرر مرحوم کی خود نوشت سوانح عمری آپ بیتی 'من آنم کہ من دانم' دلگداز فروری ۱۹۳۳ء۔

(۲) تاریخ ادب اردو (سکسینہ، ترجمہ مرزا محمد عسکری) میں یہ تاریخ ۲۰ جمادی الثانی درج ہے۔

(۲) 'آپ بیتی' دلگداز جنوری ۱۹۳۳ء۔

(۳) ایضاً۔

(۴) لکھنؤ سے چند میل کے فاصلے پر ایک قصبہ۔

(۵) 'آپ بیتی' دلگداز جنوری ۱۹۳۳ء۔

د سے واپس آئے اور بادشاہ کی ملازمت اختیار کر کے مٹیا برج میں رہنے لگے۔[۱]

شرر کی عمر ۵، ۶ سال کی ہوگی کہ ان کے نانا منشی قمر الدین نے شرر کے والد مولوی تفضل حسین کو مٹیا برج بلا لیا اور وہاں وہ بیس روپے ماہوار پر بادشاہ کے محرروں میں ملازم ہو گئے۔[۲] والد اور نانا کی عدم موجودگی میں شرر نے اپنی تعلیم منشی قمر الدین کے بڑے بھائی مولوی حفیظ الدین کے مکتب میں شروع کی۔ شرر کے مکان کے قریب ہی عزیزوں کے جو دو چار مکان تھے ان میں مولوی محمد رضا، حکیم احمد رضا، مولوی ریاض احمد اور مولوی عبد الاحد رہتے تھے۔ وہ اپنے وقت کے مشہور و مستند مدرس تھے۔ شرر کو بچپن میں ان کی صحبت ملی[۳]۔ اور ایک ہمسایہ 'چچی' کے ساتھ گھروں میں جا کر تعزیہ داری اور عورتوں کا ماتم دیکھا۔

۹ سال کی عمر میں شرر ۱۸۶۹ء میں اپنے نانا منشی قمر الدین کے پاس مٹیا برج چلے گئے۔[۴] یہاں ان کے والد نے ان کو پڑھانا شروع کیا۔ ایک ہی سال کے اندر فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھ کر 'گلستان'، 'بوستان' شروع کر دی۔ والد کی غیر معمولی توجہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ دو ہی سال کے اندر فارسی کی کتابیں ختم ہو گئیں تو صرف و نحو اور منطق کی کئی کتابیں اور پھر ملا باقر نامی ایک شیعہ کشمیری عالم سے کئی کتابیں پڑھیں منشی السلطان والی مسجد میں حافظ باب اللہ جو بڑے نیک بزرگ تھے، نماز پڑھایا کرتے۔ شرر مدت تک ان کے ساتھ رہے۔ پانچوں وقت ان کے ساتھ نماز پڑھنے اور دین داری کی باتیں سنتے۔ عرصے تک رات کو سوتے بھی مسجد میں تھے[۵]۔ اسی زمانے میں حافظ باب اللہ کے ہم وطن حافظ الٰہی بخش سے قرآن مجید پڑھا۔ کلکتہ میں شرر کی زندگی کا ایک رخ تو یہ ہے کہ وہ عالموں اور پرہیز گاروں کی صحبت میں زندگی گزارتے۔[۶] اور بعض زمانوں میں تہجد کا بھی ناغہ نہ کرتے اور دوسرا رخ یہ کہ شہزادوں کی صحبت میں رہتے جن کا مشغلہ رند مشربی اور عیش کوشی تھا۔ اس صحبت میں کچھ دیر مبتلا رہے[۷]۔ اس ماحول میں بٹیر بازی کا شوق بھی پیدا ہوا۔ افیونیوں کی صحبتیں دیکھیں۔

---

(۱) 'من آنم کہ من دانم' دلگداز جنوری ۱۹۳۳ء۔
(۲) ایضاً فروری ۱۹۳۳ء۔
(۳) ایضاً
(۴) ایضاً
(۵) ایضاً مارچ ۱۹۳۳ء۔
(۶) 'من آنم کہ من دانم' دلگداز جون ۱۹۳۳ء۔
(۷) ایضاً اپریل ۱۹۳۳ء۔

داستان گوئی کی محفلوں میں شریک ہوئے - بانک اور پٹے کو اپنا مشغلہ بنایا[1] -

واجد علی شاہ کی محلاتِ عالیات و بیگمات جو خطوط بادشاہ کی خدمت میں بھیجا کرتی تھیں وہ بادشاہ کے ملاحظہ کے بعد دفتر بیت الاجرا میں محفوظ رکھے جاتے تھے یہ خط ترددّ نامے کہلاتے تھے اور انشا پردازی کا اعلیٰ نمونہ ہوتے تھے - شرر کے والد نے بیٹے کی آزادیوں اور آوارگیوں کو دیکھ کر منشی السلطان بہادر سے یہ بات منوا لی کہ شرر اس دفترِ دار الاجرا میں حاضر ہو کر کام کیا کریں - شرر کو شروع شروع تو یہ خدمت پسند نہ آئی ، لیکن بعد میں اس میں دلچسپی لینے لگے اور اس طرح ترددّ نامے شرر کے لیے انشا پردازی کا پہلا نصاب ثابت ہوئے -[2] اس کے علاوہ شہزادوں کی شب و روز کی صحبت ، خواصوں اور محلہ داروں کی پر لطف باتیں سننے کے مواقع ، مرزا جلال بہادر کی والدہ صدر محل کی خدمت میں باریابی[3] اور داستان گوئی کی محفلوں کی شرکت نے شرر میں فصاحتِ زبان کا ذوق پیدا کیا اور انہیں اپنی زبان کی اصلاح میں بڑی مدد ملی -

کلکتے کے قیام میں دو واقعات اور اس نوعیت کے ہیں جنہوں نے شرر کی آئندہ زندگی پر اثر ڈالا - پہلا واقعہ تو یہ کہ ایک دوست کے کہنے سے یہ اہلِ حدیث اور حنفیوں کے ایک مذہبی مناظرے میں شریک ہوئے - یہ مناظرہ پہلے تو اسی طرح ہوا کہ دونوں گروہ ایک دوسرے کے رو در رو بیٹھے ، لیکن بعد میں تحریری مناظرہ ہوا اور اہلِ حدیث کے اٹھائے ہوئے ایک مسئلے کا جواب لکھنے کی خدمت شرر کے سپرد ہوئی - اس سلسلے میں انہوں نے بخاری اور مسلم کا سرسری مطالعہ کیا اور اس کے بعد اس کے تحقیقی مطالعے کی طرف متوجہ ہوئے -[4] دوسری بات یہ کہ کلکتے کے قیام کے زمانے میں وہ 'اودھ اخبار' لکھنؤ کے نامہ نگار کی حیثیت سے خبریں لکھ لکھ کر بھیجا کرتے تھے -[5]

---

(۱) من آنم کہ من دانم ، دلگداز جون ۱۹۳۳ء

(۲) ایضاً جون ۱۹۳۳ء -

(۳) شہزادے مرزا لال بہادر شرر کے ہم سن دوست تھے ان کی والدہ نواب صدر محل نہایت شائستہ اور تعلیم یافتہ بیگم تھیں - شعر و سخن میں گلشن الدولہ بہادر کی شاگرد تھیں - ان کا دیوان مرتب ہو کر چھپ گیا تھا ، جس کے اشعار بہت سے لوگوں کی زبانوں پر تھے ... ستار خوب بجاتی تھیں - موسیقی کا اچھا ذوق تھا - شرر کو اپنے بیٹے کا دوست سمجھ کر اندر بلوا لیتی تھیں - 'من آنم کہ من دانم' - دلگداز جون ۱۹۳۳ء -

(۴) 'من آنم کہ من دانم' - دلگداز جولائی ۱۹۳۳ء -

(۵) مرزا محمد عسکری ، تاریخ ادب اردو (حصہ نثر) - ص ۱۲۵ -

شرر ۱۹ سال کی عمر میں کلکتے سے لکھنؤ چلے آئے - یہاں آ کر مولوی محمد عبدالحئی سے عربی کی درسی کتابیں ختم کیں - بیس سال کی عمر میں ان کی شادی اپنے ماموں کی بیٹی سے ہو گئی - شادی کے بعد ہی حدیث کے مطالعے کے لیے دہلی گئے اور مولوی محمد نذیر حسین دہلوی کی خدمت میں رہ کر حدیث کی تکمیل کی - کلکتے کے قیام میں ایک بنگالی ماسٹر سے انگریزی پڑھی ، لیکن وہ نہ پڑھنے کے برابر تھی - لکھنؤ میں رہ کر اس کے مطالعے کی طرف خاص توجہ کی اور محنت کر کے اس میں بقدرِ ضرورت دستگاہ پیدا کر لی - اس زمانے میں 'اودھ پنچ' اور دوسرے اخبارات میں مضامین لکھے اور فلسفیانہ خیال آفرینی اور انشا پردازی پر زیادہ زور دیا - ۱۸۸۰ء میں منشی نولکشور نے اودھ اخبار کے ادارتی عملے میں شامل کر لیا - شرر کے اس خاص رنگ اور مضامین کی شہرت دور دور پہنچی اور حیدر آباد اور بعض چھوٹی چھوٹی ریاستوں سے ان کے بلاوے آنے لگے - اسی زمانے کا لکھا ہوا ایک مضمون جس کا موضوع 'روح' تھا ، سر سید کو اتنا پسند آیا کہ انھوں نے منشی نولکشور کی وساطت سے اس کے بعض حصے استعمال کرنے کی اجازت چاہی[۱] -

۱۸۸۱ء میں شرر نے اپنے ایک دوست مولوی عبدالباسط کے نام سے 'محشر' نام کا ایک ہفتہ وار رسالہ نکالا - اس کے اسلوب کی خصوصیت یہ تھی کہ فارسی کی تشبیہوں اور استعاروں کو انگریزی بندشوں کے سانچے میں ڈھالا گیا تھا - اس میں قافیہ پیمائی اور رعایتِ لفظی سے بھی احتراز کیا گیا تھا - اسی رسالے کے ۱۸ ، ۱۹ شماروں میں صبح کا سماں کھینچا گیا تھا[۲] -

۱۸۸۲ء میں شرر نے 'اودھ اخبار' کی ملازمت ترک کر دی ، وجہ یہ تھی کہ انھیں اخبار کی طرف سے خصوصی نامہ نگار بنا کر بھیجا گیا تھا - انھیں وہاں رہنا پسند نہ تھا ، اس لیے نوکری چھوڑ کر لکھنؤ آ گئے - ۱۸۸۲ء سے ان کی ناول نگاری کا سلسلہ شروع ہوا - پہلا معاشرتی ناول 'دلچسپ' ۱۸۸۲ء میں اور اس کا دوسرا حصہ ۱۸۸۳ء میں شائع ہوا - اسی سال انھوں نے بنکم چندر چیٹرجی کے ناول 'درگیش نندنی' کے انگریزی ترجمے کو اردو میں منتقل کیا - بشیر الدین صاحب اور منشی نثار حسین مالک 'پیامِ یار' کے اصرار پر شرر نے اپنا مشہور رسالہ 'دلگداز' نکالا - اسی رسالے میں ۱۸۸۸ء میں تاریخی ناولوں کا سلسلہ شروع ہوا اور اس میں علی الترتیب کئی تاریخی ناول چھپے - ان میں سے

---

(۱) مرزا محمد عسکری ، تاریخ ادب اردو (حصہ نثر) - ص ۱۲۶ -

(۲) ایضاً

ابتدائی چار ناول 'ملک العزیز ورجنا' (۱۸۸۸ء) ، 'حسن انجیلنا' (۱۸۸۹ء) ، 'منصور موہنا' (۱۸۹۰ء) اور 'قیس و لبنیٰ' (۱۸۹۱ء) ہیں - ۱۸۹۰ء[1] میں انہوں نے 'مہذب' اخبار نکالا جس میں علمائے اسلام کی سوانح عمریاں چھپتی تھیں[2] - ۱۸۹۱ء میں شرر کو حیدر آباد میں دو سو روپے ماہوار کی ملازمت مل گئی اور وہ 'دلگداز' اور 'مہذب' کو بند کرکے وہاں چلے گئے - دو سال لیت و لعل میں گزارے اور ۱۸۹۲ء میں 'دلگداز' پھر جاری کیا - ایسے شائع ہوئے نو مہینے گزرے تھے کہ یکایک انگلستان جانے کا حکم ملا[3] - انگلستان کے قیام میں انہوں نے فرانسیسی سیکھی - تاریخ کی کتابوں کا مطالعہ کیا اور بہت سا ذخیرہ اپنے ساتھ لائے[4] -

۱۸۹۸ء میں 'دلگداز' حیدر آباد سے از سر نو جاری ہوا ، لیکن ایک شورش[5] کی بنا پر گیارہ مہینے بعد بند کر دیا - ۱۹۰۰ء میں لکھنؤ آ کر اسے پھر نکالا - ۱۹۰۱ء میں پھر حیدر آباد بلائے گئے - مولانا 'دلگداز' بند کرکے وہاں چلے گئے ، لیکن وہاں کے حالات میں ایسی تبدیلیاں پیدا ہوئیں کہ جنوری ۱۹۰۲ء میں ان کی تنخواہ رکوا دی گئی[6] - ۱۹۰۳ء میں شرر لکھنؤ واپس آ گئے اور اپنے ادبی کاموں میں مصروف ہو گئے - ۱۹۰۷ء میں انہیں حیدر آباد میں نائب ناظم تعلیمات کے عہدے پر مامور کیا گیا ، لیکن ۱۹۰۹ء میں نظام کے حکم پر انہیں حیدر آباد چھوڑنا پڑا - ۱۹۱۸ء میں میر عثمان علی خان ، نظام حیدر آباد نے اپنی سوانح عمری لکھنے کے لیے حیدر آباد بلایا ، لیکن بالآخر

---

(۱) عبدالسلام خورشید - صحافت پاکستان و ہند میں - ص ۲۷۰ -

(۲) اس کا غالب حصہ اداریوں اور مضامین پر مشتمل ہوتا تھا - قومی اور بین الاقوامی خبریں مختصر انداز میں دی جاتی تھیں - عبدالسلام خورشید - صحافت پاکستان و ہند میں -

(۳) شرر ، مضامین شرر جلد اول - ص ۳۷ ، شرر کے اس بیان اور تاریخ ادب اردو ، عسکری (ص ۱۲۹) کے بیانات میں فرق ہے - تاریخ ادب اردو کے بیانات بقول مترجم خود شرر کے بیان کردہ ہیں - ان میں کہا گیا ہے کہ شرر وقار الامرا بہادر کے بچوں کے اتالیق بن کر ۱۸۹۵ء میں انگلستان گئے اور وہاں چودہ پندرہ مہینے مقیم رہ کر ۱۸۹۲ء کے آخر میں ہندوستان واپس آئے - اس بیان کی تائید شرر کے ان خطوط سے ہوتی ہے جو انہوں نے ۱۸۹۶ء میں انگلستان سے لکھے اور اب نقوش کے خطوط نمبر ۱۰۹ میں چھپے ہیں -

(۴) اس ذخیرے کو شرر نے بہت سے ہدیے اور تحفے کہا ہے اور دلگداز کے صفحوں پر رکھ کے قدردانوں کی خدمت میں پیش کرنے کا وعدہ کیا ہے - مضامین شرر ، جلد اول - ص ۴۳ ، مضمون بہ عنوان ہم اور ہماری غیبت -

(۵) یہ شورش دلگداز میں سکینہ بنت حسین کی اشاعت کی بنا پر تھی -

(۶) خط نمبر ۲۶ خطوط نمبر نقوش شمارہ ۱۰۹ -

'تاریخِ اسلام' لکھنے کا کام ان کے سپرد کیا گیا[۱]۔ دو سال کے لیے چھ سو روپے ماہوار وظیفہ مقرر ہوا اور انہیں اس بات کی اجازت مل گئی کہ وہ یہ تاریخ لکھنؤ میں بیٹھ کر لکھیں[۲]۔ شرر ۱۹۲۴ء کے وسط تک اس تاریخ کی تکمیل کے کام میں مصروف تھے[۳]۔ ۱۹۱۸ء کے سفر کے بعد شرر حیدر آباد نہیں گئے۔ بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی وجہ سے نظام نے حیدر آباد میں ان کا داخلہ اور قیام ممنوع قرار دے دیا تھا اور شرر اپنی وفات سے کچھ عرصہ پہلے تک اس بات کے آرزومند تھے کہ انہیں ''حیدر آباد میں کبھی کبھی آنے اور ٹھہرنے کی اجازت عطا ہو'' [۴]۔

زندگی کے آخری دو برس شرر کی صحت اچھی نہیں رہی۔ طرح طرح کی تکلیفوں میں مبتلا رہے۔ انتقال سے چند مہینے پہلے دماغ کام کے قابل نہ رہا تھا۔ لیکن علاج سے جب ذرا افاقہ ہوتا تو بالکل 'مشین کی طرح' لکھتے پڑھتے[۵]۔ 'دلگداز' کا دسمبر ۱۹۲۶ء کا شمارہ ۱۲، جلد ۲۶ مرنے سے دو ایک دن پہلے خود انہوں نے مرتب کیا۔ شرر کا انتقال لکھنؤ میں ۴ ۲ دسمبر ۱۹۲۶ء کو ہوا[۶]۔

ادب کے مؤرخین نے شرر کی طبیعت کی بے چینی اور جرأت مندی کو ان کی شخصیت کی نمایاں خصوصیت قرار دیتے ہوئے ادبی زندگی میں ان کی ہمہ گیری اور کثیر جہتی کو ان کا امتیاز قرار دیا ہے۔ وہ بہ یک وقت ناول نگار، مؤرخ، انشائیہ نگار، نقّاد، عالم، معلّم، صحافی، ڈراما نگار، ماہرِ تعلیم اور سیاست دان سب کچھ تھے[۷]۔ لیکن جن تین چیزوں نے انہیں اپنے عہد کے نمایاں مصنفین میں جگہ دی وہ ان کے ناول، تاریخیں اور انشائیے ہیں[۸]۔ ہمارے خیال میں شرر کے ادبی رتبے کے تعیّن کے لیے ان تین چیزوں میں ان کے صحافتی کارناموں کا شامل کرنا ضروری ہے۔

---

(۱) حیدر آباد کے مختلف سفروں کا حال تاریخی ترتیب کے ساتھ رام بابو سکسینہ کی تاریخ ادب اردو میں صراحت سے بیان ہوا ہے۔ ص ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، اور ۳۳۸ اور ۳۳۹۔

(۲) خطوط نمبر ۳۱، ۳۲ نقوش، لاہور شمارہ ۱۰۹۔

(۳) خط نمبر ۴۰ نقوش، شمارہ ۱۰۹۔

(۴) خط نمبر ۴۴ نقوش، شمارہ ۱۰۹۔

(۵) خط نمبر ۴۴ نقوش، شمارہ ۱۰۹۔ مئی کے مہینے میں دس بارہ روز کے اندر دلگداز کے دو پرچے تیار کر دیے۔ (خط ۴۶ نقوش، شمارہ ۱۰۹) اور اکتوبر ۱۹۲۶ء میں فرقہ معتزلہ کی تاریخ اور اس کے عروج و زوال پر دو سو صفحہ کا لیکچر تیار کرنے میں مصروف تھے۔ (خط نمبر ۵۱، نقوش، شمارہ ۱۰۹)۔

(۶) زمانہ، جنوری ۱۹۲۷ء۔ ص ۴۷۔

(۷) سکسینہ، تاریخ ادب اردو۔ ص ۳۳۹۔

(۸) ایضاً۔ ص ۳۴۱۔

شرر کی ناول نگاری

شرر نے اردو میں تاریخی ناول بھی لکھے اور اصلاحی و معاشرتی ناول بھی ، لیکن ناول نگاری کی تاریخ میں ان کے نام کو عموماً تاریخ نگار کی حیثیت سے اہمیت دی جاتی ہے ۔ ان کا پہلا تاریخی ناول 'ملک العزیز ورجنا' ۱۸۸۸ء میں لکھا گیا اور آخری ناول 'مینا بازار' ۱۹۲۵ء میں ۔ ۳۷ ، ۳۸ سال کی اس مدت میں شرر نے جو تاریخی ناول لکھے ان کے فنی مرتبے کی تعیین میں بڑی افراط و تفریط سے کام لیا گیا ہے ۔ ان ناولوں پر وقتاً فوقتاً جو اعتراض کیے گئے ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ شرر کے یہ تاریخی ناول ناظر کو دس پانچ صدی پیچھے لے جاتے ہیں اور شرر ان واقعات کی ایسی تصویر نہیں کھینچ سکتے جو اصل سے مطابقت رکھتی ہو[1] ۔ یہ ناول نہ ماضی کی تدوین کرتے ہیں اور نہ ان سے ماضی کے کسی دور کے کامل احیاء اور بار آفرینی کا وہ مقصد پورا ہوتا ہے جو تاریخی ناول کی امتیازی خصوصیت ہے[2] ۔ ان ناولوں میں آنے والے ہیرو اور ہیروئن ایک سے ہیں ۔ وہ سب ''من چلے ، بلند بالا اور مہذب'' ہیں ۔ ہم ایک کو دوسرے سے تمیز نہیں کر سکتے ۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کے فرزندانِ معنوی میں سے کسی نے بھی ایسی شہرت حاصل نہیں کی کہ اس کا نام ہر شخص کی زبان پر ہو[3] ۔

''سرر کے سب ہیرو ایک ہی سانچے میں ڈھلے ہوئے ہیں ۔ ان کے خیالات کی پرواز ایک ہے ۔ ان کی رفتار و گفتار کا انداز ایک ہے ۔ اگر کوئی فرق ہے تو لباس کا ۔ منصور کے جسم پر افغانی لباس ہے ، عزیز کے جسم پر ترکی ، زیاد کے جسم پر عربی ، لیکن ان کے باہمی مشابہت اتنی زیادہ ہے کہ سب سگے بھائی معلوم ہوتے ہیں''[4] ۔ وہ ''سیرتوں میں بلندی قائم نہیں کر سکتے ۔ ان کے کرداروں میں دل کی حرکت محسوس نہیں ہوتی ۔ اس لحاظ سے 'مقدس نازنین' کا شاہزادہ علی ، 'حسن انجلینا' کا حسن ، 'ملک العزیز ورجنا' کا ملک عبدالعزیز اور 'منصور موہنا' کا منصور سب ایک دوسرے سے مشابہ ہیں[5] ۔ شرر کے یہاں تاریخ کے زندہ کردار بالکل مردہ اور بے جان ہو جاتے ہیں ۔ زندۂ جاوید شخصیتوں کو مردۂ ابد

---

(۱) نواب رائے ، سرشار و شرر ، اردوئے معلیٰ مارچ ، اپریل ۱۹۰۶ء ۔

(۲) فیاض محمود گیلانی ، عبدالحلیم شرر ۔ کاروان ۱۹۳۳ء ۔

(۳) نواب رائے ، سرشار و شرر ۔ اردوئے معلیٰ ۔ مارچ ، اپریل ۱۹۰۶ء ۔

(۴) مرزا محمد سعید دہلوی ، شرر اور سرشار ۔ مخزن ۔ دسمبر ۱۹۰۶ء ۔

(۵) فیاض محمود گیلانی ، عبدالحلیم شرر ، کاروان ۱۹۱۱ء ۔

کر کے پیش کرنا مولانا کی خصوصیت ہے ۔ یہ بات عزیزِ مصر ، 'ملک العزیز ورجنا' ، 'حسن انجلینا' ، 'فلپانا' ، 'فتحِ اندلس' اور 'ماہِ ملک' کے مطالعے سے سامنے آتی ہے[1] ۔ ان کے ناولوں کو تاریخی ناول کہنا زیادہ صحیح نہیں ، اس لیے کہ ان سے نہ ہمیں کسی تاریخی دور کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے نہ کسی تاریخی شخصیت کا تصور ذہن میں بیٹھتا ہے ۔ ان کے تمام کردار یک طرفہ ہیں ۔ وہ صرف ایک ہی خوبی یا ایک ہی برائی پر زور دیتے ہیں[2] ۔ مکالمے لکھنے کی صلاحیت ان میں چھو کر بھی نہیں گئی[3] ۔ کردار بولتے شرر کی زبان سے ہیں ، ان کی ایک ایک حرکت ، ان کی ایک ایک ادا ، ان کی ایک ایک بات ثابت کرتی ہے کہ مصنف پردے کی آڑ میں بیٹھا ہوا ، کیرکٹر کا پارٹ ادا کر رہا ہے[4] ۔ شرر بول چال کو مختلف سانچوں میں نہیں ڈھال سکتے ۔ سب کردار ایک ہی زبان میں گفتگو کرتے ہیں ۔ وہ ان کی اپنی زبان نہیں قصہ گو کی زبان ہے[5]'' ۔

فطرتِ انسانی سے نا واقفیت شرر کی بڑی کمزوری ہے ۔[6] انسانی نفسیات سے انہیں کوئی مس نہیں ۔[7] وہ فطرتِ انسانی کے نشیب و فراز سے قطعاً ناواقف ہیں ۔[8] اور فطرت کی بھول بھلیاں اور جذبات کی گہرائیاں ان کے بس کی نہیں ۔[9] شرر کی ایک اور کمزوری دوسری قوموں اور تمدنوں کے متعلق ان کی تنگ نظری ہے ۔ (مثلاً 'فلورا فلورنڈا' ، 'فتحِ اندلس' اور 'مقدس نازنین' [10]) وہ اپنے فن کی ترتیب میں اپنی ذاتی رائے اور تعصبات کو جا و بے جا دخل دیتے ہیں ۔[11] انہیں مجتہدوں

---

(۱) علی عباس حسینی ، ناول کی تاریخ و تنقید ۔ ص ۲۷۱ ، ۲۷۴ اور ۲۷۵ ۔

(۲) فیض احمد فیض ، میزان ۔ ص ۲۲۳ تا ۲۳۵ ۔

(۳) محمد احسن فاروقی ، اردو ناول کی تنقیدی تاریخ ۔ ص ۱۴۵ ۔

(۴) نواب رائے ، سرشار و شرر ، اردوئے معلیٰ ، مارچ ۱۹۰۶ء ۔

(۵) فیض احمد فیض ، میزان ۔ ص ۲۳۱ ۔

(۶) مرزا محمد سعید ، شرر اور سرشار ، مخزن ، دسمبر ۱۹۰۶ء ۔

(۷) محمد احسن فاروقی ، اردو ناول کی تنقیدی تاریخ ۔ ص ۱۴۳ ۔

(۸) فیاض محمود گیلانی ، عبدالحلیم شرر ، کاروان ۱۹۳۳ء ۔

(۹) آل احمد سرور ، تنقیدی اشارے ۔ ص ۱۵ ۔

(۱۰) فیاض محمود ، عبدالحلیم شرر ، کاروان ۱۹۳۳ء ۔

(۱۱) مرزا محمد سعید ، شرر اور سرشار ، مخزن ، دسمبر ۱۹۰۶ء ۔

کا جوش اور ملاؤں کا دل ملا ہے[۱] ۔ اور وہ اسلام کو اس نظر سے دیکھتے ہیں جیسے ملائے مسجدی[۲] ۔

شرر کے تاریخی ناولوں پر کڑی نقطہ چینی کرنے والوں نے فن کے اعتبار سے ان کے معاشرتی ناولوں کو اور بھی زیادہ برا کہا ہے اور اکثر اوقات بڑے جذباتی انداز میں انہیں پوچ کہہ کر یہ حکم لگا دیا ہے کہ ان کا ذکر ہی نہ کیا جائے تو بہتر ہے (محمد احسن فاروقی) ۔ اس لیے کہ وہ محض خیالی ہیں (علی عباس حسینی) اور ان کی یہ کمزوری، فطری ہے کہ ان میں تصویر نگاری کی قابلیت نہیں جس کے بغیر مشاہدات کی سچی تصویر کھینچنا محال ہے (نواب رائے) ۔ ان کے معاشرتی ناول سوسائٹی سے نا واقفیت کا مرقع ہیں (آغا صادق کی شادی) اور ان میں ایسے واقعات بیان کیے گئے ہیں جو نا قابلِ یقین ہیں (غیب دان دلہن)[۳] ۔ ان میں سماجی رسموں کی بازاری طریقے سے ہنسی اڑائی گئی ہے (دلچسپ، دلکش، غیب دان دلہن، آغا صادق کی شادی)[۴]

شرر کے تاریخی اور معاشرتی ناولوں کے متعلق پچھلے ۶۰، ۷۰ برس کی طویل مدت میں جن خیالات کا اظہار کیا گیا، ان میں سے زیادہ ایسے ہیں جن میں ان ناولوں کے نقائص کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ۔ اس کی وجہ یقیناً یہ ہے کہ تنقیص کرنے والوں نے نہ اس خاص سیاسی اور معاشرتی پس منظر کو اہمیت دی جس میں یہ ناول لکھے گئے اور نہ ان محرکات کا غیر جانبدارانہ تجزیہ کیا، جو ان ناولوں کی تخلیق کا باعث بنے، حالانکہ یہ دونوں باتیں ایسی ہیں کہ انہیں پیشِ نظر رکھے بغیر نہ ان ناولوں کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے اور نہ ان کی فنی حیثیت اور قدر کا معروضی تعیّن ممکن ہے ۔ ان کی ناول نگاری کے محرکات کا ذکر کرتے ہوئے یہ بات کہی گئی ہے کہ کسی ریل کے سفر میں شرر کو اسکاٹ کا ناول 'طلسمان' پڑھنے کا موقع ملا تو انہیں اس بات پر غصہ آیا کہ اس ناول میں اسلام اور اسلامی تصورات کی غلط مصوری کی گئی ہے ۔ چنانچہ انہوں نے تہیّہ کیا کہ وہ صلیبی جنگوں پر ایک ناول لکھ کر اسلام اور اس کے جانبازوں کی عظمت کو نمایاں کریں گے ۔[۵] ان کی تاریخی ناول نگاری کے اس واحد محرک کا ذکر

---

(۱) نواب رائے، سرسار و شرر، اردوئے معلیٰ، مارچ، اپریل ۱۹۰۶ء ۔

(۲) محمد احسن فاروقی، اردو ناول کی تاریخی تنقید ۔ ص ۱۵۸ ۔

(۳) فیاض محمود گیلانی، کاروان ۱۹۳۳ء ۔

(۴) فیض احمد فیض، میزان ۲۲۹ ۔

(۵) A History of Urdu Literature, Saksena ، 234 ۔

شرر کے اکثر نقادوں نے کیا ہے۔ ڈاکٹر احسن فاروقی کا خیال بھی یہی ہے کہ ''یہ جذبہ مذہبی ان کے ناول نگار ہونے کا محرک ہوا''[۱]۔ علی عباس حسینی کی رائے یہ ہے کہ 'مؤرخانہ ذوق' قبولیتِ عالم کی خواہش، مذہبی جوش اور مسلمانوں کے احیاء کا خیال تاریخی ناول کا محرک بنا''[۲]۔

حقیقت یہ ہے کہ شرر نے جس دور میں زندگی بسر کی وہ مسلمانوں کے لیے بڑی آزمائش کا دور تھا اور آزمائش کے اس دور میں احیاء کی جو تحریکیں شروع ہوئیں ان میں سے زیادہ دور رس اور موثر سر سید کی تحریک تھی جس کا دائرۂ فکر و عمل سیاست، معاشرت، تعلیم، اخلاق اور دین سب پر محیط تھا۔ سر سید کے دور کے سب اہم لکھنے والے کسی نہ کسی انداز میں، ان کے پروگرام کے حامی اور عملی موید تھے اور اپنی تحریروں کے ذریعے ان خیالات کی تبلیغ کے کام میں مصروف تھے جو ان کے نزدیک مسلمانوں کے نشاۃِ ثانیہ کی اساس تھے۔ شرر ان چند ادیبوں میں سے ہیں جو سر سید کے مشن کے سب پہلوؤں میں ان کے حامی اور متبع تھے اور انہیں مسلمانوں کا ہادی و رہبر تسلیم کرتے ہوئے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ''ممالک متحدہ و پنجاب ہی نہیں، سارے ہندوستان کے مسلمانوں کو صرف ایک شخص نے تباہی سے بچا لیا اور وہ شخص سر سید تھا''[۳]۔ سیاسی اور قومی نقطۂ نظر سے وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے اتحاد کے حامی ہیں، لیکن سمجھتے ہیں کہ ہندوؤں کا طرزِ عمل اس طرح کے اتحاد کے راستے میں حائل ہے، اس لیے اس کا حل یہ ہے کہ ہندوستان کے اضلاع کو ہندو مسلمان باہم تقسیم کر لیں اور اپنی اپنی آبادی علیحدہ کر لیں[۴]۔ مسلمانوں کی معاشرتی زندگی اور اس کی مختلف خرابیوں کی طرف بھی شرر نے 'دلگداز' کے مضامین اور اداریوں میں واضح اشارے کرتے ہوئے ان کی اصلاح کی خواہش ظاہر کی ہے[۵]۔

شرر کے تاریخی اور معاشرتی ناولوں کا معروضی جائزہ لینے سے پہلے جس دوسری چیز کا لحاظ رکھنا ضروری ہے، یہ ہے کہ ناول کی صنف، اس کے فنی

---

(۱) اردو ناول کی تنقیدی تاریخ - ص ۱۲۸ -

(۲) ناول کی تاریخ اور تنقید - ص ۲۷ -

(۳) شرر، سر سید احمد خان کی دینی برکتیں، دکن ریویو، مئی ۱۹۰۸ء -

(۴) عبدالسلام خورشید، صحافت، پاکستان و ہند میں (بحوالہ اداریہ مہذب، لکھنؤ، اشاعت ۲۳ اگست ۱۸۹۰ -

(۵) شرر، مضامین شرر جلد چہارم - ص ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، مضامین شرر، جلد اول، ص ۹۶، ۱۰۲، ۱۰۶، ۱۱۲ -

حدود اور تقاضوں کے متعلق شرر کے تصورات کیا ہیں اور انہوں نے ناول لکھتے وقت قاری کے مزاج اور اس کی ضروریات ، نیز قومی اور ملکی زندگی کے مطالبات کو کس حد تک پیشِ نظر رکھا ہے۔ شرر کی رائے یہ ہے کہ کسی مسئلے کو ذہن نشین کرانے کا سب سے مؤثر ذریعہ ناول ہیں - کوئی معلمِ اخلاق یہ طریقہ اختیار کیے بغیر اپنے مقصد میں کامیابی نہیں حاصل کر سکتا - اس لیے کہ ناول ہی اخلاق کے اصلی معلم ہو سکتے ہیں - اس لیے جب کوئی شخص ناول لکھتا ہے ، تو یہ سمجھ کر کہ عمدہ سبق دینا ناول نگار کا اولین فرض ہے جسے وہ قومی خدمت سمجھ کر انجام دیتا ہے - شرر ایسے ہی ناول نگار ہیں اور بہ حیثیتِ ناول نگار وہ اسے قومی فرض سمجھتے تھے کہ وہ اپنے ناولوں کو اچھے خیالات کی تبلیغ اور اصلاحِ احوال و اخلاق کا ذریعہ بنائیں۔ اپنے اس مقصد کا تعین شرر نے بہت سوچ سمجھ کر کیا تھا - وہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں میں تاریخ کا صحیح ذوق پیدا کرنے کے علاوہ ان کے ناولوں کا مقصد یہ ہے کہ ان کے مطالعے سے ان کی رگِ حمیتِ اسلام جوش میں آئے ، ان کے قومی خون میں جوش پیدا ہو اور وہ ترقی کی راہ پر چلنے کا تہیہ کر لیں - یہ سب کچھ اسی صورت میں ممکن ہے کہ ناول قاری کے لیے دلچسپ ہو - یہ قاری ، جنہیں شرر نے پبلک کہا ہے اور جن سے ان کی مراد عوام ہیں ، صرف ایسے ناول پسند کرتے ہیں جن میں 'رومانس' ہو اور جن میں حسن و عشق کے ذکر کو ناول کی دلچسپی کی اساس سمجھ کر شامل کیا گیا ہو - شرر کے نزدیک ناول میں دلچسپی حسن و عشق کے بغیر پیدا ہی نہیں ہوتی اور اس دلچسپی کے بغیر عوام اسے پسند ہی نہیں کرتے - عوام کے مذاق کی تسکین کو شرر اپنا فنی منصب اور ان کی پسندیدگی کو اپنا انجام جانتے ہیں - یہی وجہ ہے کہ وہ ایسے ناول لکھنے کے خلاف ہیں جن کا انجام ناکامی ہو - ناکامی عوام کو پسند نہیں آتی - تعلیمِ اخلاق اور اصلاحِ احوال کے لیے شرر نے ناول کا انتخاب اس لیے کیا کہ مغرب میں یہ اصلاح کا بڑا موثر ذریعہ ثابت ہوا ہے ، لیکن مغرب سے یہ اثر قبول کرنے کے باوجود انہوں نے ''تعلیمِ اخلاق کا وہی طریقہ اختیار کیا ، جو قرآن مجید میں اختیار کیا گیا تھا''(۱)۔

(۱) اس طویل عبارت کے خیالات شرر کے مندرجہ ذیل مضامین سے ماخوذ ہیں :-

الف - مضامین شرر - جلد چہارم (مضامین ''ناول'' اور ہمارا جدید ناول) ص ۲۳۰ ، ۲۳۱ ، ۲۵۷ ، ۲۵۸ ، ۲۵۹ -

ب - مضامین شرر ، جلد ہفتم - ص ۱۲۹ تا ۱۳۵ (مضمون 'بد قسمت زبان اردو') -

ج - مضامین شرر ، جلد اول ، آغاز و اختتام سال کے مضامین - ص ۱۶ -

شرر کے تاریخی ناول پچھلے ساٹھ ، پینسٹھ سال سے ہماری ادبی زندگی میں اظہار رائے کا بڑا ہنگامہ خیز موضوع رہے ہیں اور عوام و خواص دونوں نے جو کچھ کہا ہے اس میں ذاتی پسند ، نا پسندیدگی ، مخصوص سیاسی ، معاشرتی اور گروہی تعصبات اور علمی اور تنقیدی معیاروں کو دخل رہا ہے۔ بسا اوقات یہ رائیں اپنی نہیں دوسروں کی ہیں ، انہیں غیر جانب دارانہ معروضی تجزیہ سمجھنا درست نہیں۔ یہی وجہ ہے جس طرح ان ناولوں کو مختلف حیثیتوں سے برا کہہ کر ان کی ادبی حیثیت کا صحیح اندازہ نہیں لگایا گیا ، اسی طرح عوام اور خواص دونوں ان کے بے شمار محاسن کے ثناخوان بھی ہیں۔ شرر نے تاریخی ناول جس قومی اور اصلاحی مقصد کے تحت ، جن ہنگامی احساسات اور جذبات کے زیر اثر اور جن قارئین کی اجتماعی اور انفرادی زندگی کی اصلاح کے لیے لکھے ، اس کا لازمی اثر یہ ہونا چاہیے تھا کہ ان کی ادبی تخلیقات میں (خصوصاً تاریخی ناولوں میں) وہ خرابیاں پیدا ہو جائیں اور وہ خامیاں رہ جائیں جن کا سرسری ذکر اس مقالے میں کیا گیا ہے ، لیکن شرر کے مقصد کے خلوص ، ان کے مطالعے ، غور و فکر اور بہ حیثیت مسلمان ایک مخصوص نقطۂ نظر اور اس نقطۂ نظر کو دوسرے وسائل سے عام کرنے کے علاوہ خصوصیت سے ناول ، اور تاریخی ناول کے ذریعے پیش کرنے کی کوشش اور کاوش ناول نگاری میں ایک خاص فنی تحریک کی بنیاد بنی[۱]۔

شرر نے جتنے تاریخی ناول لکھے وہ بقول شخصے "مٹی کا پہاڑ سہی ، لیکن آپ کو اسے ڈھٹھک کر دیکھنا ضرور پڑے گا"[۲]۔ اس مٹی کے پہاڑ یا ڈھیر میں سے درجن بھر کتابیں ایسی نکالی جا سکتی ہیں جو اب بھی کسی نہ کسی وجہ سے دلچسپ ہیں[۳]۔ اور ان میں سے ایک ناول ، ان کی تاریخی ناول نگاری کا حاصل

---

(۱) شرر - مضامین شرر ، جلد چہارم - ص ۲۳۱ ، ۲۳۲ کی عبارتیں ملاحظہ ہوں :—
"مگر افسوس کہ اردو میں جن حضرات نے لکھی ہیں ایسے بے مزہ اور بے لطف زبان میں کہ لوگوں کے دلوں میں تاریخی ناول پڑھ کے تاریخ کا جو جوش پیدا ہوتا ہے وہ تاریخوں کو پڑھ کے جاتا رہتا ہے .... آج کل اردو پبلک کی یہ حالت ہو رہی ہے کہ ہر طرف سے لوگ تاریخوں کو مانگ رہے ہیں .... مگر افسوس کہ مؤرخ اپنا فرض منصبی بالکل ادا نہیں کر سکے ، اس لیے کہ وہ پیاس ان کے بجھائے نہ بجھ سکی"۔

(۲) فراق گورکھپوری ، ناول کی تاریخ اور تنقید - ص ۲۷۲ -

(۳) احسن فاروقی ، اردو ناول کی تنقیدی تاریخ - ص ۱۲۸ (یہاں جن بارہ کتابوں کے نام لکھے گئے ہیں وہ یہ ہیں ، ملک العزیز ورجنا ، شوقین ملکہ ، حسن انجلینا ، منصور موہنا ، فردوس بریں ، عزیز مصر ، فلورا فلورنڈا ، فتح اندلس ، فلپانا ، بابک خرمی ، زوال بغداد ، ایام عرب -

اور ان کی انشا پردازی کا کرشمہ ہے (فردوس بریں) ۔ خود شرر کے نزدیک ''فردوس بریں'، 'ملک العزیز ورجنا'، 'فلورا فلورنڈا'، 'فتح اندلس' اور 'ایام عرب' ان کے بہترین تاریخی ناول ہیں(۱) ۔ ناولوں کی پسندیدگی کے اس فرق کے کئی اسباب ہیں ۔ بعض پڑھنے والوں نے کسی خاص وجہ سے یا بعض ناولوں کو ان کی واقعاتی اہمیت کے لحاظ سے پسند کیا ، بعض کو ان کے مناظر یا فضا بندی نے متاثر کیا ('ایام عرب' ۔ فیاض محمود) بعض کو کہانی کی دلچسپی نے مسحور کیے ، ('بابک خرمی'، 'الفانسو' ۔ فیاض محمود) و حقیقت یہی ہے کہ شرر کے تاریخی ناولوں کی بہت سی علمی اور فنی خامیوں کے باوجود انہیں جس ذوق سے پڑھا گیا اس کا سب سے بڑا راز یہ ہے کہ شرر مزاجاً قصہ گو ہیں ۔ وہ جانتے ہیں کہ کہانی کس طرح کہی جائے تو وہ سننے اور پڑھنے والوں کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے ۔ کہانی کیسے شروع ہو ، کس طرح آگے بڑھے ، کس طرح اس میں مختلف مرحلوں پر الجھاؤ پیدا ہوں اور کس طرح وہ یوں انجام پذیر ہو کہ پڑھنے والے کا دل خوش کرنے کی جو ذمہ داری قصہ گو پر عائد ہوتی ہے وہ بوجہ احسن پوری ہو ۔ کہانی کی صحیح تعمیر و ترتیب اس کے اجزاء کا باہمی ربط اور تناسب اور ان چیزوں کے ذریعے کہانی کی دلچسپی برقرار رکھنا بہترین صناعی ہے (آل احمد سرور : تنقیدی اشارے) ۔ جب کوئی یہ کہتا ہے کہ شرر ''پہلے ناول نگار ہیں ۔ جس نے سلیقے کے ساتھ ناول نگاری کی''(۲) تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ کہانی کے مختلف اصناف میں ناول کا جو ایک واضح فنی تصور ہے اس کا احساس سب سے پہلے شرر نے کیا ۔ نذیر احمد اور سرشار اپنی اپنی عظمت کے باوجود اردو دان طبقے پر یہ واضح نہیں کر سکے تھے کہ ناول کیا ہے اور اس سے کیا کام لیا جا سکتا ہے ۔ شرر نے ہمیں اس کی صحیح ہیئت سے آشنا کیا اور ان کے بعد ''ناول کے فارم نے اپنی جگہ بنائی''(۳) ۔ اور آنے والے ناول نگار کے لیے وہ راہ متعین کی جس پر چلے بغیر ناول لکھنا ممکن نہیں ۔ انہیں اسباب کی بنا پر سر عبدالقادر نے شرر کو صحیح معنوں میں اردو کا پہلا ناول نگار کہا ہے(۴) ۔

---

(۱) شرر ، زمانہ ، جنوری ۱۹۱۰ء ، بعض دوسرے نقادوں نے اپنی اپنی پسند کے مطابق مندرجہ ذیل ناولوں کو بھی ان کے اچھے تاریخی ناول کہا ہے :۔ الفانسو ، قیس و لبنیٰ ، مقدس نازنین ، لعبت چین ، جویائے حق ، امنہ الکبریٰ ، منصور موہنا اور ایام عرب ۔

(۲) احسن فاروقی ، اردو ناول کی تنقیدی تاریخ ۔ ص ۱۶۰ ۔

(۳) ایضاً ص ۱۶۱ ۔

(۴) ایضاً Abdul Qadir, Sir : New School of Urdu Literature "To Sharar, I believe belongs the credit of being the first novelist in Urdu, in the true sense of the term." p. 73.

معاشرتی ناول

شرر کی شہرت تاریخی ناول نگار کی حیثیت سے ہے ، لیکن ان کی ناول نگاری کا آغاز ایک معاشرتی اصلاحی ناول (’دلچسپ‘ حصہ اول و دوم ۱۸۸۲ء ، ۱۸۸۳ء) سے ہوا ۔ یہ کتاب کئی حیثیتوں سے شرر کے اصلاحی رجحانات اور فنّی میلانات کا عکس اور لبِ لباب ہے ۔ انیسویں صدی کے نصفِ آخر میں مسلمانوں کی زوال پذیر معاشرتی زندگی اور اس زندگی میں ذہنی اور جذباتی کیفیت کی ہلکی ہلکی جھلکیاں ایک دلچسپ اور خوش انجام کہانی کی ترتیب میں مدد دیتی ہیں ۔ غدر کے بعد کا عام معاشرہ ، لکھنؤ کی شہری زندگی کے پس منظر اور چلتے پھرتے کرداروں کی گفتار و رفتار کی صورت میں یوں ہمارے سامنے آتا ہے ، جیسے پردۂ سیمیں پر تیزی سے گزرتے ہوئے کسی فلم کے منظر ۔ ہندوستان کے دولت مند طبقے کی عیش پسندی اور اس کے جملہ لوازم ، مغرب اور مشرق کی تہذیبی قدروں کا تصادم ، انگریزی تعلیم کی آمد آمد اور اس کے اچھے اور برے پہلو ، شادی بیاہ کے مختلف مرحلوں پر غیر اسلامی شعار کا رواج ، بے معنی رسمیں اور اوہام پرستی ، اس دلچسپ ناول کے موضوعات ہیں ، جنھیں صاف شستہ اور رواں زبان میں بیان کر دیا گیا ہے ، البتہ کرداروں کے تعارف اور واقعات کے سان میں ایسے واقعات جن میں سے بعض قطعاً ناقابلِ یقین ہیں ۔ جزئیات نام کو نہیں ۔ کہانی کا عام میلان اصلاحی ہے جو عموماً ایسے مکالموں کی صورت اختیار کرتا ہے جن میں تصنّع ہے ، نذیر احمد کا سا مؤثر منطق اور استدلال ذرا بھی نہیں ۔ مکالمے فکر کی گہرائی اور جذبے کے خلوص سے یکسر خالی ہیں ۔ ان سب چیزوں میں سے لکھنوی زندگی کے تہذیبی نقوش البتہ برابر ابھرتے رہتے ہیں ۔ واقعیت اور رومانیت کا امتزاج ، منظر کشی کا شاعرانہ اسلوب اور کہانی کا عام کہانیوں کی طرح ایسے انداز میں ختم ہونا جس سے عام قاری خوش ہوتا ہے ، شرر کے پہلے معاشرتی ناول کی خصوصیات ہیں ۔

شرر نے ’دلچسپ‘ سے لے کر اپنے آخری معاشرتی ناول ’طاہرہ‘ (۱۹۲۳ء) تک جو اصلاحی معاشرتی ناول لکھے ، ان کے متعلق اظہارِ خیال کرتے ہوئے ہمارے نقادوں نے عموماً یہی کہا ہے کہ یہ ناول مقصد کے اظہار اور فن کے اہتمام کے نقطۂ نظر سے ان کے تاریخی ناولوں کے مقابلے میں کمتر درجے کے ہیں اور بہ حیثیت مجموعی ناقابلِ اعتنا ہیں ۔ خود شرر نے بھی دو ایک جگہ یہی بات کہی ہے :

”ہم نے بھی دو ایک ناول موجودہ سوسائٹی دکھانے کی کوشش میں لکھ کے شائع کیے تھے ، مگر پبلک کو ان میں ہرگز اتنا مزہ نہیں آیا جتنا کہ ’ملک العزیز ورجنا‘ ، ’فتح اندلس‘ ، ’ایام عرب‘ اور ’فردوس بریں‘ وغیرہ وغیرہ

میں آیا اور اسی خیال سے ہم ہمیشہ ناول کے لیے اگلے عہد کا کوئی واقعہ ڈھونڈ لیا کرتے ہیں''(۱)۔

معاشرتی ناولوں کے سلسلے میں قارئین کے اس رجحان کا ایک نفسیاتی سبب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہمارے ہم وطنوں اور ہم قوموں کو اپنی قومی زندگی کے اسی حصے کے واقعات میں مزہ آ سکتا ہے جو کامیابی اور عروج کا زمانہ تھا''(۲)۔

شرر نے یہ دونوں باتیں کہنے کے باوجود دس گیارہ ایسے معاشرتی ناول لکھے جن کا سیاسی ، تہذیبی اور معاشرتی پس منظر ان کے اپنے عہد کا ہے ۔ ان ناولوں میں (خصوصاً 'دلچسپ'، 'دلکش'، 'غیب دان دولہن' - (۱۹۱۱ء) ، 'خوفناک محبت' (۱۹۱۳ء - ۱۹۱۵ء) اور 'طاہرہ' (۱۹۲۳ء) ایسے طریقے ضرور استعمال ہوتے ہیں جن میں سے بعض میں اصلیت اور امکان کے پہلو بھی ندارد ہیں ، اگرچہ کہانی کی دلچسپی ضرور ہے ، کسی میں کم اور کسی میں زیادہ ۔ ان ناولوں میں بھی شرر کے مخصوص فنی تصورات اور مزاج کی وجہ سے فن کی طرح طرح کی خرابیاں اور خامیاں ہیں ۔ شرر کی طبیعت کا جوشیلا پن ، تھوڑے سے وقت میں بہت سی خدمت انجام دینے کا جذبہ ، ایک ساتھ کئی قومی اور ادبی مشاغل کی طرف توجہ ، مشرق اور مغرب کی ادبی روایات کے امتزاج سے اپنے ادب اور انشا میں ایک نئے اسلوب کو رائج کرنے کا شوق اور ولولہ ، انہیں نچلا نہیں بیٹھنے دیتا ۔ ضبط ، تحمل اور استقامت جو اچھے تخلیقی فن کار کے مزاج کے لوازم ہیں شرر کی طبیعت میں موجود نہیں اور جس فنی توجہ اور انہماک کے بغیر فنی تخلیق کے مختلف اجزاء کی ترتیب اور ان اجزاء کی ایک واحد تنظیم ممکن نہیں اس سے شرر کے ناول یکسر محروم ہیں ۔ انہوں نے اٹھتے بیٹھتے اور چلتے پھرتے زندگی پر جو اچٹتی ہوئی نظر ڈالی ہے اس کی مدد سے مہیا کیا ہوا تجربہ اور تاثر ان کی کل کائنات ہے ۔ تجربے اور اس کائنات میں فکر کی گہرائی اور جذبے کی تپش بھی نہیں ۔ اس کے باوجود شرر کے معاشرتی اور اصلاحی ناولوں کی مجموعی اہمیت مسلّم ہے ، اس لیے کہ ان سب کے مطالعے سے جو پوری تصویر نظر کے سامنے آتی ہے وہ برّصغیر کے مسلمانوں کی سیاسی ، تہذیبی ، معاشرتی زندگی کی جھلکیوں کے ملے جلے رنگوں سے بنی ہے ۔ ان ناولوں سے ان کے ذہنی میلانات کا وہ عکس بھی ابھرتا ہے جس کی اساس وہ دینی ، اخلاق اور تہذیبی قدریں ہیں جو مسلمانوں کے لیے مخصوص ہیں ۔ دولت مند طبقے کی بے راہ روی ، معاشرتی رسم و رواج کی غیر اسلامی روش ، ''پردہ'' ، عورتوں کی تعلیم اور سب چیزوں کے سنگین حدود ان ناولوں

---

(۱) شرر ، مضامین ، جلد چہارم (''ہمارا جدید ناول'') ص ۲۵۸ -
(۲) شرر ، مضامین ، جلد چہارم (ہمارا جدید ناول) ص ۲۵۸ -

مشترک موضوعات ہیں - زمینداری ، کشمیری مسلمانوں کی بے بسی ، زمینداری کا زوال ، سرسید اور شاہ ولی اللہ کی تحریکیں ، اشتراکیت کی طرف ہلکے ہلکے اشارے بھی ان بہت سے اشاروں میں سے چند ہیں - ان معاشرتی ناولوں میں شرر نے جا بجا اپنے کرداروں کے مختصر تعارف ، ان کرداروں کے برمحل مکالموں اور لکھنؤ کے معاشرتی اور گھریلو زندگی کے ذکر میں حقیقت نگاری کا جو انداز دکھایا ہے وہ صحیح مشاہدے اور ایسے بیان کے بغیر ممکن نہیں جس میں ایک ایک لفظ کی اپنی قیمت اور اہمیت ہے -

صحافت اردو نثر کی تاریخ میں شرر کو جو حیثیت دی گئی ہے وہ بلا شبہ ان کی اس ناول نگاری کی وجہ سے ہے جس کی بنا پر انہیں صحیح معنوں میں اردو کا پہلا ناول نگار کہا گیا ہے[1]- لیکن ایک نقاد نے ناول نگاری کو شرر کی شہرت کا باعث قرار دیتے ہوئے بجا طور پر ان کی دوسری حیثیتوں کو بھی تسلیم کیا ہے[2]- اس رائے کے مطابق شرر مضمون نگار ، صحافی ، تاریخ دان اور معاشّم ہیں اور ان چاروں میدانوں میں اپنے عہد کے سیاسی ، تہذیبی اور معاشرتی احساس کی ترجمانی کرتے ہوئے انہوں نے اردو میں ایسے طرزِ تحریر اور اسلوبِ نگارش کی بنیاد ڈالی ، جو قاری کے لیے دلچسپ اور دل آویز اور جدید ذوق کے میلان کا صحیح مظہر ہے[3] - بحیثیت صحافی[4] شرر کا تعلق یوں تو کئی اخباروں اور رسالوں سے رہا ، لیکن شرر کی توجہ کا مرکز اور ان کی مختلف حیثیتوں کی پرورش کا گہوارہ 'دلگداز' ہے ، جسے ''ادب و تاریخ میں اپنے رنگ کا[5] موجد'' بتایا گیا ہے اور اسے اور 'تہذیب الاخلاق' کو ایک سطح پر رکھ کر یہ رائے ظاہر کی گئی ہے کہ ''ان دو رسالوں نے مقالہ نگاری کے ارتقاء میں سب سے زیادہ مدد دی - ادب ، انشاء اور فکر و تخیل کو کہیں کا کہیں پہنچا دیا'' [6]- دلگداز کے ادارے اس لحاظ سے بہت

(۱) عبدالقادر ، سر ، حوالۂ سابقہ

(۲) فیض احمد فیض ، میزان - ص ۲۲۴ - ''شرر کا محض ناولسٹ کی حیثیت سے مشہور ہونا قدرت یا پڑھنے والوں کی ستم ظریفی ہے - وہ ناولسٹ ہونے کے علاوہ مضمون نگار ، جرنلسٹ ، تاریخ دان اور ریفارمر بھی تھے''-

(۳) Abdul Qadir : New School of Urdu Literature, Page 71. "Popularity of Dilgudas was due to the fact that the editor had grasped firmly the inclination of the modern taste as to style as well as subject matter—interesting and readable essays on historical, social and moral subjects".

(۴) محشر ، اودھ اخبار ، دلگداز ، مہذب ، پردۂ عصمت ، اتحاد ، العرفان ، دل افروز ، ظریف اور مورخ -

(۵) حامد حسن قادری ، داستان تاریخ اردو - ص ۳۴۹ -

(۶) حامد حسن قادری ، داستان تاریخ اردو - ص ۳۴۹ -

اہمیت رکھتے ہیں کہ ان میں قومی سیاسی مسائل پر اظہارِ خیال کیا جاتا تھا ۔ اسی بنا پر انہیں ''شرر کے شعوری دور کی ڈائری یا سالنامچہ'' کہا گیا ہے[۱] ۔ دلگداز کے بعد قومی نقطۂ نظر سے شرر کا ہفت روزہ 'مہذب' (پہلا شمارہ یکم اگست ۱۸۹۰ء) بہت اہم ہے ۔ اس کے ایک شمارے میں تو واضح طور پر ایسی باتیں کہی گئی ہیں جنہیں دو قومی نظریے کی بنیاد کہا جا سکتا ہے''[۲] ۔

اسلوبِ بیان

شرر اس عہد کے شمار ہیں ، جسے اردو نثر کا عہدِ زرین کہا جاتا ہے اور اس زرین عہد میں سرسید ، نذیر احمد ، آزاد ، شبلی اور حالی وہ نثر نگار ہیں جن میں سے ہر ایک تحریر کے ایک مخصوص اور منفرد طرزِ اسلوب کا بانی ہے ۔ نثر کے عظیم عہد میں شرر کا ایک صاحبِ طرز کی حیثیت سے ایک نمایاں مقام پیدا کرنا ان کی ذہانت اور قدرتِ بیان کی دلیل ہے ۔ شرر نے قومی زندگی کے تقاضوں کے تحت جو کچھ بھی لکھا اسے قاری کے لیے زیادہ سے زیادہ دلچسپ بنانے کی کوشش کی اور مشرقی انشاء کی رنگین مزاجی اور مغربی طرز کی سادگی کے امتزاج سے ایسا اسلوبِ تحریر اختیار کیا جو تاریخ ، ناول ، فلسفیانہ اور اخلاقی مضامین سب کے لیے موزوں تھا ۔ عبدالقادر نے ان کی نثر کو دلچسپ کہا ہے ۔ احسن فاروقی ان کی قوتِ بیان اور زورِ قلم کو ان کی انشاء پردازی کی خصوصیات قرار دیتے ہیں ۔ چکبست شرر کی عبارت کو سلیس و پاکیزہ مگر جدّت سے خالی قرار دیتے ہوئے اسے ''نانِ بے نمک و شیرِ بے شکر'' کہتے ہیں ۔[۳] علی عباس حسینی کے نزدیک ان کے یہاں الفاظ کے انتخاب میں احتیاط کی کمی ہے[۴] ۔ بعض نقاد شرر کی عبارت میں بہت سی غلط ترکیبوں کی طرف اشارہ کرتے اور ان کی تشبیہوں کو ناموزوں اور بے محل ٹھہراتے ہیں ۔[۵] ان مختلف رایوں سے جو مجموعی نتیجہ نکلتا

---

(۱) دلگداز کے اداریے ، ماہ نو ، جولائی ۱۹۶۶ ۔

(۲) مہذب شمارہ ۲۳ اگست ، ''ہمارے خیال میں اگر ایسا ہی وقت آ گیا ہے کہ کسی کی مذہبی رسوم بغیر دوسرے کی توہین و دل شکنی کے نہیں پوری ہوتیں اور نہ اتنا صبر و تحمل ہے کہ دوسرا فریق ان باتوں کو طرح دے تو ہندوستان کے اضلاع کو ہندو مسلمان باہم تقسیم کر لیں اور اپنی اپنی آبادی علیحدہ کر لیں'' (صحافت پاکستان و ہند میں ص ۲۷۱) ۔

(۳) چکبست لکھنوی ، مضمون پنڈت رتن ناتھ سرشار ، زمانہ ، مئی ۱۹۰۳ء ۔

(۴) علی عباس حسینی ، ناول کی تاریخ و تنقید ۔ ص ۲۷۷ ۔

(۵) عبد الحمید سید ، مضمون سرشار و شرر ۔ زمانہ ۔ فروری ۱۹۰۶ء ۔

یہ ہے کہ شرر نے 'دلگداز' کے ذریعے ، جس میں ان کے تاریخی ، فلسفیانہ اور اخلاق مضامین کے علاوہ ان کے ناول بھی چھپے ، ایک ایسے طرزِ تحریر کو رواج دیا جو مغرب و مشرق کی سادگی اور رنگینی کا امتزاج بھی ہے اور عام قاری کے لیے باعثِ کشش بھی ۔ لیکن شرر کی زود نویسی نے اس میں جا بجا ایسی خرابیاں پیدا کر دی ہیں جنھیں احتیاط کی کمی کا نتیجہ کہا گیا ہے ۔ خود سرور نے اپنے معاصرین کے اعتراضات کے جواب میں جو کچھ کہا ہے وہ یہ ہے کہ "ہم سے جیسی عبارت بن پڑتی ہے لکھ لیتے ہیں ۔ اس میں بھی کسی بات کا دعویٰ نہیں"[1] ۔ لیکن اس کے باوجود 'دلگداز' کی انشاء پردازی کو ایک خاص طرح کی انشا پردازی کہنے پر اصرار کرتے ہیں[2] اور ہماری رائے میں انشاء پرداری کے اس طرز کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ سلیس ، رواں ، شگفتہ اور دل نشین ہے اور نثر لکھنے والوں کو ایک ایسا راستہ دکھاتی ہے جس پر چلنا نسبتاً آسان بھی ہے اور نتیجہ خیز بھی ۔ اس لیے کہ اس انداز میں جو بات کہی جائے ، اس کی نوعیت خواہ کچھ بھی ہو ، وہ دلچسپ اور مؤثر ہوتی ہے ۔ اس طرح شرر نے جس طرح ناول نگار کو ناول کے فن کا ایک سانچا دیا اسی طرح انھیں یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ انھوں نے نثر میں تحریر کے ایسے طرز کو رواج دیا جو ادب اور صحافت دونوں کے لیے موزوں ہے ۔

☆ ☆ ☆

کتابیات

۱ ۔ احسن فاروقی ، ڈاکٹر ، محمد : اردو ناول کی تنقیدی تاریخ ، اردو اکیڈیمی ، لاہور ۔

۲ ۔ چکبست لکھنوی ، پنڈت رتن ناتھ سرشار ، زمانہ ، مئی ۱۹۰۳ء ۔

۳ ۔ حامد حسن قادری ، داستان تاریخِ اردو ، اکیڈیمی سندھ ، کراچی ۔

۴ ۔ سراج الدین احمد ، قاضی ، مقدمۂ داستان پاستان ۔

۵ ۔ سرور ، آلِ احمد ، تنقیدی اشارے (دوسرا ایڈیشن) لکھنؤ ۱۹۴۹ء ۔

---

(۱) دلگداز ۔ ستمبر ۱۸۸۹ء ۔

(۲) "اس میں شک نہیں کہ زمانہ بہت آگے بڑھ آیا اور اردو انشاء پردازی نے بہت کچھ عروج حاصل کر لیا مگر الحمد للہ جو چیز دلگداز کے لیے خاص تھی وہ اب بھی اسی کے دم سے وابستہ ہے" ۔ مضامین شرر جلد اول ۔ ص ۵۷ ۔

۶ - سہیل بخاری ، ڈاکٹر ، ناول نگاری ، میری لائبریری ایڈیشن ، لاہور ۱۹۶۶ء

۷ - شرر ، عبدالحلیم ، سر سید احمد خاں کی دینی برکتیں ، دکن ریویو ، مئی ۱۹۰۸ء -

۸ - شرر ، عبدالحلم ، ضمیمہ زمانہ ، ۱۹۱۱ء -

۹ - شرر ، عبدالحلیم ، مضامین شرر ، جلد اول ، سید مبارک علی شاہ گیلانی ، مزنگ لاہور -

۱۰ - شرر ، عبدالحلیم ، مضامین شرر ، جلد چہارم ، گیلانی بک ڈپو ، لاہور -

۱۱ - شرر ، عبدالحلیم ، مضامین شرر ، جلد ہفتم ، گیلانی بک ڈپو ، لاہور -

۱۲ - شرر ، عبدالحلیم ، من آنم کہ من دانم ، دلگداز ، جنوری ۱۹۳۳ء -

۱۳ - شرر ، عبدالحلیم ، من آنم کہ من دانم دلگداز ، فروری ۱۹۳۳ء -

۱۴ - شرر ، عبدالحلیم ، من آنم کہ من دانم ، دلگداز ، مارچ ۱۹۳۳ء -

۱۵ - شرر ، عبدالحلیم ، من آنم کہ من دانم ، دلگداز ، اپریل ۱۹۳۳ء -

۱۶ - شرر ، عبدالحلم ، من آنم کہ من دانم ، دلگداز ، جون ۱۹۳۳ء -

۱۷ - شرر ، عبدالحلیم ، من آنم کہ من دانم ، دلگداز ، جولائی ۱۹۳۳ء -

۱۸ - شرر ، عبدالحلیم ، گذشتہ لکھنؤ ، ورلڈ اردو سنٹر ، کراچی ۱۹۵۶ء -

۱۹ - عبدالحمید ، سید ، سرشار و شرر ، زمانہ ، فروری ۱۹۰۶ء -

۲۰ - عبد السلام خورشید ، صحافت پاکستان و ہند میں ، مجلس ترقی ادب ، لاہور جون ۱۹۶۳ء -

۲۱ - عسکری ، مرزا محمد ، تاریخِ ادبِ اردو (حصہ نثر) نولکشور پرس ، لکھنؤ ، تیسری بار -

۲۲ - علی عباس حسینی ، ناول کی تاریخ و تنقید ، انڈین بک ڈپو ، لکھنؤ ، بار اول -

۲۳ - فراق گورکھپوری ، بحوالہ ناول کی تاریخ و تنقید ، ص ۲۷۲ -

۲۴ - فیاض محمود گیلانی ، عبدالحلیم شرر ، کاروان ۱۹۳۳ء (ایک بے لاگ تنقید) -

۲۵ - فیض ، فیض احمد ، میزان ، لاہور ، فروری ۱۹۶۲ء -

۲۶ - مرزا محمد سعید دہلوی ، شرر اور سرشار ، مخزن ، دسمبر ۱۹۰۶ء -

۲۷ - نربھے رام حوہر ، دلگداز کے ادارے ، ماہ نو ، جولائی ۱۹۶۶ء -

۲۷ - نواب رائے ، سرشار و شرر ، اردوئے معلیٰ ، مارچ ، اپریل ۱۹۰۶ء -

۲۹ - دلگداز متفرق رسالے ، ستمبر ۱۸۸۹ء -

۳ - زمانہ ، جنوری ۱۹۲۷ء -

۳ - نقوش ، شمارہ ۱۰۹ (خطوط نمبر) اپریل ۱۸۶۸ء -

انگریزی کتب

1. Abdul Qadir, Sir : New School of Urdu Litera ture, Third Edition, Lahore 1932.
2. Saksena, Ram Babu : A History of Urdu Literature, 2nd Edition, Allahabad 1940.

(ب) رتن ناتھ سرشار

پنڈت رتن ناتھ سرشار ۱۸۴۶-۴۵ء کے لگ بھگ لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور انھوں نے ۲۷ جنوری ۱۹۰۲ء کو بمقام حیدر آباد دکن وفات پائی۔ کشمیری پنڈت تھے۔ والد بچپن ہی میں وفات پا گئے پرورش والدہ نے کی۔ تعلیم حاصل کرنے کے لیے کیننگ کالج میں داخلہ لیا مگر کوئی ڈگری حاصل کیے بغیر ہی کالج چھوڑ دیا۔ اس کے بعد ضلع کھیری میں لیکھم پور کے اسکول میں معلمی کے فرائض سر انجام دیتے رہے۔ اول اول 'مراسلۂ کشمیر' اور 'اودھ پنچ' میں مضامین لکھے۔ بعد ازاں "اودھ اخبار"، 'مرآۃ الہند'، 'ریاض الاخبار' اور 'دبدبۂ آصفی' میں بھی لکھتے رہے۔ ۱۸۷۸ء میں منشی نولکشور نے لکھنؤ سے 'اودھ اخبار' نکالا تو انہیں اخبار کا ایڈیٹر مقرر کیا۔ 'فسانۂ آزاد' اسی اخبار میں بالاقساط شائع ہوتا رہا۔ ۱۸۹۲ء یا ۱۸۹۳ء میں 'اودھ اخبار' سے الگ ہو گئے۔ اس کے بعد مہاراجہ کرشن پرشاد کے بلاوے پر حیدر آباد دکن چلے گئے اور 'دبدبۂ آصفی' کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ ۱۸۹۵ء سے اپنی وفات تک حیدر آباد ہی میں مقیم رہے۔

طبیعت بچپن ہی سے شوخ اور طرّار تھی۔ مشاہدہ تیز تھا اور تاثرات قبول کرنے کی صلاحیت بے پناہ تھی۔ لڑکپن کے ایام میں اپنے محلے کے بعض مسلمان گھرانوں میں ان کی آمد و رفت رہی اور انھیں بیگمات کے رہن سہن اور بول چال سے بڑی آگاہی حاصل ہوئی۔ بعد ازاں انھوں نے اپنی تصانیف میں ان معلومات سے بڑا فائدہ اٹھایا۔ ان کی ذات کے اندر کوئی ایسی بے قراری تھی جس نے اپنے اظہار کے لیے انہیں متعدد راستے اختیار کرنے کی ترغیب دی۔ مثلاً عام زندگی میں انھوں نے کسی ضابطے کو پسند نہ کیا۔ شراب نوشی کی عادت ڈالی۔ آوارہ خرامی کا ملکہ اختیار کیا۔ طبیعت کی تیزی کے جوہر دکھائے اور اوسط درجے کی گھریلو زندگی کو بہت کم برداشت کیا۔ 'فسانۂ آزاد' جو کہ ان کا شاہکار ہے، قسطوں میں شائع ہوا کرتا تھا لیکن سرشار نے اس سلسلے میں بھی کبھی کسی ضابطے یا پروگرام کے مطابق کام نہ کیا۔ کاتب مضمون کا مطالبہ کر رہا ہوتا اور وہ کاغذ پر 'فسانۂ آزاد' کا کوئی حصہ گھسیٹ رہے ہوتے۔ 'فسانۂ آزاد' میں جو نشیب و فراز نظر آتے ہی وہ سرشار کے کردار کی اس بے ضابطگی اور جزو مد ہی کے عکاس ہیں۔ حتیٰ کہ ان کے مشہور کرداروں 'خوجی اور آزاد' میں بھی ان کی شخصیت ہی کا پرتو ملتا ہے۔ سرشار نے جسمانی سطح کے علاوہ تخیئلی سطح پر بھی اپنے باطن کی بے قراری کا مداوا تلاش کرنے کی کوشش کی۔ وہ ایک خواب کار تھے، چنانچہ اپنے ہم زاد آزاد کی معیّت میں سیر بینی کے عمل میں مبتلا اور مہمات سر کرتے

رہے ۔ مگر ساتھ ہی انھوں نے باطن کی بے قراری کو ہنسنے ہنسانے کی کاوشوں سے بھی کم کرنے کی کوشش کی ۔ وہ نہ صرف اپنی عام زندگی میں حاضر جواب اور بذلہ سنج تھے بلکہ خوجی کے ذریعے انھوں نے اپنی تحریر میں بھی طبیعت کے اس رنگ کو نمایاں کیا ۔ بحیثیتِ مجموعی شراب نوشی ، سہم جوئی اور ظرافت ، ان تینوں حربوں کی مدد سے سرشار نے اپنے اندر کے ''حزن'' کو سلانے کی بھرپور کوشش کی ، مگر یہ جن آہستہ آہستہ ایک ''تپِ دروں'' کی صورت انہیں چاٹتا رہا اور وہ ۵۶ برس کی عمر ہی میں اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے ۔

تصانیف

رتن ناتھ سرشار کی تصانیف (طبعزاد اور ترجمہ) مندرجہ ذیل ہیں :

'شمس الضحیٰ'، 'فسانۂ آزاد'، 'اعمال نامۂ روس'، 'جامِ سرشار'، 'سیرِ کہسار'، 'کامنی'، 'کڑم دہم' ، 'بچھڑی ہوئی دلہن' ، 'پی کہاں' ، 'ہیشو' ، 'طوفانِ بے تمیزی'، 'گورِ غریباں'، 'الف لیلیٰ' ، 'خدائی فوجدار' اور 'مکاتیب ڈفرینہ' ۔ ان کے علاوہ ایک کتاب 'رنگے سیار' بھی چھپی جو کوئی الگ تصنیف نہیں بلکہ 'فسانۂ آزاد' سے ماخوذ ہے ۔ دوسری کتاب ، 'چنچل نار' ہے جس کی ملکیت کے بارے میں خاصی تیز و تند بحث ہو چکی ہے ۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ یہ مہاراجہ کرشن پرشاد کی تصنیف ہے ۔ دوسروں کا موقف یہ ہے کہ اسے رتن ناتھ سرشار نے لکھا ۔

شمس الضحیٰ

یہ کتاب جغرافیۂ طبعی کے بارے میں ہے سرشار نے اسے انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا اور اس میں اپنی طرف سے اشعار بھی شامل کیے ۔

فسانۂ آزاد

سرشار کی طبعزاد تصنیف ہے اور مصنّف کی شہرت کا اصل باعث بھی یہی کتاب ہے ۔ اس کتاب میں سرشار نے آزاد اور خوجی کے ناقابلِ فراموش کردار پیش کیے اور لکھنوی تہذیب کی بھر پور عکاسی کی ۔

اعمال نامۂ روس

یہ کتاب ایک انگریز سیاح ڈاکٹر واپس میکنزی کی کتاب 'روس' کا ترجمہ ہے ۔

جامِ سرشار

یہ ناول 'فسانۂ آزاد' کے ساتھ چھ ماہ تک بالاقساط 'اودھ اخبار' میں چھپتا رہا مگر 'فسانۂ آزاد' کے برعکس یہ ایک سنجیدہ تصنیف ہے ۔ سرشار نے اس کے مرکزی کردار ''نواب'' کو بڑی چابکدستی سے پیش کیا ہے ۔

سیرِ کہسار

یہ ناول دو جلدوں میں ہے ۔ زبان و بیان کے اعتبار سے 'فسانۂ آزاد' کے مقابلے میں کم زور ہے ، لیکن اس کا پلاٹ خاصا مربوط ہے اور کردار نگاری پر بھی توجہ صرف ہوئی ہے ۔

کامنی

یہ ایک ہندو خاندان کی داستان ہے جس میں سرشار نے ہندوستان کی پرانی رسوم کے برے پہلوؤں کو منکشفِ بام کیا ہے ۔ مگر ناول اس اعتبار سے کم زور ہے کہ اس میں سرشار نے ہندوؤں کی مخصوص زبان کے بجائے متوسط طبقے کے مسلمان گھرانے کی زبان استعمال کی ہے ۔ 'کڑم دہم' ، 'بچھڑی ہوئی دلہن'، 'پی کہاں' ، 'سیشو' اور 'طوفانِ بے تمیزی' یہ سب تصانیف 'خم کدۂ سرشار' کے سلسلے کی متعدد کڑیاں ہیں ۔ انہیں زیادہ سے زیادہ ناولٹ کا نام دیا جا سکتا ہے ۔ البتہ 'کڑم دہم' ایک افسانہ ہے ۔ ان تصانیف میں سرشار نے معاشرے کے مختلف گوشوں کی عکاسی کی ہے اور بعض میں قبیح رسوم کے خلاف آواز بھی اٹھائی ہے ۔

الف لیلیٰ

فارسی قصہ الف لیلیٰ کا ترجمہ ہے ۔ یہ کتاب ۱۹۰۱ء میں شائع ہوئی ، ترجمہ زیادہ کامیاب نہیں ہے ۔

خدائی فوجدار

سروانٹس کی مشہور تصنیف 'ڈان کواکزوٹ' (کہوٹے) کا ترجمہ ہے سرشار نے اس میں اپنی طرف سے اشعار کا اضافہ بھی کیا ہے ۔ ترجمہ اچھا ہے ۔

مکاتیبِ ذفرینہ

یہ کتاب بھی ترجمہ ہے۔

رتن ناتھ سرشار کی تصانیف کا سب سے بڑا وصف لکھنؤ کی تہذیب کی عکاسی ہے۔ ان کے اپنے زمانے میں لکھنؤ کی تہذیب میں گنگا اور جمنا کے ملاپ کی سی کیفیت پیدا ہو رہی تھی۔ یعنی ایک طرف 'قدیم' اپنے جملہ عناصر اور جہات کے ساتھ زندہ تھا اور دوسری طرف نیا زمانہ اس پر اپنے اثرات مرتسم کرنے لگا تھا۔ مگر نئے زمانے کے اثرات ابھی زیادہ تر زیرِ سطح تھے۔ چنانچہ ظاہر کی دنیا میں کم اور باطن کی دنیا میں نئے زمانے کے شواہد زیادہ شدت کے ساتھ نمودار ہو رہے تھے۔ 'فسانۂ آزاد' میں سرشار نے لکھنؤ کی تہذیب کی اس گنگا جمنی کیفیت کو آزاد اور خوجی کے کرداروں سے واضح کیا۔ ان میں سے خوجی قدیم کا نمائندہ ہے اور قدیم کی جملہ روایات گویا اس میں مجتمع ہو گئی ہیں اور اس کا مطمحِ نظر اس کے زمانے کے ایک عام شہری کے مطمحِ نظر کی ہو بہو تصویر ہے۔ خوجی در حقیقت لکھنوی بانکے کی پیروڈی ہے۔ یہ بانکا اپنی داخلی قوت سے تو محروم ہو چکا تھا، لیکن ظاہری طور پر اس نے وہی رکھ رکھاؤ، خود داری اور طبیعت کی تیزی برقرار رکھی تھی جو کسی زمانے میں ایک ہندوستانی سورما کا طرۂ امتیاز تھی۔ سروانٹس نے اپنی کتاب 'ڈان کواکزوٹ' میں بھی اپنے زمانے کے بانکے یعنی (Knight) کی حالتِ زار ہی کا نقشہ کھینچا تھا۔ یعنی اس بات کا اظہار کیا تھا کہ ہر چند یہ نائٹ زرہ بکتر میں ملبوس اور مہم جوئی کا دلدادہ ہے، لیکن یہ باطن کی سختی اور کردار کی رفعت سے محروم ہو چکا ہے اور اس لیے اب اس کی حیثیت اصل کی ایک مضحکہ خیز نقل کے سوا اور کچھ نہیں۔ کون نہیں جانتا کہ سرشار سروانٹس کی اس تصنیف سے متاثر تھے۔ انہوں نے نہ صرف اس کا اردو ترجمہ پیش کیا بلکہ 'فسانۂ آزاد' کے دونوں بڑے کرداروں کو سروانٹس کے بڑے کرداروں کی روشنی ہی میں خلق کیا۔ البتہ سرشار نے ایک بڑی تبدیلی یہ کی کہ اپنے کرداروں کا رول تبدیل کر دیا۔ چنانچہ ڈان کواکزاٹ کا ملازم 'فسانۂ آزاد' کے ہیرو آزاد میں سمٹ آیا جب کہ خود ڈان کواکزاٹ خوجی میں مبدّل ہو گیا۔ ثبوت اس کا یہ ہے کہ ڈان کواکزاٹ، نائٹ کی تحریف ہے اور خوجی بانکے کی۔ ڈان کواکزاٹ اور خوجی دونوں کی مہم جوئی مضحکہ خیز نوعیت کی ہے۔ دونوں بار بار حادثات کی زد میں آتے ہیں، نیز دونوں ایک گزرے ہوئے زمانے کی باقیات میں سے ہیں۔ دوسری طرف سانکو پانزا کی طرح آزاد بھی سنجیدہ ہے اور جس طرح سانکو پانزا اپنے آقا کے اعمال کو شک و شبہ کی نظروں سے دیکھتا ہے۔ بالکل اسی طرح آزاد بھی خوجی کی مہم جوئی اور لاف زنی کو اہمیت نہیں دیتا۔ مگر اس مقام پر یہ مماثلت ختم ہو جاتی ہے۔ سرشار نے آزاد کے کردار میں اپنی ذات کی بے قراری،

مہم جوئی اور سیر بینی کا جذبہ اور رومان پروری کے اوصاف بھی جمع کر دیے ہیں اور یوں اسے سانکو پانزا سے کہیں زیادہ فعال بنا دیا ہے ۔

خوجی قدیم کی پیداوار ہی نہیں اس کی تعریف بھی ہے ۔ یہ قدیم سرشار کے زمانے کے لکھنؤ میں اپنی ظاہری آب و تاب کے ساتھ زندہ تھا ۔ لباس ، رسوم ، گفتگو ، رہن سہن کے آداب اور ان سے بھی زیادہ ایک مخصوص زاویۂ نگاہ ۔ ان سب باتوں پر لکھنوی تہذیب کے اثرات ثبت ہیں ۔ یہ لکھنوی تہذیب اس لمحے سے قرار اختیار کرنے کی ایک کاوش تھی جس نے مغل سلطنت کے زوال اور اس سے پیدا ہونے والی طوائف الملوکی کی فضا سے جنم لیا تھا ۔ اس تہذیب کی داغ بیل اس وقت پڑی جب اودھ کے حکمرانوں نے 'حقیقت' کا سامنا نہ کر سکنے کے باعث اپنی آنکھیں میچ لیں اور "بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست" کے تحت خود کو ماضی اور مستقبل ، دونوں سے منقطع کرکے حال کے لمحے پر مرتکز کر لیا ۔ جب آئندہ کے خواب نظروں سے اوجھل ہوں اور ماضی کے عروج کی داستان بھی ذہن سے محو ہو جائے تو انسانی اعمال میں انجماد اور قویٰ میں اضمحلال کا نمودار ہونا ناگزیر ہے ۔ پھر جب تخیّل کم زور اور حسیّات بر انگیخت ہوں تو گوشت پوست کی زندگی نسبتاً زیادہ مرکزِ نگاہ بنتی ہے ۔ لکھنوی تہذیب در اصل مزاجاً ایک ارضی تہذیب تھی جس میں جسم کی تسکین کا معاملہ ایک فلسفۂ حیات کی صورت اختیار کر گیا تھا ۔ اس قسم کے ارضی معاشرے کا مذہب رسوم میں ، زبان اور محاورے میں ، عشقیہ شہوت پرستی میں اور جمالیاتی ذوق یا پست قسم کی لذت پرستی میں ڈھل جاتا ہے ۔ چنانچہ بہت سی قبیح رسوم جنم لیتی ہیں اور سارا معاشرہ ایک محدود سے خول میں سمٹ آتا ہے ۔ یہی کچھ لکھنؤ میں ہوا ۔ جب لکھنؤ والوں نے سیاسی اور سماجی انقلابات کی طرف سے آنکھیں میچ کر خود کو ایک چھوٹی سی جنت میں قید کر لیا ۔ سرشار کے زمانے میں اس 'جنت' کی آب و تاب ابھی باقی تھی ۔ بانکے ، پہلوان ، پتنگ باز ، افیونی ، چانڈو باز 'نواب اور رئیس' بٹیر باز ، مشاعرہ باز ، بیگمات اور ان کے ملازمین ، طوائفیں ، سافنیں ، ڈومنیاں اور بھٹیارنیں ۔۔۔ یہ سب اس تہذیب ہی کے نمائندے تھے اور محرم الحرام کے دوران ، ہولی اور بسنت کے مواقع پر ، مشاعروں اور بٹیر بازی کے معرکوں میں ، نیز میلوں ٹھیلوں ، بازارِ حسن اور بیٹھکوں میں لکھنوی تہذیب کے ماضی ہی کے عکاس تھے ۔ مگر ساتھ ہی نیا زمانہ نئے رجحانات سے لیس ہو کر اور نئے کرداروں کو اپنے جلو میں لئے لکھنوی تہذیب کے قلعے میں داخل ہو چکا تھا ۔ چنانچہ فوٹو گرافر ، گریجویٹ ، کانسٹیبل ، اسکول کے طلباء ، بیرسٹر ، ٹکٹ بابو ، آیائیں ، ماسٹرنیاں اور دوسرے کردار بھی جا بجا نظر آنے لگے تھے ۔ ہر چند ابھی یہ کردار لکھنوی تہذیب کے آٹے میں محض نمک کی حیثیت رکھتے تھے ، لیکن ان کی آمد سے وہ گنگا جمنی کیفیت

ضرور پیدا ہو گئی تھی جسے سرشار نے اپنا موضوع بنایا ۔ چنانچہ سرشار کا لکھنؤ پانی کا ایک ایسا مرتبان ہے جس میں کروڑوں جرثومے ایک عجیب سی کلبلاہٹ میں مبتلا دکھائی دیتے ہیں ۔ اسی مرتبان میں وہ نئی ہستی بھی پرورش پا رہی ہے جو آزاد کے روپ میں غلیظ پانی کی اس دنیا سے باہر نکلنے کی کوشش کرتی ہے ، مگر اس قدر پا بہ زنجیر ہے کہ جب باہر نکلتی ہے تو مرتبان کو بھی اپنے ساتھ اٹھا لے جاتی ہے ۔ دوسری طرف خوجی اس مرتبان کا پالتو کیڑا ہے اور اس میں سے باہر نکلنے کی اسے قطعاً کوئی آرزو نہیں ہے ۔ در اصل سرشار نے ان دونوں کرداروں کی مدد سے لکھنوی تہذیب کے اس دور کے دو اہم رجحانات کی بھرپور عکاسی کی ۔ خورشید الاسلام[1] کی رائے میں سرشار نے ان دونوں رجحانات پر طنز کرنے کے لیے دو طرح کے آئینے استعمال کیے ۔ ایک آئینے میں انہیں ہر شے مضحکہ خیز حد تک چھوٹی نظر آئی اور اس کے لیے انہوں نے خوجی سے علامت کا کام لیا ۔ دوسرے میں انہیں ہر شے مضحکہ خیز حد تک دیو قامت دکھائی دی اور یہاں انہوں نے آزاد کو علامت قرار دیا اور یوں ان دونوں کرداروں کا سہارا لے کر ماضی و مستقبل ، مشرق و مغرب اور پرانے اور نئے نظام کو بالعموم علیحدہ علیحدہ اور کبھی کبھی متصادم حالت میں پیش کرتے اور پڑھنے والوں کی تفریحِ طبع کا سامان بہم پہنچاتے رہے ۔

قدیم اور اس کی علامت خوجی کو طنز کا نشانہ بنانے کا اقدام تو سمجھ میں آتا ہے ، لیکن خورشید الاسلام کی یہ رائے محلِ نظر ہے کہ سرشار نے جدید اور اس کی علامت آزاد کو بھی طنز کا نشانہ بنایا ۔ چنانچہ دیکھنا چاہیے کہ سرشار نے آزاد کو دیو قامت اور خوجی کو کوتاہ قد بنا کر کیوں پیش کیا ۔ شعوری سطح پر تو شاید سرشار کے سامنے کوئی مقصد نہ ہو ، لیکن قطعاً غیر شعوری طور پر انہوں نے جدید سے اپنی ہم آہنگی اور قدیم سے اپنی نفرت کو اجاگر کرنے کے لیے ان دونوں کرداروں سے مدد لی ۔ جدید سے ان کی جذباتی وابستگی اس طور عیاں ہے کہ انہوں نے آزاد کی صفات میں مبالغہ آرائی سے کام لیا اور قدیم سے ان کی نفرت اس بات سے مترشح ہے کہ اس ضمن میں بھی انہوں نے غلو سے کام لیتے ہوئے خوجی کو عام انسانی سطح سے بہت پست مقام عطا کیا ۔ اس تفویض سے سرشار کے ہاں اصلاح پسندی کا رجحان بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ معاشرے کی اصلاح کے لیے نئے زمانے کے ساتھ چلنا اور پرانے زمانے سے منقطع ہونا چاہتے تھے ۔ ممکن ہے ان کے اس رویے پر سر سید احمد خان کی تحریک کے اثرات بھی ثبت ہوں ، لیکن ایک تعلیم یافتہ بالغ نظر اور حساس انسان کی حیثیت سے بھی ان کے اس خاص رویے کی وجوہ سمجھ میں آتی ہیں ۔ علاوہ ازیں اصلاح پسندی کے سلسلے میں یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ سرشار

---

(۱) ڈاکٹر خورشید الاسلام ، فسانۂ آزاد ، (اردو ادب ، جولائی ۱۹۵۱ء) ۔

کی اپنی زندگی شراب نوشی اور بے اعتدالی کی نذر رہی اور قاعدۂ عام یہ ہے جو شخص
کسی بری عادت میں مبتلا یا برے ماحول میں گرفتار رہا ہو وہ چاہتا ہے کہ آنے والی
نسلیں اس سے عبرت حاصل کریں اور اس اندھے کنویں میں نہ گریں جس میں وہ خود گر
گیا تھا ۔ سرشار کی بیشتر تصانیف میں شراب نوشی اور دیگر قبیح رسوم اور عادات کے
خلاف ان کی مہم اسی جذبے کی پیداوار ہے ۔ چنانچہ خوجی اور آزاد کے سلسلے میں بھی
اصلاح پسندی کا یہ جذبہ بار بار اپنی جھلک دکھاتا ہے ۔

ہر چند اپنی تحریروں میں سرشار نے خود کو محض ایک مبصّر کا مقام دیا
جو واقعات کا ناظر اور کرداروں کا عکاس تھا ، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان سارے
مناظر کی عکاسی اور کرداروں کی پیشکش میں سرشار کی اپنی شخصیت کے سیّال
عناصر ہی نے کچے مواد کا کام دیا ۔ یوں دیکھیں تو سرشار کی تصانیف ان
کے بے شمار خواب ہی دکھائی دیں گی ، جن میں وہ خود ہی ناظر اور خود ہی منظور
بھی تھے ۔ ویسے بھی ہر فنکار بنیادی طور پر ایک خواب کار ہوتا ہے ۔ لیکن
بالعموم اس کے خواب کی نوعیت ایک وژن (Vision) کی سی ہوتی ہے جس کی
تسخیر اس کے فن کا منتہا قرار پاتی ہے ۔ وژن کو تسخیر کرنے یا دوسرے لفظوں
میں اسے گرفت میں لینے کے لیے وہ بعض اوقات اپنے ہم زاد کو لازوال صفات سے
متصف کر کے ایک سپرمین (Superman) کی صورت میں بھی پیش کر دیتا ہے ۔
نطشے اور اقبال کے ہاں یہ طریقِ کار بہت نمایاں ہے ۔ چنانچہ ان کے خواب سنجیدہ
اور عظیم الشان اور ان کے ہم زاد سپرمین یا مردِ مومن ہیں ۔ مگر سرشار کے ہاں
یہ خواب دو ٹکڑوں میں بٹا ہوا نظر آتا ہے ۔ ایک طرف تو ان کے ہاں ایک سنجیدہ
وژن ہے جس کی تکمیل کے لیے وہ آزاد کو جنم دیتے ہیں اور اسے نہ صرف جسمانی
طور پر ایک عام شہری سے زیادہ توانا قرار دیتے ہیں ، بلکہ دوسرے جملہ اوصاف
کے اعتبار سے بھی اسے ایک سپرمین بنا کر پیش کرتے ہیں ۔ دوسری طرف ان کے
ہاں ایک غیر سنجیدہ وژن بھی ہے جس کے لیے وہ خوجی کو بروئے کار لاتے ہیں ۔
وژن اگر سنجیدہ ہو تو 'فنکار کا خواب' قرار پاتا ہے اور غیر سنجیدہ ہو تو
'شیخ چلی کا تخیّل' ۔ چنانچہ جہاں ایک طرف سرشار نے آزاد کی صورت میں فنکار
کا خواب دیکھا وہاں خوجی کی صورت میں 'احمقوں کی جنت' کا بھی نظّارہ کیا
نتیجہ ظاہر ہے ۔ آزاد اپنی ہمت اور قوت کی مدد سے اپنے خواب کی حدود کا
تعیّن کرتا ہے اور پھر اسے سر بھی کر لیتا ہے جب کہ خوجی شوق کی بلندی
اور ہمت کی پستی میں ایک ایسی خلیج پیدا کرتا ہے کہ اس کے خواب شیخ چلّی
کے منصوبے بن کر رہ جاتے ہیں اور وہ مضحکہ خیز نظر آنے لگتا ہے ۔ سرشار

بیک وقت آزاد کے روپ میں بھی ابھرے ہیں اور خوجی کے لباس میں بھی۔ چنانچہ ان کا خواب ایک ہی وقت میں سنجیدہ بھی ہے اور غیر سنجیدہ بھی۔ نیز یہ ان کی اپنی زندگی کا عکس بھی ہے کہ ان کی دنیاوی زندگی ہمتوں کی پستی کی حکایت ہے اور ان کا فنِ شوق کی بلندی کی داستان!

سرشار کے ہاں دو دنیاؤں کا سنگم بار بار نمودار ہوا ہے۔ نہ صرف انہوں نے ایک ایسے معاشرے کی عکاسی کی، جو بجائے خود دو زمانوں کی گنگا جمنی کیفیات کا مرقع تھا بلکہ انہوں نے اپنی شخصیت کے دو رخوں کو بھی آزاد اور خوجی کے دو متضاد کرداروں کی صورت میں پیش کیا۔ عام زندگی میں بھی وہ دو دنیاؤں کے باسی تھے ۔۔۔ ایک شراب نوشی، آوارہ خرامی اور بے اعتدالی کی زندگی تھی، دوسری فن کی وہ حیاتِ رنگ و بو جس میں تمام تضادات ایک فنّی اکائی، میں ڈھل گئے تھے۔ البتہ سرشار کی تحریروں میں دو ایسے رجحانات ضرور ملتے ہیں جو ان کی شخصیت کے دو لخت ہونے ہی پر دال ہیں۔ یعنی اپنی بعض تصانیف میں وہ بالکل سنجیدہ ہیں اور بعض میں انہوں نے ظرافت سے کام لیا ہے (مثلاً قابلِ غور بات ہے کہ ان کے دو ناول ۔۔۔ 'جامِ سرشار' اور 'فسانۂ آزاد' ایک ساتھ 'اودھ اخبار' میں چھپتے رہے مگر ان میں سے 'جامِ سرشار' ایک سنجیدہ تخلیق ہے اور 'فسانۂ آزاد' مزاحیہ!) چنانچہ سنجیدہ تصانیف میں ان کے کردار کا وہ رخ ابھرا ہے جو اصلاح پسند، ترقی کا دلدادہ اور قبیح رسوم کا مخالف ہے جب کہ دوسری تصانیف میں ان کے کردار کا وہ رخ زیادہ نمایاں ہوا ہے جو بنیادی طور پر ہنسوڑ، مسخرہ جو اور مضحکہ خیز ہے۔ سرشار کی ساری ظرافت مؤخرالذکر تصانیف ہی میں ابھری ہے اور عجیب بات یہ ہے کہ اسی کی بدولت سرشار کو مقبولیت اور شہرت بھی ملی ہے۔

سرشار کی ظرافت میں طنز کم ازکم اور مزاح زیادہ ہے۔ مگر اس مزاح میں غالب کے مزاح کی سی لطافت اور نزاکت موجود نہیں۔ یعنی اس میں وہ کیفیت پیدا نہیں ہوئی جو آنسو اور تبسم کے انضمام سے جنم لیتی ہے۔ اس کے برعکس یہ مزاح بلند بانگ اور تیز ہے۔ اور ایک ایسے قہقہے کا محرّک ہے جو اپنی صدائے بازگشت سے لمحہ بہ لمحہ تیز تر ہوتا جاتا ہے۔ اس گونج میں گہرائی کا فقدان ہے ہے، لیکن اس کے وجود کا احساس فی الفور ہو جاتا ہے۔

سرشار کی تحریروں میں طنز نسبتاً کم ہے، لیکن جب وہ لکھنؤ کے زوال پذیر معاشرے کی تصاویر پیش کرتے ہیں، نوابوں کی مکروہ عادات، چانڈو اور افیون نوشی اور بٹیر بازی کی طرف ان کے جھکاؤ، عام شہریوں کی اوہام پرستی، مذہب کے بجائے مذہبی رسوم کی پابندی میں ان کا استغراق، معلّمین کی جہالت، پیروں کی

بد اعمالی اور شاعروں اور بالکوں کے مخصوص اسلوبِ حیات پر سے پردہ اٹھاتے ہیں تو ان کی طنز فوراً محسوس ہونے لگی ہے۔ مگر اس طنز میں شدت نہیں ہے۔ خود سرشار بھی غالباً یہ بات جانتے ہیں کہ ان کی طنز میں نشتریت کی کمی ہے اور وہ اس میں زور پیدا کرنے کے لیے بعض اوقات تنقید اور تبصرے سے کام لینے لگتے ہیں اور یوں ناصح یا محتسب کا روپ دھار لیتے ہیں اس سے ان کی طنز کی ہمہ گیری مجروح ہوتی ہے۔ نیز ان کی تحریر بھی فنی اعتبار سے کمزور ہو جاتی ہے۔

طنز کی بہ نسبت سرشار کے ہاں مزاح کی فراوانی ہے۔ ہر چند وہ مزاح میں لطافت اور گہرائی پیدا نہیں کر سکے اور بعض اوقات تو ان کا مزاح پھکڑ پن کی سطح پر بھی اتر آتا ہے، تا ہم ان کے ہاں واقعہ سے ہونے والے مزاح کے متعدد نمونے ابھرے ہیں۔ جن میں سے بعض خاصے اچھے ہیں۔ اسی طرح انہوں نے چند مزاحیہ کردار پیش کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ چنانچہ خوجی، نواب، کھوسٹ شوہر، زرد پوش، مہراج سلی اور درجنوں دوسرے افراد اپنی فطری ناہمواریوں کے باعث مزاحیہ کردار کے بہت قریب جا پہنچتے ہیں۔ لیکن سرشار کی مزاح نگاری میں یہ عیب ضرور ہے کہ ان کے ہاں جگہ جگہ واقعہ کے بجائے عملی مذاق سے مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ چنانچہ خوجی جو ان کی ظرافت کا سب سے بڑا معاون ہے، قدم قدم پر عملی مذاق سے دو چار ہوتا اور اپنی فطری ناہمواریوں کے بجائے اپنے مسخرہ پن سے ہنسانے کی کوشش کرتا نظر آتا ہے۔ در اصل عملی مذاق سے پیدا ہونے والا مزاح لفظی بازی گری سے جنم لینے والے مزاح کی طرح کسی بلند معیار کا حامل نہیں ہوتا اور اس لیے جب سرشار عملی مذاق سے کام لیتے ہیں تو ان کا مزاح جاذبیت اور کشش سے دست کش ہونے لگتا ہے۔

سرشار نے مزاح پیدا کرنے کے لیے کردار، واقعہ اور عملی مذاق ان سب سے کام لیا ہے، لیکن بحیثیتِ مجموعی ان کی ظرافت فقرہ بازی اور بذلہ سنجی ہی سے عبارت ہے۔ ہر چند سرشار ایک تعلیم یافتہ اور حساس انسان تھے اور قدیم کی بہ نسبت جدید سے زیادہ متاثر تھے، تاہم قدیم لکھنوی تہذیب کی پیداوار بھی تھے۔ اس لیے ان کا ذوقِ مزاح بھی لکھنوی تہذیب ہی کی دین تھا۔ وہ لکھنوی تہذیب کی پیداوار ہیں جو رسم، جسم اور لفظ کی تہذیب تھی اور جس کے مزاح میں لفظی بازیگری کا عنصر ہی سب سے زیادہ تھا۔ ضلع جگت، پھبتی، حاضر جوابی، ٹھٹھول یہ سب بنیادی طور پر لفظی بازیگری ہی کے کرشمے ہیں اور یہ لکھنوی تہذیب کے رگ و ریشہ میں پوری طرح سرائیت کر چکے تھے۔

بعض لوگوں نے اس میں ایک ایسی تک بندی بھی دریافت کی ہے جس کی کوئی تک نہ تھی ، مگر جو اہل لکھنؤ کی ذہانت کا کرشمہ ضرور تھی ۔ اس سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ شاید یہ تک بندی مزاح کے نقطۂ نظر سے بھی اہمیت کی حامل تھی ۔ مگر ایسا ہرگز نہیں ہے وہ تحریر جو ضلع جگت ، ٹھٹھول ، پھبتی ، رعایت لفظی اور قافیہ پیمائی کی اساس پر استوار ہو ، نہ صرف اپنے اطلاق میں محدود اور اثر میں رقیق ہوتی ہے بلکہ مزاح کی کھلی ڈھلی کیفیت سے غیر متعلق ہونے کے باعث شخصیت کی کشادگی کو بھی خود میں سمو نہیں سکتی ۔ چنانچہ اس قسم کی تحریر سے پیدا ہونے والا مزاح بھی معیار کے اعتبار سے بلند نہیں ہوتا ۔ سرشار اسی لکھنؤ کی پیداوار تھے، جو لفظی مزاح پر جان دیتا تھا ۔ چنانچہ انہوں نے اپنی تحریروں میں زیادہ تر مزاح کی ایک ایسی "جنس" کو پیش کیا جو حد درجہ محدود ، گھٹی ہوئی اور بے اثر تھی ۔ ممکن ہے لکھنؤ کی تہذیب سے وابستہ افراد کو اس میں کچھ لطف ملتا ہو ، لیکن ادب کی اس وسیع تر دنیا میں جو زمانی اور مکانی حدود کے تابع نہیں ، اس کی کشش اور جاذبیت ہمیشہ محل نظر قرار پائے گی ۔

دراصل سرشار کی تحریروں کی اہم ترین خصوصیت ظرافت نہیں بلکہ اسٹائل ہے اور اسٹائل شخصیت کا عکاس ہوتا ہے ۔ اس کلیہ کی روشنی میں دیکھیں تو محسوس ہوتا ہے کہ سرشار کی شخصیت کس قدر جاذب نظر اور رنگا رنگ تھی ۔ وہ کسی سیدھی لکیر پر گام زن ہو کہ کسی خاص منزل تک پہنچنے کی دھن میں نہیں تھے ، بلکہ کارزار حیات میں ایک سیاح کی طرح مصروف خرام تھے ۔ جہاں منظر دل موہ لینے والا دکھائی دیا ، وہاں رک گئے ۔ جہاں دل نہ لگا وہاں سے چل دیے ۔ سیر بینی کے اس انداز نے جو پھول پھول سے خوشبو کشید کرنے کے مترادف تھا ، ان کے اسٹائل میں بھی بلا کی جاذبیت پیدا کر دی ۔ پھر ان کا مشاہدہ بہت تیز اور یادداشت بہت توانا تھی ۔ اس لیے انہوں نے جو کچھ دیکھا یا سنا ، وہ اسے دوجھل ہیں ، اپنی کرخت جھال کوتج کر نہایت آہستگی کے ساتھ ان کے اسٹائل کی بنت میں شامل ہو گیا ۔ نتیجہ یہ ہے کہ سرشار منظر کشی کے باب میں اپنا جواب نہیں رکھتے ۔ میلوں ٹھیلوں ، شادی غمی کی تقاریب ، دربار کی مجالس اور سرائے کی اداس فضا غرض یہ کہ ہر موقعہ پر انہوں نے نہ صرف اپنی باریک بینی بلکہ چرب زبانی کا بھی نہایت عمدہ مظاہرہ کیا اور خلق خدا کو اس کے واقعی مناظر میں بڑی خوبصورتی سے پیش کیا تاہم وہ رجب علی سرور نہیں تھے کہ محض تصویر کشی تک خود کو محدود رکھتے ۔ سرور کے مناظر میں گلیاں ، بازار ، شہر اور قصبے اپنی تمام تر اشیا اور باسیوں کے ساتھ ابھرتے تو ہیں ، لیکن یوں لگتا ہے جیسے اشیا محض چن دی گئی ہوں اور باسی ایک جادو کی نگری میں پتھر کے بت بنے کھڑے ہیں ۔ دوسری طرف سرشار کے پیش کردہ مناظر میں زندگی اور حرکت کا احساس ہوتا ہے اور یوں لگتا ہے جیسے ان

کے کردار ایک دوسرے سے متصادم ہو کر اپنی اپنی حیثیت کومنوانے کی سعی میں مبتلا
ہیں ۔ نتیجہ ظاہر ہے ۔ سرور نے گویا ایک کیمرے کی مدد سے اپنے ماحول کی ایک ایسی
تصویر کھینچی جس میں ہر شے اور ہر فرد کاغذ پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رکا کھڑا ہے ۔
جب کہ دوسری طرف سرشار نے ایک ایک آئینہ پیش کیا جس میں ان کا سارے کا سارا
ماحول اور زمانہ جیتا جاگتا ، چلتا پھرتا اور روتا ہنستا زمانہ اپنے پورے تناظر کے ساتھ
عکس ریز ہے ۔ سرشار کے اس طریق کار میں ان کی اپنی شخصیت کی سیمابی کیفیتوں کا بھی
ہاتھ تھا ۔ ان کی تحویل میں زمانے کی تڑپ اور ماحول کی باہمی اور بے قراری کو گرفت میں
لینے کے لیے ایک دوسری ہی بے قرار اور شوریدہ سر شخصیت بھی تھی ۔ یہ شخصیت
جب اسٹائل میں ڈھل کر سامنے آئی تو لکھنوی تہذیب کے سارے خدوخال کو لفظ کے
نازک پیمانے میں سمٹتی چلی گئی ۔

بارھواں باب

اردو ڈراما

تمہید

دنیا میں ڈراما یا ناٹک کا وجود تہذیب و تمدن کے آغاز سے بھی پہلے پایا جاتا ہے[1]۔ ایامِ جاہلیت میں وحشی لوگ اپنے تفریحی مشاغل کے لیے یا مذہبی فریضوں یا جنگ اور سکار سے پہلے سوانگ رچاتے، نقلیں کرتے اور اپنے اپنے انداز میں ناچتے ڈھول بجاتے اور گاتے ہیں۔

اہلِ یونان نے ڈرامے کو باقاعدہ فن کی صورت میں تشکیل دیا۔ ہندو مؤرخوں اور ناقدوں کا دعویٰ ہے کہ ان کے دیوی دیوتا آسمانوں پر ناٹک کے قاعدے بناتے اور برِّ صغیر پاکستان و ہند میں ناٹیہ شاستر کی ابتداء یونان سے بھی پہلے ہوئی۔ چنانچہ برِّ صغیر میں ناٹک سنسکرت ادب اور پراکرت زبان کا ایک اہم حصہ بن گیا اور قدیم عہد کے اعلیٰ تعلیم یافتہ، شرفاء ایکٹنگ یا نرت کاری کے فن کی تربیت حاصل کرنا باعثِ عزت سمجھتے تھے۔ بڑے بڑے عالم فاضل برہمن ناٹک لکھتے، عالی خاندان کے راجے مہاراجے شاہی محلوں میں اسٹیج آراستہ کرتے اور اپنی سرپرستی یا کثیر مصارف کے ساتھ دھوم دھام سے ناٹک رچائے جاتے۔

قدیم سنسکرت کے ڈراما نگاروں میں بھاس، کالیداس، راجہ ہرش اور بھوبھوتی کے نام خاص ہیں۔ ان کی تصانیف کے تراجم جدید ترقی یافتہ مہذب دور میں بھی دنیا کی مختلف زبانوں میں کیے جا چکے ہیں۔ ان ڈراموں میں سنسکرت زبان و ادب کے اعلیٰ محاسن اور ڈراما کی ہنرمندی پائی جاتی ہے۔

ساتویں[2] صدی عیسوی میں ہندو تہذیب و تمدن کے دورِ انحطاط کے ساتھ سنسکرت زبان و ادب کا زوال شروع ہوا اور اسی زمانہ سے سنسکرت ڈراما پستی کی طرف مائل ہوتا گیا، بالآخر اس ڈرامے اور اسٹیج کا نام بھی باقی نہ رہا۔ اس کا خاص سبب یہ تھا کہ ناٹک اور لذت کاری میں سفلی جذبات اور ادنیٰ درجہ کی فحش حرکات شامل ہونے

---

(۱) انڈین ڈراما - محکمہ نشر و اشاعت و مطبوعات (بھارت گورنمنٹ) ۱۹۵۶ء -

(۲) ابھتیے وربنم - (انگریزی ترجمہ) -

لگیں ، اعلیٰ طبقہ کے ہندوؤں نے اس میں شرکت گوارا نہ کی اور ادنیٰ درجہ کے بازاری شامل ہونے لگے ۔ چنانچہ اس فن کو ذلیل پیشہ سمجھا جانے لگا ۔ اہلِ علم و ادب اور مہذب طبقہ نے اس کی سرپرستی گوارا نہ کی ۔ (مسلمان سلاطین نے اس کی سرپرستی اس لیے قبول نہ کی کہ رقص و سرود اور نقالی دینِ اسلام میں ممنوع ہونے کے علاوہ سلطنت کے نظم و نسق میں حارج ہوتی ۔ گو دورِ آخر کے سلاطین میں سے بعض نے اپنے عہدِ حکومت میں فنِ موسیقی کی ترویج و ترقی کے لیے سرپرستی ضرور کی ، لیکن انہوں نے بھی فنِ تمثیل کو در خورِ اعتنا نہ سمجھا) ۔

برِصغیر میں تمثیل گری کے فن کی بنیاد جز قدیم ہندوستانی روایات پر رکھی گئی ان میں سنسکرت ڈراما نوٹنکی ، رہس ، لیلائیں ، نقالی یا بہروپ ، بھگت بازی وغیرہ شامل تھے ، ان تمام عناصر کے لوازم میں نرت بھاؤ یا ناچ کو ترجیح دی جاتی ہے ۔

نوٹنکی اور نقالی یا بہروپ

ہندوستان[1] میں بہروپ کا رواج بہت پرانے زمانے سے چلا آتا ہے ، نقال یا بہروپیے طرح طرح کے بھیس بدلتے ، رنگ برنگ لباس پہنے ، چہرے پر غازہ ملتے ۔ مرد عورتوں کی پوشاک پہن کر سرمہ مسّی لگاتے ۔ اس طرح ان کی پوری ٹولی یا طائفہ مل کر کسی قصہ کو آغاز سے انجام تک نقل کی صورت میں پیش کرتے ۔ نوٹنکی کی بڑی بڑی ٹولیاں اور طائفے یہ کھیل سنگیت ناٹک کی صورت میں اداکاری اور رقص و سرود کے ساتھ کھیلتے ۔

لیلا اور رہس

لیلائیں دو قسم کی ہیں ۔

رام لیلا اور کرشن لیلا ۔

(۱) رام لیلا میں ہندوؤں کی مشہور دیو مالا راماین کا قصہ سوانگ یا نقل کی صورت میں پیش کیا جاتا ۔ عام لڑکیوں کو منتخب کرکے رام ، سیتا اور لچھمن کے روپ میں پیش کیا جاتا اور اس کی نمائش کے لیے کوئی خاص جگہ یا اسٹیج مقرر نہ تھا ۔ میدانوں ، سڑکوں اور گلیوں میں بھی یہ سوانگ دکھایا جاتا ۔

---

(۱) رجب علی سرور ، فسانۂ عبرت ۔

(۲) کرشن لیلا جسے رہس بھی کہتے ہیں ، کسی زمانے کے لیے مخصوص نہیں ۔ اسے دکھانے والی رہس منڈلیاں باقاعدہ اداکاری اور ناچ گانے سے واقف لوگوں پر مشتمل تھیں ۔ اس میں کرشن کنہیا اور رادھا کے بھروپ بھر کر ان کی زندگی کے مختلف واقعات دکھائے جاتے ۔ کرشن اور رادھا کی نقلیں خوش شکل نوجوان لڑکے کیا کرتے ، جنھیں اداکاری اور رقص و نغمہ کی باقاعدہ تعلیم دی جاتی ۔ رہس کھیلنے والی منڈلیاں سال کے مختلف حصوں میں میدانوں ، محلوں اور میلوں وغیرہ کے موقعوں پر ایک جگہ نوٹنکی کی طرح تخت بچھا کر اسٹیج تیار کیا کرتیں اور اس کے سامنے فرش پر تماشائی بیٹھتے تھے ۔

بھانڈوں کی نقلیں

بھانڈوں کی نقلیں چھوٹے چھوٹے ہنسانے والے ڈرامے ہوتے ہیں ۔ انھیں ہندی میں 'پرلتش' اور انگریزی میں فارس (Farce) کہتے ہیں ۔ بھانڈ جنھیں نقّال بھی کہا جاتا ہے پرانے زمانے سے شادی بیاہ یا ولادت کی تقریب اور مختلف دعوتوں کے موقعوں پر یہ نقلیں کرکے لوگوں کو ہنسانے آتے ہیں ۔ مرزا رجب علی بیگ سرور لکھنوی نے اپنی تصنیف 'فسانۂ عبرت'[1] میں اور سلطان واجد علی شاہ نے اپنی سرگزشت[2] 'بنی' میں بھانڈوں کی نقلوں کا تفصیل سے ذکر کیا ہے ۔

بھگت باز

''ہندوستان میں پرانے وقتوں سے بھگت بازی کا چرچا رہا ہے ۔ عام طور پر بھگت باز ہندوؤں کا وہ فرقہ کہلاتا ہے جو لڑکوں کو نچاتا اور سوانگ وغیرہ بھر کر تماشا دکھاتا ہے'' ۔

ملّا غنیمت[3] کی فارسی مثنوی 'نیرنگِ عشق' میں بھگت بازوں کا ذکر آیا ہے اس سے اندازہ کیا جاتا ہے کہ بھگت باز رقص و سرود اور نقالی کے فن میں ماہر ہوتے تھے ۔ نیز بھروپ بھرنے میں انھیں کمال حاصل ہوتا تھا ۔

---

(۱) رجب علی بیگ سرور ، فسانۂ عبرت ۔ ص ۱۴ ، ۱۵ ۔

(۲) سلطان واجد علی شاہ ، بنی ۔ ص ۱۲۶ ۔

(۳) ملا غنیمت ، مثنوی نیرنگ عشق ۔ ص ۱۶۰ ۔

دیگر اصنافِ سخن میں ڈرامائی عناصر

اردو شاعری میں وہ تمام اصناف موجود ہیں جو فارسی شاعری کی خصوصیات ہیں ۔ فارسی شاعری کی طرح اردو شاعری میں مثنوی اور مرثیہ گوئی ، مرغوب اور مقبول اصناف تسلیم کی جاتی ہیں اور ان دونوں کی بنیاد منظر کشی ، واقعہ نگاری اور کرداروں کی کشمکش پر قائم کی جاتی ہے ۔ اس لیے ان میں ڈرامائی عناصر موجود ہیں ، چونکہ اردو ڈراما کی ابتدا نظم میں ہوئی اس لحاظ سے اس کے لوازم میں یہ دونوں اصناف خاص طور پر اثر انداز مانی جاتی ہیں ۔

محرم کی مجالس میں نثر خوانی کا طریقہ بھی خاص طور پر مقبول رہا ہے ۔ اس میں 'شہادت زارِ کربلا' کے عبرت انگیز واقعات مقفیٰ نثر میں بیان کیے جاتے تھے ، دہلی ، لکھنؤ اور اس کے مضافات میں ان مجالس کا چرچا زیادہ تھا ۔ اس کے علاوہ داستان گوئی اور قصہ خوانی کے نثری اسلوب نے بھی اردو ڈراما کے لوازم پر گہرا اثر ڈالا ۔ ان اصنافِ سخن کے ماہر نظم خواں اور نثار داستان گو خاص ہوا کرتے تھے ، جو آواز کے اتار چڑھاؤ کے قصہ در ڈراما کا ماحول قائم کر دیتے تھے ۔ لیکن ان میں سے کسی کو بہروپ کی ضرورت نہیں ہوتی تھی ۔ داستان گوئی کا منفرد فن اب برِصغیر پاک و ہند میں کہیں نہیں پایا جاتا ۔ لیلاؤں سے قطع نظر باقی جو اصناف و فنی عناصر اردو ڈراما کی تشکیل کا ذریعہ بنے اور زیادہ تر اس کی ترقی و تکمیل کے ضامن ہوئے ، ان میں اکثر و بیشتر مسلمان اہلِ علم و فن کی کارگزاریوں کا دخل تھا ۔

لکھنؤ کا ڈراما

انیسویں صدی[1] عیسوی کے وسط میں سلطان واجد علی شاہ کی زیر سرپرستی لکھنؤ میں فنونِ لطیفہ کی ترقی و ترویج کے لیے خاص توجہ کی گئی ۔ شاہی دربار میں شعراء ، ادباء اور علماء و فضلاء کا مجمع تھا ۔ دہلی اور اودھ کے مضافات سے ارباب فن و کمال آ کر جمع ہو گئے تھے ۔ سلطان خود علم و ادب اور فنون میں کامل دستگاہ اور مہارت رکھتا تھا ۔ رقص و نغمہ کی محفلیں تفریحی مشاغل کے طور پر آراستہ نہ ہوتی تھیں بلکہ ان کا مقصد فن کی ترقی تھا ۔ اداکاری ، نوٹنکی ، سوانگ ، نقالی اور داستان گوئی کی سرپرستی کے سبب ان تمام فنون کو عروج حاصل تھا ۔ ان تمام علمی ، ادبی ، فنی ترقیوں اور سرگرمیوں نے لکھنؤ میں شاہی اور عوامی اسٹیج کا ماحول پیدا ہونے میں مدد پہنچائی ۔

---

(۱) مسعود حسن رضوی ، پروفیسر سید ، لکھنؤ کا شاہی اسٹیج ۔

الف - واجد علی شاہ (۱۸۲۲ء - ۱۸۸۷ء)

سلطان واجد علی شاہ اودھ کے نواب امجد علی شاہ کے بیٹے تھے ، واجد علی شاہ نے ولی عہدی کے زمانہ سے فنونِ لطیفہ کی قدردانی کی ، موسیقی اور شعر و ادب کے علاوہ رقص و تمثیل گری کے لیے ایک جلسہ گاہ 'پری خانہ' کے نام سے آراستہ کیا -

''پری خانہ[۱] میں جو حسین و جمیل خوش گلو عورتیں ملازم ہوتی تھیں ، ان کے اصلی ناموں کو بدل کر پریوں کے نام دے جاتے تھے - مثلاً سلیمان پری ، جمال پری وغیرہ - واجد علی شاہ نے تمثیل گری کا آغاز اپنے ولی عہدی کے زمانے ہی میں کیا - یہ جوگیا میلہ تھا جو ساون کے مہینہ میں حضور باغ میں منایا گیا - سلطان نے جوگی کا روپ خود ہی بھرا تھا اور پری خانہ کی ناچنے گانے والیاں جوگنوں کے روپ میں شریک ہوئیں''[۲] - اس کے بعد رہس کے جلسوں کا آغاز کیا - رہس ، اصل میں راس ہے جو سری کرشن کی لیلاؤں میں سے ایک لیلا ہے - اس میں کرشن ، رادھا اور گوپیاں ، تمثیل کے انداز میں رقص و سرود کی محفل آراستہ کرتے ہیں ، ابتداء میں رہس کے جو جلسے کیے ان کی ترتیب خود سلطان کی ایجاد تھی - ان میں ناٹک کی صورت میں کرشن کنھیا اور رادھا گوپیوں کے ساتھ مل کر ناچتے گاتے نظر آتے - بعد ازاں جلسہ کے لیے سلطان نے ایک باقاعدہ رہس ناٹک لکھا اور رہس کا نام 'رادھا کنھیا کا قصہ' رکھا - یہ ناٹک ۱۸۴۲ء میں تصنیف کیا اور شان و اہتمام کے ساتھ زرِ کثیر صرف کرکے قیصر باغ میں ۱۸۴۳ء میں کھیلا گیا -

قیصر باغ میں پہلا شاہی اسٹیج لاکھوں روپے کے مصارف سے تعمیر کیا گیا - زرق برق سین سینری اور زر نگار پوشاکیں تیار کی گئیں - رہس کا ساز و سامان اور جملہ لوازمات کئی لاکھ روپے میں تیار ہوئے[۳] - یہ رہس پہلا شاہی ناٹک ہے جو لکھنؤ کے شاہی محل میں پہلی بار کھیلا گیا - اس میں کسی حد تک ڈرامائی لوازم کو ملحوظ رکھا گیا ہے - قصہ کا عنصر ربط و تسلسل کے ساتھ موجود ہے اور تمثیل گری کے ساتھ کردار نگاری پر بھی توجہ کی گئی ہے - اس رہس ناٹک کے خاص کرداروں میں کنھیا ، رادھا ، رام چیرا ، جوگن ، سکھیاں ، غربت ، مسافر وغیرہ کے علاوہ پنہارنیں ، رہس والیاں ، دیو اور پریاں شامل ہیں -

---

(۱) واجد علی شاہ ، محل خانۂ شاہی - ص ۴۷ -
(۲) سلطان واجد علی شاہ ، محل خانۂ شاہی - ص ۱۳۰ -
(۳) واجد علی شاہ عشق نامہ (نثری فارسی) ص ۱۴۸ -

واجد علی شاہ نے اپنے دور حکومت میں بھی کئی رہس ناٹک تصنیف کیے اور خاص اہتمام سے اسٹیج کرائے ۔ ان میں سے کئی ناٹک ان کی اپنی مثنویوں پر مبنی تھے اور سب کے سب منظوم ناٹک کی صورت میں تھے ۔ جن کو اوپیرا یا سنگت ناٹک کہنا بجا ہوگا ۔ ان میں مشہور حسب ذیل ہیں : (۱) افسانۂ عشق (قصہ سیم تن اور ماہ پیکر) (۲) دریائے تعشق (قصہ غزالہ اور ماہ رو) (۳) بحر الفت (قصہ ماہ پروین اور مہر پرور) ۔

ان ناٹکوں کی نسبت حکیم اصغر علی لکھنوی کا بیان ہے کہ ''رہس[۱] ایسا ایجاد کیا کہ کنھیا کا رہس مٹا دیا ۔ مثنویوں کا قصہ درست کرکے دکھا دیا'' ۔ ان رہس ناٹکوں میں نظم کے علاوہ کہیں کہیں نثری مکالمے بھی ہیں ۔

واجد علی شاہ نے اپنی معزولی کے بعد مٹیا برج میں جلا وطنی کے دوران میں چھتیس رہس ترتیب دے ۔ یہ رہس راس ناچ کی قسمیں ہیں ، رہس کی ان مختلف صورتوں کے نام بھی علیحدہ علیحدہ رکھے تھے جن میں 'طاؤس بکھی' اور 'آفتاب مکھی' خاص ہیں ۔ ان رہس کے بارے میں بعض تذکرہ نویسوں کو یہ مغالطہ ہے کہ یہ ناٹک کی شکل میں تھے ، لیکن اصل میں ان رہسوں کا ڈرامائی تشکیل سے کوئی تعلق نہیں ، ان میں صرف رقص و سرود کے جلسے ہوتے تھے ۔ پریاں (حسین عورتیں) سلطان کے ایجاد کردہ رقص کیا کرتیں اور ان کے تصنیف کیے ہوئے گیت گاتی تھیں ۔ بہر حال سلطان نے لکھنؤ کے دورِ فراغت میں جو چار رہس ناٹک کی صورت میں لکھے اور اسٹیج کیے ان کی اہمیت اردو ڈراما کی تاریخ میں مسلّم ہے اور اس لحاظ سے واجد علی شاہ کو اردو ڈراما کا معمارِ اول تسلیم کیا جاتا ہے ۔

(ب) سید آغا حسن امانت لکھنوی (۱۸۱۶ء - ۱۸۵۹ء)

میر امانت لکھنؤ کے میر آقا علی عرف میر آغا کے بیٹے تھے ، امانت کے دادا سید علی رضوی روضۂ حضرت امام رضا علیہ اسلام کے کلید بردار تھے ۔ امانت کی تعلیم لکھنؤ کے ذی علم شرفا کی طرح خالص مشرقی انداز میں ہوئی ۔ پندرہ سال کی عمر سے شعر و شاعری کی طرف میلانِ طبع ہوا اور خاندانی بزرگوں کی طرز پر مختلف اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ۔ امانت کی عمر بیس سال کی تھی کہ فالج کے عارضہ میں مبتلا ہوئے ۔ زبان بند ہو گئی اور چلنے پھرنے سے بھی معذور ہو گئے ۔ ان کی مجبوری و معذوری کے پیشِ نظر درگاہِ امامیہ لکھنؤ سے چالیس روپیہ ماہانہ وظیفہ مقرر ہو گیا ۔ امانت دس سال بعد صحت بہتر ہونے پر کربلائے معلیٰ گئے اور حضرت امام حسین کے روضہ پر حاضر ہوئے ۔ وہاں ان کی زبان

---

(۱) حکیم اصغر علی لکھنوی ، (دیباچہ) داستان دریائے عشق ۔

کھل گئی مگر لکنت باقی رہی - امانت کا زیادہ وقت گھر میں گزرتا اور شب و روز شعر گوئی میں مصروف رہتے - ان کی تصانیف حسب ذیل ہیں :

(۱) 'گلدستہ امانت' (مختصر مجموعہ کلام) (۲) 'واسوخت امانت' (۳) 'اندر سبھا' (معہ شرح اندر سبھا) (۴) 'خزائن الفصاحت' (خزائن الفصاحت) -

یہ وہ زمانہ تھا کہ لکھنؤ میں واجد علی شاہ کے دربار میں مشاہیر شعراء اور ادباء کی محفلیں آراستہ تھیں - رہس کے جلسوں کی دھوم دھام تھی ، لیکن امانت اپنی معذوری کے سبب ان مجالس میں کبھی شریک نہ ہوئے اور نہ ان کا دربار شاہی سے کوئی تعلق قائم ہو سکا -

امانت کو مرثیہ گوئی میں بھی خاص ملکہ تھا - ان کی غزل گوئی کا انداز اس زمانہ کے عام لکھنوی اسکول کے اسلوب پر تھا - جس میں معاملہ بندی ، رعایتِ لفظی اور تشبیہہ و استعارہ کی کثرت پائی جاتی ہے - ۱۸۵۲ء میں امانت نے چند احباب کی فرمائش پر 'اندر سبھا' تصنیف کی -

'اندر سبھا' کا واجد علی شاہ کے دربار یا ان کی فرمائش سے کوئی واسطہ نہ تھا - البتہ 'اندر سبھا' واجد علی شاہ کے دور میں تصنیف ہو کر کھیلا گیا ہے - 'اندر سبھا' کو امانت کی زندگی میں ہی شہرت اور مقبولیت حاصل ہو گئی تھی ، لیکن خود امانت اپنی خاندانی وجاہت اور ادبی ثقافت کے لحاظ سے اس ناٹک کو اپنے لیے وجہِ امتیاز نہیں سمجھتے تھے اس لیے 'اندر سبھا' کی غزلوں اور گیتوں میں اپنا تخلص امانت کے بجائے استاد رکھا ہے اور شرحِ اندر سبھا میں اس کی جانب اشارہ کیا ہے -

گو 'اندر سبھا' کو جدید فنی لوازم کی حیثیت سے ایک بلند معیار ڈراما نہیں کہا جا سکتا ہے تا ہم یہ عوامی اسٹیج کا پہلا ناٹک ہے - اور اس کی عام مقبولیت کا یہ حال تھا کہ جس علاقہ اور مقام پر اسٹیج کا آغاز ہوا وہاں سب سے پہلے 'اندر سبھا' کھیلا گیا - اور مدتوں تک اس کے اسلوب کی تقلید جاری رہی - 'اندر سبھا' کی ادبی اور فنی خصوصیات یہ ہیں[1] :

(۱) زبان و بیان سادہ فصیح اور مکالموں کی نظم و نثر میں بے ساختگی -

(۲) گانوں میں غزل ، ٹھمری ، دادرا ، چھند وغیرہ موسیقی کی جملہ مقبولِ عام اصناف کی موجودگی -

---

(۱) مسعود حسن رضوی ، لکھنؤ کا عوامی اسٹیج -

(۳) رقص و نغمہ کا حسین امتزاج اور تنوع ۔

(۴) قصہ میں حیرت کے ساتھ سادگی و پرکاری ۔

(۵) حسن و عشق کی رنگا رنگ کیفیات اور معاملات کو رقص و نغمہ کی دلکشی کے ساتھ پیش کرنے کا مرغوب انداز ۔

جزوی طور پر 'اندر سبھا' میں بعض فنّی خامیاں موجود ہیں ، لیکن طبع زاد تخلیق کے لحاظ سے درگزر کرنے کے لائق ہیں ، کیونکہ امانت کے سامنے کوئی فنّی نمونہ موجود نہ تھا جس کی تقلید کرتے ، انہوں نے اپنی ایجاد پسند فکری صلاحیتوں کو کام میں لا کر یہ ناٹک پیش کیا جس میں ایسا سقم کوئی نہیں جو اس کے دلچسپی سے پڑھے جانے یا کامیابی سے کھیلے جانے میں حارج ہو ۔ البتہ اس کے فنّی اسلوب میں کسی قدر سنسکرت ڈرامے کا پرتو ضرور پایا جاتا ہے ۔ کہ معمولی سامان کے ساتھ کسی بھی سڑک کے کنارے کھیلا جا سکتا ہے ، بعد میں یہ اہتمام سے اسٹیج کیا جاتا ۔ 'اندر سبھا' کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں پرستان کا سماں بندھ جاتا ۔

گو بعض ناقدین اسے مکمل ڈراما ماننے سے انکار کرتے ہیں اور معقول وجوہ ظاہر کیے بغیر بمبئی کے پارسی اسٹیج کے ان ڈراموں کو بنیاد قرار دیتے ہیں جو خود 'اندر سبھا' کے برداز پر لکھے گئے اور ان میں بھی چند وہ ہیں جو بنیادی طور اردو زبان میں نہیں بلکہ گجراتی میں لکھے گئے ، لیکن یہ کہنا غلط نہیں کہ 'اندر سبھا' سے اردو ڈرامے کی ابتدا ہوئی ۔

اندر سبھا کی تقلید

امانت کی 'اندر سبھا' کے تتبع اور تقلید میں متعدد ناٹک اسی نام سے لکھے گئے ، ان میں سب سے پہلے مداری لال کی 'اندر سبھا' کا نام آتا ہے ، گو اس کا معیار 'امانت' سے کمتر درجہ کا ہے مگر امانت کے بعد سب سے زیادہ مشہور ہوئی ۔

بعد ازاں حسب ذیل سبھائیں تالیف ہو کر شائع ہوئیں ۔ (۱) 'جشنِ پرستان' ۔ 'لالہ بھیروں سنگھ عظمت' ۔ (۲) 'بزمِ سلیمان' ۔ منشی خادم حسین افسوس ۔ (۳) 'فرخ سبھا' ۔ (مصنف نامعلوم) ۔ (۴) 'ناگر سبھا' ۔ امام بخش کانپوری (ڈھاکہ) ۔ (۵) 'ہوائی

مجلس' ۔ (مصنف نامعلوم) ۔ (۶) 'تحفۂ دل کشا' ۔ (مصنف نامعلوم) ۔ (۷) 'عاشق سبھا' ۔ (مصنف نامعلوم) ۔ (۸) 'نیچر سبھا' ۔ مرزا عنایت علی بیگ عنایت لکھنوی ۔ (۹) 'بندر سبھا' ۔ مزاحیہ (مصنف نامعلوم) ۔ (۱۰) 'دریائی اندر سبھا' ۔ حسینی میاں ظریف ۔

بنگال کا ڈراما

مشرقی بنگال[1] کے مرکزی شہر ڈھاکہ میں اردو ڈرامے کی ابتدا ۱۸۵۴-۵۳ء کے درمیان ہوئی ۔ یہاں عرصہ سے بنگلہ زبان کے ڈرامے پیش کیے جاتے تھے ۔ رفتہ رفتہ اردو داں طبقہ کی دلچسپی کے لیے بنگلہ ڈراموں میں ٹھمری ، خیال اور گیتوں کے بول اردو آمیز ہندی میں شامل ہونے لگے ۔ ڈھاکہ کے محلہ نواب پورہ اور اکرم پور کے مسلمانوں نے اردو اسٹیج قائم کرنے کی طرف سب سے پہلے توجہ کی ۔ لکھنؤ اور کانپور نیز اودھ کے مضافات میں کچھ لوگ ، اندر سبھا اسٹیج ہوتے دیکھ کر ڈھاکہ پہنچے ۔ انہوں نے اس کا ذکر کیا ۔ چنانچہ اردو کا یہ پہلا ناٹک اندر سبھا نواب پورہ میں کھیلا گیا ۔ اس میں چند با ذوق ہندوؤں نے بھی شرکت کی ۔ اور ایک رئیس کے مکان کا ناچ گھر اسٹیج کے طور پر استعمال کیا گیا ۔

بنگلہ ڈرامے کی تاریخ بہت پرانی ہے اس میں اس علاقہ کے بہت سے مسلمانوں نے بھی شرکت کی تھی اور اس کی ترقی میں ان کا بھی بڑا حصہ تھا ۔ بنگلہ تھیٹر کے سرپرست اکمل خان اور یوسف خان نے بعد میں اردو اسٹیج کے قیام میں بھی دلچسپی کا اظہار کیا ۔ ان کے ساتھ شیخ فیض بخش کانپوری نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ۔ کچھ عرصہ بعد شیخ فیض بخش نے فرحت افزا کمپنی کے نام سے اردو تھیٹر کی بنیاد رکھی ۔ اس کمپنی کے اداکاروں میں کانپور اور لکھنؤ کی ڈیرہ دار طوائفیں شامل کی گئیں ۔ یہی عورتیں مردانہ اور زنانہ تمام کردار ادا کرتی تھیں ۔ کیونکہ ان میں سے اکثر خوش گلو نغمہ نواز تھیں اور یہ ڈرامے زیادہ تر منظوم تھے ، نیز ان میں گانوں کی تعداد بھی زیادہ تھی ۔

(الف) فیض بخش

فیض بخش نے 'اندر سبھا' کے اسٹیج کرنے کے بعد شیخ امام بخش کانپوری سے رجوع کیا ۔ یہ مدت سے ڈھاکہ میں مقیم تھے اور انہیں اردو شعر و ادب پر معمولی دسترس تھی ۔ شاعری اور نغمہ سے دلچسپی رکھتے تھے ۔ فیض بخش کی فرمائش پر امام بخش (بعض تذکرہ نویسوں نے ان کا نام سہواً پیر بخش بھی لکھا ہے) نے 'اندر سبھا' کی طرز پر ایک منظوم ڈراما 'ناگر سبھا' تصنیف

---

(۱) شفاء الملک حکیم حبیب الرحمان ، تاریخ ڈھاکہ - ص ۱۴۴ - ۱۴۵ -

کیا ۔ اور فیض بخش نے اسے بڑی دھوم دھام سے سٹیج کیا ۔ اس کی زبان ہر طرح کی نحوی اور عروضی غلطیوں سے بھری ہوئی ہے ۔ ڈراما کا پلاٹ بنگال کے جادو کی ایک لوک کہانی پر مبنی تھا ۔ اس لیے بہت مقبول ہوا اور مدتوں ملک کے دوسرے علاقوں میں کئی کمپنیوں نے بھی اسٹیج کیا ۔ یہ ڈراما چھپ کر شائع بھی ہوا تھا ۔ اس کا ایک نسخہ ۱۹۲۲ء میں بھارتی پریس لکھنؤ میں چھپا تھا ۔ ڈرامے کا ہیرو ناگر کامرو دیس کا باشندہ سنپیرا ہے ۔ اس لحاظ سے ڈرامے کا نام سنپیرا بھی مشہور ہوا[۱] ۔

شہر کے کئی رؤساء فیض بخش کے سرپرست تھے ۔ کچھ عرصہ بعد کانپور سے منشی نواب علی نفیس کو ڈھاکہ بلوا کر نئے نئے ڈرامے لکھوائے ۔ ان ڈراموں کی مجموعی تعداد چالیس بتائی جاتی ہے ۔ جن میں سے تیس اسٹیج ہوئے اور مدتوں دھوم دھام سے کھیلے جاتے رہے ۔ ان میں سے 'لیلیٰ مجنوں' اور 'بے نظیر بدرِ منیر' سب سے زیادہ مشہور ہوئے اور یہ دونوں ڈرامے کتابی صورت میں بھی چھاپے گئے ۔ اس کے بعد چند تاجروں اور رئیسوں نے مل کر ایک کمپنی 'حسن افزا' کے نام سے قائم کی ۔ اس کمپنی کے لیے لکھنؤ سے حکیم حسن مرزا برق بلوائے گئے ، جنھوں نے نیا ڈراما 'حسن افروز' لکھا ۔ یہ بہت مقبول ہوا ۔ بعد ازاں برق نے دوسرا ڈراما 'گلشنِ جانفزا' لکھا ۔

(ب) ماسٹر احمد حسین وافر لکھنوی

ماسٹر احمد حسین سے مہاوت ٹولی[۲] کے رئیسوں نے ڈراما 'بلبلِ بیمار' لکھوایا ۔ یہ ڈراما اس دور کی ڈراما نویسی میں ایک نیا موڑ تھا ۔ اس میں منظوم مکالموں اور گانوں کے علاوہ نثری مکالمے بھی شامل تھے ۔ یہ ڈراما ۱۸۵۶ء میں لکھا گیا اور بعد میں شائع بھی ہوا تھا مگر اب نایاب ہے ۔ مشرقی بنگال میں یہ پہلا ڈراما ہے جس میں کسی قدر ڈرامے کی شان ہے ، ورنہ سب کے سب اوپیرا کے انداز میں تھے ۔

حکیم حبیب الرحمٰن (مؤلف تاریخِ ڈھاکہ) کا بیان ہے کہ 'بلبلِ بیمار' کے بعد ناٹکوں کا ڈربہ کھل گیا اور بہت کم محلے ایسے تھے جہاں یہ بیماری نمودار نہیں ہوئی ۔ جن محلوں میں کوئی نیا کھیل میسّر نہ ہوا وہاں 'اندر سبھا' اسٹیج ہوا ۔ حتیٰ کہ شہر سے ۳۰ میل دور جیدیپ پور جہاں بہت کم لوگ اردو بولتے یا سمجھتے تھے وہاں بھی 'اندر سبھا' اسٹیج کیا گیا ۔ اس عہد کے رؤسا کیا مغل کیا سادات ، کیا ارمنی اور مسلمان سب ہی اس رنگ میں رنگ گئے ۔ اس اردو سے نواب محل ، رحمٰن منزل بھی کم متاثر

---

(۱) سید مسعود حسن رضوی ، لکھنؤ کا عوامی اسٹیج ۔ ص ۱۳۷ ۔
(۲) عشرت رحمانی ، اردو ڈراما تاریخ و تنقید اور تاریخ ڈھاکہ ۔ حکیم حبیب الرحمان ۔

نہیں ہوا ۔ نواب سر احسن اللہ مرحوم نے بھی چند مختصر ڈرامے لکھے اور ان کے خاندانی اسٹیج میں کھیلے گئے ۔ حضرات خواجگان میں مرزا ولی جان نمر جو اردو کے سوا فارسی کے بھی اچھے ساعر تھے انہوں نے بہت سے ڈرامے لکھے اور اسٹیج کرائے ۔ محلہ اردو والوں نے پہلے 'ناگر سبھا' ، 'شیریں فرہاد' اور 'سبت بسنت' کھیل کر نام پیدا کیا ۔ اس کے بعد ایک نیا کھیل 'لال گوہر' لکھوا کر اسٹیج کیا جو بہت مقبول ہوا[1] ۔ اردو ڈراما اور تھیٹر کا چرچا[2] ڈھاکہ میں ۲۰ - ۱۹۲۵ء تک رہا ۔ آخری دور میں لائن تھیٹر کا اسٹیج اس سلسلہ میں پیش پیش تھا ۔ اس زمانہ میں برِّ صغیر پاکستان و ہند میں سیاسی جد و جہد اور تحریکِ آزادی کے سلسلہ میں مختلف شہروں کی تھیٹر کمپنیاں ، نیم سیاسی ڈرامے بھی اسٹیج کرتی رہیں ۔ ڈھاکہ میں حبیب الرحمٰن مرحوم نے ایک ڈراما 'غریب ہندوستان' ۱۹۱۹ء میں لکھا اور اسٹیج کرایا ۔

پارسی تھیٹر

(الف) ابتدائی کوششیں

بمبئی میں سترھویں صدی عیسوی کے دوران غیر ملکی تاجروں نے مسیحی تبلیغ کی غرض سے انگریزی اور دکنی اردو میں جو اس وقت ہندوستانی کہلاتی تھی ، چند تبلیغی کھیل اسٹیج کرائے ۔ اٹھارھویں صدی عیسوی کے اوائل میں انگریز تاجروں نے بمبئی میں پہلا تھیٹر ہال تعمیر کیا ۔ انیسویں صدی عیسوی کے دوران میں مرہٹوں اور پارسیوں نے چند 'ڈریمیٹک کور' قایم کیے ۔ ان کی شکل شوقیہ کلبوں کی تھی ۔ جہاں چند مرہٹی اور گجراتی زبان میں ڈرامے کھیلے جاتے تھے ۔ ان میں تمام شوقیہ اداکار اور ارکان حصہ لیتے تھے ۔ پھر 'ہندو ڈریمیٹک کور' کا قیام عمل میں آیا ۔ اس میں زیادہ تر ہندو تاجر اور پارسی رؤساء شریک تھے ۔ اس اسٹیج کی ترتیب و تزئین میں مغربی اثر غالب تھا ۔

۱۸۵۳ء میں ایک پارسی رئیس ڈاکٹر بھاؤوا جی لاڈ نے گجراتی میں ایک ڈراما 'گوپی چند اور جلندھر' لکھا ۔ اسے کسی اردو دان سے بمبئی کی مروجہ ہندوستانی بولی میں ترجمہ کرایا اور ۲۶ نومبر ۱۸۵۳ء کو 'ہندو ڈریمیٹک کور' کے اہتمام سے اسی اسٹیج پر کھیلا گیا ۔ پارسی اسٹیج پر اردو یا ہندوستانی میں کسی گجراتی ڈرامے کو منتقل کر کے پیش کرنے کا نقطۂ آغاز اسی ڈرامے کو تسلیم کیا جاتا ہے اور یہی بمبئی کے اردو تھیٹر

---

(۱) حکیم حبیب الرحمٰن 'تاریخ ڈھاکہ' - ص ۲۴۷ - ۲۴۸ -

(۲) عشرت رحمانی ، 'اردو ڈراما کا ارتقاء' - ص ۲۱۷ - ۲۱۸ -

(۳) ڈاکٹر عبدالعلیم نامی ، اردو تھیٹر حصہ اول -

کی ابتدا تھی - یہ ڈراما بہت مقبول ہوا اور ۱۸۵۳ء میں 'پارسی ڈرامٹک کور' کے ارکان نے ایک اور ڈراما 'پیدائش سیاوش' بزبان گجراتی لکھا اور اردو میں ترجمہ کرا کے اسٹیج کیا - کچھ عرصہ بعد اسی اسٹیج پر ناٹک 'اندر سبھا' بڑے اہتمام سے کھیلا گیا - اس میں زنانہ اور مردانہ تمام کردار نوجوان پارسیوں نے ادا کیے -

عرصۂ دراز پہلے ۱۸۰۵ء میں انگریز حکام نے پارسی روساء کے اشتراک سے گرانٹ روڈ پر بمبئی تھیٹر کے نام سے ایک ہال تعمیر کرایا تھا - جہاں صرف انگریزی ڈرامے اسٹیج ہوتے تھے - ۱۸۵۳ء کے آخر میں اس ہال کا نام وکٹوریا تھیٹر رکھا گیا - اس کے جملہ انتظامات پارسیوں کے ہاتھ میں آگئے اور یہی ہال اردو اسٹیج کا سنگِ بنیاد ثابت ہوا -

ماہِ جون اور دسمبر ۱۸۵۳ء میں دو ڈرامے گجراتی میں لکھوائے گئے اور اردو میں ترجمہ ہوئے - یہ تھے[1] 'حاجی میاں فضل اور کامک للال خانہ'۔ اور (۲) 'پٹھان سرفراز اور گل' - ۱۸۵۵ء کے آخر میں ایک اور اردو کھیل 'فرنگی اور ہندوستانی طرز ہائے حکومت کا موازنہ' لکھا اور اسٹیج کیا گیا[2] ، یہ حکومتِ برطانیہ کی تعریف میں پروپیگنڈے کی غرض سے کھیلا گیا - جس کا مقصد انگریزی حکام کی خوشنودی حاصل کرنا تھا - تمام ڈرامے پوری طوالت کے نہیں تھے بلکہ ان کا کل دوران تقریباً دو تین گھنٹے تھا - ۱۸۵۹ء میں اسی طرز کا ایک اور اردو ڈراما 'نانا صاحب' زیر اہتمام وکٹوریہ کلب پیش کیا گیا - اس میں جنگِ آزادی (۱۸۵۷ء) میں انگریزوں کی فتحیابی اور نانا صاحب کی غداری کا نقشہ دکھایا گیا تھا - ۱۸۶۲ء میں 'پارسی وکٹوریہ کلب' قائم ہوا - تقریباً دو سال بعد اس کا نام 'وکٹوریہ ناٹک منڈلی' ہو گیا - لیکن اس کی حیثیت بھی اس وقت تک کلب کی تھی اور اس کے سیکرٹری کیخسرو تھے جو ۱۸۶۹ء تک اپنے فرائض بڑی تندہی سے انجام دیتے رہے - اور متعدد پارسی سیٹھ اس کے سرپرستوں منظموں اور اداکروں میں شامل تھے -

اردو پارسی تھیٹر کی ابتدائی کوششوں کے ضمن میں جمشید جی بستن جی کھمبانہ اپنی خود نوشت سوانح میں بیان کرتے ہیں[3] -

''گیارھویں کھیت واڑی کے نکڑ پر بدرالدین طیب جی کا ایک مختصر سا بنگلہ تھا - ہمنے اس میں اپنا اسٹیج بنایا - اس کے لیے تختے اور بنجیں استعمال

---

(۱) ڈاکٹر نامی : اردو تھیٹر (حصہ اول) بمبئی -
(۲) یہ کھیل زور آسٹرین کلب نے پیش کیا (اردو تھیٹر - ڈاکٹر نامی)
(۳) مخطوط نسخہ - موجودہ کتب خانہ بمبئی یونیورسٹی

کی گئیں ۔ اسٹیج کے دائیں بائیں ایکٹروں کے لیے کرسیاں رکھی جاتی تھیں جن پر بیٹھ کر وہ میک اپ کرتے اور لباس تبدیل کرتے ۔ تماشائی اپنے اپنے گھروں سے کرسیاں اور دستی پنکھے لاتے تھے ۔ اسٹیج کے لیے بینچیں ہرمزجی کے باغ سے لائی گئیں ۔ ایک مارواڑی کی دوکان سے ناریل کا تیل اودھار لیا ۔ پچاس مٹی کے سکور خریدے ۔ ان میں تیل ڈال کر روشنی کے کام میں لایا گیا ۔ ٹھیک سات بجے تماشا شروع ہوا"۔

(ب) پوری طوالت کے ڈرامے

۱۸۷۰ء سے پہلے کے اردو ڈراموں کا ذکر کرتے بعض تذکرہ نویسوں نے چند مرہٹی اور گجراتی ڈراموں کو بھی اس ذیل میں شامل کیا ہے ۔ جن کا کوئی مستند ثبوت دستیاب نہیں ۔ اس زمانہ میں بمبئی کے ایک لکھ پتی پارسی سیٹھ سہراب جی فریدون پٹیل کے اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان بیٹے دادا بھائی سہراب جی پٹیل ایم اے نے سیٹھ کروڑجی ناظر کے اشتراک سے 'الفنسٹن ڈرامیٹک منڈلی' کے نام سے باقاعدہ تجارتی تھیٹریکل کمپنی قائم کر لی ۔ ۱۸۷۰ء میں اداد بھائی پٹیل جو دادی پٹیل کے نام سے پکارے جاتے تھے ، 'پرنسیں ناٹک منڈلی' کے سکرٹری مقرر ہوئے ۔ انہوں نے اندازہ کیا کہ ڈرامے کے شائقین گجراتی مرٹھی اور انگریزی ڈراموں میں چنداں دلچسپی نہیں لے رہے ہیں ۔ اب مناسب ہوگا کہ اردو میں پوری طوالت کے ڈرامے پیش کیے جائیں جو تجارتی اغراض کے لیے فائدہ بخش ہوں گے ۔ چنانچہ 'شاہنامہ فردوسی' سے ماخوذ واقعات پر مبنی ڈراما 'رستم و سہراب' جمشید جی کھوری سے گجراتی میں لکھوا کر اردو میں ترجمہ کرایا ۔ یہی وہ زمانہ تھا ، جب کیخسرو کابراجی نے 'وکٹوریہ ناٹک منڈلی' کے سیکریٹری کے عہدے سے استعفیٰ دیا اور دادی پٹیل ان کی جگہ سکریٹری مقرر ہوئے ۔ انہوں نے ڈراما 'رستم و سہراب' اس منڈلی کے زیر اہتمام اسٹیج کرایا ۔ اور بالآخر یہ منڈلی خرید کر تمام ممبروں کو علیحدہ کر دیا جسے اپنی ملکیت میں خالص کاروباری حیثیت سے چلانے لگے ۔ اب دادی پٹیل کو نئے اردو ڈراموں کی ضرورت ہوئی ۔ انہوں نے اپنے دوست ایڈل جی جمشید کھوری سے جو گجراتی زبان کے مشہور ڈراما نویس تھے ۔ گجراتی میں ایک پوری طوالت کا ڈراما 'سونا ناسولنی خورشید' لکھوایا ۔ اس کا پلاٹ ایک ہندی ناول 'کاما وتی' سے ماخوذ تھا جس ہندو معاشرت کا خاکہ پیش کیا گیا ہے ۔ اس کے اردو ترجمہ کے لیے دادی پٹیل نے سیٹھ بہرام جی فریدون جی مرزا جان کا انتخاب کیا ۔ یہ اردو فارسی میں خاصی استعداد رکھتے تھے اور گجراتی کے مشہور ادیب ہونے کی ساتھ گجراتی اخبار 'راست گفتیار' (بمبئی) کے اڈیٹر تھے ۔ انہیں ڈرامے اور اسٹیج سے خاص لگاؤ تھا اور بمبئی کے کئی پارسی

ڈریمیٹک کلبوں کے رکن رہ چکے تھے - اردو زبان میں شعر بھی کہتے تھے - اسی زمانہ میں کئی مسلمان ادیب ڈھاکہ سے بمبئی آ چکے تھے اور بہرام جی نے ان میں سے کسی ایک سے تلمذ اختیار کر لیا تھا - چنانچہ گمان غالب ہے کہ ڈراما 'خورشید'[1] کے اردو ترجمہ میں کسی استاد کا اہم حصہ تھا - غرضیکہ یہ ڈراما کھیلا گیا اور قبولیت عام حاصل کرنے میں کامیاب ہوا - دادی پٹیل کا بھی حوصلہ بڑھا اور دوسرے پارسی سیٹھوں کو بھی اردو ڈرامے کی طرف متوجہ ہونے کی ترغیب ملی - لیکن ڈراما 'خورشید' نہ کسی لحاظ سے اردو کا پہلا ڈراما تسلیم کیا جا سکتا ہے اور نہ اسے بنیادی طور پر اردو کا طبعزاد ڈراما کہلائے جانے کا حق ہے - 'اندر سبھا' پر اس ڈرامے کو اولیت حاصل ہے تو صرف اس لحاظ سے کہ اس کے مکالمے نثر میں ہیں اور 'اندر سبھا' منظوم ناٹک ہے - ڈراما 'خورشید' کو اردو کے کلاسیکی ادب میں شامل کرنا بھی درست نہیں ہے جبکہ وہ پہلے گجراتی زبان کے کلاسیکی ادب میں شمار ہوا اور بعد میں گجراتی و مرہٹی آمیز اردو میں منتقل کیا گیا -

۱۸۵۷ء کے بعد ڈرامے کی ترقی اور اس کے اسباب

برصغیر[2] پاکستان و ہند میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے دوران جو ملک گیر بے چینی اور افرا تفری پائی جاتی تھی ، ۱۸۵۸ء کے آخر میں حکومت برطانیہ کی فتحیابی کے بعد اس میں خاصی کمی پیدا ہونے لگی - خصوصاً غیر مسلم طبقے انگریزوں کی وفاداری کا دم بھرنے میں مصروف تھے - بمبئی کے پارسی سیٹھوں نے اس دوران میں اردو تھیٹر کو تجارتی اغراض و مقاصد کے لیے خاص ذریعہ قرار دیا - کیونکہ اس سے ان کے تفریحی مشاغل کی بھی تکمیل ہوتی تھی اور کار و باری فروغ کا موقعہ بھی میسّر آتا تھا -

۱۸۵۸ء سے ۱۸۷۰ء تک جو اردو ڈرامے اسٹیج کیے گئے ان کی پوری تعداد اور ناموں کی تفصیل مستند طور پر معلوم نہیں ہوئی - لیکن یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ چکا ہے کہ یہ سب کے سب گجراتی میں تصنیف کیے گئے اور بعد میں اردو زبان میں منتقل ہوئے - دادا بھائی پٹیل نے ۱۸۷۰ء میں ڈراما 'خورشید' کی کامیابی اور شہرت سے سب سے زیادہ فائدہ اٹھایا اور اپنی تمام توجہ اردو ڈراموں کی طرف مبذول کر دی ، گو ان کی کوششوں کو بعض پارسیوں نے بری نظر سے

---

(۱) امتیاز علی تاج (مرتب) خورشید (اردو کا کلاسیکی ادب)

(۲) عشرت رحمانی ، اردو ڈراما کا ارتقا -

ڈاکٹر نامی ، اردو تھیٹر (حصہ دوم) -

دیکھا اور انہیں براہِ راست گجراتی زبان کی ترقی میں رکاوٹ سمجھا ۔ لیکن پٹیل نے کسی مخالفت کی پرواہ نہ کی اور اردو تھیٹر کی ترویج و ترقی کے انتظامات میں مصروف ہو گیے ۔ چنانچہ پٹیل نے ایدل جی کھوری سے ایک اور ڈراما 'نور جہان' گجراتی زبان میں لکھوا کر پارسی نوجوان خانصاحب نروان جی ہنروان جی آرام سے اردو میں ترجمہ کرایا ۔ آرام صاحب ِ ذوق تعلیم یافتہ پارسی تھے ۔ جنہیں اردو شعر و ادب سے خاص دلچسپی تھی ۔ منشی احمد حسن وافر جو ڈھاکہ سے بمبئی آ گئے تھے ، آرام نے شعری میں ان سے تلمذ اختیار کر لیا اور ان سے نہ صرف ڈراما 'نور جہان' کے ترجمہ میں امداد حاصل کی ، بلکہ اپنی دوسری تصانیف میں بھی انہیں سے استفادہ کیا ۔ (ڈراما نور جہان کے مکالمے بھی نثر میں ہیں) ۔ کچھ عرصہ بعد دادی پٹیل اور کنور جی ناظر میں اختلافات پیدا ہو گئے اور وکٹوریہ ناٹک منڈلی پٹیل کی واحد ملکیت ہو گئی ۔ انہوں نے ۱۸۷۲ء میں آرام سے ایک منظوم ڈراما 'بے نظیر بدرِ منیر' لکھوایا ۔ اور نئی پارسی اداکاروں کی خدمات حاصل کرکے وکٹوریہ تھیٹر میں اسے اسٹیج کیا ۔ اس ڈرامے میں خورشید جی پالیوالا کے والد ہنروان جی بابا نے دیوان نجومی کا کردار بڑی خوبی سے ادا کیا ۔ یہ خود گانا نہ جانتے تھے ۔ ان کا گانا ان کے بیٹے خسرو قباد نے پسِ پردہ گایا جو بےحد مقبول ہوا ۔ نروان جی منشی نے ماہ رخ کا پارٹ کیا اور خاص شہرت حاصل کی ۔ چنانچہ مدتِ دراز تک پارسی اسٹیج کے ڈراموں میں زنانہ کردار پارسی نوجوان ہی ادا کرتے تھے اور عرصہ تک یہ روایت قائم رہی ۔

بعد ازاں دادی پٹیل نے آرام سے نیا اردو ڈراما 'حاتم طائی' تصنیف کرایا اور اعلان کیا کہ وہ خود شہزادہ منیر شامی کا کردار ادا کریں گے ۔ اس اعلان سے پارسی طبقہ میں ہنگامہ بپا ہو گیا کیونکہ پٹیل اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ عالی مرتبت خاندان کے چشم و چراغ اور دونڑوں کے رئیس تھے ۔ قدامت پرست پارسی اداکاری کو خلافِ شان سمجھتے تھے ۔ اس مخالفانہ شور و غل کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس ڈرامے کی بڑی شہرت ہو گئی اور مقررہ تاریخ و وقت پر وکٹوریہ تھیٹر کا ہال تماشائیوں سے کھچا کھچ بھر گیا ۔ اس ڈرامے میں پٹیل نے مناظر کی تبدیلی اور آراستگی میں مشینوں سے کام لیا تھا ۔ بہت سے لوگ پٹیل کی اداکاری پر نکتہ چینی کے خیال سے آئے تھے ۔ لیکن اس نے اس شان سے اپنا کردار ادا کیا کہ عام تماشائی اور مخالفین اسے دیکھ کر مبہوت رہ گئے اور سب نے متفقہ طور پر دل کھول کر داد اور مبارکباد دی ۔ پٹیل کے بعد اس ڈرامے میں دھنجی بھائی ماسٹر عرف پالکی والا نے حیرت انگیز اداکاری کا مظاہرہ کیا ۔

اور دادا بھائی رتن جی ٹھونٹھی نے اپنے طویل فنّی تجربہ اور انتظامی لیاقت سے مدد لی اور اس کے اسٹیج کی آراستگی میں بڑی مدد دی ۔

مشہور تھیٹر کمپنیاں

اردو ڈرامے کی کامیابی اور مقبولیت کو دیکھ کر کئی اور پارسی سیٹھوں نے کمپنیاں بنا ڈالیں اور مشینوں کے استعمال شروع کیے ۔ اب اردو تھیٹر اور ڈرامے کی تجارتی ترقی کے لیے نئی راہیں کھلنے لگیں اور اسٹیج میں بڑی بڑی جدتیں پیش کی جانے لگیں ۔ ان میں حسب ذیل کمپنیاں زیادہ مشہور ہیں ۔

(۱) **پارسی وکٹوریہ ناٹک منڈلی** - (۱۸۶۹ء سے ۱۸۸۰ء تک) مالک و ڈائرکٹر دادا بھائی سہراب جی پٹیل ایم ، اے ۔ بعد میں خورشید جی بالیوالا اور دادا بھائی رتن جی ٹھونٹھی نے بھی اس کا انتظام سنبھالا اور ترقی دی ۔ خان صاحب نروان جی مہرواں جی ارام اس کمپنی کے ڈراما نگار تھے ۔ ان کے بعد چند اور ڈراما نگار بھی شامل ہوئے ۔

(۲) **پارسی اوریجنل تھیٹریکل کمپنی** - (۱۸۷۹ء) مالک و ڈائرکٹر پسٹن جی فرام جی المتخلص بہ رنگ و پروین ۔ یہ منشی نواب علی نفیس کانپوری کے شاگرد تھے ۔ جو ڈھاکہ سے بمبئی آ کر مقیم ہوئے اور مشرق بنگال کے اردو ڈرامے اپنے ساتھ لائے تھے ۔ اس کمپنی کے خاص ڈراما نویس حسینی میاں ظریف تھے ۔ پسٹن جی بڑے اعلیٰ منتظم اور نامور فنکار تھے ۔ ملکہ وکٹوریہ کی جوبلی کے موقع پر وہ اس کمپنی کو لندن لے گئے اور وہاں زر کثیر صرف کر کے بڑے شان و اہتمام سے کئی ڈرامے اسٹیج کیے ۔

(۳) **وکٹوریہ ناٹک کمپنی** - زیرِ اہتمام خورشید جی بالیوالا و دادا بھائی رتن جی ٹھونٹھی (۱۸۸۰ء) ۔ اس کمپنی کے خاص ڈراما نگار منشی محمود میاں رونق بنارسی اور منشی و ناٹک پرشاد طالب بنارسی تھے ۔ بالیوالا اعلیٰ فنکار اور صاحبِ ذوق مخیّر انسان تھے ۔ انہوں نے تھیٹر کی ترقی کے لیے بڑی محنت کی ۔

(۴) **الفریڈ تھیٹریکل کمپنی** - بمبئی (۱۸۹۶ء تا ۱۹۱۹ء) ۔ زیرِ اہتمام کاؤس جی کھٹاؤ جی ۔ اس کمپنی کے خاص ڈراما نویس کریم الدین مراد اور منشی مہدی حسن احسن لکھنوی تھے ۔ بعد میں آغا حشر کاشمیری اور پنڈت

بیتاب بنارسی بھی شریک ہوئے ۔ لاہور میں یہ کمپنی ۱۹۱۴ء میں اپنے کھیل دھوم دھام سے دکھا رہی تھی کہ اس دوران میں کاؤس جی گھٹاؤس جی نے وفات پائی اور ان کے بیٹے جہانگیر جی نے کمپنی کا انتظام سنبھالا ۔ پانچ سال بعد کلکتہ کے مشہور پارسی کروڑ پتی تاجر سیٹھ میڈن کے ہاتھ یہ فروخت کر دی ۔

(۵) **نیو الفریڈ تھیٹریکل کمپنی** ۔ بمبئی (۱۹۱۴ء تا ۱۹۲۳ء) ۔ محمد علی ناخدا نے الفریڈ تھیٹریکل کمپنی کی شہرت اور کامیابی سے متاثر ہو کر اس نام سے اپنی کمپنی قائم کی اور مشہور پارسی اداکار سہراب جی کو مہتمم اور ڈائرکٹر مقرر کیا ۔ اس کمپنی کے خاص ڈراما نویس آغا حشر کاشمیری تھے ، جن کے ڈراموں کی کامیابی اور شہرت کے سبب کمپنی کو بڑا عروج حاصل ہوا ۔ بعد میں سہراب جی کی بیرانہ سالی کے سبب کمپنی احمد آباد ، (گجرات) میں مستقل طور پر قیام پذیر ہوئی اور وہیں ختم ہو گئی ۔

(۶) **اولڈ پارسی تھیٹریکل کمپنی** ۔ بمبئی ۱۸۹۷ء میں شروع ہوئی مالک و ڈائرکٹر ، ممتاز پارسی فنکار سیٹھ ارد شیر بھائی ٹھوٹلھی ۔ یہ کمپنی اس دور کے مختلف مشہور مصنّفین کے ڈرامے اسٹیج کرتی تھی ۔ ۱۹۰۱ء میں اس نے پنجاب کا دورہ کیا ۔ امرتسر کے قیام کے دوران سب منڈوے میں لاکھوں آگ لگ گئی ۔ تمام ساز و سامان جل کر خاکستر ہو گیا ۔ کچھ عرصہ بعد ارد شیر بھائی نے ہمت کرکے از سر نو کمپنی کو آراستہ پیراستہ کیا اور پھر یہ کئی سال تک کامیابی سے چلتی رہی ۔

ان مشہور کمپنیوں کے چرچے سن کر اور شان و شوکت دیکھ کر ملک کے مختلف شہروں میں متعدد کمپنیاں قائم ہوئیں ۔ انیسویں صدی کے آخر میں رامپور (یو ۔ پی) میں نواب جنّت مکان حامد علیخان المتخلص بہ رشک نے لاکھوں روپے کے صرف سے قلعہ معلیٰ کے بالمقابل شاندار تھیٹر ہال تعمیر کرایا اور سرکاری تھیٹر کمپنی قائم کرکے دور دور سے مشہور ایکٹر ، ایکٹریس بلائیں ، جو گراں قدر مشاہرہ پر ملازم ہو کر اداکاری کے فرائض انجام دیتی رہیں ۔ ریاست کے ہوم سیکرٹری صاحبزادہ محمود علی سرکاری کمپنی کے منتظمِ اعلیٰ تھے ۔ جب یہ کمپنی برطرف کی گئی تو محمود علی چند ماہ بعد اس کے ممتاز فنکاروں کو جمع کرکے دہلی لے گئے اور وہاں اپنی جوبلی تھیٹریکل کمپنی

قائم کر لی ۔ عباس علی عباسی اس کمپنی کے چیف ایکٹر اور ڈائرکٹر تھے ۔ اس کمپنی کے دو ڈرامے 'جام جہاں نما' اور 'گل رو زرینہ' زیادہ مشہور و مقبول تھے ۔ ان دونو ڈراموں کے مصنف مرزا کاظم علی برلاس مراد آبادی تھے ۔ لیکن معمولی رد و بدل کے ساتھ سید عباس علی ان کو اپنے نام سے اسٹیج کرتے رہے ۔

دوسری مشہور تھیٹر کمپنیوں میں سے چند قابل ذکر حسب ذیل ہیں ، جو اپنے اپنے دور میں شہرت حاصل کرکے زمانہ کے ساتھ ختم ہو گئیں ۔

(۱) دی راجپوتانہ مالوہ تھیٹریکل کمپنی جودھپور ۔

(۲) لائٹ آف انڈیا تھیٹریکل کمپنی ۔ آگرہ (مہتمم : حافظ محمد عبداللہ) ۔

(۳) بے نظیر سٹار آف انڈیا تھیٹریکل کمپنی ۔ علی گڑھ و آگرہ ۔ (مہتمم : نظیر بیگ نظیر) ۔

(۴) انڈین امپیریل تھیٹریکل کمپنی ۔ فتح پور (مہتمم : حافظ محمد عبداللہ) ۔

(۵) دی سون آف انڈیا تھیٹریکل کمپنی ۔ حیدر آباد دکن (مہتمم : مدنی نواب) ۔

(۶) میڈن تھیٹرز لمیٹڈ (کلکتہ و بمبئی) ۔ اس کے زیر اہتمام کئی تھیٹر کمپنیاں تھیں ۔

(الف) پارسی کورنتھین تھیٹریکل کمپنی کلکتہ ۔ (ب) الفنسٹن تھیٹریکل کمپنی ۔ (ج) الفریڈ تھیٹریکل کمپنی ۔ بمبئی ۔

(۷) شیکسپیئر تھیٹریکل کمپنی ۔ بمبئی ۔ (مہتمم : وی ۔ کے ۔ نائک) ۔

(۸) جمعدار تھیٹریکل کمپنی ۔ حیدر آباد دکن (یہ جمعدار کی کمپنی کے نام سے مشہور تھی) ۔

(۹) امپریل تھیٹریکل کمپنی ۔ بمبئی ۔

(۱۰) پارسی الگزینڈرا تھیٹریکل کمپنی ۔ دہلی (مالک و مہتمم : سیٹھ حبیب) ۔

(۱۱) البرٹ تھیٹریکل کمپنی آف پنجاب (مہتمم : ماسٹر رحمت علی رحمت) ۔

(۱۲) بیاکل عبارت تھیٹریکل کمپنی ۔ میرٹھ (جیشور پرشاد مائل دہلوی اس کے خاص ڈراما نگار تھے) ۔

(۱۳) بال روم تھیٹریکل کمپنی ۔ حیدر آباد دکن (مہتمم : ماسٹر ابراہیم) ۔

(۱۵) انڈین شکسپیئر تھیٹریکل کمپنی - بمبئی (مالک و مہتمم : آغا حشر کاشمیری) -

(۱۵) گلوب تھیٹر (پنجاب) لاہور -

(۱۶) سوریہ وجے ناٹک کمپنی - بریلی (مہتمم و مصنف رادھے شیام) -

(۱۷) پریم برچارنی ناٹک منڈلی - لاہور (مالک و مہتمم : لال، نانک چند) -

(۱۸) پنجاب رنگ رس کلب - لاہور - (مہتمم : آغا رحمت علی) -

(۱۹) مہاراجہ چرکھاری کی سرکاری تھیٹر کمپنی - چرکھاری -

(۲۰) محبوب جان کی تھیٹر کمپنی - دہلی -

(۲۱) جہاں آرا تھیٹریکل کمپنی - کلکتہ (مالک و مہتمم : جہاں آرا کجن فلم سٹار) -

یہ تمام کمپنیاں ۱۹۱۴ء سے ۱۹۳۵ء کے دوران قائم ہوئیں اور بند ہوتی گئیں -

قدیم دور کے ڈرامائی عناصر اور اسٹیج کی ترقی

اردو ڈرامے اور تھیٹر کی ترویج و ترقی کے سلسلہ میں پارسیوں کی مساعی اور انہاک کا بڑا حصہ رہا - گو ان کا مقصد خالص تجارت تھا ، تاہم ان کے زیر اثر فنی خدمات انجام دینے والے ڈراما نگار ، منتظمین اور فنکار اپنی اپنی صلاحیتوں کے لحاظ سے ہر دور میں قابلِ قدر کوششوں میں مصروف رہے اور اپنے اپنے عہد میں انہوں نے نمایاں کارنامے انجام دے - البتہ ان ڈراموں میں ملکی اور قومی زندگی اور سماجی کشمکش سے کوئی تعلق نہ تھا - جن تھیٹروں میں یہ ڈرامے دکھائے جاتے تھے ، موضوعات کے لحاظ سے ان کی کوئی قومی یا تہذیبی اہمیت نہیں تھی ، بلکہ یہ صرف نئے تجارتی مرکزوں کی تفریح گاہ تھے اور اسی لیے کسی بڑے ادیب نے اس ادب سے کوئی دلچسپی نہیں لی - ان ڈراموں میں فکری گہرائی اور نئی جدت یا حیاتِ معاشرہ کی کوئی خاص عکاسی نظر نہیں آتی تھی - ظاہری چمک دمک میں خاصی ترقی ہوئی - اس اسٹیج کا مطمحِ نظر خاص طور پر عوامی تفریح تھا ، اس لیے اوسط درجہ کے شاعر اور منشی قسم کے ادیب محض اجرت حاصل کرنے کی غرض سے ڈراما نگاری کے تجارتی میدان کے مردِ نیے رہے - ہدایت کار زیادہ تر معمولی اردو دان ، مالکان کمپنی کی اکثریت پارسی اور اکثر فنکار ان پڑھ یا ادنیٰ درجہ کے اردو خواں اصحاب تھے اس لیے ڈراموں کی عام زبان فصاحت و شستگی سے عاری تھی - جس کی نسبت نامور فلسفی ادیب ڈاکٹر مرزا ہادی رسوا لکھنوی

کی رائے تھی کہ ''یہ بولی ٹھولی بمبئی کی دساور معلوم ہوتی ہے'' ۔ معمولی طور پر ان ڈراموں میں نظم اور گانوں کا حصہ زیادہ ہوتا تھا ۔ یہی سبب ہے کہ ڈراما نگار کا فن اور ادب سے اتنا تعلق رکھنا ضروری نہ تھا ، جتنا کہ تکبند اور شاعر ہونا ۔ انفرادی طور پر بعض ڈراما نگاروں نے اسلوب اور زبان میں ترقی کے آثار پیدا کرنے میں کسی قدر کامیابی حاصل کی ۔ لیکن کسی معیار کی عدم موجودگی میں ایسے تفریحی پہلو کو زیادہ دخل تھا جس میں خالص جذباتی قسم کے ادا ر ، ساز و سامان کی بے جا چمک دمک، اور بعض اداکاروں خصوصاً گلوکاروں کی ہر دلعزیزی کو اہمیت حاصل ہوتی تھی ۔ اگر کوئی ڈراما نگار مروّجہ اسلوب اور مقبول روش سے گریز کرکے کسی خاص تبدیلی اور ترقی کی طرف قدم بڑھانا چاہتا تو تھیٹر کے مالکان اور کارپرداز اپنی ضروریات اور کاروباری اغراض کے مطابق انھیں گوارا نہ کرتے ، بلکہ حسبِ ضرورت چند تبدیلیاں کرکے زیادہ عامیانہ بنانے کی کوشش کرتے ۔ اس نیم معمولی صلاحیتوں کے ڈراما نگاروں کے علاوہ اعلیٰ صلاحیتوں کے مالک ادیب بھی تھیٹر کی ڈراما نگاری میں خود کو عوام کے تفریحی معیار سے بلند نہ کر سکے ۔ کیونکہ تھیٹر کے کارپرداز عالمی ادب میں ڈراما نگاری کی تاریخ اور دورِ جدید کی فنّی اقدار سے ناواقف تھے ، ان کی نگاہیں زندگی کی گہری اور بنیادی حقیقتوں سے نا آشنا تھیں ۔ ان وجوہ کی بنا پر اردو ڈراما اور تھیٹر کا عام معیار کسی بڑی ترقی کا ضامن نہ بن سکا اور دورِ جدید میں تعلیم و تہذیب کی رفتار ترقی کی ہمسری نہ کر سکنے کے سبب زوال پذیر ہو کر دم توڑنے پر مجبور ہو گیا ۔ پارسی سیٹھ جن کی اکثریت اس تھیٹر کی اجارہ دار تھی ۔ ڈراما اور اسٹیج کو نئے موڑ پر لانے کی ضرورت نہ سمجھتے تھے، کیونکہ ان کو تفریحی تجارت کے لیے فلم کا نیا میدان مل گیا ۔ آخرکار اسٹیج کی روشنی گل ہو گئی ۔

ڈرامے کے موضوعات

اردو ڈراما اور تھیٹر کی ابتدائی نشوونما اور ترویج و ترقی کی روایت میں برّصغیر پاکستان و ہند کے مقامی عناصر لوک کہانیاں ، سنسکرت ناٹک ، راس لیلا نیلائین ، لیلائین یاترا اور کٹھ پتلیاں وغیرہ کی اجزائی تراکیب شامل رہیں ۔ لیکن تجارتی تھیٹر کے ڈراموں میں خالص مغربی اثر کار فرما ہوا ، چنانچہ ان ڈراموں کی تقسیم موضوع کے اعتبار سے حسب ذیل کی جاتی ہے :

(۱) منظوم ڈرامے (ابتدائی دور کے سنگیت ناٹک ، اندر سبھا ، ناگر سبھا ، فرخے سبھا اور دوسری سبھائیں ۔ ان کے علاوہ اردو مثنویوں پر مبنی ناٹک جن میں 'بے نظیر بدرِ منیر' وغیرہ شامل ہیں ۔ جن میں دیو اور پریوں

کے کردار خاص تھے اور ان کے مقام طلسماتی تھے۔ ان کے اسٹیج کیے جانے میں مشینوں اور مناظر کی رنگا رنگی سے بہت کام لیا گیا۔

(۲) روحانی ڈراما۔ اس میں ابتدائی طور پر ہندو دیو مالا سے متعلق دھارمک ناٹک پیش کیے گئے۔ جو رامائن، مہابھارت اور دوسرے واقعات پر مبنی تھے۔ بعد میں اسلامی عقائد سے متعلق نیم تاریخی یا تبلیغی داستانوں پر منطبق ڈرامے بھی لکھے گئے۔ جن میں 'نورِ عرب'، 'حورِ عرب'، 'نورِ اسلام' 'سلطان صلاح الدین'۔ 'محمد بن قاسم' اور 'طارق بن زیاد' وغیرہ خاص ہیں۔ یہ دونوں طرز کے ڈرامے عوام میں بیحد مقبول ہوئے اور تھیٹر کے آخری دور تک یکساں مقبولیت کے ساتھ کھیلے جاتے رہے۔

ایرانی قصص

ایران کی قدیم تاریخ سے اخذ کر کے 'شاہنامہ' فردوسی' پر مبنی واقعات کو بھی تمثیلی انداز میں پیش کیا گیا۔ کیونکہ پارسیوں نے اپنی ابتدائی تاریخ کے ابواب کو زندہ رکھنے اور انہیں شاندار انداز میں دکھانے کی غرض سے اسٹیج کرنے کو اپنا قومی فریضہ سمجھا۔ ان ڈراموں میں 'رستم سہراب'، 'بیژن منیژہ' وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

سماجی اصلاحی ڈرامے

ابتدائی دور کے جن پریوں سے متعلق طلسماتی کھیل دیکھتے دیکھتے شائقین تھک چکے تھے اور مذہبی ڈراموں کے لیے موضوع زیادہ وسیع نہ تھا، اس لیے بعض ڈراما نگاروں نے اپنے ملک کے معاشرتی قبائح، شراب نوشی، قمار بازی اور دوسری مذموم و مضر رسوم و عادات پر مبنی پلاٹ تیار کر کے ڈرامے لکھے۔ جو پسند کیے گئے، اس سلسلہ میں بعض مغربی ڈراموں کے چربے بھی تھے جن کے نام و مقام اور فضا تبدیل کر کے مقامی رنگ میں پیش کیا گیا۔ طالب، احسن، بیتاب اور سب سے زیادہ آغا حشر نے اصلاحِ معاشرت پر مبنی کامیاب ڈرامے تصنیف کیے۔

مغربی ادب سے اخذ و ترجمہ

اس سلسلہ میں سب سے زیادہ تراجم ولیم شیکسپیر کے ڈراموں کے ہیں۔ گو دوسرے مشہور مغربی ڈراما نگاروں اور افسانہ نویسوں کی تصانیف سے بھی اردو

ڈراموں کے اخذ و ترجمہ میں خاصی مدد لی گئی۔ لیکن شیکسپیئر کے اکثر ڈرامے بمبئی اور کلکتہ میں اسٹیج ہوتے رہے تھے۔ اس لیے انہیں اردو لباس میں پیش کرنا نسبتاً آسان تھا۔ چنانچہ شروع سے آخر تک شیکسپیئر کے ڈراموں کی تعداد سب سے زیادہ اخذ و ترجمہ میں شامل رہی۔ کئی کئی ڈراما نگاروں نے ایک ایک ڈرامے کے پلاٹ سے اخذ کر کے اپنے اپنے طرز میں نئے ڈرامے لکھے۔ انگریزی ڈراموں سے ماخوذ بہتر انداز کے کھیل پیش کرنے کی مایاں قدر خدمت کاؤس جی کھٹاؤس نے منشی احسن سے شیکسپیئر کے کئی ڈراموں کے پلاٹ کے اخذ و تصرف سے نئے ڈرامے لکھوائے جن کے مکالموں کی زبان فصیح اور ڈرامائی تدبیر کاری بہتر تھی۔ اس کے بعد آغا حشر نے اس کام کو زیادہ خوبی اور خوش اسلوبی سے انجام دیا اور ان میں سے اکثر ڈراموں کو اپنی طرز سے لکھ کر نقل کو اصل کر دکھایا۔

سیاسی ڈرامے

اردو اسٹیج کا پہلا سیاسی ڈراما 'فرنگی اور ہندوستانی طرزِ حکومت کا موازنہ تھا'۔ اس کے بعد 'نانا صاحب' لکھا گیا۔ پھر ایک عرصہ تک اس موضوع پر کوئی ڈراما نہیں لکھا گیا۔ بعد ازاں برصغیر میں سیاسی جد و جہد اور تحریکِ آزادی کے عروج کے دوران یکے بعد دیگرے کئی تھیٹر کمپنیوں نے اپنے ڈراما نگاروں سے اس موضوع پر نئے نئے کھیل لکھوائے اور خاص اہتمام سے پیش کیے[1]۔

مجلسی ڈراما

اردو کے چند مستند ادیبوں نے دورِ قدیم کی تھیٹر کمپنیوں میں اسٹیج کیے جانے والے اردو ڈرامے دیکھے۔ انہوں نے ان ڈراموں کی زبان (نظم و نثر) کی پستی کا اندازہ کیا اور خیال پیدا ہوا کہ ان کی اصلاح کے لیے کوشش کی جائے۔ چنانچہ چند ایسے ڈرامے لکھے گئے جن کی ادبی حیثیت مسلّم تھی۔ پلاٹ میں تہذیبی معیار کو ملحوظ رکھا گیا اور مکالموں میں شستگی اور فصاحت تھی۔ مقفیٰ و مسجع عبارت آرائی، بے جا شعر خوانی اور گانوں کو یک قلم موقوف کر کے سلیس اور با محاورہ زبان کا استعمال کیا گیا۔ لیکن ان ڈراموں کی بیئت تجارتی اسٹیج کے لیے قطعاً فائدہ بخش نہ تھی۔ اس لیے کسی تھیٹر کمپنی نے ان میں سے کسی ڈرامے کو اسٹیج کرنے کے لیے قبول نہ کیا۔ ان کی حیثیت زیادہ تر ادبی تھی جو کتابی صورت میں شائع ہوئے اور شائقینِ ادب نے دلچسپی کے لیے پڑھ لیے۔ چونکہ یہ

---

(۱) عشرت رحمانی، اردو ڈراما تاریخ و تنقید۔

انشا پرداز اپنے دور کے لاہور اور مسلّم ادیب ضرور تھے ، لیکن فنِ تمثیل سے ناواقف اور ڈرامائی لوازم پر عبور نہ رکھتے تھے ، اس لیے فنّی لحاظ سے ان کی تصانیف میں کوئی ہیئتی تبدیلی یا تدبیر کاری ایسی نہ تھی جو اردو ڈراما نگاری اور تھیٹر میں کوئی انقلابی تبدیلی پیدا کرنے کا موجب ثابت ہو سکتی - اس لیے بھی اسٹیج کے کار پرداز ان کی طرف متوجہ نہ ہوئے اور ہم وقتی طور پر قارئین کی تفریح کے سوا تمثیل گری کا عملی نمونہ نہ بن سکے - اس لحاظ سے ان کی روایت محض مجلسی تمثیل کی ہے -

محمد حسین آزاد

شمس العلماء[1] مولانا محمد حسین آزاد دہلوی کا نام اس ضمن میں سرِ فہرست ہے - آزاد اردو کے صاحبِ طرز انشا پرداز جدید طرزِ شاعری کے بانیوں میں شمار ہوتے ہیں - وہ مستند مؤرخ اور نقاد بھی تھے - پنجاب کے دورانِ قیام میں انہوں نے شکسپیئر کے مشہور ڈرامے 'میکبتھ' کا اردو ترجمہ کیا - جس کا کچھ حصہ لاہور کے ایک اخبار میں شائع ہوا ، لیکن یہ آزاد سے مکمل نہ ہو سکا - بعد ازاں مولانا نے ایک نیم تاریخی ڈراما 'اکبر' لکھنا شروع کیا اس کا پلاٹ شہنشاہ اکبرِ اعظم کے دور میں شہزادہ جہانگیر اور ملکہ نور جہاں کی داستانِ معاشقہ پر مبنی ہے - یہ ڈراما مکمل نہ ہونے پایا تھا کہ آزاد مرضِ جنون میں مبتلا ہو گئے اور ڈراما ادھورا رہ گیا - جو عرصۂ دراز بعد ان کے شاگردِ رشید خواجہ ناصر نذیر فراق دہلوی نے مکمل کیا - اس ڈرامے کی زبان ادبی لحاظ سے فصیح و سلیس ہے - لیکن مکالموں میں خطاب و طوالت نے اثر کم کر دیا ہے - بعض اور فنّی خامیاں بھی نمایاں ہیں - آخری حصہ محض داستان سرائی کی حیثیت رکھتا ہے - ڈرامائیت نام کو بھی نہیں ہے -

مرزا رسوا لکھنوی (۱۸۵۸ء - ۱۹۳۱ء)

مرزا محمد ہادی لکھنؤ کے قدیم مغل خاندان سے تعلق رکھتے تھے - اردو ، فارسی ، عربی ، انگریزی اور عبرانی زبانوں میں کامل دستگاہ رکھتے - علومِ فلسفہ ، نجوم اور ہیئت میں بھی مہارتِ تامہ حاصل تھی - مرزا صاحب شیوا بیان ادیب ہونے کے ساتھ پرگو شاعر تھے - شاعری میں مرزا اور رسوا تخلص کرتے تھے - اردو ناول نگاری میں ان کا مقام بلند ہے - ان کے متعدد ناولوں میں 'امراؤ جان ادا' ، 'شریف زادہ' اور 'خورشید' بہت مقبول ہیں - غزل گوئی کے علاوہ رسوا نے دو مثنویاں

---

(۱) سکسینہ ، رام بابو ، تاریخ ادب اردو -

'نوبہار' اور 'صبحِ امید' بھی لکھی ہیں ۔ تھیٹر کے اصلاح کے خیال سے رسوا نے دو ڈرامے بھی لکھے ۔ ان میں ایک منظوم ڈراما 'لیلیٰ مجنوں' اور دوسرا 'طلسمِ اسرار' ہے ۔ 'لیلیٰ مجنوں' میں متعدد بحروں کے استعمال کے جدید اور دلکش تجربے کیے گئے ہیں ۔ ڈراما 'طلسمِ اسرار' کا پلاٹ افلاطون کے فلسفہ مظاہرِ قدرت کے رموز و نکات پر مبنی ہے ۔ اس کی زبان فصیح و بلیغ فلسفیانہ ہے ۔ ان دونوں ڈراموں میں سے ایک بھی اسٹیج نہ ہو سکا ۔

امراؤ علی

(ولادت و وفات نا معلوم) لکھنؤ کے معزز خاندان کے تعلیم یافتہ فرد تھے ۔ عنفوانِ شباب میں تھیٹر اور ڈرامے کا ایسا چسکا پڑا کہ تعلیم سے کنارہ کشی کرکے گھر بار سے منہ موڑ اداکاری کا پیشہ اختیار کر لیا ۔ ۸۹ - ۱۸۹۰ء کے دوران بمبئی کی کئی پارسی تھیٹر کمپنیوں میں فنکار کی حیثیت سے کام کرتے اور شائقین سے داد لیتے رہے ۔ ۱۸۹۰ء میں ایک سیاسی ڈراما 'البرٹ بل' تصنیف کیا ۔ اس کا پلاٹ اس زمانہ کی ایک مشہور سیاسی قرارداد (Bill) کی حمایت میں لکھا گیا تھا ۔ ان دنوں وائسرائے کی کونسل کے ایک انگریز رکن سر البرٹ نے بل پیش کیا تھا کہ ہندوستانی مجسٹریٹوں کو انگریز ملزموں کے مقدمات فیصل کرنے کا مجاز قرار دیا جائے ۔ ہندوستان کے انگریز باشندوں نے اس کے خلاف سخت احتجاج کیا ، لیکن یہ بل معمولی ترمیم کے بعد منظور ہو گیا ۔ اس ڈرامے کی زبان سلیس تھی ، لیکن مکالمے طویل اور سیاسی واقعات کی بنا پر غیر دلچسپ اندازِ بیان کی وجہ سے اسٹیج کیے جانے کے لائق نہ سمجھا گیا ۔ اس کی ڈرامائی تدبیرکاری اور فنی لوازم بھی کمزور ہیں ۔

اس کے بعد امراؤ علی خان نے شکسپیئر کے ڈراما 'ہملیٹ' کے پلاٹ پر ایک ڈراما 'جہانگیر' لکھا اور ۱۸۹۵ء میں ایک طبعزاد ڈراما 'رزم بزم' تصنیف کیا ۔ یہ اسٹیج ہوا لیکن کامیاب نہ ہو سکا ۔

ان کے علاوہ ۱۸۹۲ء میں احمد حسین خان (لاہور) نے شکسپیئر کے ڈراما 'اوتھیلو' سے اخذ کرکے ایک ڈراما 'جعفر' لکھا ۔ یہ بھی اسٹیج کے کام نہ آ سکا ۔ اسی طرح بعض دوسرے ادیبوں نے بھی ادبی ڈرامے تصنیف کیے ۔ یا مغربی ڈراموں سے اخذ کیے ۔

اسٹیج ڈراما

آرام ۔ نسیروان جی مہروان جی (خانصاحب) ۔

بمبئی کے تعلیم یافتہ ، پارسی خاندان کے خوش ذوق نوجوان اور لائق فنکار تھے ۔ ایک عرصہ تک پارسی اسٹیج کے گجراتی ڈراموں میں اداکاری کرتے رہے ۔ اردو کی معمولی استعداد بھی رکھتے تھے ۔ پارسی فنکاروں اور تھیٹر کے کارپردازوں کو اردو ڈرامے اسٹیج کرنے کا خیال آیا تو ان کی نظرِ انتخاب نسروان جی مہروان جی پر پڑی ۔ ان کے نام کے ساتھ 'خانصاحب' کا جزو بھی شامل ہے ۔ گمان غالب ہے کہ حکومتِ ہند کی جانب سے یہ خطاب ملا ہوگا ۔ مستند تذکروں سے اس امر کی تصدیق ہو چکی ہے کہ یہ شاعر نہیں تھے ۔ غالباً ڈراما نویس بننے کے بعد آرام تخلص اختیار کیا ہوگا ۔ ڈھاکہ سے جو ادیب اور ڈراما نگار بمبئی آ کر مقیم ہوئے ان میں منشی احمد حسن وافر بھی تھے ۔ آرام نے ان سے تلمذ اختیار کیا ۔ ان کے ڈراموں کی فہرست میں ڈراما 'نور جہان' اور 'حاتم' گجراتی زبان سے ترجمہ ہیں اور پہلا طبعزاد ڈرامہ 'بے نظیر بدرِ منیر' ہے ۔ لیکن اس ڈرامے کا ابتدائی نسخہ بھی گجراتی رسم الخط میں ملتا ہے جو 'انڈیا آفس لائبریری ، لندن' میں موجود ہے ۔ اس کے ایک مطبوعہ ایڈیشن کے سرورق پر مترجمہ فقیر محمد تیغ درج ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آرام کے گجراتی نسخہ کو تیغ نے اردو کا جامہ پہنایا تھا اور آرام کے دوسرے اردو ڈراموں میں ان کے استاد وافر کا بڑا حصہ تھا ۔ ان کے تراجم و تصانیف کی فہرست میں سترہ ڈرامے شامل ہیں ۔ ان میں گجراتی سے ترجمے بھی ہیں اور تصنیف کیے ہوئے بھی بتائے جاتے ہیں ۔ لیکن ان میں سے کئی ڈرامے ڈھاکہ کے مصنفین کی فہرست میں بھی ملتے ہیں ۔ آرام کے تالیفی یا تصنیفی دور کا عرصہ ۱۸۷۰ء سے ۱۸۸۰ء تک دس سال کی مدت پر پھیلا ہوا ہے ۔ سید امتیاز علی تاج مرحوم نے آرام کے نام سے ان ڈراموں کے دو مجموعے مرتب کرکے مجلسِ ترقیِ ادب ، لاہور کے زیرِ اہتمام شائع کیے ہیں ۔ ان کے طویل دیباچوں میں تاج صاحب نے بھی کسی مستند ثبوت کے ساتھ اس بات کی تصدیق نہیں کی کہ آرام شاعر تھے ۔ خود آرام نے اپنے ایک ڈراما 'جہانگیر شاہ اور گوہر' کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ :

> ''یہ بتانا بیجا نہ ہوگا کہ میں شاعر نہیں ہوں ، نہ ہی سخنور ہونے کا دعویٰ کرتا ہوں ۔ یہ کام میں نے فقط شوق کے لیے کیا ہے''[1] ۔

ڈراما 'حاتم' مصنفہ ایدل جی کھوری مترجمہ آرام میں مصنف نے اپنے دیباچہ میں

---

(۱) ڈاکٹر نامی ،اردو تھیٹر ۔ حصہ دوم ۔

نسروان جی (مترجم) کو صرف گجراتی اور ہندوستانی زبان میں مہارت رکھنے والا 'پارسی جوان' لکھا ہے ۔ اس کے تخلص (آرام) یا اس کے شاعر ہونے کا کوئی تذکرہ نہیں کیا ۔ جہاں تک اندازہ ہے ''گجراتی اور ہندوستانی زبان میں مہارت رکھنے'' سے ایدل جی کھوری کی مراد صرف یہ ہے کہ وہ نسران جی مہروان جی ان زبانوں میں کچھ استعداد ضرور رکھتے تھے اور 'ہندوستانی زبان' کا مطلب با محاورہ ادبی اردو سے ہرگز نہیں بلکہ صرف بول چال کی مقامی ہندوستانی ہو سکتا ہے ۔ ورنہ آرام کے ڈرامے خواہ تصنیف ہوں یا ترجمہ گجراتی رسم الخط کے بجائے اردو رسم الخط میں لکھے ہوئے موجود ہونا چاہیے تھے ۔ بہر حال آرام کو محض تخلص کا شاعر یا تکبند مانا جا سکتا ہے جو اس زمانہ کے چند دوسرے مصنفین کا بھی حال تھا اور وہ وکٹوریہ ناٹک منڈلی کے مستقل ڈراما نگار رہے ۔ آرام کے ڈراموں کی فہرست یہ ہے جن میں منظوم اور نثری دونوں ڈرامے شامل ہیں ۔

گجراتی سے تراجم

(۱) نور جہان (۲) حاتم ۔

تصانیف

(۳) باغ و بہار (۴) بہرام اور شیریں (۵) جوان بخت (۶) چند راؤلی (۷) عالمگیر (۸) گل بکاؤلی (۹) گوپی چند (۱۰) لیلیٰ مجنوں (۱۱) الہ دین (۱۲) بے نظیر بدرِ منیر (۱۳) پریوں کی ہوائی مجلس (۱۴) جہانگیر شاہ اور گلنار (۱۵) خوابِ بخت (۱۶) شکنتلا (۱۷) لعل و گوہر ۔

حسینی میاں ظریف (۱۸۱۳ء - ۱۸۹۶ء)

ان کا پورا نام غلام حسین عرف حسینی میاں اور ظریف تخلص تھا ۔ میسور ضلع بڑودہ کے باشندے تھے ۔ اردو کی معمولی استعداد رکھتے تھے اور ادنیٰ درجہ کے تکبند شاعر بھی تھے ۔ کچھ عرصہ مہتر جمنا داس بھگوانداس ناشرینِ کتب بمبئی کے پاس ملازم رہے ۔ اس زمانے میں بمبئی کی مشہور تھیٹر کمپنیوں کے کھیلے ہوئے گجراتی اور اردو ڈراموں میں معمولی رد و بدل کرکے اپنے نام سے چھپواتے اور بعض کمپنیاں جو نئے ڈراموں کی تلاش میں رہتی تھیں ان کے نام سے وہ ڈرامے کھیلتیں ۔ چنانچہ ان کی تالیف و تصنیف کی فہرست میں متعدد ڈرامے ہو گئے ۔ پھر اوریجنیل تھیٹریکل کمپنی کے لیے کئی ڈراموں کو مسخ کرکے اپنے نام سے اسٹیج کرایا اور اس کمپنی کے ڈراما نگار منشی مقرر ہوئے ۔ آخر عمر میں پرائمری اسکول میں مدرس ہو گئے ۔ لیکن اس زمانہ میں بھی

ظریف نے حسبِ معمول اپنی ڈراما نگاری کا سلسلہ جاری رکھا - ان کے نام سے چھپے ہوئے کئی ڈراموں پر جو قطعہ لکھا ہوتا - اس کا آخری مصرع ان کے حسبِ حال تھا :

ناٹک پہ اے ظریف تراشے نئے نئے

ظریف کے لکھے ہوئے تمام ڈراموں کی زبان میں زبان و بیان کی اغلاط عام ہیں - اشعار میں نقص اور خامیاں ہیں - اس کا سبب ظریف کی زبان سے کم واقفیت اور کم علمی بھی ہے اور یہ بھی کہ جن ڈراموں میں ترمیم و تنسیخ کرکے اپنایا ہے ان کی اصل تصانیف میں بھی یہ خامیاں موجود ہیں - کیونکہ مصنّفین زیادہ تر دکنی تھے ، یا دکن میں عرصۂ دراز تک بود و باش رکھنے کی وجہ سے ان کی بول چال میں مقامی محاوروں کا اثر تھا اور یہی زبان ان کے ڈراموں کے مکالموں ، اشعار اور گانوں میں استعمال ہوئی ہے -

ظریف کے نام سے ۲۵ ڈرامے اسٹیج ہوئے اور چھپ کر شائع ہوئے ، جن میں سے اکثر نایاب ہیں - ان ڈراموں میں سے بائیس ڈرامے ایسے ہیں جو دوسرے ڈراما نگاروں یعنی امانت لکھنوی ، کریم الدین مراد ، رونق بنارسی ، آرام اور ڈھاکہ کے مصنّفین کی فہرست میں بھی موجود ہیں -

ان میں سے ہر ایک کے سرورق پر 'ظریف' کا نام مرتب کی حیثیت سے درج ہے - صرف حسب ذیل تین ڈراموں میں 'ظریف' کا نام مصنّف کے طور پر چھپا ہے - اس سے قیاس کیا جاتا ہے کہ اول الذکر تمام ڈراموں میں معمولی تبدیلی کر کے 'ظریف' نے اپنے نام سے اسٹیج کرائے - باقی کی نسبت زیادہ تفصیل معلوم نہ ہو سکی - اس لیے وہ انھی کی تصنیف سمجھے جاتے ہیں -

(۱) ڈراما رنج و راحت عرف آصف و مہوش (۱۸۸۴ء) -

(۲) نیرنگِ عشق عرف گلزارِ عصمت (۱۸۸۶ء) -

(۳) انجامِ سخاوت عرف خدا دوست (۱۸۹۰) -

محمود میاں رونق بنارسی (۱۸۲۵ء - ۱۸۸۶ء)

محمود علی عرف محمود میاں کے بزرگوں کا اصل وطن بنارس تھا - ان کے والد ترکِ وطن کر کے دکن آ گئے تھے - وہیں محمود علی کی ولادت ہوئی - وہ زیرِ تعلیم ہی تھے کہ ان کے والد اور والدہ کا سایہ سر سے اٹھ گیا - اس وقت محمود علی کی عمر اٹھارہ سال تھی - کچھ عرصہ بعد وہ بمبئی آ گئے اور ایک کاٹن مل میں ملازمت

اختیار کی - یہیں تھیٹر کا شوق ہوا - پارسی کمپنیوں کا دور دورہ شروع ہوا تھا - انہوں نے اردو فارسی کی اچھی خاصی استعداد بہم پہنچا لی تھی - اردو میں شعر بھی کہتے تھے اور رونق تخلص کرتے تھے - چنانچہ پارسی وکٹوریہ ناٹک منڈلی[1] کے موجودہ ڈائرکٹر دادا بھائی رتن جی ٹھونٹھی نے ان سے چند ڈراموں میں ترمیم و تنسیخ کر کے انہیں نئے روپ میں پیش کرنے کا کام سپرد کیا -

دادا بھائی ٹھونٹھی کے بیٹے آرد شیر دادا بھائی ٹھونٹھی کا بیان ہے کہ :-

''منشی محمود میاں رونق پارسی اور دوسری کمپنیوں کے لیے جو ڈرامے لکھتے تھے ان میں سے اکثر وہ تھے جو پارسی کمپنیوں میں پہلے اسٹیج ہو چکے تھے - رونق نے ان کو از سرِ نو لکھ کر ترمیم و تنسیخ کر کے اپنے نام سے پیش کیا''۔

رونق پارسی تھیٹر کے پہلے غیر پارسی ڈراما نگار تھے اور ان کی مکالمہ نویسی اور ڈرامائی ، تدبیر کاری کا اسلوب بھی اپنے پیش رؤوں سے بہتر تھا - انہوں نے قطع و برید اور اخذ و ترجمہ کے علاوہ کئی طبعزاد منظوم ڈرامے لکھے - جن میں سے اکثر ڈراموں کے پلاٹ قدیم مثنویوں ، طلسماتی اور مافوق الفطرت واقعات ، جن پریوں اور بادشاہوں کی داستانوں پر مبنی ہیں -

رونق ڈراما نویسی کے علاوہ اداکاری بھی کرتے تھے - ایک روایت کے مطابق رونق نے ۱۸۸۶ء میں اپنے ایک ڈراما 'عاشق کا خون' عرف 'دامن پہ دھبا' میں ایک کردار ادا کرنے کے دوران اسٹیج پر استرے سے اپنا گلا کاٹ کر خود کشی کی اور بمبئی کے بڑے قبرستان میں دفن ہوئے - رونق کے ڈراموں کی فہرست میں حسب ذیل ڈرامے شامل ہیں (۱) بے نظیر بدرِ منیر (آرام کے ڈرامے سے ماخوذ) (۱۸۷۹ء) - (۲) 'لیلیٰ مجنوں' (۱۸۷۹ء) - (۳) 'انجامِ الفت' عرف 'ہمایوں ناصر' (۱۸۸۰ء) - (۴) 'پورن بھگت' (۱۸۸۰ء) - (۵) 'سیف سلیمانی' عرف 'معصوم معصومہ' (۱۸۸۰ء) - (۶) 'ستم ہامان' عرف 'فریبِ عزرائیل' (۱۸۸۰ء) - (۷) 'عاشقِ صادق' عرف 'ہیر رانجھا' (۱۸۸۰ء) - (۸) 'حاتم بن طے' عرف 'افسرِ سخاوت' (۱۸۸۲ء) - (۹) 'طلسمِ زہرہ' عرف 'رنج کا بدلہ گنج' (۱۸۸۲ء) - (۱۰) 'فسانۂ عجائب' عرف 'جانعالم

(۱) الف - خورشید بالیوالا (مخطوطہ) ، خود نوشت ڈائری -
ب - اردو تھیٹر ، ڈاکٹر نامی -
ج - رونق کے ڈرامے (جلد پنجم) مرتبہ سید امتیاز علی تاج -

انجمن آرا' (۱۸۸۲ء) ۔ (۱۱) 'انصاف محمود شاہ' عرف 'ظلم عمران روسیاہ' (۱۸۸۲ء) ۔ (۱۲) 'عجائب برستان' عرف 'بہارستان عشق' (۱۸۸۳ء) ۔ (۱۳) 'ظلم اظلم' عرف 'جیسا ہونا ویسا پانا' (۱۸۸۳ء) ۔ (۱۴) 'خواب گاہ عشق' عرف 'بیداد وحشت' (۱۸۸۳) ۔ (۱۵) 'خواب محبت' عرف 'نادان کی دوستی کا جنجال' (۱۸۸۳ء) ۔ (۱۶) 'غرور رعد شاہ' عرف 'چندہ حور و خورشید نور' (۱۸۸۵ء) ۔ (۱۷) 'فریب فتنہ عرف چاہت زر' (۱۸۸۵ء) ۔ (۱۸) 'جفائے ستم گر' عرف 'کھٹری کی گھڑیال' (۱۸۸۶ء) ۔ (۱۹) 'کال کا بھوگ' (مزاحیہ) (۱۸۸۶ء) ۔ (۲۰) 'نور الدین اور حسن افروز' (۱۸۸۶ء) ۔ (۲۱) 'چمبیلی گلاب' (مزاحیہ) ۔ (۲۲) 'میاں بستو اور بیوی کھٹمل' (مزاحیہ) ۔

مؤخرالذکر چاروں کھیل مختصر مزاحیہ نظمیں نہیں جو پوری طوالت کے ڈراموں کے ساتھ دکھائی جاتی تھیں ۔ لیکن علیحدہ علیحدہ کتابی صورت میں شائع ہوئے تھے ۔ ان ڈراموں میں اکثر بعد میں دوسرے ڈراما نگاروں نے معمولی تبدیلی کے ساتھ اپنے نام سے اسٹیج کرائے اور شائع کیے گئے ۔

الف خان حباب[۱] (سن ولادت و وفات نا معلوم)

منشی الف خان یو ، پی کی قدیم ریاست رامپور کے معزز پٹھان خاندان سے تعلق رکھتے تھے وہ اردو اور فارسی میں معقول مہارت رکھتے تھے ۔ شعر گوئی اور نثر نگاری میں خاصی شہرت حاصل تھی ۔ حباب تخلص تھا ، ان کا سن ولادت اور وفات معلوم نہیں ہوئی ۔ پارسی تھیٹر کے ابتدائی دور میں دوسرے گروہ کے ہمعصر تھے ۔ ان کی ڈراما نگاری کا زمانہ ۱۸۹۰ء سے ۱۹۰۰ء تک کے دوران کا ہے ۔

حباب تلاش معاش میں بمبئی گئے اور تھیٹر کے شوق نے انہیں ڈراما نویسی کی طرف متوجہ کیا ۔ اس دور کی چند پارسی تھیٹر کمپنیوں کے لیے ڈرامے لکھے جن میں سب کے سب منظوم ہیں ۔ تفصیل حسب ذیل ہے ۔

(۱) 'غزالہ ماہرو عرف تماشائے خوش گلو' (یہ منظوم ڈراما سلطان واجد علی شاہ کی مثنوی کے رسالہ پر لکھا گیا ۔ سلطان نے خود بھی اپنی اس مثنوی کو ناٹک کی شکل میں ترتیب دیا اور لکھنؤ کے شاہی اسٹیج پر بڑی دھوم دھام سے اسٹیج کرایا تھا ۔ پارسی تھیٹر کے اسٹیج پر یہ کھیل بہت مقبول ہوا) ۔ (۲) 'شرار عشق' (۳) 'قتل سیاؤش' (۴) 'افسانہ ارژنگ' (۵) 'تائید خدا' (۶) 'کرشن لیلا' (۷) 'ہرہاس

---

(۱) عشرت رحمانی ، اردو ڈرامے کا ارتقا ۔

پک، (۸) 'نالۂ مظلوم' (۹) 'نوروز' (۱۰) 'جشنِ کنور سین' عرف 'سیرِ پرستان'، (۱۱) 'نگاہِ غفلت'

کریم الدین مراد (پ - ۱۸۴۲ء)

کریم الدین کا اصل وطن بریلی تھا (یوپی) اردو، فارسی اور عربی کی مروجہ تعلیم سے آراستہ تھے - ایک عرصہ تک بریلی کے کسی مدرسۃ العلوم میں مدرس تھے - شعر و نغمہ میں کامل مہارت حاصل کی - جب ۱۸۸۲ء میں دادا بھائی رتن جی ٹھونٹھی نے پارسی وکٹوریہ ناٹک منڈلی (بمبئی) کو اپنی ملکیت میں لے کر اس کی از سرِ نو تنظیم کی اور 'اندر سبھا' کو خالص لکھنوی تہذیب و روایت کے مطابق خاص اہتمام سے اسٹیج کرنے کا تہیہ کیا، اس سلسلہ میں اپنے معتمدِ خاص، پسٹن جی کو دہلی، لکھنؤ اور روہیلکھنڈ کے مختلف شہروں بریلی، مراد آباد وغیرہ کے دورے پر بھیجا تاکہ ملبوسات اور مختلف ساز و سامان کی نسبت صحیح معلومات حاصل کریں - پسٹن جی نے دادا بھائی کے ایماء پر ان شہروں کے ادیبوں اور شاعروں سے بھی ملاقات کی اور اپنی کمپنی کے لیے لائق مصنف تلاش کرنے کی کوشش کی - چنانچہ ان کی نظرِ انتخاب کریم الدین مراد پر پڑی اور اسے اپنے کام کے لیے بہت مفید پایا - شرائط طے ہو جانے پر مراد بمبئی پہنچ گئے - دادا بھائی ان کی بہت عزت کرتا اور ان کے فنِ موسیقی و شعر گوئی کی مہارت سے مرعوب تھا -

مراد نے پہلا ڈراما 'گل بکاؤلی'، سردار جی، مہروان جی آرام کے ڈرامے کی بنیاد پر تالیف کیا جو ۱۸۸۳ء میں اسٹیج ہو کر مقبول ہوا - دوسرا ڈراما 'گلستانِ خاندان' ۱۸۸۵ء میں، رونق بنارسی کے ڈرامے سے اخذ کر کے لکھا - یہ دونوں کھیل بہت مقبول اور مشہور ہوئے - تیسرا ڈراما ۱۸۸۷ء میں 'چترا بکاؤلی' اور چوتھا ڈراما ۱۸۹۰ء میں 'خدا داد' لکھا - ان ڈراموں کو بہت شہرت حاصل ہوئی - مراد کے ڈراموں کی مقبولیت کا سبب ان کے شعروں کی پختہ بندش، زبان کی فصاحت و سلاست اور نغمگی کا دلکش انداز تھا - وہ اپنے گانوں کی دھنیں خود تجویز کرتے جو مقبولِ عام ہوتیں - ۱۸۹۱ء کے بعد مراد وکٹوریہ ناٹک منڈلی کے مالکان میں جھگڑا ہو جانے کے سبب پارسی الفریڈ تھیٹریکل کمپنی میں چلے گئے اور اپنے پرانے ڈراموں میں ترمیم کر کے انہیں از سرِ نو پیش کیا - چند نئے ڈرامے بھی لکھے - پارسی الفریڈ نے ان کے ڈراما 'چترا بکاؤلی' غیر معمولی کامیابی اور شہرت حاصل کی -

چند(۱) مشہور ڈراموں کے بارے میں بعض تذکرہ نویسوں نے اپنی غلط معلومات اور نامکمل جہان بین کی بنیاد پر لکھا ہے کہ ان کے مصنفین نا معلوم ہیں ۔ حالانکہ ان میں سے ہر ایک کے مصنف کا نام مستند اطلاعات کی بنا پر معلوم ہو چکا ہے ۔ ان کی تفصیل حسب ذیل ہے ۔ البتہ ان مصنفین کے تفصیلی حالات پردۂ گمنامی میں ہیں ۔

(۱) 'فتنہ خانم' ، عرف 'مقبول عالم' ۔ حسینی میاں ظریف نے پرانے ڈرامے سے اخذ کیا ۱۸۸۷ء (۱۳۰۵ھ) میں طبع ہو کر ان کے نام سے شائع ہوا ۔

(۲) 'آدسمر اعظم' ۔ حسینی میاں ظریف نے کسی قدیم ڈرامے میں ترمیم کر کے از سر نو لکھا ، 'طلسمات سلطانی' کے نام سے بڑی مشہور ہوا ۔ دو ایکٹ کا ڈراما ہے ۔

(۳) 'ظلم وحشی' ۔ (منشی افسوں کا لکھا ہوا ہے ، پارسی اسٹیج کے دور اول کے غیر معروف ڈراما نگاروں میں تھے) ۔

(۴) 'دو رنگی دنیا' ۔ ابتدائی پارسی تھیٹر کے پارسی ڈراما نگار کابراجی بہمن جی نوروز جی کی تصنیف ہے جسے پارسی ناٹک منڈلی نے بمبئی کے لیے ۱۸۷۰ء میں لکھا ۔ گجراتی رسم الخط میں گجراتی آمیز بول چال میں تھا ۔ اسی مصنف کے دوسرے ڈرامے 'گل کی بھول' اور 'گاؤں کی گوری' تھے ۔ یہ سب نایاب ہیں ۔

حافظ محمد عبداللہ فتح پوری (سن ولادت و وفات نا معلوم) ۔

حافظ محمد عبداللہ کے والد کا نام شیخ الٰہی بخش تھا جو قصبہ باہورا کے رئیس اور زمیندار تھے اور چتوڑہ ضلع فتحپور ہند میں رہائش پذیر تھے ۔

عبداللہ دولتمند ، خوش ذوق شاعر تھے ۔ ڈرامے اور تھیٹر سے خاص شغف رکھتے ۔ انڈین امپریل تھیٹریکل کمپنی کے نام سے اپنی تھیٹر کمپنی بنائی ۔ اداکاری اور موسیقی سے بھی خاص رغبت تھی ۔ اپنی کمپنی کے لیے قدیم ڈراما نگاروں کے متعدد ڈراموں میں رد و بدل کر کے ترتیب دیتے اور اپنے نام سے اسٹیج پر پیش کرتے رہے ۔ یہ تمام ڈرامے چھپ کر شائع ہوئے ہیں ۔ حافظ تخلص کرتے تھے اور اپنی کمپنی کے ہدایت کار بھی

---

(۱) الف ۔ عشرت رحمانی ، اردو ڈراما تاریخ و تنقید ۔
ب ۔ ڈاکٹر نامی ، اردو تھیٹر (حصہ دوم) ۔

خود ہی تھے ۔ عبداللہ نے اپنے دور میں کئی تھیٹر کمپنیاں قائم کیں اور بڑے اہتمام سے چلائیں ۔ ان کا شمار حسینی میاں ظریف کی صف میں ہوتا ہے ۔ ان کی فہرست میں چالیس ڈرامے شامل ہیں جو تقریباً تمام ابتدائی عہد کے پارسی اسٹیج کے مصنفین آرام ، رونق حباب اور مراد وغیرہ کے نام سے اسٹیج ہو کر چھپ چکے تھے ۔

(۱) ان کا پہلا ڈراما 'عشق شیریں فرہاد' عرف 'داغ حسرت' ۱۸۸۱ء میں مرتب ہو کر اسٹیج کیا گیا ۔

(۲) شکنتلا(۱) ۔ اس ڈرامے کی نسبت حافظ عبداللہ کا بیان ہے کہ یہ منظوم ڈراما مصنف (عبداللہ) نے ماہ نومبر ۱۸۸۵ء میں بمقام باندہ تصنیف کیا ۔ پھر ۲۵ فروری ۱۸۹۰ء کو ضروری ترمیم و تنسیخ کے بعد علی گڑھ سے شائع کیا ۔ اس کا پلاٹ راجہ دسینت اور شکنتلا کے مشہور افسانہ پر مبنی ہے ۔

(۳) 'بے نظیر بدر منیر عرف تماشائے دلپذیر' (سن تالیف نا معلوم) یہ ڈراما نروان جی مہروان جی آرام کے نام سے اسٹیج ہو کر ۱۸۸۱ء میں شائع ہوا تھا ۔ رونق نے بھی از سر نو اسے لکھا تھا ۔ حافظ عبداللہ نے اس میں ترمیم و تنسیخ اور گانوں کے رد و بدل کے ساتھ ترتیب دیا ۔ اس کا پلاٹ مثنوی میر حسن سے ماخوذ ہے ۔

(۴) 'الہ دین خوش نصیب' عرف 'چراغ عجیب' ۔ (سن تصنیف نا معلوم) ۔ نروان جی مہروان جی آرام کے منظوم ناٹک 'الہ دین عجیب و غریب چراغ' سے ماخوذ ہے ، جس کا پلاٹ الف لیلیٰ کی مشہور داستان 'الہ دین کا چراغ' پر مبنی ہے ۔ کئی اور ڈراما نویسوں نے بھی اس پلاٹ پر ڈرامے لکھے ۔

نظیر بیگ (سن پیدائش و وفات نا معلوم) ۔

مرزا نظیر بیگ اکبر آباد (آگرہ) کے مرزا اشرف بیگ کے صاحبزادے تھے ۔ شعر و شاعری اور اداکاری کا شوق تھا ۔ نظیر تخلص کرتے تھے ۔ حافظ عبداللہ کے شاگرد ہوئے اور ان کی الڈین امپریل تھیٹریکل کمپنی میں معمولی اداکار کی حیثیت سے کام کرنے کے بعد ترقی کر کے چیف ایکٹر اور پارسی جوبلی تھیٹریکل کمپنی کے ڈائرکٹر مقرر ہو گئے ۔ بعد ازاں یکے بعد دیگرے کئی تھیٹر کمپنیوں کے مینجنگ ڈائرکٹر رہے ۔ نظیر نے

---

(۱) دیباچہ ڈراما شکنتلا (حافظ عبداللہ) ۔

۳۲ ڈراموں پر ہاتھ صاف کرکے معمولی تبدیلیوں کے ساتھ اپنے نام سے اسٹیج کرایا - یہ سب کے سب چھپ کر شائع ہو چکے ہیں :

۱ - نتیجۂ محبت - اس ڈرامے کا پورا نام 'ستم عشق و الفت' عرف 'نتیجۂ محبت' ہے - نظیر بیگ نے اس کے دیباچہ میں لکھا ہے - - - ''میں نے یہ ناٹک از سر نو ترتیب دیا اور اس کا نام 'ستم عشق و الفت' عرف 'نتیجۂ محبت' رکھا - اس کا قصہ مشہور مثنوی 'زہر عشق' (مصنفہ نواب مرزا شوق لکھنوی) سے ماخوذ ہے - ماہ فروری ۱۸۹۲ء میں شہر دہلی بھیت میں بزبان فصیح اردو نظم و نثر لکھا گیا -

چترا بکاؤلی عرف گلزار عاشق (۱۸۹۴ء)

۲ - کریم الدین مراد بریلوی کے ڈرامے میں ترمیم و تنسیخ کر کے بمقام فتح گڑھ از سر نو ترتیب دیا - اس کا پلاٹ مشہور داستان بکاؤلی اور تاج الملوک سے ماخوذ ہے -

۳ - 'الہ دین' (۱۸۹۸ء) مشہور داستان سے ماخوذ ہے - اس ڈرامے کو حافظ عبداللہ نے آرام اور دوسرے ڈراما نویسوں کے قدیم ڈرامے کی بنیاد پر ترتیب دیا تھا - نظیر نے بعد میں اسی میں ترمیم کر کے اپنے نام سے اسٹیج کیا - قدیم تھیٹر کی ڈراما نگاری میں اس قسم کی ترمیم و تنسیخ گوارا سمجھی جاتی تھی جو مدتوں جاری رہی - غالباً اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ متعدد تھیٹر کمپنیوں کو نئے نئے ڈراموں کی آئے دن ضرورت پیش آتی تھی اور کاپی رائٹ ایکٹ میں کوئی باضابطہ تحفظ بھی نہ تھا - اس کے علاوہ ڈراما نویسوں کی اکثریت اس قسم کی نقالی اور کنٹریبیوشن پر عمل کرتی تھی اور بمصداق -

این گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند

عباس علی میر (۱۸۸۹ء - ۱۹۳۴ء)

ان کا اصلی نام میر غلام عباس تھا - اور عرف عباس علی - لاہور میں پیدا ہوئے ان کے والد کا نام حکیم میر بخش علی تھا - جو پنجاب کی کسی ریاست میں طبیب خاص رہے - غلام عباس انٹرمیڈیٹ کالج میں زیر تعلیم ہی تھے کہ تھیٹر کا شوق ہوا - شعر و شاعری سے بھی رغبت تھی - کالج کے اسٹیج پر اداکاری کرتے تھے

پروفیسر نوری رام تیرتھ سے کلام پر اصلاح لینے لگے۔ آخرکار تھیٹر کی اداکاری کو پیشہ بنا لیا اور تعلیم سے کنارہ کشی اختیار کر کے اسٹیج کے مردِ میدان بن گئے۔ اسی لگن میں بمبئی پہنچے اور وہاں کی مشہور تھیٹر کمپنیوں کے لیے ڈرامے لکھنے لگے۔ اردو فارسی میں اچھی استعداد رکھتے تھے۔ ان کا طرز عام فہم اور فصیح و سلیس تھا اور مکالموں میں روانی، اثر اور بےساختگی تھی۔ گانوں کی زبان سادہ اور دلکش تھی۔ ان کی ڈراما نگاری کا دور ۱۹۰۶ء سے ۱۹۳۰ء تک ہے۔ ان کی ڈرامائیت میں مختلف معاشرتی، اصلاحی، نیم تاریخی، نیم سیاسی اور اسلامی موضوعات پر تیس ڈرامے شامل ہیں۔ آخری اکتیسواں ڈراما 'سخی سندری' ۱۹۳۰ء میں لکھ رہے تھے کہ شدید علالت کے سبب صاحبِ فراش ہو گئے اور کچھ عرصہ بعد وفات پائی۔

(۱) پہلا ڈراما 'نیرنگِ ستمگر' (۱۹۰۶ء)۔

(۲) نورجہان (۱۹۱۰ء)۔ (نیم تاریخی)۔

ان کے نیم سیاسی ڈراموں میں (۱) 'پنجاب میل'۔ (۲) 'شریمتی فجری'۔ (۳) 'لیڈی لاجونتی'۔ (۴) 'شاہی فرمان' ہیں۔ اور اسلامی ڈراموں میں 'نورِ اسلام' سب سے زیادہ مقبول اور کامیاب تسلیم کیا گیا۔

اصغر نظامی (سنِ پیدائش و وفات نامعلوم)

آغا سید اصغر علی، اصغر تخلص کرتے تھے۔ اپنے دور کے خوش فکر شاعر اور ادیب تسلیم کیے جاتے تھے۔ ذی علم اور صاحبِ ذوق تھے۔ ان کی ڈراما نگاری کا دور ۱۹۰۸ء سے ۱۹۲۵ء تک شمار کیا جاتا ہے۔ اس عرصہ میں جو ڈرامے لکھے ان میں چار مشہور و مقبول ہوئے جن میں سے خاص طور پر دو ڈراموں کو زیادہ شہرت حاصل ہوئی۔

(۱) 'پھولوں کی ہتھکڑی' عرف 'اشکوں کی جھڑی'۔ اس کے پلاٹ کا موضوع اصلاحِ اعمال سے متعلق ہے۔ جن میں خیر و شر کے تصادم میں انجام خیر کی فتح ہوتی ہے۔

(۲) 'حسن کا چاند عرف دیوی موہنی' پلاٹ کی بنیاد عشق حقیقی و عشق مجازی پر ہے۔ جس میں بالآخر عشقِ حقیقی کی کامرانی دکھائی گئی ہے۔

یہ ڈراما پارڈنگ تھیٹریکل کمپنی آف انڈیا کے لیے تصنیف کیا گیا تھا۔

(۳) 'نرکی تلوار عرف غازی صلاح الدین' (نیم تاریخی)۔

(۴) 'قومی دلیر عرف اتفاق' (نیم سیاسی)۔

طالب بنارسی (۱۸۵۲ء - ۱۹۲۰ء)

ونائک پرشاد نام تھا اور طالب تخلص۔ ان کا وطن بنارس تھا۔ ان کے والد منشی روشن لال کالستھ خاندان کے تعلیم یافتہ بزرگ تھے۔ طالب اردو نثر و نظم پر معقول دسترس رکھتے تھے۔ شاعری میں پہلے راسخ دہلوی اور بعد میں داغ دہلوی سے تلمذ رہا۔ فنِ موسیقی میں بھی ملکہ تھا۔ پہلے اخبارات و رسائل میں ادبی، اخلاق، تمدنی اور سیاسی مضامین لکھتے رہے۔ تھیٹر کے شوق میں بمبئی پہنچے، اس وقت ان کی عمر تیس سال کے قریب تھی۔ ان کو خورشید جی بالیوالا نے پارسی وکٹوریہ ناٹک منڈلی میں مستقل ڈراما نگار کی حیثیت سے ملازم رکھ لیا۔ اور سب سے پہلے 'سنگین بکاؤلی' اور 'عاشق کا خون' رونق کے دو ڈراموں میں ضروری ترمیم کرائی۔ پھر ایک انگریزی ڈرامے 'ڈے اینڈ نائٹ' کا پلاٹ دے کر نیا ڈراما لکھنے کی فرمائش کی۔ جو ۱۸۸۳ء میں مکمل کیا اور اس کا نام 'لیل و نہار' رکھا۔ یہ ڈھاکے کے 'بلبلِ بیمار' کے بعد فصیح و سلیس نثر میں پہلا اردو ڈراما سمجھا جاتا ہے۔ جو ڈرامائی لوازم اور تدبیر کاری کے لحاظ سے بھی ایک ترقی یافتہ نمونہ تھا۔ اس کے علاوہ انکے مندرجہ ذیل ڈرامے مشہور ہیں:

(۱) 'چمنِ عشق' (۱۸۸۴) منظوم طلسماتی ڈراما (۲) 'نگاہِ غفلت' (۱۸۸۸ء) معاشرتی ڈراما (۳) 'دلیر دل شیر' (۱۸۹۰ء) اس ڈرامے کا پلاٹ دھنپت رائے بیکس کے قدیم ڈراما 'چوری سینہ زوری عرف دل شیر' سے ماخوذ ہے۔ (۴) 'کرشمۂ قدرت' (۱۸۹۲ء) (۵) 'گوپی چند' (۱۸۹۳ء) ہندو دھارمک ڈراما (٦) 'ہریش چند' (۱۸۹۵) ہندو دھارمک ڈراما (۷) 'بکرم بلاس عرف سات اندھے' (۱۹۱۱ء)۔

طالب بمبئی میں مستقل طور پر پارسی وکٹوریہ ناٹک منڈلی سے ہی منسلک رہے۔ خورشید جی بالیوالا کی وفات کے بعد انہوں نے ڈراما نویسی ترک کر دی۔ ان کا آخری ڈراما 'خورشید عالم' مسلم اصلاحی کھیل تھا۔ طالب کے کل ڈراموں کی تعداد پندرہ ہے۔

بزرگ شاہ لاہوری (سن پیدائش و وفات نامعلوم)

سید بزرگ شاہ لاہور کے تعلیم یافتہ سید خاندان کے لائق فرد تھے - اردو اور فارسی زبان پر کامل عبور رکھتے تھے - انہوں نے ۱۸۸۵ء میں 'ڈراما نویسی' کی طرف توجہ کی اور چار پانچ ڈرامے صرف مقامی تھیٹر کمپنیوں کے لیے لکھے - ان کے زیادہ تر ڈرامے ۱۸۸۶ء میں لکھے اور اسٹیج کیے گئے - بزرگ شاہ اورینٹل اوپیرا اینڈ ڈرامیٹک تھیٹریکل کمپنی پنجاب کے منیجر بھی رہے -

(۱) **طلسمات سلیمانی** (۱۸۸۶) - اس کی کہانی عبدالعزیز نامی تاجر ختن اور اس کے خاندان کے گرد گھومتی ہے - ۱۸۸۷ء میں یہ ڈراما محمد عبداللہ عرف ملک ہیرا تاجر کتب ، کشمیری بازار ، لاہور نے کچھ رد و بدل کے ساتھ کر کے شائع کیا -

شاہ صاحب نے قدیم ڈراما 'آتشیں اعظم' میں ترمیم و تنسیخ کر کے بھی مرتب کیا - ان کے ڈراموں میں 'قمرالزمان و بدورا' اور 'نورالدین و حسن افروز عرف کنیز پارس' بھی مشہور ہیں -

احسن لکھنوی (۱۸۵۹ء - ۱۹۳۰ء)

سید مہدی حسن احسن لکھنؤ کے معزز خاندان کے فرد تھے - ان کے والد میر حسن علی اودھ شاہی فوج کے ممتاز عہدیدار تھے - نانا حکیم نواب میر آغا حسن ازل حکمت و شاعری میں اعلیٰ مقام رکھتے تھے - میر ازل کے بڑے بھائی حکیم میر تصدق حسین شوق عرف نواب مرزا مصنف مثنوی 'زہر عشق' و 'بہار عشق' وغیرہ سلطان واجد علی شاہ کے درباری مصاحب تھے - اس نسبت سے احسن کو شعر و ادب کا ذوق اور لیاقت ورثہ میں ملی - اردو ، فارسی ، عربی اور انگریزی کی تعلیم لکھنؤ میں حاصل کی - لکھنؤ کی سرزمین کی پیداوار تھے ، شعر و نغمہ میں ادب و شاعری اور موسیقی میں اعلیٰ مہارت پائی - احسن اپنے دور کے مسلم الثبوت ادیبوں اور شاعروں میں ممتاز حیثیت کے مالک ہوئے -

۱۸۹۵ء میں لکھنؤ میں تھیٹر کمپنیوں کے چرچے دیکھ کر ڈراما نویسی کی جانب توجہ کی اور اپنے نانا مرزا شوق کی شہرۂ آفاق مثنوی ۱۸۹۶ء میں 'زہر عشق' کے اساس پر ڈراما 'دستاویز محبت عرف زہر عشق' لکھا جو ۱۸۹۷ء میں داراب شاہ کی پارسی تھیٹریکل کمپنی نے اسٹیج کیا - اس کی مقبولیت اور شہرت نے انہیں اسٹیج کے لیے مستقل طور پر ڈرامے لکھنے پر آمادہ کر دیا - چنانچہ بمبئی جا پہنچے اور پارسی الفریڈ تھیٹریکل

کمپنی میں مستقل ڈراما نگار کی حیثیت سے شامل ہو گئے ۔ اس وقت بمبئی میر حسینی میاں ظریف ، کریم الدین مراد اور الف خان حباب وغیرہ کے ڈراموں کی دھوم مچی ہوئی تھی ۔ احسن نے اسٹیج کے ڈراموں میں زبان کی فصاحت ، سلاست و شستگی ، مکالموں کے زور بیان ، گانوں میں لطافت ، دلکشی اور دھنوں میں کیف و لذت پیدا کرکے منفرد اسلوب کے مالک قرار پائے ۔ انہوں نے نظم و نثر کے متوازن امتزاج سے اردو ڈرامے کو نیا رنگ روپ دیا اور شکسپیئر کے مشہور انگریزی ڈراموں کے پلاٹ کو بڑی خوبی سے اردو میں تشکیل دیا ۔ انہوں نے ۱۸۹۵ء سے ۱۹۰۳ء نو سال کی مدت میں دس ڈرامے لکھے اور سب کے سب شہرت و مقبولیت کے آسمان پر چمکے ، لیکن احسن کو ہمیشہ قدر ناشناسی کی شکایت رہی[1] ۔

(۱) 'چندراؤلی'۔ (۱۸۹۷) ۔ حباب کے مشہور ڈراما 'چترا بکاؤلی' کے انداز پر تصنیف کیا گیا ۔

(۲) 'خونِ ناحق عرف مار آستین' (۱۸۹۸ء) شکسپیئر کے ڈراما 'ہملیٹ' کے پلاٹ سے ماخوذ ۔

(۳) 'بزمِ فانی عرف گلنار فیروز' ۔ (۱۸۹۸ء) ۔ شکسپیئر کے ڈراما 'رومیو جولیٹ' سے ماخوذ ۔

(۴) 'دلفروش' (۱۹۰۰ء) شکسپیئر کے ڈراما 'مرچنٹ آف وینس' سے ماخوذ ۔

(۵) 'بھول بھلیاں' (۱۹۰۱ء) ۔ شکسپیئر کے ڈراما 'کومیڈی آف ایررز' سے ماخوذ ۔

(۶) 'چلتا پرزہ' (۱۹۰۲ء) (معاشرتی ڈراما) ۔ نیو الفریڈ تھیٹریکل کمپنی بمبئی کے لیے تصنیف کیا ۔

(۷) 'شریف بدمعاش' (معاشرتی ڈراما) (۱۹۰۳ء) ۔ نیو الفریڈ تھیٹریکل کمپنی کے لیے تصنیف کیا ۔

---

(۱) ڈاکٹر نامی ، اردو تھیٹر (حصہ دوم) ۔

تیرھواں باب

(الف) سوانح

اردو کے قدیم نثری ادب کے جائزے سے یہ دلچسپ انکشاف ہوتا ہے کہ اردو کے نثری ادب کے اس دور کا بیشتر سرمایہ بلحاظِ نوعیت کسی نہ کسی طور سے سوانحی ہے۔

چونکہ اردو نثر کی اولین تحریر کے بنیادی مقاصد، مذہبی اور روحانی نوعیت کے تھے یعنی یا تو وہ صوفیائے کرام کی تحریریں تھیں یا پھر خود ان کے تذکرے، ملفوظات، منقولات اور سوانحات پر مشتمل تھیں، اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ بعض اصنافِ ادب کے برعکس اردو میں سوانح کوئی نئی صنف نہیں ہے۔ البتہ اس فن کے معیاروں اور نظریات میں وقت کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے اعتبار سے تبدیلیاں آتی رہی ہیں۔ ۱۸۵۷ء یا اس سے کچھ قبل لکھی گئی سوانح عمریوں کو ہم اس کے ارتقائی مدارج سے ''حالی کی سوانح نگاری سے قبل کے دور'' کا نام دیتے ہیں۔

حالی کی سوانح نگاری اردو کے سوانحی ادب میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے اور یہ دور اس فن کے معیاروں اور طریقِ کار میں ایک انقلاب لایا۔ اس دور سے پہلے کے سوانحی ادب کے جو نمونے تذکروں، ملفوظات اور حالات کی صورت میں ہماری نظر سے گزرتے ہیں ان کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ اس دور کا سوانح، تاریخ و سوانح کے اس معیار اور نظریے سے نا آشنا نظر آتا ہے جو عربی تاریخ و سوانح نگاری کا نمایاں وصف تھا۔ جس کا بڑا سبب یہ ہے کہ ہماری ادبی روایات کی جڑیں فارسی ادب سے پیوست ہیں اور اسی سے براہِ راست متاثر ہیں۔ معلوم ہوتا ہے فارسی ادب نے عربی فنِ سوانح سے کوئی گہرا اثر قبول نہیں کیا۔ چنانچہ یہی انداز ہمارے یعنی اردو کے قدیم سوانحی ادب کا رہا ہے۔ ان سوانح نگاروں کا نقطۂ نظر سراسر تاریخی رہا ہے اور سوانح عمری میں مؤرخانہ رنگ عرصے تک ہماری ادبیات میں غالب رہا ہے۔ اس نوع کی سوانح عمریوں میں صداقت اور حقیقت کی تلاش ضرور ہوتی تھی، لیکن یہ تلاش موٹے موٹے اور نمایاں واقعات تک ہی محدود ہوتی تھی۔ سوانح عمری کے فن کی وہ باریکیاں نہ تھیں جو ایک جیتے جاگتے انسان کی زندگی کا حصہ ہوتی ہیں اور اس کے کردار و گفتار کے پس منظر کے طور پر کارفرما ہوتی ہیں (یہی عناصر اور عوامل ایک شخص کی زندگی کے

ان پہلوؤں کا کھوج لگاتے ہیں جو اس کو ایک ناول سے زیادہ دلچسپ اور پرپیچ بناتے ہیں) ۔

موڑ خانہ سوانح عمریوں سے قطع نظر ہمارے سوانحی ادب کا بیش تر سرمایہ تصوراتی اور ارادتی عناصر سے عبارت ہے ۔ اس میں لکھنے والا حقائق کے تحفظ اور ان کے اسباب کی جھان بین سے زیادہ ظاہر پر نظر رکھتا ہے ۔ چنانچہ اس دور کے بیشتر تذکروں کو اٹھا کر دیکھیے تو محسوس ہوتا ہے کہ لکھنے والے کا ذخیرہ معلومات انتہائی محدود ہے ۔ لیکن ساتھ ہی بعض تذکروں کی افادیت اور بعض خوبیوں سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا ۔

اردو سوانح و تذکرہ نگاری کے سلسلے میں ان فارسی تذکروں کا ذکر یوں ضروری اور ناگزیر ہے کہ اول تو یہ لکھے اردو شعراء کے متعلق گئے ہیں ، دوم یہ کہ یہ تذکرے آنے والے تذکروں کے پیشرو قرار دیے گئے ہیں ۔

حالی

سر سید اور رفقائے کار نے جس ادبی تحریک کی داغ بیل ڈالی وہ اپنے اسالیب اور نظریات کی بناء پر دبستانِ سر سید کے نام سے مشہور ہوا ۔ حالی اس دبستان کا اہم ترین ستون ہیں اور اس سلسلے میں حالی کا نام ہمیشہ احترام اور عقیدت سے لیا جائے گا ۔ خصوصاً اردو سیرت نگاری حالی کو کبھی فراموش نہیں کر سکتی ۔

جیسا کہ ابھی ذکر کیا جا چکا ہے کہ اردو ادب اس صنفِ ادب سے تہی دامن نہ تھا ، بلکہ شروع ہی سے اردو کے اہلِ قلم کا رجحان اور میلان اس صنفِ ادب کی طرف قائم رہا اور یہ بات بھی نہ تھی کہ ادب کے جدید مغربی خصوصاً انگریزی تصورات سے آشنائی سے پہلے ہمارے سوانح نگاروں کے سامنے کوئی معیار ہی موجود نہ تھا ۔ ہمارے سوانح نگاروں کے پیشِ نظر سب سے بڑا معیار تو یہی تھا کہ وہ مشرق کی "سعادتمندی" اور مشرقیانہ مزاج کے وارث تھے ۔ وہ کسی کی پردہ دری سے زیادہ پردہ پوشی کے قائل تھے ۔ ان کا خیال تھا کہ اگلوں کی عیب جوئی اور نکتہ چینی غیر مستحسن فعل ہی نہیں ، بلکہ بد اخلاقی اور بد کرداری کو راہ دیتی ہے ۔ ان کے نزدیک کمزوریوں اور لغزشوں کی تشہیر اتنی ضروری نہ تھی کہ جتنا انسانی شرف و کمال کا اظہار ضروری تھا ۔ اس نظریے کے باوجود ہمارے سوانح نگار اپنی تہذیبی اور ثقافتی روایت کے مطابق انصاف اور غیر جانبداری سے کام لیتے تھے اور اپنے موضوع کو ان ہی اوصاف سے یاد کرنے کی کوشش کرتے تھے جن سے وہ متصف تھے ۔

چنانچہ حالی اسی روایت کے وارث تھے ۔ حالی ایک ایسے زمانے کی پیداوار تھے جس میں جدّت کا احترام کیا جاتا تھا ۔ وہ اور ان کے معاصر ادب اور زندگی کے ہر میدان میں ایک ایسا تجربہ کرنا چاہتے تھے جو جدّت اور قدامت کے معتدل اور پسندیدہ امتزاج سے تیار کیا گیا ہو ۔ سلف کا احترام و محبت ، تاریخ و سوانح کے وسیلے سے زیادہ کسی اور ذریعہ کا محتاج نہیں ۔ مولانا حالی اپنی پہلی سوانحی تصنیف کے دیباچہ میں اپنے تصورِ سوانح نگاری کے بارے میں یوں لکھتے ہیں[1] :

"بیوگرافی ان بزرگوں کی ایک لا زوال یادگار ہے جنھوں نے اپنی نمایاں کوششوں سے دنیا میں کمالات اور نیکیاں پھیلائی ہیں جو انسان کی آئندہ نسلوں کے لیے اپنی مساعیٔ جمیلہ کے عمدہ کارنامے چھوڑ گئے ہیں" ۔

(حیاتِ سعدی)

"خصوصاً جو قومیں علمی ترقیات کے بعد پستی کے درجہ کو پہنچ جاتی ہیں ان کے لیے بیاگرافی ایک تازیانہ ہے جو ان کو خوابِ غفلت سے بیدار کرتا ہے" ۔

(حیاتِ سعدی)

حالی بیاگرافی کو علمِ اخلاق ہی کی ایک اعلیٰ شاخ کہتے ہیں :

"بیوگرافی علمِ اخلاق کی نسبت ایک اعتبار سے زیادہ سودمند ہے کیونکہ علمِ اخلاق سے نیکی اور بدی کی ماہیت معلوم ہوتی ہے اور بیوگرافی نیکی کے کرنے اور بدی سے بچنے کی نہایت زبردست تحریک دل میں پیدا کرتی ہے" ۔

اب یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ مولانا اپنے ملّی تقاضوں اور ضرورت کے پیشِ نظر ایسے لوگوں کی سوانح عمریوں کو لکھنے کے قائل تھے جن کی سوانح عمریاں دعوتِ عمل دیتی ہیں ۔ چنانچہ انہوں نے انگلستان کے ایک مشہور مصنف کا قول نقل کرکے یہ بھی

---

(۱) حالی ، حیات سعدی ۔

واضح کر لیا ہے کہ سوانح عمری کی تصنیف اور مطالعہ کا مقصد کیا ہونا چاہیے :

''بیوگرافی چلّا چلّا کر اور سمندر کے طوفان کی طرح غل مچا مچا کر یہ آواز دیتی ہے کہ جاؤ تم بھی ایسے ہی کام کرو''[۱] ۔

سوانحی موضوعات کے انتخاب کا سبب

خود مولانا حالی کی دو سوانحی تصانیف 'حیاتِ سعدی' اور 'یادگارِ غالب' ایسے ہی لوگوں کی سوانح عمریاں ہیں جو چلا چلا کر اور غل مچا مچا کر یہ آوازیں دیتے ہیں کہ تم بھی ایسے ہی کام کرو ۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حالی نے ایسے موضوعات کا انتخاب کیوں کیا جو ان کے خیال اور نظریے کے مطابق لوگوں کو کچھ ایسا کرنے پر اکسائیں جو خود بھی یادگار بن سکے ، تو اس کے جواب میں یہی کہا جا سکتا ہے ۔ اول تو حالی کی نظرِ انتخاب کی یہی وجہ ہو سکتی ہے کہ وہ خود بھی شاعر تھے ۔ شاعر اگرچہ نہ سپہ سالار ہوتا ہے اور نہ ہی کوئی مصلح و موجد اور اس کی زندگی ان طوفانوں سے نا آشنا ہوتی ہے جو قومی اور ملکی پیمانوں پر جدوجہد اور عمل کرتے ہیں ، لیکن اگر اس کی شاعری میں وہ قوت ، توانائی اور پیغام ہوتا ہے جو اس کو زندہ رکھے تو وہ بجائے خود ایک معرکہ ہوتا ہے اور پھر شیخ سعدی کے پائے کا مصنف اور شاعر جو کہ محض ایک گوشہ عافیت میں بیٹھ کر قلم چلانے پر قانع نہ تھا ، بلکہ اکثر اپنا دفتر و قلم سنبھال کر سیر و سیاحت پر بھی نکل پڑتا تھا ، جو زندگی اور عمر کے کسی حصے کے متعلق یہ فیصلہ دینے پر تیار نہ تھا کہ اس منزل پر آ کر انسان کی سیکھنے اور سکھانے کی عمر ختم ہو جاتی ہے ۔ یقیناً اس نے تاریخ کے کسی مخصوص دور اور زمانے میں تہلکہ تو نہیں مچایا تھا اور نہ ہی کسی قوم کی ڈوبتی کشتی کو ترا دینے کا بیڑا اٹھایا تھا ، لیکن وہ اپنے وقت ، اپنی سوچ اور اپنے فکر و فن کو اس کر گیا ۔ ایک جاری و ساری پیغام کو زمانے کے سفر کا ساتھی بنا گیا ۔ اور اس کی یہی بڑائی و عظمت حالی کو بھا گئی تھی ۔

حالی کا فنِ سوانح نگاری

موضوع کے انتخاب کے بعد بات حالی کے فن کی طرف آتی ہے ۔ 'حیاتِ سعدی' کی تصنیف کو مولانا نے تین حصوں میں تقسیم کیا ہے : (۱) نظم و نثر پر تبصرہ (۲) شیخ سعدی

---

(۱) اس آخری قول کے بعد جو انہوں نے انگریز مصنف کے حوالے سے اپنے دیباچے میں لکھا ہے حالی کے نظریۂ سوانح کے متعلق مندرجہ ذیل امور صاف ہو جاتے ہیں ۔

الف ۔ بیوگرافی تازیانۂ عبرت ۔ ب ۔ پسماندہ قوموں کی رگ حمیت بیدار کرتی ہے ۔

ج ۔ نیکی کی تحریک پیدا کرتی ہے ۔ د ۔ اس کا مطالعہ بڑے اور عظیم کارناموں کی ترغیب دلاتا ہے ۔

کے حالات (۳) خاتمہ۔

لیکن تینوں حصوں میں اجمال کی سدت اور سر سری انداز سے کام لیا گیا ہے - مگر جب ہم حالی کی مشکلات ، یعنی سواد کی کمی ، اطلاعات اور معلومات کے فقدان کا جائزہ لیتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے کس درجہ مشکل کام انجام دیا ہے - بے شک انہوں نے ذرے سے توانائی حاصل کرنے کی کوشش کی ہے اور کاہ سے پہاڑ برآمد کیا ہے - باوجود انتہائی کوشش کے وہ تذکروں اور یاد گاروں میں سے شیخ کے متعلق یہی کچھ مواد فراہم کر سکے ہیں - لیکن انہوں نے محض تذکروں اور یاد گاروں ہی پر تکیہ نہیں کیا - بلکہ سرگورا وسلی کا انگریزی تذکرہ بھی دیکھا مگر وہاں بھی انہیں کوئی نئی چیز نہ مل سکی - اب حالی کے لیے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ وہ شیخ کی کلیات کے جامع علی بن احمد کے دیباچے ، چند انگریزی تصانیف اور خود شیخ کے کلام پر اکتفا کریں - لیکن ساتھ ہی 'حیات سعدی' کے مطالعہ سے محسوس ہوتا ہے کہ ابھی حالی کے اس نئے تجربے میں وہ پختگی نہیں آئی تھی جو اس فن کا تقاضا ہے اور انہی چند باتوں کی کمی یا زیادتی قاری پر بری طرح کھٹکتی ہے - مثلاً بعض بعض جگہوں پر جانبداری اور روا داری کا رویہ - دوسرے سعدی کے یہاں محبوب مذکر ہے اور سادہ رویوں کی تعریف کے سلسلے میں حالی اس الزام کو دور کرنے کی غرض سے مختلف تاویلیں پیش کرتے ہیں جو کمزور اور بے اثر محسوس ہوتی ہیں اور پھر شیخ کے مذہب کا ذکر چھیڑا اور اس مسئلے کو تاریکی ہی میں رہنے دیا اور یہ کہہ کر خاموش ہو گئے :

"ہم اس کو کسی خاص مذہب کا ثابت کر کے ایک ایسے شخص کو جو مقبولِ فریقین ہے ایک گروہ کا مقبول اور دوسرے گروہ کا مردود نہیں بنانا چاہتے" -

سب سے بڑا اعتراض اس سوانح عمری پر یہ کیا جاتا ہے کہ اس میں سعدی کو بطور معلّمِ اخلاق تو ابھارا گیا ہے ، لیکن اس کی شخصی اور انسانی حیثیت کو نظر انداز کر دیا گیا ہے - اس سلسلے میں معترض جب یہ محسوس کرتا ہے کہ سعدی کی نجی زندگی کے متعلق اطلاعات اور مواد کا فقدان حالی کے فن میں سدِّ راہ بن گیا تھا تو پھر وہ یہی کہہ سکتا ہے کہ :

"حیاتِ سعدی ہماری اردو سوانح نگاری کا اولین اور بیش قیمت سرمایہ ہے" -

حیاتِ جاوید

حالی کی دوسری سوانحی تصنیف 'حیاتِ جاوید' 'حیاتِ سعدی' کے پورے بارہ سال بعد منظرِ عام پر آئی یعنی اس کا سنہ تصنیف و اشاعت ۱۸۹۳ء تا ۱۹۰۱ء ہے - 'حیاتِ جاوید'

نہ صرف سرسید کی پہلی اور شاید آخری مفصّل سوانح عمری ہے، بلکہ یہ وہ معرکۃ الآراء سوانح عمری ہے جس نے تنقید و مخالفت کا بازار گرم کر دیا ۔ اس میں شک نہیں کہ حالی پر جا و بیجا لعن طعن کیا گیا تھا اور انہیں بے جا اعتراضات کا ہدف بنایا گیا ۔ ان پر غلو کی حد تک سرسید سے جانبداری کا الزام لگایا گیا ، لیکن یہ بھی بات ہے کہ اس سلسلے میں فنِ سوانح نگاری پر بڑی بحث و تمحیص ہوئی اور حالی کے مخالفین اور موافقین کے قلمی مباحثے اور مناظرے اس فن کا معیار بننے چلے گئے ۔

کہنے کو تو حالی کے لیے یہ کوئی مشکل بات نہ تھی کہ اپنے مرشد و محبوب قائد سرسید کے حالاتِ زندگی کو کتابی صورت دے دیں ۔ لیکن یہ تو اس فن کا ماہر ہی جان سکتا ہے کہ مصنف جس قدر صاحبِ سوانح سے قریب ہوتا ہے اسی قدر مشکل کا سامنا ہوتا ہے ۔ سوانح نگار کے لیے مواد و اطلاعات کی کمی اور قلت جس قدر مشکل اور دقت پیدا کرتی ہے اس سے کہیں زیادہ مواد و خبر کی کثرت آزمائش بن جاتی ہے ۔ ایک عزیز و محترم شخص کی زندگی کا ہر لمحہ مصنّف کے لیے قیمتی اورگراں بہا ہوتا ہے اس کی یاد داشت میں محفوظ واقعات کا ہجوم اس شخص اور قارئین کی امانت ہوتی ہے ۔ حق داروں تک ”حقوق رسانی“ یوں اور مشکل ہو جاتی ہے کہ ایسے لکھنے والے کے لیے کہ جس کا اپنے موضوع سے جذباتی تعلق ہو ردّ و قبول کا مرحلہ پلِ صراط پر گذرنے سے کم نہیں ہوتا ۔ اور پھر جب کہ شخصیت ہی ہمہ جہت ، ہمہ پہلو اور مسلّمہ عظمت کی حامل ہو تو اس طرح یہ اندازہ لگانا جا سکتا ہے کہ حالی نے اپنے ذمہ کس قدر مشکل کام لیا تھا ۔ سرسید ہمارے مُلی اور سیاسی مسائل کا وقتی مصلح نہ تھا اس کا کام ایسا دور رس اور نتیجہ خیز تھا کہ وہ آج بھی ہمارے سیاسی ادبی اور تہذیبی شعور میں موجود ہے ۔ ایسے شخص کی شخصیت نگاری بڑی ذمہ داری تھی ۔ حالی اس ذمہ داری اور اس کی مشکلات سے بخوبی واقف تھے ۔ لیکن وہ اس کام سے خائف یوں نہ تھے کہ اردو میں سوانح نگاری تو بہت سوں نے کی ہے ، مگر ان میں شاید کوئی بھی ایسا نہ تھا جس کے پاس سوانح نگار کا دل ہو ۔ اس میں شک نہیں یہ دل صرف حالی کے حصے میں آیا ۔ اس کام میں ان کو ایک دقّت یہ بھی پیش آئی تھی کہ ان کی اپنی فطرت بڑی حلیم ، عیب پوش اور در گذر کرنے والی تھی اور سرسید ایک متنازعہ فی شخصیت بنے ہوئے تھے ۔

یادگارِ غالب

حالی کی تیسری سوانحی تصنیف 'یادگارِ غالب' ہے جو انہوں نے شاید 'حیاتِ جاوید' کی ترتیب و تصنیف کے ساتھ ساتھ ہی مرتب کی تھی اس لیے کہ 'حیاتِ جاوید' کا تصنیفی عرصہ ۱۸۹۳ء تا ۱۹۰۱ء ہے اور 'یادگارِ غالب' کا سنہ تصنیف ۱۸۹۶ء ہے ۔ ایسا لگتا ہے کہ

حالی نے اپنی تمام تر توجہ اور قلمی قوتیں 'حیاتِ جاوید' پر صرف و مرکوز کردی تھیں اور اس لیے 'یادگارِ غالب' کو خاطر خواہ توجہ نہیں دے سکے ۔

'یادگارِ غالب' کے مطالعہ کے بعد ذہن سے ایک ہی صدا نکلتی ہے ، حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا ۔ غالب اور حالی کا تعلق اس نوعیت کا تھا کہ ان کی سوانح عمری لکھنا ان کے لیے نسبتاً زیادہ سہل اور دلچسپ کام تھا ۔ وہ اس سلسلے میں نہ تو مواد کی کمی کی شکایت کر سکتے ہیں اور نہ ہی انبوہِ واقعات میں الجھنے کا عذر ہو سکتا ہے ۔ غالب سے ان کو والہانہ عقیدت و شیفتگی بھی نہیں ہے جو لکھتے وقت قلم کو با ادب اور ہوشیار رہنے پر مجبور کرتی ہے ۔ وہ ان کے بزرگ معاصر تھے ۔ ان کی تھوڑی بہت شاگردی کا شرف بھی ان کو حاصل ہوا اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ غالب کی شخصیت متنازعہ فیہ نہ تھی ۔ ان کے خطوط اور یادداشتوں کا دلچسپ اور وافر ذخیرہ ان کا مآخذ بن سکتا تھا ۔ ان کی زندگی میں بقولِ خود حالی ''کوئی مہتم بالشان واقعہ بھی نہ تھا جو مصنف کو مرعوب کر دیتا'' ۔ انہوں نے اس سوانح عمری کو منتخب ہی یوں کیا تھا کہ غالب بحیثیت انسان ایک خاصے کی چیز تھے اور ان کی زندگی کی عمومیت میں کئی رنگ تھے ۔ چنانچہ اس انتخاب کی وجہ وہ یہ لکھتے ہیں :

> ''لیکن ان فائدوں سے قطع نظر کی جائے تو بھی ایک ایسی زندگی کا بیان جس میں ایک خاص قسم کی زندہ دلی کے اپنے شگفتگی کے سوا کچھ نہ ہو ۔ ہماری پژمردہ دل سوسائٹی کے لیے کچھ کم ضروری نہیں'' ۔
> (دیباچہ یادگارِ غالب ۔ ص ۸) ۔

لیکن ہمیں حالی کی متانت سے شکایت ہے کہ انہوں نے اس شگفتہ اور زندہ دل شخص کا بے رنگ عکس پیش کیا ہے ۔ وہ اس کا کوئی ایسا مرقع نہ تیار کر سکے جس کو غالبِ افسردہ دل کی افسردگی اور شگفتگی کے امتزاج کا جاندار مرقع کہا جا سکے ۔ انہوں نے تو غالب کی اس حد تک بھی تصویر نہ پیش کی جو آزاد نے 'آبِ حیات' کے مختصر تذکروں میں کر دی تھی ۔ اس کی بڑی وجہ حالی کا اسلوبِ نگارش ہے جس سے بیگانگی کا احساس ہوتا ہے ۔ حالی کا محتاط لب و لہجہ یہ تاثر دیتا ہے کہ لکھنے والا اپنے ہیرو سے بہت فاصلے پر ہے اور موضوع اور مصنّف کے درمیان قرب و یگانگت موجود نہیں ہے ۔ حالانکہ حقیقت یہ نہیں ۔ حالی مرزا کی صحبت میں خاصے بے تکلف رہے ہیں یہاں تک کہ انہوں نے ان کو نماز پڑھنے کی تلقین بھی کی تھی اور اس سلسلے میں کچھ رنجش بھی ہو گئی تھی جس کا ذکر بھی انہوں نے کیا ہے ۔

بہر حال یہ غالب کی پہلی اور باقاعدہ سوانح ہے اور جس کو مصنّف نے پوری

احتیاط اور احترام سے لکھا ہے یعنی محض دیکھی سنی باتوں اور اپنے اندازوں پر اکتفا نہیں کیا ہے ، بلکہ اپنے موضوع کو بے حد قریب سے دیکھنے اور جاننے کے باوجود تحقیق ، تفتیش و تلاش کے کسی موقع اور مآخذ کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا ۔

شبلی کی سوانح نگاری

حالی کے معاصر شبلی نعمانی ہیں ان کی سوانحی تصنیفات کا دور ۱۸۸۷ء سے تقریباً ۱۹۱۰ء تک ہے ۔

شبلی کو تو جلد یا بدیر چمکنا ہی تھا ۔ علی گڑھ کا ماحول اور سید کا فیض صحبت پا کر ان کی شہرت کا پودا بڑی سرعت سے پروان چڑھا ۔ شبلی نے بہت کچھ لکھا اور خوب لکھا ۔ ان کی انشائی قوت اور اسلوب کا جال بجائے خود ایک مستقل موضوع ہے ، لیکن یہاں ان کی سوانح نگاری ہی کا ذکر مناسب ہے ۔ اس سلسلے میں انہیں سر سید کی یہ تجویز بہت پسند آئی کہ سوانح نگار اگر نامور اسلاف میں سے اپنے اپنے پسندیدہ شعبوں اور موضوعات کا تعین کر کے تصنیفی سلسلہ قائم کریں تو کام سہل اور تعمیری ہو سکے گا ۔ چنانچہ انہوں نے فرمانروایان اسلام کو اپنے لیے پسند کیا اور اس پسند میں ان کے مزاج کی عظیم الشان کیفیات کا بڑا ہاتھ ہے ۔ وہ حالی کے برعکس خاموش قسم کے موضوعات کے بجائے زبردست اور انقلاب آفرین موضوعات کو زیادہ پسند کرتے تھے ۔ دوسرا سلسلہ جو انہوں نے اپنے لیے منتخب کیا تھا وہ علمائے اسلام کا تھا ۔ چنانچہ ان کی سوانحی تصنیفات کی فہرست حسب ذیل ہے :

(۱) المامون (۱۸۸۷ء - ۱۸۸۹ء) (۲) سیرت النعمان (۱۸۸۹ء - ۱۸۹۰ء)

(۳) الفاروق (۱۸۹۴ء - ۱۸۹۸ء) (۴) الغزالی (۱۹۰۲ء)

(۵) سوانح مولانا روم (۱۹۰۲ء) ۔

اور پھر اس کے بعد ۱۹۱۰ء تک تمام تحریری و تصنیفی سلسلہ قطع کرکے اس معرکۃ الآراء تصنیف پر تمام تر توجہ مرکوز رہی جس کے متعلق انہوں نے خود لکھا ہے :

عجم کی مدح کی ، عباسیوں کی داستاں لکھی
مجھے چندے مقیم آستان غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرت پیغمبر خاتم
خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

المامون[1]

شبلی نے ناموران اسلام کی جو فہرست بنائی تھی اس کے اعتبار سے مامون کا نام تیسرے نمبر پر آتا ہے ۔ لیکن ان کا مذاق تحقیق اور تاریخ و سوانح کا فنی احترام اس درجہ بڑھا ہوا تھا کہ وہ خاطر خواہ سواد کے بغیر لکھ ہی نہیں سکتے تھے ۔ چنانچہ مناسب یہی سمجھا کہ جس موضوع کے لیے مواد دستیاب ہو اسی سے آغاز کیا جائے ۔ چنانچہ 'المامون' ہی سب سے پہلے لکھنا شروع کی ۔ انہوں نے 'المامون' کے دیباچہ میں اپنے طریق کار کا اعلان کر دیا یعنی وہ 'ٹائم اینڈ لائیڈ' کے انداز پر لکھیں گے ۔

''تاریخ کے ساتھ لائف کا مذاق بھی موجود ہو'' ۔

(دیباچہ المامون ۔ ص ۴)

اور در اصل مامون کی سوانح عمری عہد عباسیہ کی تاریخ ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ 'المامون' میں سوانح کی مکمل اور مستقل صورت کے بجائے صرف جھلکیاں نظر آتی ہیں ۔ لیکن اس کے باوجود حالی کی 'حیات سعدی' کے بعد یہ دوسری نئی طرز کی سوانح عمری تسلیم کی گئی ہے ۔ اس سوانح عمری میں شبلی نے دلچسپ حکایتوں کی تکنیک سے فائدہ اٹھایا ہے اور اس طرح موضوع کو خشکی اور بے کیفی سے بچا لیا ہے ۔ امور مملکت اور مامون کی انتظامی صلاحیتوں اور آبادی کے سلسلے میں لکھتے لکھتے جیسے ہی ان کو خیال آتا ہے کہ ایسا نہ ہو کہ یہ تفصیلات قاری کی اکتاہٹ کا سبب بن جائیں ، فوراً کسی حکایت یا دلچسپ واقعہ کو اس تفصیل کی مثال کے طور پر لکھ دیتے ہیں ۔ اسی طرح تہذیبی اور ثقافتی جھلکیوں اور جزئیات کے لکھتے وقت ان کا قلم بڑی سبک روی سے چلتا ہے ۔

سیرۃ النعمان

شبلی کی دوسری سوانحی تصنیف 'سیرۃ النعمان' ہے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شبلی نے 'الفاروق' لکھنا شروع کی تو مواد کی کمی نے یہاں بھی کام میں رکاوٹ ڈالی ۔ اس سلسلے میں بعض نادر کتابیں یورپ میں چھپ رہی تھیں ۔ ان کے انتظار میں 'الفاروق' کا سلسلہ منقطع کرنا پڑا اور ۱۸۸۹ء میں 'سیرۃ النعمان' شروع کر دی ۔ یعنی امام ابو حنیفہ کی سوانح عمری شروع کر دی ۔ یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے ۔ حالات زندگی ، علم و فضل اور کارنامے ۔ دونوں حصوں میں شبلی نے واقعات کی صحت کا اہتمام کیا ہے ۔ صرف

---

(۱) تفصیلی بحث کے لیے دیکھیے اسی جلد کا چھٹا باب (شبلی) ۔

مستند واقعات سے ہی سروکار رکھا ہے اور یہ سب کچھ بڑے دلکش اور سائنٹفک[1] انداز میں لکھا ہے ۔

الفاروق

اپنے مواد کی تشکیل کے لحاظ سے شبلی کی لکھی ہوئی تمام سوانح عمریوں میں نمایاں اور ممتاز ہے ۔ اس کے مواد کے حصول کے لیے انھوں نے پورے ذوق و شوق سے کام لیا ۔ اس سلسلے میں انھوں نے ان تمام ممالک کا سفر کیا جہاں جہاں تک حضرت عمرؓ کے زمانے میں اسلامی فتوحات پہنچیں ۔ ان کا سوقِ تجسّس ان کو روم اور شام کے کتب خانوں میں بھی لے گیا ۔ غرضیکہ شبلی نے 'الفاروق' کے سلسلہ میں اس تمام تلاش و تفحص سے بھی کام لیا ہے جو حضرت عمر فاروقؓ عالمگیر شخصیت اور با اصول فرمانروا کی سوانح کے سلسلے میں بہت ضروری تھا ۔ ساتھ ہی انھوں نے اس تنظیم و ترتیب کو بھی اپنا اصولِ کار بنایا ہے جو کسی سوانح عمری میں دلکشی کے ساتھ ساتھ سلجھاؤ اور نظم و ضبط پیدا کرتی ہے ۔ چنانچہ حضرت عمرؓ کے سیاسی تدبر ، فرمانروائی کے سلیقے کو نمایاں کرنے کے ساتھ ساتھ انھوں نے بطورِ شخص بھی حضرت کے اس کردار کو بڑی چابکدستی سے ابھارا ہے جس کی قوت سے وہ خود بہت متاثر تھے ۔

---

(۱) یہ سائنسی نظریہ اور ذہن ہمیں شبلی کی تمام سوانحی تصنیفوں میں نظر آتا ہے ۔ انھوں نے اپنے پسندیدہ اور محترم ہیروؤں کو نہ تو فوق العادہ بتایا ہے اور نہ ہی ان کی غیر ضروری پردہ پوشی کی کوشش کی ہے ۔ مثلاً مامون سے جذباتی اور ذہنی لگاؤ کے باوجود نہ اس کی میخواری سے انکار کرتے ہیں نہ ہی اس کی بعض سنگدلانہ حرکتوں سے :

> "علامہ ابن خلدون نے تاریخ میں نہایت سختی کے ساتھ مامون کی بادہ نوشی سے انکار کیا ہے لیکن تاریخی سند کوئی نہ پیش کر سکے ۔ صرف حسن ظن پر تقریر کو طول دیا ہے تاہم نبیذ کا پینا تسلیم کیا ہے ۔ ابن خلدون کے تسلیم کرنے والے مجاز ہیں کہ ہماری کتاب میں مامون کی نسبت جہاں شراب کا ذکر آئے وہاں نبیذ سمجھیں" ۔
> (المامون ، حاشیہ ۔ ص ۵۸) ۔

یا

> "اس غیر متوقع فتح کی خوشی نے مامون جیسے رقیق القلب کو سنگدل بنا دیا اور اس نے اپنے بھائی کے خون آلود سر کو مسرت کی نگاہ سے دیکھا" ۔
> (المامون ۔ ص ۴۶) ۔

الغزالی

'الفاروق' کے بعد 'الغزالی' کا نام آتا ہے - یہ شبلی کی ان تصالیف میں سے ہے جو انہوں نے حیدر آباد میں لکھیں[1] -

شبلی کے تصورِ سوانح کو جان لینے اور گذشتہ دو سوانح عمریوں 'سیرۃ النعمان' اور 'الفاروق' کے جائزے کے بعد اس طریقِ کار کو سمجھنا چنداں مشکل نہیں جو انہوں نے 'الغزالی' میں برتا ہوگا ، لیکن نقاد ان کی اس سوانح عمری بلکہ 'سوانح عمری مولانا روم' سے کچھ زیادہ مطمئن نہیں نظر آتے ، جن میں سے بعض کا خیال ہے کہ شبلی نے اپنے عظیم الشان موضوعات کا حق ادا نہیں کیا[2] -

"یوں تو ان کی حیدر آباد کی ساری تصانیف پر ایک بے جان تکلّف چھایا ہوا ہے - لیکن غزالی اور مولانا روم کی سوانح عمریوں سے خاصی مایوسی ہوئی ہے"
(شبلی نامہ - ص ۱۱۲)

لیکن یہ کہنا نا انصافی ہوگی کہ شبلی نے ان سوانح عمریوں کو لکھتے وقت کسی قسم کے تحقیقی تساہل یا حق گوئی و صداقت سے چشم پوشی کی ہے - انہوں نے ان کمزوریوں کو جہاں کہیں بھانپا ہے وہیں اس کو منظرِ عام پر لائے ہیں - مثلاً امام غزالی کی طبیعت کی جاہ پرستی اور شہرت کی طرف میلان کے متعلق لکھتے ہیں :

"درس و تدریس کی طرف طبیعت کا میلان اس وجہ سے تھا کہ وہ جاہ پرستی اور شہرتِ عامہ کا ذریعہ تھی" - (الغزالی - ص ۶۴)

سوانح عمری مولانا روم

سلسلۂ کلامیہ کی دوسری سوانح عمری مولانا جلال الدین رومی کی سوانح عمری ہے لیکن در اصل اس میں شبلی نے ان کے فن اور کلامِ فکر پر زیادہ توجہ دی ہے - شخصی

---

(۱) حیدر آباد کے مقام کی تخصیص یوں ضروری ہے کہ یہاں آکر شبلی کا تصنیفی محور بدل گیا تھا - ان دنوں مولانا پر 'علم الکلام' کا رنگ گہرا تھا اور وہ اسی نہج پر سوچ رہے تھے ، یہاں تک کہ :

"غزالی اور رومی کی سوانح عمریوں کو بھی علم الکلام کی کتابیں بنا دیا" -
(شبلی نامہ - ص ۱۲۲)

(۲) ان اعتراضات کا بڑا سبب اور پس منظر میں یہ وجہ بھی ہے کہ شبلی 'حیات جاوید' پر تنقید کرتے وقت اصول فن سوانح کے بڑے سخت اصولوں سے بحث کی ہے اور بعد میں اسی کڑے معیار پر ان کی اپنی سوانحی تصنیفات کو پرکھا گیا ہے -

اور ذاتی رنگ کی پرواہ نہیں کی ہے ۔ البتہ ان کے شوق ، تجسس اور علمی موشگافیوں کی داد دینا پڑتی ہے اور مہدی افادی کے اس تقریظی مضمون میں کچھ زیادہ مبالغہ نہیں ہے[۱] ۔

سیرت النبی

'سیرت النبی' شبلی کی آخری سوانحی تصنیف ہے ۔ جسے شبلی نے حاصل حیات قرار دیا ہے جیسا کہ پہلے ذکر آ چکا ہے 'سیرت النبی' ایک ایسا موضوع ہے کہ جس پر قلم اٹھانا ہر سیرت نگار اپنا فرض عین سمجھتا اور نجات اخروی کا ذریعہ ۔ رسول اکرم کی سوانح عمریاں بہت لکھی گئیں ، لیکن نہ تو اردو میں آپ کی سیرت نگاری کے خصوصی اصولوں کا تعین کیا گیا تھا نہ کام کو خاطر خواہ طور پر نبھایا گیا تھا ۔ مرزا حیرت کے بقول لکھنے والے آپ کی آنکھ ، بھوؤں کی تعریف سے آگے نہ بڑھتے تھے ۔ بیان اور اسلوب کی رنگینی ، موضوع کی دلکشی پر حاوی رہتی تھی اور اس طرح آپ کے اوصاف ، کردار اور بشری شخصیت سامنے آ ہی نہ سکتی تھی ۔

شبلی نے اس سیرت کو قلم بند کرنے سے قبل اصول سیرت النبی پر فکر کی ، اور ایک معیار بنایا کہ اس عالمگیر شخصیت کو کس طرح تحریر و سوانح کی گرفت میں لایا جا سکتا ہے ۔ جس کا لقب رحمت عالم ہے اور جو ایک مکمل آئین و دستور حیات کے ساتھ ساتھ روحانی اور نفسانی نظم و ضبط کا بہترین لائحہ عمل لایا تھا ۔

چنانچہ 'الفاروق' اور 'الغزالی' کی تکمیل کے بعد ۵ ۔ جون ۱۹۰۳ء /۲۸۔ ربیع الاول ۱۳۱۲ھ کو حیدر آباد ہی میں اس پر کام شروع کیا[۲] ۔ وہ اس کو بلند سے بلند تر معیار پر پیش کرنا چاہتے تھے ۔ چنانچہ انہوں نے اس سلسلے میں معیار قائم کیا تھا ۔ ان کے پیش نظر یورپین سوانح نگاروں کی لکھی ہوئی آنحضرت کی متنازع فیہ سوانح عمریاں بھی تھیں ۔ خصوصاً آکسفورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر مارگولیتھ کی تصنیف بڑے مسموم اثرات کی حامل تھی اور اس تاثر کو زائل کرنے کی ذمہ داری شبلی نے قبول کی تھی ۔

---

(۱) مہدی افادی کا مضمون ''ایک گھنٹہ پروفیسر شبلی کی صحبت میں'' ۔

(۲) حیات میں مصنف نے قیاساً لکھا ہے کہ ''معلوم ہوتا ہے کہ جس انداز سے وہ اس کو لکھ رہے تھے وہ خود ان کو پسند نہیں آ رہا تھا اور غالباً یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ہمیشہ اس کو راز رکھا اور سارے مکتوبات میں ایک حرف ، بھی اپنے دوستوں میں سے کسی کو نہیں لکھا
(حیات شبلی ۔ ص ۰۰۷)
لیکن یہ قیاس کچھ زیادہ درست نہیں معلوم ہوتا ۔ ممکن ہے وہ اس کام کو ایک مقدس اسرار کے طور پر کرنا چاہتے ہوں اور سوچتے ہوں کہ جتنا زیادہ چرچا ہوگا اسی قدر اس کام کے تقدس اور اسرار میں کمی آئے گی ۔

انہوں نے پرانے میلادی اسالیب کو یکسر ترک نہیں کیا ہے بلکہ آنحضرت کی ولادت کے بیان کو روایتی انداز ہی میں تحریر کیا ہے۔ اس میں انہوں نے قدیم و جدید ، عقیدت و تحقیق کا جتنا دلکش اور متوازن امتزاج قائم کیا یہ ان ہی کا حصہ تھا ۔ اس انداز کی سیرت نگاری ، جس میں ایک طرف تاریخ کی صداقت تھی ، دوسری طرف فنونِ لطیفہ کی سی باریکی اور اور نفاست تھی ، کے لیے ۱۹۰۳ء سے ۱۹۱۴ء تک کا عرصہ کم ہے لیکن پیامِ اجل نے شبلی کو مہلت نہ دی اور اس کی آخری جلد کی تکمیل ان کے شاگردِ رشید سید سلیمان ندوی نے کی ۔

حالی و شبلی کے معاصر سوانح نگار

حالی و شبلی کی تنقیدوں ، نظریات اور سوانحی تصنیفوں نے اردو سوانح نگار کا راستہ ہموار کر دیا تھا ۔ وہ نیا تصور جو حالی اور شبلی کی اردو سیرت نگاری میں داخل ہوا ، اتنا دلکش اور دلچسپ تھا کہ لکھنے والوں نے بکثرت اس طرف توجہ دی اور محسوس یہ ہوتا ہے یہ اور اس کے بعد تک کا ایک معقول عرصہ سوانح نگاری ہی کا دور ہے ۔ افسوس یہ ہے کہ برِصغیر میں لکھی جانے والی یہ تمام کی تمام تصنیفات یا تو باقی نہیں ہیں یا پھر نایاب ہیں ۔ اس لیے بہتر یہ ہے کہ چند امتیازی ناموں اور تصنیفات پر ہی روشنی ڈالی جائے ۔

اس عہد کے مشہور لکھنے والوں میں مرزا حیرت دہلوی ، احمد حسن خان ، مولوی احمدین، مولوی ذکاء اللہ ، فیروز الدین ڈسکوی ، سراج احمد ، عبدالحلیم شرر ، منشی محمد الدین فوق ، خواجہ غلام الثقلین ، قاضی سلیمان اور عبدالرزاق کانپوری ہیں[1] ۔

مرزا حیرت

مرزا حیرت دہلوی کو سوانح نگاری کا خاصہ سلیقہ ہے ۔ یوں بھی انہوں نے بکثرت تصنیفات پیش کی ہیں اور سوانح عمریاں بھی بہت لکھی ہیں ، لیکن صرف چند دستیاب ہیں : (۱) حیاتِ طیبہ (۲) حیاتِ فردوسی (۳) سیرۃِ محمدیہ (۴) نورتن اکبری مع سوانح اکبری ، (۵) سوانح عمری زیب النساء بیگم ۔

یہ وہی مرزا حیرت ہیں جنہوں نے عہد یہ میں سیرت نگاری کے مروجہ پہلو پر اعتراض کیا تھا اور انہیں سیرت نگاری کے لیے معیار اور طریقِ کار کی تلاش تھی ۔ 'حیاتِ طیبہ' شاہ

---

(۱) سوانح نگاروں کی اس فہرست میں سے ان ہی ناموں اور تصانیف کا ذکر کیا جائے گا جن کی سوانح نگاری قابلِ ذکر ہے یا کسی لحاظ سے اہم ہے ۔

اسمٰعیل شہید کی سوانح عمری ہے اور اس کا سنِ تصنیف ۱۸۹۴ء/۱۳۱۲ھ قدسی ہے -

یہ کتاب تین اہم حصوں میں منقسم ہے - دیباچہ ، پہلا حصہ ، دوسرا حصہ - اس کتاب کے مطالعے سے محسوس ہوتا ہے کہ مرزا صاحب شبلی کے انداز سے متاثر ہیں - انھوں نے وہ سارا سماجی اور تاریخی پس منظر بیان کیا ہے جو شاہ اسمٰعیل شہید نے آنکھ کھول کر دیکھا - اس کے علاوہ عوامی اور درباری زندگی کا تاریخی اور سماجی پس منظر بھی قدرے طوالت سے لکھا ہے - مرزا صاحب نے اپنے موضوع کو ایک سیاسی ، مذہبی اور شخصیت کے طور سے ہی نہیں بلکہ بحیثیت انسان بھی سمجھا ہے - چنانچہ ان کے اوائل عمر کے مشغلے ، ان کی تعلیم اور ذہنی نشو و نما کا ذکر ، لڑکپن اور جوانی کے رجحانات اور مشاغل کا بھی ذکر موجود ہے - کتاب کے بیشتر حصہ پر سیاسی رنگ غالب ہے - دوسرا حصہ مولوی سید احمد بریلوی کے حالات پر مشتمل ہے اس لیے کہ ہر دو حضرات کا نام اور ذکر ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہے - مرزا حیرت کے فن کے بتدریج مطالعے سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ حالی سے بھی متاثر ہیں - اس دور کے سوانح نگار کو اس وقت تک تسلی نہیں ہوتی جب تک کہ وہ اپنے ہیرو کی عظمت کے ثبوت کے طور پر یورپین مؤرخین کی آراء اور حوالوں کو شامل نہ کریں - مرزا حیرت نے بھی یہ طریقِ کار اپنایا ہے -

مرزا حیرت کی بقیہ دو سوانحی تصنیفات بھی اسی نہج اور تصور کے تحت لکھی گئی ہیں - البتہ 'سیرت محمدیہ' اس مناظرانہ رجحان کی آئینہ دار ہے جو عہدِ سرسید کا امتیازی وصف تھا - یعنی اکثر سیرتیں اور مذہبی کتابیں اس نقطۂ نظر سے لکھی جا رہی تھیں جو یورپ کے مستشرقین کی بے بنیاد الزام تراشیوں اور غلط بیانیوں کا ازالہ کر سکیں - ان کی کتابوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا حیرت ، حالی اور شبلی سے متاثر ہونے کے باوجود اپنا الگ رنگِ طبیعت رکھتے تھے یعنی تیز و تند اور مناظرانہ - اس کے علاوہ ، اچھے خاکہ نویس بھی تھے - ان کی تصنیف 'نورتنِ اکبری مع سوانح اکبر' اس کی ... ہے - اس میں اکبر کے نو رتنوں کے جداگانہ خاکے ان کی اس صلاحیت کی غمازی کرتے ہیں - اسی طرح زیب النساء بیگم کی سوانح عمری پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ مرزا حیرت میں شخصیت نگاری کا جوہر بھی موجود تھا اور اس کے صحیح تصور سے بھی وہ آشنا تھے - اس کے دیباچے کو پڑھ کر ایک بار بھی ان کی اسلاف پرستی کا احساس نہیں ہوتا ہے - ساتھ یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ اس دور کے لکھنے والے سرسید اور حالی کی تقلید میں کس بے تکلفی سے انگریزی الفاظ کو اپنی تحریروں میں استعمال کرتے تھے - مشہور اور سنے سنائے واقعات بھی تحریر کیے ہیں - مثلاً اس کا علم ہیئت سے شغف اور بوڑھی استانی سے سوالات وغیرہ جیسے واقعات سے اس کی ذہانت و علمیت کو نمایاں کیا ہے -

جہاں کہیں وہ تہذیبی و ثقافتی جھلک پیش کرتے ہیں داستانی رنگ غالب آ جاتا ہے ۔ مثلاً ایران کے عباس شاہ ثانی کے فرزند شاہزادہ فرخ نے جو دعوت زیب النساء بیگم کو دی تھی اس کا جزئیاتی بیان داستانی رنگ میں بیان کیا ہے ۔

فیروز الدین ڈسکوی

اسی زمانے اور قبیل کے لکھنے والوں میں ایک قابل ذکر نام فیروز الدین ڈسکوی کا ہے ۔ ان کی فقط ایک ہی کتاب دستیاب ہے ۔ 'سیرت النبی ، پیارے نبی کے پیارے حالات' اس کتاب کی غرض مصنف نے کتاب کے دیباچے کی اولین سطور ہی میں بیان کر دی ہے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارک اور اسلام کی صداقت کو بالتفصیل بیان کرنا چاہتے ہیں ۔ اس کے علاوہ اس کے ضمن میں قرآن حکیم کی مختلف سورتوں کا مقام اور زمانہ نزول درست اور صحیح طور پر دانا چاہتے ہیں ۔ اس کتاب میں تذکرہ نگاری ، سیرت اور تاریخ سے مدد لی گئی ہے ۔ یہ کتاب ۱۹۰۷ء میں شائع ہوئی ۔ اس کا اسلوب سادہ اور عقیدت مندانہ ہے ۔ فیروز الدین ڈسکوی کی چند اور بھی تصنیفات ہیں جن میں 'غوث اعظم'، 'تاریخ محمدی'، 'یادگار سعیدی'، 'یادگار وکٹوریہ' ، وغیرہ کے علاوہ ایک 'تذکرہ شعرائے اردو' بھی ہے ۔ افسوس کہ ان کی بقیہ تصنیفات نایاب ہیں اور اس لیے ان کے متعلق کوئی رائے قائم نہیں کی جا سکتی

منشی محمد الدین فوق

اسی دور کے لکھنے والے منشی محمد الدین فوق ہیں ۔ ان کی متعدد سوانحی تصانیف ہیں :

۱ ۔ 'ابوالحسن ملا دو پیازہ' ، 'مہاراجہ رنجیت سنگھ' ، 'کشمیر کی رانیاں' ، 'یاد رفتگان' ، 'غنی کاشمیری' ، 'للہ عارفہ' ، 'تذکرہ خواتین دکھن' ، 'ملا عبدالحکیم سیالکوٹی' ، نور جہاں اور جہانگیر' کی سوانح عمریاں ۔ فوق صاحب کی چند تصنیفات دستیاب ہو سکی ہیں ۔ 'حسن' 'للہ عارفہ' ، 'نور جہاں اور جہانگیر' ، 'تذکرہ خواتین دکھن' اور' ملا عبدالحکیم سیالکوٹی' ۔

للہ عارفہ کشمیر کی ایک خدا رسیدہ خاتون کا ذکر ہے جو فقر و سلوک میں اہمیت رکھتی ہے ۔ اس عارفہ کا تذکرہ 'تاریخ کبیر کشمیر' کے مصنف اور کئی انگریز تذکرہ نگاروں نے

بھی کیا ہے - انداز بیان خشک اور سرسری ہے - موضوع زندگی کی خفیف سی جھلک بھی نہیں ملتی - 'تذکرۂ خواتین دکن' موڑ خانہ مقصد کا تذکرہ ہے جس میں سوانحی عنصر تقریباً مفقود ہے - فوق صاحب کی تیسری کتاب یعنی 'نور جہاں اور جہانگیر'، مناظرانہ مقصد کے تحت لکھی گئی ہے - مرزا حیرت کے بعض بیانات کی تردید منظور ہے اور اسی مقصد پر زور دیا ہے -

ملا عبدالحکیم سیالکوٹی - ملک العلماء علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی کی یہ سوانح عمری لکھتے وقت فوق پر حالی کی سوانح نگاری کا تاثر معلوم ہوتا ہے - یوں معلوم ہوتا ہے کہ حالی کی لکھی ہوئی سوانح عمریاں زیر مطالعہ رہی ہیں - علامہ کے تفصیلی حالات کے علاوہ ان تصانیف اور دوسری خدمات پر بھی تبصرہ کیا ہے - فوق کی جملہ تصانیف ایک ہی تاثر دیتی ہیں کہ وہ اچھے سوانح نگار نہیں -

عبدالرزاق کانپوری مصنف 'البرامکہ'

برصغیر میں اردو سوانح نگاری کی تاریخ نامکمل رہے گی اگر اس سلسلے میں اردو کے ایک قابل ذکر تذکرہ 'البرامکہ' کا ذکر نہ کیا جائے - اگر یہ کہا جائے کہ 'البرامکہ' اس عہد کی ناقابل فراموش تصنیف ہے تو بے جا نہ ہوگا - یہ ایک ایسا تذکرہ ہے جس میں مصنف نے تاریخ، تذکرے اور سوانح کا اتنا دلکش سنگم بنایا ہے کہ اس کی جس قدر بھی تعریف کی جائے کم ہے - تاریخ اور سوانح کے نقادوں نے مورخ اور سوانح نگار کا فرق ان الفاظ میں بیان کیا ہے :

> ''سوانح نگار اور مورخ کا فرق پوسٹ مارٹم کرنے والے ڈاکٹر اور آپریشن کرنے والے سرجن کا سا ہے - اول الذکر بے دردی و بے رحمی سے کانٹ چھانٹ کرتا ہے اور مؤخر الذکر احتیاط، نرمی اور ہمدردی سے نازک رگوں کو چھیڑتا ہے'' -

ظاہر ہے کہ یہ بڑا زبردست فرق ہے، لیکن اگر کسی میں ہر دو صلاحیتیں جمع ہو جائیں تو ظاہر ہے کہ وہ دونوں کاموں سے خوش اسلوبی سے عہدہ برآ ہو سکتا ہے - عبدالرزاق مصنف 'البرامکہ' ایک ایسے سرجن بن کر سامنے آتے ہیں جس کے اندر دونوں صلاحیتیں یکساں طور پر موجود ہیں - چنانچہ جہاں تک سوانح نگاری کا تعلق ہے انھوں نے ایک اچھے سوانح نگار کا فرض ادا کیا ہے، لیکن جہاں حقائق اور واقعات کی بات آتی ہے

ان کا رویہ مورخ یا سائنسدان کا سا ہو جاتا ہے یعنی وہ اپنے موضوع اسی زاویے سے دیکھتے ہیں جس سے انہیں کام لینا ہوتا ہے ۔ اس تذکرے میں سب سے زیادہ نازک مقام و موقع وہ آتا ہے جب وہ آل برمک کے عروج و زوال کی داستان بیان کرتے ہیں اور یہاں آ کر یہ مرحلہ درپیش ہوتا ہے کہ ایک طرف ان کو برامکہ کے اس انجام کا دلی تاسف اور قلق اور دوسری طرف وہ اس خانوادے خصوصاً جعفر برمکی کی بد اعتدالیوں اور بدعنوانیوں سے بھی انکار نہیں کرتے ۔ وہ اگر ایک جگہ یہ لکھتے ہیں کہ ''زمانہ جاہلیت کو اگر حاتم طائی پر فخر ہے تو عہدِ اسلام کو فضل پر ناز ہے'' ۔ تو دوسری جگہ یہ لکھتے نہیں ہچکچاتے کہ فضل بعادت خوب پسند تھا ، ان کی یہی سچائی اور دوسری طرف صاحبِ سوانح سے ہمدردی و الفت ان کی سوانح نگاری کی معراج بن گئی ہے ۔ اس میں شک نہیں 'البرامکہ' ایک قابلِ قدر اضافہ ہے جو عہدِ سرسید نے اردو سوانح میں کیا ۔

حکیم احمد حسن

اسی دور کے ایک اور لکھنے والے حکیم احمد حسن ہیں جنھوں نے 'حیات اصلاح الدین' ۱۸۹۷ء میں اور 'حیات نور الدین زنگی' ۱۹۰۰ء میں لکھی ۔ حکیم احمد حسن حالات و واقعات کے سلسلے میں تحقیق و تلاش کو اہمیت دیتے ہیں اور اس سلسلہ میں خاصی محنت سے کام لیتے ہیں ۔ ''مجھے اس سوانح کے لکھنے میں بڑی بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا'' ۔ موضوع سوانح کا انتخاب اور اس سلسلے میں تحقیق و تلاش کا مذاق بتاتا ہے کہ مصنف کا ذہن شبلی کے طریق کار سے متاثر اور قریب ہے وہی ٹائم اینڈ ٹائیڈ Time and Tide یعنی تاریخی اور سوانحی انداز پر کام کرنا ۔ حکیم صاحب کے ماخذ ، ابنِ اثیر کی 'ایامِ اتابکہ' اور 'ابنِ ابی طے' ، 'رئیس ابوالعلی' ، 'قاضی ابنِ شداد' ہیں ۔ 'انتخابِ واقعات اس انداز سے کیا ہے کہ نور الدین محمود کی شخصیت خود بخود چمک کر سامنے آتی ہے ۔ اچھی سوانح نگاری کا معیار ہی یہ ہے کہ کم سے کم واقعات بیان کرکے شخصیت کا زیادہ سے زیادہ تاثر دیا جائے اور حکیم احمد حسن نے یہ تاثر قاری کے جذبات سے کھیلے بغیر پیدا کیا ہے ۔ ہیرو کی شرافت اور عالی حوصلگی کی شہادت عیسائی مؤرخ ارچر کے حوالے سے نمایاں کی ہے ۔ ان کا لب و لہجہ سلجھا ہوا اور متین ہے ، نور الدین کے معاوضوں اور معرکوں کے سلسلے میں بھی رہوارِ قلم کی باگوں کو مضبوطی سے اپنے قبضے میں رکھا ہے ۔ کہیں ذاتی نظریے یا جذبے کو غالب نہیں آنے دیا ہے ۔ سب سے بڑی تکنیک جو انہوں نے برتی ہے وہ یہ ہے کہ مختلف الخیال مصنّفین کے حوالے اور مآخذ سے بات کی ہے ۔ مثلاً ابنِ ابی طے نے نور الدین کی تنقیص بھی کی ہے ۔

حکیم صاحب کی دوسری تصنیف 'حیاتِ صلاح الدین' اگرچہ دستیاب نہیں ، لیکن

اغلب یہی ہے کہ یہی رویہ اور طریقِ کار برتا گیا ہوگا ۔

منشی احمد شفیع

ریاست بہاولپور کے نائب وزیر منشی احمد شفیع صاحب نے بھی اس صنفِ ادب میں طبع آزمائی کی ہے اور ان کا "تذکرۂ تیمور" ۱۸۹۲ء میں مطبع رحمانی لاہور سے شائع ہوا ۔ اس کتاب کے سرِ ورق پر یہ تحریر ہے ۔

"لطف انگیز و نتیجہ خیز سوانح عمریوں کا سلسلہ"

اس دور کی لکھی ہوئی سوانح عمریوں کے دیباچے بڑی اہمیت رکھتے ہیں اور محسوس ہوتا ہے کہ کس طرح تمام کے تمام لکھنے والے اس صنفِ ادب کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا لینے کی فکر میں تھے ۔ چنانچہ یہ اپنے دیباچے میں لکھتے ہیں :

> سوانح کے قواعد محتاجِ بیان نہیں ۔ زمانۂ حال و گذشتہ کے نامور فلاسفروں ، عالیہ دماغ اعیانِ سلطنت اور ترقی کے اولوالعزم مسافروں کے اطوارِ زندگی اپنے نقشِ قدم پر چلنے کی سفارش کرتے ہیں" ۔ (دیباچہ تذکرۂ تیمور)
> یہ امر مسلم الثبوت ہے کہ بہ نسبت الفاظ کے تمثیلیں ہمیشہ کارگر ثابت ہوا کرتی ہیں" ۔

پھر اخیر میں لکھتے ہیں "ہمارے ملک کو مارل ، سوشل ، ایجوکیشنل ترقی کے لیے اس قسم کی تصانیف کی ضرورت ہے" ۔ مصنف نے آغاز دلچسپ اور بے ساختہ الفاظ میں کیا ہے اور یوں لگتا ہے کہ جیسے وہ کسی ناول کا آغاز کر رہے ہیں ۔ "موسمِ بہار ۱۳۳۶ء میں شوقِ نظارہ ایک سیاح کو آسمان سے باتیں کرتے ہوئے مینارِ سمرقند پر چڑھا لے گیا" ۔ آغاز ہی نہیں منظر کشی کے سلسلے میں تاریخ و تخیل کو بڑی دلآویزی سے باہم دگر کر کے حقیقت و تخیل کا دلکش امتزاج پیش کیا ہے ۔

> "اس بلند مینار پر چڑھ کر سیاح نے جب اپنی نظر چاروں طرف دوڑائی تو دیکھا نصف ایشیاء میں شمال مشرق اور مغرب کی جانب اسٹپز کے ہزارہا میل لمبے میدان ، ہری ہری گھاس کے مرغزاروں سے لہلہا رہے ہیں ۔ ان میں بیسیوں دریا بعد کے سبب مقیش کے تاروں کی طرح چمک رہے ہیں" ۔

تخیل کی اور حقیقت کی رنگ آمیزی کے ساتھ ساتھ ہر بات حوالے اور تحقیق سے کہی ہے ۔ حواشی میں حوالہ جات درج ہیں ۔ خیموں کے بیان کے سلسلے میں جو استفادہ خاص طور

کی مشہور انگریزی نظم 'لالہ رخ' سے کیا ہے اس کو تحریر کر دیا ہے ۔ اسی طرح روی گانر لیز دی کلاویجو کے حوالے سے تیمور کے خیمہ کا کروفر اور اس کی ملکہ کے حسن و جمال اور سنگھار کو بیان کیا ہے ۔ البتہ ایک کمی ضرور محسوس ہوتی ہے کہ تیمور کی عسکری صلاحیتوں اور مشاغل کا پیالہ تشنہ ہے جس کی وجہ ماخذ اور اطلاعات کی کمی ہے ۔

محمد احمد سعید مارہروی

محمد احمد سعید مارہروی 'حیاتِ خسرو' کے مصنف ہیں ۔ ان کی یہ تصنیف ۱۹۰۳ء میں شائع ہوئی ۔ سوانح عمری کی ترتیب میں حالی اور شبلی کا طریقِ کار یعنی حالاتِ زندگی اور ان کی تصنیف و تالیف ، ذہانت اور طباعی ایجاد و اختراع کے ذکر کے علاوہ جناب سلطان المشائخ نظام الدین اولیاء کے حالات مختصر طور پر درج ہیں ۔ محمد سعید احمد مارہروی کا نظریۂ سوانح بھی اپنے عہد اور عصر کے تصور کے مطابق ہے ، یعنی سلف کے مشاہیر کے کارنامے افسردہ قوم کے ولولے بڑھاتے ہیں ۔ اگرچہ یہ تشنہ سی سوانح عمری ہے تاہم امیر خسرو کے حالاتِ زندگی پر پہلی کتاب ہے ۔ اس وقت ان کے اس قدر حالات بھی جمع کر لینا بہت بڑی بات تھی ۔ مصنف کی خسرو سے عقیدت انتہا کو پہنچی ہوئی ہے ۔ اس لیے ان سے کسی نکتہ چینی یا تنقید کی توقع عبث ہے ۔ ویسے بھی ان کے ابتدائی حالات تقریباً مفقود ہیں ۔ البتہ صاحبِ سوانح کے حوالے سے کئی ایسے واقعات لکھے ہیں جن سے ان کے تصورات اور کردار پر روشنی پڑتی ہے ۔

متفرق سوانح عمریاں

آئینۂ سکندری

۱۸۹۴ء کی ایک تصنیف 'آئینۂ سکندری' یعنی سکندرِ اعظم ہے جس کے مصنف کا نام درج نہیں ہے بلکہ کارپردازان پیسہ اخبار مطبع خادم التعلیم پنجاب لاہور باہتمام منشی محبوب عالم درج ہے ۔

مشاہیر کا تذکرہ اور سوانح اس عہد کا مروجہ مذاق تھا ، چنانچہ سکندر کے حالاتِ زندگی بھی اسی سلسلے میں اور اسی افادی مقصد کے تحت لکھے گئے :

> "یوں تو ہر ملک میں تذکرات المشاہیر بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھے جانے کے قابل ہوتے ہیں ، لیکن ہمارے ملک کے برابر ان کی ضرورت فی زمانہ کہیں نہیں" ۔ (دیباچہ)

وہی تکنیک ہے جو شبلی نے مشاہیر کے سلسلے میں استعمال کی ہے یعنی ملکی سیاست اور غیر ملکی اثرات و سیاست کو پس منظر کے طور پر بیان کیا گیا ہے ۔ مآخذوں کے سلسلے میں بھی صداقت کا بڑا اہتمام کیا گیا ہے ۔ چنانچہ 'سکندر نامے' کو اس بناء پر زیادہ قابلِ اعتناء نہیں سمجھا گیا یوں کہ :

''جب کہ تحریرِ کتاب کے وقت مصنف کا مطلب صرف اظہار شاعری اور لیاقت کا ہو اور دانستہ صحت مطالبِ تواریخی کی جانب نظرِ اغماز سے دیکھے تو کس طرح امید ہو سکتی ہے کہ واقعات تواریخی صحیح رہ جاویں'' ۔

چنانچہ، کوشش یہ کی گئی ہے کہ خود یونانی حوالوں اور ماخذ سے بات کی جائے ۔ اس دور کے رواج اور فیشن کے مطابق بے تکلف انگریزی الفاظ عبارت میں موجود ہیں :

''ایک دفعہ کا ذکر ہے کوئی سوداگر ایک نادر گھوڑا بیوئی فل فیلقوس کے پاس لایا'' ۔

کتاب بیشتر اس کی مہمات کے مختصر جائزے پر مشتمل ہے ، لیکن جا بجا شخصی پہلو پر روشنی پڑتی جاتی ہے ۔ در اصل ان کتابوں پر تنقید کرتے وقت ہمارے ذہن میں شخصیت اور سوانح کا فرق موجود ہونا ضروری ہے ۔ شخصیت نگاری کی تمام تر توجہ فرد کی داخلی اور خارجی زندگی ، کیفیات اور کردار پر ہوتی ہے ۔ سوانح نگار کے پیشِ نظر ایک پورا عہد اور دور ہوتا ہے جس کے ایام کے الٹ پھیر میں کسی فرد کا ہاتھ ہوتا ہے اور اس فرد کی شخصیت کے ابھرنے میں اس وقت کا ہاتھ ہوتا ہے ۔ اس دور میں شخصیت سے زیادہ یہ پیش کرنا مقصود تھا کہ کسی مخصوص دور میں کوئی شخص کس طرح ابھرا اور اپنے زمانے کی تاریخ پر اثر انداز ہوا ۔

آئینۂ داغ

'آئینۂ داغ' ریاست جموں و کشمیر کے سر رشتۂ تعلیم کے سابق ڈائرکٹر محمد نثار علی شہرت نے لکھی اور ۱۹۰۵ء میں اسلامیہ پریس لاہور نے شائع کی ۔ مجموعی طور پر یہ ایک ناقص سوانح عمری ہے ، جس میں اپنا ذکر غیر ضروری حد تک ہے ۔ کسی شخصیت کو لکھتے وقت اس کے تعلق یا کسی نسبت کی بناء پر اپنے ذکر میں منہمک رہنا ایک طرح کی خیانت ہے ۔ تمہید سے توقع تو یہی ہوتی ہے کہ ایک ایسا شخص جو اپنے صاحبِ سوانح کے ساتھ ربط ہی نہ رکھتا ہو بلکہ بے تکلف اس کے ساتھ اٹھا بیٹھا ہو ، داغ جیسے

شوخ طبع شاعر کا جیتا جاگتا اور دلچسپ مرقع پیش کرے گا مگر ان وراق میں داغ کی شخصیت دور دور نہیں ملتی ۔

یادگارِ ذوق

'یادگارِ دوق' کے مصنف ظہور الدین وحشی ہیں ۔ خادم التعلیم پریس لاہور سے یہ کتاب طبع ہوئی ۔ مولانا محمد حسین آزاد نے ذوق کی جو شخصیت اور خاکہ 'آبِ حیات' میں پیش کیا ہے ، یہ اس سے بہت مختلف ہے ۔ ذوق اور ان کے معاصرین کی چشمکوں کا ذکر سرسری ہے ۔ سب سے عجیب بات یہ ہے کہ مولانا آزاد جن کو اپنے استاد سے بڑا لگاؤ اور عقیدت ہے کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں وہ اپنے استاد کی بیاض اپنے ساتھ لینا نہ بھولے ، ان کا نام ذوق کی فہرستِ تلامذہ میں شامل نہیں ۔ مصنف کا طرزِ تحریر البتہ ہمدردانہ اور مشفقانہ ہے ۔

حیاتِ انیس

میر انیس کی سوانح عمری ۱۸۵۷ء میں 'حیاتِ انیس' کے نام سے امجد علی اشہری نے لکھی ہے ۔ اس کے دیباچے کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے ، اس تصنیف کے محرک مولانا شبلی ہیں ۔ اس سوانح عمری کا نمایاں وصف اس کے مصنف کا رکھ رکھاؤ اور متانت ہے ۔ کسی موضوع کی بڑی خوش نصیبی ہوتی ہے اگر اس کے لکھنے والے اور اس کے درمیان تھوڑا بہت ذہنی تناسب موجود ہو ۔ 'حیاتِ انیس' کے مصنف میں کم از کم ایک چیز ایسی ضرور ہے جس کو ہم انیس کے طریقِ کار سے مناسبت دے سکتے ہیں، اور وہ مناسبت ہے الفاظ کے استعمال میں فن کارانہ حد تک محتاط ہونا ۔ انیس کو اگرچہ الفاظ کا بادشاہ کہا گیا ہے لیکن انہوں نے لفظوں کا زیاں کبھی گوارا نہیں کیا ۔ لفظوں کو تو وہ ہیروں اور موتیوں سے زیادہ عزیز جانتے تھے اور جہاں کہیں ضرورت ہوتی تھی وہیں مناسب لفظ جڑ دیتے تھے ۔ 'حیاتِ انیس' کے مصنف امجد علی اشہری نے بھی لفظ کے سلسلے میں نہ بے جا اسراف سے کام لیا ہے اور نہ ہی بخل سے ۔ اس توازن نے ان کی تحریر میں اختصار اور جامعیت پیدا کر دی ہے ۔ اس کے اولین صفحات میں ہی مصنف کے ذہنی نظم و ضبط کا احساس ہوتا ہے ۔ خاندانی پس منظر خصوصاً انیس کی والدہ کے کردار کو اس انداز میں پیش کیا ہے کہ ذہن پر ایک بھرپور تاثر اس خاندان کی ثقاہت اور ثقافت کا قائم ہو جاتا ہے ۔ میر انیس کا حلیہ ، وضع قطع ، جسمانی رکھ رکھاؤ اور ان کی طرح طرح کی ٹوپیوں سے دلچسپی کو بڑے دلچسپ اور پر معنی انداز میں بیان کیا ہے اور اس طرح رفتہ رفتہ میر انیس کی شخصیت اور ان کی وضع داری سامنے آتی ہے ۔

تذکرۂ خواتین

حافظ اسلم جیراجپوری 'حیاتِ حافظ' اور 'تذکرۂ خواتین' کے مصنف ہیں ۔ ان کا اسلوب جذباتیت اور جانب داری سے پاک ہے ۔ عبارت میں شگفتگی اور دلچسپی کا عنصر غالب ہے ۔ 'حیاتِ حافظ' کا سنہ تصنیف ۱۹۰۹ء یہاں پر آ کر اردو سوانح نگاری کا وہ دور جو ۱۸۵۷ء سے شروع ہوتا ہے اور تقریباً ۱۹۱۴ء تک اسی انداز اور نہج پر چلتا رہتا ہے ختم ہوتا ہے ۔ یوں تو تقریباً تینتالیس سال کے عرصے میں بکثرت سوانح عمریاں لکھی گئیں جن میں سے اکثر نایاب ہیں یا پھر ان کا ذکر اس لیے ضروری نہیں محسوس ہوتا کہ ان میں کوئی قابلِ ذکر بات نہیں اور اس کے بعد سوانح نگاری میں بتدریج مذاق اور تصورات کی تبدیلی واقع ہوتی رہی ہے جس کا ذکر اگلے باب میں ہوگا ۔

(ب) مکاتیب

مرزا غالب

غالب اگرچہ سنہ ۱۸۵۰ء سے قبل ہی اردو میں خط لکھنا شروع کر چکے تھے لیکن ان کے خطوط کے مجموعے[1] - 'عود ہندی' اور 'اردوئے معلیٰ' کی اشاعت سے سلیس اور سادہ خطوط نگاری کی روایت کو استحکام نصیب ہوا - منشی غلام غوث بیخبر کے سلیس زبان میں لکھے ہوئے خطوط (۱۸۴۶ء) اور ماسٹر رامچندر کی 'خیر خواہ' اور 'محب ہند' کی تحریروں (۱۸۴۸ء) میں بے تکلف اور عام فہم انداز میں خط لکھنے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے ، لیکن اس کے باوجود اسی میدانِ خاص میں غالب کو جو اولیت حاصل ہے وہ اپنی جگہ برقرار ہے - غالب کے یہ خط اپنی ادبی اہمیت کے ساتھ سوانحی اور اور تاریخی حیثیت بھی رکھتے ہیں - ان سے مرزا کی داستانِ حیات بھی مرتب ہوتی ہے اور انیسویں صدی کی سیاسی کشمکش اور بدلتے ہوئے رجحانات کا بھی اظہار ہوتا ہے - خطوطِ غالب کی شگفتہ اور سلیس زبان ، بے تکلف اسلوبِ بیان اور القاب و آداب کے برمحل استعمال نے انہیں تاریخ ادب کا درخشاں باب بنا دیا - ظرافت اور نکتہ سنجی نے ان میں وہ تازگی اور شادابی پیدا کر دی جو وقت اور زمانہ کی قید سے آزاد ہے - دوستوں ، عزیزوں ، مربیوں اور شاگردوں کے نام جو خطوط ہیں ، ان میں صرف ذاتی روابط نہیں بلکہ زندگی اور زندہ دلی کے تمام سامان موجود ہیں - نوابانِ رامپور کے نام جو خطوط ہیں ان میں غالب نے اپنی پہلودار شخصیت کے تمام نقوش اجاگر کر دیے ہیں - اغراض و مقاصد ، شاعری ، علمیت ، انانیت ، انفرادیت اور افکار و حوادث غرض کسی پہلو کو نہیں چھوڑا - ایک بڑی شخصیت کا یہی جادو ہوتا ہے جو اس کے کارناموں کے ساتھ اس کی شخصی عظمت کا بھی امین ہوتا ہے - مرزا نے ذاتی تعلقات اور حالات کے پردے میں بڑے اہم واقعات

---

(۱) عود ہندی ۱۸۶۸ء ، اردوئے معلیٰ ۱۸۶۹ء - مکاتیب غالب مرتبہ امتیاز علی خان عرشی ۱۹۳۷ء - مکاتیب غالب مرتبہ امتیاز علی خان عرشی (۱۴ نئے خطوط کے ساتھ ۱۹۴۳ء) - نادر خطوط غالب مرتبہ رسا ہمدانی کاشانہ ادب لکھنؤ ۱۹۳۹ء - خطوط غالب مرتبہ مہیش پرشاد ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد ۱۹۴۱ء - ادبی خطوط غالب مرتبہ مرزا عسکری ادارہ فروغ اردو لکھنؤ ۱۹۵۴ء (وہ خطوط جس میں مرزا نے ادبی نکات حل کیے ہیں) - خطوط غالب (نئی ترتیب و اضافہ) مرتبہ مالک رام انجمن ترقی ہند ۱۹۶۲ء - خطوط غالب مرتبہ غلام رسول مہر کتاب منزل لاہور - خطوط غالب مہر صدی ایڈیشن ۲ جلدیں مجلس یادگار غالب پنجاب یونیورسٹی لاہور ۱۹۶۹ء - نادرات غالب مرتبہ آفاق حسین مشہور پریس کراچی ۱۹۴۹ء - نقوش لاہور مکاتیب نمبر نقوش لاہور - خطوط نمبر ۱۹۶۸ء (بنام قاضی جلیل جنون بریلوی) -

بیان کیے ہیں اور انہیں عبرت اور بصیرت کے تمام سامان مہیا کر دے ہیں ۔ ان میں زندگی اپنی پیچیدگیوں اور رعنائیوں کے ساتھ جلوہ‌گر ہے ۔ غرض یہ خطوط ایک مٹی ہوئی تہذیب ، اجڑے ہوئے شہر کی درد انگیز کہانی بھی ہیں اور حوصلہ شکن حالات میں زندہ رہنے کا وسیلہ بھی ۔ بیان کی شوخی اور ظرافت کی چاشنی نے ان میں وہ شانِ دلآویزی پیدا کر دی ہے جسے بقول حالی[۱] :

> ''ان خطوط کو ناول اور ڈرامہ سے زیادہ دلچسپ بنا دیا ہے ۔ غالب کی اردو خطوط نگاری کی مدت کم و بیش بیس سال ہے ، لیکن اپنی شگفتگی اور زعفرانِ زار کیفیت کی وجہ سے ان کے تقریباً تمام خطوط ہر دور میں بڑھنے والوں کو اپنی طرف متوجہ کرتے رہیں گے ۔ منشی نبی بخش حقیر کو ۴ جون ۱۸۵۳ء کو لکھتے ہیں ۔ ''بھائی صاحب کیسی تاریخ اور کیسی نقل کیا فرماتے ہو ۔ پہلے مجھ سے حقیقت پوچھ لیا کرو ۔ میرا عقیدہ ہے کہ جو نظم و نثر تمہاری نظر سے نہ گزرے وہ ضائع ہے'' ۔

وائے برجان سخن‌گو بہ سخندان نہ رسد[۲] ۔ ۱۸۶۴ء کو بے خبر کو لکھتے ہیں :

> ''ہاں حضرت کہیے منشی ممتاز علی خان کی سعی بھی مشکور ہوگی ؟ وہ مجموعۂ اردو چھپے گا یا چھپا ہی رہے گا ؟ احباب اس کے طالب ہیں بلکہ بعض نے طلب کو بسرحدِ تقاضا پہنچا دیا ہے''[۳] ۔

مفتی صدر الدین آزردہ

غالب کے ہمعصروں میں فلسفی ، محدث ، شاعر اور بے مثل انشا پرداز موجود تھے ، لیکن خطوط نویسی کے میدان میں ان کا کوئی ہم پلہ نہیں ۔ مفتی صدر الدین آزردہ جو اپنے وقت کے جیّد عالم ، مفتی اور شاعر تھے ، ان کے خطوط خواجہ احمد فاروقی کے مضمون[۴] کے ساتھ شائع ہوئے ہیں ۔ یہ خطوط زیادہ تر ۱۸۵۷ء کے بعد کے ہیں جب مفتی صاحب طرح طرح کی آزمائشوں سے گزر کر تنگی ترشی سے زندگی کے دن گزار رہے تھے اور افکار و امراض نے انہیں گھیر رکھا تھا ۔ نوابانِ رامپور کے نام جو خط ہیں وہ

---

(۱) حالی ، یادگار غالب ۔ ص ، ۱۶۰ ۔
(۲) نادرات غالب بار اول ۔ ص ۳۵
(۳) عرشی (مرتب) مکاتیب غالب ، بار دوم ۔ ص ۲۱۷
(۴) خواجہ احمد فاروقی (مرتب) کلاسیکی ادب (مجموعہ تنقیدی مضامین) ۔

عرض و معروضات کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ ان کے اندازِ تحریر پر فارسی طرزِ انشا کا اثر ہے ۔ خواجہ احمد فاروقی لکھتے ہیں :

"آزردہ کا لب و لہجہ غزلوں میں تو رندانہ ہے ، لیکن خطوط میں زاہدانہ یا مولویانہ ، پھر بھی ان کو اگر انشائے اردو کے بڑے نقشہ میں دیکھا جائے تو وہ ایسے حقیر بھی نظر نہ آئیں گے ۔ ان کے یہاں نہ قدماء کی معائیت اور شعبدہ بازی ہے اور نہ ان کی ثقالت اور صنعت گری ۔ ۔ ۔ بیچ کی ایک سیدھی لکیر ہے ۔ ۔ ۔ آزردہ کی نثر فارسی کی گود سے اتر کر الگ تو کھڑی ہو گئی ، لیکن ابھی اسے راستہ اور منزل کی خبر نہیں" ۔

نواب یوسف علی خاں کو لکھتے ہیں :

"بعد گزارش مراسمِ نیاز مندی ہا ملتمس آن کہ عنایت نامہ انتظار میں پہنچا بہت طمانیت و تقویت حاصل ہوئی ۔ طبیعت نیاز مند کی بدستور ہے ۔ بلکہ پہلے سے بہت تخفیف حاصل ہے اور اخبار موحشہ کا کچھ اعتبار نہیں ۔ یہاں ایسی ایسی خبریں مشہور تھیں کہ ان کا لکھنا نا مناسب ہے ۔ انشاء اللہ تعالیٰ آپ کو زندہ سلامت رکھے اور دشمنوں کو روسیاہ کرے" ۔

واجد علی شاہ

۱۸۵۶ء میں سلطنتِ اودھ کا الحاق سلطنتِ انگریزی سے ہو گیا اور جانِ عالم واجد علی شاہ سیٹا برج کلکتہ بھیج دیے گئے ۔ کچھ بیگمات ساتھ گئیں اور کچھ یہیں رہ گئیں ۔ اس جدائی میں بیگمات نے شاہ کو جو[1] خط لکھے ان کا موضوع ظاہر ہے ہجر و مفارقت ہی ہو سکتا تھا ۔ بہت سی تبدیلیوں کے باوجود اس وقت کا لکھنؤ ، 'فسانہ عجائب' کے اثر سے آزاد نہیں تھا ۔ واجد علی شاہ اور بیگمات کے خطوط کی زبان بھی مقفلی اور پر تکلف ہے ۔ مولوی عبدالحلیم شرر اپنی 'آپ بیتی' میں لکھتے ہیں[2] :

"ان مراسلات میں ہجر و وصال اور اشتیاق و فراق اور سوز و گداز کے سوا ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے مصائب اور حالات کا ذکر بھی ہے ۔

---

(۱) مخزن اسرار سلطانی (بیگمات اودھ کے خطوط) مرتبہ منشی امتیاز علی مجیب فرخ آبادی ۱۹۰۲ء بیگمات اودھ کے خطوط باہتمام منشی انتظام اللہ سہابی مکتبہ ادب اردو بازار دہلی ۔ بیگمات اودھ کے خطوط خواجہ احمد فاروق مشمولہ کلاسیکی ادب ۔ جان عالم واجد علی شاہ اور بیگمات اودھ کے خطوط از نصیر الدین ہاشمی رسالہ 'آج کل' دہلی خطوط نمبر اپریل ۱۹۵۴ء ۔

(۲) خواجہ احمد فاروق ۔ کلا سیکی ادب ۔ مفتی تظام اللہ شہابی ، بیگمات اودھ کے خطوط ۔ تاریخ ممتاز میں واجد علی شاہ کے خط اپنی بیگمات کے نام ۔

بعض ایسی باتیں خطوط میں نظر پڑیں ، جن کا تاریخِ ہند سے بڑا تعلق ہے . . . ان خطوط میں اکثر توارد اور تکرار ہے اور قافیہ پیمائی اور عبارت آرائی کے کھٹکوں نے انہیں بدنما کر دیا ہے . . . . ان خطوط کے القاب قابلِ دید ہیں ، زبان بھی پیاری ہے ، گو اردوئے قدیم ہے مگر لطف انگیز ہے ۔ بعض منظوم رقعے ہیں'' ۔

بلا شبہ تکلف اور تصنع کے باوجود ان مکاتیب میں لطفِ بیان اور چاشنیٔ زبان ہے ۔ یاسمن محل کی زبان ملاحظہ ہو :

''جانِ عالم ، ایک سال ہوگیا ! سب چہیتوں کو نوازا ، مجھ نگوڑی کو کبھی بھول کے بھی پرزۂ کاغذ سے خوش نہ کیا'' ۔

مکاتیب کا یہ رومانی انداز پر تکلف بھی ہے اور مقفیٰ بھی ۔ ادبی حیثیت کے ساتھ ان کی تاریخی حیثیت بھی ہے یہ اپنے عہد کے مزاج کے آئینہ دار ہیں ۔

سر سید احمد خاں

۱۸۵۷ء[1] کے انقلاب نے اہلِ ہند کو ایک نئی زندگی سے آشنا کیا ۔ ان کے فکر و خیال کا دائرہ وسیع ہوا اور زندگی کے نئے تصورات سامنے آئے ۔ اس کے تقاضے اور ضرورتیں بدل گئیں ، انکی آرزوئیں اور امنگیں کچھ سے کچھ ہو گئیں ۔ علی گڑھ تحریک انہیں اثرات کا نتیجہ ہے ۔ اس تحریک کے بانی سر سید احمد خاں نے ہندوستان کی سیاست اور معاشرت پر گہرے اثرات چھوڑے ۔ اردو ادب بھی ان اثرات کا مرہونِ منت ہے وہ ایک زود نویس مکتوب نگار کی حیثیت سے بھی قابلِ توجہ ہیں ۔ غالباً وہ اردو ادب میں پہلے شخص ہیں جنہوں نے ذاتی حالات و ضروریات سے زیادہ قومی ، ملکی ، سیاسی اور تہذیبی مسائل کو اپنے خطوط کا موضوع بنایا اور یہ مسائل اسطرح انکے ذاتی حالات میں شیر و شکر ہو گئے کہ

---

(۱) غدر ۱۸۵۷ء میں حصہ خط و کتابت جو بہادر شاہ اور غدر لڑنے والوں کے درمیان ہوئی تھی اور جسکو قلعہ دہلی میں انگریزوں نے گرفتار کیا تھا خواجہ حسن نظامی نے ترجمہ کرا کر ۱۹۲۰ء میں پرنٹنگ ورکس دہلی سے شائع کر دی تھی ۔ خطوط سے ترجمہ کیے گئے یہ خطوط اس سلسلہ کی کڑی ہیں جو بہادر شاہ کے مقدمہ غدر دہلی کے گرفتار شدہ خطوط اور غدر دہلی کے اخبار پر مشتمل ہے ۔ یہ خطوط اردو یا فارسی میں تھے مقدمہ کی ضرورت سے انگریزی وکیل نے انکا انگریزی ترجمہ کرایا تھا ۔ خواجہ کی عرضی بھی ہے جو اس طرح ہے ''نشان شرافت و عظمت میر فتح علی خان نے یہاں آنے کی تکلیف گوارا فرمائی مجھے نہایت ممنون و مشکور کیا انہوں نے میرے معاملات سے نہایت ہمدردی اور پدرانہ شفقت ظاہر کی ۔ تمام زبانی احکام جو میر فتح علی کی معرفت فرمائے گئے تھے ، مجھے لفظ بہ لفظ پہنچ گئے اور جوابات قابل تحریر نہیں تھے لہذا میر فتح علی صاحب ہی سے حضور کو معلوم ہو جائینگے ۔ ص ۔ ۶۹

انہیں علیحدہ کرنا مشکل ہے ۔ کیونکہ یہ مکاتیب انکے مشن کے سلسلے ہی کی کڑی ہیں ۔ اس سلسلہ کی اہم ترین کڑی سرسید کے وہ خطوط ہیں جو سمندر پار سے نواب محسن الملک کو لکھے گئے ۔ ان خطوط میں انگلستان کی ترقی و تہذیب کا ذکر ہے ہندوستان کی مفلسی اور جہالت کا ماتم ہے اور اپنے مستقبل کے منصوبوں کا ذکر ہے ۔ پروفیسر آلِ احمد سرور نے ان خطوط کی نسبت اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھا ہے :

"سرسید کے یہاں ایک ہی رنگ ، ایک ہی سر، ایک ہی جذبہ ملتا ہے ۔ انکی شخصیت میں سب سے نمایاں چیز ان کی دردمندی اور اخلاص ہے ، اس وجہ سے ان کے مضامین میں ایک تاثیر اور خطوں میں ایک رفعت ملتی ہے ۔ خطوں میں وہی شخصیت جھلکتی ہے ، جو تہذیب الاخلاق کے کالموں میں۔ ۔ ۔ ۔ سرسید کے یہاں نہ کوئی راز ہے جس سے پردہ اٹھنے میں دلچسپی ہو ، نہ نشیب و فراز ہیں ، جن سے گزر کر انسان پستیوں کی پستی اور شوق کی بلندی کا نظارہ کر لے۔ ۔ ۔ ۔ سرسید کی دراصل کوئی پرائیویٹ لائف تھی ہی نہیں ، ان کے یہاں قومی خدمت کا جذبہ ہے ، جو ہر رنگ میں اور ہر جگہ نظر آتا ہے ۔ دراصل سرسید ایک مصلح ہیں ، انکی ہر تحریر ضرورت کے ماتحت وجود میں آتی ہے ۔ اسلام کی محبت ، مسلمانوں سے لگاؤ ، بنی نوع انسان سے ہمدردی کے جذبہ نے انکے شوق کو بلندی اور عزم کو استقامت بخشی ۔ اس لیے وہ جب اور جہاں کہیں اظہارِ خیال کرتے ہیں ، یہی جذبہ غالب آجاتا ہے"[1] ۔

ان کے خطوط میں تاثیر ، شگفتہ ظرافت اور خوبصورت انشا سے نہیں ، بلکہ خلوص اور دردمندی سے پیدا ہوتی ہے ۔ ایک دوست کو لکھتے ہیں :

"بھائی جان سنو اب یہ وقت نہیں رہا ، میں اپنی مکتوباتِ ضمیر کو مخفی رکھوں ، میں صاف کہتا ہوں ، اگر لوگ تقلید نہ چھوڑیں گے اور خاص اس روشنی کو جو قرآن و حدیث سے صحیح حاصل ہوتی ہے نہ تلاش کریں گے اور حال کے علوم کا مذہب سے مقابلہ کر سکیں گے

---

(۱) وحید الدین سلیم (مرتب) خطوط سرسید ، حالی بریس پانی پت ۱۹۰۱ء ۔ خطوط سرسید مرتبہ سر راس مسعود نظامی پریس بدایوں ۱۹۴۴ء مکتوبات سرسید مرتبہ شیخ اسمعیل پانی پتی مجلس ترقیٔ ادب لاہور ۱۹۵۹ء ۔ مکاتیب سرسید مرتبہ مشتاق حسین فرینڈز بک ہاوس علی گڑھ ۱۹۶۰ء ۔ نقوش لاہور مکاتیب نمبر نقوش لاہور ۱۹۵۶ء و خطوط نمبر ۱۹۶۸ء ۔

تو مذہب اسلام ہندوستان سے معدوم ہو جائیگا - اسی خیر خواہی نے مجھ کو برانگیختہ کیا ہے جو میں ہر قسم کی تحقیقات کرتا ہوں اور تقلید کی پروا نہیں کرتا ، ورنہ آپ کو خوب معلوم ہے کہ میرے نزدیک مسلمان رہنے کے لیے اور بہشت میں داخل ہونے کے لیے آئمہ کبار درکنار ، مولوی حبو کی بھی تقلید کافی ہے" -

یا ایک اور جگہ مخاطب کرتے ہیں :

مجھے ایسے لفظوں میں لکھنا نہیں آتا جو اندھوں کے دکھانے کے لائق ہو - میں یقین کرتا ہوں کہ جس قدر لوگ مجھ کو برا کہتے ہیں اگر مجھے اس پر صبر کامل عطا کرے تو میرے لیے ایک نہایت عمدہ زاد راہ دوسری دنیا کےلیے ہے ، جہاں ہمیشہ رہنا ہے - ایسا کس کا نصیب جسکو نہایت عمدہ زاد راہ وہاں کے لیے ہاتھ آوے - حج کریں حاجی صاحب ، حدیث پڑھیں مولوی صاحب اور سب کا نتیجہ ہم کو ملے ، اس سے زیادہ کیا خوب بات ہوگی" -

سرسید نے خطوں میں طنز کے حربوں سے جگہ جگہ کام لیا ہے - کہیں کہیں ظرافت کی چاشنی بھی ہے ، لیکن ہر جگہ ایک سنجیدہ مقصد پوشیدہ ہے - کہیں وہ دل کی بھڑاس بھی نکالتے ہیں ، لیکن اس میں تلخی کے بجائے طنزیہ انداز میں دلائل و براہین کے انبار لگا دیتے ہیں اور پڑھنے والے کی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے ، علمی اور تمدنی مسائل زیر بحث آ جاتے ہیں اور سیاسی نکات پر روشنی پڑتی ہے - اس طرح ان خطوں کی ایک علمی حیثیت بھی ہے ، لیکن انکی سب سے بڑی حیثیت ایک مخلص اور بے ریا انسان کی زندگی اور اسکے مشن کی وضاحت کی ہے -

محسن الملک اور وقار الملک

سرسید کے خاص رفقائے کار بالخصوص محسن الملک اور وقارالملک کے یہاں بھی وہی جدید بن پایا جاتا ہے اور اس حد تک کہ کسی جگہ بھی ان کی فضا نہیں بدلتی - انکا لب و لہجہ مقصد اور مدعا سب ایک ہی ہے - انیسویں صدی کی تعلیمی جد و جہد، تہذیبی تبدیلیاں اور سماجی حالات اہم دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں مکاتیب محسن الملک[1] -

---

(۱) مکتوبات محسن الملک حصہ اول مکتوب وقارالملک حصہ دوم مرتبہ مولوی محمد امین زبیری شمسی پریس آگرہ - مکاتبات الخلان مرتبہ محمد عثمان مقبول (نواب محسن الملک کے خط سرسید کے جواب اصول تفسیر پر آٹھ خط - (یہ خط ۱۸۹۲ء سے ۱۸۹۵ء تک) ساتھ ہی تین دلچسپ خط جو محسن الملک کے ایک دوست کی تحریر کے جواب میں -

اور وقارالملک کے مرتب مولوی امین زبیری نے صحیح لکھا ہے کہ :

''مسلمانوں کی ترقی کا خواہ کیسا ہی درخشاں دور کیوں نہ آ جائے ، لیکن ان دونوں بزرگوں کی خدمات ملّی اور احسانات قومی کسی طرح فراموش نہیں کیے جا سکتے اور تقدم کی جو فضیلت ان کو حاصل ہے وہ ہمیشہ جریدۂ قومی پر ثبت رہیگی۔ . . . اس لحاظ سے میں ان دونوں بزرگوں کے چند پرائیویٹ خطوط . . . شائع کرتا ہوں۔ ان خطوط سے نہ صرف ان دونوں بزرگوں کی اعلیٰ سیرت اور کریکٹر پر روشنی پڑے گی ، بلکہ اس زمانہ کی قومی تاریخ اور قومی اہم معاملات کی تشریح و توضیح بھی ہوگی۔ . . . . یہ خطوط جدید طرزِ انشا پردازی اور سنجیدہ و پختہ تحریر کا بہت اچھا نمونہ ہیں ۔ غرض کہ یہ مجموعہ قومی تاریخ اور ادبی لحاظ سے بہت دلچسپ ہے'' ۔ زبیر صاحب کی رائے ایک حد تک صداقت پر مبنی ہے لیکن ادبی تاریخ میں بلند جگہ کی مستحق صرف وہی تخلیقات ہوتی ہیں جنکی ادبیت نے لوگوں کو متاثر کیا ہو۔ محسن الملک وقارالملک کو لکھتے ہیں ۔ ''میں نے تم کو اپنا دوست جانا اور آپ نے کامل دیانت اور راستبازی سے مجھے یقین دلایا کہ تم میرے دوست ہو کہ جس پر ایک جان دو قالب کا مقولہ صادق ہے مگر اس زمانہ کی کارروائی سے جب میں دشمنوں کے ہجوم میں گرفتار تھا اور جب میرے لیے صبح اور شام ہو رہی تھی اور آپ خوب جانتے کہ میری کیا حالت تھی ، مجھے کس قدر آپ سے مدد ملنی چاہیے تھی وہ بھی دیانت کے ساتھ جائز طریقہ سے نہ کہ ناجائز اور نا واجب'' ۔

وقارالملک محسن الملک کو لکھتے ہیں :

''میں آپ کی خیر و عافیت کا ہمیشہ طالب تھا اور رہونگا ، لیکن مولوی مہدی علی یہ مرہم اور اس قسم کے اور مرہم زخم کا علاج نہیں ہے جو آپ نے میرے بے گناہ دل کو پہنچایا ہے ۔ گر صد ہزار لعل و گہر میدہی چہ سود دل را شکستہ نہ کہ گوہر شکستہ ۔ صاف بات یہ ہے کہ اس بات کا قطعی فیصلہ ہو چکا ہے کہ میرے اور آپ کے درمیان اب کوئی رسم و راہ باقی نہیں ہے ۔ میں آدھے اندھیرے اور آدھے اجالے کو کبھی پسند نہیں کرتا'' ۔

یہ اور اسی طرح کے شکوہ و شکایت بلکہ تلخ و ترش گفتگو کے نمونے ان مکاتیب میں پھیلے ہوئے ہیں ۔ الزام تراشی اور خطا و نسیاں کی بے شمار مثالیں قارئین کو اپنی

طرف متوجہ کرتی ہیں ۔ کہیں یہ خطوط اس بات کے غمّاض ہیں کہ مسلمان قوم کی دو بہترین شخصیتیں جنکی بصیرت اور دلسوزی نے لاکھوں ذہنوں کو متاثر کیا کس طرح ایک دوسرے سے ہم کلام ہوتی ہیں ۔ خاص کر وقار الملک کی کھڑی شخصیت منظرِ عام پر آ جاتی ہے ۔ وہ تذبذب اور امید و بیم کی اس فضا کو باقی ہی رکھنا نہیں چاہتے ، صاف گوئی اور صاف دلی انکا شعار تھا ۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ ''وقارالملک لوہا ہی لوہا تھے اور محسن الملک تیل ہی تیل''۔ لیکن وقارالملک پر بعض اعتبار سے محسن الملک کو فوقیت حاصل ہے انہوں نے اصولِ تفسیرِ قرآن پر جو خط سرسید اور دوسرے دوستوں کو لکھے ہیں وہ کمال لیاقت اور زبردست بصیرت پر دلالت کرتے ہیں ۔ ان خطوں میں ادبیت کی چاشنی نے زورِ بیان پیدا کر دیا ہے ۔ طوالت اور مضمون کی ثقالت کے باوجود یہ خط اپنے اندر ایک ایسی دلآویزی رکھتے ہیں جو دلیلوں کی بہتات اور حوالوں کی کثرت کے بوجھ کو ہلکا کر دیتی ہے ۔ کس خوبی سے سرسید کی بلندئ خیال کا اعتراف کرتے ہوئے ان کی خامیوں پر گرفت کی ہے :

> ''اب تو مجھے پورا یقین ہوگیا کہ فلسفیانہ خیالات اور حکیمانہ زاویوں نے آپ کے خیالات اسقدر بلند کر دے ہیں کہ ہم نا سمجھ آدمیوں کی سمجھ وہاں تک پہنچ نہیں سکتی ۔ اور نیچر کے طوفان خیز اور نا پیدا کنار دریا میں آپ نے اپنے جہاز کو اس مردانگی اور بے باکی سے ڈالدیا ہے کہ ہمارے خیالات کی کمزور کشتیاں وہاں تک پہنچتے پہنچتے پاش پاش ہو جاتی ہیں'' ۔ خط ۹ فروری ۱۸۹۵ء ۔

الطاف حسین حالی

سر سید کے حلقۂ احباب میں حالی کی ذات بھی نہایت اہم تھی وہ سر سید کے خیالات کے بہت بڑے مبلّغ اور ان کے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے والے تھے انہوں نے سر سید کے خیالات کو ادبی رنگ دے کر انہیں پھیلانے اور استقامت بخشنے میں بڑا کام کیا ۔ ان کے مکاتیب کا لب و لہجہ بھی قومی اور ملی زیادہ ہے ۔ ذاتی حالات اور گھریلو معاملات کا ذکر ان کے خطوں میں ملتا ہے ، لیکن موضوع کی ہم آہنگی کے سبب حالی کے خط بھی سر سید کے خطوط کے زمرہ میں آتے ہیں ۔ سر سید کا کوئی خط سر سید محمود کے نام اب تک ہماری نظر سے نہیں گزرا ، لیکن حالی نے اپنے بیٹوں ، پوتوں اور عزیزوں کے نام خط لکھے ہیں ۔ گھریلو مسائل سے دلچسپی کا اظہار کیا ہے اور بچوں کی بیماری اور عزیزوں کی پریشانی میں ان کا غم غلط کرنے کی کوشش کی ہے ، لیکن بنی نوع انسان سے ہمدردی اور مسلمانوں

کی خدمت ان کے یہاں بمنزلہ عبادت کے ہے ۔ حالی سر سید ہی کی طرح قوم کے اقبال کا ماتم کرتے ہیں برائیوں اور بدعنوالیوں کو بری نظر سے دیکھتے ہیں ، جہالت ، تعصب اور بے حسی پر آنسو بہاتے ہیں ۔ لیکن اظہار مدعا میں سر سید کی طرح جوش و خروش اور غیض و غضب کا شکار نہیں ہوتے ، بلکہ ہر حال میں توازن کا دامن تھامے رہتے ہیں ۔ ان کے یہاں اپنے معاصرین کے مقابلے میں نرمی اور اعتدال زیادہ ہے ۔ ڈاکٹر خورشید الاسلام نے حالی کے خطوط کی نسبت لکھا ہے :

"ان[1] کی محبت کا سرچشمہ ان کے خطوط میں بھی شدت سے نظر آتا ہے ۔ یہ محبت آل اولاد ، بھائی بند ، اہل محلہ ، پڑوسی ، استاد ، شاگرد ، دوست احباب ، ملک و ملت ، رہبر و مصلح ، ہر شخص کے لیے عام ہے ۔ گویا حالی خلوت پسند ہیں وہ اپنے آپ سے کبھی باتیں نہیں کرتے بلکہ بنی نوع انسان کو مخاطب کرتے ہیں ۔ وہ اجتماعی احساس سے معمور ہیں ان کی ہر صدا قوم اور ملّت کے سوگ میں ڈوبی ہوئی ہے اور وہ بھی دو ٹوک ۔ نہ تمہیدیں ہیں نہ تکلّفات اور نہ کسی طرح کی فنی باریکیاں ، بلکہ قطعیت ، سادگی ، ایجاز ، اختصار اور اعتدال ہے ۔ بلا شبہ حالی کی سچی محبت اور یگانگت میں کلام نہیں ۔ کسر نفسی ، شفقت اور احترام سے انکار کوئی خط خالی نہیں ۔ ان کے مکاتیب ان لمحوں کی یادگار معلوم ہوتے ہیں جو شغل گریہ سے محروم رہ گئے ۔ ان میں زندگی حسن اور توانائی کے آثار ناپید ہیں ۔ ان کے خطوط کاروباری ہیں رونے سے فارغ ہو کر انہیں روز مرہ کی زندگی کے فریضے یاد آتے ہیں اور چار و ناچار خط لکھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں ۔ انہیں مکتوب البہ بے جان معلوم ہوتا ہے وہ خط لکھنے میں سلیقہ کا ثبوت نہیں دیتے بلکہ اپنی خانگی زندگی میں سلیقہ کا ثبوت دینے کے لیے خط لکھتے ہیں"۔

بات واضح ہے کہ حالی کے خطوط میں نہ تنّوع ہے اور نہ جذبہ کی شدت اور نہ الفاظ میں رنگینی ، لیکن بے ریائی اور خلوص قدم قدم پر نمایاں ہے[2]۔ مسلمانوں کی پستی ، ذلت اور نکبت دلسوزی و ہمدردی کا ایک سیلاب ہے ، لیکن وہ

---

(۱) خورشید الاسلام ، حالی (مکاتیب کی روشنی میں) نگار لکھنؤ ، نومبر ۱۹۳۹ء ۔

(۲) ڈاکٹر عبدالقیوم ، حالی کی نثر نگاری ، مجلس ترقیٔ ادب لاہور ۱۹۶۴ء ۔

غم نہیں جو زندگی کو مفلوج بنا دے ، وہ کسک ہے جس سے زندہ دلی ، عزائم کی بیداری اور احساسات کو زندگی ملتی ہے[1] -

مولوی نذیر احمد

نذیر احمد ناول نگاری کے ساتھ اردو ادب میں ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے انہوں نے ملازمِ سرکار کی حیثیت سے بہت مصروف زندگی گزاری - معاملات خانگی اور کاروبارِ تجارت میں دلچسپی لی - غالباً انہوں نے دوستوں عزیزوں ہم عصروں کو بہت ہی کم خط لکھے اور جو کچھ لکھے وہ منظرِ عام پر نہ آ سکے - صرف ایک مجموعہ 'موعظہ حسنہ'[2] کے نام سے شائع ہوا ہے - یہ تمام خطوط نذیر احمد نے اپنے بیٹے کے نام لکھے جس کا مقصد علم کی فضیلت اور دنیوی معاملاتِ زندگی کے نشیب و فراز بتانا تھا - در اصل نذیر احمد ان خطوط میں اپنے مزاج افتاد طبیعت اور اسلوب کے اعتبار سے پوری طرح ظاہر ہوئے ہیں - مراسلت کے پیرایہ میں واعظانہ رنگ اور تربیتی رنگ ظاہر ہوا ہے - 'موعظہ حسنہ' کے مرتب ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ :

> ''ان کے ایسے خطوط اب تک دستیاب نہیں ہو سکے ، جو اخلاص و محبت کی گرمی رکھتے ہوں یا ہم کلامی کی آرزو کا نتیجہ ہوں - 'موعظہ حسنہ' میں واعظانہ تلخ نوائی کے ساتھ ایک شفیق باپ کے محبت بھرے دل کی دھڑکن بھی سنائی دیتی ہے - ان خطوں میں کہیں شوق و انتظار کی کیفیت ہے ، کہیں شکوہ و شکایت کا لطیف انداز ہے اور کہیں لب و لہجہ کی چمکار میں رنگ آشنائی کی جھلک'' -

ان کے اندازِ تخاطب کا نمونہ یہ ہے :

> ''میں نہیں کہتا کہ تم کو سود و زیاں کا تفرقہ ، نیک و بد کا امتیاز نہیں ، لیکن اتنا کہوں گا کہ تم کو بے قراری کا شوق نہیں - یہ اگر ہو تو پھر وہی تمہارا استاد ہے - وہی تمہارا ساز و سامان خود ایجاد کرتا ہے - کیا کروں ، کیوں کر کروں ؟

---

(۱) نقوش ، لاہور مکاتیب نمبر ، جلد اول -

(۲) ڈپٹی نذیر احمد ، موعظہ حسنہ ، مجوی پریس لکھنؤ ، ۱۸۷۸ء - موعظہ حسنہ مرتبہ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی ، مجلس ترقی ادب لاہور ، ۱۹۶۸ء -

نیسیٹی از دی مدر آف انونشن ، پس نیسیٹی پیدا کرو اور وہ نہیں
ہے مگر طلب صادق جیسے زور کی بھوک یا تڑاکے کی پیاس ۔ یہ تصور
کہ شاید عربی میں تم کو پڑھانا مجھ کو اکثر ایذا دیا کرتا ہے ،
لیکن وہی شوق ہو تو ہر استاد باپ سے بڑھ کر کام دے ۔

ع شوق در ہر دل کہ باشد رہبرے درکار نیست"

غرض ان مکاتیب کا مرکزی خیال نفع نقصان ، اچھائی برائی ، ناپ تول ، دور اندیشی اور اغراض و مقاصد پر مبنی ہے ۔ یہی ان خطوط کا مدعا ہے ۔

محمد حسین آزاد

محمد حسین آزاد کی تصانیف اردو ادب کا قیمتی سرمایہ ہیں ۔ اردو کے عناصر خمسہ میں ان کا مقام بہت بلند ہے ، لیکن مکتوبات کی دنیا سے انہیں زیادہ دلچسپی نہیں ۔ انہوں نے اپنے اسلوب نگارش کا بانکپن ، 'دربار اکبری' اور 'نیرنگ خیال' میں دکھایا ہے ۔ خطوط[۱] کو انہوں نے زیادہ قابل توجہ نہیں سمجھا یا فقط ضرورت سے مجبور ہو کر چند لوگوں کو انہوں نے خطوط لکھے ہیں ، لیکن بقول مہیش پرشاد یہ مجموعہ بھی بڑا پر لطف اور کار آمد ہے ۔ خواجہ حسن نظامی کے نزدیک :

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آمنے سامنے بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے ہیں ۔ چھوٹے چھوٹے فقرے مؤثر آسان اور سمجھ میں آنے والے الفاظ ..... غالب اور آزاد کے رقعات میں بہت مشابہت ہے ۔ زمانہ بھی دونوں کا قریب قریب تھا دل بھی دونوں کے سلطنت اسلامی کے انقلاب نے مجروح کر دیے تھے ۔ اس واسطے جب وہ کچھ لکھتے تھے چوٹ کھایا ہوا دل ، دو چار قطرے خون کے عبارت میں ملا دیتا تھا ، جس سے پڑھنے والا مسحور ہو جاتا تھا" ۔

---

(۱) مکتوبات آزاد کی اشاعت کا سلسلہ ۱۹۰۶ء میں مخزن لاہور میں شروع ہوا اور کئی مہینے جاری رہا ۔ بعد میں کتابی شکل میں سید جالب دہلوی کے طویل دیباچہ کے ساتھ یہ کل اٹھائیس خط شائع ہوئے ، بعد میں آغا محمد طاہر نے ۶۸ خطوں کے اضافہ کے ساتھ یعنی ۹۶ خطوں کا مجموعہ ۱۹۲۳ء میں شائع کیا ۔ ۱۹۶۶ء میں سید مرتضیٰ حسین فاضل کے مقدمہ کے ساتھ مجلس ترقی ادب لاہور نے شائع کیا ۔ کچھ خطوط مولوی مہیش پرشاد نے مشاہیر اردو کے خطوط ، میں اور چند خط نقوش لاہور نے مکاتیب نمبر ۱۹۵۶ء میں شائع کیے ۔

ایک خط میں سید حسن بلگرامی کو لکھتے ہیں :

"آزاد نے کہا ، سحر کا نور ، شفق کی سرخی ، صبح کا عالم ، جب نظر آتا ہے اہلِ دل کہتے ہیں سبحان اللہ ! صبا و نسیم پھولوں کی شمیم لاتی ہیں ۔ دل کہتا ہے صلّی علیٰ ۔ اس میں آفتاب سے اجازت اور اس میں خسروِ گل سے استخراج کون کرتا ہے"۔

یا دوسری جگہ لکھتے ہیں :

"آپ پیر و مرشد ہیں ، آلِ رسول ہیں اور سب کی بھلائی کے لیے محنت اور ہمت کرتے ہیں ۔ یہ نذرانہ غریبانہ کے ماتھے کا پسینہ اور آنکھوں کا پانی ٹپکا کر جمع کیا ہے آپ کے لائق نہیں ۔ مان کا پان ہے اور سچے دل کی نیاز ہے ۔ امیدوار ہوں کہ قبول ہو"۔

ان خطوں میں زمانہ کی شکایت شاگردوں کے گلے اور اپنی قلندرانہ طبیعت و بے نیازی کا ذکر ہے ، اپنی تخلیقات کا بیان ہے اور بقول ان کے برابر خطوط چلے آ رہے ہیں کہ فرمایے 'دربار اکبری' کا کیا حال ہے ، 'قند پارسی' کا کیا حال ہے ۔ لیکچروں کا کیا حال ہے یہ کوئی نہیں پوچھتا کہ آزاد کا کیا حال ہے ۔

شبلی نعمانی

اردو کے عناصرِ خمسہ میں بحیثیت مکتوب نگار شبلی کا مرتبہ سب سے بلند ہے ۔ ان کے مکتوبات[1] نے اردو کی ادبی تاریخ میں ایک اچھے اسلوبِ نگارش کا اضافہ کیا ۔ مولانا احسن مارہروی نے کئی جگہ مکتوب نگاری کے فن میں شخصیت کو بڑی اہمیت دی ، بلکہ خطوط میں اس کا نمایاں ہونا ضروری قرار دیا ہے ۔ شبلی کے مکاتیب میں یہ انفرادیت اور خود پسندی ہر جگہ نمایاں ہے اگرچہ شبلی کے خطوط بھی ضرورت کے ماتحت لکھے گئے ۔ لیکن ان کے یہاں ایسے خطوط بھی ہیں جو ذاتی جذبات اور شوقِ ملاقات سے مجبور ہو کر لکھے گئے ۔ یہ کاروباری خط نہیں بلکہ ذوقِ نظر کے آئینہ دار ہیں ۔ ایجاز و اختصار نے ان خطوط کو اور بھی دلچسپ بنا دیا ہے ۔ شبلی اردو میں غالباً پہلے بڑے ادیب ہیں ، جنھوں نے عورتوں کو خطوط لکھے اور دل کھول کر لکھے ۔ مولوی عبدالحق نے

---

(۱) مکاتیب شبلی (حصہ دوم) دارالمصنفین اعظم گڑھ ۔ خطوط شبلی عورتوں کے نام مرتبہ محمد امین زبیری ۱۹۲۶ء خطوط مشاہیر مرتبہ عبدالماجد دریا بادی ۳۹ خط ۔ نقوش لاہور مکاتیب نمبر ۱۹۵۶ء اور نقوش لاہور خطوط نمبر ۱۹۶۸ء ۔

خطوطِ شبلی (عورتوں کے نام) کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ :

''اس سے قبل مولانا کے رقعات کی دو جلدیں شائع ہو چکی ہیں ، لیکن وہ اس داستان سے خالی ہیں - محبت کے ولولے اور راز و نیاز کی سرگوشیوں کا لطف لینا ہو تو ان رقعات کو پڑھنا چاہیے - یہ وہ جواہر ریزے ہیں جو ہمارے ادیبوں ، انشا پردازوں کے کلام میں مشکل سے ملیں گے اور اگر ہیں بھی تو فرضی اور بناوٹی یا پایہ تہذیب سے گرے ہوئے . . . . بعض تصانیف ان کی ایسی ہیں جو مدتوں شوق سے پڑھی جائیں گی اور انہیں میں یہ خطوط ہیں ، جو بمنزلہ سدا بہار کے ہیں'' -

عطیہ فیضی کو لکھتے ہیں :

''تم کو بار بار ٹوکتا ہوں ممکن ہے تم کو گراں گزرے ، لیکن جی نہیں مانتا کہ تمہاری اردو کے روشن چہرے پر داغ رہنے پائیں ، بس دو چار بار کی اور کسر ہے'' -

اسی طرح دوسرے خطوں میں بھی آمد کی شان جلوہ گر ہے - حبیب الرحمٰن شیروانی کو لکھتے ہیں :

''چند ضروری کام ندوہ کے انجام دے کر کشمیر وغیرہ بھاگ جانا چاہتا ہوں ، شاید ایک ہفتہ کے اندر اندر - آزاد بھی ساتھ ہوں گے - نظامت کا مسئلہ معرکۃ الآرا ہے اور جتنی شورشیں ہیں سب اس کی تہہ میں ہیں - میری بد اعتقادی ، دہریت ، بے نظامی ، تحکم اور استبداد ، یہ تمام اوصاف پہلے ہی تھے ، لیکن نظامت کی دوربین نہ ہونے سے نظر نہ آتے تھے'' -

بات کہنے کا یہ ڈھنگ شبلی کے خطوں میں تقریباً ہر جگہ نظر آتا ہے - وہ ضروری باتیں بڑے دلچسپ اور مؤثر انداز میں بیان کرتے ہیں - اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں ، مکتوب الیہ پر اثر انداز ہوتے ہیں ، دل کی بھڑاس نکالتے ہیں ، لیکن طبیعت کے ابال کے باوجود مکتوب الیہ کو نہیں بھولتے ، یعنی ہر حال میں مراسلت کے انداز کو برقرار رکھتے ہیں - خشکی اور بے کیفی کو نہیں پیدا ہونے دیتے ، مضمون آرائی اور بے جا علمیت کے اظہار سے گریز کرتے ہیں اور ان کا اپنے مخاطب سے رابطہ برقرار رہتا ہے - خطوط کی یہی دلآویزی ان کی امتیازی صفت ہے -

اکبر الہ آبادی

اکبر الہ آبادی کی شخصیت انیسویں صدی کی اردو شاعری میں ایک حد تک سر سید تحریک کے خلاف ردِ عمل کی حیثیت رکھتی ہے - یہاں انہوں نے کھل کر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے - اکبر قدیم خیالات کے دلدادہ ، صوفیوں کے معتقد اور مشرق تہذیب کے پرستار تھے - مشرق سے محبت ان کے نزدیک بمنزلہ مذہب کے تھی - اس لیے مغربی تہذیب کی 'برکات' کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے - انہوں نے اپنے خطوط میں بھی ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا ہے[1] - ان کے مکاتیب کے لیے مجموعے منظرِ عام پر آ چکے ہیں ، ان کے مکاتیب سے ان کا روزنامچہ بھی مرتب کیا جا چکا ہے - انہوں نے اپنے معتقدوں ، مداحوں اور ہم مذاق اصحابِ علم کے نام خاصی تعداد میں خطوط لکھے ہیں - عزیزوں ، دوستوں اور خوردوں سے مراسلت کی ہے ، ان کی رہبری کی ہے ، انہیں مشورے دیے ہیں ، کتابوں اور شاعری پر اظہارِ خیال کیا ہے ، مذہب کی اہمیت ، زندگی سے اس کا تعلق ، عالمِ اسلام کا اضطراب ، مسلمانوں کی غفلت ، اپنی ذات ، اپنی بیماریاں ، کمزوری ، نقاہت ، غرض خط کا زندگی سے جو گہرا تعلق ہوتا ہے وہ جس طرح جذبات اور کوائف کا ترجمان ہوتا ہے ، وہ سب باتیں اکبر کے خطوں میں ملتی ہیں اور وہ بھی صاف سادہ اور دلچسپ زبان میں - بر محل القاب و آداب اور روانی سے اپنے خیالات کا اظہار جا بجا اشعار کا استحصال اور اس سے اپنے مقصد اور مدعا کا اظہار کرتے ہیں - عبدالماجد دریا بادی ، سید سلیمان ندوی ، خواجہ حسن نظامی ، شیخ عبدالقادر ، مرزا سلطان احمد ، ڈاکٹر اقبال اور حبیب الرحمان خان شیروانی سے ان کا سلسلۂ مراسلت عرصہ تک قائم رہا - یہ خط زیادہ تر مختصر ہیں کہیں کہیں وہ اختصار کی پابندی کو توڑ دیتے ہیں - البتہ خواجہ حسن نظامی کے نام کے خط قدرے طویل ہیں - ایک خط میں مرزا سلطان احمد کس قدر گہری محبت اور یگانگت کا اظہار کرتے ہیں :

> ''بلا شبہ بڑی مسرت ہوتی ، اگر آپ تشریف لاتے - آپ کو موقع نہ ملا - خیر زندگی باقی ہے تو پھر کبھی سہی - ڈاکٹر اقبال صاحب

---

(۱) مکتوبات اکبر الہ آبادی بنام مرزا سلطان احمد ، کریمی پریس لاہور - رقعات اکبر نامہ ، ناشر محمد نصیر ہمایوں ، قومی کتب خانہ لاہور - رقعات اکبر نامہ معہ مقدمہ شیخ عبدالقادر بار دوم ۱۹۴۷ء قومی کتب خانہ لاہور - خطوط اکبر بنام خواجہ حسن نظامی اور بنام عبدالماجد دریا بادی ۲ جلدوں میں ۱۹۲۴ء - خطوط مشاہیر مرتبہ عبدالماجد دریا بادی میں ۲۰۰ خط - مرقعٔ ادب مرتبہ صفدر مرزا پوری میں کچھ خط نیز نقوش لاہور مکاتیب نمبر ۱۹۵۶ء و خطوط نمبر ۱۹۶۸ء - اکبر الہ آبادی اور مہاراجہ کشن پرشاد کی خط و کتابت معہ حواشی خواجہ حسن نظامی محبوب المطابع دہلی اگست ۱۹۵۱ء -

نے بڑی زحمت اٹھائی ، صرف چند گھنٹوں کے لیے مجھے ملنے کو
الہ آباد تشریف لائے تھے ۔ آپ صاحبوں کا کرم ہے ، لیک دلی ہے ،
ورنہ میری کیا ہستی ہے ۔

چل بسے اسبابِ غفلت چشمِ عبرت رو چکی
میری ہستی تھی ہی کیا اور تھی جو کچھ ہو چکی"

ڈاکٹر اقبال صاحب بلحاظ جملہ حالات کے اس وقت اس حلقہ میں آیاتِ الٰہی میں سے ہیں ،
آپ نے بجا طور ان کی مدح کی ہے وہ بھی نازاں ہیں کہ آپ جیسے عالم فلاسفر نیک دل
بزرگ کی خدمت میں نیاز حاصل ہے (خط ۲۰ جنوری ۱۹۱۳ء) ۔ یا ایک اور صاحب کے
نام کس خوبصورتی سے زمانہ کی کشمکش اور انقلاب کی یاد دلاتے ہیں :

"میں خیال کرتا ہوں کہ قوم و مذہب کی افسوسناک حالت پر عمدہ
اشعار جو حالی اور شبلی اور میں نے کہے ہیں اور نیز بعض دیگر
حضرات کے ان کو یکجا کر کے چھپوائے ، یادگار رہے گا کہ مسلمانوں
نے کیا نوحہ کیا تھا" ۔

(خط بنام منشی شرف الدین احمد خان ۸ اگست ۱۹۰۸ء) ۔

دیگر مکتوب نگاز

امیر مینائی

مکتوب نگاری کی فہرست میں اور بھی متعدد اہم شخصیتوں کے نام سامنے آتے
ہیں ۔ امیر مینائی ، داغ دہلوی ، عبدالحلیم شرر ، شاد عظیم آبادی ، ریاض خیر آبادی ،
حکیم عبدالحئی مصنف گلِ رعنا ، برج نرائن چکبست اور دیگر شاعر اور ادیب وغیرہ ۔
در اصل خطوط نویسی ایک انسانی ضرورت ہے اور انسانی جذبات کے اظہار کا ایک ذریعہ ۔
ہمارے شاعروں اور مصنّفوں نے جو خطوط لکھے ان میں لوگ مقصد اور مدعا کے علاوہ
اور بہت کچھ بھی تلاش کرتے ہیں ۔ اس میں کہیں کامیابی ہوتی ہے اور کسی جگہ
مایوسی ۔ خط لکھنا ایک فن ہے ، بلکہ مشکل فن ۔ یہی وجہ ہے کہ ہم بہت سے لوگوں
کے خط پڑھتے ہیں ، لیکن لذت اور تسکین ہمیں صرف ان خطوں میں ملتی ہے جنہیں
مکتوب نگار نے اپنے خونِ جگر سے لکھا ہو ۔ امیر مینائی انیسویں صدی کے آخر کے
اساتذہ میں سے ہیں ، لیکن مکتوب نگار کی حیثیت سے وہ کوئی خاص نقش ہم پر نہیں چھوڑتے ،

البتہ انہوں نے القاب میں نیا رنگ پیدا کیا ہے :

''گرامی گوہر، سلام معنون اخلاص و دعا مشحون سواد تحریر سراپا تنویر سرمہ کش دیدہ منتظر ہوئی - میرے قدر دان میرے مہربان سلام مسنون! اخلاص و دعا مشحون لو - مدت کے بعد محبت نامہ آیا - پیاری نظم و نثر نے مسرور کیا - سر کے پاؤں بری زمین تھی آپ نے غزل زور طبیعت سے بہت اچھی کہی - ایسی زمین میں تکلف اور بناوٹ کے سوا کیا ہو سکتا ہے - اثر باقی مزے کی زمین تھی اس میں مزے کے شعر نکلے'' - (خط بنام حبیب الرحمان خان حسرت شیروانی ۹ دسمبر ۱۸۸۸ء) -

مرزا داغ

داغ کے خطوط[1] - (انشائے داغ) نواب رامپور نظام دکن نواب وقار الملک اور شاگردوں اور دوستوں کے نام ہیں 'انشائے داغ' کے مرتب نے اپنے مقدمہ میں لکھا ہے کہ :

> ''خانگی اور معمولی باتوں کے علاوہ جب کہیں تذکرۂ عشق و عاشقی اور تبصرۂ حسن و جمال کا پہلو مل جاتا ہے اور مخاطب معشوقانہ انداز و ادا کا سرمایہ دار ہوتا تو اس خط میں وہ بے شوخی کیے نہیں چوکتے تھے''۔

شاد عظیم آبادی کے خطوط ڈاکٹر محی الدین قادری زور کی ترتیب کے ساتھ شائع ہو چکے ہیں - عبدالحلیم شرر کے خطوط 'نقوش' لاہور مکاتیب نمبر میں شامل اشاعت ہیں مزید کچھ خط رسالہ 'آجکل' دہلی خط نمبر اپریل ۱۹۵۴ء میں بھی شامل ہیں[2] - ریاض خیر آبادی کے خط بھی توجہ کے قابل ہیں - مزید جلال لکھنوی ، سید احمد دہلوی مؤلف 'فرہنگ آصفیہ'، حبیب الرحمان خان شیروانی ، مولانا غلام قادر گرامی ، وحید الدین سلیم ، عبدالرحمٰن بجنوری ، حکیم عبدالحئی مصنف 'گل رعنا' اور چکبست لکھنوی کا خط بنام لالہ سری رام کسی نہ کسی پہلو سے قابل توجہ ہیں -

---

(۱) مولانا احسن مارہروی (مرتب) انشائے داغ ، انجمن ترقی اردو ہند (دہلی) ۱۹۴۱ء و بوستان قلم مرتبہ محمد عبداللہ خان خویشگی میں ۲ خط -

(۲) نقوش ، مکاتیب نمبر ۱۹۵۶ء -

(ج) عورتوں کا ادب

تمہید

تاریخ اس امر کی شاہد ہے اور حالات و واقعات جو مشاہدہ کی صورت دانشوروں کے سامنے ہیں ، اس بات کے گواہ ہیں کہ کرہ ارض پر جو ممالک مہذب اور ترقی یافتہ خیال کیے جاتے ہیں ان کے عروج ، انکی ترقی اور تہذیب و تمدن کا ذریعہ تعلیمِ نسواں رہا ہے -

برصغیر پاک و ہند میں تعلیمِ نسواں کی طرف سب سے پہلے ۱۸۶۴ء کے لگ بھگ گورنمنٹ پنجاب نے توجہ دی اور اس توجہ کے نتیجے میں نارمل سکول اور دوسرے مدرسہ جات برائے خواتین معرضِ وجود میں آئے - لیکن قوم کی جھوٹی غنا ، بے توجہی اور ناقص العقلی نے ان کا عدم وجود برابر کر دیا - اول تو ان اسکولوں میں معمولی درجہ کے لوگوں کی بچیاں حصولِ علم کے لیے آتی تھیں اور اعلیٰ درجہ یا متوسط طبقہ کے لوگ اپنی بچیوں کو نچلے درجہ کی لڑکیوں کے اسکول میں بھیجنا اور ان کے ساتھ پڑھنا نہ صرف گوارہ ہی نہیں کرتے تھے بلکہ کسرِ شان سمجھتے تھے - دوسرے اس دور کا رواج تھا کہ کمسنی ہی میں لڑکیوں کی شادی کردی جاتی تھی جو یقیناً حصولِ علم کے لیے زہرِ ہلاہل کا حکم رکھتی تھی -

اس دور میں ادیبوں نے شعوری طور پر ایسے ادب کو جنم دیا - جس سے تین مقاصد حل ہو سکتے تھے - اول یہ کہ اس ادب سے عورتوں کی تعلیم و تربیت ، اصلاح اور تہذیب ہو سکتی تھی - دوسرے اس میں تفریح کا پہلو بھی موجود تھا - یعنی اس ادب میں اپنے معاشرہ کی ایسی عکاسی ہوتی تھی کہ پرانی اور نئی اقدار کی کشمکش کا پر لطف خاکہ ناظرین کے سامنے آ جائے جس سے وہ اپنے خد و خال پہچان سکیں اور اس آئینہ میں اگر وہ اپنی شکل نہ دیکھ سکیں تو حالی موالی لوگوں کی کج فہمی یا کج روی کو دیکھ کر محظوظ ہو جائیں اور تیسرے یہ کہ اس ادب سے افہام و تفہیم کا مقصد بھی حل ہو جاتا تھا اور قارئین کو فطرتِ انسانی کے نئے نئے پہلوؤں سے آگاہی ہو جاتی تھی - مگر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اصلاح کا پہلو اس سارے ادب پر غالب رہا - چنانچہ مولانا حالی کی 'مجالس النساء' سے لیکر 'مراۃ العروس' اور 'مراۃ العروس' سے لیکر راشدالخیری کی 'صبحِ زندگی' تک جہاں معاشرہ اور روز مرہ زندگی کی بھر پور عکاسی ہو رہی تھی اور ایسے ایسے جیتے جاگتے کر دار تخلیق ہو رہے تھے جو آج تک زندہ و تابندہ ہیں - وہاں معاشرہ میں

عورتوں مردوں اور خصوصیت سے عورتوں کو نہ صرف ان کے فرائض سے واقفیت کرائی جاتی تھی ، بلکہ ان کے حقوق سے بھی انہیں روشناس کرایا جاتا تھا ۔ اس ادب کی سب سے بڑی صفت یا خصوصیت دراصل تعلیم و تربیت نسواں ہے اور 'مجالس النساء' سے لے کر راشدالخیری کے ابتدائی ناول جو اس دور میں شامل کیے جا سکتے ہیں ۔ ان سب میں تربیت نسواں بہت نمایاں ہے ۔ اور اس تربیت کا بالواسطہ نتیجہ یہ ہوا کہ عورت کو حقوق طلبی اور جذبۂ خود اختیاری کی سوجھ بوجھ ہوگئی ۔

معاشرے میں عورت کے مقام کا تصور عشرہ بہ عشرہ بدلتا رہا ۔ پہلی کتابوں میں عورت محض ایک ماں اور بیوی ہے ۔ جس کی سب سے بڑی صفت اس کا سگھڑپن ہے ۔ لیکن دماغی یا فکری لحاظ سے اسکی کوئی حیثیت نہیں ہے ۔ مگر اسی دور کے ناولوں میں جدید عورت کا ظہور بھی ہوتا ہے ۔ اس کی مثالیں ایک طرف 'فسانۂ آزاد' کی حسن آرا ہے اور دوسری طرف محمد ہادی رسوا کی امراؤ جان ادا ہے ۔ یہ عورت رفتہ رفتہ اتنی روشن دماغ ہوئی کہ اس کے فوراً بعد ہی 'روسنک بیگم' جس کی ہیروئین کا نام بھی یہی ہے ۔ جو اگلے دور سے تعلق رکھتی ہے ، مگر مختار ہے اور معاشرے میں اپنی شخصیت کا اثر ڈالنے میں کامیاب ہوتی ہے ۔

ابتدائی تصانیف

جیسا کہ جلد سوم کے تیرھویں باب متعلقہ عورتوں کے ادب میں ذکر ہو چکا ہے ۔ وہ ادب جو فقط عورتوں کی تعلیم و تربیت کے لیے تصنیف کیا گیا ہو وہ بھی اس سے پہلے منظر عام پر آچکا تھا اس قسم کے ادب میں انیسویں صدی کے نصف آخر میں اور اضافہ ہوا ۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۳ء تک کے دور میں جو ادب فقط عورتوں کے لیے لکھا گیا وہ چار قسم کا ہے ۔

پہلی قسم ایسے ادب کی ہے جو فقط ناصحانہ انداز میں لکھا گیا ۔ اس کا مقصد محض تعلیم و اصلاح ہے ۔ یہ ادب چھوٹے چھوٹے رسائل پر مشتمل تھا ۔ ان میں سے بعض تو قرآن حکیم کے احکامات ، احادیث نبوی اور بزرگوں کے اقوال کی تشریح اور ان سے اخذ کردہ پند و نصائح پر محیط ہے ۔ ان میں عورتوں کی پوری زندگی یعنی بچپن سے وفات تک کے تمام مدارج و ادوار سے متعلقہ امور تک بحث کی ہوئی ہے ۔ مثال کے طور پر 'مجالس النساء' از مولانا الطاف حسین حالی سے ایک ایسا اقتباس پیش کیا جاتا ہے جو نہ صرف عورتوں کے بچپن سے وفات تک کے تمام مدارج کی وضاحت کرتا ہے بلکہ معاشرے میں عورت کے مقام کو بھی بیان کریگا :

"دنیا نے ان کے ساتھ یہ سلوک کیا کہ جس دن پیدا ہوئیں سارا کنبہ

یا تو بیٹے کی امید پر خوشیاں منا رہا تھا یا بیٹی کا نام سنتے ہی ایک ایک کے منہ پر اداسی چھا گئی ۔ ماں باپ ہیں تو اداس ہیں ۔ بھائی بہن ہیں تو اداس ہیں ۔ خالہ ، پھوپھی ، نانی ، دادی ، اپنا ، بیگانہ یا گیا جو سنتا ہے ٹھنڈے سانس بھر کر رہ جاتا ہے ۔ یوں ظاہر میں کوئی خوشی کی صورت بنا لے تو کچھ کہی نہیں جاتی ۔ پر خوشی سی چیز سو سو کوس نہیں ۔ پھر جب برس ڈیڑھ برس کی ہوئیں اور اپنی بھولی بھالی صورت اور پیاری پیاری باتوں سے ایک ایک کا جی لبھانے لگیں تو اماں ، باوا ، خالہ ، پھوپھی کی مامتا کچھ جوش میں آئی ، پر بیٹوں کے برابر اب بھی ان کی جان عزیز نہ ہوئی ۔ بیٹوں کا نام غصے میں بھی لیا تو "اللہ آمین" کر کے لیا ۔ ان کو پیار میں بھی پکارا تو 'موئی مرنے جوگی' ، 'غارت گئی' ، کہہ کر پکارا ۔ پھر جب ہوش سنبھالا اور اس قابل ہوئیں کہ ماں کی ، باپ کی تربیت سے آدمی بنیں اور دین دنیا کی برائی بھلائی سے خبردار ہوں ۔ ماں باپ نے ان سے اپنی خدمت لینی شروع کی اور کوئی سلوک ایسا نہ کیا جس سے وہ ان کی احسانمند ہوتیں ۔ پکانا ریندھنا ان کو اس لیے بنایا کہ ماماں رکھنے کی ضرورت نہ ہو ۔ سینا پرونا اسلیے سکھایا کہ درزی یا مغلانی کو سلائی دینی نہ پڑے ۔ چھٹی سے لیکر بسم اللہ تک اور منگنی سے لیکر چوتھی تک جتنی شادیاں کیں وہ اپنے نام کے لیے کیں ۔ جہیز میں جو کچھ دیا وہ دنیا کے دکھاوے کو دیا ۔ ایک پڑھنا لکھنا ایسی چیز تھا جو دنیا اور آخرت میں ان کے کام آتا ۔ سو ماں باپ نے اس کی ہوا تک نہ لگنے دی اور یہ سمجھا کہ اول تو ان کے پڑھانے لکھانے سے ہم کو کچھ فائدہ نہیں ، دوسرے یہ پڑھنے میں رہینگی تو گھر کے کام دھندے کون کریگا ۔ پھر جب بیاہی گئیں اور ایک غیر شخص کے پالے پڑیں تو وہاں میکے سے بھی زیادہ دکھ اٹھانے پڑے ۔ ساری عمر کاٹنی تو درکنار رہی ۔ وہاں ایک ایک گھڑی کاٹنی دشوار ہوگئی ۔ ساس کو یا تو یہ چاؤ لگ رہا تھا کہ کہ کب بہو آئے اور کب بیٹے کا گھر آباد ہو یا بہو کے آتے ہی سو غیروں کی ایک غیر ہوگئی ۔ نندوں کو یا تو آٹھ پہر بھابی کے نام کی تسبیح تھی یا بھابی کی صورت سے بیزار ہوگئیں ۔ خاوند کا دل بھی جیسا چاہیے ویسا نہ ملا ۔ کیونکہ اول تو چودہ پندرہ برس کی جان کو بیاہ

کا ایسا چاؤ ہی کیا تھا ۔ دوسرے ماں بہنوں کی نگاہ بیوی کی طرف سے پھری ہوئی دیکھی ، آگے بیوی میں کوئی ایسا جوہر نہ پایا جو سب کو چھوڑ کر اسی کا ہو رہتا ۔ غرض بیگانی بیٹی کی کسی نے خریداری نہ کی ۔ اب رہی اولاد ، سو جس ماں کی حقیقت باپ کے گھر میں یہ ہوگی ۔ اسکی عظمت ، اسکی بزرگی ، اسکا ادب اولاد کے دل میں کیا خاک ہوگا؛‘[1] ۔

مذہبی رسائل میں اس دور کے چار نمایاں رسائل کا ذکر کافی ہوگا ۔

مذہبی رسائل

رسالہ تحفۃ الزوجین

مولوی محمد قطب الدین خان نے ۱۸۴۵ء میں شروع کر کے ۱۸۵۸ء میں مکمل کیا ۔ یہ ایک مقدمہ اور دو ابواب پر مشتمل ہے ۔ خاتمہ پر شادی و غمی کی رسومات و روایات ہیں ۔ پہلے باب میں ’خاوندوں کے حقوق بیویوں پر‘ روشنی ڈالی گئی ہے ۔ دوسرے باب میں ’بیویوں کے حقوق خاوندوں‘ سے بحث کی گئی ہے ۔ اس کتاب کا مقصد یہ ہے کہ احادیث و تفاسیر کی روشنی میں مرد اور عورت دونوں کو ان کے حقوق و فرائض سے آگاہ کیا جائے ۔ بری اور غلط رسومات و روایات کی وضاحت کرکے ان سے نجات دلائی جائے ۔ اتباعِ احکامِ خدا اور رسول کے ساتھ تقویٰ کا بھی بیان ہے ۔ ان رسموں سے پرہیز کرنا بتایا ہے کہ جن میں کفر کا خوف ہے ۔ شادی کی بہت سی رسموں کو کافروں اور فاسقوں کی رسمیں بتایا ہے ۔

آداب النساء (جلد دوم)

یہ منظوم کتاب حافظ سید محمد بنگلوریہ نے ۱۸۵۸ء میں خاص طور پر عورتوں کے لیے لکھی ۔ جس کا ذکر خود مصنّف نے اپنی کتاب کے آخری صفحے پر ان اشعار میں کیا ہے :

نہ تھی عورتوں کے لیے کوئی کتاب
لکھا چند اوراق سو ہوئی کتاب
زنانی محاورت زنانی لغات
زنانی لب و لہجہ اور ان کی بات

---

(۱) حالی ، الطاف حسین ، مولوی ، مجالس النساء (پہلا حصہ) ص ۶ سے ۸ ۔ لاہور ۱۸۸۳ء

بہر حال مخصوص عورات کو
ہدایت ملے مجھ کو حسنات ہو

اس کتاب کا آغاز حمد و نعت سے ہوتا ہے :

''اس میں نماز کی ترغیب ، معراج کا حال ، تعریف علماء ، قرآن و آل ابتدائے جہان کا سن وصال ، آدم و حوّا کی پیدائش ، چار نبی ، چار خلیفوں ، چار امام اور چار دشمن انسان کے اور پانچ منزل و مقام کا ذکر مذکور ہے اور پانچ رکن اسلام کے پانچ فائدوں کے ساتھ ، گیارہ ازواجِ مطہرات ، دو دو تین تین نکاحِ ثانی شوہر کا حق ، گوشے گوشے کی بات اور نقشے وغیرہ کا بیان مسطور مسورات کے لیے ہے''(۱) -

ہر منزل یا ہر فصل کی ابتداء اجی بی ! کو مخاطب کر کے ہوتی ہے - جس سے بات ہوتا ہے کہ عورتوں کے لیے ہے -

رسالۂ علم الاخلاق

مولوی سید کرامت حسین کی اس کتاب میں ۴۷ عنوانات میں حقوق اور علم الاخلاق سے بحث کی گئی ہے - ان میں سے چند قابلِ ذکر یہ ہیں - علم الاخلاق میں جبر و اختیار کے معنی ، نکاح ، حق سال ، حق اولاد ، مریض اور آفت رسیدہ کی اعانت اور عورتوں کے حقوق وغیرہ - اگر اس آخری موضوع کو بجنسہی یہاں پیش کر دیا جائے تو اسی سے اندازہ ہو جائے گا کہ عورتوں میں اتنا شعور پیدا ہو چلا تھا کہ وہ اپنے حقوق کے لیے مطالبہ کریں :

''جیسے مردوں کو اپنے ان افعال میں جو زیستہائے سہ گانہ کے لیے مفید ہیں پوری آزادی ہونا چاہیے - عقد سے بوجہ کلیہ تقسیمِ محنت چند کام شوہر کے ذمہ ہوں گے اور چند زوجہ کے اس طور سے اون کی مطلق آزادی میں ضروری قیدیں لگیں گی مگر اون ضروری قیدوں کے علاوہ پوری آزادی چاہیئے - جتنے حقوق کا بیان ہوا ، اون سب میں عورتوں کو ویسی ہی آزادی چاہیے جیسی مردوں کو چاہیے''(۲)-

---

(۱) سید محمد بنگلوریہ ، حافظ ، آداب النساء (جلد دوم) ص ۱ - مطبع محمدی بمبئی ۱۸۵۸ء -

(۲) سید کرامت حسین ، مولوی ، رسالۂ علم الاخلاق - ص ۱۱۲ - قیصر ہند پریس ، الہ آباد ، ۱۹۰۷ء -

تحفۃ الاحبا فی احکامِ تحریم النساء

قطب الدین خانصاحب مرحوم دہلی نے اردو زبان میں لکھی - ۱۹۱۶ء میں چھٹی بار نول کشور پریس کانپور میں چھپی - اس ۳۶ صفحات کے مختصر کتابچے کے پہلے اور آخری صفحے پر خود مصنف نے اس کتاب کے مقصد پر یوں روشنی ڈالی ہے :

> "تحفۃ الاحبا فی احکام تحریم النساء واسطے بصیرت اہلِ ایمان و یقین کے کہ اکثر وہ مسائلِ محرمات سے آگاہ ہو جائیں کہ کون عورتیں ہم پر حرام ہیں اور کس کس طرح سے عورت حرام ہوتی ہے ..... واسطے افادۂ عوام کے نہایت عمدگی کے ساتھ زبانِ اردو میں بمحاورۂ روز مرہ قرآن شریف اور حدیثِ پاک سے نقل فرما کر ترجمہ کیا"۔

قرآنِ مجید کے علاوہ فتاویٰ عالمگیری سے بھی استفادہ کیا گیا ہے - ایک مسئلہ ختم نہیں ہونے پاتا کہ لفظ 'اگر' آ کر دوسرا مسئلہ شروع ہو جاتا ہے - اس طرح یہ کتاب مسلسل ایک دوسرے سے جڑے ہوئے مسائل پر مبنی ہے -

نیا ادب

اس کے بعد ایسا ادب پیدا ہونے لگا جس میں یہی باتیں اور خاص طور سے عورتوں کی تعلیم کے مسائل پر چند ایک فرضی کردار بحث کرتے ہیں - یہاں سے ناول کی چار بنیادی ضروریات میں سے دو ضروریات کا نشان ملنا شروع ہو جاتا ہے - یعنی کردار نگاری اور گفتگو و مکالمے (یعنی ایسے ادب میں جن سے کرداروں کی نفسیات کا اندازہ بھی ہو جاتا ہے) موجود ہوتے ہیں -

اس عبوری دور کے ادب کی مثالیں 'سراج الہدایت'، 'مجالس النساء' اور 'زہرہ المعروف بہ 'مشیرِ نسواں' میں مل جاتی ہے -

سراج الہدایت

یہ کتاب محمد وزیر علی خان نے ۱۸۴۷ء میں چھوٹے بچے اور بچیوں کے لیے لکھی اس کا تفصیلی ذکر اس سے پہلے کی جلد یعنی ۱۸۰۳ء سے ۱۸۵۷ء کے ادب میں آ چکا ہے -

مجالس النساء

مولانا الطاف حسین حالی نے جو کتابیں اینگلو عربی اسکول دہلی کے مدرس کی حیثیت سے لکھیں ان میں سے چند ایک عورتوں کے لیے تصنیف کیں ، جن میں 'مجالس النساء' ایک خاص اہمیت کی حامل ہے ۔

حالی نے 'مجالس النساء' کے کرداروں کو اس طرح تخلیق کیا ہے کہ ہر کردار ایک صفاتی کردار بن گیا ہے ۔ یعنی ہر کردار کی ایک انفرادی حیثیت اور اپنی اپنی خصوصیات ہیں جو اسے دوسرے کردار سے جدا کرتی ہیں اور اس کی یہ خصوصیات ہر مقام پر روشن نظر آتی ہیں ۔ یہی سبب ہے کہ کتاب کو کہیں سے بھی اٹھا کر پڑھنا شروع کر دیں وہیں سے قاری سمجھ جاتا ہے کہ یہ کس کردار کی گفتگو ہے یا کس کردار کے متعلق ہے ۔ علاوہ ازیں ہر کردار کی گفتگو میں ایک واقعیت بھی موجود ہے ۔ مکالموں میں روز مرہ سے کام لیا گیا ہے ۔ جس میں زبان سادہ اور پرتاثیر بن گئی ہے اس ناول میں اصلاح اور تفریح دونوں کا امتزاج موجود ہے ۔ یہ مذہبی رسائل اور ناول کی درمیانی کڑی ہے ۔ کیونکہ مکالمہ جو ناول کا بنیادی عنصر ہے اس کے ذریعے کردار اور معاشرے پر تنقید و تبصرہ کرتے ہیں ۔ مثلاً "آتو جی کے ساتھ محمودہ بیگم اور اس کی ماں اور مریم زمانی بیگم کی گفتگو :

"آتو جی ! آداب

برخوردار بوڑھ سہاگن ! بیگم یہ تمہارے ساتھ اور کون ہیں ؟

ہیں ! آتو جی آپ نہیں جانتیں ؟ میری سہیلی ہیں ۔

اے کون ہیں ؟ مریم زمانی ؟

حضرت ! بندگی

بھلا بیٹا بہت سی عمر ، میاں جیے ، بچے جئیں ، بوا تم کہاں ؟

جی میں ابھی آ کے اتری ہوں"[1]۔

اسی تبصرہ میں حالی نے عورت کی معاشرے میں جگہ کو بیان کیا ہے اور اس سے نجات کا ذریعہ حصولِ علم و ادب بتایا ہے ۔ یہ ڈرامہ اور ناول کی ایک ملی جلی شکل ہے ۔

---

(۱) حالی ، الطاف حسین ، مجالس النساء (پہلا حصہ) ص ۱ ، لاہور ۱۸۸۳ء ۔

اس میں چار بڑے کردار ہیں اور چاروں عورتوں کے کردار ہیں - یعنی آتو جی ، محمودہ بیگم ، اس کی ماں اور مریم زمانی وغیرہ ـ اس قصہ کا ہر ہر واقعہ سبق آموز اور اصلاحی پہلو رکھتا ہے ـ آتو جی جو ایک معمر خاتون ہیں یہ قصہ چھیڑتی ہیں ، قصہ میں جس خاندان کا ذکر ہے اس کے ہر فرد کی زندگی اور واقعات کو جزئیات کے ساتھ بیان کیا ہے - معلوم یوں ہوتا ہے کہ کہانی در کہانی ہے -

زبان سادہ سلیس ہونے کے ساتھ ساتھ خالصتاً عورتوں کے لہجہ اور محاورہ میں ہے -

ناول

زہرہ المعروف بہ مشیرِ نسواں

از بیگم سید ہمایوں مرزا بیرسٹر ایٹ لاء ـ مطبع اختر حیدر آباد دکن ۱۹۰۶ء - ناول کے پیرایہ میں یہ کتاب عورتوں کی ہر عمر اور ہر حالت کے متعلق مفید نصائح اور معلومات کے ذخیرے پر مبنی ہے - اس میں بشمر ان واقعات کو بیان کیا ہے جو عموماً عورتوں پر گزرا کرتے ہیں - بعض ناگوار یا سخت حالات بھی ہوئے ہیں اور ان سے بچنے کے لیے عقل و دانش کے ساتھ ساتھ زیورِ تعلیم سے بھی آراستہ ہونا چاہیے - مزید برآں مختلف علوم سے واقفیت کے فوائد بھی بیان کیے ہیں - یعنی علمِ جغرافیہ ، علمِ باغبانی وغیرہ وغیرہ - یہ سب باتیں ایک خاندان کے افراد کے ذریعہ پیش کی گئی ہیں - ارشاد علی ان کی بیگم شمسی بیگم اور ان کی بڑی بیٹی زہرہ ، بیٹا خالد اور پھر چھوٹی بیٹی سیعدہ بانو ہیں - زہرہ اس پوری کہانی میں ہیروئن کا کردار ادا کرتی ہے - مصنف نے اس میں جملہ سلیقے ، علم و ادب ، ہنرمندی غرض سب خوبیوں کا مجسمہ بنا کر پیش کیا ہے - رقیہ کو ایک پھوہڑ لڑکی کے روپ میں دکھایا ہے اور استانی جی ہمہ وقت علم و عقل کا پرچار کرتی رہتی ہیں - اس طرح چھوٹے چھوٹے مضامین ایک دوسرے سے ایک کڑی کی مانند جڑے ہوئے ہیں اور اس طرح جڑ کر ایک ناول کی شکل اختیار کرتے ہیں -

اس کے بعد تیسری قسم کے ادب کا ظہور ہوتا ہے جس میں 'مراۃ العروس' جیسی کتابیں شامل ہیں - یہاں عورت کو ایک خاندان کا فرد تصور کیا گیا ہے اور ایک پورے ماحول کی تصویر کشی کی گئی ہے - اگرچہ ایسے ناولوں کا مقصد اصلاحی ہے ، مگر اس میں جیتے جاگتے کردار پیدا ہو گئے ہیں اور معاشرے کی جزئیات اس طرح دی گئی ہیں کہ قصہ پر حقیقت کا گمان ہوتا ہے - اب اس ادب میں مکمل ناول بھی پائے جاتے ہیں اور ان میں ناولوں کی چاروں خصوصیات مل جاتی ہیں - یعنی ماحول کا بیان ، کردار نگاری ، پلاٹ

اور مکالمے ۔ اسی قسم کا ادب ایسے ناولوں پر منتج ہوتا ہے ۔ جس میں گھریلو زندگی میں عورتوں کے سگھڑ پن کے باوجود معاشرے کی کڑی پابندیوں کی وجہ سے عورتوں کی مجبوری اور اکثر اوقات بے بسی اور مصیبت کے بیان سے بالواسطہ احتجاجی اندازِ بیان ہو جاتا ہے ۔ 'صبحِ زندگی'، 'شامِ زندگی'، 'شبِ زندگی' اور 'نوحۂ زندگی' اسی قسم کے ناول ہیں ۔ اس کے ساتھ ہی اس قسم کے ناول بھی لکھے جانے لگے جن میں لونڈیوں، مغلانیوں، داشتاؤں یا منکوحہ طوائف کے گھر میں لانے سے جو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں ان کو موضوع بنایا گیا ہے ۔ اس قسم کے ناولوں میں منشی سجاد حسین کی 'طرح دار لونڈی' اور ڈپٹی نذیر احمد کی 'محصنات' یا 'فسانۂ مبتلا' شامل ہیں ۔

منشی سجاد حسین لکھنوی کی 'طرح دار لونڈی' مکالمہ نگاری کی مکمل اور قابلِ ستائش تصنیف ہے ۔ آپ انیسویں صدی کے بڑے صحافی تھے نہ کہ ناول نگار، لیکن جتنے ناول لکھے وہ سب کسی اور ہمعصر کے ناولوں سے کسی طور بھی کم تر نہیں ۔ منشی صاحب کا مشہور ناول 'حاجی بغلول' ہے جو اس دور کے لیے مزاح نگاری کے نمونے سے بڑھ کر نہ تھا ۔ انیسویں صدی کے نصف آخر میں داستان گوئی زوال پذیر تھی اور ناول کو عروج حاصل ہو رہا تھا ۔ بلکہ اگر ہم یوں کہیں کہ منشی سجاد حسین نے جس ماحول میں آنکھ کھولی تو ناول نویسی ایک فیشن بن چکی تھی ۔ رسالوں میں قسط وار ناول چھپنے کا بہت رواج تھا ۔ 'طرح دار لونڈی' کی جو سب سے بڑی خوبی ہے وہ کردار نگاری اور مکالمہ نگاری ہے ۔ اس کے بیشتر کردار خواتین ہی ہیں یعنی مغلانی انّا، لونڈی، ماما اور بیگم صاحبہ وغیرہ ۔ ہر طبقہ اور ہر درجہ کی عورت کی زبان، لب و لہجہ اور روزمرہ جداگانہ ہے ۔ یعنی مغلانی کی زبان لونڈی کی زبان سے بہتر ہوگی اسی طرح درجہ بدرجہ زبان کا فرق نمایاں ہے ۔ مثلاً بخشو اور اس کی جورو کے جوتی پیزار کا اقتباس بطور نمونہ پیشِ خدمت ہے :

جورو : سن تو سہی ۔ یہ آج اپنی بہنیاں نجبن بیگم کو اچھی بڑی سی دریتی لا دینے کو پیسے اچھی طرح نکل آئے اور اس وقت مستان سرمے والے نے آواز لگائی، اللہ ہم ایک پیسہ مسّی کو مانگا کیے ۔ قسمیں کھانے لگا، کس شمر کے بچے کے پاس ایک جھنجھی بھی ہو، نہ دینا تھا نہ دیا، اب یہ کہاں سے دام نکلے ؟

بخشو : میں کہتا ہوں نصیباً کی ماں ! تم اپنے ہوش میں ہو ؟ کہیں گھانس تو نہیں کھا گئیں ؟ وہ باتیں کرتی ہو جس سے گدھے کو بھی بخار آتا ہے ۔ شک کی بھی حد کر دی ۔ آج کئی دن سے اس نے پیسے دبے تھے، بازار اگر تم جاتا تو میرے لیے آئینہ لے آنا ۔ تم جانو، میری بھول جانے

کی تو خو ہے ، نہ خیال رہا ، آج دھیان آیا ، لیتا آیا"(۱) ۔

زبان دانی اور کردار نگاری میں مہارت کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ جس ماحول اور کنبہ میں منشی سجاد حسین نے پرورش پائی اس میں سب قسم کے کردار موجود تھے ۔ اس لیے انہیں سب طبقوں کی عورتوں کو قریب سے دیکھنے اور ان کی زبان سننے کا موقع بھی ملا جس سے انہوں نے پوری طرح فائدہ اٹھا کر 'طرح دار لونڈی' کے سب کرداروں میں جان ڈالی ۔

اس کے بعد ایسا ادب پیدا ہونے لگا جس میں جدید عورت یعنی موڈرن گرل کا ظہور ہوتا ہے ۔ اس قسم کے ناولوں کی ہیروئن تعلیم یافتہ ہوتی ہے اور معاشرے میں اپنا مقام متعین کرنے یا کروانے میں بلا واسطہ کوشش کرتی ہے ۔ اس قسم کے ناولوں کی مثال 'روشنک بیگم' ہے ۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو رتن ناتھ سرشار کے 'فسانۂ آزاد' میں بھی جدید قسم کی عورتوں کی مثال ملنی شروع ہو گئی تھی ۔ کیونکہ 'فسانۂ آزاد' کی ہیروئن جہاں آرا اپنے خواستگاروں کا امتحان لیتی ہے اور اپنے حصول کی شرائط خود متعین کرتی ہے بلکہ جب میاں آزاد امتحان میں پورے بھی اترتے ہیں پھر بھی انہیں ترکیہ جا کر رومیوں سے لڑنا پڑتا ہے ۔ تاکہ وہ ثابت کر سکیں کہ ان میں مثالی ہیرو کی صفات بھی موجود ہیں ۔ (مزید تفصیل کے لیے دیکھیے اسی جلد کا گیارھواں باب) ۔

اس دلیل سے یہ بات ثابت کرنے کا ارادہ نہیں ہے کہ 'فسانۂ آزاد' عورتوں کے ادب میں بھی شامل کیا جائے ۔ مقصود اس سے یہ ہے کہ عورتوں کے ادب میں ایسی عورت کا ظہور جو اپنی قسمت کی خود مالک ہو اور اپنی زندگی کے متعلق خود فیصلہ کر سکے یا جس میں فعالیت کی صفات بھی موجود ہوں ہمارے ادب میں کوئی ایک سو سال سے موجود ہے اور دیکھا جائے تو یورپ میں بھی جدید عورت کا ظہور ایک سو سال سے کم ہے ۔

'بحرِ دانش' از محمد عبدالرحمٰن مطبع نظامی کانپور

عبدالرحمٰن صاحب نے بھی یہ کہانی کسی اپنے دوست سے سنی تھی ۔ یہ بیس صفحات کا مختصر کتابچہ ایک قصہ ہے بہ مشتمل سوداگر بچہ و جوہری بچہ ملک چین و فیصلۂ حکیم عقلِ بحر ۔

اسکی زبان اس وقت کے رواج کے مطابق مسجع اور مقفیٰ ہے ۔ نثر کے درمیان کہیں کہیں چند بند اشعار کے بھی آ جاتے ہیں ۔ اس قصہ کا لبِ لباب یہ ہے کہ عورتوں کی

(۱) سجاد حسین ، منشی ، طرح دار لونڈی ۔ ص ۵۶ ۔

بے حجابی اور بے پردگی مردوں پر مصیبت لاتی ہے - لہذا پردہ نشینی پر زور دیا ہے - اب مقفیٰ عبارت کا نمونہ ملاحظہ ہو :

> ''کہتے ہیں کہ ملک چین میں ایک جوہری بچہ اور تاجر زادہ میں نہایت رابطہ اور اتحاد تھا ، مگر جوہری بچہ از بس خبیث النفس بانئی فساد اور تاجر زادہ سلیم الطبع نیک نہاد تھا ، دونوں میں ایسی محبت اور الفت تھی کہ دیکھنے والوں کو حیرت تھی ، رات دن ہمکاسہ و ہم نوالہ ، شب و روز ہم پیالہ . گویا ایک جان دو قالب ، ایک دوسرے پر دوستی میں غالب ، بے دیکھے آپس کے ایک دم قرار نہ ہوتا ، جدائی کے نام سے ہر ایک کھونا - فرط محبت سے دونوں بیقرار ، مستاء دوستی سے سرشرا ، باہم اسقدر بے تکلفی کو بڑھایا ، کہ پردہ حجاب مستورات کا بھی درمیان سے اوٹھایا''(۱) -

'بدرالنساء کی مصیبت' مصنفہ مولوی عبدالحلیم شرر لکھنؤ ۱۸۹۷ء قومی پریس لکھنؤ

یہ ایک ایسا چھوٹا سا ناول ہے ، جس میں بردے کے بعض اتفاق حادثات درد ناک مگر دلکش اور دلچسپ انداز میں پیش کیے گئے ہیں - انیسویں صدی کی ابتدا میں جو حالت عورتوں کی تھی وہی انیسویں صدی کے آخر تک کم و بیش رہی - یعنی ان کی تعلیم کی طرف کوئی خاص توجہ نہ دی گئی اور نہ ہی معاشرے میں کوئی نمایاں مقام حاصل ہوسکا - ہاں البتہ اب عقل النساء جیسی عورتوں نے تعلیم نسواں کے سلسلے میں آواز بلند کرنی شروع کر دی تھی -

آئینۂ عبرت یعنی ایک خاتون کی مصیبت از اختر بانو سہروردیہ حبلل متین کلکتہ ۱۹۱۰ء

یہ کتاب برائے نصاب امتحان مڈریکولیشن لکھی گئی یعنی مرد اور عورت دونوں کے لیے یکساں مفید ہونے کی حامل ہے - جیسا کہ موضوع سے پتہ چل جاتا ہے کہ یہ ایک خاتون کی مصیبت کی کہانی ہے جسکو سادہ ترین زبان میں بیان کیا گیا ہے -

سفر نامے

اس دور میں عورتیں بھی سفر نامے لکھنے لگیں تھیں - چنانچہ اسی سلسلہ کی ایک کڑی جو آسانی سے دستیاب ہو سکی وہ یہ سفر نامہ جسکا نام ہے - 'دنیا عورت کی نظر میں'

---

(۱) محمد عبدالرحمٰن ، بحر دانش - ص ۲ ۳ ، مطبع نظامی کانپور -

جسکو بیگم نواب سربلند جنگ نے ۱۹۱۰ء میں خواجہ بک ڈپو دہلی سے شائع کیا ۔ یہ سفر نامہ خاصہ جزوی تفصیلات کا حامل ہے ۔ اس سفرنامہ میں بیگم نواب سربلند جنگ نے مکہ معظمہ ، مدینہ منورہ ، مصر ، شام ، عراق ، اٹلی ، فرانس ، انگلستان اور دنیا کے مختلف ممالک کے چشم دید حالات پیش کیے ہیں ۔ اسکی زبان بھی سادہ اور روزمرہ کے مطابق ہے ۔

تراجم

۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۴ء کے دور کے ادب کا جائزہ لینے سے ہمیں یہ بھی علم ہوتا ہے کہ اس دور میں کئی ایک عربی سے آسان اردو اور انگریزی و فارسی سے بھی آسان اور عام فہم اردو زبان میں تراجم ہوئے ۔ یہاں صرف دو تراجم کا ذکر کرنا کافی ہوگا جن میں سے ایک انگریزی اور دوسرا عربی سے اردو ترجمہ ہوا ۔

سیرِ ظلمات

ظفر علی خان نے ترجمہ کیا اور مطبع شمسی حیدرآباد دکن سے شائع ہوا اس میں وسط افریقہ کے ہولناک اور ہوشربا مناظر اور وہاں کے باشندوں کی اوہام پرستی اور رسومات و عادات کے حیرت انگریز حالات فصیح اور با محاورہ اردو میں پیش کیے گئے ہیں ۔

تفریح القلوب

(ترجمہ) آلام الناس از مولوی وزیر احمد بی ، اے ، شائع کردہ مطبع قیصری بریلی ۱۸۸۳ء ۔ یہ کتاب سب سے پہلے عربی میں موجود تھی ۔ جس کا ترجمہ انگریزی میں ہوا ۔ انگریز اسے بہت ذوق و شوق سے پڑھتے تھے ۔ بعد ازاں مولوی وزیر احمد صاحب نے اسے آسان اور عام فہم زبان میں ترجمہ کیا ترجمہ اتنا اچھا ہے کہ اس میں ترجمہ کا گمان نہیں ہوتا بلکہ اصل ہی محسوس ہوتا ہے ۔ اس کتاب میں خلیفہ اول کے عہد کے دلچسپ واقعات اور قصے لکھے گئے ہیں ۔ اس وقت کے رواج کے مطابق جابجا اشعار بھی موجود ہیں ۔

ادبی رسائل

کچھ ایسے رسائل کا ذکر شروع میں کیا جاچکا ہے جن میں مذہبی مسئلے مسائل سے بحث کی جاتی ہے ۔ لیکن اب جن رسائل کا ذکر درج ذیل ہے وہ ادبی رسائل ہیں اور جس طرح مردوں کے کئی ایک ادبی رسائل اور جریدے شائع ہوتے تھے اسی طرح عورتوں نے بھی اپنی زیرِ نگرانی چند ایک رسائل کا اجراء کیا ۔ ان رسائل کے ناموں ہی سے پتہ چل جاتا

ہے کہ یہ خصوصیت سے عورتوں کے لیے لکھے گئے ہیں ۔ حتی کہ ایڈیٹر کا مؤنث ایڈیٹرہ بنا کر نام کے ساتھ لکھا ہے ۔ کیونکہ عورتوں میں تعلیم بہت کم تھی اس لیے کثیر تعداد میں ایسی خواتین دستیاب نہیں ہو سکتی تھیں جو ان رسائل کے لیے ایسے مضامین لکھ سکیں جو اپنی بہنوں کے لیے مفید ثابت ہوں ۔ چنانچہ اگر مرد بھی ایسے مضامین لکھ بھیجتے جو کسی بھی پہلو سے عورتوں کے لیے فائدہ مند ہوتے تو انہیں رسائل میں جگہ دے دی جاتی تھی ۔ یہاں ایک دو رسائل کا مختصر سا جائزہ لینا ضروری ہے تاکہ قارئین کو ان رسائل کی نوعیت کا کچھ علم ہو سکے ۔ ان رسائل کو کامیاب بنانے میں مردوں نے عورتوں کی کافی مدد کی اور ہمت بھی بڑھائی ۔

رسالہ شریف بی بی ، ایڈیٹر محبوب عالم

اس رسالہ میں عورتوں اور مردوں کے لکھے ہوئے مضامین موجود ہیں ۔ لیکن مردوں نے بھی عورتوں ہی کے موضوعات کو قلمبند کیا ہے یا یوں کہہ لیجیے کہ عورتوں کے لیے عورتوں سے متعلق مفید مضامین لکھے ہیں ۔ رسالے میں جتنے بھی مضامین ہیں ان سب کے موضوعات خاص اہمیت کے حامل ہیں ، مثلاً تربیتِ اطفال ، دستر خوان ، ہند کی بے مثال خواتین ، دکن کی ملکہ چاند بی بی ، ہندوستان کی مستورات کے توہمات ، لباس کی نسبت میری رائے اور تعلیمِ نسواں اور اسکی غرض ، اس آخری مضمون سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو تاکہ اس دور کی عورت کے نظریات اور سہل متمنع زبان کا اندازہ ہو سکے ۔

> ”عورتوں کی تعلیم کے متعلق آج تک بعض لوگوں کا خیال ہے کہ عورتوں کو صرف کسی قدر مذہبی تعلیم دینی چاہیے ۔ اس سے زیادہ تعلیم کا اثر ان پر بہت برا پڑے گا ۔ ان کے اخلاق اور حیا کو نقصان پہنچائے گا اور پردہ سسٹم سے باہر جانے کی ترغیب دے گا ۔ افسوس ہے کہ ایسے لوگ یہ نہیں خیال کرتے کہ اگر یہی عورتیں جو بچوں کی بہترین اتالیق ہیں ، جاہل اور نالائق رہ جائیں گی تو ان کے شاگرد (یعنی بچے جو دنیا کی آئندہ آبادی ہوں گے) بوجہ احسن کندۂ ناتراش اور جاہل نکلیں گے ۔ اس سچے اصول کا کوئی بھی توڑ نہیں ہو سکتا کہ دنیا کی ساری شائستگی کا مدار کسی ملک کی عورتوں پر ہے ۔ افسوس ہے کہ بے انصاف لوگ صرف اس بات کو مقدم سمجھتے ہیں کہ عورتوں پر ناجائز حکمرانی کریں ۔ ان کو غلامی کے حلقے سے باہر نہ جانے دیں کیونکہ اگر تعلیم کی روشنی ان کی آنکھوں میں بھر گئی تو جہالت

کی تاریکی میں وہ زیادہ عرصہ رہنا پسند نہیں کریں گی اور یہ کیسا ظلم ہے کہ عورتوں کو صرف عورتوں کے حیلہ پر جاہل رکھا جائے۔ خواہ نسل ہی مسخ یا یوں کہو کہ منقطع کیوں نہ ہو جائے۔ کیونکہ بری نسل سے نسل کا منقطع ہونا ہی بہتر ہے۔

دانی چہ گفتہ اند بنی عوف در عرب
نسلِ بریدہ بہ کہ موالید بے ادب"[1]

رسالہ پردہ نشین

(مرتبہ) مسز خاموش ۱۹۱۲ء تا ۱۹۱۵ء مسز احتشام مہتممِ اشاعت 'رسالہ پردہ نشین' آگرہ 'رسالہ پردہ نشین' کا مقصد عورتوں کے مضامین عورتوں کے لیے پیش کرنا تھا۔ لیکن کبھی کبھی کوئی اچھا مضمون مردوں کا بھی شاملِ رسالہ کیا جاتا تھا۔ اس رسالہ میں جن موضوعات پر عموماً مضامین لکھے جاتے ان میں اہم شخصیتیں، معاشی اور معاشرتی مسائل اور امورِ خانہ داری سے متعلق ہدایات وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ مثلاً ایک بہادر عربی خاتون، دہلی میں زنانہ کالج سے پہلے مردانہ کالج ہونا چاہیے، سنہری کمخواب، باورچی خانہ اور شریف زادی، ممتاز محل کا عرس، زنانہ اور متفرق جنگی خبریں، قبل از وقت شادی، تعلقات زن و شوہر وغیرہ۔

اس رسالہ میں صرف نثر ہی نہیں بلکہ ایک آدھ نظم بھی شامل ہوتی، جن کے موضوعات اس قسم کے ہوتے تھے، مثلاً قدرتِ خدا کی تعریف میں اور لوری وغیرہ۔ اس کے علاوہ چند موضوعات مستقل بھی ہوتے مثلاً دو دو باتیں اور رسم و رواج وغیرہ۔

علامہ راشد الخیری

مولانا کی خدمات اصلاحِ نسواں کے بارے میں اتنی متنوع ہیں کہ ان کا ذکر اس مضمون میں لازمی ہے۔ مولانا کی کثیر التعداد تصانیف سے ظاہر ہے کہ ان کی تمام زندگی صنفِ کمزور کی حمایت و وکالت میں بسر ہوئی۔ ہم اس بات کے لیے معذرت خواہ ہیں کہ اس مضمون سے متعلق بہت سے ایسے فاضل مصنفین کو،

(۱) رسالہ شریف بی بی، جون ۱۹۱۰ء - ص ۳ -

ان کے ادب پاروں اور رسائل کو نظر انداز کرنا پڑا ہے ۔ کیونکہ اس مختصر سے مضمون میں جس قدر گنجائش تھی ۔ اسی قدر پیش کر دیا گیا ہے ۔

عبدالماجد دریاد بادی رسالہ 'صدق لکھنؤ' میں علامہ راشد الخیری کے بارے میں لکھتے ہیں :

''وہ عورت کا حقیقی غم خوار تھا ۔ ہر عورت کو بہترین بیٹی ، بہترین ماں دیکھنے کا آرزو مند تھا.......اس نے تبلیغ شرافت کی کی ، حیا و عصمت کی کی ، مشرقیت کی کی ، حوّا کی بیٹیوں کو وہ عائشہ اور فاطمہ کی خوش نصیب کنیزیں بنانا چاہتا تھا ۔ مس سنگیز اور ڈاکٹر میریا اسٹوپس کی غلامی کی طرف لے جانا نہیں چاہتا تھا ۔ اس نے مسلمان عورت بنانا چاہا ۔ جنت کی حور بنانا چاہا ۔ راجہ اندر کے اکھاڑے کی پری نہیں''۔

حفیظ ہوشیار پوری

''لہو روتا رہا وہ عورتوں کے خوابِ غفلت پر
عیاں کرتا رہا داغِ جگر صفحاتِ عصمت پر

بسر کی خدمتِ نسواں میں ساری زندگی اپنی
زبانِ خاص سے آنسو بہائے ان کی حالت پر''

راشد الخیری مسلم عورتوں کے بہت بڑے محسن ہیں ۔ اردو زبان کو درجۂ کمال پر انہوں نے ہی پہنچایا ۔ ان کے ہاں سر سید کی سی سوچ و فکر ، نذیر احمد کا ساز در قلم ، حالی کی طرح قومی و ملی درد ، انیس کی سی جذبات نگاری ، اور آزاد کی سی انشاء پردازی ۔ غرض سب ہی خصوصیات ان کی تحریروں میں موجود ہیں ۔ ان کے ادب کا سب سے بڑا مقصد اصلاحِ معاشرت ہے جس کے لیے وہ مختلف نقادوں کی رائے کے مطابق کبھی غم نگار ہیں ، کبھی شاعر ، کبھی مؤرخ ، کبھی مبلغِ اسلام اور کبھی ایڈیٹر 'عصمت'۔

علامہ راشد الخیری نے یوں تو بے شمار کتب خواتین ہی کے مسئلے مسائل سے متعلق لکھیں یہاں دو ایک کا ذکر ہی ممکن ہے ۔

صبحِ زندگی

۱۹۰۷ء میں لکھی گئی اور ۱۹۰۹ء میں پہلی بار رسالہ 'مخزن' میں شائع ہوئی - اس کتاب میں نسیمہ بیگم کو ایک مثالی کردار کے طور پر پیش کیا اور یہ بھی بتایا ہے کہ ایک مکمل اور مثالی عورت کس طرح کی تعلیم و تربیت سے وجود میں آتی ہے اور وہ نہ صرف اپنے خاندان بلکہ اپنی پوری قوم کے لیے باعثِ فخر شخصیت ثابت ہوتی ہے - پوری کتاب میں نسیمہ بیگم کی تعلیم و تربیت، اخلاق و ادب اور تمیز تہذیب سکھانے کی ہی باتیں ہیں - مثلاً پانچ چھ سال کی بچی باپ کے سلام کو جاتی ہے تو پہلے اس بات پر ڈانٹ پڑتی ہے کہ:

"چھم چھم کرتے باپ کے آگے جانا تم کو شرم نہیں آتی -

وہ جھانجن چوڑیاں اتار پلنگ پر ڈال کر چلنے لگتی ہے کہ پھر اس کے کان میں یہ الفاظ چھنجتے ہیں:

نوج ایسی بے ڈھنگی بیٹی ہو کہ کسی چیز کا ٹھیک ٹھور ہی نہیں - جہاں جی چاہا اتار پھینکی" (ص ۱۶) -

شام زندگی (فروری ۱۹۱۷ء)

"شامِ زندگی'، 'صبحِ زندگی' سے بھی بڑھ گئی - مولانا نے اس خوبی اور لیاقت سے لکھا کہ عورتوں کو، لڑکیوں کو، مردوں اور لڑکوں کو سب کو یکساں مفید ہوگی .... اب کوئی شخص اس مفید کتاب کو نہ پڑھے اور اپنی مستورات اور بچوں کو اس کی دید سے محروم رکھے تو اس کا کیا علاج.... شام زندگی باعتبار علم و ادب اردو زبان کا بہترین تحفہ ہے اور باعتبار مضمون ہر شخص تسلیم کرے گا کہ مولانا راشد الخیری کی تحریر مستورات کے معاملے میں ہمیشہ دل کے پار ہو جاتی ہے"[1]-

---

(۱) خواجہ حسن نظامی، اخبار صداقت، کلکتہ اپریل ۱۹۱۷ء -

(د) بچوں کا ادب

انیسویں صدی کے تقریباً وسط سے اردو ادب میں انقلاب پذیری کے واضح رجحانات کا پتہ چلتا ہے - اور معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانی ادیبوں نے ادب و انشاء کا وہ حول جس میں بند وہ کر وہ ایک طویل عرصے تک دنیا کو نہ دیکھ سکتے تھے ، بالکل توڑ دیا تھا - اس عہد کے نامور ادیبوں مولوی نذیر احمد ، مولوی ذکاء اللہ ، مولانا محمد حسین آزاد ، مولوی محمد اسمعیل میرٹھی اور مولانا الطاف حسین حالی نے بچوں کے لیے نہایت منظم طریقے پر کتابیں لکھیں ، جن کے ذریعے تہذیب و تمدن اور قومی خصائص کی پوری پوری نگہداشت ہوئی اور اس امر کا خاص لحاظ رکھا گیا کہ بچوں میں زندگی کے تقاضے پورے کرنے کی صلاحیت پیدا ہو - ان کتابوں نے اس انقلابی زندگی کی طرف رہنمائی کی جو ۱۸۵۷ء سے پہلے کی دنیا سے نکال کر لوگوں کو تمدن ، معاشرت ، سیاست ، مذہب اور علم و ادب کی نئی دنیا کی طرف لے جا رہی تھی - یہ رجحان اس شعور کا آفریدہ تھا ، جسے سر سید ، اہلِ ملک ، بالخصوص مسلمانوں میں پیدا کرنا چاہتے تھے - چنانچہ سر سید کے افکار و خیالات کی یہ رو جنہیں حالی ، شبلی اور نذیر احمد نے بروان چڑھایا ، ان نئی کتابوں میں موجود تھی اور ہر کتاب زندگی کا کوئی نہ کوئی نیا پہلو لیے ہوئے تھی اور اس امر کی غماز تھی کہ بچوں کو اب نئی دنیا کی ضرورت ہے - نذیر احمد کی 'چند پند' اور 'منتخب الحکایات' کو چھوڑ کر کہ یہ دونوں قدیم طرز کی اخلاقی تربیت کی مدعی ہیں ، باقی سب کتابوں میں اس انقلاب پذیری کا نشان ملتا ہے اور یقین ہوتا ہے کہ اس کام کو نہایت سلیقے سے سرانجام دیا گیا -

نذیر احمد ، حالی اور آزاد نے بالخصوص قصے اور کہانی کو قومی مقاصد کی تکمیل کے لیے استعمال کیا - یہ بات نہایت واضح طور پر ان تصانیف سے معلوم ہوتی ہے ، جن میں ادیبوں کا فکری رجحان تقریباً ایک ہے - وہ ایک دوسرے سے اسلوب میں جدا سہی ، مقصد میں ہم آواز ہیں - نذیر احمد کی 'مرأۃ العروس' (۱۸۶۹ء) ، حالی کی 'مجالس النساء' کریم الدین کی 'تعلیم النساء' (۱۸۷۴ء) اور آزاد کی 'نصیحت کا کرن پھول' (۱۸۶۴ء) معاشرتی اصلاح کے نظریے ہی میں وحدت فکر کی حامل نہیں ، بلکہ ادب میں اس نظریاتی ہم آہنگی کا بھی پتہ دیتی ہیں ، جو غدر کے بعد ہندوستانی ادیبوں میں پیدا ہوئی تھی - یہ کتابیں مجھے بچیوں کی اخلاقی ، ذہنی اور معاشرتی تربیت کے اس نظام کو پیش کرتی ہیں ، جس پر مشرقی تہذیب کا مکمل اثر ہے اور ان مسائل کو بیان کرتی ہیں جو اس وقت کی زندگی کا موضوع تھے - تعویذ گنڈوں کے بے جا اعتقاد نے عورتوں کی عقلی ترقی

بر جو پہرے بٹھائے ہوئے ، ہندوستان کی قومی زندگی پر اس کا اثر برا پڑ رہا تھا اور یہ وہی عورتیں تھیں جو نئی تعلیم کو گمراہی خیال کرتی تھیں اور بیٹوں کا پیدا ہونا نحوست جانتی تھیں اور اپنی بے عقلی سے نئی زندگی کی اچھائیوں کو بھی برا سمجھتی تھیں ۔ نذیر احمد اور حالی نے ان کی اصلاح کی ۔ آزاد نے 'نصیحت کے کرن پھول' میں معاشرے کے ایسے ہی فاسد خیالات کو مٹانے کی کوشش کی ۔ حالی نے 'مجالس النساء' میں جن خطوط پر تربیت کی ہے ، آزاد نے 'کرن پھول' میں سعید کو اور نذیر احمد نے 'مرأۃ العروس' میں اصغری کو انہی خطوط پر ڈھالا ہے ۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے ان بزرگوں نے تعلیم کو تمدنی حالت کی اصلاح کے لیے استعمال کیا اور بالارادہ ایسی نثر لکھی جو بچوں کی تمدنی ضرورتیں پوری کرے ۔ نذیر احمد کہتے ہیں :

> ''میں اپنے بچوں کے لیے ایسی کتابیں چاہتا تھا کہ وہ ان کو چاؤ سے پڑھیں ، ڈھونڈا ، تلاش کیا ، کہیں پتہ نہ لگا ۔ ناچار میں نے ہر ایک کے مناسب حال کتابیں بنانی شروع کیں ، بڑی لڑکی کے لیے 'مراۃ العروس' ، چھوٹے کے لیے 'منتخب الحکایات' ، بشیر کے لیے 'چند پند' ''[۱] ۔

۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان میں نہ صرف سیاسی تبدیلیاں ظہور میں آئیں بلکہ قومی زندگی کے اکثر پہلو منقلب ہوئے ۔ خاص طور پر یہ زمانہ علم و ادب میں خوشگوار تبدیلیوں کا پیغام لایا ، جس کے ذریعے ابتدائی تعلیم کا ڈھانچہ بدلا گیا اور ان ضروریات کا خیال رکھا گیا جو جسمانی اور عقلی صحت مندی کے لیے مفید ہیں ۔ یہ بات ان کتابوں میں خاص طور پر ملتی ہے جو مختلف مضامین پر مشتمل ہیں اور ملک کے نامور مفکرین کے قلمی تعاون سے تیار کی گئی ہیں ۔ کتابوں کی یہ طرز عام طور پر ریڈروں کے نام سے مشہور ہے ۔ ریڈروں کا یہ کامیاب سلسلہ مولوی ذکاء اللہ ، اسمعیل میرٹھی ، آزاد اور مولوی کریم الدین نے شروع کیا ۔ بچوں کی ابتدائی کتابوں میں محکمہ تعلیم پنجاب کے تیار کردہ 'تعلیم المبتدی'[۲] کے سلسلے کو جو فوقیت حاصل ہے وہ آزاد کے علمی اور

---

(۱) قادری ، حامد حسن ، داستان تاریخ اردو ۔ ص ، ۴۷۲ ۔

(۲) 'تعلیم المبتدی' کے سلسلے کو آزاد کا سلسلہ کہنے کی واضح دلیلیں یہ ہیں کہ ان کتابوں کے مسودے مولانا آزاد کے ذاتی کتب خانے میں ان کے وارثوں کے پاس موجود ہیں ۔ وہ ساری نظمیں جو اس سلسلہ میں ہیں ، آزاد کی ہیں ۔ مولانا آزاد کا اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک مسودہ جو اردو کی دوسری کتاب کا ہے ، اس میں مصنف کہتا ہے ''ہم پہلے حصے میں کہہ آئے ہیں'' اور جو کچھ کہہ آئے ہیں وہ تعلیم المبتدی کے پہلے حصے میں لفظ بہ لفظ موجود ہے ۔ ایک اور جگہ مصنف کہتا ہے کہ ہم آئندہ جلد میں اس بات کا ذکر کریں گے ۔ وہ ذکر تعلیم المبتدی کی آئندہ جلد میں موجود ہے اور سب سے بڑھ کر ان کتابوں کا منفرد اسلوب بتاتا

فکری تقدم کا پتہ دیتی ہیں - ۱۸۸۶ء میں اس سلسلے کا آغاز ہوا جس میں آٹھ کتابیں ہیں - ان میں پہلی ، دوسری ، تیسری ، چوتھی اور پانچویں کتاب ابتدائی تعلیم کی نفسیات ، بچپن کے معصومانہ خیالات کے مطابق ، نہایت عمدہ اسلوب میں لکھی گئی ہیں - یہ صحیح ہے کہ ان کتابوں پر مولانا آزاد کا نام نہیں - بعض کتابوں کے ٹائٹل پر انگریزی میں یہ عبارت تحریر ہے :

''مگر یہ بات اب کسی سے پوشیدہ نہیں رہی کہ آزاد اور محکمۂ تعلیمِ پنجاب کے بعض افسرانِ بالا سے انیسویں صدی کے آخر میں شدید اختلاف پیدا ہو گئے تھے اور جن کا نتیجہ اس تشدد کی شکل میں ظاہر ہوا جس نے آزاد کے حواس مختل کر دے - اس کو دیکھتے ہوئے تعبید نہیں کہ آزاد کو یہ زک بھی پہنچائی گئی ہو کہ ان کا نام کتابوں سے خارج کر دیا ہو''۔

ان کتابوں کا تمثیلی انداز اور مصورانہ بیان اپنی جگہ منفرد سہی ، لفظوں اور جملوں کے جوڑ میں آوازوں کے حسن اور آہنگ کو جس خوبی سے سمویا گیا ہے وہ نثر میں شاعری کی سی کیفیت پیدا کرتا ہے اور ان خوبیوں کو ابھارتا ہے جو سماعت اور بصارت کو اچھی لگتی ہیں - ان کتابوں سے اس تجرباتی دور کا آغاز ہوتا ہے جس کے بعد کے مصنفین نے بچوں کی کتابیں لکھیں - مولوی ذکاء اللہ نے جو اعلیٰ پایہ کے انشاء پرداز ، معلم اور ماہرِ لسانیات تھے ، آزاد کے تدریسی اثر کو قبول کیا اور جو خوبیاں آزاد نے اپنے ہاں رکھی تھیں ذکاء اللہ نے ان کو قبول کیا - انہوں نے اودھ اور شمالی ہند کے محکمۂ تعلیم میں وہی کام کیا جو آزاد نے پنجاب میں کیا - ۱۸۸۸ء میں ان کی پہلی دوسری کتاب شائع ہوئی - اس کے علاوہ ڈائریکٹر محکمۂ تعلیم اودھ مسٹر ای ویٹ کی فرمائش پر انہوں نے اردو کی دوسری ، تیسری ، چوتھی اور پانچویں کتاب لکھی - چھٹی ، ساتویں اور آٹھویں جماعت کی ریڈروں میں انتخابِ مضامین کیا - سر سید ، نذیر احمد ، حالی ، نظیر اکبر آبادی ، ناسخ اور اسمعیل میرٹھی کے مضامین نثر و نظم شامل کیے اور مروج انگریزی ریڈروں سے ان مضامین کا ترجمہ کیا جو معاشرتی اور تمدنی معلومات بہم پہنچاتے تھے - سوائے پہلی کتاب کے کہ یہ صرف قاعدہ ہے ، باقی چاروں کتابیں ضروری اور دلچسپ مضامین کا مجموعہ ہیں اور اپنے اپنے معیار کے مطابق اتنی مکمل ہیں کہ اگر آج بھی انہیں شاملِ نصاب کر لیا

ہے کہ مصنف کون ہے ؟ ہندوستان میں اب تک صرف ایک ادیب پیدا ہوا ہے جو اس طرزِ خاص اور اسلوب جدید کا مالک ہو - یہ وہ اسلوب ہے جس سے آزاد کو انفرادیت ملی ، 'تعلیم المبتدی' کا سلسلہ کسی اور مصنف کی تحریر ہوتا تو چھپ جاتا ، لیکن آزاد کی تحریر چھپانے سے کہاں چھپتی ہے ؟ . . .

جائے تو مکمل طور پر نئی زندگی کی ضرورتوں سے ہم آہنگ ہوں ۔ چنانچہ مؤلف خود فرماتے ہیں :

"۔ ۔ ۔ ۔ باقی کتابوں کی تالیف میں ان باتوں کا خاص خیال رکھا گیا ہے کہ مضامین ایسے ہوں کہ جن میں طالبِ علموں کا دل لگے اور مدرسہ ان کو دل لگی کی جگہ معلوم ہو ۔ جن چیزوں کو وہ جانتے ہیں اور روز دیکھتے ہیں ان کا بیان کرنا اچھی طرح آ جائے ۔ اس مطلب کو پورا کرنے کے لیے میں نے انگریزی ریڈروں کے سلسلے میں سے بھی مضامین انتخاب کرکے اردو میں ترجمہ کیے"(۱) ۔

اس دور کے تین اہم مصنّفین ہیں جنھوں نے بچوں کے لیے نثر لکھی اور تعلیمی نظر سے عمدہ انتخاب کیے ۔ ان مصنّفوں میں مولانا محمد حسین آزاد ، مولوی ذکاء اللہ اور اسمٰعیل میرٹھی ہیں ۔ اردو زبان کی کتابوں کا سب سے مشہور سلسلہ کتب اسمٰعیل میرٹھی کا ہے ۔ ۱۸۹۳ء میں اس سلسلے کی چار کتابیں تصنیف ہوئیں ، ۱۸۹۴ء میں ٹیکسٹ بک کمیٹی نے ان کی منظوری دی ۔ ان تصنیفی کتب کے علاوہ دوسری منتخب ریڈریں 'کمکِ اردو' (۱۹۰۹ء) 'ادیبِ اردو' (۱۹۰۹ء) 'سفینۂ اردو' (۱۹۱۰ء) 'سوادِ اردو' (۱۹۱۴ء) اعلیٰ درجے کا ادبی انتخاب ہیں ، جو نئی عمر کے بچوں میں علم و ادب کا مذاق پیدا کرتی ہیں ۔ ان کتابوں کو مختلف عمر کے بچوں کی ذہنی کیفیتوں کے مطابق ترتیب دیا گیا ہے ۔ تدریج کے اس اصول ، زبان کی سلاست اور رنگ برنگ دلچسپ نظموں کے باعث ابتدائی نصاب اور بچوں کی عام تعلیم کے لیے انھیں بڑی وقعت اور شہرت حاصل ہے ۔ دراصل اسمٰعیل میرٹھی کی شہرت کا مدار انہی ریڈروں پر ہے ۔ اور ان ریڈروں کی مقبولیت میں نمایاں حصہ ان نظموں کا ہے جو خاص طور پر مولوی صاحب نے انہی ریڈروں کے لیے تصنیف کیں ۔ ان میں الفاظ کا اختصار ، مصورانہ بیان ، دلکش عنوان اور آہنگ کی بے پناہ خوبیاں ہیں ، شاید انہی خوبیوں کا یہ اثر ہے کہ ان کا ایک ایک شعر بچوں اور بڑوں کے نوکِ زبان ہے ۔ اور بچوں کا حافظہ شعر انہیں نہایت سرعت سے قبول کرتا ہے ۔

بچوں کے مزاج کی تربیت میں علم و ادب کا جو نمایاں حصہ ہے ، دنیا کے تمدن کی تاریخ اس کی صاف گواہی دیتی ہے ۔ اس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ ۱۸۵۷ء کے بعد بیسویں صدی کے ربع اول تک بہت احتیاط اور باقاعدگی کے ساتھ ہمارے ادیبوں نے علم و ادب ، زندگی کے نئے تقاضوں کے پیشِ نظر تخلیق کیا اور زبان سے قومی و ملکی تعمیر کے جو رشتے ہیں انھیں محسوس کیا اور ان مقاصد کے لیے جو ذریعہ مناسب ہاتھ آیا ، اس سے فائدہ اٹھایا ۔ حتیٰ کہ ان ضرورتوں کا خیال بھی رکھا جو ہندوستان کی سیاسی فضا نے پیدا کی

(۱) مولوی ذکاء اللہ ، اردو کی پانچویں کتاب ۔ ص ، ۲ ۔

تھیں ۔ ہندوستانی قوموں کا اتحاد اس وقت کا نہایت اہم مسئلہ تھا ۔ اگرچہ انگریز سیاسی طور پر اس امر کی تکمیل دل سے نہ چاہتے تھے ، مگر جہاں انتظامی اور ملکی ضرورتوں کے لیے اس کی ضرورت پیش آئی ، ہندوستانی ادیبوں سے کام لیتے ۔ چنانچہ اردو کو قومی اتحاد کے لیے بروئے کار لایا گیا ۔ اور محکمۂ تعلیم پنجاب نے خاص طور پر اپنی بعض کتابوں میں اس پہلو کو مدِ نظر رکھا ۔ اور سرکاری اداروں سے شائع ہونے والی ایسی کتابوں میں جن میں قومی موضوعات پر مضامین رقم ہوتے توازن اور تناسب سے کام لیا جاتا[1] ۔

درسی کتابوں ، قصے کہانیوں ، عام علمی و ادبی اور تفریحی مضامین کے ذریعے بچوں کا ادب آگے بڑھ رہا تھا ۔ مگر کوئی ایسا ذریعۂ عام نہ تھا جس سے بچوں میں خود بھی ادب تخلیق کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی اور انہیں اپنے خیالات کے اظہار کا موقع ملتا اور ان کے یہ خام خیالات و نا پختہ افکار بھی شائع ہوتے ، تاکہ ان میں لکھنے کی عادت بڑھتی اور انہیں حوصلہ ملتا ۔ بچوں کے ادب کی ترویج کا یہ ایک نہایت اہم مسئلہ تھا ۔ چنانچہ بیسویں صدی کے آغاز میں بچوں کا ادب صحافت سے آشنا ہوا ۔ کارخانۂ پیسہ اخبار ، خادم التعلیم پریس لاہور سے بچوں کا اخبار جاری ہوا ۔ پنجاب میں اردو صحافت کے ایک مقتدر بزرگ منشی محبوب عالم اس کے مدیر تھے ۔ اس اخبار میں بچوں کے لیے بڑوں سے مضامین لکھوائے جاتے ، مگر چند صفحات خود بچوں کی اپنی لکھی ہوئی تحریروں کے لیے مخصوص ہوتے ۔ اردو کا یہ پہلا اخبار تھا جس نے بچوں کو ادبی ترغیب دی ۔ بچوں میں علمی و ادبی شوق بیدار کرنے کے لیے اس ادارے نے بعض خاص عنوانات کا سلسلہ بھی شروع کیا ، جس میں بچوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ۔ حوصلہ افزائی کے خیال سے ان کی غیر معیاری تحریریں بھی شائع کیں ۔ اس طریقِ کار نے ننی عمر کے بچوں میں خود اعتمادی کا جذبہ پیدا کیا اور اشاعتِ مضمون کی خواہش میں مسابقت کا جو احساس پیدا ہوا اس نے انہیں زندگی کی کشمکش سے کافی حد تک آشنا کرنے کی سعی کی ۔ یہ اخبار پورے ہندوستان میں بچوں کا دلپسند اخبار تھا اور جب تک 'پھول' جاری نہ ہوا ، اس اخبار کی مقبولیت میں کمی نہیں آئی ۔

۱۹۰۹ء میں 'پھول' جاری ہوا ۔ یہ خالصۃً بچوں کا رسالہ تھا ۔ اس رسالے نے اپنے ظہور سے بیسویں صدی کے پہلے عشرے میں ایک انقلاب آفریں دعوتِ عمل دی ۔ یہ دعوتِ عمل ہندوستان کے اہلِ ثروت اور اہلِ قلم کو تھی کہ وہ چاہیں تو اپنے وسائل کو بروئے کار لا کر بچوں میں اعلیٰ درجے کا علمی و ادبی مذاق پیدا کر سکتے ہیں ، جس کے

---

(۱) محمد حسین آزاد اور پیارے لال آشوب کی مشترکہ تالیف رسوم ہند ، ۱۸۶۹ اس کی واضح مثال ہے ۔

ذریعے نئی پود کو زندگی بسر کرنے کے عمدہ طور طریق نہایت خوش اسلوبی سے سمجھائے جاسکتے ہیں ۔ یہ وہ رسالہ تھا جس نے تقریباً نصف صدی تک اپنے وقار ، اپنی شان اور اپنے معیار میں کوئی فرق نہیں آنے دیا ۔ اور ڈھونڈ ڈھونڈ کر ان نئے لکھنے والوں کی تربیت کی جن کے قلم میں جان اور تحریر میں زندگی کی ذرا سی بھی رمق نظر آئی ۔ ''کون نہیں جانتا کہ زمانہ حاضر کے بہت سے ادیب . . . جنھیں گذشتہ پچیس تیس سالوں میں شہرت ملی ، انہوں نے پھول سے لکھنا سیکھا ، 'پھول' سے لکھنا شروع کیا'' ۔ اس لیے عام طور پر کہا جاتا ہے کہ 'پھول' صرف ایک اخبار ہی نہیں ، ایک ادارہ بھی تھا جس نے کم و بیش پچاس برس تک ملک کے ادیبوں کو دعوتِ فکر دی اور نئے لکھنے والوں کی ذہنی تربیت کا فریضہ سر انجام دیا ۔

بچوں کے ادب کی ترویج کا یہ دور بعض سرم گرادیبوں اور مصلحانہ جذبات رکھنے والے مفکرین کا رہینِ منت ہے ۔ اور یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے بے حد تدبر اور تعقل کے ساتھ بچوں کی فکری تعلیم اور تربیت کا بیڑا اٹھایا ۔ بالخصوص بچوں کی ادبی نثر کے ذخیرے کو اتنا بڑھا دیا کہ اس سے مناسب اور حسبِ ضرورت فائدہ اٹھایا جا سکے ۔ اس ادب میں قصے کہانیوں نے بچوں کے تخیّل کی پرداخت کی اور اخلاقی تربیت کے مضامین والی کتابوں نے ان اہم معاشرتی اور دینی ضرورتوں کی تکمیل کی ، جن کا لازم نتیجہ بہترین سوسائٹی کی تکمیل کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے ۔ پرورشِ اطفال کے موضوع سے اردو تہی دامان تھی ، انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے شروع ہوتے ہی ایسے مضامین کی ضرورت کا احساس بہت بڑھ گیا ۔ انگریزی ان مضامین سے مالا مال تھی اس لیے پرورشِ اطفال کا موضوع ، انگریزی سے اردو میں منتقل ہوا ، 'مادرِ شفیق' ، 'بچوں کی پرورش' ، اور 'پرورشِ اطفال' جیسی اچھی کتابیں سامنے آئیں ۔ مھدی بیگم ، سلطان جہاں بیگم ، اور ممتاز بشیر بیگم وغیرہ نے ایک مشنری کی حیثیت سے اس طرح یہ کام سر انجام دیا کہ تربیتِ اطفال کے مضامین میں یہ خواتین مردوں سے بازی لے گئیں ۔

بچوں کے ادب کی تاریخ کا یہ دور ، اردو زبان و ادب کی عام ترقی کا دور بھی ہے ۔ اس میں ادب و انشاء پر ترقی کی نئی راہیں کھلیں ۔ ان راہوں پر چل کر اردو نے انگریزی سے بہت سے سبق سیکھے ، مگر اس تجدیدِ زبان اور ترقیٔ ادب کا مفہوم یہ نہیں کہ ہم نے اندھی تقلید کی اور اپنی اچھائیوں کو بھی برا سمجھ کے چھوڑ دیا ۔ ہاں یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ ہم مدت سے معاشرے اور ادب میں بعض چیزوں کو اچھا سمجھ کے اختیار کیے ہوئے تھے ، مگر استدلال اور عقل کی روشنی میں وہ غلط ثابت ہوئیں اور غلط ثابت نہیں ہوئیں تو کم از کم بے فائدہ ضرور ٹھہریں ، چنانچہ دع ماکدر کے مصداق انہیں چھوڑ دیا ۔ مثال کے

طور پر انیسویں صدی کے شروع تک ہمارے بزرگوں کے نزدیک بچوں کی تعلیم کا منشاء صرف مذہب اور معاشرت کی اقدار کو مضبوط کرنا اور شائستہ اخلاق کی پرورش تھا ۔ حالانکہ تعلیم کا مدعا صرف یہ نہیں ۔ تعلیم کا سب سے نمایاں کردار یہ ہونا چاہیے کہ وہ بچے کی عادات و اطوار میں تعمیر کا کام دے ، اس کے دل و دماغ کو نئے نظریات اور ترقی پسندانہ خیالات کو قبول کرنے کے قابل بنائے اور بچے کے مشاغل کو اس طرح ڈھالے کہ اس کی صلاحیتیں بلند مقاصد کی تحصیل کے لیے مستعد ہوں ۔ تعلیم کا مقصد صرف توسیعِ علم نہیں ۔ اگر تعلیم کا مقصد صرف علم بڑھانا ہوتا تو دنیا کی ترقی رک جاتی اور سوائے عقلِ انسانی کے کوئی اور شے صحت مند نہ ہوتی ۔ انسانی معاشرے میں صحیح طور پر زندہ رہنے کے لیے عقلی ترقی کی بس ایک حد تک ضرورت ہے اور باقی اعصاب جو عقل سے کسی طور بھی کم مایہ اور حقیر نہیں ، علم سے مستفید ہونے کے یکساں حقدار ہیں ۔ ہر بچہ اپنے خاندان سے ، اپنے ماں باپ سے ایک عصبی نظام لے کر آتا ہے اور اس عصبی نظام کا صحیح استعمال تعلیم کا ایک اہم مقصد ہے ، اس توارث کو نظر انداز کر کے بچے کی تعلیم و تربیت کی جائے ، جیسی کہ انیسویں صدی کے تقریباً وسط تک کی گئی ، تو سب سے بڑا خطرہ رجعی افعال (Reflexes) کے ٹکراؤ کا ہے جو موروثی رجحان اور جبلتوں کا خیال کیے بغیر تعلیم و تربیت سے پیدا ہوتا ہے ۔ لہذا اس دور میں بچوں کی کتابوں میں نیا مواد داخل ہوا ، زندگی اور دنیا سے دور کرنے کا جو متصوفانہ عمل تھا ، آہستہ آہستہ کم ہونے لگا ۔ انیسویں صدی کا وسط شروع ہوتے ہی بچوں کے ادب کا رجحان بدل گیا اور مضامین علمی و ادبی کے ذریعے مختلف علوم و فنون اور مشاغل کی طرف بچوں کی توجہ دلائی گئی ۔ مگر یہ سب کچھ مذہب اور عقیدے کو کمزور کر کے نہیں ہوا ، عقائدِ دینی اور افکارِ تمدنی کو ہمارے بزرگوں نے کسی جگہ گھٹنے نہیں دیا البتہ اتنا ضرور کیا کہ صرف مذہبی اور معاشرتی نقطۂ نظر سے تعلیم حاصل کرنے کا رجحان ختم کر دیا ۔ ابتدائی طور پر اس امر کی کوشش کی کہ علم و ادب کے ذریعے بچوں میں ،

جبلی صلاحیتیں ابھریں ،

استدلال کی قوت پیدا ہو ،

الفاظ کے استعمال کا ہنر آئے ، اور

گفتگو سمجھنے کی صلاحیت بڑھے ۔

اس سے بھی بڑھ کر ، اس دور کے بچکانے ادب کا تجزیہ کرنے کے بعد جو سب سے اہم بات معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اس ادب کے ذریعے زندگی سے شناسائی کا راستہ کھلا ، اور ساری توجہ اس امر پر مرکوز رہی کہ علم و ادب کے

ذریعے ہم میں یہ شعور پیدا ہوا کہ جن چیزوں کا اختیار کرنا ضروری اور مفید ہے، انہیں اختیار کریں اور جن کا چھوڑنا ضروری ہے، انہیں چھوڑیں - گویا تعلیم سے اس عالمگیر مقصد کی تکمیل کی گئی جسے افلاطون نے مفادِ انسانی کے لیے سب سے ضروری قرار دیا تھا :

> ''تحصیلِ علم کا مقصد یہ ہے کہ ہم ان چیزوں سے محبت کرنا سیکھیں جن سے ہمیں محبت کرنی چاہیے اور ان چیزوں سے نفرت کرنا سیکھیں جن سے ہمیں نفرت کرنی چاہیے''(۱) -

☆ ☆ ☆

مصنف	کتاب نامہ	طباعت	
رام پرشاد	ابتدائی تعلیم کی رام کہانی	شمسی پریس، آگرہ، ۱۹۰۸ء	
علاء الدین	ابتدائی تعلیمی نفسیات	قومی کتب خانہ لاہور، ۱۹۸۷ء	
پیارے لال	اردو کی تیسری کتاب	گورنمنٹ بک ڈپو، پنجاب، ۱۸۷۶ء	
آزاد، محمد حسین	اردو کی دوسری کتاب	ایضاً	سنہ نامعلوم
آزاد، محمد حسین	اردو کی تیسری کتاب	ایضاً	
آزاد، محمد حسین	اردو کی چوتھی کتاب	ایضاً	۱۸۸۶ء
مولوی ذکاء اللہ	اردو کی پہلی کتاب	محکمۂ تعلیم اودھ، ۱۸۸۸ء	
ذکاء اللہ	اردو کی دوسری کتاب	ایضاً	
ایضاً	اردو کی چوتھی کتاب	ایضاً	
ایضاً	اردو کی پانچویں کتاب	ایضاً	
پیارے لال	اردو کی تیسری کتاب	محکمۂ تعلیم پنجاب، ۱۸۷۶ء	

---

(۲) اخلاص حسین، (مترجم) 'اصول تدریس' - ص ۳۶۶ -

اردو زبان کی کتابوں کا سلسلہ

اسماعیل میرٹھی	پہلی کتاب	محکمۂ تعلیم اودھ، ۱۸۹۲ء
ایضاً	دوسری کتاب	ایضاً ۱۸۹۳ء
ایضاً	تیسری کتاب	ایضاً
ایضاً	چوتھی کتاب	ایضاً
ایضاً	ادیب اردو	ایضاً ۱۹۰۹ء
سیدہ اختر	اسماعیل میرٹھی	(مقالہ) ایم اے اردو پنجاب، ۱۹۵۴ء
اخلاص حسین	اصول تدریس	اکیڈیمی آف ایجوکیشنل ریسرچ، کراچی۔
نذیر احمد	بنات النعش	مکتبہ علم و ادب دہلی، ۱۹۳۷ء
ممتاز بشیر بیگم	بچوں سے دو دو باتیں	مطبع انسٹیٹوٹ علی گڑھ، ۱۹۱۷ء
مدیر، مولوی محبوب عالم	بچوں کا اخبار	خادم التعلیم اسٹیم پریس، لاہور ۱۹۰۲ء تا ۱۹۰۹ء (مختلف فائلیں)
الیاس مجیبی	بچوں کے ادب کے پچیس سال	ساقی، جوبلی نمبر کراچی، ۱۹۵۵ء
میکا	بچوں کی تعلیم	رفاہ عام پریس، لاہور ۱۹۰۲ء
ابرار صدیقی	بچوں کی ذہنی صلاحیتیں	اکادمی پنجاب، ۱۹۵۸ء
انتخاب، از غلام عباس	پھول	ترقیٔ اردو بورڈ، ۱۹۶۳ء
دارالاشاعت لاہور	پھول	مختلف فائلیں، ۱۹۰۹ء تا ۱۹۴۶ء
تعلیم المبتدی کا سلسلہ محکمۂ تعلیم پنجاب	پہلی کتاب	مطبع سرکاری لاہور، ۱۸۶۸ء
اسماعیل میرٹھی	توزک اردو	۱۸۹۴ء
حامد حسن قادری	داستانِ تاریخ اردو	لکشمی نرائن اگروال، آگرہ، ۱۹۵۷ء
مولوی کریم الدین	رسومِ ہند	پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی، ۱۸۶۹ء

ذریعے ہم میں یہ شعور پیدا ہوا کہ جن چیزوں کا اختیار کرنا ضروری اور مفید ہے ، انھیں اختیار کریں اور جن کا چھوڑنا ضروری ہے ، انھیں چھوڑیں - گویا تعلیم سے اس عالمگیر مقصد کی تکمیل کی گئی جسے افلاطون نے مفادِ انسانی کے لیے سب سے ضروری قرار دیا تھا :

''تحصیلِ علم کا مقصد یہ ہے کہ ہم ان چیزوں سے محبت کرنا سیکھیں جن سے ہمیں محبت کرنی چاہیے اور ان چیزوں سے نفرت کرنا سیکھیں جن سے ہمیں نفرت کرنی چاہیے''[۱] -

☆ ☆ ☆

مصنف	کتاب نامہ	طباعت	
رام پرشاد	ابتدائی تعلیم کی رام کہانی	شمسی پریس ، آگرہ ، ۱۹۰۸ء	
علاء الدین	ابتدائی تعلیمی نفسیات	قومی کتب خانہ لاہور ، ۱۹۵۷ء	
پیارے لال	اردو کی تیسری کتاب	گورنمنٹ بک ڈپو ، پنجاب ، ۱۸۷۶ء	
آزاد ، محمد حسین	اردو کی دوسری کتاب	ایضاً	سنہ نامعلوم
آزاد ، محمد حسین	اردو کی تیسری کتاب	ایضاً	
آزاد ، محمد حسین	اردو کی چوتھی کتاب	ایضاً	۱۸۸۶ء
مولوی ذکاء اللہ	اردو کی پہلی کتاب	محکمۂ تعلیم اودھ ، ۱۸۸۸ء	
ذکاء اللہ	اردو کی دوسری کتاب	ایضاً	
ایضاً	اردو کی چوتھی کتاب	ایضاً	
ایضاً	اردو کی پانچویں کتاب	ایضاً	
پیارے لال	اردو کی تیسری کتاب	محکمۂ تعلیم پنجاب ، ۱۸۷۶ء	

---

(۱) اخلاص حسین ، (مترجم) 'اصول تدریس' - ص ۳۶۶ -

اردو زبان کی کتابوں کا سلسلہ

اسماعیل میرٹھی	پہلی کتاب	محکمۂ تعلیم اودھ ، ۱۸۹۲ء
ایضاً	دوسری کتاب	ایضاً ۱۸۹۳ء
ایضاً	تیسری کتاب	ایضاً
ایضاً	چوتھی کتاب	ایضاً
ایضاً	ادیب اردو	ایضاً ۱۹۰۹ء
سیدہ اختر	اسماعیل میرٹھی	(مقالہ) ایم اے اردو پنجاب ، ۱۹۵۴ء
اخلاص حسین	اصول تدریس	اکیڈیمی آف ایجوکیشنل ریسرچ ، کراچی -
نذیر احمد	بنات النعش	مکتبہ علم و ادب دہلی ، ۱۹۳۷ء
ممتاز بشیر بیگم	بچیوں سے دو دو باتیں	مطبع انسٹیٹوٹ علی گڑھ ، ۱۹۱۷ء
مدیر، مولوی محبوب عالم	بچوں کا اخبار	خادم التعلیم اسٹیم پریس ، لاہور ۱۹۰۲ء تا ۱۹۰۹ء (مختلف فائلس)
الیاس مجیبی	بچوں کے ادب کے پچیس سال ساق ، جوبلی نمبر کراچی ، ۱۹۵۵ء	
میکا	بچوں کی تعلیم	رفاہ عام پریس ، لاہور ۱۹۰۲ء
ابرار صدیقی	بچوں کی ذہنی صلاحیتیں	اکادمی پنجاب ، ۱۹۵۸ء
انتخاب ، از غلام عباس	پھول	ترقیٔ اردو بورڈ ، ۱۹۶۳ء
دارالاشاعت لاہور	پھول	مختلف فائلیں ، ۱۹۰۹ء تا ۱۹۴۶ء
تعلیم المبتدی کا سلسلہ محکمۂ تعلیم پنجاب	پہلی کتاب	مطبع سرکاری لاہور ، ۱۸۶۸ء
اسماعیل میرٹھی	توزک اردو	۱۸۹۴ء
حامد حسن قادری	داستان تاریخ اردو	لکشمی نرائن اگروال ، آگرہ ، ۱۹۵۷ء
مولوی کریم الدین	رسوم ہند	پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی ، ۱۸۶۹ء

اسماعیل میرٹھی	سوادِ اردو	۱۹۱۴ء
ایضاً	سفینۂ اردو	۱۹۰۹ء
عبدالسلام خورشید	صحافت ہند و پاکستان میں	ترقیٔ ادب ، لاہور ۱۹۶۲ء
فہرستِ کتب	پنجاب پبلک لائبریری	لاہور ۱۹۳۷ء تا ۱۹۴۶ء
مولوی کریم الدین	قواعد المبتدی	مطبع کوہ نور لاہور ، ۱۹۵۷ء
ایضاً	قصۂ پنجاب سنگھ	مطبع سرکاری لاہور ، ۱۸۷۴ء
اسماعیل میرٹھی	کمکِ اردو	۱۸۹۴ء
ایم ڈی برکت اللہ	لڑکیوں کی پہلی کتاب	سلسلۂ تعلیمِ نسواں ، لاہور ۱۹۰۳ء
نذیر احمد	مرأة العروس	برکت علی ، لاہور ، سنہ نامعلوم
حالی	مجالس النساء	حالی پریس پانی پت ، ۱۹۲۴ء
آزاد	نصیحت کا کرن بھول	۱۸۶۴ء لاہور ، ۱۹۱۷ اشاعت
مولوی کریم الدین	واقعاتِ ہند	نولکشور ، لکھنؤ ۱۸۷۶ء

چودھواں باب

دوسرے ناول نگار

اردو ناول کا آغاز نذیر احمد اور سرشار کا مرہونِ منت ہے مگر اس کی مقبولیت میں شرر کی وجہ سے کئی گنا اضافہ ہوا۔ ان تینوں ناول نگاروں کے اثرات اردو ناول پر بہت گہرے اور دور رس ہوئے ہیں، بلکہ نصف صدی یا اس سے کچھ زیادہ مدت تک ناول ابھی اثرات کی صدائے باز گشت رہا ہے۔ سرشار و نذیر احمد۔۔۔ اور ذرا بعد میں شرر کے معاصرین نے بہت کم نئی روایات کی داغ بیل ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ سرشار کے زیرِ اثر جو ناول وجود میں آیا اس نے اپنے آپ کو مزاحیہ کردار نگاری اور مکالمے تک محدود کر لیا۔ اس کے اہم ترین نمائندے منشی سجاد حسین ہیں۔ نذیر احمد کے متعبین نے اصلاحِ معاشرت کا راستہ منتخب کیا۔ اس گروہ کی نمائندگی کرنے والوں میں مرزا محمد سعید اور پنڈت کشن برشاد کول سرِ فہرست ہیں۔ شرر سے متاثر ہو کر لکھنے والوں میں محمد علی طبیب کا نام نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ صرف مرزا محمد ہادی رسوا ایک ایسے ناول نگار ہیں جنھوں نے الگ راستہ نکالا اور ان کے ساتھ ہی ان کا تتبع کرنے والے بھی پیدا ہو گئے، غرض زیرِ نظر دور میں اہم ترین ناول نگار تو مرزا رسوا ہی ہیں، باقی حضرات کی بدولت ناول کی صنف مقبول ہوئی اور اس کی تعداد میں بہت اضافہ ہوا مگر اس نے ترقی کی بہت کم منزلیں طے کیں۔ ان ناول نگاروں میں سب سے پہلے مرزا ہادی رسوا کا ذکر کیا جاتا ہے۔

مرزا محمد ہادی رسوا

ان کا نام محمد ہادی تھا۔ پہلے مرزا تخلص کرتے تھے بعد میں صرف ناول نگاری کے لیے مرزا رسوا کا فرضی نام اختیار کیا، جس کا سبب یہ تھا کہ وہ ناول نگاری کو اپنے کمالات میں ادنٰی حیثیت دیتے تھے اگرچہ بالآخر یہی فن ان کی حیاتِ جاوید کا سبب بنا۔

مرزا رسوا فروری ۱۸۵۸ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ بزرگ ماژندران سے عہدِ مغلیہ میں ہندوستان آئے۔ پردادا نے نواب آصف الدولہ کے عہد میں اودھ میں سکونت اختیار کی۔ مرزا نے اس زمانے کے دستور کے مطابق فارسی، عربی، صرف و نحو وغیرہ میں تعلیم حاصل کی۔ ان کے معلّمِ اوّل ان کے والد تھے، جن سے انہوں نے ریاضی بھی پڑھی۔ سولہ برس کی عمر میں والد کا انتقال ہو گیا۔ خاندانی جائداد پر گذر اوقات کرنے

لگے ۔ تعلیم حاصل کرنے کا شوق تھا ۔ ۱۸۷۶ء میں رڑکی کالج سے سب اوورسیری کا امتحان پاس کیا اور ملازمت شروع کی مگر طبعیت میں تلون تھا ، جلد ہی استعفیٰ دے دیا پھر کیمیا گری کا شوق ہوا ۔ خاصہ روپیہ اس کی نذر کیا ۔ آخر اوورسیری کو بالکل ترک کر کے چرچ مشن سکول لکھنؤ میں مدرس ہوگئے ۔ یہیں پرائیویٹ طور پر مختلف امتحانات پاس کیے ۔ ۱۸۸۸ء میں ریڈ کرسچین کالج میں عربی اور فارسی کے مدرس مقرر ہوئے ۔ ۱۸۹۴ء میں فارسی اور فلسفہ کے مضامین کے ساتھ بی ۔ اے پاس کیا ۔ ۱۹۰۱ء میں حیدر آباد دکن میں ملازمت اختیار کی مگر خرابیٔ صحت کی بنا پر دو سال کے بعد واپس آ کر پھر مدرسی اختیار کرلی ۔ اب کے لکھنؤ میں عرصے تک علمی و ادبی کاموں میں منہمک رہے ۔ ۱۹۱۹ء میں دوبارہ حیدر آباد میں ملازم ہوئے ۔ اس بار وہ دارالترجمہ میں رکن شعبۂ فلسفہ مقرر ہوئے اور متعدد کتابیں اردو میں ترجمہ کیں ۔ قدیم و جدید فلسفے کے تقابلی مطالعے پر ایک مبسوط تصنیف پر انہیں امریکہ کی کسی یونیورسٹی سے پی ۔ ایچ ۔ ڈی کی ڈگری ملی ۔ ۲۱ اکتوبر ۱۹۳۱ء میں حیدر آباد ہی میں انتقال کیا ۔

مرزا رسوا ہرفن مولا تھے ۔ فلسفہ ، طب ، منطق ، ریاضی ، ہیئت ، شاعری ، مذہبیات ، کیمیا گری ، موسیقی اور نجوم میں انہیں دسترس حاصل تھی ۔ عربی اور فارسی کے عالم تھے ۔ اردو شارٹ ہینڈ اور ٹائپ کا کی بورڈ انہی کا بنایا ہوا ہے ۔ ناول نگاری انہوں نے زندگی کے ایک مختصر سے وقفے میں کی ۔ ان کے تمام ناول (سوائے اختری بیگم کے) چار برس کی مدت میں لکھے گئے ۔ ناول نگاری سے ان کا مقصد صرف اپنی مالی مشکلات دورکرنا تھا ۔ انہوں نے سنجیدگی سے اس طرف توجہ نہیں کی ۔ ظہیر فتح پوری لکھتے ہیں :

> ''انہوں نے اپنے ناولوں کو اپنے مرتبے سے کمتر سمجھا اور محمد ہادی ناول نگاری کی دنیا میں مرزا رسوا کا نقاب پہن کر آئے ۔ علمی تصانیف کے بر خلاف ناول انہوں نے عام طور پر اس وقت لکھے جب انہیں روپوں کی ضرورت ہوئی . . . . چنانچہ انہوں نے اپنے ناولوں پر کبھی نظرِ ثانی نہ کی ۔ اکثر تو یہ ہوا کہ خود بولتے جاتے ہیں اور کوئی دوست یا شاگرد لکھتا جاتا ہے اور کاتب کو دیتا جاتا ہے ۔'' (۱)

مرزا رسوا نے مندرجہ ذیل ناول لکھے :

۱ ۔ افشائے راز حصہ اوّل (۱۸۹۶ء)
۲ ۔ امراؤ جان ادا (۱۸۹۹ء)

---

(۱) ظہیر فتح پوری (مرتب) امراؤ جان ادا ، ص ح ، ط ، مطبوعہ مجلس ترقی ادب ، لاہور ، طبع اول ستمبر ۱۹۶۳ء ۔

۳ ۔ ذاتِ شریف (جنوری ۱۹۰۰ء)

۴ ۔ شریف زادہ (دسمبر ۱۹۰۰ء)

۵ ۔ اختری بیگم (۱۹۲۴ء)

ان طبع زاد ناولوں کے علاوہ انہوں نے انگریزی سے بعض ناول اخذ یا ترجمہ کر کے بھی شائع کیے(۱) ۔ ان میں سے 'خونی شہزادہ' ، 'بہرام کی رہائی' ، 'طلسمات' ، 'خونی جورو' ، 'خونی بھید' اور 'خونی عاشق' کے نام ہمیں معلوم ہوسکے ہیں یہ ناول تمام تر جرائم و اسرار کی دنیا سے تعلق رکھتے ہیں ۔ علاوہ ازیں وہ تراجم کی ذیل میں آتے ہیں اس لیے ان کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ۔ البتہ مرزا رسوا کے طبعزاد ناولوں کو تفصیل سے جانچنا ضروری ہے ۔

مرزا رسوا نے ناول کی صنف اور اپنے سے قبل کے اردو ناول کے بارے میں بعض مقامات پر اظہارِ خیال بھی کیا ہے جو ان کے ناولوں کے سمجھنے کے لیے سود مند ہے ، اس لیے ان میں سے چند اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں ۔ 'انشائے راز' کے دیباچے میں لکھتے ہیں :

"نیاز مند کو نہ اس زمانے کا طرزِ تحریر پسند ہے اور نہ اس کے لکھنے کی لیاقت ، اور آپ بیتی لکھیے تو اس طرح لکھیے جس طرح ہم آپ باتیں کرتے ہیں ، نہ کہ اس عبارت میں جو کسی انگریزی کتاب کا لفظی ترجمہ ہو" ۔

اس کے بعد ایک اور جگہ ان الفاظ میں یوں اظہارِ خیال کرتے ہیں :!

"بے چارے غریب ، کم مایہ ، جاہل ، بدتمیز ، بد صورت بھی تو آخر خدا کے بندے ہیں ۔ کبھی تو ان کے حالات ، ان کے خیالات ان کی خواہشوں کی طرف التفات کرنا چاہیے ۔"

'ذاتِ شریف' کے دیباچے میں اس رائے کا اظہار کرتے ہیں :

"ہمارے ناول نہ ٹریجڈی ہیں نہ کامیڈی ، نہ ہمارے ہیرو تلوار سے قتل ہوئے نہ انجن سے کسی نے خود کشی کی ۔ نہ ہجر ہوا نہ وصل ، ہمارے ناولوں کو موجودہ زمانے کی تاریخ سمجھنا چاہیے ۔"

---

(۱) ایک ناول 'خورشید بہو' بھی ان سے منسوب ہے مگر یہ ان کی تصنیف نہیں ہے بلکہ ان کے نام سے فائدہ اٹھانے کی کوشش ہے (تفصیل کے لیے دیکھیے 'مرزا محمد ہادی رسوا از میمونہ بیگم انصاری ، ص ۴۵) مطبوعہ ، مجلس ترقی ادب ، طبع اول جون ۱۹۶۳ء

'امراؤ جان ادا' میں منشی احمد حسین کے پردے میں اپنا مافی الضمیر یوں ظاہر کیا ہے :

''لکھنؤ میں چند روز رہنے کے بعد جب اہلِ زبان کی اصلی بول چال کی خوبی کھلی ، اکثر ناول نویسوں کے بے تکے قصے ، مصنوعی زبان اور تعصب آمیز ، بے ہودہ ، جوش دلانے والی تقریریں آپ کے دل سے اتر گئیں'' ۔

ان اقتباسات سے ان کے ناول نگاری کے بارے میں مندرجہ ذیل نتائج نکلتے ہیں :

۱ - ناول اپنے زمانے کی تاریخ ہوتا ہے ۔

۲ - واقعیت کا بیان اور کردار نگاری ضروری ہے ۔

۳ - ناول ایک فن پارہ ہوتا ہے اس لیے اسے فنی مطالبات پر پورا اترنا چاہیے ۔

۴ - ناول کی زبان فطری اور کردار کے مزاج سے میل کھاتی ہوئی ہونی چاہیے ۔

ظاہر ہے کہ جو شخص ناول نگاری کے میدان میں ان نظریات کے ساتھ داخل ہو رہا ہے اور اس وقت تک کے ناولوں کی روایت پر تعریضی جملے لکھتا ہے ، اس سے ہم یہ توقع وابستہ کر سکتے ہیں کہ وہ ضرور ادب میں کسی اہم ناول کا اضافہ کرے گا ۔ ان نظریات کے بعد جب ہم ان کے ناولوں کا جائزہ لیتے ہیں تو ایک حد تک مایوسی ہوتی ہے مگر جب ناول نگاری کی صنف سے ان کی عدم توجہی کی طرف دھیان جاتا ہے تو ہم ان کے ان ناولوں کو غنیمت سمجھنے لگتے ہیں ۔ پھر بھی یہ سچ ہے کہ ان کے ناول اپنے عہد کی تاریخ ہیں ۔

مرزا رسوا کا پہلا ناول 'افشائے راز' نا مکمل رہ گیا ۔ یہ تین حصوں میں مکمل ہوتا لیکن رسوا اس کا صرف پہلا حصہ لکھ پائے ۔ اس حصے میں بھی دو چیزیں قابلِ ذکر ہیں ۔ ایک یہ کہ اس کے ہیرو محمد ذکی اس کے قبل کے اردو ناولوں کے ہیروؤں سے مختلف ہیں ۔ اس سے پہلے نذیر احمد ، شرر اور سرشار میں ہیرو عام آدمیوں سے بلند تر ہوتا تھا مگر اس قصے کا ہیرو عام لوگوں سے مختلف نہیں ہے ۔ دوسرے لکھنؤ شہر ، اس کے باشندے اور انکا سماجی پس منظر اس میں موجود ہے ۔

رسوا کا دوسرا ناول 'امراؤ جان ادا' نہ صرف مرزا رسوا کا بہترین ناول ہے بلکہ اس جیسے فنی خصائص کے حامل ناول پورے اردو ادب میں بہت کم نکلیں گے ۔ اس ناول

کے بارے میں بعض نقاد مصر ہیں کہ 'امراؤ جان ادا' حقیقت میں ایک طوائف تھی اور یہ سب واقعات اس پر گذرے تھے[1] مگر فن کی دنیا میں یہ بات اہمیت نہیں رکھتی کہ کونسا واقعہ حقیقت میں گذرا اور کونسا نہیں گذرا۔ اہم بات یہ ہے کہ ناول نگار نے جو کچھ ہمارے سامنے پیش کیا ہے وہ قابلِ یقین ہے یا نہیں۔ اس بات کے مدِّ نظر مرزا رسوا کی فن کاری کا قائل ہونا پڑتا ہے کہ انہوں نے قارئین کو واقعات کی صداقت کا اس قدر یقین دلا دیا ہے کہ وہ امراؤ جان کو کسی طرح فرضی کردار تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ بعض نقادوں کا خیال ہے کہ 'امراؤ جان ادا' محض ایک طوائف کی آپ بیتی ہے۔ اول اول یہ رائے علی عباس حسینی نے دی:

''یہ ایک رنڈی کی کہانی اسی کی زبانی ہے''[1]۔

اس رائے کی تفصیل سہیل بخاری نے مہیا کی ہے۔ وہ اس ناول میں سے رنڈیوں کی تعلیم، تربیت، رہن سہن، آدابِ معاشرت وغیرہ کے واقعات چن چن کر تحریر کرتے ہیں اور اپنی دانست میں ثابت کر دیتے ہیں کہ:

> ''امراؤ جان ادا ایک طوائف کی آپ بیتی کے رنگ میں چکلے کی انسائیکلوپیڈیا ہے اور رنڈی اور رنڈی پنے کے متعلق جملہ معلومات فراہم کرتی ہے''[2]۔ ''مرزا رسوا نے اپنے ناول سے لکھنؤ کی صرف رنڈی بازی پر روشنی ڈالی ہے لکھنوی زندگی کے دوسرے پہلوؤں سے سروکار نہیں رکھا''[3]۔

مگر یہ آراء نہ صرف مرزا رسوا کے نظریۂ ناول نگاری سے متصادم معلوم ہوتی ہیں بلکہ ان میں ناول کے بہت سے ایسے واقعات سے جو نگار خانے کے باہر ہوئے ہیں، عمداً پہلو تہی کی کوشش کی گئی ہے۔ ناول کے آغاز میں رسوا ہمیں اودھ کی ایک غریب بستی کی معاشرت سے متعارف کراتے ہیں، پھر نگار خانے کے حوالے سے نوابوں کا تمدن سامنے لایا گیا ہے۔ پھر امراؤ جان کے نگار خانے سے فرار کے بعد اس زمانے کے غیر محفوظ راستوں، چوروں ڈاکوؤں کی کارروائیوں، سیاسی بے تدبیریوں اور فوجوں کی بزدلیوں کی طرف واضح اشارے کیے گئے ہیں۔ ناول کے آخری حصے میں اکبر علی خان کے حوالے سے متوسط

---

(۱) امراؤ جان ادا، مطبوعہ نیا ادارہ لاہور، اختتامیہ تمکین کاظمی
(۲) علی عباس حسینی، ناول کی تاریخ اور تنقید۔ ص ۳۶۷ مطبوعہ لاہور اکیڈمی، لاہور ستمبر ۱۹۶۳ء۔
(۳) سہیل بخاری، ناول نگاری۔ ص ۱۵۳، مطبوعہ مکتبہ میری لائبریری لاہور۔
(۴) " " " " ۔ ص ۱۵۴۔

طبقے کے گھروں کے نقشے بیان کیے گئے ہیں جو اب تک ناول نگار کے قابو میں نہیں آ سکے تھے ۔ غرض اس عہد کے اودھ کے ادنیٰ ، متوسط اور اعلیٰ سبھی طبقوں کے اس زمانے کے طرزِ معاشرت کو اس ناول کا موضوع بنایا گیا ہے ۔ ان میں سے بہت سے واقعات ایسے ہیں جن کا رنڈیوں اور نگار خانوں سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے اور اگر محض نگار خانوں کی تصویر کشی مطلوب ہوتی تو ان واقعات کو بآسانی قلمزد کیا جا سکتا تھا ۔ یہ تفصیلات اس بات کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ 'امراؤ جان ادا' کو 'انتزاعِ سلطنتِ اودھ' کے اردگرد کے چند برسوں میں وہاں کے معاشرتی زوال کو پیش کرنے کی علامت بنایا گیا ہے ۔

'امراؤ جان ادا' پہلا اردو ناول ہے جس میں ایک کردار کی زبان سے واقعات کے بیان کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے ۔ اس سے پہلے نذیر احمد ، سرشار اور سرر کے ناولوں کے پلاٹ بیانیہ تکنیک کے مطابق بنائے گئے تھے ۔ ان میں بھی ناول نگار اکثر بیان کنندہ کا پردہ ہٹا کر خود واقعات پر تبصرہ شروع کر دیتا ہے ۔ رسوا نے اس ناول میں اپنے کردار کو ناول کا جزو بنا دیا ہے وہ اس طرح کہ امراؤ جان ادا تمام واقعات رسوا کو سناتی ہے اور رسوا قدرتاً اس پر تنقید ، تبصرہ ، وغیرہ کرتا جاتا ہے ۔ ظاہر ہے کہ یہ طریقہ پہلے طریقے سے بہتر ہے ۔ رسوا سے پہلے کے تمام اردو ناولوں (ماسوا فسانۂ مبتلا کے) کے پلاٹ سادہ اور خطِ مستقیم بناتے ہیں ۔ یعنی اُن کے واقعات جس نقطے سے شروع ہوتے ہیں ، اسی پر برابر بڑھتے رہتے ہیں اور بالآخر ختم ہو جاتے ہیں ۔ مگر 'امراؤ جان ادا' کا پلاٹ دائرہ مکمل کرتا ہے ۔ واقعات کا آغاز پیر بخش کے امراؤ کو اغوا کرنے سے ہوتا ہے اور پیر بخش کے آخر میں پھانسی پانے پر خاتمہ ۔ اگرچہ اختتام میں شاعرانہ انصاف (Poetic Justice) کی جھلک نظر آتی ہے ،مگر یہ رسوا کی مجبوری ہے ۔ وہ اتنے حقیقت پسند نہیں تھے کہ پیر بخش کو چھوڑ جاتے ، جس طرح عموماً زندگی میں ہوتا ہے ۔ ان آغاز و انجام کے واقعات کے درمیان امراؤ جان کی تعلیم و تربیت ایک طرف اور دوسری طرف اس کی زندگی بھر کا تجربہ بیان کیا گیا ہے ۔ پھر آغاز کی طرف امراؤ کا نوچی بننا اور اختتام کے قریب نوچی بٹھانا اور ان واقعات کے درمیان امراؤ جان ادا کے شہر بہ شہر پھرنے کے واقعات تحریر کیے گئے ہیں ۔ تمام واقعات میں ایک ایسا توازن اور تناسب ہے جو اردو ناول میں کہیں اور نظر نہیں آتا ۔ مرزا رسوا اس ناول کی حد تک جزئیات نگاری اور مناظر کی ناول میں اہمیت سے پوری طرح آگاہ معلوم ہوتے ہیں ۔ وہ نہ تو تفصیلات کا غیر ضروری طور پر انبار لگاتے ہیں جیسا کہ 'فسانۂ آزاد' میں نظر آتا ہے اور نہ بہت اختصار سے کام لیتے ہیں کہ تشنگی محسوس ہو ، جیسا کہ قاری سرفراز حسین عزمی کے 'شاہدِ رعنا' میں ہے ۔ وہ بہت مناسب لفظوں میں ، واقعات کی

اہمیت کے مطابق تفصیلات فراہم کر دیتے ہیں ۔ ان کی منظر نگاری اگرچہ دوسرے تمام ناول نگاروں کی طرح پس منظر کا کام دیتی ہے ۔ تاہم ان کے مناظر میں وہ فنکاری نہیں جو بعد کے ناول نگار مثلاً 'قرۃ العین حیدر' (آگ کا دریا) اور عبداللہ حسین (اداس نسلیں) میں نظر آتی ہے ۔

'امراؤ جان ادا' کے کردار بیشتر حقیقت پسندانہ ، دلکش اور زندہ ہیں[1] ۔ وہ چند لفظوں میں کردار کا ظاہر بیان کرتے ہیں اور تھوڑی دیر میں کردار اپنا باطن خود ہی ظاہر کر دیتا ہے ۔ 'امراؤ جان ادا' میں بعض کردار ارتقائی ہیں اور بعض شروع ہی میں مکمل ہو کر سامنے آتے ہیں ۔ بنیادی کرداروں میں ارتقا پایا جاتا ہے ۔ یہ اردو ناولوں کی روایات سے قدرے ہٹی ہوئی ہے ۔ اس میں مثالیت پسندی کی جھلکیاں کمتر نظر آتی ہیں ، بقول خود وہ زیادہ خوبصورت نہیں ۔ خانم بھی خریدتے وقت صورت پر اظہار پسندیدگی نہیں کرتی ۔ اس میں اور بھی کوئی زیادہ مثالی خوبیاں تحریر نہیں کی گئیں ۔ اس کے کردار پر جو کیفیت شروع سے آخر تک چھائی رہتی ہے ، یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو پوری طرح طوائف نہیں بنا سکتی ۔ رنڈی پنا اسے بہت کم آتا ہے ۔ دوسری طوائفیں فرمائشوں سے آشناؤں کا ناک میں دم کر دیتی ہیں مگر امراؤ سے یہ نہیں ہو سکتا ۔ وہ طبعاً ایک کی ہو کر رہنا چاہتی ہے مگر اس کا المیہ یہ ہے کہ وہ ایسے ماحول میں ہے جہاں ہر آشنا سے ہنس بول کر ملنا پڑتا ہے وہ یقیناً اس قابل

---

(۱) یہ مناسب ہوگا کہ اگر یہاں پر 'امراؤ جان ادا' کو اس سے پہلے اور بعد کے لکھے جانے والے ناولوں کے ساتھ رکھ کر دیکھا جائے ۔ 'امراؤ جان ادا' کا مقابلہ ، 'توبۃ النصوح' ، 'فسانۂ آزاد' یا 'طرحدار لونڈی' سے کرنے پر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ 'فسانۂ آزاد' کا ماحول 'امراؤ جان ادا' سے اور ان دونوں کا 'توبۃ النصوح' کے معاشرتی پس منظر سے بہت مختلف ہے ۔ اس اختلاف کے باوجود فنی لحاظ سے ان سب میں کوئی نہ کوئی یگانگت کا عنصر موجود ہے ۔ مگر جیسا کہ ظاہر ہے 'بیگمات لکھنؤ مضافات لکھنؤ کی عورتیں ، کلیم کی والدہ اور اس کی بہن نعیمہ سے بہت مختلف ہیں ۔ ان کے مشاغل مختلف ہیں ، ان کی اٹھان مختلف ، زندگی میں دونوں کے مقاصد مختلف اور مردوں سے میل جول کے انداز مختلف ، مگر کیونکہ سپہر آرا اور نعیمہ میں طبقہ کے تفاوت کے باوجود 'جان' ہے ، یعنی وہ گوشت پوست کی بنی ہوئی معلوم ہوتی ہے ، بھڑکتی ہیں اور بدکتی بھی ہیں ، ایک ہی دھرے پر نہیں چلتیں یا کسی نئے بنائے ہوئے اصول کے ماتحت زندگی نہیں گزار دیتیں اس لیے ان میں خود اختیاریت کام کرتی ہے اور وہ خود بیں نہیں تو خود رائے ضرور ہیں ۔ اس بات میں وہ 'امراؤ جان ادا' سے بہت ملتی ہیں ۔ یہاں تک کہ اگرچہ 'امراؤ جان ادا' ایک اور دنیا کا باشندہ معلوم ہوتی ، مگر اپنی جگہ وہ بھی ایک جیتی جاگتی تصویر ہے اور آپ یہ محسوس کرتے ہیں کہ اگر آپ اس سے ملیں تو اس کے لیے کچھ سلیقہ کچھ محفلی آداب اور رکھ رکھاؤ ضروری ہوگا ۔ یعنی اس کی شخصیت کا پرتو آپ پر ضرور پڑے گا اور اس سے ملنے کے لیے 'ہوسناکی' کے علاوہ آپ کو تہذیبی انداز اختیار کرنا ہوگا ۔ یہی ایک زندہ کردار کی علامت ہے . . . نذیر عمومی

تھی کہ کسی کے گھر میں مستقلاً پڑ رہتی - اس کی کوشش بھی اس نے متعدد بار کی مگر یہ اس کی قسمت نہ تھی - طبعاً نیک مگر بد قسمتی سے طوائفیت پر مجبور ۰۰۰ یہ امراؤ جان ادا کے کردار کی بنیادی صفت ہے اور اسی وجہ سے پڑھنے والے کو اس سے ہمدردی سی ہو جاتی ہے۔

ضمنی کرداروں میں بعض تو ایسے ہیں جو صرف ایک آدھ لمحے کے لیے ہمارے سامنے آتے ہیں اور بعض ذرا لمبی مدت تک قصے میں موجود رہتے ہیں - مگر رسوا کو اس بات میں کمال حاصل ہے کہ جس کردار کا انہوں نے ذرا بھی ذکر کر دیا ہے اس کی انفرادیت ظاہر ہو گئی ہے طوائفوں کے کرداروں کو دیکھیے کیا مجال کہ ایک کردار دوسرے میں مدغم ہوتا ہوا معلوم ہو - اگرچہ اس وجہ سے بعض کردار نادرے مثالی ہو گئے ہیں مثلاً :

"خانم کی نوچیوں میں بگا جان گانے میں فرد تھیں مگر صورت وہ کہ رات کو دیکھو تو ڈر جاؤ سیاہ جیسے الٹا توا ، اس پر چیچک کے داغ ، پاؤ بھر قیمہ بھر دو تو سما جائے - لال لال آنکھیں ، بھدی ناک بیچ میں سے پچکی ہوئی - موٹے موٹے ہونٹ ، بڑے بڑے دانت ، فربہ انتہا سے زیادہ ، اس پر ٹھگنا قد - بونی بھونی کی لوگ پھبتی کستے تھے مگر قیامت کا گلا تھا"(۱) -

یہ خورشید جان ہیں :

"پری کی صورت تھی ، رنگ میدا شہاب ، ناک نقشہ گویا صانع قدرت نے اپنے ہاتھ سے بنایا تھا - آنکھوں میں یہ معلوم ہوتا تھا کہ موتی کوٹ کے بھر دیے ہیں - ہاتھ پاؤں سڈول ، نور کے سانچے میں ڈھلے ہوئے - بھرے ہوئے بازو ، گول کلائیاں ، جامہ زیبی وہ قیامت کی کہ جو پہنا معلوم ہوا یہ اسی کے لیے مناسب تھا"(۲) -

اگرچہ دونوں کرداروں میں خاصی مثالیت پسندی موجود ہے تاہم دونوں صاف الگ الگ ہیں - اب میلے میں آئے ہوئے ہزاروں افراد میں سے چند چہرے ملاحظہ کیجیے -

"ایک صاحب ہیں کہ وہ اپنے تن زیب کے انگرکھے اور اودی صدری ، نکہ دار ٹوپی ، چست گھٹنے اور مخملی چڑھویں جوتے پر اتراتے ہوئے

(۱) ظہیر فتح پوری (مرتب) امراؤ جان ادا - ص ۶۶ -
(۲) " " " ص ۱۹۵ -

چلے جاتے ہیں ۔ کوئی صاحب ہیں صندلی رنگا ہوا دوپٹہ سر سے آڑا باندھے ہوئے ، رنڈیوں کو گھورتے ہوتے ہیں ۔ ایک صاحب آئے تو ہیں میلا دیکھنے ، مگر بہت ہی مکدر ، حس ہ حسیں ، کچھ چکے چپکے بڑبڑاتے جاتے ہیں ۔ معلوم ہوتا ہے بیوی سے اڑ کے آئے ہیں ۔ جن باتوں کے جواب وقت پہ نہ سوجھی تھی انہیں اب یاد کر رہے ہیں . . . کوئی صاحب اپنے چھوٹے بچے کی انگلی پکڑے اس سے باتیں کرتے چلے آتے ہیں ۔ ہر بات میں اماں کا نام آتا ہے ، اماں کھانا پکاتی ہوں گی ، اماں کا جی ، منتا ہے اماں گھر ہی ہوں گی اماں جاگتی ہوں گی ، بہت سوخی ہو کیا کرو نہیں تو اماں حکیم کے ہاں چلی جاویں گی ۔ ایک صاحب سات آٹھ برس کی لڑکی کو سرخ کپڑے پہنا کے لائے ہیں ۔ کندھے پر چڑھائے ہوئے ہیں ۔ ناک میں ننھی سی نتھنی ہے ۔ اونچی جوڑی گندھی ہوئی ۔ لال تنال باف کا موباف پڑا ہے ۔ ہاتھوں میں چاندی کی چوڑیاں ہیں ۔ معصوم کے دونوں ہاتھ زور سے پکڑے ہوئے ہیں ۔ کلائیاں دکھی جاتی ہیں ۔ کوئی چوڑیاں اتار نہ لے ۔ کبھی پھر پہنا کے لانا ہی کیا ضرور تھا‘‘[۱] ۔

کرداروں کی ایک آدھ حرکت کی مدد ہی سے انہیں منفرد اور ممیز بنا دیا گیا ہے ۔ غرض اس ناول میں مختلف طبقات کے بہت سے کردار پیش کیے گئے ہیں جن میں طوائفیں ، مولوی ، نواب ، گھریلو عورتیں ، ڈاکو ، شعراء ، ملازمین وغیرہ شامل ہیں مگر خوبی یہ ہے کہ ہر کردار دوسرے سے الگ تھلگ پہچانا جاتا ہے ۔

’امراؤ جان ادا‘ کے مکالمات رواں دواں ، سلیس اور شستہ زبان میں ہیں مگر عموماً مختلف کرداروں کی بول چال میں نمایاں فرق محسوس نہیں ہوتا ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اکثر افراد خواندہ ہیں اور لکھنؤ کے رہنے والے ہیں ۔ تاہم ان میں جتنا فرق کیا جا سکتا تھا وہ بھی رسوا کے ہاں موجود نہیں ، یہاں تک کہ دلاور خان اور پیر بخش جیسے ان پڑھ افراد کی گفتگو بھی چند لفظوں کی تبدیلی کے ساتھ پڑھے لکھوں کی گفتگو میں تبدیل ہو جاتی ہے ۔

’امراؤ جان ادا‘ میں چند اور فنی نقائص بھی موجود ہیں ، مثلاً بعض جگہ تضاد ہے جس کی دو مثالیں مندرجہ ذیل ہیں :

(۱) ’’خورشید کی آواز اچھی نہ تھی ۔ صورت پری کی ، گلا ایسا جیسے

(۱) ظہیر فتح پوری (مرتب) امراؤ جان ادا ۔ ص ۱۶۴ ، ۱۶۵ ۔

پھٹا بانس ، ہاں ناچنے میں اچھی تھی اور یہی اس نے سیکھا بھی تھا - اس کا مجرا صرف ناچ کا ہوتا تھا"(۱) -

اس کے بعد ایک جگہ لکھتے ہیں :

"خورسید کی ذات سے خانم کو بڑی امیدیں تھیں - واقعی اگر اس میں رنڈی پن ہوتا تو لاکھوں ہی پیدا کرتی - اس حسن و خوبی پر آواز بالکل ہی نہ تھی ، ناچنے میں بھی بالکل پھوہڑ تھی"(۲) -

(۲) "یہاں ایک مولوی صاحب سے سامنا ہوا - کالے سے تھے - سر منڈا ہوا تھا - ایک نیلی تہمد باندھے دھوپ میں ٹہل رہے تھے"(۳) -

انہی صاحب کے بارے میں ذرا آگے چل کر لکھتے ہیں :

"جوان آدمی تھے ، صورت بھی کچھ بری نہ تھی ، سانولی رنگت تھی ، چہرے پر جونق پن تھا ، سر پر لمبے لمبے بال تھے ، منہ پر ڈاڑھی تھی مگر کچھ بے تکے پن کی حد سے بڑھی ہوئی"(۴) -

یہ اور ایسے دوسرے نقائص معمولی سی توجہ سے دور کیے جا سکتے تھے -

'امراؤ جان ادا' اردو کا پہلا ناول ہے جس میں نفسیات کا عنصر نہایت عمدگی سے شامل کیا گیا ہے - کرداروں کے ردِ عمل ، الجھنیں ، پیچیدگیاں ، لگاوٹیں وغیرہ بہت خوبصورتی سے واضح کی گئی ہیں - کرداروں کے افعال کے نفسیاتی جواز مہیا کیے گئے ہیں - یوں اس ناول میں کرداروں کا ظاہر ہی نہیں باطن بھی پوری طرح اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے -

رسوا کا ناول 'ذاتِ شریف' 'امراؤ جان ادا' کے بعد ان کے دوسرے تمام ناولوں سے بہتر ہے مگر 'امراؤ جان ادا' سے اسے کوئی نسبت نہیں - 'امراؤ جان ادا' میں زندگی صفحے صفحے پر موجود ہے اور اس میں واقعیت کا احساس پوری طرح کارفرما ہے -

(۱) ظہیر فتح پوری (مرتب) امراؤ جان ادا - ص ٦٦ -
(۲) " " " - ص ١٦ -
(۳) ظہیر فتح پوری (مرتب) امراؤ جان ادا - ص ۲۰۵ -
(۴) " " " - ص ۲۰۸ -

'ذاتِ شریف' بھی حقیقت نگاری کی کوشش ہے مگر بڑے محدود پیمانے پر ۔ اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ ایک بھولے بھالے نواب کو سحر و جادو اور طلسم و پری کے چکر میں پھنسا کر کس طرح لوٹا گیا ۔ اس میں زندگی ان معنوں میں محدود ہے کہ اس میں یا تو نوابوں کے کردار ہیں اور یا انہیں بیوقوف بنانے والے جعلسازوں کے ۔ اس ناول کا پلاٹ مرکب ہے ۔ ایک قصہ حکیم صاحب کے گرد گھومتا ہے اور دوسرا چھوٹے نواب صاحب کے متعلق ہے ۔ اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ سر زمینِ لکھنؤ میں جعلساز کس طرح لوگوں کو پھانستے اور پھر کوڑی کوڑی کو محتاج کر دیتے ہیں ۔ رسوا کے اپنے لفظوں ہی میں دیکھیے :

> "لکھنؤ کے رہنے والے عموماً عقلِ معاس سے بے بہرہ ہیں ۔ ۔ ۔ ۔
> اگر کسی چلیے پرزے آفت کے پرکالے کو عقلِ معاس ہے بھی تو وہ
> عقلِ فساد کے ساتھ ملی ہوئی ۔ نیک اور جائز وسیلوں سے روپیہ پیدا
> کرنا یہاں کے لوگ نا ممکن خیال کرتے ہیں" ۔

یہ اقتباس تو 'شریف زادہ' سے ہے مگر 'ذاتِ شریف' اسی گروہ کی کارستانیوں کی داستان ہے ۔ 'ذات شریف' میں زندگی کی ہما ہمی 'امراؤ جان ادا' جیسی نہ سہی مگر پلاٹ میں دلچسپی کا عنصر موجود ہے اگرچہ اس کو پڑھتے ہوئے بعض جگہ کچھ کمی سی محسوس ہوتی ہے ۔ شاید یہ ناول بہت عجلت میں لکھا گیا ہے ۔

'شریف زادہ' ایک شخص مرزا عابد حسین کا قصہ ہے ۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ وہ کس طرح اپنی ذاتی محنت اور قابلیت کی بدولت ترقی کرتے کرتے ممتاز حیثیت کا مالک ہو جاتا ہے ۔ اکثر نقادوں کا خیال ہے کہ 'شریف زادہ' مرزا رسوا کی اپنی سوانح حیات کی تصویر ہے ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کے بعض واقعات مرزا رسوا کی زندگی سے بہت مماثلت رکھتے ہیں ، لیکن مرزا عابد حسین کے ہاں جو استقلال اور قوتِ فیصلہ ہے رسوا اس سے محروم ہیں ۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ شاید یہ کردار مرزا رسوا کا آئیڈیل کردار ہے ۔ مرزا صاحب اپنی زندگی میں بڑے متلون مزاج واقع ہوئے تھے اور زیادہ مدت تک کسی کام پر جم کر نہیں بیٹھ سکتے تھے ۔ اپنے آئیڈیل کردار میں انہوں نے وہ تمام خصوصیات شامل کر دی ہیں جن کی کمی وہ اپنی ذات میں پاتے تھے ۔ اس ناول کا پلاٹ بالکل سیدھا سادہ ہے ۔ واقعات برابر ایک خطِ مستقیم پر حرکت کرتے رہتے ہیں ۔ اس میں کوئی خاص بات نہیں ، کوئی نمایاں دلچسپی نہیں ۔ حتیٰ کہ ناول کا مرکزی کردار ایک بے روح اور بے کشش شخصیت دکھائی دیتا ہے ۔

'اختری بیگم' کے واقعات میں 'شریف زادہ' اور 'ذاتِ شریف' سے زیادہ وسعت ہے ۔ اس میں متوسط طبقے کی زندگی کے متعلق کچھ باتیں بتائی گئی ہیں ۔ ایسی زندگی جس میں

دوسرے کی بات پر شبہہ کیا جاتا ہے اور پھر شبہے کو حقیقت سمجھ کر دل ہی دل میں نفرت شروع ہو جاتی ہے۔ آخرکار نفرت زبان پر آ کر فتنہ و فساد کا موجب بن جاتی ہے۔ اس ناول کا پلاٹ دلچسپ ضرور ہے تاہم ضرورت سے زیادہ اختصار نے اس کا بہت سا فنی حسن چھین لیا ہے۔ اس میں ہیروئن اختری کا کردار مثالی ہے جو خوبیوں کا مجسمہ ہے اور نذیر احمد کے مثالی کرداروں کی طرح بے جان ہے۔ مگر جعفری کا کردار مصنف کا معتوب کردار ہونے کے باوجود زندگی سے بھرپور ہے۔

غرض مرزا رسوا اردو ناول میں نذیر احمد، سرشار اور شرر سے زیادہ حقیقت نگاری کو ناول میں متعارف کرانے کا موجب ہوئے ہیں۔ انہوں نے مثالیت پسندی کو کم سے کم کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ بھی سرشار کی طرح لکھنؤ کی زندگی کو ناولوں میں پیش کرتے ہیں مگر نہ تو آزاد جیسے مثالی ہیرو بناتے ہیں اور نہ خوجی سے مضحک کردار پیش کرتے ہیں۔ وہ زندگی کو متانت سے دیکھتے ہیں۔ روزمرہ کے واقعات ان کی نظر میں رہتے ہیں اور ان سے ناولوں میں بہت اچھا کام لیتے ہیں۔ وہ تفصیلات کے انبار نہیں لگاتے۔ اختصار اور جامعیت ان کے ناولوں میں ہر جگہ نظر آتی ہے بلکہ بعض ناولوں میں تو تفصیلات کی کمی کا احساس ہوتا ہے۔ ان کے ہر ناول میں کچھ حصے یقیناً ایسے ہوتے ہیں جنہیں واقعیت نگاری کی عمدہ مثالوں کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ وہ یقیناً بہت اچھا ناول نگار بننے کی صلاحیت رکھتے تھے مگر انہوں نے اس فن سے بے اعتنائی برتی۔ صرف ایک ناول یعنی 'امراؤ جان ادا' دل لگا کر لکھا جو اردو کے کلاسیکی ناولوں میں اہم حیثیت رکھتا ہے۔ باقی ناول عجلت میں لکھے گئے ہیں۔ اگر رسوا ناول ہی کے ہو رہتے تو اردو ناول کی تاریخ میں بہت سے اہم اضافے کرتے۔

منشی سجاد حسین

سجاد حسین ۱۸۵۶ء میں کاکوری کے قصبے میں پیدا ہوئے۔ یہ قصبہ لکھنؤ سے نو میل کے فاصلے پر ہے۔ اوائل عمر میں اپنے ماموں نواب فدا حسین خان کی زیر نگرانی تعلیم حاصل کی جو لکھنؤ میں وکیل تھے۔ ۱۸۷۳ء میں انٹرنس کا امتحان پاس کر لینے کے بعد کیننگ کالج لکھنؤ میں داخل ہوئے مگر ایف۔ اے کا امتحان دیے بغیر کالج چھوڑ دیا۔ پھر تلاش معاش شروع کی۔ فیض آباد میں فوج کو اردو پڑھانے پر مقرر ہوئے مگر سال بھر میں یہ ملازمت ترک کر دی۔ ۱۸۷۷ء میں لکھنؤ سے مزاحیہ اخبار 'اودھ پنچ' جاری کیا۔ بقیہ عمر اخبار نویسی میں بسر کی۔ 'اودھ پنچ' نے بہت سے ایسے لکھنے والوں کو متعارف کرایا جنہوں نے اردو نثر میں مزاح نگاری کی بنیادیں رکھیں۔ ۱۹۱۲ء میں بیماری اور عسرت کے باعث اخبار بند کر دیا۔ 'اودھ اخبار' سیاست میں

کانگرس کا حامی اور انگریزوں کا مخالف تھا ۔ سرسید تحریک اور آن سے وابستہ افراد کا سخت گیر نقاد تھا ۔ منشی صاحب نے فالج کے عارضے میں ۲۲ جنوری ۱۹۱۵ء کو انتقال کیا ۔

منشی سجاد حسین نے چھ ناول لکھے ۔ جن کے نام یہ ہیں : 'حاجی بغلول'، 'احمق الدین'، 'طرحدار لونڈی'، 'میٹھی چھری'، 'پیاری دنیا'، 'کایا پلٹ' ۔

منشی سجاد حسین کے تمام ناول مختصر اور سو سوا سو صفحات میں محیط ہیں ۔ ان کے ناول ایک لحاظ سے سرشار کی روایت ہی کی ایک شاخ ہیں ۔ انھوں نے لکھنؤ کی زندگی کے بعض خاص پہلوؤں کا ذکر ہی ناولوں کا موضوع قرار دیا ہے ۔ وہ چونکہ قدیم معاشرت کو پسند کرتے تھے اس لیے انھوں نے تجدد کی مخالفت کی ہے چنانچہ قدیم اور مٹتی ہوئی معاشرت کے تفصیلی خاکے ان کے ناولوں میں آ گئے ہیں ۔

'حاجی بغلول' میں ایک کردار 'حاجی محمد بغلول العلی صاحب قبلہ مکتبی مدنی ثم لکھنوی' کو پیش کیا گیا ہے جو لکھنؤ کے بعض امراء کے مختار کار ہیں ، ان کو چند مضحک واقعات سے بے درپے گزارا گیا ہے اور ان کے دلچسپ ردِ عمل سے قارئین کو ہنسایا گیا ہے ۔ حاجی صاحب کا تعارف اس طرح کرایا گیا ہے :

> ''نیچر نے بھی صورت و شکل بنانے میں خاص توجہ مبذول رکھی تھی مثل اور لوگوں کے آپ کی تعمیر ٹھیکہ دار کے سپرد نہ کی تھی ، بلکہ دست خاص کی صنعت تھی ۔ سر اگر حد چودہ انچ کے دور سے بال دو بال زائد ہی تھا مگر گدی کی جانب بہت اونچا ، ماسھو لال کی چڑھائی کی طرح پیشانی کی طرف ڈھلا ہوا ۔ پیشانی پست ، نیچے کی جانب جھکی ۔ ابرو چھوٹے مگر بے چین اور کاواک ، آنکھوں پر مثل سائبان خس پوش آگے کو ابھرے ۔ بینی شاید قلت فرصت سے ایسی مختصر بنی تھی کہ بانا معدوم ، نتھنے صرف نہ جانے کے روشن دان ، اوپر کا لب چھوٹا ، نیچے کا جبڑا مع زنخدان آگے کو ابھرا ہوا ۔ رخساروں کی ہڈیاں دبی ، اوپر کی بہ نسبت نیچے کی ہوائی بڑی ، اس پر رسولی ڈاڑھی نوراً علی نور چہرے کو نوکدار بنائے ہوئے ۔ پتلی گردن اس قدر مختصر کہ ریشِ مقدس با این ہمہ اختصار آرزوؤں کے گنجِ شہیداں پر جاروب کش ۔ بازو اور ہاتھ فی الجملہ دبلے ۔ شانے ڈھلے ہوئے ۔ انگلیاں لکھنؤ کی سہین ککڑیاں ۔ شکمِ مبارک کا بیضاوی

دور سینے سے سوا - ٹانگیں چھوٹی - اوپر کا دھڑ بڑا - دانہ خور
گھوڑی کی طرح ہو قدمی چال -"

اگرچہ یہ کردار خوجی کے کردار سے متاثر ہو کر اختراع کیا گیا ہے مگر حلیے میں خوجی سے یکسر مختلف نظر آتا ہے البتہ دونوں کی دلچسپی میں کلام نہیں - اس ناول کے بعض بیانات 'فسانۂ آزاد' سے ماخوذ معلوم ہوتے ہیں(۱) -

'طرحدار لونڈی' میں ایک ایسی لڑکی کا قصہ بیان کیا گیا ہے جسے دیہات سے کوئی گنوار اغوا کر کے لاتا ہے - پھر اسے چھوڑ کر الگ ہوتا ہے - لکھنؤ کے نواب اس لڑکی کو جس کا نام نجمنا ہے لونڈی بنالیتے ہیں مگر وہ نواب کے نوکر مخشو سے آنکھ لڑاتی ہے جو اسے لے نکلتا ہے - جہاں سے ایک اور شخص ننھے مرزا کے ہتھے چڑھ جاتی ہے اور آخر بازارِ حسن کی زینت بنتی ہے - یہ منشی سجاد حسین کا بہترین ناول ہے - پورا ناول مکالموں میں لکھا گیا ہے - مختلف کرداروں کے ذہنی اور طبعی اختلافات الگ الگ بتائے گئے ہیں - قصہ سیدھا سادہ ہے مگر بے کیف اور سپاٹ نہیں - مختلف کرداروں کی گفتگو میں جو فرق ملحوظ رکھا گیا ہے وہ خاصے کی چیز ہے -

'احمق الدین' کا کردار بھی 'حاجی بغلول' کی طرح ایک دلچسپ احمق کا ہے جو حد درجہ متلون مزاج بھی ہے - یوں تو نواب ہے مگر جعلسازوں کے ہاتھوں لٹنے کے بعد ایک جگہ ملازمت کر لیتا ہے - جہاں اسے نئی تہذیب اختیار کرنے کا شوق ہوتا ہے - لباسِ انگریزی اختیار کرنے میں یہ درگت بنی ہے :

"انگریزی پوشاک پہننے چلے - قمیض سے کچھ مانوس تھے - کف دار کرتے پہنا کرتے تھے - پہلے اس کو پہنا - پھر ویسٹ کوٹ زیبِ جسم کیا - اب پتلون کی باری آئی - قمیض کے دامنوں اور پتلون میں جھگڑا ہو گیا - کبھی پتلون اوپر کبھی دامن - کسی طرح چول نہیں ٹھیک بیٹھتی - بڑی دقت بریسیز نے ڈال دی - جب کاندھوں پر لے جاتے ہیں ، دامن سمٹ کر ناف پر - لب دریا کف دریا کف جمع - بہزار دقت توڑ مروڑ کر کمرے کے گرد جمع کیے - ویسٹ کوٹ سے چھپائے - بریسیز شانے پر پہنچے مگر ویسٹ کوٹ کے اوپر - پھر کوٹ پہنا - بظاہر جنٹلمین بننے میں کوئی کسر نہ چھوڑی -"

یہ لباس اختیار کیا تو پردے کے مخالف ہو گئے - پھر عقدِ بیوگان کے شدت سے حامی ہو گئے - آخر بہزار خرابی پاگل خانے پہنچ جاتے ہیں - اس ناول میں سرسید احمد خاں

---

(۱) مگر داستان امیر حمزہ کے عمرو عیار کے حلیے سے بہت مشابہت رکھتا ہے . . . مدیر عمومی

اور بالخصوص عبدالحلیم شرر کے بعض نظریات کا مذاق اڑایا گیا ہے۔ اگرچہ یہ سمجھنا غلط ہو گا کہ 'احمق الدین' ایک علامت ہے۔ مصنف کے خیال میں جو لوگ انگریزوں کی نقالی کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ 'احمق الدین' ہیں۔

'پیاری دنیا' تمثیلی قصہ ہے جسے ناولوں کی فہرست میں بعض کھینچ تان کر ہی شامل کیا جاسکتا ہے۔ یہی کیفیت 'کایا پلٹ' کی ہے۔ اس پر داستانوی اثرات زیادہ گہرے ہیں۔ 'سیٹھی چھری' کا مرکزی خیال ایک انگریزی مضمون سے ماخوذ ہے۔

مجموعی طور پر منشی سجاد حسین کی یہ تصانیف اردو مزاحیہ ناول نگاری کا نقطۂ آغاز ہیں۔ سرشار نے 'فسانۂ آزاد' وغیرہ میں بھی مزاحیہ عنصر کو بہت کچھ ناول میں داخل کیا ہے مگر پھر بھی وہ کل کا ایک حصہ ہے۔ سجاد حسین کو یہ شرف حاصل ہے کہ انہوں نے پورے کا پورا ناول مزاحیہ انداز میں لکھنے کی طرح ڈالی۔ ان کے ناولوں میں زمانی وقفہ بہت مختصر ہوتا ہے۔ بعض اوقات اتنا مختصر کہ انہیں 'طویل مختصر افسانے' کہنے کو جی چاہتا ہے۔ پلاٹ سیدھے سادے ہیں۔ کردار یک رخ خاکے ہیں۔ اردو میں مضحک کردار نگاری کے وہ موجد تو نہیں ہیں مگر اپنی ناول نگاری کو انہی کے لیے وقف کر دینے کا افتخار انہیں کو ہے۔ وہ ارتقائی کردار تخلیق نہیں کرتے مگر یک رخے خاکوں میں جو کچھ فنی خصوصیات ہو سکتی ہیں۔ وہ ان کے کرداروں میں موجود ہیں۔ وہ مکالمہ نگاری میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کا تفوق رسوا اور سرشار دونوں پر ہے۔ سرشار کے ہاں اردو کے مختلف علاقائی لہجوں کا وہ شعور نہیں ملتا جو سجاد حسین کے ہاں موجود ہے۔ ان کے تمام کردار محض بول چال ہی سے الگ پہچانے جا سکتے ہیں۔ وہ لکھنؤ کی بولی ٹھولی اور ضلع جگت میں مہارت رکھتے ہیں۔ غرض 'سجاد حسین' کے ناول کوئی بہت بڑے کارنامے نہ سہی، انکی ظرافت بھی امتدادِ زمانہ سے ویسی سدا بہار نہ رہی ہو گی تاہم اپنے دور کے معاشرے کا ایک رخ دکھانے میں انہیں جو کامیابی ہوئی ہے وہ کسی دوسرے کے حصے میں کمتر آئی ہے۔

محمد علی طبیب

محمد علی خاں نام، طبیب تخلص۔ پیدائش ۱۸۵۳ء، وطن شاہ آباد ضلع ہر دوئی تھا۔ وہ ہردوئی کی میونسپلٹی میں صدر طبیب رہے۔ بعد میں ہردوئی ہی میں آنریری مجسٹریٹ بھی رہے۔ طب کے علاوہ علمِ ہیئیت میں بھی دخل رکھتے تھے۔ شرر کے 'دلگداز' کے مقابلے میں انہوں نے ہردوئی سے ایک ماہنامہ 'مرقع عالم' نکالا، جس میں ان کے بیشتر ناول اور تفریحی مضامین بالاقساط شائع ہوئے۔ ۱۹۱۸ء میں وفات پائی۔

طبیب نے یہ ناول لکھے 'عبرت'، 'جعفر و عباسہ'، 'دیول دیوی'، 'اختر و حسینہ'، 'حسن سروز'، 'گورا' اور 'رام پیاری' ۔ ۔ ۔ اس کے علاوہ 'رائڈر ہیگرڈ'[1] کے ایک ناول کا ترجمہ 'دل کا سانپ' کے نام سے کیا ۔

حکیم محمد علی طبیب کے ناول شرر کی مقبولیت سے متاثر ہو کر لکھے گئے ہیں اور انہی کے ناولوں کو نمونہ بنایا گیا ہے ۔ شرر نے تاریخ اور معاصر سماج دونوں کو ناولوں کا موضوع بنایا ہے ۔ طبیب کے ہاں بھی دونوں طرح کے ناول موجود ہیں ۔ 'عبرت'، 'دیول دیوی'، 'جعفر و عباسہ' اور 'رام پیاری' تاریخی ناول ہیں 'اختر و حسینہ'، 'حسن سرور' اور 'گورا' معاشرتی ہیں ۔

ان کے ناولوں میں 'عبرت' کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی ۔ یہ پہلے 'مرقع عالم' میں ۱۸۹۰ء سے ۱۸۹۲ء تک شائع ہوتا رہا ۔ پھر کتابی صورت میں چھپا ۔ اب تک اس کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں ۔ اس تاریخی ناول میں سرزمین اطالیہ کو واقعات کا پس منظر بنایا گیا ہے ۔ جصے کا ہیرو سلطنت کے ایک گورنر کا لڑکا جان اور ہیروئین شہزادی ہنوریا ہے ۔ اس جصے میں مختلف واقعات کی ترتیب اور ابواب کی تقسیم میں سلیقہ موجود ہے ۔ مگر اس بات کا کوئی قرینہ نہیں پایا جاتا کہ جصے کے واقعات اٹلی کی سرزمین میں رونما ہو رہے ہیں ۔ اس ناول میں نہ اٹلی کی سرزمین کہیں نظر آتی ہے اور نہ تمدن ۔ کردار گفتگو سے سو فیصد ہندوستان کے افراد معلوم ہوتے ہیں ۔ اس پر مستزاد یہ کہ وہ غالب، ذوق اور حالی کے شعر پڑھتے ہیں ۔ غرض طبیب تاریخی فضا پیدا کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے ۔ ناول کا ہیرو جان جصے کے بعض واقعات میں ایک بہادر نوجوان معلوم ہوتا ہے لیکن وہ محبوبہ کو دیکھ کر ہی غش کھا جاتا ہے اور یہ کیفیت اس پر اکثر طاری ہوتی رہتی ہے ۔ وہ ناول سے زیادہ مشرقی داستانوں کا کوئی کردار نظر آتا ہے ۔ ہیروئن قدرے بہتر ہے مگر اس میں بھی شہزادگی کی صفات کم ہی دکھائی دیتی ہیں ۔ اس ناول کے ایک کردار میکسمس کی بہت تعریف کی گئی ہے :

> ''عبرت میں طبیب نے ایک ایسا کردار بھی پیش کیا ہے جو غیر فانی ہے ۔ یہ میکسمس ہے[2]''

> ''میکسمس کی ذہانت و انکساری اور علمیت و سنجیدگی کے ساتھ

---

(۱) ہیگرڈ پیدائش ۱۸۵۶ء وفات ۱۹۲۵ء

(۲) علی عباس حسینی، ناول کی تاریخ اور تنقید ۔ ص ۳۳۵

ساتھ اپنی کمزوریوں کا اعتراف اسے عبرت کا سب سے بڑا کردار بنا دیا ہے"

قطع نظر اس کے کہ کمزوریوں کا اعتراف کسی کردار کو "بڑا کردار" نہیں بنا سکتا، میکسمس کے کردار میں کوئی جان نہیں ہے - حالانکہ وہ جان کا مصاحب ہے مگر اس میں وہ چستی، ہمت اور تدبر نہیں ہے جو ایسے کرداروں کا خاصہ ہوتی ہے - اس میں اتنی صلاحیت بھی نہیں کہ جو کہ جان سے بگڑ جائے اسے سنبھال سکے - زیادہ سے زیادہ وہ جان کا ایک وفادار خادم کہلوا سکتا ہے - اس میں آگے بڑھ کر کام کو اپنے ہاتھ میں لینے کی صلاحیت نہیں ہے - اس لحاظ وہ اتنا اہم بھی معلوم نہیں ہوتا جتنا کہ داستانوں میں شہزادوں اور شہزادیوں کے ساتھی وزیر زادے اور وزیر زادیاں ہوتی ہیں - وہ 'سحرالبیان' کی نجم النساء جتنا اہم بھی نہیں ہے - اسے طبیب نے عالم بنا کر پیش کیا ہے حالانکہ ناول عالم کی بجائے باہمت اور با تدبیر شخص کے کردار کا متقاضی ہے -

یہی کیفیت طبیب کے دوسرے تاریخی ناولوں کی ہے - وہ تاریخی ناول کے فن کے متعلق اس غلط فہمی کا شکار ہیں کہ تاریخی واقعات کی صحت کے سوا دوسری کسی بات کی اس کے لیے ضرورت نہیں ہوتی - حالانکہ اس دور کے عقائد، رسوم و رواج، معاشرت اور ماحول کو برابر کی اہمیت حاصل ہوتی ہے - طبیب تاریخی واقعات کی صحت کا کچھ نہ کچھ اہتمام کر لیتے ہیں مگر باقی شرائط زیادہ محنت، مطالعے اور تخلیقی تخیل کا تقاضا کرتی ہیں جسے وہ پورا کرنے سے قاصر ہیں -

طبیب کے معاشرتی ناولوں میں اس دور کے بعض مسائل کو پیش کیا گیا ہے - 'گورا' میں بیوگان کی ہر درد زندگی کی مصوری کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے ان کے لیے عقد ثانی بہت ضروری ہے - 'اختر و حسینہ' میں انہی ناموں کے دو کرداروں کی داستان محبت بیان کی گئی ہے جو لیلی و مجنوں کی طرح ایک دوسرے سے عشق کرتے ہیں مگر از روایتی عاشق و معشوق کے برعکس بہت سی تکلیفیں جھیل کر بالآخر ہمیشہ کے لیے اکٹھے ہو جاتے ہیں -

طبیب کے معاشرتی ناولوں میں مسائل کو سطحی نظر سے دیکھا گیا ہے - وہ جو کچھ ثابت کرنا چاہتے ہیں، ناول کے واقعات بعض اوقات اُن سے بالکل متضاد بات ثابت کر دیتے ہیں - ان کے ہاں سب سے بڑی کمی یہ ہے کہ ان کی انشا ناولوں کے لیے پسندیدہ نہیں وہ داستانوں کے آرائشی اور رومانی انداز بیان کو اختیار کر لیتے ہیں جو

---

(۱) سہیل بخاری، ناول نگاری - ص ۲۱۵

سماجی ناولوں کی واقفیت کے لیے مضر ہے ۔ تاریخی ناولوں میں البتہ ایک حدتک اس کی گنجائش نکل آتی ہے ۔ طبیب کے ہاں تشبیہات مرکب ، پیچیدہ اور بھدی سی پڑتی ہیں ۔ کردار نگاری میں بھی کامیاب نہیں ہو سکے ۔ ان کے ناولوں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ واقعات کی ترتیب کا کچھ شعور ضرور رکھتے ہیں ۔ اس معاملے میں وہ شرر پر فائق ہیں ۔ علی عباس حسینی نے جب یہ لکھا کہ ''طبیب کے قلم میں شرر سے زیادہ ناول نگاری کی صلاحیت تھی''[1] تو ان کا اشارہ ان کے ناولوں کی ترتیبِ واقعات ہی کی طرف تھا ۔

ناول نگار شعراء

رسوا ، سجاد حسین اور طبیب کے علاوہ بھی اس دور میں بہت سے لوگوں نے ناول لکھے ہیں ۔ ناول کی صنف اس دور میں اس قدر مقبول ہوئی کہ بہت سے ایسے حضرات جن کا اصل میدان شاعری تھا وہ بھی ناول نگاری کے کوچے میں در آئے ۔ ان لوگوں میں مولانا حالی ، آغا شاعر ، ریاض خیر آبادی اور بیخود دہلوی وغیرہ شامل ہیں ۔ علاوہ ازیں ناول کی مقبولیتِ عام بمانے میں کچھ اور لوگوں نے بھی حصّہ لیا جن میں قاری سرفراز حسین عزمی ، نواب سید محمد آزاد ، سجاد حسین انجم کسمنڈوی ، مرزا عباس حسین ہوش ، جوالاپرشاد برق وغیرہ کے اسماء کو زمانے نے بالکل فراموش ہونے سے بچا لیا ۔ ان ناول نگاروں کے ہاں کوئی انفرادیت نظر نہیں آتی ۔ یہ نذیر احمد ، سرشار ، شرر ، سجاد حسین اور مرزا رسوا کے مقلدین ہیں ۔ ان کی ناول نگاری کا مختصر جائزہ درج ذیل ہے :

مولانا الطاف حسین حالی (پ ۱۸۳۷ء و ۳۱ دسمبر ۱۹۱۴ء)

آخری عمر میں قصہ گوئی کی طرف مائل ہوئے ۔ انہوں نے ۱۸۷۴ء میں 'مجالس النساء' کے نام سے ایک ناول لکھا جو دوحصوں میں مکمل ہوا ۔ اس ناول کی قدامت اس بات سے ہے کہ یہ بظاہر 'مراۃالعروس' کے پانچ برس بعد لکھا گیا ہے ۔ سید وقار عظیم لکھتے ہیں :

> ''حالی نے اس منصب کو بھی اسی کامیابی سے پورا کیا ہے جس طرح نقاد ، شاعر اور معلم کے مناصب اختیار کر کے انہوں نے اپنی کامیابی حاصل کی ہے کہ ان میں سے ہر میدان میں ان کی حیثیت محض رہرو کی نہیں رہبرِ کامل کی ہے''[2] ۔

---

(۱) علی عباس حسینی ، ناول کی تاریخ اور تنقید ۔ ص ۳۳۷

(۲) وقار عظیم ، پروفیسر ، داستان سے افسانے تک ۔ ص ۵۴ اردو اکیڈمی سندھ ، کراچی ، جولائی ۱۹٦۰ء

سچ تو یہ ہے کہ حالی کی حیثیت بطور شاعر، ناقد اور سوانح نگار ہے ۔ اس کے مقابلے میں بطور ناول نگار وہ بہت معمولی حیثیت رکھتے ہیں ۔ اس ناول کا قصہ چھوٹا سا ہے ۔ آسے پھیلانے کے لیے جزئیات کا سہارا لیا گیا ہے ۔ جزئیات بعض جگہ بہت مناسب ہیں، لیکن جب وہ قصے کو آگے بڑھانے میں معاون نہ ہوں تو الجھن کا باعث بن جاتی ہیں ۔ البتہ اس ناول کی ایک خصوصیت قابل ذکر ہے ۔ اس کے مکالمے بہت سبک، فطری اور موقع محل کے مطابق ہیں یہی مکالمے اس ناول کو بدرجے گوارا بناتے ہیں ۔

ریاض خیر آبادی (۱۸۵۶ء[1] - ۱۹۳۶ء)

ریاض خیر آبادی نے ناول نگاری کی ابتدا شرر سے متاثر ہو کر قصہ گوئی شروع کی ۔ ان کے جو ناول ابھی تک دریافت ہوئے ہیں، ان کے نام یہ ہیں 'حرم سرا'، 'نظارہ' 'تصویر' اور 'ناشاد' ان میں 'ناشاد' طبع زاد ہے ۔ باقی کے بعض ناول رینالڈز (Reynolds) سے ماخوذ ہیں ۔ ریاض انگریزی نہیں جانتے تھے ۔ ان کے احباب انہیں مفہوم بتا دیتے تھے ۔ بعد میں ریاض انہیں اپنی زبان میں لکھ لیتے تھے ۔ 'حرم سرا' (Loves of the Harem) سے ماخوذ ہے ۔ یہ ۱۸۸۹ء میں لکھا گیا ۔ نظارہ (Ellon pessy) کا ترجمہ ہے ۔ ۱۸۸۹ء ہی میں قسط وار شائع ہوا ۔ اگلے سال کتابی صورت میں چھپا ۔ تصویر 'Bronze's statue' کا ترجمہ ہے ۔

'ناشاد' تاریخی ناول ہے ۔ اس کا پس منظر شاہجہان کے بیٹوں کی جنگ تخت نشینی کا زمانہ ہے ۔ اس میں شہزادہ مراد اور شہزادی مہر النساء کے عشق کی داستان بیان کی گئی ہے ۔ پلاٹ اور کردار معمولی درجے کے ہیں ۔ تاریخ کے واقعات کو عشق کی ذرا سی آمیزش کے ساتھ ناول بنانے کی کوشش کی گئی ہے ۔

شاد عظیم آبادی (پ ۱۸۴۶ء - و ۱۹۲۷ء)

شاد عظیم آبادی کا ناول 'صورت الخیال' تین جلدوں میں ہے ۔ مصنف نے مقدمے میں سبب تصنیف بیان کر دیا ہے ۔ وہ کہتے ہیں کہ انسانی طبیعت کا خاصہ ہے کہ پند و نصائح کو جب تک تمثیلی انداز میں بیان نہ کیا جائے، اثر قبول نہیں کرتی ۔ اس ناول میں انہوں نے ایک عورت ولایتی کا قصہ بیان کیا ہے جو طرح طرح کے مصائب میں

---

(۱) قیوم نظامی کی تحقیق کے مطابق یہ سن درست ہے (دیکھیے مقالہ 'ریاض خیر آبادی' برائے ایم - اے اردو قلمی پنجاب یونیورسٹی لائبریری) اگر چہ اکثر نقادوں نے ۱۸۵۳ء لکھا ہے ۔

مبتلا ہوئی ہے - جن میں سے کچھ مصیبتیں اس کے اپنے ہاتھوں لائی ہوئی ہیں - اس لیے اس ناول میں اگر کوئی مقصد ہے تو یہ کہ بڑے کردار سے لوگ عبرت پکڑیں -

اس ناول کا پلاٹ بہت جگہ غیر فطری ہے اور اکثر جگہ اتفاقات کے سہارے واقعات آگے بڑھتے ہیں - کرداروں میں ولایتی کا کردار کچھ ناقابل یقین رہتا ہے - دوسرے کرداروں میں میر نیاز علی اور مغلانی کے کردار بہتر ہیں - علی عباس حسینی نے اس ناول کے متعلق یوں اظہار رائے کیا ہے :

> ''مجالس النساء میں جس طرح دلی کی شریف زادیوں کی زبان پیش کی گئی ہے اسی طرح 'صورت الخیال' کی تینوں جلدوں میں عظیم آباد کی بیگماتی زبان لکھی گئی ہے - لیکن شاد نے اسی پر اکتفا نہیں کی ہے بلکہ نوکر چاکر، اہل حرفہ، ایرانیوں، انگریزوں اور دیہاتیوں کی زبانیں بھی لکھی ہیں - اسی لیے یہ کتاب لسانیاتی حیثیت سے بھی 'مجالس النساء' پر فوقیت رکھتی ہیں اور اس کی مستحق ہیں کہ موجودہ ناولوں کی طرز پر پھر سے طبع کرا کے شائع کی جائیں''[1] -

مرزا ظفر علی بیگ

مرزا ظفر علی بیگ جو آغا شاعر قزلباش کے نام سے مشہور ہیں - داغ دہلوی کے مشہور تلامذہ میں ہیں - انہوں نے ناول بھی لکھے ہیں - ان کے طبعزاد ناولوں میں 'ہیرے کی کنی'، 'ناہید'، 'ارمان' اور 'نقلی تاجدار' شامل ہیں - 'نقلی تاجدار' تاریخی ناول ہے - 'ہیرے کی کنی' اور 'ناہید' عشقیہ ناول ہیں - ان میں اصل دلچسپی بیانات کی ہے - واقعات میں اصلیت کم اور تخیلیت زیادہ ہے -

'ارمان' ان ناولوں میں سب سے بہتر ہے - سہیل بخاری کے بقول :

> ''اس ناول میں بڑی چابکدستی سے متوسط طبقے کی خانگی معاشرت کی نقشہ کشی کی گئی ہے . . . . اس میں آغا شاعر کی حقیقت نگاری کا کمال نظر آتا ہے - یہ ناول اپنے معصوم رومان کے دلکش آغاز اور فطری انجام، لطیف و بلیغ کنایوں اور نفسیاتی اشاروں، حقیقی مرقع کشی اور واقعیت نگاری، ڈرامائی انداز بیان اور کرداری ارتقاء

---

(۱) علی عباس حسینی، ناول کی تاریخ اور تنقید - ص ۲۴۰، ۲۴۱ -

اور پر تاثیر مکالموں اور اعلیٰ انشا پردازی کے باعث اردو ادب کا ایک نادر شاہکار ہے''[۱] ۔

بیخود دہلوی (پ ۲۲ فروری ۱۸۶۲ء - و ۱۹۵۵ء)

سید وحید الدین احمد متخلص بہ بیخود دہلوی نے بھی شاعری کی مصروفیتوں میں سے کچھ وقت نکال کر ۱۸۹۹ء میں ایک ناول 'ننگ و ناموس' کے نام سے لکھا ۔ اس کا مقصد بقول مصنف یہ ہے کہ بے پردگی کی خرابیاں ظاہر کی جائیں ۔ اس زمانے میں عبدالحلیم شرر نے پردے کے خلاف مہم شروع کر رکھی تھی اور اس موضوع پر ایک ناول 'بدرالنساء کی مصیبت' بھی لکھا تھا ۔ علاوہ ازیں لوگوں کو خطوط بھی لکھتے تھے جن میں پردے کی مخالفت کی گئی تھی ۔ بیخود کے پاس بھی اس مضمون کا خط پہنچا وہ لکھتے ہیں :

''میرے پاس شرر کا اسی مضمون کا خط آیا تھا میں نے اس کا تو کوئی جواب نہیں دیا البتہ اس کے جواب میں 'ننگ و ناموس' لکھ کر شائع کروا دیا تھا''[۲] ۔

لیکن یہ ناول اپنے مقصد کے سراسر خلاف جاتا ہے ۔ اس میں بے پردگی سے کسی پر کوئی مصیبت نہیں آتی بلکہ طربیہ انجام کی وجہ سے بے پردگی کی ترغیب کا باعث بنتا ہے ۔ البتہ اس میں جگہ جگہ ایسے وعظ کہے گئے ہیں جن میں بے پردگی کی مخالفت کی گئی ہے ۔ مثلاً قصے کا ہیرو ابو الحامد ایک جگہ کہتا ہے :

''یہ بالکل بے ہودہ خیال ہے کہ ہندوستان سے پردہ اٹھا دیا جائے ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مقدمات کی تعداد بڑھ جائے گی ، وکلاء کی بن آئے گی ۔ سرکار کو جج بھرتی کرنے پڑیں گے اور ہندوستانی بیچاروں کا دم ناک کی پھننگ میں آ جائے گا''[۳] ۔

اس ناول کا پلاٹ سادہ ، قصہ مختصر اور کردار نگاری معمولی درجے کی ہے - البتہ اس دور کے کئی دوسرے ناولوں کی طرح مکالمہ نگاری بہتر ہے ۔

---

(۱) سہیل بخاری ، ناول نگاری ۔ ص ۲۰۸ - ۲۰۹ -

(۲) شاہد احمد دہلوی ، گنجینۂ گوہر ۔ ص ۵۷ -

(۳) بیخود دہلوی ، ننگ و ناموس ۔ ص ۴ -

دیگر ناول نگار

جو لوگ شاعری کے ذریعے ناول کے میدان میں آنے کی بجائے براہِ راست ادھر آ گئے۔ ان میں سے بہت سے لوگوں کے نام زمانے نے فراموش کر دیے۔ جن ناول نگاروں کے نام اب بھی قدرے معروف ہیں وہ ہیں قاری سرفراز حسین عزمی، عباس حسین ہوش، سید محمد حسین آزاد، جوالا پرشاد برق، سجاد حسین انجم کسمنڈوی وغیرہ۔

قاری سرفراز حسین عزمی (پ ۱۸٦۷ء – و ۱۹۳۴ء)

قاری سرفراز حسین عزمی بطور ناول نگار ان لوگوں میں زیادہ مشہور ہیں اور بعض ناقدین ان کے معترف معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے ناول ہیں 'سعید'، 'سعادت'، 'شاہد رعنا'، 'سزائے عیش'، 'انجامِ عیش'، 'سرابِ عیش'، 'بہارِ عیش' اور 'خمارِ عیش'۔ ان تمام ناولوں کا ایک اور صرف ایک ہی موضوع ہے اور وہ ہے طوائف۔ ان میں طوائف کی زندگی کے مختلف گوشے واضح کیے گئے ہیں۔ ان ناولوں سے عزمی نے اصلاح و تبلیغ کا کام لیا ہے۔ طوائفیں اکثر اپنی زندگی پر متاسف دکھائی دیتی ہیں اور جب ان میں سے کوئی گناہ کی زندگی کو ترک کرکے گھر بسا لیتی ہے تو اسے سکون مل جاتا ہے۔

عزمی کے ناولوں میں 'شاہدِ رعنا' کو خاص اہمیت دی جاتی ہے۔ یہ ناول ۱۸۹۷ء میں شائع ہوا۔ بہت مختصر سا ناول ہے۔ اس میں ایک طوائف ننھی جان کے حالات بیان کیے گئے ہیں اور بتایا گیا ہے کہ کس طرح رفتہ رفتہ وہ گناہ کی زندگی سے تائب ہوکر خوشگوار تاہل کی زندگی بسر کرنے لگتی ہے۔ اگر ناول کے ٹائیٹل پر درج سنِ اشاعت درست ہے (اور اس کے غلط ہونے کی بظاہر کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی) تو اسے طوائف کی داستان کی حد تک 'امراؤ جان ادا' پر دو برس کا تفوق حاصل ہے۔ اس میں معاشرت کے نقشے یا واقعہ نگاری کا وہ رنگ تو ہرگز نہیں ہے جو 'امراؤ جان ادا' میں ہے مگر ننھی جان کی زندگی کی بہت سی تفصیلات امراؤ جان سے ملتی جلتی ہیں۔ بلکہ بعض جگہ تو شبہ ہوتا ہے کہ مرزا رسوا نے اس سے متاثر ہوکر 'امراؤ جان ادا' تحریر کیا ہے۔ مثلاً 'شاہدِ رعنا' کے آغاز کی چند سطریں ملاحظہ کیجیے:

> "نو ساڑھے نو برس کی ہوں گی کہ میری تعلیم دو وقتہ پابندی سے ہونے لگی اور مجھے اچھے اچھے کپڑے پہننے کو ملنے لگے

بڑی آپا کے ملنے والے جو آتے تھے اکثر انہیں پان بنا کر میں ہی دیا کرتی تھی اور ہنسی مذاق کی باتوں میں بھی رفتہ رفتہ مجھے مزہ آنے لگا۔ اب تک میں اماں کے پاس سویا کرتی تھی مگر مجھے خوب یاد ہے کہ آپا کی مسہری کی خوشبو اور سجا ہوا کمرہ دیکھ کر میرے دل میں بڑے بڑے ارمان پیدا ہوتے تھے۔ میلے تماشوں میں اب میں برابر ان کے ساتھ جانے لگی اور چھوٹے چھوٹے مجروں میں بھی ان کی رعایت سے لوگ مجھے بلانے لگے۔ بڑی عمر کے لوگ تو مجھے زہر معلوم ہوتے تھے مگر جوان یا میرے ہم سن ناچ میں مجھ سے ہنسی مذاق کرتے تھے تو اندر سے میرا دل بہت خوش ہوتا تھا"[1]۔

نگار خانے میں تعلیم اور تربیت کے دوران 'امراؤ جان ادا' کے جو حالات بیان کیے گئے ہیں۔ اس اقتباس سے بڑی مماثلت رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی قصے میں کرداروں کے بعض نام اور واقعات 'امراؤ جان ادا' سے ملتے جلتے ہیں۔ مگر ایک تو عزمی نے اسے محض نگار خانے تک محدود رکھا ہے دوسرے ان کے مزاج میں اس قدر اختصار ہے کہ کردار اور واقعات زندہ ہونے سے محروم رہتے ہیں

اس کے تمام کردار اس ذہانت سے محروم ہیں جو 'امراؤ جان ادا' کے کرداروں میں ہے۔

عباس حسین ہوش

عباس حسین ہوش نے دو ناول 'افسانہ نادر جہاں'[2] اور 'ربط ضبط' لکھے۔ اول الذکر نذیر احمد کی تقلید میں ہے۔ اور ثانی الذکر میں سرشار کا رنگ پایا جاتا ہے۔

'افسانہ نادر جہاں' میں روز مرہ اور محاورے کی فراوانی ہے۔ واقعات ناقابلِ یقین سے ہیں۔ لڑکیوں کے تعلیمی نصاب کی ضرورتوں کا خیال رکھ کر لکھا گیا ہے 'ربط و ضبط' تاریخی ناول ہے مگر چند برس پہلے کی تاریخ کو پس منظر کے طور پر پیش کرتا ہے۔ اس کے واقعات زیادہ قابلِ یقین ہیں۔ بعض ضمنی کردار 'سرشار' کے کرداروں کی یاد دلاتے ہیں۔

---

(۱) شاہد رعنا ، مطبوعہ مطبع ہاشمی میرٹھ ، طبع اول ۱۹۰۷ء۔

(۲) افسانۂ نادر جہاں پر مصنفہ کی حیثیت سے نادر جہاں کا نام تحریر ہے مگر علی عباس حسینی (ناول کی تاریخ و تنقید) عینی شاہدوں کے حوالے سے اسے ہوش کی تصنیف قرار دیتے ہیں (ص ۳۴۲)۔

سید محمد آزاد (پ ۱۸۴۶ء - و ۱۹۱۶ء)

سید محمد آزاد نے 'نوابی دربار' کے نام سے ۱۸۷۸ء میں ایک ناول لکھا۔ عبدالغفور شہباز اسے ڈراما قرار دیتے ہیں[1]۔ مگر اس زمانے میں ناول کو آغاز سے انجام تک مکالمات کی شکل میں لکھنے کا رواج ہو چلا تھا۔ جیسا کہ ہمیں منشی سجاد حسین کی ایسی ہی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے۔ اس میں ڈرامائی عمل کی کمی ہے۔ اس لیے اسے مکالماتی ناول قرار دینا درست ہے۔ اس میں اودھ کے نوابوں کی تنزلی سے بگڑی ہوئی معاشرت کی طنزیہ انداز میں عکاسی کی گئی ہے۔ نواب صاحب کا کردار لکھنؤ کے دیگر روایتی نوابوں سے ملتا جلتا ہے اس لیے اپنے طبقے کا نمائندہ کردار ہے۔ اس ناول میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جن کا ذکر سجاد حسین کے ضمن میں کیا جا چکا ہے۔

جوالا پرشاد برق (پ ۱۸۶۳ء - و ۱۹۱۱ء)

جوالا پرشاد بھی منشی سجاد اور سید محمد آزاد کی طرح 'اودھ پنچ' کے مستقل لکھنے والوں میں شامل تھے۔ انہوں نے بنکم چندر چیٹر جی کے ناولوں مثلاً 'بنگالی دلہن'، 'پرتاپ'، 'روہنی'، 'مرنالنی' وغیرہ کو اردو میں منتقل کیا ہے۔

سجاد حسین انجم کسمنڈوی (پ ۱۸۵۷ء - و ۱۹۱۳ء)

سجاد حسین انجم کسمنڈوی نے 'کائنات'، 'حیاتِ شیخ چلی' اور 'بھلا بھگت' کے نام سے تین قصے لکھے ہیں۔ جو اس دور کے مزاحیہ انداز کے لکھنے والوں کے رنگ میں ہیں۔ ان کا ایک اور ناول 'نشتر' ہے۔ جس کے بارے میں انہوں نے دعویٰ کیا ہے کہ یہ ایک غیر مطبوعہ فارسی قصے کا ترجمہ ہے۔ جسے ایک شخص حسن شاہ نے لکھا ہے۔ یہ ناول کے ہیرو حسن شاہ کے ایک کشمیری طائفے کے ساتھ رہنے والی کسی لڑکی خانم جان سے عشق کی داستان ہے۔ جو اردو میں ۱۸۹۴ء میں شائع ہوئی۔ ناول کے واقعات سیدھے سادے اور بیشتر حقیقت پر مبنی ہیں۔ خاص طور پر خانم جان کے کردار میں جو دلکشی ہے وہ طوائفوں کے موضوع پر لکھے

---

(۱) نوابی دربار، مرتبہ ممتاز منگلوری، مکتبۂ خیابان ادب لاہور، نومبر ۱۹۶۶ء۔

(۲) عشرت رحمانی نے ان کی تاریخ وفات ۱۹۱۳ء قرار دی ہے اور عمر چھیالیس سال (ناول نشتر، مجلس ترقی ادب، لاہور) - میں (عبداللہ خویشگی) نے فرہنگ عامرہ ۱۹۰۲ء - انہوں نے تاریخ پیدائش ۱۸۵۷ء قرار دی ہے - اگر عشرت رحمانی کے بقول انجم چھیالیس سال کی عمر میں فوت ہوئے تو اسی صورت میں وفات ۱۹۰۳ء میں زیادہ قرین قیاس ہے۔

ہوئے ناولوں کے تمام زنانہ کرداروں سے بڑھ کر ہے۔ خانم جان ایک خوانندہ ، باذوق اور وفا شعار عورت نظر آتی ہے۔ ناول کے بعض واقعات اور انعام مثنوی 'زہر عشق' کی یاد دلاتے ہیں۔ خانم جان تو عشق میں جان دے دیتی ہے مگر حسن شاہ 'زہر عشق' کے ہیرو کی طرح یہی کہتا رہ جاتا ہے:

حاصل اتنا ہے اس کہانی سے ہم رہے جیتے سخت جانی سے

اس قصے میں اشعار کا استعمال بہت زیادہ ہے۔ اس قدر زیادہ کہ قصے کا تسلسل ان سے ٹوٹ ٹوٹ جاتا ہے۔ اگر اشعار نہ ہوتے تو یہ ناول اس سے زیادہ دلکش ہوتا۔ اس میں خانم جان کی طرف سے جو رقعے تحریر کیے گئے ہیں۔ ان میں بڑے حقیقی جذبات جھلکتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔

مرزا محمد سعید

بیسویں صدی کے آغاز سے جن ناول نگاروں نے شہرت حاصل کی ان میں مرزا محمد سعید کا نام سب سے اہم سمجھا جاتا ہے۔ مرزا محمد سعید ۱۸۸۶ء میں دلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد انگریزی تعلیم حاصل کر کے سرکاری ملازمت میں رہے والدہ سر سید احمد خان کی رشتہ دار تھیں ، اس لیے مرزا صاحب کو شروع ہی سے جدید تعلیم دلوائی گئی۔ چونکہ ان کے والد مدت تک لاہور میں مقیم رہے اس لیے انہوں نے تعلیم لاہور میں حاصل کی۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم۔ اے انگریزی کا امتحان پاس کیا اور اس میں اول رہے۔ ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ میں لیکچرار ہوئے ، اس کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور میں اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہوئے۔ ۱۹۱۸ء میں پروفیسر ہو گئے۔ یہاں سے محکمۂ تعلیم کے اسسٹنٹ سیکرٹری ہو کر دہلی اور شملہ چلے گئے۔ پھر لدھیانہ کے گورنمنٹ کالج کے پرنسپل ہوئے اور پھر رہتک میں اسی آسامی پر رہے۔ ریٹائر ہونے کے بعد مدتِ مدید تک علمی اور ادبی سرگرمیوں میں مصروف رہے۔ مرزا سعید تاریخ ، فنونِ لطیفہ ، سیاسیات ، منطق اور فلسفہ میں بہت دلچسپی لیتے تھے۔

آج مرزا محمد سعید کا نام ان کے ناولوں کی وجہ سے زندہ ہے۔ انہوں نے دو ناول لکھے ہیں۔ پہلا ناول 'خوابِ ہستی' ۱۹۰۵ء میں شائع ہوا۔ دوسرا ناول 'یاسمین' ۱۹۰۸ء کی تصنیف ہے۔

'خوابِ ہستی' میں ایک نہایت ذہین مگر نا تجربہ کار نوجوان کا قصہ بیان کیا گیا ہے ، جسے دلی کی ایک طوائف حسن افروز سے محبت ہو جاتی ہے۔ پھر وہ تھیٹر

کی ایک اداکار شمیم کی طرف مائل ہوتا ہے وہ بھی جھوٹی محبت جتاتی ہے ، لیکن جب عثمان کو بعض دوسرے لوگوں کے ساتھ بھی اس کے اسی نوعیت کے تعلقات کا علم ہوتا ہے تو وہ شمیم سے قطع تعلق کر لیتا ہے مگر سخت بیمار بڑ جاتا ہے۔ صحت یابی پر تبدیلی آب و ہوا کے لیے دلی پہنچتا ہے تو پھر حسن افروز سے ملاقات ہوتی ہے۔ پرانی محبت عود کر آتی ہے اور وہ حسن افروز سے شادی کر لیتا ہے۔ حسن افروز جلد ہی بیمار ہو کر مر جاتی ہے تو عثمان کو ایک روحانی تجربہ ہوتا ہے اور مذہب کے دامن میں اسے پناہ مل جاتی ہے۔

'خوابِ ہستی' اصلاحی ناول ہے۔ ناول کے دیباچے میں مصنّف نے خود بھی اس کا اعتراف کیا ہے۔ ناول کا مقصد نوجوانوں کو طوائفوں اور تھیٹر کی اداکاروں کے دام سے بچانا معلوم ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں صوفیاء کے انداز میں مصنّف یہ بھی کہنا چاہتا ہے کہ دنیوی تعلقات اور حسن و جوانی کی حیثیت ناپائیدار ہے۔ انسان کو سکون محض مذہب کے دامن میں مل سکتا ہے۔

'خوابِ ہستی' کا قصہ پیچیدگی سے مبّرا ہے۔ کردار نگاری معمولی درجے کی ہے عثمان کا کردار مقابلتاً دلچسپ ہے۔ شمیم اور حسن افروز کے کردار زیادہ متاثر نہیں کرتے۔ ناول کے مناظر کتابی اور بے جان سے ہیں۔ مکالمے طویل ہیں اور کہیں کہیں تقریروں کا روپ دھار لیتے ہیں۔ تاہم ناول کے بعض واقعات میں نفسیاتی حقیقت نگاری کی اچھی مثالیں موجود ہیں۔ بالخصوص عثمان کا ردّ عمل بعض جگہ نہایت مناسب ہے۔ اس ناول میں مصنّف کی ایک غلط فہمی کی وجہ سے واقعات کا تانا بانا بری طرح درہم برہم ہوتا ہے۔ بیانیہ ناولوں میں ہم فرض کر لیتے ہیں کہ تمام واقعات کو دیکھنے والا کوئی شخص ہر جگہ موجود ہے جو خفیہ سے خفیہ بات کو بھی دیکھ رہا ہے۔ ڈرامے کی خود کلامی وغیرہ کی طرح ناول کی صنف میں یہ چیز ایک مفاہمت کی حیثیت رکھتی ہے۔ لیکن مرزا صاحب اُس سے واقف نہیں معلوم ہوتے۔ 'خوابِ ہستی' میں اگر عثمان کوئی خفیہ رقعہ لکھتا ہے تو مرزا صاحب اس خیال سے کوئی اس پر اعتراض کرے گا کہ یہ رقعہ ناول نگار کو کس طرح حاصل ہوا ؟ فوراً لکھ دیتے ہیں کہ "اس کی ایک نقل کسی ذریعے سے ہمیں بھی حاصل ہو گئی ہے"۔ ایسے موقعے ناول میں کئی جگہ آتے ہیں۔ اس نے قصے کے تسلسل کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔

'یاسمین' کا ہیرو اختر ایک رئیس کا بیٹا ہے۔ مصوری سے اسے بے حد لگاؤ ہے۔ وہ باپ کی مرضی سے ایک لڑکی صفیہ سے شادی کر لیتا ہے۔ لیکن ایک نن کلو

کی طرح اس شادی سے نا مطمئن ہے ۔ چنانچہ وہ ایک اور لڑکی یاسمین سے محبت شروع کر دیتا ہے اور جب وہ لڑکی اسے دغا دے جاتی ہے تو پھر اپنی بیوی صفیہ کی طرف پلٹ آتا ہے ۔

اس ناول کا مقصد بھی اصلاحی ہے ۔ مصنف یہ کہنا چاہتا ہے کہ جوانی کا جوش انسان کو اکثر گمراہ کرتا ہے اور محض جذباتیت پر سکون زندگی کی ضمانت نہیں بن سکتی ۔ اس پلاٹ کی 'خوابِ ہستی' سے مماثلت ظاہر ہے ۔ تاہم یہ قصہ مجموعی طور پر 'خوابِ ہستی' کے مقابلے میں زیادہ فن کاری سے بیان کیا گیا ہے ۔ اس میں بیان کنندہ کی دخل اندازی کے لیے ایک فن کارانہ جواز پیدا کر لیا گیا ہے، اس لیے یہ بری معلوم نہیں ہوتی ۔

کرداروں میں ہیرو اختر اور ہیروئن یاسمین کی سیرتیں قابلِ توجہ ہیں ۔ دونوں کی باطنی کیفیات اور ظاہری خصوصیات کو مصنف نے اچھی طرح بیان کیا ہے ۔ دونوں کے کرداروں میں بہت کچھ حقیقت پسندی ملتی ہے ۔ مرزا سعید کے ان دونوں ناولوں میں فنونِ لطیفہ پر جو بحثیں آتی ہیں وہ اردو ناول میں ایک نئی چیز ہیں پھر بھی مرزا سعید سے ان کی تعلیم و تربیت کو دیکھتے ہوئے جتنے عمدہ ناولوں کی توقع کی جا سکتی تھی، یہ دونوں تصانیف اس پر پوری نہیں اترتیں ۔

مرزا محمد سعید کے معاصرین میں بہت سے لوگوں نے ناول لکھے ۔ مگر ان میں جن لوگوں نے مقبولیت حاصل کی ان میں پنڈت کشن پرشاد کول، فیاض علی، محمد مہدی تسکین اور ظفر عمر کے نام ممتاز ہیں ۔

کشن پرشاد کول نے دو ناول لکھے ہیں، پہلا 'شاما' اور دوسرا 'سادھو اور بیسوا' ۔ دوسرا ناول انگریزی سے ماخوذ ہے ۔ 'شاما' بہتر تصنیف ہے، یوں بھی طبع زاد ہونے کی وجہ سے زیادہ اہم ہے ۔ یہ بھی مقصدی ناول ہے ۔ اس میں ہندو معاشرت کی بعض خرابیوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ۔ خصوصاً بچپن کی شادیاں ہدف تنقید بنائی گئی ہیں ۔ اس کے علاوہ ہندو عورت کے لیے طلاق دینے کی آزادی کا مطالبہ کیا گیا ہے ۔ سیدھے سادے پلاٹ کے اس ناول کا قصہ حقیقت پسندانہ ہے ۔

فیاض علی نے دو رومانی ناول 'شمیم اور انور' لکھے ہیں ۔ یہ اس قسم کے ناول ہیں جو اب اردو ادب میں بہت عام ہو گئے ہیں ۔ ان ناولوں میں کوئی خاص بات نہیں ۔ سیدھے سادے عشقیہ قصوں کی روایت کے آغاز کا سہرا ان کے سر ہے ۔

محمد مہدی تسکین نے تین ناول 'برف کی دیوی'، 'مستانہ اور حسن پرست' لکھے۔ 'برف کی دیوی' ایک انگریزی ناول کا آزاد ترجمہ ہے۔ باقی دونوں طبعزاد ہیں۔ ان میں بھی 'حسن پرست' قابلِ ذکر ہے۔ اس پر منشی سجاد حسین کے مزاحیہ ناولوں کی روایت کا اثر بہت گہرا ہے۔

ظفر عمر اردو میں جاسوسی اور اسراری ناول کی روایت کا آغاز کرنے والے ہیں۔ اس سے پہلے بھی جاسوسی ناول لکھے گئے مگر وہ تراجم تھے۔ ظفر عمر نے انگریزی کے جاسوسی ادب سے مدد ضرور لی ہے مگر ان کی مدد سے طبع زاد چیزیں لکھنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے مشہور ناول 'نیلی چھتری'، 'بہرام کی گرفتاری'، 'چوروں کا کلب' اور 'لال کٹھور' وغیرہ ہیں۔ ظفر عمر پولیس کے اعلیٰ عہدے دار تھے اس لیے جرائم اور ان کی نوعیت سے واقفیت رکھتے تھے تاہم ان کے ناولوں میں وہ تجسس اور تحیّر دکھائی نہیں دیتا جو اس طرح کے ناولوں کی لازمی صفت سمجھا جاتا ہے۔

بحیثیت مجموعی اس عرصہ میں بہت سے ناول نگار پیدا ہوئے۔ ان میں انفرادی صلاحیتیں کم تھیں۔ زیادہ تر نذیر احمد، سرسار اور شرر کے ناولوں کا تتبع کیا جاتا رہا۔ ناول کی روایت میں کچھ اضافہ کیا تو مرزا رسوا اور منشی سجاد حسین نے۔ باقی حضرات زیادہ تر مقلدین کی صف میں آتے ہیں۔ اس دور کے ناول نگار انگریزی ناول سے واقف تھے مگر انگریزی کے اول درجے کے ناول نگاروں سے متاثر ہونے کی بجائے انہوں نے ایسے ناول نگاروں کا تتبع کیا جن کی انگریزی ادب میں کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔ اس دور کے ناول یا تو اصلاحی ہیں یا رومانی۔ اصلاحی ناول نذیر احمد سے متاثر ہیں۔ رومانی ناولوں کی روایت اس دور کی رومانی تحریک ہی کی ایک شاخ ہے۔ تاریخی ناول کی روایت شرر سے شروع ہوتی ہے۔

بعض ناول نگاروں نے اپنے پیشروؤں سے آگے بڑھنے کی بھی کوشش کی ہے۔ موضوعات میں جنسی مسائل بھی آگئے ہیں، اگرچہ طوائف کا کردار 'فسانۂ مبتلا' میں بھی موجود ہے مگر اس زمانے میں رومانی تحریک کے زیرِ اثر طوائف سے خصوصی دلچسپی لی جانے لگی اور جنسیات اور اس کے متعلقات پر ذرا کھلے انداز میں لکھا جانے لگا۔ اس گروہ کی نمائندگی رسوا، عزیمی اور مرزا محمد سعید نے کی ہے۔ غرض ان ناول نگاروں نے اردو ناول میں فنی اضافے تو کم کیے ہیں البتہ ناول کی صنف کو مقبول بنانے میں حصہ لیا ہے اور نہ صرف عوام میں ناول کے مطالعے کا شوق پیدا کیا ہے بلکہ بہت سے لوگوں کو ناول نگاری کی طرف مائل کر دیا ہے۔

پندرھواں باب

صحافت

جنگ آزادی اور صحافت

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی ناکام ہوئی تو مسلمانوں پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹ پڑے ۔ اگرچہ جنگ آزادی میں برصغیر کی کئی اقوام شریک تھیں ، مگر مسلمان پیش پیش تھے ۔ اس لیے انگریزوں کا عتاب زیادہ تر مسلمانوں پر نازل ہوا ۔ صحافت کے میدان میں بھی مسلمانوں ہی کو زیادہ نقصان پہنچا ۔ غیر مسلم اخبارات نے مسلم اخبارات اور مسلمانوں کے خلاف سخت انتقامی کارروائیوں کا مطالبہ کیا ۔ 'لاہور کرانکل' نے ۸ جولائی ۱۸۵۷ء کی اشاعت میں لکھا "اب اس امر میں کوئی شبہ نہیں رہا کہ اس بغاوت کی تہہ میں مسلمانوں کی سازش کارفرما ہے ۔ انہیں شدید سے شدید سزا دینی چاہیے ، کیونکہ یہ جب تک مسلمان ہیں اپنی رائے کو نہ بدل سکتے ہیں نہ بدلیں گے" ۔ 'بنگال ہرکارو' نے ہر مسمار شدہ گرجے کے عوض پچاس مسجدیں مسمار کرنے اور اس مہم کا آغاز دہلی کی جامع مسجد سے کرنے کا مطالبہ کیا ۔ 'بمبئی ٹائمز' نے خون کے بدلے خون کا نعرہ لگایا ۔ غرض مارگریٹا بارنز کے الفاظ میں "اینگلو انڈین اخبارات کا لب و لہجہ انتہائی خوفناک تھا ۔ عیسائیوں اور انگریزوں کی طرف سے خونریزی و غارت گری کا جتنا شدید مطالبہ کیا گیا اس کی مثال نہیں ملتی ۔ ہیبرٹ (Hebert) اور مارات (Marat) کے بے رحم اور سنگدل اخبارات نے انقلاب فرانس کے دوران جو کچھ شائع کیا تھا وہ اس کے مقابلے میں ہیچ تھا ، جو کلکتے کے بعض اخبارات نے جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد چھاپا"(۱) ۔ چنانچہ برصغیر میں مسلمانوں کی داروگیر کے نتیجہ میں مسلم صحافت بھی متاثر ہوئی ۔ بیشتر مسلم اخبارات بند کر دیے گئے اور ان کے مدیروں کو جیلوں میں ڈال دیا گیا ۔ 'دہلی اردو اخبار' کے ایڈیٹر مولانا محمد باقر کو پرنسپل دہلی کالج مسٹر ٹیلر کے قتل کی سازش میں حصہ لینے کے الزام میں گولی مار دی گئی ۔ مولانا محمد حسین آزاد گرفتاری سے بچنے کے لیے روپوش ہو گئے ۔ نٹراجن کے الفاظ میں "۱۸۵۳ء میں اردو زبان کے اخبارات کی تعداد ۳۵ تھی ۔ ۱۸۵۸ء کی فہرست میں صرف بارہ اخبار رہ گئے ۔ ان میں چھ پہلے اخبار تھے اور چھ نئے ۔ ان بارہ اخباروں میں سے صرف ایک اخبار کی ادارت ایک مسلمان کے پاس تھی"(۲) ۔ گویا جنگ آزادی کی ناکامی کے نتیجے میں

---

(۱) Barns, Margartta : *The Indian Press*, P. 249, George Allen and Unuin Ltd., 1940.

(۲) Natrajan, S. : *A History of the Press in India*, P. 54. Asia Publishing House, 1962

مسلم صحافت عملی طور پر ختم ہو گئی ۔

جنگِ آزادی کے بعد جو اردو اخبارات جاری ہوئے ان کے مالک اور مدیر غیر مسلم تھے اور ان اخبارات کا لہجہ خوشامدانہ تھا ۔ بدر شکیب اس سلسلے میں رقم طراز ہیں : ". . . . . ہنگامہ خیز زمانے میں یا تو اکثر و بیشتر (اردو) اخبارات بند ہو گئے یا ملک کے بدلے ہوئے حالات قانون اور دار وگیر کے خوف نے ان کے لہجے میں اعتدال پیدا کر دیا"(۱) ۔ نٹراجن نے اخبارات کے لہجہ میں تبدیلی کا سبب یوں بیان کیا ہے ۔ "اردو ادب کے مراکز لکھنؤ ، دہلی ، میرٹھ اور کانپور جنگِ آزادی کی ہولناکیاں بہت قریب سے دیکھ چکے تھے اور اب ان میں سیاسی حرفت کا یارا نہیں تھا ۔ کلکتہ میں انگریزی اور بنگالی نے فارسی اور اردو کو نکال باہر کیا تھا"(۱) ۔ ان حالات میں جو صحافت باقی رہی وہ ہندو صحافت تھی جسے حکومت کی سرپرستی حاصل تھی ۔

۱۸۵۷ء سے پہلے اردو ادبی زبان تھی جس میں شعری تخلیقات زیادہ تھیں اور نثری کم ، نثری تخلیقات زیادہ تر ادبی نوعیت ہی کی تھیں ۔ چنانچہ ۱۸۵۷ء سے پہلے کی اردو صحافت زبان اور اسلوب کے لحاظ سے ادب سے زیادہ مختلف نہیں تھی ۔ خبروں تک میں زبان خالصتاً ادبی ہوتی تھی ۔

جنگِ آزادی کی ناکامی کے بعد جاری ہونے والے ہندو اخبارات میں سے 'اودھ اخبار' بطور خاص قابلِ ذکر ہے ۔ یہ اخبار منشی نول کشور نے ۱۸۵۸ء میں لکھنؤ سے ہفت روزہ کی صورت میں جاری کیا ۔ ابتدا میں یہ چار صفحات پر مشتمل ہوتا تھا ، لیکن رفتہ رفتہ اس کی ضخامت ۴۸ صفحات تک پہنچ گئی اور گارساں دتاسی کو یہ کہنا پڑا "میرے خیال میں اس سے زیادہ ضخیم اخبار ہندوستان بھر میں کوئی نہیں"(۲)۔ اس اخبار میں مولوی غلام محمد خان تپش ، تابند ، غالب احمد حسن شوکت ، عبدالحلیم شرر ، سید امجد علی اشہری ، مرزا حیرت دہلوی ، پنڈت رتن ناتھ سرشار اور مولانا جالب دہلوی ایسے لوگ کام کرتے تھے ۔ ۱۸۷۱ء میں یہ اخبار ہفتے میں دو بار شائع ہونے لگا اور مندرجات کی صحت اور وقعت کے لحاظ سے اہم تصور ہونے لگا ۔ ۱۸۷۳ء میں یہ روزنامہ بن گیا ۔

'اودھ اخبار' پالیسی کے اعتبار سے معتدل اور غیر فرقہ وارانہ اخبار تھا ۔ اس کا کوئی خاص سیاسی مسلک نہیں تھا ۔ اس کے پہلے ایڈیٹر منشی غلام محمد خان تپش تھے ۔ ۱۸۷۸ء میں پنڈت رتن ناتھ سرشار اس کے ایڈیٹر مقرر ہوئے اور ان کا 'فسانۂ آزاد' اس میں بالاقساط چھپنے لگا، جس سے اخبار کی مقبولیت دو چند ہو گئی ۔ اگرچہ پنڈت رتن ناتھ سرشار یکم فروری ۱۸۸۰ء

---

(۱) بدر شکیب ، اردو صحافت ۔ ص ۱۹۹ ۔ کاروان ادب کراچی ۱۹۶۲ء ۔

(۲) *A History of the Press in India.* P 103.

کو اخبار سے الگ ہو گئے ، مگر اس کے بعد بھی 'فسانۂ آزاد' بالاقساط اخبار میں چھپتا رہا ۔ کچھ عرصہ مولانا عبدالحلیم شرر بھی اس اخبار سے وابستہ رہے ۔ اس اخبار کے مندرجات میں ادبیت جھلکتی ہے ۔

'اودھ اخبار' کی اپنے ہمعصر 'پنچ' اخباروں سے نوک جھونک بھی ہوتی رہتی تھی ۔ خصوصاً 'اودھ پنچ' سے قلمی جھڑپیں جاری رہتیں ۔ اس سلسلے میں 'اودھ اخبار' کی ۲۸ جولائی ۱۸۸۰ء کی اشاعت سے ایک مضمون کا اقتباس ملاحظہ ہو ۔

> ''ہندوستان میں اخباروں کا جاری ہونا آج کل کیمیا کی بوٹی ہو رہا ہے ہم خرما و ہم ثواب کا مزہ آ رہا ہے ۔ یعنی اخبار جاری کیا اور نامور ہو گئے ...... بوسیدہ لکڑی کا ایک چرخ چوں چرخا رکھ لیا اور قلم کے تکلے پر پرانی دھرانی روئی کا سوت کاتنا شروع کر دیا ۔ نہ کوئی ایڈیٹر نہ منیجر نہ پبلشر نہ منتظم ، سب کے سب غائب غلہ مگر گلے سڑے گندے مضامین کی کھیپ اور پوٹ پوٹ گٹھڑے کے گٹھڑے خالی گنج کی ٹرین سے لدا لد چلے آتے ہیں...... معلوم نہیں ان لوگوں نے کون سا افسوں یاد کر رکھا ہے کہ اس کے اثر سے ہندوستان میں ان کا گروہ بڑھتا جاتا ہے''۔

'اودھ اخبار' ایک معیاری اخبار تھا جس میں قومی اور بین الاقوامی خبریں ، خبروں کے پس منظر پر بہت سے مضامین اور عام سیاسی و معاشرتی امور پر مختلف النوع مواد موجود ہوتا تھا ۔ انگریزی اخباروں خصوصاً 'لنڈن ٹائمز' سے بھی اچھے اچھے مضامین ترجمہ کر کے شائع کیے جاتے تھے ۔

سر سید احمد خان اور صحافت

'اودھ اخبار' کو شہرت اور مقبولیت اس وقت حاصل ہوئی جب وہ سہ روزہ بلکہ روز نامہ بنا ۔ جنگِ آزادی کے بعد جو دوسرے غیر مسلم اخبارات جاری ہوئے ان میں سے کوئی بھی غیر معمولی اور اہم نہیں تھا ۔ جنگِ آزادی کے بعد مسلم صحافت کے دوسرے دور بالخصوص اردو صحافت کے دوسرے دور کا آغاز سر سیّد احمد خان نے کیا ۔ سر سید احمد مفکر ، عالم ، مصلح اور راہنما تھے اور مسلمانوں کی اصلاح اور ان کی بقاء ان کا مقصودِ نظر تھا ۔ پہلے انہوں نے ''رسالہ اسبابِ 'بغاوتِ ہند' لکھ کر انگریزوں کو 'جنگِ آزادی' کے صحیح اسباب بتانے کی اور مسلمانوں کو انگریزوں کے وحشیانہ انتقام سے بچانے کی کوشش کی پھر مسلمانوں کی اصلاح کے لیے صحافت کے میدان میں داخل ہونے کا فیصلہ کیا ۔ پہلے انہوں

نے مسلمانوں میں جدید علوم حاصل کرنے کی ضرورت کا شعور پیدا کرنے کے لیے سائنٹفک سوسائٹی قائم کی پھر اسی سوسائٹی کے زیر اہتمام 'اخبار سائنٹفک سوسائٹی' (جو بعد ازاں علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ بن گیا) جاری کیا

اخبار سائینٹیفک سوسائٹی

یہ اخبار ۱۸۶۶ء میں علی گڑھ سے ہفت روزہ کی صورت میں جاری ہوا۔ بعد ازاں سہ روزہ ہو گیا۔ یہ انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں شائع ہوتا تھا، اور اس کا مقصد انگریزوں اور ہندوستانیوں دونوں طبقوں کو متوجہ اور متاثر کرنا تھا۔ سر سید احمد خان کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ مسلمان جب تک جدید علوم و فنون نہیں سیکھیں گے، اس وقت تک ان کی حالت نہیں بدل سکتی اور جدید علوم و فنون سیکھنے کے لیے حکمرانوں کی زبان سیکھنا اور ان سے مصالحت کرنا ضروری ہے۔ چنانچہ وہ ایک طرف تو مسلمانوں میں بالخصوص اور ہندوستانیوں میں بالعموم یہ احساس پیدا کرنا چاہتے تھے کہ زمانے کے تقاضوں کو سمجھنا اور پورا کرنا ضروری ہے۔ دوسری طرف وہ انگریزوں کو ہندوستانیوں خصوصاً مسلمانوں کے مسائل اور احساسات سے آگاہ کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے سائینٹفک سوسائٹی میگزین کو اس مقصد کے لیے وقف رکھا۔ اس اخبار میں انگریزی اور اردو عبارتیں ساتھ ساتھ شائع ہوتی تھیں۔ انھوں نے اس اخبار کو خبروں کی صحت کے اعتبار سے اس مقام پر پہنچا دیا جہاں پہلے کوئی اردو اخبار نہیں پہنچا تھا، علاوہ ازیں انھوں نے اپنے مدلّل منطقی عام فہم اداریوں، تبصروں اور مضامین سے اخبار کو مفید اور وقیع بنایا۔ مولانا الطاف حسین حالی نے 'حیاتِ جاوید' میں اس اخبار کے متعلق لکھا ہے کہ:

> "اس میں سوشل، اخلاق، علمی اور پولیٹیکل ہر قسم کے مضامین برابر چھپتے تھے ...... انگریزی اخباروں سے عمدہ عمدہ آرٹیکل جو معاملاتِ ہندوستان سے علاقہ رکھتے تھے برابر ترجمہ ہو کر اس میں چھاپے جاتے تھے۔ ہندوستان کے طریقِ معاشرت یا تعلیم کے متعلق جتنے لیکچر سوسائٹی میں دیے جاتے وہ سب اس کے ذریعے سے شائع ہوتے تھے ...... اگرچہ یہ اخبار ملک کی سوشل اصلاح کا ہمیشہ ایک عمدہ آسرا رہا ہے اور اول اول کئی سال تک جس قدر زمانۂ حال کی نئی اصلاحیں اس کی بدولت ہندوستانیوں کو حاصل ہوتی رہی ہیں ان کے لحاظ سے یہ کہنا کچھ مبالغہ نہیں ہے کہ کم سے کم شمالی ہندوستان میں عام خیالات کی تبدیلی اور معلومات کی ترقی اس پرچہ کے اجراء سے شروع ہوئی ہے مگر، اس کے ساتھ ہی پولیٹیکل معاملات میں جو وقعت اور اعتبار اس پرچے نے گورنمنٹ

اور حکام کی نظر میں حاصل کیا وہ آج تک کسی دیسی اخبار نے حاصل نہیں کیا''۔

سر سید خان چاہتے تھے کہ مسلمان انگریزوں سے مصالحت کریں۔ جدید علوم سیکھیں اور انگریزی جانیں تا کہ ترقی کر سکیں۔ اگرچہ سر سید احمد خان کے مخالفین نے ان پر انگریزوں کی طرفداری اور خوشامد کا الزام عائد کیا مگر ۱۸۵۷ء کی سولنکیوں کے بعد اگر کسی شخص نے حکومت کے طور عمل اور انگریزوں کے اقدامات پر سب سے پہلے جرأت سے تنقید کی تو وہ سر سید ہی تھے ۔ ''یہ خبریں ہم کو اسی طرح پہنچتی ہیں جس طرح شکار کے موسم میں یہ خبریں پہنچتی ہیں کہ فلاں صاحب نے آج ایک ہرن مارا چنانچہ فنر صاحب کے مقدمہ کے بعد ایک خبر دناپور کے صاحب کی پہنچی جنہوں نے ایک پنکھا قلی کو مارے لاتوں کے جان سے مار ڈالا۔ دوسری خبر ان صاحب کی پہنچی جنہوں نے ایک ملاح کو راہ گزارنے عالم بقا کیا۔ تیسری خبر لکھنؤ کے حویلدار کی پہنچی جس نو شوقین گوروں نے بندوق سے شکار کیا ...... غرض کہ یہ خبریں قتل کی ہیں ، جن میں چند ہندوستانی مقتول اور چند صاحب بہادر قاتل ہیں اور ان جملہ مقدمات میں اب تک یہ معلوم نہیں ہوا کہ قاتلوں سے کیا مواخذہ ہوا''(۱)۔ ''اور ہندوستانی کتنے ہی علوم و فنون میں کمال حاصل کریں اور کتنے ہی دیانت دار اور خوش کردار ہو جائیں مگر وہ انگریزوں کے نزدیک بے ایمان اور غیر مہذب ہی رہیں گے اور انگریز چاہے جتنی ہی بد افعالیاں کریں مگر وہ شریف کے شریف ہی ہیں''(۲)۔

اخبار سائنٹفک سو سائٹی $\frac{۱۸\times۲۲}{۴}$ کے سولہ صفحات پر مشتمل ہوتا تھا ۔ کچھ صفحات پر انگریزی اور اردو کا مواد برابر دیا جاتا تھا ۔ مگر کچھ صفحات صرف اردو متن کے لیے وقف ہوتے تھے ۔ مواد خبروں ، اداریوں ، شذروں اور عمومی و خصوصی نوعیت کے اداریوں پر مشتمل ہوتا تھا ۔ یہ اخبار سرسید احمد خان کی وفات کے بعد بھی جاری رہا ۔

تہذیب الاخلاق

۱۸۶۹ء میں سرسید احمد خان انگلستان گئے وہاں انہوں نے رچرڈ سٹیل اور جوزف اڈیسن کے اخبارات 'دی سپکٹیٹر' کے متعلق بہت کچھ سنا اور انہیں پڑھا ۔ چنانچہ انہوں نے وہیں یہ ارادہ کر لیا کہ وہ بھی ان پرچوں کے انداز کا ایک رسالہ نکالیں گے ۔ واپس آ کر انہوں نے ۲۴ دسمبر ۱۸۷۰ء کو 'تہذیب الاخلاق' جاری کیا ۔ یہ ماہوار رسالہ تمام تر اردو میں ہوتا تھا اور $\frac{۱۸\times۲۲}{۴}$ کے بارہ

---

(۱) اخبار سائینٹفک سوسائٹی ، ۱۵ ستمبر ۱۸۷۶ء ، جلد ۱۱ ، نمبر ۳۵ -
(۲) اخبار سائینٹفک سوسائٹی ، ۲۳ دسمبر ۱۸۷۵ء -

صفحات پر مشتمل ہوتا تھا ۔کبھی کبھی صفحات آٹھ ہوتے تھے ۔ 'تہذیب الاخلاق' اپنے مفید مضامین کی وجہ سے بہت مشہور ہوا ۔ زیادہ تر مضامین سرسید احمد خاں خود لکھتے تھے ۔

اخبار سائنٹفک سوسائٹی کے بر عکس 'تہذیب الاخلاق' کا مقصد مسلم معاشرے کی اصلاح تھا ۔ انھوں نے 'تہذیب الاخلاق' کے پہلے شمارہ میں تمہید کے زیر عنوان مسلمانوں کی اصلاح کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے لکھا تھا ''.... بس ہمارا مطلب ہندوستان کے مسلمان بھائیوں سے ہے اور اسی مقصد کے لیے یہ پرچہ جاری کرتے ہیں تا کہ بذریعہ اس پرچہ کے جہاں تک ہو سکے ان کے دین و دنیا کی بھلائی میں کوشش کریں'' ۔ 'تہذیب الاخلاق' میں سرسید احمد خاں اور ان کے رفقاء نے جتنے مضامین چھپے ان میں خیالات ، رسم و رواج ، طرز عمل اور معاشرت کی اصلاح پر زور دیا گیا اور ہر معاملہ میں عقلی اور تنقیدی انداز فکر اختیار کرنے کی تلقین کی گئی ۔ چھ سال سات ماہ بعد 'تہذیب الاخلاق' بند ہوگیا ۔ اس عرصہ میں اس میں ۲۲۶ مضامین شائع ہوئے ۔ ان میں سے ۱۱۲ سرسید احمد خاں نے لکھے تھے ۔ تین سال بعد یہ رسالہ دوبارہ جاری ہوا مگر پھر دو سال پانچ ماہ بعد بند ہوگیا ۔ تقریباً چودہ سال بعد یہ تیسری بار شروع ہوا مگر تین سال کے بعد ختم ہو گیا ۔ اس کی بار بار بندش کی وجہ سرسید احمد خاں کی گوناگوں مصروفیات تھیں ۔

خالدہ ادیب خانم نے (Inside India) میں لکھا ہے کہ ''سرسید کو کسی پہلو سے دیکھا جائے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک بڑا سا پتھر ہندوستان کی اسلامی سوسائٹی کے ٹھہرے ہوئے پانی میں لڑھکا دیا گیا ہے ۔ اس نے جو لہریں اٹھائیں وہ اب تک حرکت میں ہیں ۔ خواہ ان کی سمت ہمیشہ وہ نہ رہی ہو جو سرسید پسند کرتے تھے ۔ سرسید احمد خاں کے اخبارات سائنٹفک سوسائٹی اور 'تہذیب الاخلاق' بھی گویا ایسے پتھر تھے جو برصغیر کی اردو صحافت کے ٹھہرے ہوئے پانی میں لڑھکا دیے گئے تھے'' ۔ سرسید کے ان اخبارات نے ہمعصر اردو صحافت کو بہت متاثر کیا ۔ مولانا الطاف حسین حالی نے 'حیاتِ جاوید' میں لکھا ہے کہ سرسید احمد خاں کے اخبارات کے بعد جاری ہونے والے اخبارات سے موازنہ کیا جائے تو ''صاف معلوم ہو جائے گا کہ اردو اخبارات نے ان پرچوں سے کیا سبق حاصل کیا ہے'' ۔ سرسید کے اخبارات نے اردو زبان کی بھی بڑی خدمت کی ۔

سرسید احمد خاں اور ان کے رفقاء کے سامنے ایک واضح نصب العین تھا ، جسے وہ دوسروں تک پہنچانا چاہتے تھے ۔ ان کے خیال میں قدیم انداز نگارش جس کا بنیادی مقصد محض ذہنی عیاشی ہو کر رہ گیا تھا مفید نہ ہو سکتا تھا ۔ اس سے قبل صحافت شاعرانہ انداز بیان لیے ہوئے تھی اور یہ چیز مسائل پر غور اور علوم کے اردو میں ڈھالنے کے راستے میں رکاوٹ تھی ۔ سرسید نے صحافت میں علم کا پیوند لگایا ۔ ان کے ساتھ ساتھ نواب محسن الملک ، نواب وقارالملک ، مولوی چراغ علی ، مولوی ذکاء اللہ دہلوی ، مولانا نذیر احمد ، علامہ شبلی ، مولانا حالی اور بہت سے دوسرے زعما بھی تھے جو نہ صرف مضامین و مقالات کے ذریعے براہِ راست بلکہ الگ الگ طور پر ان علمی و

۔ مقالات کے ذریعے بالواسطہ طور پر بھی اردو صحافت و ادب کی اصلاح میں شریک تھے ۔ ان تحریروں میں سادگی ، متانت اور جامعیت کے عناصر ملتے ہیں اور یہی عناصر دورِ سرسید کی صحافت اور ادب کے بنیادی عناصر ہیں ۔ اگرچہ بعض نقادوں کی رائے میں سرسید احمد خان کی زبان ادبی چاشنی سے محروم ہے اور انگریزی الفاظ کے استعمال نے اسے عجیب و غریب بنا دیا ہے ، مگر ان کی تحریر کا یہ عیب تحریر کی خوبیوں کے مقابلے میں ذرا نظر نہیں آتا ۔

سرسید احمد خان نے اختتامی سال ۱۸۷۴ء/۱۲۹۱ھ میں خود اس سلسلے میں لکھا تھا کہ 'جہاں تک ہم سے ہو سکا ہم نے اردو زبان کے علم و ادب کی ترقی میں اپنے پرچوں کے ذریعے سے کوشش کی ۔ مضمون کے ادا کا ایک سیدھا اور صاف طریقہ اختیار کیا جہاں تک ہماری کج مج زبان نے یاری دی الفاظ کی درستی ، بول چال کی صفائی پر کوشش کی ۔ رنگینی' عبارت جو تشبیہات اور مضامین خیالی سے بھری ہوتی ہے اور اس کی شوکت صرف لفظوں ہی لفظوں میں رہتی ہے اور دل پر اس کا کچھ اثر نہیں ہوتا ، پرہیز کیا ۔ تک بندی سے کہ وہ اس زمانہ میں مقفیٰ عبارت کہلاتی تھی ، ہاتھ اٹھایا اور جہاں تک ہو سکا سادگی' عبارت پر توجہ کی'' ۔

اودھ پنچ اور مزاحیہ صحافت

جس وقت سر سید احمد خان کے زیرِ اثر اردو صحافت مندرجات کے اعتبار سے سنجیدہ ہوتی جا رہی تھی ، عین اس وقت ایک مکتبِ فکر غیر سنجیدگی اور مزاح کی روش پر گامزن تھا ۔ یہ مکتبِ فکر مزاحیہ اخبارات کا تھا جس کا سرخیل 'اودھ پنچ' تھا ۔ انیسویں صدی میں انگلستان میں 'لنڈن پنچ' نے مزاحیہ صحافت کا ڈول ڈالا اور اس کا انداز بہت مقبول ہوا ۔ چنانچہ نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان میں بھی پنچ اخباروں کا سلسلہ شروع ہو گیا ۔ ۱۸۵۹ء میں مدراس سے 'مدراس پنچ' کا اجراء ہوا جس کے مالک شاہ محمد صادق حسینی شریف ، مہتمم جعفر حسین حسینی شریف اور مدیر غلام محی الدین چشتی تھے ۔ یہ اخبار اپنا رنگ نہ جما سکا ۔ ۱۸۷۶ء میں 'روہیل کھنڈ پنچ' جاری ہوا ۔ اسی سال پٹنہ سے 'بہار پنچ' نکلا ۔ جنوری ۱۸۷۷ء میں لکھنؤ سے 'اودھ پنچ' منظرِ عام پر آیا اور ۱۹۱۲ء تک جاری رہا ۔ اس کے مدیر منشی سجاد حسین تھے ۔ لکھنے والوں میں مرزا مچھو بیگ ستم ظریف (مرزا مرتضیٰ) ، نواب سید محمد آزاد ، پنڈت تربھون ناتھ ہجر ، منشی جوالا پرشاد برق ، منشی احمد علی شوق ، منشی احمد علی کسمنڈوی اور اکبر الہ آبادی قابلِ ذکر ہیں ۔ یہ اخبار ۱۲'' × $\frac{1}{2}$۹'' سائز کے آٹھ صفحات پر چھپتا تھا ۔ سر ورق پر چھوٹے چھوٹے کئی کارٹون ہوتے تھے ۔ اندر کے صفحات پر مضامین ، نظمیں اور خبریں درج کی جاتی تھیں اور کئی کارٹون بھی دیے جاتے تھے ۔ بعض کارٹون 'لنڈن پنچ' سے نقل شدہ ہوتے تھے ۔

'اودھ پنچ' ہندو مسلم اتحاد کا حامی اور انڈین نیشنل کانگریس کا موید تھا ۔ 'اودھ اخبار' کے برعکس بیباکانہ تنقید کرتا تھا ۔ مغربی تہذیب کا مخالف تھا ۔ چونکہ سر سید احمد خان مصالحانہ

پالیسی کے داعی اور علمبردار تھے اس لیے یہ اخبار اپنے رنگ میں ان پر بھی تنقید کرتا تھا۔ اگرچہ اس کا انداز مزاحیہ ہوتا تھا مگر اس میں گہرا طنز موجود ہوتا تھا، مثلاً ''دیسی توجہ نقص طریقہ تعلیم سرکاری اکیس سال کے سن تک سول سروس کا امتحان دینے کی اہلیت نہیں رکھتے اور اس سول سروس کے میوے کو ہندوستان کی آب و ہوا موافق نہیں، لہذا یہ ولایتیوں کے لیے مخصوص ہے۔ چونکہ دیسیوں کا کم وزن ہوتا ہے اور کم وزن اور چھوٹا سر حماقت کی نشانی ہے لہذا دیسی احمق ہیں۔ اس واسطے دیسیوں کی رائے قابل مضحکہ ہے اور مضحکہ چونکہ ذلیل کرتا ہے لہذا دیسی ذلیل ہو گئے''[۱]۔

اودھ پنچ کے اثرات

یہ اخبار اس اعتبار سے بہت اہم تھا کہ اس نے مزاحیہ صحافت کو ایک تحریک سا دیا اور تنقید و مضحکہ اڑانے میں کارٹون استعمال کیے، سیاسی و معاشرتی مسائل پر کھل کر تنقید کی۔ 'اودھ پنچ' کی مقبولیت کا اثر ہوا کہ جگہ جگہ سے پنچ اخبار جاری ہونے لگے اور تھوڑے ہی عرصہ میں بیسیوں مزاحیہ اخبار منظر عام پر آ گئے۔ مثلاً 'سرپنچ ہند' لکھنؤ، 'پنجاب پنچ' لاہور، 'کلکتہ پنچ'، 'انڈین پنچ'، 'دہلی پنچ'، 'بنگال پنچ'، 'فتنہ اوا آدم پنچ'، 'بنارس پنچ'، 'راجپوتانہ پنچ'، 'میرٹھ پنچ'، 'سرپنچ'، کشمیر پنچ'، 'ہریانہ پنچ'، 'کرناٹک پنچ، دکن پنچ'، 'فتح گڑھ پنچ'، 'جالندھر پنچ'، 'آگرہ پنچ' وغیرہ وغیرہ۔ ان میں سے بیشتر اخبار ہفت روزہ تھے اور 'اودھ پنچ' کے مقلد ان۔ میں سے ریاض خیر آبادی کا 'فتنہ' (جو ۸ جولائی ۱۸۸۲ء کو گورکھپور سے جاری ہوا) واقعی فتنہ تھا۔ یہ اخبار اپنی تیزی و طرّاری کے باعث نسبتاً زیادہ مقبول ہوا۔ مزاحیہ صحافت کا یہ زور انیسویں صدی کے آخر میں جا کر ٹوٹا۔

'اودھ پنچ' نے اردو زبان و ادب کی اصلاح میں بھی اہم حصہ لیا۔ چکبست کے الفاظ میں ''اودھ پنچ کی یادگار خدمت یہ ہے کہ اس نے اردو نثر کو اس کا مصنوعی زیور اتار کر جس میں سوائے کاغذی پھولوں کے کچھ نہ تھا، ایسے پھولوں سے آراستہ کیا جن میں قدرتی لطافت کا رنگ موجود تھا''[۲]۔ ادبی اعتبار سے 'اودھ پنچ' کی ظرافت بلند پایہ نہیں تھی۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے بقول ''اودھ پنچ کی ظرافت بڑی حد تک ادبی عناصر سے تہی اور سستی قسم کے ہزل اور پھکڑ پن سے زیادہ قریب ہے''[۳]۔

---

(۱) اودھ پنچ۔ اشاعت ۲۸ اگست ۱۸۷۷ء۔

(۲) مضامین چکبست۔

(۳) وزیر آغا، اردو ادب میں طنز و مزاح۔ ص ۱۴۹۔

انجمنوں کے رسائل

۱۸۶۴ء میں ڈاکٹر لائٹنر (Leitner) کی سرپرستی میں 'انجمن اشاعت مطالب مفیدہ پنجاب' قائم ہوئی جو بعد ازاں یہ 'انجمن پنجاب' کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس انجمن کے اغراض و مقاصد کی تکمیل کے لیے ۱۸۶۵ء میں 'رسالہ انجمن اشاعت مطالب مفیدہ' جاری کیا۔

اس رسالے کی ادارت مولانا محمد حسین آزاد کے پاس تھی۔ جو یونیورسٹی کالج کے شعبۂ عربی سے منسلک تھے۔ اس رسالے میں انجمن کی معمول کارروائی کے ساتھ ساتھ علمی و ادبی مضامین بھی شائع ہوتے تھے۔ کبھی کبھی کچھ مواد انگریزی میں بھی اور گورمکھی میں بھی چھپ جاتے تھے۔ ۱۸۷۰ء میں یہ رسالہ بند ہو گیا اور اس کی جگہ 'ہائے پنجاب' جاری ہوا۔ مگر ۱۸۷۱ء میں اخبار 'انجمنِ پنجاب' نے 'ہائے پنجاب' کی جگہ لے لی۔ اس اخبار کو حکومت کی سرپرستی حاصل تھی۔ اس کی عبارت سولہ صفحات تھی۔ مدیر ماسٹر پیارے لال آشوب اور مدیرِ معاون محمد حسین آزاد تھے۔ اس میں علمی مضامین 'مراسلات' انگریزی اور عربی اخبارات کے تراجم غرض ہر طرح کا مواد چھپتا تھا۔

جس طرح 'اودھ پنچ' کی تقلید میں بہت سے پنچ اخبار جاری ہوئے تھے۔ اسی طرح اخبار 'انجمنِ پنجاب' کی طرح کے بہت سے رسائل جاری ہوئے، جیسے اخبار 'انجمنِ ہند'، رسالہ 'انجمنِ اسلامی کلکتہ'، رسالہ 'انجمنِ رفاہ' گولکنڈہ، رسالہ 'انجمن مناظرہ' دہلی، رسالہ 'انجمنِ شاہ جہانپور'، رسالہ 'انجمنِ معبدِ عام' تصور، رسالہ 'انجمنِ اسلام' لکھنؤ، رسالہ 'انجمنِ تہذیب' کانپور، رسالہ 'انجمنِ زراعت' بجنور وغیرہ وغیرہ۔

دوسرے نمایاں اخبار

اس عرصے میں بہت سے اخبار بھی جاری ہوئے۔ گویا 'انجمنِ پنجاب' کی زبان میں جس کو کوئی پیشہ نہیں ملتا تھا وہ اخبار نکال لیتا تھا۔ تاہم ان میں سے مندرجہ ذیل اخبار قابلِ ذکر ہیں:

لاہور

پنجابی اخبار

یہ اخبار منشی محمد عظیم نے ۱۸۵۶ء میں جاری کیا۔ اس سے پہلے آپ نے ۱۸۴۹ء میں لاہور کرانیکل نکالا تھا۔ 'پنجابی اخبار' کچھ عرصہ بعد بند ہو گیا اور ۱۸۶۵ء میں اسے دوبارہ جاری کیا گیا۔ اس کی ادارت حافظ عمر دراز کرتے تھے۔ اس کے صفحات ۱۰ (دس) اور سائز ۱۳×۱۰ تھا۔ مندرجات کے لحاظ سے یہ متین اور پالیسی

کے لحاظ سے غیر جانبدار تھا۔ اس میں خبروں، مراسلوں کے علاوہ لم سیاسی مضامین اور انگریزی اخبارات کے بعض مندرجات کے ترجمے شائع ہوتے تھے۔

آفتاب پنجاب

یہ اخبار دیوان سنگھ بوٹا نے یکم جولائی ۱۸۷۳ء کو لاہور سے ہفت روزے کی صورت میں جاری کیا۔ اس کے مدیر مولوی نبی بخش تھے۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید 'صحافت پاکستان و ہند میں' میں لکھتے ہیں: ''ابتدا میں اس کی پالیسی روادارانہ تھی لیکن اس صدی کے آخری سالوں میں یہ ایک خالص فرقہ پرست ہندو اخبار بن گیا۔ جب ہندو مسلم فسادات ہوتے یہ اخبار سارا قصور مسلمانوں پر ڈال دیتا'۔

رفیق ہند

یہ اخبار مولوی محرم علی چشتی نے ۵ جنوری ۱۸۸۴ء کو لاہور سے جاری کیا۔ یہ ہفت روزہ تھا اور مسلمانوں کے حقوق کا علمبردار۔ سر سید احمد خان کی تحریک کا سرگرم مؤید تھا، لیکن سر سید کے مذہبی عقائد کا مخالف تھا۔ اس میں واقعاتی خبریں اور ٹھوس مضامین شائع ہوتے تھے۔ یہ اخبار ۱۹۰۴ء میں بند ہو گیا۔

اکمل الاخبار

یہ اخبار ۱۸۵۷ء کی جنگ کے تھوڑی دیر بعد دہلی سے حکیم محمود خان نے جاری کیا۔ ایڈیٹر منشی بہاری لال مشتاق تھے۔ یہ متین اخبار تھا۔ میانہ روی کا قائل تھا۔ اگر کبھی تنقید کرتا تو نہایت لطیف پیرایہ میں۔ مثلاً اس کی ۲ اگست ۱۸۷۰ء کی اشاعت کا یہ اقتباس ''پایونیئر الہ آباد ناقل ہے کہ مغربی و شمالی صوبہ میں یہ خبر مشہور ہے کہ یہ نیا ٹیکس بہ سبب تشریف آوری ڈیوک آف ایڈنبرا کے لگا ہے اور ہم دعا کرتے ہیں کہ ملکہ معظمہ کو خدا اپنے لڑکوں سے اتنی محبت دے کہ آئندہ اپنے بچوں کو ہندوستان نہ بھیجیں''۔

قیصر الاخبار

یہ اخبار منشی سراج الدین احمد خان نے الہ آباد سے ہفت روزے کی صورت میں جاری کیا۔ اس میں مقامی خبریں کم اور غیر ملکی زیادہ چھپتی تھیں۔ مضامین کے علاوہ طنزیہ اشارات کی صورت میں سیاسی تبصرے شائع ہوتے تھے۔ اینگلو انڈین اخبارات اردو اخبارات کے خلاف جو زہر افشانی کرتے تھے یہ اس کا موثر جواب دیتا تھا

احسن الاخبار

یہ اخبار حاجی محمد کبیرالحق نے ۶ جنوری ۱۸۷۸ء کو الہ آباد سے ہفت روزے کی صورت میں جاری کیا ۔ اس میں خبریں اور مضامین زیادہ ہوتے تھے ۔ فارسی ، ترکی اور انگریزی اخباروں سے بھی خبریں ترجمہ کی جاتی تھیں ۔ پالیسی کے لحاظ سے معتدل تھا ۔ عالمِ اسلام کے متعلق معلومات اور خبریں زیادہ دیتا تھا ۔

مہذب

یہ اخبار یکم اگست ۱۸۹۰ء کو مولانا عبدالحلیم شرر نے ہفت روزے کی صورت میں لکھنؤ سے جاری کیا ۔ یہ مندرجات کے لحاظ سے اعلیٰ پایہ کا اخبار تھا ۔ اس میں اداریوں ، شذروں اور مضامین کو زیادہ جگہ دی جاتی تھی ۔ حکومت سے تعلقات کے بارے میں سر سید احمد خان کی پالیسی کا حامی تھا ، لیکن علی گڑھ تحریک کے خلاف تھا ۔ مسلمانوں کو کانگرس اور ہندوؤں سے الگ رکھنے کا حامی تھا ۔ مثال کے طور پر اس نے یکم ستمبر ۱۸۹۰ء کی اشاعت میں 'ہندو مسلمان' کے زیرِ عنوان لکھا :

> "ہندوستان کی پولیٹیکل قوت کا دار و مدار ان دونوں مذکورہ قوموں کے اتفاق پر ہے ۔ افسوس یہ ہے کہ اس وقت تک متواتر کوششیں کی گئیں کہ دونوں فریقوں میں ایک مضبوط اور ضروری نیشنیلٹی پیدا ہو ، لیکن تجربہ روز بروز بتاتا جاتا ہے کہ وہ سب کوششیں خاک میں مل گئیں اور کوئی نتیجہ نہیں پیدا ہوا"۔

اس میں علمی ، ادبی ، سیاسی ، تاریخی ، معاشرتی اور دینی ہر قسم کے مضامین چھپتے تھے ۔ ضخامت سولہ صفحات اور سائز $\frac{۱۸ \times ۲۲}{۴}$ تھا ۔

کشف الاخبار

یہ پرچہ بمبئی سے ۱۸۵۸ء میں جاری ہوا ۔ اس کے مدیر منشی امان علی لکھنوی تھے ۔ یہ آٹھ صفحات پر چھپتا تھا ۔ پہلے صفحہ پر منظوم اشعار چھپتے تھے ۔ جس میں اخبار کے کوائف اور محاسن بیان کیے جاتے تھے ۔

مدراس

شمس الاخبار

یہ اخبار مدراس سے ۱۸۵۹ء میں جاری ہوا اور نصف صدی سے زیادہ عرصہ زندہ رہا ۔ پہلے دس دن بعد چھپتا تھا ۔ پھر ہفت روزہ ہو گیا ۔ اس کے پہلے مدیر سید عبدالستار تھے ، بعد ازاں محمد نصیر الدین گھٹالہ مدیر مقرر ہوئے ۔ اس میں زیادہ تر مواد عربی ، فارسی اور ترکی اخباروں سے ترجمہ ہو کر چھپتا تھا ۔ ترکی کی حمایت میں لکھنے اور ۱۸۷۸ء کی جنگِ روم و روس میں ترکی کے لیے چندہ جمع کرنے پر سلطان عبدالحمید خان ثانی نے تمغۂ مجیدیہ عطا کیا ۔

جریدۂ روز گار

یہ اخبار ۱۸۷۵ء میں مدراس سے ہفت روزہ کی صورت میں جاری ہوا ۔ پہلے سید مرتضیٰ شاہ قادری اس کے مہتمم و منتظم تھے ۔ پھر محمد عبداللطیف نے انتظام و انصرام سنبھالا ۔ یہ سولہ صفحات پر چھپتا تھا ۔ اور اس میں سلطنتِ آصفیہ دکن کی خبریں بڑے اہتمام سے شائع ہوتی تھیں ۔ یہ ترکوں کی حمایت میں ہی خبریں اور مضامین شائع کرتا تھا ۔ اس عرصے میں مدراس سے 'اخبارِ صبح' عمدہ الاخبار 'اخبار کرزان' 'ظہیرالاسلام' 'مظہرالعجائب' 'تمغہ احسن الجرائد' اور متعدد دوسرے اخبار جاری ہوئے مگر مذکورہ اخبارات ان سب میں ممتاز تھے ۔

قاسم الاخبار

یہ اخبار ۱۸۹۵ء میں منشی محمد قاسم نجم نے جاری کیا ۔ اس کی ضخامت آٹھ صفحات تھی ۔ مندرجات کی صحت اور معیار کے لحاظ سے کامیاب اور اچھا اخبار تھا ۔ اس کے تبصرے خاصے وقیع ہوتے تھے ۔ بعض اوقات یہ دوسرے اخباروں مثلاً 'اخبار سائنٹفک سوسائٹی' وغیرہ سے اچھے مضامین نقل کر لیا کرتا تھا ۔

منشور محمدی

یہ اخبار محمد شریف نے ۱۸۷۲ء میں جاری کیا اور اس کا اصل مقصد ان عیسائی اخباروں کو جواب دینا تھا جو مسلمانوں اور اسلام کے خلاف گمراہ کن پراپیگنڈہ کرتے تھے ۔ شیخ رحیم بخش رئیس بٹالہ ، میرزا غلام احمد ، مولوی میرزا موحد جالندھری اور محمد علی کانپوری اس میں مستقل طور پر مضامین لکھا کرتے تھے ۔ سائز چھوٹا اور صفحات بارہ تھے ۔ مضامین کے علاوہ اس میں عالمِ اسلام خصوصاً ترکی کی خبریں بڑے اہتمام سے شائع ہوتی تھیں ۔

میسور اخبار

یہ اخبار ۱۸۷۳ء میں جاری ہوا ۔ اس میں خبریں اور مضامین بالاہتمام چھپتے تھے ۔ اور اور اس کے ادارتی تبصرے خاصے وقیع ہوتے تھے ۔ مثال کے طور پر ۲ جون ۱۸۷۵ء کے ایک اداریہ کا اقتباس یہ ہے ۔

> "اخباروں اور مطابع کو آزادی عنایت کرنا ۔ یہ بھی سرکار وقت کی ایک بڑی دانائی کی دلیل ہے ۔ اس سے حدان اخبار نویسوں کو فائدہ نہیں ۔ ہاں سرکار اور رعایا کے لیے یہ بڑے فائدہ کی بات ہے ۔ سچی سچی باتوں کا اظہار حکّام ماتحت کی کار روائیوں کا افشا رعایا کی مصیبتوں اور سرکار کی بعض غلطیوں کا اظہار بہ جز اس کے ہو نہیں سکتا کہ اخباروں کو آزادی ملے"

دکن کے اخبارات

دکن سے ۱۸۵۹ء میں ایک طبی رسالہ جاری ہوا ۔ ۱۸۷۳ء میں 'مخزن فوائد' ایک علمی رسالہ منظر عام پر آیا جس کے مدیر نواب عمادالملک مولوی سید حسن بلگرامی مقرر ہوئے ۔ ۱۸۷۷ء میں اردو اخبار 'خورشید دکن' جاری ہوا ۔ اس کے مدیر مرزا کاظم غازی تھے ۔ یہ اخبار ایک سال بعد بند ہوگیا ۔ ۱۸۷۸ء میں 'آصف الاخبار'، ۱۸۸۰ء میں 'شوکت اسلام' اور 'معلم شفیق'، ۱۸۷۵ء میں 'اخبار آصفی'، ۱۸۸۷ء میں 'دکن پنچ' 'افسر الاخبار' اور 'خیال محبوب'، ۱۸۸۹ء میں 'محبوب القلوب'، ۱۸۹۵ء میں 'ملک و ملت'، ۱۸۹۶ء میں 'نظارۂ عالم' جاری ہوئے ۔ دو فارسی اخبار 'شفق' اور 'سیدالاخبار' بالترتیب ۱۸۸۰ء اور ۱۸۹۵ء میں جاری ہوئے ۔ ان اخباروں میں سے 'شوکت اسلام' بطور خاص قابل ذکر ہے ۔ یہ آزادانہ پالیسی رکھتا تھا اور حکومت پر بیباکانہ تنقید کرتا تھا ۔

سجن لال کے الفاظ میں "انیسویں صدی کے وسطی زمانہ کو اردو کی نشاۃ ثانیہ کا دور کہا جا سکتا ہے ۔ اس دور میں اردو اخبارات نے بہت ترقی کی اور معاشرے، آرٹ اور لٹریچر پر گہرا اثر ڈالا ۔ ۔ ۔ ۔ ۱۸۵۸ء سے ۱۸۸۵ء تک کے عرصہ میں لاہور سے ساٹھ، دہلی سے تیس، لکھنؤ سے ستر اخبارات جاری ہوئے ۔ مراد آباد، آگرہ، میرٹھ، بمبئی، مدراس، حیدرآباد وغیرہ سے نسبتاً کم اخبار نکلے ۔ ۱۸۶۹ء میں یو پی میں ۲۶ اخبارات نکلے تھے جو ۱۸۷۰ء میں ۳۳ ہوگئے ۔

مگر ان اخبارات کی اشاعت محدود رہتی تھی ۔ سجن لال ہی کے بقول ۱۸۷۰ء کے ۳۳ اخبارات کی کل اشاعت ۵۰۹۷ تھی ان میں سے ۲۱۰۹ کاپیاں حکومت خریدتی تھی اور ۳۶۰ یورپی باشندے انفرادی طور پر اخبار خریدتے تھے ۔

روزانہ اخبارات

انیسویں صدی کے آخری ربع میں اردو صحافت میں ایک اور اہم تبدیلی رونما ہوئی ۔ یہ تبدیلی تھی روزانہ اخبارات کا اجرا ۔ اگرچہ اردو کا پہلا روزنامہ 'اردو گائیڈ' ۱۸۸۵ء میں کلکتہ سے جاری ہوا تھا ، لیکن مندرجات کے لحاظ سے یہ اپنے ہمعصر ہفت روزہ اخبارات سے مختلف نہیں تھا ۔ ۱۸۷۳ء میں 'اودھ اخبار' روزنامہ بن گیا ۔ یکم جنوری ۱۸۷۵ء کو 'روز نامچۂ پنجاب' جاری ہوا ۔ ۱۸۸۳ء میں لاہور سے ہفت روزہ 'شفیق ہند' کا اجرا ہوا تو کچھ مدت بعد اس کے ضمیموں کے طور پر دو روز نامے 'نسیم صبح' اور 'شام وصال' جاری ہوگئے ۔ پھر 'اخبار عام' بھی روزانہ چھپنے لگا ۔ ۱۸۸۰ء میں 'کوہ نور' روزنامہ بن گیا ۔ چند سال بعد روزانہ 'پیسہ اخبار' منظر عام پر آیا ۔ کلکتے سے 'آئینۂ تماشا' (۱۵ دسمبر ۱۸۸۲ء) 'پیک صبا' (۲۰ اپریل ۱۸۸۵ء) اور 'روزنامچۂ ملک' (یکم مئی ۱۸۸۵ء) جاری ہوئے ۔ لکھنؤ سے 'روزنامچۂ لکھنؤ' (یکم جنوری ۱۸۸۲ء) 'روزانہ' (۱۱ جون ۱۸۸۵ء) ، الہ آباد سے 'قیصرالہند' کا روزانہ ایڈیشن (یکم نومبر ۱۸۷۷ء) اور 'روزنامچۂ عالم' (یکم اکتوبر ۱۸۸۳ء) منظر عام پر آیا ۔ حیدر آباد دکن سے 'پیک آصفی' (جنوری ۱۸۸۳ء) 'سفیر دکن' (۱۸۸۸ء) 'شیر دکن' (۱۸۸۷ء)، مدراس سے 'اتحاد' (۱۸۸۵ء)، بمبئی سے 'خادم ہند' (۷ مارچ ۱۸۸۳ء)، پٹنہ سے 'بہار پٹنہ' (۱۸۷۶ء) نکلے ۔ اس کے بعد روزناموں کا اجراء ایک معمول بن گیا ۔ مذکورہ بالا روزناموں میں سے کچھ تو جلد ہی بند ہوگئے ۔ بعض چند سال تک زندہ رہے اور ان میں سے جن اخباروں نے زیادہ شہرت حاصل کی اور جنہوں نے جدید روزانہ اردو صحافت کی داغ بیل ڈالی وہ دو ہیں ۔ 'اخبار عام' اور 'پیسہ اخبار' ۔ بقول ڈاکٹر عبدالسلام خورشید (مرتب 'صحافت پاکستان و ہند میں') بر عظیم میں جدید صحافت کے علمبردار دو اخبار تھے ۔ اول 'اخبار عام' دوم 'پیسہ اخبار' ۔

اخبار عام

یہ اخبار پنڈت قلندر رام نے یکم جنوری ۱۸۷۱ء کو لاہور سے ہفت روزہ کی صورت میں جاری کیا ۔ کچھ عرصہ بعد یہ سہ روزہ اور بالآخر روزنامہ بن گیا ۔ اس کے ایڈیٹر پنڈت گوپی ناتھ تھے ۔ اس میں صفحہ اول پر ایک ایک یا دو دو سطر کی مختصر خبریں صفحہ ۲ پر شذرات اور دوسرے صفحات پر مفصل خبریں اور مضامین وغیرہ چھپتے تھے ۔ شذرات آسان اور عام فہم ہوتے تھے ۔ جیسے ۲۷ ستمبر ۱۸۸۳ء کی اشاعت میں شامل یہ شذرہ :

> ''عنقریب حکم جاری ہونے والا ہے کہ عدالتوں کے سمن بذریعہ ڈاک تقسیم ہوا کریں ۔ بیشک اس سے ہر قسم کی سہولت ہو جاوے گی ۔ بشرطیکہ غریب چٹھی رسالوں کی تنخواہوں کی طرف بھی عنایت کی توجہ کی جاوے ۔ ڈاک کا کام پچھلے دنوں جتنا کچھ کہ بڑھایا گیا ہے پیشتر سے دو چند ہے اور باوجود اس کے چٹھی

رسانوں کی تنخواہوں کے وہی تین کانے منتظمان کی ناقدر شناسی کی طرف انگلی کر رہے ہیں "۔

بعض اوقات اداریٰ شذرات خبروں پر تبصرہ کی بجائے صبر ، علم ، اخلاق جیسے عمومی اور اصلاحی موضوعات پر ہوتے تھے ۔ روزانہ 'اخبار عام' کچھ عرصہ بعد پھر سہ روزہ ہو گیا ۔ ۱۹۲۰ء میں یہ دوسری بار روزنامہ بنا مگر ایک ہی سال بعد پھر سہ روزہ ہو گیا ۔ آخر ۱۹۳۰ء میں بند ہو گیا ۔ اختر شہنشاہی کے مطابق "اردو پڑھنے والوں کے لیے اس سے بہتر اخبار ہندوستان میں وئی نہیں"۔

پیسہ اخبار

'پیسہ اخبار' ۱۸۸۷ء میں فیروز والا (ضلع گجرانوالہ) سے ہفت روزہ کی صورت میں جاری ہوا ۔ اس کے مالک و منتظم منشی محبوب عالم تھے جنہوں نے فیروز والہ ہی سے ۱۸۸۶ء میں ماہنامہ 'زمیندار' اور پھر ہفت روزہ 'ہمت' جاری کیا تھا ۔ 'پیسہ اخبار' اپنے اجراء کے چند سال بعد لاہور منتقل ہو گیا اور صدی کے آخری سالوں میں روزنامہ بن گیا اور مقبولیت اور شہرت میں 'اخبار عام' کو بھی مات کر گیا ۔ یہ اخبار متین اور سنجیدہ تھا ۔ مسلمانوں کے حقوق کا علمبردار تھا اور اس میں اخباریں غالب ہوتی تھی ۔ یہ پہلا اخبار تھا جسے کاروباری بنیادوں پر کامیابی سے چلایا گیا ۔ اشتہارات کی فراہمی کا خاطر خواہ انتظام کرکے آمدن بڑھائی گئی ۔ 'زمیندار' کے روزنامہ ہونے سے پہلے یہ اردو اخباروں میں ممتاز ترین اور مقبول ترین تھا لیکن جب 'زمیندار' مولانا ظفر علی خان کی آتش بار تحریروں سے مسلّح ہو کر میدانِ صحافت میں آیا تو 'پیسہ اخبار' ماند پڑ گیا اور آخر ۱۹۲۴ء میں بند ہو گیا ۔

'پیسہ اخبار' نے اگرچہ اردو صحافت کا روپ سنوارنے اور اسے تجارتی بنیادوں سے چلانے یں بھی نمایاں حصہ لیا اور خبروں کو معروضی بنا کر پیش کرنے اور شذرات کو جامع اور مؤثر بنانے میں بھی کردار ادا کیا ۔ مگر اس کی زیادہ یادگار خدمت یہ ہے کہ اس نے مکتبِ صحافت کا کام انجام دیا اور اس میں کئی ایسے لوگوں نے صحافتی تربیت حاصل کی جو بعد ازاں نامور صحافی اور ایڈیٹر بنے ۔ مثلاً لالہ دینا ناتھ نے 'پیسہ اخبار' سے وابستہ رہنے کے بعد 'ہندوستان' جاری کیا ۔ حکیم نبی بعد ازاں 'الحکماء' کے ایڈیٹر بنے ۔ منشی احمد دین نے بعد میں 'غمخوار' جاری کیا ۔ منشی محمد دین فوق نے بعد ازاں 'کشمیری' میگزین نکالا ۔ مولوی شجاع الدولہ نے اس اخبار میں تربیت حاصل کرکے 'ملّت' کی ادارت سنبھالی ۔ میر جالب دہلوی 'پیسہ اخبار' کے مدیر رہنے کے بعد 'ہمدرد' میں کام کرتے رہے ۔ پھر 'ہمدم' (لکھنؤ) کے ایڈیٹر مقرر ہوئے اور بعد ازاں اپنا اخبار 'ہمت' جاری کیا ۔

ہندوستان

'اخبار عام' اور 'پیسہ اخبار' کے بعد اور 'زمیندار' کے روزنامہ بننے سے پہلے جو روزنامہ اخبارات جاری ہوئے ان میں سے 'ہندوستان' اور 'مسلم گزٹ' قابل ذکر ہیں۔ 'ہندوستان' لالہ دینا ناتھ اور پریم بھیج دت نے ۱۹۰۴ء میں لاہور سے جاری کیا۔ یہ اخبار پالسی کے اعتبار سے نیشنلسٹ تھا۔ کچھ عرصہ اس کا روزانہ ایڈیشن 'دیپک' جاری ہوا جو ۱۹۱۵ء تک جاری رہا۔

مسلم گزٹ

یہ اخبار بیسویں صدی کے آغاز میں لکھنؤ سے جاری ہوا اس کے ایڈیٹر مولانا وحید الدین سلیم پانی پتی تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے ۲۹ دسمبر ۱۹۱۲ء کے 'الہلال' میں اس کے متعلق لکھا تھا ''مگر در حقیقت موجودہ تفسیرات کے ذکر میں سب سے زیادہ خصوصیت کے ساتھ 'مسلم گزٹ' لکھنؤ کا ذکر آنا چاہیے جس نے موجودہ سیاسی تغیرات خیالات کی تولید میں سب سے زیادہ حصہ لیا اور اس خدا پرستانہ دلیری اور حق گویانہ آزادی کے ساتھ صدا بلند کی کہ فی الحقیقت 'لا یخافون لومۃ لائم' کے نفوس خاص میں اس کا شمار ہے۔ ہم اپنے مخدوم دوست سے متمنّی ہیں کہ اپنے قلمی جہاد کو اور زیادہ محکم و شدید کریں وہ یقین کریں کہ حق اور سچائی کے لیے فتح ہے، باطل اور باطل پرستی کے لیے نہیں کہ 'ان الباطل کان زھوقا'۔

سہ روزہ اخبارات

بیسویں صدی کے آغاز میں روزانہ اخبارات کے اجراء کا رجحان عام ہوتا جا رہا تھا۔ اس لیے اس دور میں بعض ہفت روزہ اخبارات اگر روزنامے نہ بن سکے تو سہ روزہ اخبار بن گئے اور بعض لوگوں نے روزنامے جاری کرنے کی سکت نہ پا کر سہ روزہ اخبارات جاری کیے اور اس طرح روزانہ صحافت کے قریب ہونے کی کوشش کی اس دور کے چند قابل ذکر سہ روزہ اخبارات یہ ہیں :

وکیل

یہ اخبار شیخ غلام محمد نے انیسویں صدی کے آخر میں امرتسر سے ہفت روزہ کی صورت میں جاری کیا تھا۔ بعد ازاں یہ سہ روزہ ہو گیا بلکہ ہفتہ میں تین بار شائع ہونے لگا۔ یہ سنجیدہ اور متین اخبار تھا اور مسلمانوں کے حقوق کا ترجمان تھا۔ حامد علی صدیقی، مولانا عبداللہ العمادی اور مولانا ابوالکلام آزاد جیسے لوگ اس کے ایڈیٹر رہے۔ اس میں علی گڑھ، مصر اور ترکی کے معاملات پر بہت سا مواد چھپتا تھا۔ چنانچہ اس نے قارئین کو ان مسائل سے با خبر کرنے اور ان میں دلچسپی لینے کے قابل بنانے میں اہم حصہ لیا۔ 'وکیل' نے حجاز ریلوے کے لیے چندے کی فراہمی میں بھی حصہ لیا۔ جب مولانا ابوالکلام آزاد اس کے مدیر مقرر ہوئے تو شذرات اور

اداریوں کے لیے ڈیڑھ کالم وقف ہوتا تھا ، مگر مولانا نے اس مقصد کے لیے چار کالم وقف کیے اور اس طرح اداریوں کی افادیت کو وسیع کیا ۔ علاوہ ازیں اس میں علمی و تاریخی نوعیت کا مواد بھی زیادہ چھپنے لگا ۔ جب 'زمیندار' روزنامہ بن گیا اور 'الہلال' وغیرہ میدان میں آ گئے تو 'وکیل' ماند پڑ گیا ۔

وطن

یہ اخبار مولوی انشاء اللہ خان نے ۱۹۰۲ء میں لاہور سے ہفت روزہ کی صورت میں جاری کیا ۔ مولوی صاحب اس سے پہلے 'وکیل' سے وابستہ رہ چکے تھے ۔ اس لیے ابتدا میں اس اخبار پر 'وکیل' کے رنگ کی گہری چھاپ تھی ، لیکن رفتہ رفتہ اس کا رنگ ڈھنگ بدل گیا ۔ ۱۹۱۵ء میں یہ روزنامہ بن گیا مگر جلد ہی پھر ہفت روزہ میں تبدیل ہو گیا اور آخر ۱۹۳۵ء میں بند ہو گیا ۔ یہ خالصتاً سیاسی نوعیت کا اخبار تھا اور اس میں چھپنے والے بیشتر مضامین اور تبصرے سیاسی رنگ ہی کے ہوتے تھے ۔

مدینہ

یہ اخبار ۱۹۱۲ء میں بجنور سے سہ روزہ کی صورت میں جاری ہوا اس کے ایڈیٹر حامد انصاری تھے ۔ پالیسی کے اعتبار سے یہ نیشنلسٹ اخبار تھا مگر متانت اور دلائل کا دامن نہیں چھوڑتا تھا ۔ اس کی پالیسی سے اختلاف کرنے والے لوگ بھی اس کا باقاعدگی سے مطالعہ کرتے تھے ۔ یہ اخبار اس وقت تک جاری ہے ۔ ابتدائی دور کے برعکس بعد کے ادوار میں اس نے زیادہ مؤثر اور اہم کردار ادا کیا ۔

ادبی ماہنامے

برصغیر میں علمی و ادبی جرائد کا آغاز جنگ آزادی سے پہلے ان مسیحی مشنریوں نے کیا تھا جو تبلیغی مواد کے ساتھ ساتھ جرائد میں عمرانی اور تاریخی مضامین شائع کرتے تھے ۔ اس سلسلے کی پہلی کڑی پادری آر سی آرنھر کا 'خیر خواہ ہند' تھا جو ۱۸۳۷ء میں جاری ہونے کے چند سال بعد بند ہو گیا تھا ۔ ۱۸۶۱ء میں اس کا احیاء ہوا ۔ جنگ آزادی کے بعد جاری ہونے والے مسلم رسائل میں سے سرسید خان کے 'تہذیب الاخلاق' کو اولین اہمیت حاصل ہے ۔ 'تہذیب الاخلاق' کے بعد جو رسائل جاری ہوئے ان میں سے قابل ذکر یہ ہیں :

دلگداز

یہ رسالہ مولانا عبدالحلیم شرر نے ۱۸۹۰ء میں 'مہذب' کے اجراء سے کچھ مدت پہلے لکھنؤ سے جاری کیا اور پچاس برس تک اسے تنہا مرتب کرتے رہے ۔ مولانا کے شہرۂ آفاق ناول اس رسالے میں قسط وار شائع ہوتے تھے ۔ اس کے علاوہ 'دلگداز' میں ادبی مقالات اور تاریخی مواد شائع

ہوتا تھا ۔ مولانا عبدالحلیم شرر کی صحافتی زندگی کی ابتدا 'اودھ اخبار' سے ہوئی - ۱۸۸۲ء میں انہوں نے لکھنؤ سے 'محشر' جاری کیا لیکن زیادہ شہرت ان کے 'دلگداز' کو حاصل ہوئی ۔

مخزن

بیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ ہی لاہور سے ماہنامہ 'مخزن' جاری ہوا جس کے مالک و مدیر شیخ (سر) عبدالقادر تھے ۔ اس رسالہ کے اجراء کا خیال شیخ صاحب کو اس وقت آیا جب برطانوی حکومت لفٹیننٹ گورنر میکڈانل کی وساطت سے صوبجات متحدہ میں اردو پر کاری ضرب لگا رہی تھی۔ اس رسالہ کے اجراء کا مقصد مذہبی و سیاسی بحثوں سے الگ رہ کر اردو ادب کی خدمت کرنا تھا ۔ شیخ (سر) عبدالقادر اعلیٰ تعلیم یافتہ اردو انگریزی دان تھے اور 'مخزن' کے اجراء سے پہلے ہی اہل قلم کی حیثیت سے نامور تھے چنانچہ 'مخزن' جلد ہی شہرت حاصل کر گیا ۔ ابتدا میں شیخ محمد اکرام مدیر معاون تھے - ۱۹۰۴ء میں شیخ صاحب انگلستان گئے تو رسالہ کا انتظام شیخ محمد اکرام نے سنبھال لیا - ۱۹۰۶ء میں شیخ صاحب واپس آئے تو پھر 'مخزن' کو ترتیب دینے لگے - ستمبر ۱۹۰۷ء میں شیخ (سر) عبدلقادر وکالت کے لیے دہلی منتقل ہوئے تو اکتوبر سے 'مخزن' بھی دہلی سے شائع ہونے لگا ۔ شیخ محمد اکرام بدستور مدیر معاون تھے مگر دہلی میں راشدالخیری کا تعاون بھی حاصل ہوا ۔ کچھ عرصہ بعد شیخ (سر) عبدالقادر لاہور منتقل ہوگئے اور 'مخزن' کا دفتر بھی یہیں منتقل ہوگیا - ۱۹۱۰ء میں سر عبدالقادر نے 'مخزن' مولوی غلام رسول کے ہاتھ بیچ دیا مگر اس کے بعد بھی سر عبدالقادر کا نام آنریری ایڈیٹر کے طور پر سرورق پر چھپتا رہا ۔

سر عبدالقادر کی زندگی اور ان کے زمانے میں 'مخزن' کا معیار بہت بلند رہا - شیخ محمد اکرام 'مخزن' کی فروخت سے پہلے ہی الگ ہو گئے تھے اور ان کی جگہ غلام محمد بطور مدیر معاون مقرر ہوئے تھے ۔ فروخت کے بعد غلام محمد بطور مدیر بن گئے ان کے بعد میر نثار علی شہرت ، علامہ تاجور نجیب آبادی اور اظہر علی آزاد نے ادارت کے فرائض انجام دیے ۔

'مخزن' کے مستقل قلمی معاونین میں علامہ اقبال ، غلام بھیک نیرنگ ، مرزا اعجاز حسین اعجاز ، نادر کاکوری ، طالب بنارسی ، شوق قدوائی ، سرور جہان آبادی ، علی بلگرامی ، خوشی محمد ناظر ، مولانا ظفر علی خان اور عبدالرشید چشتی جیسے لوگ شامل تھے ۔ ان کے علاوہ محمد حسین آزاد ، علامہ شبلی نعمانی ، مولانا الطاف حسین حالی ، مولوی ذکاءاللہ ، سید احمد دہلوی ، داغ ، ریاض خیر آبادی ، شاد عظیم آبادی ، سلطان حیدر جوش ، حسن نظامی ، حسرت موہانی ، فانی بدایونی ، یاس و یگانہ عظیم آبادی ، اکبر الہ آبادی ، مولانا محمد علی جوہر ، مولانا ابوالکلام آزاد ، برج نرائن چکبست ، تلوک چند محروم ، پیارے لال شاکر ، محمود شیرانی ، سجاد حیدر یلدرم ، حامد حسن قادری ، عبدالحلیم شرر ، آغا حشر کاشمیری ، اسمعیل میرٹھی ، خلیفہ عبدالحکیم ، وحیدالدین سلیم ، نوح ناروی اور بہت سے دوسرے ادیبوں اور شاعروں کی نگارشات بھی اس میں شائع ہوتی تھیں ۔

'مخزن' نے بہت سے اہل قلم کو شہرت بخشی ۔ قارئیں میں ادب کا ذوق پیدا کیا ۔ پنجاب میں اردو کی آبیاری کی اور ادیبوں اور شاعروں کے لیے تربیت گاہ کا کام دیا ۔ مولانا صلاح الدین احمد لکھتے ہیں ''قوموں کی تاریخ میں بعض دفعہ چھوٹے چھوٹے واقعات اہم ترین نتائج کے پیشرو بن جاتے ہیں ۔ 'مخزن' کا اجراء بھی ہماری تہذیبی تاریخ میں اس قسم کا ایک واقعہ ہے''[1] ۔

اردوئے معلیٰ

یہ رسالہ مولانا حسرت موہانی نے ۱۹۰۳ء میں علی گڑھ سے جاری کیا ۔ مولانا شاعر، ادیب اور سیاست دان تھے اور اس رسالہ کے بیشتر مضامین خود لکھا کرتے تھے ۔ یہ رسالہ چالیس سال سے زیادہ عرصہ تک چلتا رہا ۔ اس میں علمی و ادبی مضامین کے ساتھ ساتھ تیز قسم کے سیاسی مضامین شائع ہوتے تھے ۔ اس لیے اس کی اہمیت زیادہ تھی ۔ مولانا حسرت موہانی حق گو اور جری انسان تھے اور مصاحت سے نا آشنا تھے ۔

اردوئے معلی میں ایک طرف اساتذۂ قدیم کے دواوین مع مقدموں کے شائع ہوتے تھے ۔ اچھے اور بلند پایہ عامی مقالات اور بڑے شعرا کا کلام جگہ پاتا تھا ۔ دوسری طرف سیاست پر تیز قسم کے مضامین رہتے تھے ۔ مثال کے طور پر مئی ۱۹۰۷ء کے اردوئے معلی میں ''بے حسی کے آثار'' کے زیر عنوان مضمون میں مولانا حسرت موہانی نے لکھا :

''۔۔۔۔۔۔۔۔ ہم لوگوں کا فرض ہونا چاہیے کہ اس حق کے اظہار میں مطلق باک نہ کریں اور صداقت کی آخری فتح پر یقین رکھتے ہوئے راہِ حق میں جو مصائب پیش آئیں ان کو بہ کشادہ پیشانی برداشت کریں اور خوب سمجھ لیں کہ آزادی کی دولت آسانی سے نہیں حاصل ہوا کرتی ۔ یہ جو حکومت کی جبروت سے بہ ظاہر تحریکِ حرّیت کو فاش شکست ہوئی ہے اس پر افسردہ و مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں کیونکہ ابھی تک ہماری قوت نہ مجتمع ہے نہ منظم ۔ اس لیے ہم کو ابھی کچھ دنوں تک ایسی ایسی بہت سی ناکامیوں اور شکستوں کو صبر و شکر کے ساتھ برداشت کرنا پڑے گا ۔۔۔۔۔۔''

۱۹۰۸ء میں مولانا حسرت موہانی کے ایک اور تیز و تلخ مضمون کے نتیجہ میں انھیں دو سال قید کی سزا ملی ۔ سزا بھگت کر جیل سے رہا ہوئے تو کچھ لوگوں نے سیاست سے کنارہ کش یا کم از کم نرم روی کا مشورہ دیا ۔ اس پر آپ نے نومبر ۱۹۰۹ء کے شمارہ میں لکھا :

> ''مشکل یہ ہے کہ ہمارے خیال میں یقین یا عقیدہ ، عام اس سے کہ وہ مذہبی ہو یا سیاسی ایک ایسی چیز ہے جس کو محض کسی خوف یا مصلحت کے خیال سے ترک یا تبدیل کرنا اخلاقی گناہوں میں سے ایک بدترین گناہ ہے ، جس کے ارتکاب

---

(۱) سردار مسیح گل ، تنقیدی ادب ۔ ص ۵۱۵

کا کسی حریت پسند یا آزاد خیال اخبار نویس کے دل میں ارادہ بھی نہیں پیدا ہو سکتا۔''

مولانا حسرت موہانی کی حق گوئی اور بیباکی کی وجہ سے ان کا کلام اور تنقیدی مضامین ذوق و شوق سے پڑھے جاتے تھے۔ انہوں نے روزنامہ کے صحافی انداز کو اردوئے معلیٰ میں ادبی سطح پر پیش کیا اور یہ اپنی نوعیت کا پہلا کامیاب تجربہ تھا۔

زمانہ

یہ رسالہ منشی دیا نرائن نگم نے ۱۹۰۳ء میں جاری کیا۔ یہ ادبی و سیاسی رسالہ تھا۔ منشی صاحب کانگرسی خیالات رکھتے تھے، لیکن اس رسالہ نے ہندوؤں کو اردو زبان کے قریب لانے میں نمایاں کام کیا اور اس کے علمی معاونین میں مسلمان اور ہندو دونوں شامل تھے۔ چکبست، سید سلیمان ندوی، عزیز مرزا اور عبدالماجد دریا بادی اس میں اکثر لکھتے تھے۔ 'زمانہ' کے لکھنے والے سرسید مکتبِ فکر کی نثر نگاری کے حامی تھے۔ زمانے کے خاص نمبر بڑے اہتمام سے شائع ہوتے تھے اور مقبول ہوتے تھے۔

اس دور میں جو دوسرے ادبی رسائل جاری ہوئے ان میں مولانا ظفرالملک علوی کا 'الناظر' (لکھنؤ) کلاسیکی ادب کا علمبردار تھا۔ مولانا ناظر علی خان کا 'دکن ریویو' سید اکبر شاہ نجیب آبادی کا 'عبرت'، منشی محمد دین فوق کا 'کشمیری میگزین' وغیرہ بھی قابل ذکر ہیں۔

گلدستے

علمی و ادبی ماہناموں کے ساتھ ساتھ قدیم طرز پر گلدستے بھی شائع ہوتے رہے۔ گلدستہ وہ پرچہ کہلاتا تھا جس میں صرف شعراء کا کلام درج ہوتا تھا۔ ۱۸۷۱ء میں ریاض خیر آبادی کا 'گلکدۂ ریاض' جاری ہوا، ۱۸۸۳ء میں انہوں نے 'فتنہ و عطر فتنہ' جاری کیا جو بہت مقبول ہوا۔ اس کے بعد 'پیام عاشق'، 'ارمغان فرخ'، ابوالکلام آزاد کے 'نیرنگ عالم' اور 'خدنگ نظر' وغیرہ نے شہرت حاصل کی۔ 'خدنگ نظر' منشی نوبت رائے نظر کا گلدستہ تھا جس کی ترتیب مولانا آزاد کے سپرد تھی۔

جنگجویانہ صحافت

سرسید احمد خان کا دورِ اصلاح، مصالحت اور عقلیت کا دور تھا لیکن سرسید کی وفات تک حالات بدل چکے تھے۔ بیسویں صدی کے آغاز میں مسلمان بھی سیاسی حقوق کے لیے جدوجہد کرنے کی ضرورت محسوس کرنے لگے۔ ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ اسی غرض سے قائم ہوئی۔ ۱۹۱۱ء میں حکومت نے ہندوؤں کے دباؤ میں آکر بنگال کی تقسیم منسوخ کر دی تو سرسید کے رفقاء بھی مصالحت کی پالیسی سے بد دل ہوگئے۔ وقارالملک نے ۳۰ دسمبر ۱۹۱۱ء کے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ

مزٹ میں لکھا ''یہ آفتاب نصف النہار کی طرح ایسا روشن ہے کہ ان واقعات کو دیکھنے کے بعد جو اس وقت مشاہدہ میں آئے ، یہ مشورہ دینا کہ مسلمانوں کو گورنمنٹ پر بھروسا کرنا چاہیے لا حاصل مشورہ ہے ۔ اب زمانہ اس قسم کے بھروسے کا نہیں رہا'' ۔ ۳۱ اگست ۱۹۱۳ء کو مسجد کانپور کی شہادت سے مسلمانوں کا احساس بے بسی اور شدید ہوگیا ۔ برصغیر سے باہر بھی مسلمانوں کی حالت مخدوش تھی ۔ سلطنت عثمانیہ کو ختم کرنے کی کوششیں جاری تھیں ۔ غرض مسلمانوں کا مستقبل ایک استفہامیہ نشان بنا ہوا تھا ۔ اب حقوق کے تحفظ کی جد و جہد تیز کرنے اور مصلحت و مصالحت کو بالائے طاق رکھ کر جوش و جذبہ کے ساتھ کام کرنے کا وقت تھا ۔ چنانچہ اس دور کی صحافت نے بھی نئی صورت اختیار کر لی ۔ یہ صورت تھی جنگجوئی ، مبارزت طلبی ، جرأت و بیباکی کے ساتھ اظہار خیال کی ۔

اس دور میں نڈر ، بیباک ، پر جوش اور پر عزم صحافی میدان صحافت میں وارد ہوئے ۔ ان میں مولانا ظفر علی خان ، مولانا محمد علی جوہر اور مولانا ابوالکلام آزاد سر فہرست ہیں ۔ مولانا ظفر علی خان کا 'زمیندار' ، مولانا محمد علی جوہر کا 'کامریڈ' اور 'ہمدرد' اور مولانا ابوالکلام آزاد کا 'الہلال' صحافت کے میدان پر اس طرح چھا گئے کہ دوسرے تمام اخبارات و جرائد دب کر رہ گئے ۔ بقول ڈاکٹر سید عبداللہ :

> ''ملک کی سیاست بدل رہی تھی اور بیرونی حوادث سے جذبات اس درجہ مشتعل ہو رہے تھے کہ ٹھنڈی معقولیت کے لیے کوئی گنجائش باقی نہ تھی ۔ چنانچہ بیسویں صدی کے ربع اول میں اردو صحافت اور مجلہ نگاری سرا پا جذبات پر آکر کھڑی ہو گئی اور سیاسی کشمکش نے کچھ ایسی صورت اختیار کر لی کہ نہ دانا گورنمنٹ چھاپے کی آزادی قائم رکھ سکی اور نہ آزاد رعیت اس آزادی کو برقرار رکھ سکی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس فضا نے اخبار نویسی کے جو بڑے بڑے نمونے ہمارے سامنے پیش کیے ان میں 'الہلال' ، 'زمیندار' اور 'ہمدرد' کو نمایاں مقام حاصل ہے''(۱)

زمیندار

مولانا ظفر علی خان کے والد مولانا سراج الدین احمد نے جون ۱۹۰۳ء میں ہفت روزہ اخبار 'زمیندار' جاری کیا جس کا مقصد زمینداروں ، کاشتکاروں اور کسانوں کی بھلائی کے لیے کام کرنا تھا ۔ مولانا مالی مشکلات کی بنا پر زیادہ دیر لاہور میں نہ رہ سکے اور اپنے گاؤں کرم آباد ضلع گجرانوالہ چلے گئے ، چنانچہ 'زمیندار' کا دفتر بھی وہیں منتقل ہو گیا ۔ اس زمانہ میں اس اخبار کی اشاعت دو ہزار سے زائد تھی ۔ مولانا ظفر علی خان اس دور میں حیدر آباد دکن میں ملازم

---

(۱) ڈاکٹر سید محمد عبداللہ ، جدید اردو نثر (مقالہ سرسید خان) ۔ ص ۱۳۹

تھے ۔ اور 'دکن ریو یو' کے مدیر تھے ۔ نومبر ۱۹۰۹ء میں مولانا سراج الدین احمد کا انتقال ہوگیا تو مولانا ظفر علی خاں نے وطن واپس آ کر 'زمیندار' کا انتظام سنبھال لیا ۔ اس سے پہلے 'دکن ریو یو' کے مدیر اور 'خیابان فارس' ، 'فسانۂ لندن' ، 'سیر ظلمات' اور 'معرکہ مذہب و سائنس' کے مترجم کی حیثیت سے شہرت حاصل کر چکے تھے ۔ آپ نے 'زمیندار' کا دفتر پھر لاہور منتقل کر لیا اور اس کا انداز بدل کر اسے مسلمانوں کا ترجمان بنا دیا ۔ چنانچہ 'زمیندار' کی مقبولیت میں بھی اضافہ ہوا ۔ جب جنگ طرابلس کا آغاز ہوا تو مولانا ظفر علی خان نے 'زمیندار' کو روزنامہ میں تبدیل کر دیا اور اس میں جنگ کی خبریں خصوصی اہتمام کے ساتھ شائع کرنے لگے ۔ یہ اردو کا پہلا اخبار تھا جس نے رائیٹر اور ایسوسی ایٹڈ پریس آف انڈیا سے خبریں حاصل کرنے کا انتظام کیا ۔ 'زمیندار' کے عملۂ ادارت میں مولانا ظفر علی خان کے علاوہ نیاز فتح پوری ، مولانا عبداللہ العمادی ، مولانا وحیدالدین سلیم پانی پتی اور منشی وجاہت حسین جھنجھانوی جیسے لوگ بھی شامل تھے ۔ مولانا ظفر علی خان بلند پایہ ادیب ، شعلہ بیان مقرر ، عالم اور شاعر بھی تھے ۔ ان کے مقالات افتتاحیہ اور نظموں نے ہر طرف تہلکہ مچا دیا اور ہر طرف 'زمیندار' کا طوطی بولنے لگا ۔ ''جب 'زمیندار' سرحدی علاقے میں پہنچتا تو پٹھان ایک آنہ دے کر تو 'زمیندار' خریدتے اور ایک آنہ پڑھوائی کے لیے دیتے''[1] شہروں کے بازاروں اور دیہات کے چوپالوں میں 'زمیندار' ہی کا چرچا ہوتا ۔ مولانا محمد علی جوہر نے ۲۳ مارچ ۱۹۱۲ء کے 'کامریڈ' میں لکھا تھا کہ :

> ''یہ پرچہ اس لیے عروج کو پہنچا کہ ایک ایسے شخص نے اس کی ادارت سنبھالی جو نہایت قابل ہے ...... علی گڑھ کا گریجوایٹ ہے ...... ہندوستان کے ایک سے زیادہ صوبوں میں نظم و نسق کا تجربہ رکھتا ہے ...... جدید تمدن اور سیاست سے آگاہ ہے ...... انگریزی کی اعلیٰ قابلیت کا حامل ہے ۔ اردو نثر میں ایک درخشاں اسلوب کا مالک ہے اور شعر و شاعری پر اسے کامل عبور ہے ...... اور اب صورت یہ ہو گئی ہے کہ 'زمیندار' کے مقابلے پر دوسرے اخبار پھیکے اور بے مزہ معلوم ہوتے ہیں ...... الخ'' ۔

'زمیندار' کی بے باکی اور ہر دلعزیزی سے حکام ناراض ہو گئے ۔ مارچ ۱۹۱۲ء میں 'زمیندار' سے ایک ایک ہزار روپے کی دو ضمانتیں طلب کی گئیں ۔ ۱۹۱۲ء میں مسجد کانپور کا سانحہ رونما ہوا تو 'زمیندار' نے بڑی جرأت کے ساتھ مسلمانوں کے جذبات کی ترجمانی کی چنانچہ حکومت نے دو ہزار کی ضمانت ضبط کر کے دس ہزار روپے کی مزید ضمانت طلب کی ۔ چندہ جمع کر کے یہ رقم بھی جمع کرا دی گئی ۔ اس سال مولانا ظفر علی خان لندن گئے جہاں انہوں نے پریس ایکٹ کی تنسیخ کے لیے جد و جہد کی ، تقریریں کیں ۔ پارلیمنٹ کے

---

(۱) خورشید الاسلام ، صحافت پاکستان و ہند میں ۔ ص ۳۵۱

ارکان سے ملے - پریس ایکٹ کے نقصانات کے بارے میں ایک کتاب بھی لکھی جو شائع نہ ہو سکی - مولانا نے لندن میں ایک مقالہ بعنوان ''چار چیز است تحفۂ لندن — خمر و خنزیر و روز نامہ و زن - اس مقالہ کی اشاعت پر 'زمیندار' کی دس ہزار روپے کی ضمانت ضبط کر کے دس ہزار کی مزید ضمانت طلب کی گئی - چھاپہ خانہ بھی ضبط کر لیا گیا - مولانا لندن ہی میں تھے - ادھر ہر وقت چندہ جمع نہ ہو سکا چنانچہ 'زمیندار' عارضی طور پر بند ہو گیا - لیکن جلد ہی چندہ جمع ہو گیا اور 'زمیندار' پھر زندہ ہو گیا - مولانا لندن سے واپس آئے تو تھوڑے عرصہ بعد جنگِ عظیم شروع ہو گئی حکومت نے انہیں کرم آباد میں نظر بند کر دیا - ادھر 'زمیندار' پر جنگ کی خبریں شائع نہ کرنے کی پابندی لگا دی گئی چنانچہ 'زمیندار' اس پابندی کے خلاف احتجاج کے طور پر بند کر دیا گیا - اس کی بار بار بندش اور اجراء کا سلسلہ دیر تک جاری رہا -

مولانا محمد علی جوہر

مولانا محمد علی جوہر آکسفورڈ کے گریجوایٹ ، مقرر اور اردو و انگریزی کے بے مثال انشا پرداز تھے ، ریاست رام پور اور بڑودہ میں اعلیٰ ملازمتوں پر فائز رہے اور اس دوران ملک کے بلند پایہ انگریزی و اردو اخبارات میں مضامین لکھتے رہے ، مگر ۱۹۱۰ء میں ملازمت چھوڑ کر خار زار صحافت میں داخل ہو گئے - بے سرو سامانی کے عالم میں کلکتہ سے انگریزی ہفت روزہ 'کامریڈ' جاری کیا جس نے پورے ملک میں تہلکہ مچا دیا - مولانا محمد علی کی انگریزی زبان پر مکمل قدرت اور جرأت و بے باکی نے 'کامریڈ' کو بہت با اثر اور مقبول بنا دیا - اس کے حلقۂ قارئین میں بہت سے انگریز افسر اور حکمران بھی شامل تھے - گورنر جنرل ہندوستان کی انتظامی کونسل کے رکن مالیات سرگائی فلیٹ وڈ Sir Guy Fleetwood جب انگلستان واپس جانے لگے تو انہوں نے مولانا محمد علی سے کہا ''میں کامریڈ کے پرچے اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں - میں اپنے دوست کے لیے جو لندن پنچ کا ایڈیٹر ہے اس سے بہتر تحفہ نہیں لے جا سکتا - اس کے اور آپ کے طرزِ تحریر میں اتنی مشابہت ہے کہ دونوں میں تمیز کرنا مشکل ہے''۔

جب دارالحکومت دلی منتقل ہوا تو مولانا نے 'کامریڈ' کا دفتر بھی وہیں منتقل کر دیا - مولانا کے بیباکانہ اداریوں اور مضامین کی بنا پر ۱۹۱۳ء میں حکومت نے اس اخبار کی کاپیاں ضبط کر لیں - پریس کی بھی ضمانت مانگی گئی جو بعد ازاں ضبط کر لی گئی - پہلی جنگِ عالمگیر شروع ہونے پر 'لندن ٹائمز' نے ترکوں کا انتخاب The Choice of the Turks کے زیرِ عنوان ایک اشتعال انگیز اداریہ لکھا - مولانا محمد علی نے یہ اداریہ پڑھا تو بیماری کے باوجود قلم پکڑ کر بیٹھ گئے نہ سوئے نہ آرام کیا - وقفوں کے بعد سخت قسم کا قہوہ

Selections from Comrade, Page 187. (۱)

پیتے رہے - چالیس گھنٹے [illegible]
کیا جو ۲۶ ستمبر ۱۹۱۴ کے [illegible]
ایوان اقتدار میں زلزلہ آ گیا - [illegible] پریس کی ضمانت بھی ضبط کر لی گئی - حکومت اس مضمون سے اس قدر خائف تھی کہ ۱۹۴۲ء میں بھی اس کی اشاعت کی اجازت نہ دی(۱) مولانا نے مسلسل ضمانتوں اور ضبطیوں کے پیش نظر ۱۹۱۴ء میں اخبار بند کر دیا اور اس کے آخری شمارہ میں لکھا: ''ہم نے جس بات کو صحیح [illegible] آزادی کے ساتھ اس کا اعلان کیا اور اسے ہر کسی تک ہر جگہ پہنچایا - [illegible] اعلان ببانگ دھل نہ کیا جا سکا تو غیر صحیح بات بھی نہ کہی - ہم زندگی اور موت بین کبھی نہیں مریں گے - ہم اس لیے زندہ رہے کہ ہم نے جرأت سے کام لیا - [illegible] بھی جرأت سے کام لیں گے اور زندہ رہیں گے'' -

ہمدرد

مولانا محمد علی نے 'کامریڈ' کے اجراء کے ساتھ ہی ایک اور روز نامہ 'ہمدرد' نکالنے کا منصوبہ بنایا تھا - مگر ٹائپ وغیرہ کا انتظام بر وقت نہ ہو سکنے سے یہ اخبار ناحمر سے ۲۳ فروری ۱۹۱۲ء کو نامکمل صورت میں نکلا اور کچھ مدت بعد جا کر مکمل صورت میں جلوہ گر ہوا - مگر ایک تو جنگ بلقان کے خاتمے کی وجہ سے اخباروں کی مانگ کم ہو گئی تھی دوسرے ٹائپ مقبول نہ تھا چنانچہ اسے از سر نو نستعلیق میں چھاپا جانے لگا، تب جا کر یہ مقبول ہوا -

اتنے میں پہلی جنگ عظیم شروع ہو گئی اور اخباروں کی اشاعت کئی گنا ہو گئی - مگر ۱۹۱۵ء میں مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی دونوں نظر بند کر دیے گئے - اور اس کے ایک ماہ بعد 'ہمدرد' پر سخت سنسر عائد کر دیا گیا، چنانچہ اگست ۱۹۱۵ء میں 'ہمدرد' بھی بند ہو گیا اور اس کا پہلا دور ختم ہو گیا -

'ہمدرد' ایک بلند پایہ اخبار تھا - جس میں خبروں کی صحت، تبصروں کی وقعت اور مضامین کی ثقافت پر بہت توجہ دی جاتی تھی، اس کے ادارتی عملہ میں میر محفوظ علی، سید ہاشمی فرید آبادی، قاضی عبدالغفار، مولوی عبدالحلیم شرر اور ڈاکٹر سعید احمد بریلوی جیسے لوگ بھی شامل تھے - یہ اخبار مندرجات کے لحاظ سے بلند پایہ ہونے کے علاوہ دیدہ زیب بھی تھا - اخبار سے متعلق صلاح مقررہ یعنی ''ادارتی کانفرنس کا آغاز بھی 'ہمدرد' ہی سے ہوا - بقول قاضی عبدالغفار ''کیا زمانہ تھا، جب ہمدرد 'کامریڈ' کے دفتر میں صبح

My life a fragment——*Writing and Speeches of Mohammad Ali*, Page 178. (۱)

اور شام تمام ممبران سٹاف اخبار کے متعلق مشورے میں شریک ہوتے تھے''[۱]

الہلال

مولانا ابوالکلام آزاد ایک بلند پایہ عالم، مذہبی راہنما، بے مثال خطیب اور ادیب
ان کی مادری زبان تھی اور فارسی اور اردو پر بھی انہیں مکمل دسترس تھی۔
اخبار نویسی کا شوق تھا۔ ۱۹۰۰ء میں بمبئی ہی میں کلکتہ کے ہفت روزہ اخبار
کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ پھر 'احسن الاخبار' کی ترتیب و تدوین میں حصہ لیتے رہے،
اور 'وکیل نظر' کی ادارت کے فرائض بھی ادا کیے۔ پھر ایک معاون مولوی
جعفری کے ساتھ مل کر 'لسان الصدق' جاری کیا کچھ عرصہ 'الندوۃ' اور
بھی وابستہ رہے اور آخر ۱۳ جولائی ۱۹۱۲ء کو اپنا اخبار ہفت روزہ 'الہلال'
اخبار کے اجراء پر کسی صاحب نے امداد کی پیشکش کی۔ اس پر مولانا
نے ۲۷ جولائی ۱۹۱۳ء کے 'الہلال' میں لکھا:

> "جو اخبار اپنی قیمت کے سوا کسی انسان یا جماعت سے کوئی اور رقم لینا جائز رکھتا ہے وہ 'اخبار نہیں' بلکہ اس فن کے لیے ایک دھبہ اور سر تا سر عار ہے۔ ہم اخبار نویس کی سطح کو بہت بلندی پر دیکھتے ہیں اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فرض الٰہی ادا کرنے والی جماعت سمجھتے ہیں''۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے نزدیک اخبار نویسی مشن تھی۔ اور انہوں نے مشنری جذبہ ہی سے کام کیا۔ الہلال $\frac{۳۰ \times ۲۰}{۴}$ کے ۱۶ صفحات پر نکلتا تھا۔ سر ورق کے چار صفحات اس سے الگ تھے۔ پہلے صفحہ پر نام کی تختی کے نیچے مقالہ افتتاحیہ چھپتا تھا۔ پہلے چند شماروں میں خبریں بھی شائع ہوئیں، لیکن بعد میں خبروں کی جگہ بھی مضامین اور اسلامی ملکوں سے آنے ہوئے مکاتیب نے لے لی۔ 'الہلال' خوبصورت ٹائپ میں چھپتا تھا اور باتصویر جریدہ تھا۔ معنوی لحاظ سے یہ جریدہ 'دعوت' کی حیثیت رکھتا تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد مسلمانوں کی اصلاح اور ان میں بیداری پیدا کرنے کے داعی تھے۔ وہ مسلمانوں کو اسلام کی بنائی ہوئی 'صراطِ مستقیم' پر چلانا چاہتے تھے۔ ان کے نزدیک مذہب اور سیاست ایک دوسرے سے الگ نہیں تھے بلکہ صحیح سیاست مذہب کی صحیح پابندی میں سے وجود پا سکتی ہے۔

---

(۱) رئیس احمد جعفری، سیرت محمد علی۔ ص ۳۳۳ ۳۳۴۔

بیٹے رہے ۔ چالیس گھنٹوں کے بعد لندن ٹائمز کے اداریہ کا جواب اسی عنوان کے تحت تیار کیا جو ۲۶ ستمبر ۱۹۱۴ء کے 'کامریڈ' میں دس کالموں میں چھپا ۔ اس مضمون سے انگریزی ایوان اقتدار میں زلزلہ آ گیا ۔ یہ مضمون ضبط کر لیا گیا ۔ پریس کی ضمانت بھی ضبط کر لی گئی ۔ حکومت اس مضمون سے اس قدر خائف تھی کہ ۱۹۴۲ء میں بھی اس کی اشاعت کی اجازت نہ دی[۱] مولانا نے مسلسل ضمانتوں اور ضبطیوں کے پیش نظر نومبر ۱۹۱۴ء میں یہ اخبار بند کر دیا اور اس کے آخری شمارہ میں لکھا : ''ہم نے جس بات کو صحیح سمجھا آزادی کے ساتھ اس کا اعلان کیا اور اسے ہر کسی تک ہر جگہ پہنچایا ۔ اگر کبھی سچ کا اعلان ببانگ دھل نہ کیا جا سکا تو غیر صحیح بات بھی نہ کہی ۔ ہم زندگی اور موت کے بین کبھی نہیں مریں گے ۔ ہم اس لیے زندہ رہے کہ ہم نے جرأت سے کام لیا ۔ ہم آئندہ بھی جرأت سے کام لیں گے اور زندہ رہیں گے'' ۔

ہمدرد :

مولانا محمد علی نے 'کامریڈ' کے اجراء کے ساتھ ہی ایک اور روز نامہ 'ہمدرد' نکالنے کا منصوبہ بنایا تھا ۔ مگر ٹائپ وغیرہ کا انتظام بر وقت نہ ہو سکنے سے یہ اخبار تاخیر سے ، ۲۳ فروری ۱۹۱۳ء کو نامکمل صورت میں نکلا اور کچھ مدت بعد جا کر مکمل صورت میں جلوہ گر ہوا ۔ مگر ایک تو جنگ بلقان کے خاتمے کی وجہ سے اخباروں کی مانگ کم ہو گئی تھی دوسرے ٹائپ مقبول نہ تھا چنانچہ اسے از سر نو نستعلیق میں چھاپا جانے لگا ، تب جا کر یہ مقبول ہوا ۔

اتنے میں پہلی جنگ عظیم شروع ہو گئی اور اخباروں کی اشاعت کئی گنا ہو گئی ۔ مگر ۱۹۱۵ء میں مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی دونوں نظر بند کر دیے گئے ۔ اور اس کے ایک ماہ بعد 'ہمدرد' پر سخت سنسر عائد کر دیا گیا ، چنانچہ اگست ۱۹۱۵ء میں 'ہمدرد' بھی بند ہو گیا اور اس کا پہلا دور ختم ہو گیا ۔

'ہمدرد' ایک بلند پایہ اخبار تھا ۔ جس میں خبروں کی صحت ، تبصروں کی وقعت اور مضامین کی ثقافت پر بہت توجہ دی جاتی تھی ، اس کے ادارتی عملہ میں سید محفوظ علی ، سید ہاشمی فرید آبادی ، قاضی عبدالغفار ، مولوی عبدالحلیم شرر اور ڈاکٹر سعید احمد بریلوی جیسے لوگ بھی شامل تھے ۔ یہ اخبار مندرجات کے لحاظ سے بلند پایہ ہونے کے علاوہ دیدہ زیب بھی تھا ۔ اخبار سے متعلق صلاح مقررہ یعنی ''ادارتی کانفرنس کا آغاز بھی 'ہمدرد' ہی سے ہوا ۔ بقول قاضی عبدالغفار ''کیا زمانہ تھا ، جب ہمدرد 'کامریڈ' کے دفتر میں صبح

My life a fragment——*Writing and Speeches of Mohammad Ali*, Page 178. (۱)

اور شام تمام ممبران سٹاف اخبار کے متعلق مشورے میں شریک ہوتے تھے۔"[1]

الہلال

مولانا ابوالکلام آزاد ایک بلند پایہ عالم ، مذہبی راہنما ، بے مثال خطیب اور ادیب تھے ۔ عربی ان کی مادری زبان تھی اور فارسی اور اردو پر بھی انہیں مکمل دسترس تھی ۔ بچپن ہی سے اخبار بینی کا شوق تھا ۔ ۱۹۰۰ء میں بمبئی ہی میں کلکتہ کے ہفت روزہ اخبار "الصباح" کے ایڈیٹر مقرر ہوئے ۔ پھر 'احسن الاخبار' کی ترتیب و تدوین میں حصہ لیتے رہے ، 'تحفہ محمدیہ' اور 'فرنگ نظر' کی ادارت کے فرائض بھی ادا کیے ۔ پھر ایک معاون مولوی محمد یوسف جعفری نے ساتھ مل کر 'لسان الصدق' جاری کیا ۔ کچھ عرصہ 'الندوۃ' اور 'وکیل' سے بھی وابستہ رہے اور آخر ۱۳ جولائی ۱۹۱۲ء کو اپنا اخبار ہفت روزہ 'الہلال' جاری کیا ۔ اخبار کے اجراء پر کسی صاحب نے مالی معاونت کی پیشکش کی ۔ اس پر مولانا نے ۲۷ جولائی ۱۹۱۳ء کے 'الہلال' میں لکھا :

> "جو اخبار اپنی قیمت کے سوا کسی انسان یا جماعت سے کوئی اور رقم لینا جائز رکھتا ہے وہ 'اخبار نہیں' بلکہ اس فن کے لیے ایک دھبہ اور سر تا سر عار ہے ۔ ہم اخبار نویس کی سطح کو بہت بلندی پر دیکھتے ہیں اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فرض الہی ادا کرنے والی جماعت سمجھتے ہیں" ۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے نزدیک اخبار نویسی مشن تھی ۔ اور انہوں نے مشنری جذبہ ہی سے کام کیا ۔ الہلال $\frac{۲۰ \times ۳۰}{۴}$ کے ۱۶ صفحات پر نکلتا تھا ۔ سر ورق کے چار صفحات اس سے الگ تھے ۔ پہلے صفحہ پر نام کی تختی کے نیچے مقالہ افتتاحیہ چھپتا تھا ۔ پہلے چند شماروں میں خبریں بھی شائع ہوئیں ، لیکن بعد میں خبروں کی جگہ بھی مضامین اور اسلامی ملکوں سے آئے ہوئے مکاتیب نے لے لی ۔ 'الہلال' خوبصورت ٹائپ میں چھپتا تھا اور باتصویر جریدہ تھا ۔ معنوی لحاظ سے یہ جریدہ 'دعوت' کی حیثیت رکھتا تھا ۔ مولانا ابوالکلام آزاد مسلمانوں کی اصلاح اور ان میں بیداری پیدا کرنے کے داعی تھے ۔ وہ مسلمانوں کو اسلام کی بنائی ہوئی 'صراطِ مستقیم' پر چلانا چاہتے تھے ۔ ان کے نزدیک مذہب اور سیاست ایک دوسرے سے الگ نہیں تھے بلکہ صحیح سیاست مذہب کی صحیح پابندی میں سے وجود پا سکتی ہے ۔

---

(۱) رئیس احمد جعفری ، سیرت محمد علی ۔ ص ۳۳۳ ۳۳۴ ۔

'الہلال' میں مذہب ، سیاست ، معاشیات ، نفسیات ، جغرافیہ ، تاریخ ، عمرانیات ، سوانح ، ادب اور حالات حاضرہ پر اعلیٰ قسم کے مضامین اور تبصرے شائع ہوتے تھے ۔ اس میں علامہ شبلی نعمانی ، علامہ اقبال ، مولانا حسرت موہانی اور سید سلیمان ندوی جیسے اکابر بھی لکھتے تھے مولانا نے بڑی جرأت اور بے باکی کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کیا چنانچہ ۱۶ نومبر ۱۹۱۳ء کو حکومت نے 'الہلال' پریس کی دو ہزار کی پہلی ضمانت ضبط کر لی ۔ ۱۴ اور ۱۲ اکتوبر کا مشترکہ شمارہ ضبط کر لیا ۔ دس ہزار روپے کی نئی ضمانت مانگی گئی جو جمع نہ کرائی گئی ۔ چنانچہ نومبر ۱۹۱۴ء میں 'الہلال' بند ہو گیا اور اس کا پہلا دور ختم ہو گیا ۔

جائزہ

۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۴ء تک یعنی ستاون برس میں برِ صغیر کی صحافت کئی انقلابی تبدیلیوں سے دو چار ہوئی ۔ ۱۸۵۷ء کے فوراً بعد کی صحافت عوام کی ترجمان نہیں تھی ، اخبارات حکومت کی تعریف اور خوشامد میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتے تھے ۔ خبریں غیر سیاسی اور ہمعصر اخباروں سے نقل شدہ ہوتی تھیں ۔ سر سید احمد خان نے اردو صحافت کو با مقصد اور خفیہ بنانے میں حصہ لیا ۔ انہوں نے اعتدال اور حکومت سے مصالحت کی پالیسی پر گامزن ہونے کے باوجود مناسب تنقید کا حق ادا کیا ۔ سر سید کی تحریک نے ایک طرف لوگوں میں یہ عام سیاسی و تعلیمی شعور پیدا کیا اور دوسری طرف اردو زبان و ادب کی اصلاح کر کے اسے زندگی سے ہم آہنگ کیا ۔ سر سید مکتب فکر کی متین صحافت کے دوش بدوش مزاحیہ صحافت میں پھلی پھولی اور اس نے ۱۸۵۷ء کے بعد کی مایوس کن فضا میں زندہ رہنے کا حوصلہ بخشا ۔ انیسویں صدی کے آخر میں روزانہ صحافت کا غلبہ ہو گیا اور اس میں کاروباری پہلو بھی در آیا ، مگر بیسویں صدی کے آغاز میں مولانا ظفر علی خان ، مولانا محمد علی جوہر اور مولانا ابوالکلام آزاد جیسے جری اور نڈر صحافیوں نے صحافت کو دوسری انتہا پر پہنچا دیا ۔ پچاس پچپن برس میں صحافت کا خوشامد سے بغاوت اور مبارزت کی حد تک پہنچ جانا کوئی معمولی کارنامہ نہیں ہے ۔ روزنامہ 'زمیندار' کے ابتدائی دور ، 'کامریڈ' ، 'الہلال' اور 'ہمدرد' نے صحافت کا معیار قائم کیا جس کے بعد کی صحافت معنوی اعتبار سے اس پر قائم نہ رہ سکی ۔

ادبی پہلو

اردو صحافت اور ادب میں سرسید احمد خان کے بعد مولانا ظفر علی خان ، مولانا محمد علی جوہر اور مولانا ابوالکلام آزاد کی صحافت کے آغاز تک اسلوب کے اعتبار سے کوئی نئی تحریک نہیں ملتی ۔ قدیم مشکل پسندی کا دور تو پہلے ہی ختم ہو چکا تھا ۔ 'ہمسہ اخبار' اور 'اخبار عام' وغیرہ نے اردو صحافت کو ادب سے الگ کرنے اور صحافت میں اخبارات غالب کرنے کے سلسلے میں

نمایاں کام کیا ۔ اردو صحافت کی زبان کو بھی اخباری زبان بنانے کی کشوش کی مگر بیسویں صدی کے شروع میں صحافت و ادب میں سرسید کی عقلیت اور علمیت کے خلاف ردّ عمل شروع ہوا ۔ سرسید کی تحریک بعد ازاں ٹیگور اور آسکر وائلڈ کے زیر اثر کر رومانی بن گئی ۔ حانجہ 'مخزن' کے بیشتر لکھنے والوں پر رومانویت غالب تھی ۔ . . . یہ تحریک ہلکے پھلکے انداز تخیل کی کار فرمائی اور زبان میں ادبی چاشنی سے عبارت ہے ۔ اس زمانے میں ادب ایک بار پھر اخباریت پر یورش کر دیتی ہے ۔ 'ملائے عام' اور 'ریاض الاخبار' وغیرہ سے وابستہ صحافی بنیادی طور پر ادیب تھے اور صحافت کو ادبی سطح پر لے جانا چاہتے تھے ۔ دوسرے گروہ میں شامل لوگ صحافی پہلے تھے ادیب بعد میں ۔ اس لیے ان کے ہاں اسلوب کی جدت کے باوجود صحافت کی عام اور سادہ روش ملتی ہے ۔ مولانا ظفر علی خان ، مولانا محمد علی جوہر ، مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا حسرت موہانی ادیب بھی تھے اور پر جوش خطیب بھی ۔ وہ عالم بھی تھے اور سیاست دان بھی ۔ ان کا زمانہ تقریر و تحریر میں پر جوش خطابی انداز کا متقاضی تھا ۔ چنانچہ انہوں نے صحافت کو نعرۂ مستانہ دیا ۔ زبان 'پرجوش ، جارحانہ اور چونکا دینے والی ہے ۔ یہ زعماء چونکہ افق صحافت پر چھائے ہوئے تھے ، اس لیے ان کے زیر اثر صحافتی اسلوب کی جگہ ادبی اسالیب نے لے لی ۔ ان کی صحافت ادبی صحافت تھی ۔ انہوں نے صحافت میں جذباتی نگاری کو فروغ دیا ۔ مگر اس سے بعض دوسرے اہم راستے بند ہوگئے ۔

☆ ☆ ☆

کتابیات

۱ - Barns, Margarita, *The Indian Press*, George Allen & Unwin Ltd., 1940.

۲ - Natrajan, S. : *A History of the Indian Press in India*, Asia Publishing House, 1962.

۳ - صدیقی ، محمد عتیق ، ہندوستانی اخبار نویسی (کمپنی کے عہد میں) انجمن ترقیٔ اردو ہند ، (علی گڑھ) ۱۹۵۷ء

۴ - خورشید ، عبدالسلام ، صحافت پاکستان و ہند میں ، مجلس ترقیٔ ادب لاہور ، ۱۹۶۳ء

۵ - بدر شکیب ، اردو صحافت ، کاروان ادب کراچی ، ۱۹۵۲ء

۶ - حالی ، الطاف حسین ، حیات جاوید

۷ - مولوی عبدالحق ، سرسیّد احمد خان

۸ - Sir Abdul Qadir, *Famous Urdu Poets and Writers*

۹ سردار مسیح گل ، تنقیدی ادب

۱۰ مضامین چکبست

۱۱ - جدید اردو نثر

۱۲ - مخزن ، تحقیقی و تجزیاتی مطالعہ ، تحقیقی مقالہ از عبدالشکور ، شعبۂ صحافت پنجاب یونیورسٹی ، لاہور

۱۳ - کامریڈ (تحقیقی مقالہ ، انگریزی میں) شعبہ صحافت ، پنجاب یونیورسٹی ۔ لاہور

۱۴ - جعفری ، رئیس احمد ، سیرت محمد علی

۱۵ - ذوالفقار ، غلام حسین ، ظفر علی خان ، ادیب و شاعر

۱۶ - قاضی عبدالغفار ، آثار ابوالکلام آزاد

۱۷ - *Selections from The Comrade*

۱۸ - Mohammad Ali : *My life—A Fragment*

سولھواں باب

اردو شعراء کے تذکرے

انیسویں صدی عیسوی کا آغاز کئی وجوہ سے اردو زبان و ادب کی ترقی کے لیے مبارک ثابت ہوا۔ سب سے اہم بات یہ ہوئی کہ فورٹ ولیم کالج کی معرفت پہلی بار اردو کا چھاپا خانہ قائم ہوا اور شاعری کے ساتھ ساتھ اردو نثر کی طرف بھی توجہ کی گئی۔ اس سے پہلے قرآن پاک کے بعض تراجم اور فارسی قصوں کے دو ایک مسجع و مرصع اردو ترجمے تو ملتے تھے، لیکن ادبی نثر کا کوئی نمونہ موجود نہ تھا۔ ڈاکٹر گلکرسٹ اور ان کے رفقائے کار کی کوششوں سے فورٹ ولیم کالج کے شعبۂ تصنیف و تالیف نے نثر کی جانب خصوصی توجہ کی اور اس توجہ کے نتیجے میں مختلف نوعیت کی متعدد نثری کتابیں تھوڑے ہی عرصے میں سامنے آ گئیں۔ نثر کی اس مقبولیت اور رفتارِ ترقی کا اثر تذکرہ نگاری پر بھی پڑا۔ سب سے نمایاں اور اہم بات یہ ہوئی کہ اردو شعراء کے تذکرے فارسی زبان کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی لکھے جانے لگے۔ چنانچہ انیسویں صدی عیسوی کے اوائل ہی میں جو دو تذکرے سامنے آئے ان میں 'گلدستۂ حیدری'، مؤلفہ سید حیدر بخش حیدری (۱۸۰۲ء/۱۲۱۷ھ) اور 'گلشنِ ہند'، مؤلفہ مرزا علی لطف مرقومہ ۱۸۰۰ء/۱۲۱۵ھ اردو زبان ہی میں ہیں۔ دوسری اہم بات یہ ہوئی کہ تذکرہ نگاری سے اہلِ مغرب کو بھی دلچسپی پیدا ہوئی اور اس دلچسپی کے نتیجے میں اردو شعراء کے بعض تذکرے انگریزی اور فرانسیسی زبانوں میں بھی لکھے گئے۔ تذکرہ نگاری کی قدیم روش میں بھی نمایاں تبدیلیاں ہونے لگیں۔ اس سے پہلے یہ ہوتا تھا کہ اہلِ ذوق حضرات یا خود شعرائے کرام اپنے پسند کے اشعار اور منتخبات کی بیاضیں تیار کر لیتے تھے۔ ان بیاضوں میں اشعار کے ساتھ جب شاعر کا نام اور مختصر سوانح کا اضافہ کر دیا جاتا تھا تو وہ آسانی سے تذکرے میں بدل جاتی تھیں۔ اب یہ صورت نہ رہی بلکہ تذکرہ نگاری کے لیے مختلف ممکن ذرائع سے مواد فراہم کیا جانے لگا۔ پہلے یہ ہوتا تھا کہ خود شاعر یا اس کے دوستوں اور شاگردوں سے بہ آسانی جو کچھ معلوم ہو جاتا تھا بغیر تحقیق اسی کو تذکروں میں شامل کر دیا جاتا تھا۔ اگر کسی کی بیاض یا تذکرے سے استفادہ بھی کیا جاتا تو اسے راز ہی رکھا جاتا تھا۔ مآخذ کا سراغ یا حوالہ دینے کا رواج نہ تھا۔ انیسویں صدی کے تذکروں کی روش اس سے قدرے مختلف ہو گئی۔ اب دوستوں اور عزیزوں سے سنی ہوئی باتوں کے علاوہ اخبار، رسائل، اشتہارات، فہرستِ کتب اور باہم مراسلت سے بھی مدد لی جانے لگی گویا انیسویں صدی میں تذکرہ نگاری دستاویزی شہادتوں اور کارآمد حوالوں کی بدولت بیاض سے بہت آگے بڑھ کر ادبی سوانح نگاری کی حدود میں داخل ہونے لگی۔ چنانچہ انیسویں صدی کے اوائل ہی میں بعض

ایسے تذکرے وجود میں آ گئے جن میں شعراء کے نام ، تخلّص ، تلمّذ ، توطّن ، تعلیم ، تربیت ، خاندان ، ماحول ، ذریعۂ معاش اورکارناموں کو پہلے کے مقابلے میں زیادہ تحقیق و تفصیل سے بیان کرنے کی کوشش ملتی ہے ۔ اس کوشش نے انیسویں صدی کے تذکروں میں خاصا تنوّع پیدا کر دیا ہے ۔ یہ تنوّع مواد اور ہیئت دونوں میں ملتا ہے ۔ اس سے پہلے کے تذکرے ایک ہی نہج پر مرتب کیے جاتے تھے ۔ فرق اتنا تھا کہ کسی کے یہاں شعراء کی تعداد کم تھی ، کسی کے یہاں زیادہ ۔ ورنہ انتخاب کلام اور سوانح حیات کے اختصار کے لحاظ سے وہ یک رنگے ہوتے تھے ۔ یہی وجہ ہے کہ محسن کے 'سراپا سخن' ، سعادت خان ناصر کے 'خوش معرکۂ زیبا' ، صہبائی کے 'انتخاب دواوین' اور یکتا کے 'دستور الفصاحت' کے طرز کے تذکرے اٹھارھویں صدی میں نظر نہیں آتے ۔ 'سراپا سخن' کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں جسم کے سارے اجزاء یعنی سر سے لے کر پاؤں تک کے موضوع پر شعراء کی جتنی غزلیں مل سکی ہیں انہیں یکجا کر دیا گیا ہے ۔ 'انتخاب دواوین' اور 'دستور الفصاحت' میں صرف نمایندہ شعراء کو جگہ دی گئی ہے ۔ یوں سمجھ لیجیے کہ ان تذکروں میں ادبی اور تاریخی اسالیب کی ارتقائی کڑیوں کو ملانے کی شعوری کوشش کی گئی ہے جو اس سے پہلے اٹھارھویں صدی کے تذکروں میں نایاب ہے ۔

انیسویں صدی عیسوی کے تذکروں میں پہلے تذکروں کے برخلاف ایک اہم اضافہ بھی یہ نظر آتا ہے کہ ان تذکروں میں شعراء کے حالات زندگی اور انتخاب کلام کے ساتھ ساتھ شعر و ادب کے مروّجہ موضوعات و مسائل پر بھی بحثیں چھیڑی گئی ہیں ۔ مثال کے طور پر ، زبان کیا ہے؟ اردو زبان کب اور کہاں پیدا ہوئی ؟ اس کی پیدائش کے کیا اسباب ہیں ؟ شاعری کیا ہے ؟ اس کا آغاز کب سے ہوا ہے ؟ اردو کے اولیں شعراء کون کون سے ہیں ؟ مختلف زمانوں میں اردو شاعری کی کیا خصوصیت و نوعیت رہی ہے ؟ شاعری کا فن کیا ہے ؟ اس فن کا ارتقاء کس طرح ہوا ہے ؟ شاعری کی بلحاظ ہیئت کتنی قسمیں ہیں ؟ ان اقسام کے لوازم کیا ہیں ؟ عروض و قافیہ کسے کہتے ہیں ؟ ان کے عیوب و محاسن کیا ہیں اور شاعری میں وہ کس طرح اثر انداز ہوتے ہیں ؟ اس طرح کے اور بہت سے سوالات انیسویں صدی کے تذکروں کے مقدموں اور دیباچوں میں اٹھائے گئے ہیں اور ان کے جوابات دینے کی کوشش کی گئی ہے ۔ اس سلسلہ میں گارساں دتاسی ، امام بخش صہبائی ، کریم الدین ، احمد علی خان یکتا اور قادر بخش صابر کے تذکرے خصوصیت سے قابل ذکر ہیں ۔ ان تذکروں میں زبان اور شاعری کے متعلق جو تفصیلی بحثیں ملتی ہیں وہ آج ہمارے لیے کس حد تک قابل قبول ہیں یہ ایک الگ سوال ہے ، لیکن ان بحثوں کی اہمیت و افادیت سے انکار ممکن نہیں ۔ اس لیے دراصل انہیں بحثوں نے اردو کی ادبی تاریخ و تنقید کی مختلف کڑیوں کو ایک لڑی میں پرونے اور نئی راہ پر لگانے میں ہماری راہنمائی کی ہے ۔

انیسویں صدی میں اشاعت و طباعت اور مواد کی فراہمی میں آسانیوں کے سبب تذکرہ نگاری کی رفتار بھی قدرے تیز رہی ہے ۔ چنانچہ انیسویں صدی کے آغاز سے لے کر ۱۸۵۷ء کے

درمیانی عرصے میں دو درجن سے زائد تذکرے لکھے گئے ہیں ۔ ان تذکروں میں 'عمدۂ منتخبہ' مؤلفہ اعظم الدولہ سرور ، 'مجمع الانتخاب' مؤلفہ شاہ کمال ، 'ریاض الفصحا' مؤلفہ مصحفی ، 'مجموعۂ نغز' مؤلفہ قدرت اللہ قاسم ، 'تذکرۂ بے جگر' مؤلفہ خیر تی لعل بے جگر ، 'دیوانِ جہاں' مؤلفہ بینی نرائن جہاں، 'طبقاتِ سخن' مؤلفہ غلام محی الدین مبتلا ، 'تذکرۃ الشعراء' مؤلفہ ابن امین طوفان ، 'دستور الفصاحت' مؤلفہ احمد علی خان یکتا ، 'گلشنِ بے خار' مؤلفہ مصطفی خان شیفتہ ، 'تاریخِ ادبِ ہندوستانی' مؤلفہ گارساں دتاسی ، 'انتخابِ دواوین' مؤلفہ امام بخش صہبائی ، 'مدائح الشعراء' مؤلفہ عنایت حسین خان مہجور ، تذکرہ 'بہارِ بے خزاں' مؤلفہ احمد حسن سحر ، 'گلدستۂ نازنیناں' مؤلفہ کریم الدین ، 'گلستانِ بے خزاں' مؤلفہ قطب الدین باطن ، 'خوش معرکۂ زیبا' مؤلفہ سعادت خان ناصر ، 'طبقات الشعرائے ہند' مؤلفہ کریم الدین ، 'سراپا سخن' مؤلفہ محسن علی محسن ، 'یاد گارِ شعراء' مؤلفہ اشپرنگر ، 'گلشنِ ہمیشہ بہار' مؤلفہ نصراللہ خان خویشگی اور 'گلستانِ سخن' مؤلفہ قادر بخش صابر وغیرہ کے نام آتے ہیں ۔ یہ تذکرے بلحاظِ زبان دو خاص گروہوں میں تقسیم کیے جاسکتے ہیں ۔ ایک وہ جو فارسی زبان میں ہیں ، دوسرے وہ جو اردو یا کسی اور زبان میں لکھے گئے ہیں ۔ پہلے گروہ میں 'عمدۂ منتخبہ' ، 'مجمع الانتخاب' ، 'ریاض الفصحا' ، 'مجموعۂ نغز' ، 'تذکرہ بے جگر' ، 'دیوانِ جہاں' ، 'طبقاتِ سخن' ، 'تذکرہ ابنِ امین طوفان' ، 'دستور الفصاحت' ، 'گلشنِ بے خار' ، 'مدائح الشعراء' ، 'تذکرہ بہارِ بے خزاں' اور 'گلشنِ ہمیشہ بہار' کے نام آتے ہیں ۔ اب ان تذکروں کو طرزِ قدیم کے تذکرے بھی کہہ سکتے ہیں اس لیے کہ ان کی روش ظاہری و معنوی دونوں لحاظ سے اٹھارھویں صدی کے تذکروں سے الگ نہیں ہے ۔ باقی تذکرے اردو ، فرانسیسی یا انگریزی میں لکھے گئے ہیں اور یہ اپنے مواد و طریقۂ کار کے لحاظ سے پچھلے تذکروں سے اس درجہ مختلف ہیں کہ انہیں طرزِ جدید کے تذکرے کہنا زیادہ مناسب ہوگا ۔

عمدۂ منتخبہ

طرزِ قدیم کے تذکروں میں 'عمدۂ منتخبہ' سب سے ضخیم ہے ۔ اس میں ایک ہزار کے قریب قریب شعراء کا ذکر آیا ہے ۔ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی کے مطابق اس تذکرے کا سالِ آغاز ۱۸۰۱ء/۱۶-۱۲۱۵ھ اور سال اختتام ۱۸۰۹ء/۱۲۲۴ھ ہے[1]۔ لیکن بعض حضرات کا خیال ہے کہ اس میں ۱۸۰۹ء / ۱۲۲۴ھ کے بعد بھی سات آٹھ سال تک اضافے ہوتے رہے ہیں[2]۔ جیسا کہ کہا جا چکا ہے اس تذکرے کا انداز اٹھارھویں صدی کے تذکروں سے الگ نہیں ہے ۔ حالاتِ زندگی بہت مختصر ہیں ۔ کلام کے انتخاب میں البتہ قدرے اہتمام

---

(۱) ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی (مرتب) مقدمہ 'عمدۂ منتخبہ' مطبوعہ دہلی یونیورسٹی ۱۹۶۱ء ۔

(۲) مخطوطات انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی ۔ جلد اول ۔ ص ۱۳۹ ، مطبوعہ ۱۹۶۵ء ۔

کیا گیا ہے۔ ہر چند کہ یہ تذکرہ اس پرآشوب عہد میں لکھا گیا ہے جب کہ ذوق، غالب اور مومن وغیرہ کی شہرت کا آفتاب چڑھ رہا تھا اور شاہ عالم نابینا کی سلطنت دہلی سے پالم تک رہ گئی تھی، لیکن اس تذکرے سے اس زمانے کی سیاسی و سماجی زندگی پر کوئی روشنی نہیں پڑتی، سوانحی اور تنقیدی اشارے بھی برائے نام ہیں۔ پھر بھی ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی کے لفظوں میں "'تذکرۂ سرور' اپنے عہد کے عمومی رجحانات کا پابند ہے۔ سرور نے مذاقِ شعر میں بھی ان کے ذاتی رجحانات کے علاوہ اس دور کے اثرات کا پرتو دکھائی دیتا ہے۔ اس لیے کہ انہوں نے صحتِ محاورہ پر زور دیا ہے۔ 'غزل ہائے طولانی' کی مذمت کی ہے اور لکھا ہے کہ ایہام گوئی کا دور ختم ہو چکا ہے"(۱)۔

مجموعہ الانتخاب

'مجموعہ الانتخاب' مؤلفہ شاہ کمال مرقومہ ۱۸۰۴ء/۱۲۱۹ھ(۲) بھی 'عمدۂ منتخبہ' کے ڈھب پر ہے۔ یہ بھی فارسی میں ہے اور ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔ اس کے دو قلمی نسخے کتب خانۂ نواب سالار جنگ حیدر آباد میں، ایک ایشیاٹک سوسائٹی لندن اور ایک انجمن ترقی اردو (ہند) میں محفوظ ہیں۔ نثار احمد فاروقی نے ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو اور قاضی عبدالودود کے حوالے سے لکھا ہے کہ اس کا ایک نسخہ برٹش میوزیم لندن اور ایک کلکتے میں بھی ہے(۲)۔ ڈاکٹر نذیر احمد علوی کے بیان کے مطابق زاہدہ ابوالحسن کو اس کا ایک مخطوطہ حیدر آباد کے کسی ذاتی کتب خانے میں بھی ملا ہے(۳)۔ ایشیاٹک سوسائٹی کے قلمی نسخے کا ایک فوٹو اسٹیٹ انجمن ترقی اردو کراچی کے کتب خانے میں موجود ہے۔ اس تذکرے کی ترتیب میں 'نکات الشعراء'، 'مخزنِ نکات' اور مصحفی کے 'تذکرۂ ہندی' سے خصوصاً مدد لی گئی ہے۔ چنانچہ اس میں بیشتر انہیں شاعروں کا ذکر ہے جو میر، قائم اور مصحفی کے مذکورہ بالا تذکروں میں آ چکے ہیں۔ شعراء کے حالات قدیم تذکروں کی روشِ عام کے مطابق بہت مختصر ہیں۔ کلام کے منتخبات البتہ خاصے طویل ہیں اور اسی طوالت نے اس کو ضخیم بنایا ہے۔ اس کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ غزل کے اشعار کے علاوہ اس میں مرثیہ، ہجو، مخمس، قصیدہ اور مثنوی کے اقتباسات بھی بطور نمونہ کہیں کہیں دیے گئے ہیں اس سے یہ فائدہ ہے کہ اس زمانے کی غزل گوئی کے ساتھ ساتھ دوسرے اصنافِ سخن کے ارتقاء و معیار کا اندازہ کرنے میں مدد ملتی ہے۔

---

(۱) ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی (مرتب) مقدمہ عمدہ منتخبہ

(۲) نصیرالدین ہاشمی، شعرائے اردو کا نایاب تذکرہ۔ ص ۷۱ تا ۹۱ مطبوعہ رسالہ اردو، بابت جنوری ۱۹۵۶ء۔

(۳) تین تذکرے (تلخیص و مقدمہ)۔ ص ۲، مطبوعہ دلی ۱۹۶۸ء۔

(۴) رسالہ تذکرہ، مطبوعہ دلی۔

ریاض الفصحاء

'ریاض الفصحاء' مؤلفہ مصحفی کا نام تاریخی ہے ۔ اس سے ۱۸۰۶ء/۱۲۲۱ھ برآمد ہوتے ہیں ۔ لیکن اس میں ۱۸۲۰ء/۱۲۳۶ھ تک اضافے ہوتے رہے ہیں ۔ یہ مصحفی کا دوسرا تذکرہ ہے اس سے پہلے وہ 'تذکرۂ ہندی' کے نام سے شعرائے اردو کا ایک تذکرہ ۱۷۹۴ء/۱۲۰۹ھ میں لکھ چکے تھے۔ 'ریاض الفصحاء' بھی فارسی میں ہے اور پہلے تذکرے کے مقابلے میں ضخیم ہے ۔ اس تذکرے کے ذریعہ اس زمانے کے شعراء اور ماحول کے متعلق بہت سی نئی باتیں سامنے آتی ہیں ۔ وجہ یہ ہے کہ مصحفی ایک خوش فکر شاعر تھے اور ان کے دوستوں اور شاگردوں کا حلقہ بھی بہت وسیع تھا ۔ اس حلقے میں حاتم ، خواجہ میر درد ، میر ، سودا اور فغان جیسے بزرگ بھی تھے ۔ قائم ، جرأت ، سوز ، بقا ، انشا اور میر حسن جیسے ہم عصر اور آتش و ناسخ ، نصیر و رنگین ، ممنون و طپش اور خلیق و افسوس بھی شامل تھے ۔ مصحفی نے ان میں سے اکثر کا حال لکھا ہے اور ذاتی معلومات کی بناء پر لکھا ہے ۔ سوانح سے ہٹ کر اس زمانے کی شاعری اور ادب کے اتار چڑھاؤ کی کیفیت بھی معلوم ہوتی ہے ، مثلاً حاتم کے حوالے سے 'دیوان ولی' کا شاہجہان آباد میں آنا ، حاتم کے 'دیوان زادہ' اور ان کی جگت استادی کا چہار طرف شہرہ ہونا ، بعض صاحبوں کا ایہام گوئی پر اردو شاعری کی بنیاد رکھنا اور بعض شاعروں کا آنکھوں دیکھا حال بیان کرنا اور اس طرح کے بہت سے تاریخی و تہذیبی رجحانات و واقعات ہیں جن کا علم ہمیں 'ریاض الفصحاء' کے ذریعے ہوتا ہے[1]۔

مجموعۂ نغز

'مجموعۂ نغز' مؤلفہ میر قدرت اللہ قاسم بھی قدیم تذکروں میں خاصا ضخیم ہے اور ۱۸۰۶ء/۱۲۲۱ھ میں مکمل ہوا ہے اس میں قدیم دکنی شعراء سے لے کر شہ عالم ثانی کے عہد تک کے شاعروں کا ذکر آیا ہے ۔ حالات زندگی یہاں بھی مختصر ہیں ۔ پھر بھی بہت سی اہم باتیں مل جاتی ہیں جو تاریخ کی گم شدہ کڑیوں کی بازیابی میں مدد کرتی ہیں ۔ اس تذکرے سے بعد کے اکثر تذکرہ نگاروں نے مدد لی ہے ۔ خصوصاً 'آب حیات' مؤلفہ محمد حسین آزاد کے بہت سے واقعات ، جنہیں اب تک صرف آزاد کی اختراع سمجھا جاتا تھا ، اسی تذکرے سے ماخوذ ہیں ۔ مثلاً ولی اور ناصر علی کی شاعرانہ نعلی کا قصہ ، سراج الدین علی خان آرزو کی عالمانہ شخصیت اور ان کی بدیہہ گوئی کا بیان ، سودا کے اشعار کو حدیث قدسی سے تعبیر کرنا اور تنک مزاجی کا تذکرہ ، ولی کے متعلق ''شاعریست از شیطان مشہور'' کا حکم لگانا ، انشاء اور عظیم کے معرکے کا حال ، جرأت ، میر حسن ، محمد امان نثار ، بقاء الدین بقا اور

---

(۱) مولوی عبدالحق (مرتب) مقدمہ ریاض الفصحا مطبوعہ انجمن ترقی اردو ، اورنگ آباد ۱۹۳۴ء ۔

نموں وغیرہ کی سوانحِ حیات کا زیادہ حصہ، آزاد نے قدرت اللہ قاسم ہی کے تذکرے سے لیا ہے[1]۔

فارسی زبان کے بعض دوسرے تذکرے مثلاً 'دیوانِ جہان' مؤلفہ بنی نرائن جہاں، 'گلشنِ ہمیشہ بہار' مؤلفہ خیشگی، 'بہارِ بے خزاں' مؤلفہ احمد حسین، اور 'تذکرہ ابنِ امین طوفان' وغیرہ میں انتخابِ کلام کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ ان تذکروں کی اہمیت صرف اس بات میں ہے کہ ان کے ذریعہ بعض شعراء کے گم شدہ اشعار اور نایاب غزلیں دستیاب ہو جاتی ہیں۔

تذکرۂ بے جگر

'تذکرۂ بے جگر' ہنوز غیرمطبوعہ ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ انڈیا آفس لندن میں محفوظ ہے۔ اس کی نقل مملوکہ خواجہ مشفق (کراچی) میرے سامنے ہے۔ اس کے شعرا کے تراجم 'دیوانِ جہان' کے مقابلے میں بہت تفصیلی ہیں اور زیادہ تر مبتلا میرٹھی کے تذکرے 'طبقاتِ سخن' اور مصحفی کے 'تذکرۂ ہندی' سے لیے گئے ہیں۔ اس میں سوانحی عناصر تو ملتے ہیں، لیکن تنقیدی عناصر نہ ہونے کے برابر ہیں۔

'طبقاتِ سخن' مؤلفہ غلام محی الدین مبتلا میرٹھی پر تبصرہ کرتے ہوئے نثار احمد فاروقی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ:

> "بے جگر نے ایک جگہ منشی مہر چند مہر لاہوری (ساکن لکھنؤ) کی تاریخِ ولادت ۱۷۸۲ء بتائی ہے اور لکھا ہے کہ ان کی عمر ۵۰ سال ہے۔ اس حساب سے دیکھا جائے تو بے جگر نے اپنا تذکرہ ۱۸۲۱ء/۱۲۳۷ھ کے اس پاس مرتب کیا ہے"[2]۔

مہر چند مہر کے بارے میں بے جگر کے اصل الفاظ یہ ہیں:

> "مہر چند در سن یک ہزار یک صد و ہفتاد و دو ہجری روز شنبہ در کوڑا جہان آباد . . . . تا حال کہ عمر شریفش بہ پنجاہ و پنج سال رسیدہ بخدمت لائقہ حیات مستعار را می گذراند"۔

اس بیان کی روشنی میں نثار احمد فاروقی کا یہ کہنا کہ 'تذکرۂ بے جگر' ۱۸۲۱ء/۱۲۳۷ھ کے آس پاس مرتب ہوا ہے، کچھ ایسا غلط نہیں ہے۔ لیکن فاروقی صاحب نے غالباً اس تذکرے کے

---

(۱) مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے، حافظ محمود خان شیرانی، مقدمہ مجموعۂ نغز، مطبوعہ پنجاب یونیورسٹی، لاہور ۱۹۳۳ء۔

(۲) نگار (لکھنؤ) بابت ستمبر ۱۹۰۹ء۔

دوسرے تراجم پر نظر نہیں ڈالی ورنہ وہ ۱۸۲۱ء/۱۲۳٦ھ کے بجائے ۱۸۲٦ء/۱۲۴۲ھ کے آس پاس لکھتے ، اس لیے کہ ۱۸۲٦ء/۱۲۴۲ھ تک کے اندراجات کا ثبوت اس کے بعض تراجم سے ملتا ہے ، چند مثالیں دیکھیے ، عشق و مبتلا میرٹھی کے بارے میں مؤلف نے لکھا ہے کہ ۱۸۲۵ء/۱۲۴۱ھ میں انتقال کیا ۔ اصل الفاظ یہ ہیں :

''اخرس فی سنہ یک ہزار و دو صد و چہل و یک در شہر رمضان روز پنجشنبہ ازیں جہان گذران برفت'' ۔

میر قاسم علی کے ترجمے میں مؤلف نے بلاواسطہ ذکر ہے اصل عبارت یہ ہے :

''... میر قاسم علی تا به سلمہ اللہ تعالی ... فی سنہ یک ہزار و دو صد چہل و دو ... او ... تقریبے ... از متوطن خود اتفاق رسیدن در میرٹھ . . . مسود مجموعہ بنادر خورد'' ۔

ان عبارتوں سے صاف ظاہر ہے کہ پہلا ترجمہ ۱۸۲۵ء/۱۲۴۱ھ اور دوسرا ۱۸۲٦ء/۱۲۴۲ھ کے بعد لکھا گیا ہے ۔ اس لیے اس کا تکملہ ۱۸۲٦ء/۱۲۴۲ھ کے بعد کے قریبی سن میں ہوا ہوگا ۔ ۱۸۲٦ء/۱۲۴۲ھ کے بعد کا کوئی سن تذکرے میں نظر نہیں آتا ۔ وثوق کے ساتھ اس تذکرے کے سالِ تصنیف کے متعلق کچھ کہنا یوں آسان نہیں کہ اس کا جو قلمی مسودہ ہمارے سامنے ہے وہ ان معنوں میں ناقص الاول و والاخر ہے کہ دیباچہ یا مقدمہ و خاتمہ سے عاری ہے ۔ انشاء اللہ خان انشاء کے اشعار اور شاہ عالم آفتاب کے ترجمے سے شروع ہو کر نعام اللہ یقین کے ترجمے پر تذکرہ ختم ہو جاتا ہے ۔

خیراتی لعل بے جگر نے اس کی تالیف میں اردو فارسی شعراء کے کئی تذکروں مثلاً 'گلِ رعنا' مؤلفہ شفیق ، 'خزانۂ عامرہ' مؤلفہ آزاد بلگرامی ، 'طبقاتِ سخن' عشقی ، مبتلا میرٹھی' 'نشتر عشق' مؤلفہ آغا حسین قلی خان ، 'مجمع النفائس' مؤلفہ سراج الدین علی خان آرزو ، 'تذکرۂ ہندی' مؤلفہ مصحفی اور 'سفینۂ خوشگو' مؤلفہ بندرابن داس خوشگو وغیرہ سے مدد لی ، مصحفی اور عشقی میرٹھی کے تذکرے خصوصاً ان کے سامنے رہے ہیں ۔ بے جگر نے بعض دوسرے تذکرہ نگاروں کی طرح اپنے ماخذ پر پردہ نہیں ڈالا بلکہ جہاں سے جو کچھ اور جتنا اخذ لیا ہے اس کا سراغ دے دیا ہے ۔ نتیجتاً ان کا تذکرہ شعراء کے حالات کے ماخذ میں خاصا وقیع ہو گیا ہے ۔ بے جگر نے دوسرے تذکروں سے مدد لینے کے ساتھ ساتھ اپنی طرف سے بھی بہت کچھ اضافے کیے ہیں ۔ اس اضافے کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ بے جگر نے اردو شعراء کے جن تذکروں کے حوالے دیے ہیں ، ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں جس میں دو سو سے زائد شعراء کا ذکر آیا ہو ۔ اس کے برعکس بے جگر کے تذکرے میں چار سو کے قریب شعراء کا کلام بھی شامل ہے ۔ خاص بات یہ ہے کہ مؤلف نے شعراء کے تلمذ ، ولدیت ، سکونت ، پیشہ ،

عمر ، سالِ پیدائش ، سفر ، مقام ، سالِ وفات ، احباب اور اعزا کی نشان دہی اکثر جگہ کی ہے۔ سنِ وفات کے ثبوت میں مؤلف نے خود بھی قطعاتِ تاریخی کہے ہیں اور بعض دوسرے شعراء کے بھی قطعات نقل کیے ہیں۔ ابرو کے سلسلے میں لکھا ہے کہ ۱۷۳۳ء/۱۱۴۶ھ میں وفات پائی۔ اصل عبارت یہ ہے :

''بہ شب جہارم رجب سن ست و اربعین و مأت و الف در گذشت تاریخ وفاتش ازیں رباعی و قطعہ بر آوردہ ام . . . لالہ ہرگوپال نقتہ این قطعہ نوشتہ'' . .

کلب علی خاں فائق رامپوری ، آبرو کی تاریخ وفات کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ ''جہاں تک میرا علم ہے اردو کا صرف ایک تذکرۂ شعراء ایسا ہے جس میں یہ سن دیا ہے۔ یہ خیراتی لعل بے جگر کا تذکرہ ہے جو عہدِ اکبر ثانی کی تصنیف ہے''[1]۔ لیکن آبرو ہی کی تخصیص نہیں ہے اس قسم کی اطلاعات بے جگر نے بہت سے شعراء کے متعلق بہم پہنچائی ہیں۔ انتخابِ کلام میں بعض جگہ صرف ایک دو شعر نقل کیے ہیں ، لیکن ممتاز شعراء میں سے اکثر ایسے ہیں جن کے کئی کئی سو اشعار درج کیے ہیں۔ انتخابِ کلام کی اس طوالت نے اس تذکرے کو بہت ضخیم کر دیا ہے۔ اس میں سکندر آباد اور اس کے نواح کے بہت سے ایسے شعراء کے حالات بھی مل جاتے ہیں جو کسی اور تذکرے میں مذکور نہیں ہیں۔

دیوانِ جہاں و تذکرہ ابنِ امین

'دیوانِ جہاں' مؤلفہ بنی نرائن جہاں بھی فارسی میں ہے اور طبع ہو چکا ہے۔ یہ بنیادی طور پر بیاضِ اشعار ہے۔ اس سے ایک اہم بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ مندرجہ ذیل مطلع کی غزل :

کب رہا ہے اب ہمیں حور و بشر کا امتیاز
دیکھ کر جاتا رہا مجھ کو نظر کا امتیاز[2]

جسے بعض نے مرزا نوشہ غالب سے منسوب کر دیا ہے، در اصل بہادر بیگ خان غالب کی ہے[3]۔

تذکرہ 'ابنِ امین' بھی طبع ہو چکا ہے۔ یہ بہت مختصر سا تذکرہ ہے۔ اس میں صرف اکتالیس شاعروں کا ذکر ہے۔ حالاتِ زندگی ایک دو سطروں میں لکھے گئے ہیں۔ انتخابِ کلام

---

(۱) اوریئنٹل کالج میگزین لاہور۔ ص ۹ ، بابت مئی ۱۹۶۰ء۔

(۲) کلیم الدین احمد مرتب دیوان جہاں - ص ۱۷۸ تا ۱۸۰ مطبوعہ پٹنہ ۱۹۵۹ء مملوکہ قیصر ابن حسن -

(۳) تفصیل کے لیے دیکھیے ، غالب شاعر امروز و فردا - ص ۴۸ تا ۵۰ از راقم الحروف مطبوعہ اظہار سنز لاہور ۱۹۷۰ء -

کا بھی یہی حال ہے ۔ ہاں اپنے استاد یاسین خان اور اپنے والد کے دوست ناسخ کے اشعار علی الترتیب اکیس اور ستر نقل کیے ہیں ۔ ناسخ کے متعلق ایک اہم بات یہ بتائی گئی ہے کہ وہ شاعری میں کسی کے استاد نہ تھے[1] ۔

طبقاتِ سخن

'طبقاتِ سخن' مؤلفہ غلام محی الدین مبتلا میرٹھی بھی فارسی میں ہے اور اس کا سالِ تصنیف ۱۸۰۷ء/۱۲۲۲ھ ہے ۔ یہ اب تک کتابی صورت میں شائع نہیں ہوا ۔ ڈاکٹر محمد حسین نے شاہ جہان پور کے قلمی نسخے کی تلخیص 'ہماری زبان' علیگڑھ میں البتہ بالاقساط شائع کر دی ہے ۔ یہی ہمارے سامنے ہے ۔ ڈاکٹر محمد حسین کے لفظوں میں 'طبقاتِ سخن' اردو ادب کی تاریخ میں یوں اہمیت رکھتا ہے کہ اس میں بعض شعراء کے مفصل حالات درج ہیں ۔ دوسرے یہ کہ اس میں اس زمانے کی اردو نثر کے بعض نمونے خطوط اور لطائف کی صورت میں مل جاتے ہیں ۔ تیسرے یہ کہ اس میں مصنف نے بعض شعراء سے ذاتی ملاقاتوں کی تفصیل دی ہے ۔ چوتھے یہ کہ بعض شعراء کے متعلق کچھ ایسی باتیں مل جاتی ہیں جو کہیں اور درج نہیں ہیں[2] ۔

دستور الفصاحت

'دستور الفصاحت' مؤلفہ حکیم سید احمد علی خان یکتا حس کا ذکر اردو شعراء کے تذکروں کے ساتھ کیا جاتا ہے حقیقتاً تذکرہ نہیں 'دریائے لطافت' کے طرز کی ایک علمی و ادبی تالیف ہے ۔ اس کے تکملہ کا سال ۱۸۳۳ء/۱۲۴۹ھ ہے ، لیکن اس کا آغاز ۱۷۹۸ء/۱۲۱۳ھ سے پہلے ہوچکا تھا ۔ کتاب ، مقدمہ و خاتمہ کے علاوہ پانچ ابواب پر مشتمل ہے ۔ مقدمہ میں اردو کی پیدائش اور ارتقاء کا بیان ہے ۔ خاتمہ میں حند ایسے شعراء کا تذکرہ ہے جن کے حوالے کتاب کے مباحث میں دیے گئے ہیں ۔ گویا اس کتاب کا صرف خاتمہ 'تذکرۃ الشعراء' کے تحت آتا ہے ۔ مولانا امتیاز علی خان عرشی نے صرف مقدمہ کے ساتھ شائع کر دیا ہے ۔ عرشی صاحب کے مقدمے کی روشنی میں اس تذکرے کی مدد سے زبان و ادب کے متعلق بعض اہم اور نئی باتیں سامنے آتی ہیں ۔ مثلاً یکتا نے حسابی تناسب کے ذریعہ اس زمانے کی علمی و ادبی زبان کے متعلق یہ بتایا ہے کہ اس میں تین چوتھائی عربی و فارسی اور ایک چوتھائی ٹھیٹھ ہندی کے الفاظ پائے جاتے ہیں ۔ دوسرے یکتا کے بیان سے یہ پتہ چلتا ہے کہ میر تقی میر خود لکھنؤ نہیں گئے تھے ۔ بلکہ سودا کی وفات کے بعد نواب آصف الدولہ نے انہیں بلوایا تھا ۔ تیسرے یہ کہ میر کی تنک مزاجی کی تصدیق اس تذکرے سے ہوتی ہے ۔ چوتھے یہ کہ میر و سودا کے کلام کے فرق کو انھوں نے بالکل اچھوتے انداز میں

---

(۱) قاضی عبدالودود مرتب مقدمہ تذکرۃ الشعراء ابن طوفان مطبوعہ ادارہ تحقیقات پٹنہ ۱۹۵۸ء ۔
(۲) ہماری زبان علیگڑھ ، بابت ۱۵ جنوری ۱۹۶۰ء تا ۸ اپریل ۱۹۶۰ء ۔

اس طرح ظاہر کیا ہے :

"اگرچہ کلامِ فصاحت نظامش (میر) مثل سعدی بظاہر آسان نظر می آید ولے ممتنع است - بیشتر شعراء مقلد او ہستند و طرزش نمی یا بند بخلاف مرزا محمد رفیع کہ باوجود کمال پختگی کہ دارد تقلیدش ہر صاحبِ فہم را ممکن" -

پانچویں یعنی قیام الدین قائم ، مصحفی ، انشا اور افسوس وغیرہ کے حالاتِ زندگی سے متعلق بعض تفصیلات اس تذکرے میں مل جاتی ہیں[1] -

گلشنِ بے خار

'گلشنِ بے خار' مؤلفہ شیفتہ ۱۸۳۲ء/۱۲۴۸ھ اور ۱۸۳۴ء/۱۲۵۰ھ کے درمیان مکمل ہوا ہے - چنانچہ تذکرے کے آخر میں مومن اور صہبائی وغیرہ کے جو قطعاتِ تاریخی دیے ہوئے ہیں ان سے ۱۸۳۴ء/۱۲۵۰ھ ہی نکلتے ہیں[2]- اور 'گلشنِ بے خار' میں قدماء سے لے کر معاصرین تک کا ذکر کیا ہے، لیکن سب کو نہیں صرف اہم اور ممتاز شعراء کو جگہ دی گئی ہے - اس لحاظ سے ایسے منتخب شعراء کا تذکرہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا - شعراء کے حالاتِ زندگی شیفتہ کے یہاں بھی اگرچہ مختصر ہیں لیکن جو کچھ ہیں اہم اور قابلِ اعتبار ہیں - خصوصاً غالب ، مومن ، ذوق ، آزردہ وغیرہ کے متعلق انہوں نے ایک معاصر کی حیثیت سے جو کچھ لکھا ہے وہ تاریخ اور تنقید دونوں لحاظ سے اہم خیال کیے جانے کے لائق ہے - معاصرین کے متعلق اس تذکرے میں بعض نئی باتیں مل جاتی ہیں ، مثلاً مومن خان مومن اور امت الناظم صاحب جی کے معاشقے کا سراغ پہلے پہل اسی سے ملتا ہے - 'گلشنِ بے خار' میں کلام کے انتخاب اور اس پر رائے زنی کا بھی خاص اہتمام ملتا ہے - شیفتہ کی تنقیدی رائیں بیشتر درست ہیں اور اس بات کا ثبوت فراہم کرتی ہیں کہ شیفتہ عام تذکرہ نگاروں کے برعکس کلام کی پرکھ کا ایک مخصوص معیار رکھتے تھے - اس معیار سے ڈاکٹر عندلیب شادانی صاحب نے اختلاف کیا ہے[3] - لیکن ان کے اختلافی دلائل بہت کمزور ہیں - شیفتہ کی تنقیدی آراء کو آج کی تنقید کی روشنی میں دیکھنا ان کے ساتھ نا انصافی ہے - دیکھنا یہ چاہیے کہ شیفتہ سے پہلے تذکرہ نگاری کی روش کیا تھی اور 'گلشنِ بے خار' میں جو تنقیدی رائیں دی گئی ہیں ان کی اس زمانے کے لحاظ سے کیا اہمیت ہے - عندلیب شادانی مرحوم کے سوا ایک بھی اردو کا کوئی ادیب یا ناقد ہو جس نے شیفتہ کے تنقیدی شعور کا اعتراف نہ کیا ہو - ان کے تنقیدی شعور اور خوش

---

(۱) مولانا امتیاز علی خان عرشی (مرتب) مقدمہ دستور الفصاحت - ص ۳۰ تا ۳۳ ، مطبوعہ ہندوستانی پریس ، رام پور ۱۹۴۳ء -

(۲) شیفتہ ، گلشن بے خار ، مطبوعہ نول کشور پریس لکھنؤ ، ۱۸۷۴ء/۱۲۹۱ھ -

(۳) 'تحقیق کی روشنی میں' مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز ، کراچی ۱۹۶۳ء ، طبع اول -

ذوق کا ایک ثبوت تو یہی ہے کہ انہوں نے صرف منتخب شعراء کا ذکر کیا ہے اور ہر شاعر کے متعلق اچھی یا بری رائے دینا ضروری سمجھا ہے ۔ اس ضرورت کا احساس ان سے پہلے کے تذکرہ نگاروں کے یہاں بہت کم نظر آتا ہے ۔

مدایح الشعراء

'مدایح الشعراء' ہنوز قلمی ہے ۔ اس کا ایک مخطوطہ رامپور میں محفوظ ہے ۔ سب سے پہلے عرشی صاحب نے اس کا تعارف کرایا تھا[1] ۔ بعد ازاں جناب اکبر علی خان کی مرسلہ معلومات کی مدد سے راقم الحروف نے اس کی فہرست شعراء شائع کردی تھی[2]۔ اس وقت رام پور کے نسخے کی ایک نقل مملوکہ خواجہ مشفق راقم الحروف کے پیش نظر ہے اس میں ۱۸۴۴ء/۱۲٦۰ھ تک اضافے ہوتے رہے ہیں اور صرف انسٹھ شاعروں کے مختصر حالات ملتے ہیں ۔ ہر شاعر کے نمونہ کلام کو مولف نے خمسہ ، مسدس ، مثلث یا مربع کر کے پیش کیا ہے ۔ چونکہ یہ تذکرہ بنارس میں لکھا گیا ہے اس لیے زیادہ تر انہیں شعراء کا ذکر ہے جو اس وقت وہاں موجود تھے ۔ اس سے یہ ضرور پتہ ملتا ہے کہ کسی وقت بنارس شعر و سخن کا اہم مرکز رہ چکا ہے ۔

گلشن ہمیشہ بہار

'گلشن ہمیشہ بہار' مؤلفہ نصراللہ خان خشگی میں بھی حالات و کوائف سے زیادہ اشعار کے انتخاب پر توجہ دی گئی ہے ۔ یہ تذکرہ ۱۸۵۳ء/۱۲۷۰ھ میں مکمل ہوا اور اس سال 'فتح الاخبار' کول سے شائع کر دیا گیا ۔ چونکہ یہ مطبوعہ نسخہ بھی تقریباً نایاب ہو گیا تھا اس لیے انجمن ترقی اردو کراچی نے ۱۹٦۷ء میں ڈاکٹر اسلم فرخی کے مقدمہ کے ساتھ دوبارہ شائع کر دیا ہے ۔ سوائے اس کے کہ اس کے ذریعے بعض معاصرین کے متعلق کچھ نئی باتیں معلوم ہو جاتی ہیں ، اور کوئی خاص بات نہیں ہے ۔

تذکرۂ بہار بے خزاں

'تذکرہ بہار بے خزاں' احمد حسین سحر کی تالیف ہے ۔ اور ۱۸۴۵ء/۱۲٦۱ھ میں لکھا گیا ہے اس کا واحد قلمی نسخہ ندوۃ العلماء لکھنؤ کے کتب خانے میں محفوظ تھا جس کی تلخیص اور فہرست شعراء پہلی بار رسالہ 'نگار' پاکستان کراچی میں شائع ہوئی[3] ۔ اب یہ طبع ہو کر منظرعام

---

(۱) امتیاز علی خان عرشی (مرتب) مقدمہ دستور الفصاحت ، مطبوعہ رامپور ۱۹۴۳ء ۔

(۲) نگار (پاکستان) تذکروں کا تذکرہ نمبر (۱۹٦۴ء) ۔ ص ۱۷۱ مرتبہ راقم الحروف ۔

(۳) تذکروں کا تذکرہ نمبر ۔ ص ۱۷۳ ، بابت مئی جون ۱۹٦۴ء مرتبہ راقم الحروف ۔

پر آ گیا ہے ۔ صاف پتہ چلتا ہے اور خود مولف نے لکھا ہے کہ ان کا بنیادی مقصد اشعار کا انتخاب تھا ۔ چنانچہ اس میں آتش کے تین سو بیس ، غالب کے ۱۲۰ ، میر کے ۱۹۵ ، ناسخ کے ۲۰۱ اور مصحفی کے ۱۰۱ اشعار بطور نمونہ درج کیے گئے ہیں ۔ یہ نمونے مؤلف کی خوش ذوق اور تنقیدی شعور کا بہر حال پتہ دیتے ہیں ۔ سحر نے نظیر اکبر آبادی کے بارے میں اپنے معاصرین کے برعکس مناسب رائے دی ہے ۔ وہ انہیں ایک بلند پایہ شاعر سمجھتے ہیں ۔ ذوق ، مومن اور غالب کی شاعری کے متعلق بھی ان کی رائے آج کل کے ناقدین سے ملتی جلتی ہے ۔ وہ غالب کو مومن و ذوق سے بہتر شاعر سمجھتے ہیں[1] ۔ سوانح شعراء کے سلسلے میں بھی بعض نئے پہلو سامنے آتے ہیں ، مثلاً میر تقی میر کے معاشقے کا انکشاف اول اول اسی تذکرے نے کیا ہے ۔ میر کے بارے میں لکھا ہے کہ :

> ''بہ شہر خویش با پری تمثالے کہ از عزیزانش بود در پردہ تعشق طبع و میل خاطر داشتہ آخر عشق او خاصہ مشک پیدا کردہ''[2] ۔

یہ فقرے میر کی عشقیہ شاعری کے بعض نکتوں کو سمجھنے سمجھانے میں معاون ثابت ہوئے ہیں ۔

اب تک جن تذکروں کی اہمیت سے بحث کی گئی ہے وہ سب کے سب فارسی میں ہیں اور مواد و بیان کی ان میں کم و بیش وہی یک رنگی و یکسانگی ہے جو اٹھارھویں صدی عیسوی کے تذکروں کا طرۂ امتیاز ہے ، لیکن انیسویں صدی میں جدید علوم و افکار اور حالات و ماحول کے زیر اثر تذکرہ نگاری اپنی پرانی روش پر قائم نہ رہ سکی ۔ اس میں دوسری تبدیلیوں کے ساتھ ایک تبدیلی یہ ہوئی کہ فارسی کے ساتھ ساتھ دوسری زبانوں میں بھی اردو شعراء کے تذکرے لکھے جانے لگے ۔ چنانچہ انیسویں صدی میں جہاں کئی اہم تذکرے اردو زبان میں لکھے گئے وہاں بعض تذکرے انگریزی اور فرانسیسی زبانوں میں بھی مرتب کیے گئے ۔ ان تذکروں کی روش ، زبان و بیان اور مقصد و مواد ہر لحاظ سے پچھلے تذکروں سے بہت مختلف ہے ۔ ایسے تذکروں میں بلحاظ تاریخ تالیف سر فہرست 'گلشن ہند' مؤلفہ میرزا علی لطف اور 'گلدستۂ حیدری' مؤلفہ حیدر بخش حیدری ہیں ۔ 'گلدستۂ حیدری' جس کا ایک جزو تذکرے کی حیثیت سے بنام 'گلشن ہند' ہی منظر عام پر آیا ہے ۱۸۰۲ء مطابق ۱۲۱۷ھ میں مکمل ہوا ہے[3] ۔ ایسے ڈاکٹر

---

(۱) ڈاکٹر نعیم احمد مرتب مقدمہ تذکرہ بہار بے خزاں ، مطبوعہ علمی مجلس دلی ۱۹۶۸ء مملوکہ قیصر ابن حسن کراچی ۔

(۲) احمد حسین سحر ، تذکرہ بہار بے خزاں ۔ ص ۹۰ ، مطبوعہ علمی مجلس دلی ۱۹۶۸ء ۔

(۳) حیدر بخش حیدری ، مقدمہ گلشن ہند ، مرتب ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو ، مطبوعہ علمی مجلس دلی ۱۹۶۷ء ، طبع اول ۔

مختار الدین احمد نے کتابی صورت میں مفید مقدمہ کے ساتھ شائع کر دیا ہے ۔ اس میں تراجم اور منتخبات دونوں چونکہ بہت ہی مختصر ہیں اس لیے تنقیدی و سوانحی مواد نہ ہونے کے برابر ہے ۔ تذکرے کا مطالعہ بتاتا ہے کہ مؤلف نے زیادہ تر 'گلزار ابراہیم' مؤلفہ ۱۱۹۸/۸۳-۱۷۸۴ء کو سامنے رکھ کر اپنا تذکرہ مرتب کیا ہے[1] ۔ مرزا علی لطف کا تذکرہ موسومہ بہ 'گلشن ہند' حیدری کے 'گلشن ہند' سے دو سال پہلے یعنی ۱۸۰۰ء مطابق ۱۲۱۵ھ میں مکمل ہوا ہے حالانکہ کچھ اضافے بعد میں بھی ہوئے ہیں ۔ یہ تذکرہ اول اول مولانا شبلی کے حاشیائی نوٹ اور مولوی عبدالحق کے بسیط مقدمہ کے ساتھ ۱۹۰۶ء میں رفاہ عام اسٹیم پریس لاہور سے شائع ہوا ۔ بعد کو اسی مطبوعہ نسخے کی لوح 'گلزار ابراہیم' کے ساتھ شائع کر دی گئی اور ۱۹۳۴ء میں 'گلشن ہند' و 'گلزار ابراہیم' دونوں ایک ساتھ منظر عام پر آئے ۔ 'گلشن ہند' مؤلفہ لطف بنیادی طور پر 'گلزار ابراہیم' کا ترجمہ ہے ۔ صرف ۶۸ شاعروں کا اضافہ لطف نے کیا ہے ۔ لیکن بقول مولوی عبدالحق ''یہ نرا ترجمہ نہیں ہے اس میں لطف نے ایسے اضافے کیے ہیں کہ یہ ایک الگ تذکرہ بن گیا ہے ۔ یہ تذکرہ میر امن کی 'باغ و بہار' سے کچھ پہلے لکھا گیا ہے گویا اس زمانے کی تالیف ہے جب کہ ادبی نثر کا کوئی معیار یا نمونہ موجود نہ تھا ، اس لحاظ سے یہ قدیم اردو نثر کا ایک قیمتی سرمایہ ہے اور اس کے ذریعہ محقق علم اللسان کو اور ان لوگوں کو جنہیں زبان کا چسکا ہے بہت کچھ نئی باتیں معلوم ہو سکتی ہیں''[2] ۔

گارساں دتاسی کا تذکرہ

جدید طرز کے دوسرے اہم تذکرہ نگاروں میں گارساں دتاسی و امام بخش صہبائی ، کریم الدین ، قطب الدین باطن ، سعادت خان ناصر ، محسن علی محسن اور ڈاکٹر اشپرنگر کے تذکروں کے نام آتے ہیں ۔ گارساں دتاسی نے اردو شعراء اور مصنفین کا حال تذکرے کے طرز پر فرانسیسی زبان میں 'تاریخ ادب ہندوی' کے نام سے لکھا تھا ۔ اس کی پہلی جلد ۱۸۳۹ء میں شائع ہوئی ۔ دوسری جلد ۱۸۴۷ء میں منظر عام پر آئی اور ۱۸۷۰ء اور ۱۸۷۱ء کے درمیان گارساں نے اس کا دوسرا ایڈیشن نئے مواد کے ساتھ تین جلدوں میں شائع کیا ۔ پہلی جلد کا ترجمہ کریم الدین اور فیلن صاحب کی کوششوں سے ۱۸۴۸ء میں 'طبقات الشعراء' کے نام سے شائع ہوا ۔ اس کا ذکر آگے آئے گا ۔ لیکن یہ نرا ترجمہ نہیں ہے اس میں کریم الدین نے اپنی طرف سے بھی اضافے کیے ہیں ۔ ۱۹۶۱ء میں ایک فرانسیسی خاتون سکستان لیلیان ندرو نے تینوں جلدیں اردو

---

(۱) گلشن ہند ، مضمون اقتدا حسن مشمولہ رسالہ اردو کراچی ، ص ۶۷ - ۸۷ ، بابت جولائی ۔

(۲) مقدمہ گلشن ہند ، از مولوی عبدالحق مطبوعہ حیدر آباد دکن ۱۹۰۶ء ، مخزونہ انجمن ترقی اردو ، کراچی ۔

میں منتقل کر دی ہیں اور حواشی و مقدمہ لکھ کر کراچی یونیورسٹی سے پی ۔ ایچ ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے ۔ اس کا ٹائپ شدہ ایک نسخہ دو جلدوں میں ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کے کتب خانے میں موجود ہے ۔

گارساں دتاسی نے تاریخِ ادب کے مقدمے میں اردو کی پیدائش ، ساخت ، مزاج اور رسم الخط کے مسائل پر گفتگو کی ہے ۔ اصنافِ سخن اور علمِ بیان و بدیع کی بحثیں چھیڑی ہیں ۔ اردو کی مقبولیت اس کی ترقی کے امکانات اور اس کی وسعتِ بیان کا جائزہ لیا ہے ۔ مسعود سعد سلمان سے لے کر غالب کے عہد تک کی آٹھ سو سالہ ثقافتی و ادبی رفتار پر تاریخی نظر ڈالی ہے ۔ اردو میں مستعمل تلمیحات اور شاعرانہ رموز و علائم کی تشریح کی ہے ۔ قدیم تذکروں کی نوعیت و حیثیت پر تبصرہ کیا ہے اور سب کے آخر میں اس نے تذکرہ نگاری کے طرز پر شعراء و مصنفین کے حالاتِ زندگی اور نمونۂ کلام درج کیا ہے ۔ گارساں دتاسی کی علمی و ادبی بحثوں میں بہت سی کمزوریاں بھی ہیں اور ایک محقق یا نقاد کو اس کے بعض مباحث پر اعتراض کرنے کی بڑی گنجائش ہے ۔ اس کے باوجود اس تذکرے کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے ۔ ہندوستان سے ہزاروں میل دور بیٹھ کر جس جگہ اور جس زمانے میں یہ تذکرہ مرتب کیا گیا ہے اس جگہ اور اس وقت اس سے بہتر تالیف کی صورت آسان نہ تھی ۔ گارساں نے پیرس میں رہ کر اپنے تذکرے کے ذریعے ہمیں سینکڑوں تصانیف ، اخبارات ، تالیفات ، تراجم ، مجموعہ ہائے کلام ، رسائل ، مخطوطات ، کلیات ، دواوین ، منتخبات اور شعراء کے حالات و افکار کا سراغ دیا ہے ۔ اگر یہ تذکرہ موجود نہ ہوتا تو اردو زبان و ادب کی تاریخ کا بہت سا قیمتی مواد اور بہت سے اہم مآخذ ہماری نظروں سے اوجھل ہوتے ۔ حق بات یہ ہے کہ اس تذکرے نے اردو میں ادبی تاریخ و تحقیق کے کام کو آگے بڑھانے اور پاکستان و ہند سے باہر اردو کو روشناس کرانے میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے ۔ خاص طور پر اردو کی مقبولیت اس کے رسم الخط اور تذکرہ نگاری کے فن کے متعلق گارساں دتاسی کے یہاں بعض ایسے بیانات ملتے ہیں جو اس کی وسیع النظری اور اردو سے غیر معمولی لگاؤ کا واضح ثبوت ہیں ۔ اردو کے متعلق گارساں دتاسی کی رائے ہے کہ :

> ''ہندوستان کی عام بولیوں میں ہندوستانی (اردو) سب سے زیادہ وسیع البیان اور لچکدار زبان ہے اور اس کا جاننا سب سے سود مند ہے ۔ وجہ یہ ہے کہ یہاں عموماً یہی زبان استعمال ہوتی ہے ۔ شمالی ہند اور شمالی علاقے کی عدالتوں اور دفتروں میں جب سے فارسی کی جگہ اردو استعمال ہونے لگی ہے اس نے اور زیادہ اہمیت حاصل کر لی ہے''(۱) ۔

آج کے جو لوگ اردو رسم الخط کو مشکل بنا کر اسے آسان بنانے یا رومن اور دیوناگری میں اسے منتقل کرنے کی سفارش کرتے ہیں ، انہیں یہ جاننا چاہیے کہ یہ بحث نئی

---

(۱) اردو ترجمہ (قلمی) جلد اول ۔ ص ۵ ۔

نہیں ہے بلکہ اردو کے مقابلے میں ہندی کو لانے کے لیے اس بحث کا آغاز بہت پہلے ہو چکا تھا گارساں دتاسی کا اس سلسلے میں بیان ہے کہ :

> ''گذشتہ کئی برسوں سے ہندوستان میں وہی رجحان پیدا ہو گیا ہے جو یورپ میں قومیت کے نام پر پیدا ہوا تھا ۔ ہندوؤں نے اردو پر حملے شروع کر دیے ہیں ۔ ان کا دعوی ہے کہ ملک کی عام زبان اردو نہیں ہندی ہے ۔ لیکن اس حقیقت کو نظر انداز کر جاتے ہیں کہ اردو ایک دلکش ادبی سرمایہ رکھتی ہے ۔ اس کے برعکس ہندی ادبی حیثیت سے تقریباً ختم ہو چکی ہے ۔ یہ مسئلہ ادبی نوعیت کا ہے جیسے فرانس میں تنگ نظر قوم پرستوں نے صوبائی بولیوں کو از سرِ نو زندہ کرنے کی کوشش میں اٹھایا تھا ۔ ہندو فارسی رسم الخط کے مخالف ہیں اور دیوناگری کو ترجیح دیتے ہیں ۔ لیکن ایسا کرنا آنکھ سے اندھے ہو جانے کے مترادف ہے ۔ بہر حال مسلمانوں نے بڑی حوصلہ مندی سے ان کے حملوں کا مقابلہ کیا اور ایسی قوی دلیلیں پیش کیں کہ میرے نقطۂ نظر سے وہ کامیاب رہے ۔ یہ اختلاف دراصل نسل و مذہب کے اختلاف سے پیدا ہوا ہے ۔ کون جانے کہ انگریز حکومت رومن حروفِ تہجی کو رواج دے کر اس اختلافی مسئلے کو ختم کر دے گی یا باقی رکھے گی ۔ لیکن اگر ایسا ہوا تو یہ علمی و ادبی حیثیت سے ایک افسوس ناک واقعہ ہوگا''[1]۔

اسی طرح اردو شعراء کے قدیم تذکروں کے متعلق بھی گارساں نے بہت صحیح رائے دی ہے ۔ ان کے لفظوں میں :

> ''اکثر نے صرف چند شعراء کے نام اور ان کے دو ایک شعر بطور نمونہ نقل کر دیے ہیں ۔ طویل سے طویل تبصرے میں بھی مصنف کی تاریخِ پیدائش ، تاریخِ وفات ، ان کے حالاتِ زندگی ، ان کی تصانیف اور ان کے موضوعات کا ذکر نہیں ملتا ۔ ان کے نزدیک صرف یہ بات اہم ہے کہ شعراء نے اپنا دیوان مرتب کیا ہے یا نہیں کیونکہ جس شاعر نے اپنا دیوان مرتب کر لیا وہ صاحبِ دیوان ہونے کی حیثیت سے بڑا ممتاز شاعر خیال کیا جاتا ہے''۔

گارساں دتاسی کا یہ خیال بڑی حد تک صحیح ہے ۔ گارساں سے پہلے تذکروں کا تقریباً یہی حال ہے ۔ چنانچہ انہوں نے اپنے تذکرے میں اس بات کی کوشش کی ہے کہ جن

---

(۱) اردو ترجمہ (قلمی) جلد اول ۔ ص ۴ ۔

خامیوں کا ذکر انہوں نے اوپر کیا ہے ان سے ان کا تذکرہ پاک ہے اور اسی کوشش کا نتیجہ ہے کہ ان کا تذکرہ اپنی کمزوریوں کے باوصف ادبی تواریخ اور سوانح کے بہت سے مفید عناصر اپنے اندر رکھتا ہے۔ شعراء کی مروجہ اصنافِ نظم و نثر ان کے اجزاء اور ان کے اصطلاحی الفاظ کی تعریفیں بھی متعین کرنے کی کوشش کی ہے، اس کوشش میں ان سے بعض جگہ لغزشیں بھی ہوئی ہیں۔ پھر بھی یہ کیا کم ہے کہ انہوں نے اپنے مقدمے میں نند، بیت، بیاض، قصیدہ، واسوخت، جستان، دیوان، کلیات، فرد، غزل، غزلیات، انشاء، خیال، شعر، مدح، منقبت، مرثیہ، مثنوی، مولود، معمہ، قطعات، محیط، مستزاد، نعت، لطیفہ، قطعہ، ریختہ، رسالہ، رباعی، سلام، سالگرہ، سہرہ، ساقی نامہ سدود، شکار نامہ، سوز، تقریظ، ترانہ، تاریخ، تشبیب، تذکرہ، ثابات، غزل، ہجو، حمد اور ریختی سب کی تعریفیں کی ہیں۔ یہ ایک ایسی علمی و ادبی کوشش ہے جو اس سے پہلے کسی اور تذکرے یا تالیف میں نظر نہیں آتی۔

الغرض گارساں دتاسی کا تذکرہ اردو زبان و ادب کی تاریخ کا ایک اہم ماخذ ہے۔ اگر یہ ماخذ موجود نہ ہوتا تو ہم اردو کے بہت سے قدیم شعراء و مصنفین اور ان کی تالیفات، سوانح حیات سے بے خبر رہتے۔

انتخابِ دواوین

۱۸۴۲ء/۱۲۵۸ھ میں دلی کالج کے پرنسپل بوترس کی فرمائش پر امام بخش صہبائی نے اردو کے ۱۲ ممتاز شعراء کے دواوین کو سامنے رکھ کر کلام کا انتخاب کیا اور شعراء کے حالات کا اضافہ کر کے ۱۸۴۴ء/۱۲۶۰ھ میں 'انتخابِ دواوین' کے نام سے اسے شائع کر دیا۔ اس کا ایک مطبوعہ نسخہ لیاقت نیشنل لائبریری کراچی میں موجود ہے۔ لیکن سرورق غائب ہے۔ اشعار کا انتخاب پاکیزہ ہے اور مؤلف کے ذوقِ شعری پر دلالت کرتا ہے۔ غزل کے ساتھ مؤلف نے دوسرے اصناف پر بھی نظر رکھی ہے۔ چنانچہ اس میں غزلیات کے ساتھ ساتھ اس صنف کا نمونہ بھی دیا گیا ہے جس میں کوئی خاص شاعر امتیازی حیثیت کا مالک ہے۔ اس تذکرے کا جو حصہ ادبی نقطۂ نظر سے اہم ہے وہ اس کا دیباچہ ہے۔ یہ دیباچہ اردو میں ہے اور اس میں صہبائی نے شعر کی تعریف، تاریخ، وزن قافیہ، ردیف اور اصنافِ سخن پر اجمالاً لیکن عالمانہ روشنی ڈالی ہے۔ صہبائی سے پہلے گارساں دتاسی کے سوا کسی اور تذکرہ نگار کے یہاں علمی مباحث نہیں ملتے۔ ہاں بعد کے تذکرہ نگاروں مثلاً کریم الدین اور مرزا قادر بخش نے اس روایت کو برقرار رکھا ہے۔

سراپا سخن

مرزا محسن علی محسن نے 'سراپا سخن' کے نام سے ۱۸۵۳-۵۲ء/۱۲۶۹ھ میں ایک تذکرہ مکمل کیا۔ یہ پہلی بار سالِ تصنیف کے آٹھ سال بعد ۱۸۶۱ء/۱۲۷۷ھ میں شائع ہوا۔

اس کے بعد مطبع نولکشور سے اس کے کئی ایڈیشن نکلے - ۱۸۷۵ء/۱۲۹۲ھ کا مطبوعہ ایک نسخہ میرے سامنے ہے[1]۔ ڈاکٹر اقتدا حسن اور ڈاکٹر سید سلیمان حسین نے اپنے مقدمات کے ساتھ اس کی تلخیص بھی شائع کر دی ہے[2]۔

'سراپا سخن' اردو فارسی کے تذکروں میں عجیب و غریب تذکرہ ہے - اردو شعراء کے تذکروں میں صرف 'ارمغان گوکل پرشاد' ایسا تذکرہ ہے جو 'سراپا سخن' کا ہم رنگ و ہم موضوع ہے - ڈاکٹر اقتدا حسن اور ڈاکٹر سید سلیمان حسین میں سے کسی نے بھی اس کا ذکر نہیں کیا - حالانکہ 'سراپا سخن' کے ضمن میں اس کا مطالعہ ضروری تھا - 'سراپا سخن' میں شعراء کے حالات زندگی یا انتخاب کلام کو یک جا کرنے کی کوشش بنیادی طور پر نہیں کی گئی بلکہ مصنف کا اصل مقصود سارے اعضائے جسمانی کے ردیفوں پر مختصر شعراء کی غزلوں کو جمع کرنا تھا - دیباچہ میں سببِ تالیف کے طور پر محسن نے خود لکھا ہے کہ جس زمانے میں وہ سلسلۂ تجارت کلکتہ میں مقیم تھے ان کی ملاقات شیخ الٰہی بخش عشقی سے ہوئی - ایک دن برسبیل تذکرہ ناسخ کا یہ مصرعہ سامنے آیا -

ع "جب کبھی پہنا جڑاؤ اس نے زیور کان میں"

اور خیال ہوا کہ اگر اسی انداز سے سارے اعضائے جسمانی پر ناسخ کی غزلیں ہو جائیں تو ایک دیوان سراپا کے نام سے مرتب کیا جا سکتا ہے ، لیکن ناسخ کی عمر نے وفا نہ کی اور محسن نے مختلف شعراء کے کلام کی مدد سے اس کام کو مکمل کیا - اس کام میں انہیں کتنی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ان کا اندازہ دیباچہ کی ان سطور سے کیا جا سکتا ہے :

> "بہر کیف ان کے (عشق کے) پاسِ خاطر سے محنتِ عظیم کو گوارا کیا فہرستِ اعضا کی تیاری پر راغب ہوا . . . . . . بعد ازاں بموجب
>
> "عشق آسان نمود اول ولے افتاد مشکلہا"
>
> جو کوہ کنی پیش آئی . ! . . . . . ایک ثمر اس کا یہ ہے کہ پندرہ تذکرے اور صدہا دواوین اور بیاضیں بڑی جستجو سے بہم پہنچائیں - شعرائے ماضی کا کلام دستیاب ہوا اور ہر ناظم دور و دیار کی خدمت میں آپ اور احباب دل سوز سے خطوط لکھوا کر بھیجے - حتیٰ کہ چار مطبع (کذا) اخبار میں خبر چھپوائی . . . . . . اور شعرائے معاصرین کی خدمت میں مکرر

---

(۱) سراپا سخن ، مطبوعہ ۱۸۷۵ء/۱۲۹۲ھ ، مطبع نولکشور لکھنؤ ، مملوکہ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی -

(۲) (الف) تذکرہ سراپا سخن (تلخیص و ترتیب) ڈاکٹر اقتدا حسن ، مطبوعہ اظہار سنز لاہور ۱۹۷۰ء -

(ب) تلخیص سراپا سخن، مرتبہ ڈاکٹر سید سلیمان حسین ، مطبوعہ نایاب بکڈپو لکھنؤ ۱۹۶۷ء -

حاضر ہو کر غزلیں لایا اور جن کی کوئی غزل اس قید کی نہ تھی، ان سے کہلوائی بلکہ مشاعروں میں اسی طرح کی طرحیں کیں۔ غرض کہ اس تلاش سے سات سو (سے زیادہ) شعراء کا کلام فراہم کیا''۔

چنانچہ 'سراپا سخن' میں اعضائے جسمانی سے متعلق صدہا غزلیں شامل ہیں اور سر سے لے کر پاوں بلکہ تلوؤں تک کی ردیف کے ہزاروں اشعار یکجا ہو گئے ہیں۔ اعضا کی ردیفیں بالترتیب اس طور پر آتی ہیں:
سر، دماغ، بال، چوٹی، زلف، کاکل، جبین، آبرو، آنکھیں، پلکیں، ناک، عارض، لب، دندان، زبان، ذقن، دہن، کان، کان کی لو، منہ، گلا، گردن، دوش، ہاتھ، بازو، کہنیاں، کلائی، پہونچا، ہتھیلیاں، گھائیاں، پورین، ناخن، سینہ، چھاتیاں، بغل، پہلو، دل، روح، پیٹ، ناف، پشت، کمر، کولہے، سرین، رانیں، زانو، ساق، پاؤں، ایڑیاں، تلوے''۔

شعراء کے حالات بہت مختصر ہیں۔ دو چار سطروں سے زیادہ کسی کے متعلق کچھ نہیں ملتا۔ لیکن شاعر کے نام، ولدیت، سکونت اور تلمذ کا ذکر ان میں خاصے اہتمام سے کیا گیا ہے۔ گویا قدیم شعراء کے سلسلے میں سوانحی اعتبار سے یہ تذکرہ بہت اہم ہے۔ جیسا کہ 'نگار' کے تذکروں کے تذکرہ نمبر میں ظاہر کیا جا چکا ہے۔ یہ تذکرہ دنیائے ادب میں اپنی نوعیت کے لحاظ سے منفرد ہے اور لکھنوی مذاقِ سخن کی پوری نمائندگی کرتا ہے۔

گلدستۂ نازنینان و طبقات الشعراء

اس دور کے دو تذکرے 'گلدستۂ نازنینان' اور 'طبقات الشعرائے ہند' بھی بہت اہم ہیں۔ دونوں کے مؤلف کریم الدین ہیں۔ 'گلدستۂ نازنینان' کا سال تصنیف ۱۸۴۴ء/۱۲۶۰ھ اور سن طباعت ۱۸۶۵ء/۱۲۶۱ھ ہے[1]۔ اس میں صرف ۳۷ منتخب شعراء کا ذکر آیا ہے۔ یہ صہبائی کے 'انتخاتِ دواوین' کے طرز پر لکھا گیا ہے۔ بلکہ صہبائی کے بعض تراجم من و عن صہبائی کے تذکرے سے لیے گئے ہیں[2]۔ اس کا دیباچہ بھی 'انتخاب دواوین' کے دیباچے کی طرح علمی و ادبی مباحث پر مشتمل ہے اور تذکرہ نگاری کو تاریخ نگاری کی طرف لے جانے میں راہنمائی کرتا ہے۔ 'طبقات الشعرائے ہند' ۱۸۴۷ء میں مکمل اور اشرف علی

---

(۱) ملاحظہ ہو 'گلدستہ نازنینان' مطبوعہ رفاہ عام دہلی ۱۸۴۵ء مخزونہ لیاقت نیشنل لائبریری کراچی۔

(۲) تفصیل کے لیے دیکھیے' نگار (پاکستان)، ص ۲۰، بابت نومبر ۱۹۶۳ء، مضمون از راقم الحروف۔

کے زیر اہتمام ۱۲۶۴ھ/۱۸۴۸ء میں مطبع العلوم مدرسہ دہلی سے شائع ہو گیا۔ اس کے سر ورق پر یہ عبارت ملتی ہے:

> ''تاریخ شعراء کا مسٹر فیلن صاحب بہادر اور مولوی کریم الدین نے گارسان دتاسی کی تاریخ ۱۸۴۸ء میں ترجمہ کیا اور نو سو چونسٹھ شاعروں اردو گو کے اشعار اور حال بھی دواوین مختلفہ سے منتخب کر کے اس میں مندرج کیے''(۳)۔

اس عبارت سے اشتباہ ہوتا ہے کہ تذکرے کے تکملہ کا سال ۱۸۴۸ء ہے لیکن ایسا نہیں ہے۔ اندرونی اندراجات بتاتے ہیں کریم الدین نے اسے ۱۸۴۷ء کے آخر میں مکمل کیا اور اگلے سال ۱۸۴۸ء میں چھپنا شروع ہو گیا۔ اس لیے ۱۸۴۷ء کو سال تصنیف اور ۱۸۴۸ء کو سال طباعت خیال کرنا چاہیے۔ سر ورق پر دی ہوئی تعداد شعراء بھی صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ مطبوعہ نسخے میں ایک ہزار سے زائد شعراء کے تراجم ملتے ہیں۔ کہنے کے لیے یہ گارساں کی تاریخ ادب ہندوستانی کی جلد اول کا ترجمہ ہے لیکن کریم الدین نے اس میں اتنے اضافے کیے ہیں کہ یہ ایک الگ تذکرہ بن گیا ہے۔ تراجم سے پہلے ایک بسیط مقدمہ ہے اس میں کریم الدین نے اردو کے ماخذ تذکرہ نگاری اور تاریخ کے فرق۔ تذکروں کی عام روش اور تذکروں کے اقسام پر روشنی ڈالی ہے۔ اس سے انکار نہیں کہ یہ موضوعات گارساں ہی کے مقدمہ سے ماخوذ ہیں۔ لیکن بعض اہم بیانات کریم الدین ہی کے ہیں۔ مثلاً تذکرہ نگاری اور تاریخ نگاری کے فرق کے سلسلے میں میں یہ الفاظ گارساں کے نہیں کریم الدین کے ہیں:

> ''کتاب تذکرہ اور طبقات چونکہ شاخیں فن تاریخ کی ہیں اس لیے اکثر اہل علم و فضل نے بلحاظ تکمیل فن تواریخ کے اس فن کی کتابیں...... تصنیف کی ہیں....... مگر افسوس نہ کسی نے اس شاخ کو شاخ تاریخ نہ رکھا۔ واضح ہو کہ تاریخ اس کو کہتے ہیں جس میں واقعات یا حالات زمانہ اس طور پر لکھے جائیں کہ اس سے معلوم ہو سکے کہ فلاں زمانے میں یہ حادثہ یا واقعہ گزرا۔ بخلاف تذکرے کے کہ اس میں خاص ایک قسم کے لوگوں کا حال لکھا جاتا ہے۔ مثلاً تذکرہ الشعراء یا تذکرہ انبیاء یا تذکرہ اولیاء وغیرہ۔ اس سے معلوم ہوا کہ تذکرہ

---

(۱) طبقات الشعرائے ہند۔ مطبوعہ مطبع العلوم مدرسہ دہلی ۱۸۴۸ء، مخزونہ انجمن ترقی اردو کراچی۔

خاص ہے اور تاریخ عام کہ وہ تذکروں پر بھی مشتمل ہوتی ہے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ تذکرہ ایک قسم کی تاریخ ہے۔ بشرطیکہ اس میں ہر ایک شخص کے زمانے کا بھی حوالہ ہو اور اگر صرف حال ہو اور تاریخ کسی کی دریافت نہ ہو سکتی ہو اور نہ مصنف کے بیان سے واضح ہو کہ کس زمانے کا یہ حال بیان کرتا ہے تو اس صورت میں داخل تاریخ نہ ہوگا بلکہ ایک قسم علحدہ مقابل تاریخ کے ہوگی۔ اس صورت میں نسبت تضاد کی ہوگی۔ غرضیکہ تاریخ میں بحث واقعات زمانہ سے ہوتی ہے اور تذکرے میں اشخاص کا بیان ہوتا ہے''(۱)۔

مقدمہ کے بعد کریم الدین نے تذکرے کے اصل مواد کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے اور اس کی تفصیل اس طور پر دی ہے:

قسم اول۔ اس میں ان شعراء کا ذکر ہے جو بانی اردو کے تھے اور انہوں نے اس زبان اردو کے شیوع میں کوشش بلیغ کی۔

طبقہ دوم۔ اس میں ان کا ذکر ہے جو مصلح اردو اور مروج اس زبان کے تھے۔ اور انہوں نے الفاظ دریبھہ کا استعمال یک قلم زبان ریختہ سے موقوف کیا۔

طبقہ سوم۔ اس میں وہ شاعر ہیں جو طبقہ دوم کے شاگرد تھے۔ ان کو الفاظ صحیح اور محاورات دلچسپ کے استعمال کرنے کا بہت شوق تھا۔

طبقہ چہارم۔ اس طبقے میں وہ شاعر ہیں جو ہم عصر اس بندے کے ہیں اور ان سے ملاقات بندہ کی ہے یا اکثر جا بہ ان کو دیکھا ہے یا ان کا حال سنا ہے اور ملاقات نہیں ہوئی۔

طبقہ پنجم۔ خود مؤلف تذکرہ کے حالات پر ختم ہوتا ہے اس کے بعد تکملہ کے عنوان سے ان شعراء کا ذکر ہے جن کی تاریخ وفات یا حیات معلوم نہیں ہو سکی۔ ایسے شعراء کی تعداد ۱۴۶ ہے۔ سب سے آخر میں امید حیدر آبادی کا ایک سطری ذکر ہے اور صرف ایک شعر درج ہے۔ بعد ازاں خاتمہ کے عنوان سے اردو شاعری کی تاریخ کا اجمالی ذکر ہے اور ہر طبقے کے نامور شعراء کے نام و کام کی دوبارہ نشان دہی کی ہے۔

کریم الدین نے شعرا کی یہ درجہ بندی تو کر دی ہے اور مقدمہ میں تراجم کو تاریخی صحت کے ساتھ لکھنے کا ادعا بھی کیا ہے۔ لیکن وہ اس میں بہت کم کامیاب ہوئے ہیں۔

---

(۱) مقدمہ طبقات الشعرائے ہند۔

ڈاکٹر سید عبداللہ نے صحیح لکھا ہے کہ "دیباچے میں انہوں نے جن اصول و قواعد کا اعلان کیا ہے ان پر پورا پورا عمل نہیں ہو سکا"[1]۔ واقعات کی سنین کی غلطیوں کے ساتھ ساتھ ان سے شعراء کی طبقاتی تقسیم میں بھی جا بجا لغزشیں ہوئی ہیں ۔ جن شعراء کے نام بلحاظ زمانہ طبقہ دوم میں ہونے چاہیے تھے، وہ سوم میں اور سوم کے چہارم میں درج کیے گئے ہیں ۔ بعض شعراء کا ذکر مختلف تخلصوں کے ساتھ دو جگہ آ گیا ہے ۔ اس تکرار میں بعض جگہ عجب التباس ہوا ہے کہ چند بائی ماہ لقا کا ذکر پہلے طبقۂ دوم میں مرد شاعر کی حیثیت سے ہوا ہے اور پھر طبقہ چہارم میں عورت کی حیثیت سے ذکر کیا گیا ہے ۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار نے اس قسم کی لغزشوں کی نشان دہی اپنے ایک مضمون میں کردی ہے[2]۔ ان کمزوریوں کے باوجود طبقات کی تاریخی حیثیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ۔ یہ اردو زبان کا پہلا تذکرہ ہے جس میں تاریخ و تذکرہ کے تعلق پر بحث کی گئی ہے ۔ ان کے فرق کو سمجھا گیا ہے اور واقعات و حالات کے اندراج میں تاریخ نگاری کے عناصر کا شعوری لحاظ رکھا گیا ہے ۔ ڈاکٹر محمود الہی نے اپنے ایک مضمون میں بہت صحیح لکھا ہے کہ :

> "کریم الدین نے طبقات الشعرائے ہند کو جس نہج پر تقسیم کیا ہے وہ تذکرہ نگاری کی قدیم روش سے بڑی حد تک مختلف ہے ۔ یہ تقسیم ایک مؤرخ کا نتیجۂ فکر ہو سکتا ہے ۔ ایک روایتی طرز کے تذکرہ نگار کا نہیں ان کے ۰۰۰۰۰ الفاظ محمد حسین آزاد کے ان جملوں کے ابتدائی نقوش معلوم ہوتے ہیں جو 'آبِ حیات' تک ہر دور کی تمہید میں استعمال کیے ہیں" ۔

یہ صحیح ہے کہ دتاسی کی تاریخ کا ایک بڑا حصہ کسی نہ کسی شکل میں طبقات میں شامل کر لیا گیا اور یہ بھی صحیح ہے کہ دتاسی کی ادبی تاریخ کا مجوزہ خاکہ کریم الدین کی نظر سے گذر چکا تھا ۔ لیکن ادبی تاریخ کے موضوع پر ان کا ذہن زیادہ صاف تھا ۔ انہوں نے دتاسی کے مقدمہ تاریخ کو بھی طبقات میں شامل کر لیا تھا ۔ اس مقدمہ پر انہوں نے جو اضافہ کیا ہے وہ اردو میں اپنے طرز کی پہلی آواز ہے جو تذکرہ نگاری کی مروجہ روش کے خلاف صدائے احتجاج بھی ہے اور ایک نئے انداز کی تذکرہ نگاری کے لیے دعوتِ فکر و نظر بھی[1]۔

مختصر یہ کہ 'طبقات الشعرائے ہند' انیسویں صدی کے وسط کا ایک اہم تذکرہ اور ہماری ادبی تاریخ کا ایک اہم ماخذ ہے ۔ اس کا سوانحی اور تنقیدی لب و لہجہ عام تذکروں سے مختلف ہے ۔ اس میں سیاسی و معاشرتی ماحول کی تصویریں بھی ہیں اور مصنفین و شعراء کے متعلق بے

---

(۱) شعرائے اردو کے تذکرے ، ص ۹۶ ، مطبوعہ مکتبہ جدید لاہور ۱۹۵۲ء ۔

(۲) طبقات الشعرائے ہند اور مولوی کریم الدین (مشمولہ صحیفہ لاہور) شمارہ نمبر ۳۰ ، بابت جولائی ۱۹۶۷ء ۔

(۳) طبقات الشعرائے ہند 'مشمولہ' 'بازیافت' مطبوعہ نسیم بک ڈپو ، لکھنؤ ۔

لوگ رائیں بھی اس میں مبالغہ و تصنع یا پاسداری و لعن طعن کا وہ انداز نظر نہیں آتا جو قدیم تذکروں کی خصوصیت ہے ، بعد کے تذکروں نگاروں حتیٰ کہ خود گارساں دتاسی نے تاریخ ادب ہندوستانی کے تکملہ کے وقت اس سے فائدہ اٹھایا ہے اور محمد حسین آزاد کی مشہور کتاب 'آبِ حیات' کا تو یہ ماخذِ خاص ہے ۔ قاضی عبدالودود نے 'آبِ حیات اور طبقات الشعراء' کے عنوان سے دونوں کے مماثل پہلوؤں کی نشان دہی تفصیل کے ساتھ کر دی ہے[۱]۔

گلستانِ بے خزاں

قطب الدین باطن کا تذکرہ 'گلستان بے خزاں' جس کا تاریخی نام 'نغمۂ عندلیب' ہے ۱۸۴۸ء/۱۲۶۵ھ میں مکمل ہوا ہے ۔ خاتمۃ الطبع' کے زیر عنوان دی ہوئی صراحت کے مطابق یہ تذکرہ مؤلف کی فرمائش پر پہلی بار مطبع نول کشور لکھنؤ سے ۱۸۷۵ء/۱۲۹۲ھ میں شائع ہوا ہے ۔ دیباچے میں مؤلف نے لکھا ہے[۲]:

> ''گلشنِ بے خار تالیف نواب مصطفیٰ خان شیفتہ جو اول سے آخر تک دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ حضرت بس نوابی پر فریفتہ ، سب کو حقارت سے یاد کیا اپنی اوقات کو برباد کیا ۔ بجز سات شخصوں کے ہر ایک کی نسبت عبارت ہجو آمیز ہے اور عبارت تذکرہ کی وہ مثل کہ آدھا تیتر آدھا بٹیر ۔ تذکرہ اردو عبارت فارسی اون کی اور اون کے استاد کی عقل کا پھیر .... ایسی ایسی بے انصافیاں جب نظر آئیں تو عاصی حکیم سید قطب الدین مختاص باطن نے .... ایک تذکرہ جواب گلشن بے خار بعبارت اردو زبان جمع کیا جس کا نام رکھا گلستانِ بے خزاں'' ۔

قطب الدین باطن کا رویہ شیفتہ کے ساتھ بہت سخت ہے اور 'گلشنِ بے خار' میں ایسی ناہمواریاں نہیں ہیں جیسی کہ باطن نے بیان کی ہیں ۔ بہر حال اس سے یہ ضرور پتہ چلتا ہے کہ 'گلستان بے خزاں' شیفتہ کے تذکرے کے جواب میں لکھا گیا ہے ۔ شیفتہ سے باطن کی ناراضگی کا اصل سبب یہ تھا کہ شیفتہ نے باطن کے استاد نظیر اکبر آبادی کی شاعری کو پایۂ اعتبار سے گری ہوئی بتایا تھا ۔

باطن کو اپنے استاد کے بارے میں شیفتہ کی یہ رائے سخت ناگوار گذری اور انہوں نے اس کے جواب میں ایک تذکرہ لکھ ڈالا ۔ اس میں باطن نے 'گلشنِ بے خار' کا انتقام لیا اور شیفتہ کے احباب ، استاد اور ممدوحین کو جی بھر کے گالیاں دیں ۔ شیفتہ نے مومن اور آزردہ کی بڑی تعریفیں کی تھیں ۔ اس لیے ان دونوں کے کلام میں باطن نے معائب نکالے اور آزردہ کے کلام پر اصلاحیں دیں ۔ اس انتقامی جذبے کا یہ نتیجہ ہوا کہ 'گلستان بے خزاں' کی تحریر میں اعتدال و توازن

---

(۱) معاصر شمارہ ۳ ، ص ۱۵۵ ، بابت دسمبر ۱۹۵۲ء مملوکہ راقم الحروف ۔
(۲) دیباچہ گلستان بے خزاں ، مطبوعہ نول کشور ۱۸۷۵ء/۱۲۹۲ھ مملوکہ ضمیر نیازی ، کراچی ۔

باقی نہ رہا ۔ تذکرہ مخالفین کی ہجو اور موافقین کی مدح بن گیا ۔ آزردہ کا ترجمہ دو صفحوں میں ہے لیکن صرف اعتراضات کا مجموعہ ہے ۔ نہ ان کے حالات زندگی ہیں ، نہ منتخب اشعار (ص ۲۲)۔ شیفتہ کا ذکر تین صفحوں میں ہے لیکن اس میں کوئی کام کی بات نہیں ہے ۔ صرف لعنت و ملامت کی گئی ہے اور انتخابِ کلام میں غالباً تلاش کر کے بے کیف اشعار درج کیے ہیں (ص ۱۳۰) ۔ غالب کے حالات و انتخابِ کلام میں دو صفحے ہیں لیکن چھینٹوں سے خالی نہیں ہیں ۔ چودہ اشعار بطور نمونہ دیے ہیں (ص ۱۷۱) ۔ مومن چونکہ شیفتہ کے استاد تھے اس لیے انہیں خاص طور پر برا بھلا کہا ہے ۔ نمونۂ کلام میں معمولی قسم کے تیرہ اشعار دیے ہیں (ص ۲۲۳) ۔ اس کے برعکس اپنے دوست سید گلزار علی اسیر کے مبالغہ آمیز تعریف کے ساتھ تفصیل سے حالات زندگی لکھے ہیں اور ۵۶ اشعار انتخاب میں دے ہیں (ص ۲۶) ۔ خود اپنا ترجمہ چھ صفحوں میں لکھا ہے اور ایک سو سے زائد اشعار نمونۂ کلام میں دے ہیں (ص ۳۲) ۔ اپنے استاد نظیر اکبر آبادی کی حد درجہ تعریف کی ہے اور بیس صفحے ان کی نذر کیے ہیں ۔ یہ اس تذکرے کا سب سے طویل حصہ ہے اور اس میں تین سو کے قریب اشعار درج کیے گئے ہیں (ص ۲۵۷) ۔ ہر چند کہ باطن نے نظیر اکبر آبادی کی تعریف میں بڑے مبالغے سے کام لیا ہے تاہم اس سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ نظیر اکبر آبادی رفتہ رفتہ منظر عام پر آگئے ۔ فکر کی بلندی نہ سہی لیکن سماجی زندگی کی ترجمانی اور مقامی آب و رنگ کی عکاسی کے اعتبار سے اُردو کا کوئی شاعر ان کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتا ۔ شیفتہ نے نظیر کے ساتھ واقعی زیادتی کی تھی ۔ اور یہ شیفتہ ہی کی تنقیدی رائے کا اثر تھا کہ نظیر بہت دنوں تک گوشۂ گمنامی میں رہے ۔ باطن نے انہیں بہت اچھالا اور اس انداز سے کہ عام و خاص کو ان کی طرف متوجہ ہونا پڑا ۔ اس لیے ہمارے نزدیک 'گلستان بے خزاں' کا بڑا حاصل یہ ہے کہ اس کی بدولت ایک بڑے شاعر کو تاریخ ادب میں اپنی جگہ مل گئی ۔ یوں باطن کے تذکرے کے تراجم بہ حیثیت مجموعی بے جان ہیں ۔ عبارت کی صناعی اور بے جا تعریف و تنقیص کے طومار میں سوانحی و تاریخی پہلو یکسر گم ہو گئے ہیں ، یہ تذکرہ 'گلشنِ بے خار' کے جواب میں لکھا گیا ہے لیکن اس کی گرد کو نہیں پہنچتا ۔ حامد حسن قادری نے بہت صحیح لکھا ہے کہ ''انتخابِ کلام ، حالات اور تنقید میں حکیم باطن کا 'گلستانِ بے خزاں' یا نغمۂ عندلیب بالکل ہیچ پوچ ہے ۔ شیفتہ نے اپنے تذکرے میں بہترین اشعار کا انتخاب کیا ہے ۔ باطن کا انتخاب نہایت معمولی ہے ۔ وہ سخن سنجی سے عاری معلوم ہوتے ہیں[1]''۔

یادگارِ شعراء

'یادگار شعراء' ڈاکٹر اشپرنگر کی تالیف ہے ۔ ڈاکٹر اشپرنگر ایک ممتاز مستشرق ہیں ۔ انہیں ۱۸۴۶ء کے اواخر میں حکومتِ ہند کی طرف سے اس کام پر مامور کیا گیا تھا کہ وہ شاہانِ اودھ اور اس علاقے کے بعض دوسرے کتب خانوں کی فہرست مرتب کریں اور ان کے

---

(۱) قادری ، حامد حسن داستان تاریخ اردو ، ص ۳۶۵ ، مطبوعہ آگرہ ۱۹۵۷ء ، طبع دوم ۔

نوادر کا جائزہ لیں ۔ چنانچہ انہوں نے اس کام کو ۱۸۵۰ء میں مکمل کر لیا اور ان کی مرتبہ فہرست کتب کلکتے سے ۱۸۵۴ء میں شائع کر دی گئی ۔ تذکرہ یادگار 'شعراء' مترجمہ طفیل احمد در اصل اسی فہرست کے باب اول کا اردو ترجمہ ہے جو ۱۹۴۳ء میں ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد سے شائع ہوا ہے ۔

گارساں دتاسی کی تاریخ ادب ہندوستانی کے بعد یہ دوسرا تذکرہ ہے جو ایک یورپین مستشرق کی کوشش سے وجود میں آیا ہے ۔ گارساں کا تذکرہ فرانسیسی زبان میں تھا ۔ ڈاکٹر اشپرنگر نے اسے انگریزی زبان میں انگریزی حروف تہجی کی ترتیب کے ساتھ مرتب کیا ہے ۔ بعد میں طفیل احمد نے اسے انگریزی سے اردو میں منتقل کر کے اسے 'یادگار شعراء' کا نام دیا ۔

ڈاکٹر اشپرنگر کے تذکرے میں جن شاعروں کا ذکر آیا ہے وہ خود اس کی دی ہوئی تفصیل کے مطابق 'ریختہ گویان' (حسینی) 'نکات الشعراء' ، 'مخزن نکات' ، 'گلزار ابراہیم' ، 'تذکرۂ شورش' ، 'تذکرۂ ہندی' (مصحفی) 'تذکرۂ عشقی' ، 'گلشن ہند' ، 'عیار لشعراء' ، 'عمدۂ منتخبہ' ، 'مجموعۂ نغز' ، 'طبقات سخن' (مبتلا) ، 'دیوان جہاں' ، 'گلدستۂ نشاط' ، 'گلشن بے خار' ، 'گلستان بے خزاں' ، 'انتخاب دواوین ، 'گلدستۂ نازنینان' ، 'تذکرہ شعرائے ہند' (کریم الدین) اور 'چمن بے نظیر' سے ماخوذ ہیں ۔

ان تذکروں کی تفصیل دینے کے بعد اشپرنگر نے ان تمام شعراء کا ذکر فرداً فرداً کیا ہے جن کا ذکر مذکورہ بالا تذکروں میں آیا ہے ۔ ہر شاعر کے حالات کے ساتھ ان تذکروں کے حوالے بھی دے دیے گئے ہیں جن سے یہ حالات ماخوذ ہیں ۔ ماخذات میں اوپر دی ہوئی بیس کتابوں میں سے صرف چودہ کے حوالے اصل کتاب میں ملتے ہیں ۔ چھ کتابوں یعنی 'دیوان جہاں' ، 'گلدستۂ نشاط' ، 'انتخاب دواوین' ، 'چمن بے نظیر' ، 'گلدستۂ نازنینان' اور 'طبقات الشعرائے ہند' (کریم الدین) کا حوالہ نظر نہیں آتا ۔ اصل کتاب میں ماخذ کے حوالوں کے ساتھ اشپرنگر نے تذکروں کے نام کے بجائے ان کے نشانات دیے تھے ۔ فاضل مترجم نے ان نشانات کی جگہ اصل تذکروں کے نام دے دیے ہیں ۔ اس طرح یہ تذکرہ تحقیقی مطالعہ کے لیے زیادہ آسان اور مفید تر ہو گیا ہے ۔

اس میں ۱۵۱۱ شاعروں کا ذکر آیا ہے ۔ گویا دتاسی کے تذکرے کو چھوڑ کر یہ ۱۸۵۰ء تک لکھے جانے والے سارے تذکروں سے ضخیم ہے ۔ یہ اردو شعراء کا پہلا تذکرہ ہے جس میں جگہ جگہ ہر شاعر کے سلسلے میں ماخذ کا سراغ دیا گیا ہے ۔ گویا تحقیقی نقطۂ نظر سے تذکروں کے سلسلے میں ماخذ کی نشان دہی کا سلسلہ ڈاکٹر اشپرنگر سے شروع ہوتا ہے ۔ ورنہ اس سے پہلے یہ رواج نہ تھا بلکہ اکثر تراجم کو ایک دوسرے سے مقدم یا مؤخر ثابت کرنے میں خاصی دشواری پیدا ہو گئی ۔ 'یادگار شعراء' ، شعراء کا تذکرہ ہونے کے ساتھ ساتھ اکثر شعراء اور تذکرہ نگاروں کے سلسلے میں فرہنگ کا بھی کام کرتا ہے ۔ یعنی اس کے دیکھنے سے یہ بھی پتہ چل جاتا ہے کہ کسی خاص تذکرے یا شاعر کا ذکر اور کن کن تذکروں میں آیا

ہے ۔ اس خصوصیت نے اس تذکرے کو تحقیق کا ایک اہم ماخذ بنا دیا ہے اور تذکرہ نگاری پر کام کرنے والوں کے لیے خاصا مفید ثابت ہوا ہے ۔ ایک خاص بات اس تذکرے میں یہ ہے کہ اس میں صرف شعراء کے نثری تراجم میں وہ پہلا تذکرہ ہے جو اشعار کے منتخبات سے عاری ہے اور بیاضِ شعراء کے بجائے سوانحِ شعراء کی بنیاد پر ترتیب دیا گیا ہے ۔

گلستانِ سخن

۱۸۵۷ء تک لکھے جانے والے اہم تذکروں میں آخری تذکرہ 'گلستانِ سخن' ہے ۔ یہ مرزا قادر بخش صابر کی تالیف ہے اور کئی وجوہ سے بہت اہم ہے ۔ مؤلف نے اس کے آخر میں بہ عنوان 'خاتمہ' لکھا ہے کہ :

"اخیر ماہ شوال بارہ سو اکہتر (۱۲۷۱ھ) میں اتمام پایا"[۱] ۔

مولانا امتیاز علی عرشی[۱] اور قاضی عبدالودود صاحب[۲] نے بھی یہی خیال ظاہر کیا ہے کہ 'گلستانِ سخن' شعبان ۱۲۷۰ھ مطابق ۱۸۵۳ء میں شروع ہوکر شوال ۱۲۷۱ھ مطابق ۱۸۵۴ء میں مکمل ہو گیا ہے ۔ لیکن 'بیاضِ اشعار' کی صورت میں اس کا مواد وہ بہت دنوں سے جمع کر رہے تھے ۔ 'گلستانِ سخن' پہلی بار ۱۲۷۱ھ مطابق ۱۸۵۴ء میں مطبع مرتضوی دہلی سے دوسری بار ۱۲۹۹ھ مطابق ۱۸۸۲ء میں مطبع نولکشور لکھنؤ سے اور تیسری بار مجلس ترقیٔ ادب لاہور سے شائع ہوا تاریخ ۔ آخر الذکر اشاعت میں خلیل الرحمان داؤدی اور ڈاکٹر وحید قریشی کے مقدمات شامل ہیں ۔

یہ ضخیم تذکرہ اردو زبان میں ہے اور اس میں ۵۳۵ شاعروں کا ذکر آیا ہے ۔ فہرست مضامین کی صورت یہ ہے کہ سب سے پہلے حمد ہے جس کے شروع میں 'ساقی نامہ' کے طور پر چند اشعار ہیں ۔ بقیہ حصہ نثر میں ہے ۔ اس کے بعد مصنف نے اپنا حال اور وجۂ تالیف بیان کیا ہے بعد ازاں ایک طویل و بسیط مقدمہ ہے ۔ یہ زبان و بیان اور فنِ شعر کے مباحث پر ایک مکمل تصنیف کی حیثیت رکھتا ہے اور تقریباً دو سو صفحات میں پھیلا ہوا ہے ۔ مقدمہ کے متعلق صابر نے دیباچہ کے آخر میں لکھا ہے کہ :

مقدمہ کا نام 'تبصرہ' رکھتا ہوں اور اس کو ایک مقدمے اور تین مقصد میں منقسم کرتا ہوں ۔

مقدمہ : مقصد اول ۔ زبان کے معنی اور اس امر کی تحقیق میں کہ :

آغاز آفرینش میں زبان ایک تھی یا متعدد اور اگر ایک تھی تو اول کون سی زبان موجود تھی اور پھر کس طرح مختلف زبانیں بہم پہنچیں ۔

---

(۱) گلستان سخن مطبوعہ مطبع مرتضوی دہلی ۱۸۵۴ء/۱۲۷۱ھ مخزونہ انجمن ترقیٔ اردو ، کراچی ۔

(۲) دیباچہ دستور الفصاحت ، ص ۱۰۳ ، مطبوعہ رام پور ۱۹۴۳ء ۔

(۳) دلی کالج میگزین ، ص ۸۷ تا ۹۵ ۔ مطبوعہ دلی ۱۹۵۳ء ۔

مقصد دوسرا ۔ حد شعر اور موجد اشعار اور عروض و قافیہ کے بعض فوائد کا ذکر
بہ طریق اجمال ۔

مقصد تیسرا ۔ ذکر اقسام نظم اور ہر ایک کی تعریف'' ۔

مذکورہ بالا مقاصد پر صابر نے فی الواقع بڑی مفصل بحث کی ہے ۔ اس کے بعد اصل تذکرہ شروع ہوتا ہے جس میں شعراء کا حال بلحاظ حروف تہجی لکھا گیا ہے ۔ تراجم کا آغاز صدر الدین آزرد کے نام سے ہوتا ہے اور اس انداز سے گویا تذکرہ ان کے نام سے معنون کیا گیا ہے ۔ اس تذکرے کی انفرادی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں صرف معاصرین یعنی ان شاعروں کا ذکر ہے جو اس وقت حیات تھے ۔ صابر نے اپنے پیش رو شعراء کو تذکرے میں داخل نہ کرنے کی وجہ یہ بتائی ہے کہ ان کا ذکر 'تکرار بیجا' میں محسوب ہوگا ۔ اس لیے اکثر کتابیں ان کے احوال سے مالا مال ہیں ۔ شعراء میں اکثریت دہلی سے تعلق رکھتی ہے ۔ تنقیدی عنصر زیادہ نہیں ہے پھر بھی اس کی تاریخی اور سوانحی اہمیت مسلم ہے ۔ مؤلف نے ایک معاصر کی حیثیت سے اپنے عہد خصوصاً انیسویں صدی کے وسط کے اردو شعراء اور ان کے ماحول و رجحان کے متعلق بہت سی اہم اور نئی باتیں بہم پہنچائی ہیں[1] ۔ ڈاکٹر وحید قریشی کی رائے ہے کہ :

'سوانحی حصہ پر اگرچہ اس تذکرے میں زیادہ توجہ نہیں کی گئی لیکن بعض دوسری ضمنی معلومات کی وجہ سے 'گلستان سخن' کا مرتب ضرور اپنے بعض دوسرے ہم عصر تذکرہ نگاروں سے سبقت لے گیا ہے''[2] ۔

قاضی عبدالودود نے ایک مضمون مطبوعہ دلی کالج میگزین میں 'گلستان سخن' کے باب اول اور دوم دونوں کا تفصیلی و تحقیقی جائزہ لیا ہے اور اس کی حسب ذیل خصوصیات گنوائی ہیں[3]:

(۱) 'گلستان سخن' میں ۵۴۰ شعراء کے مستقل تراجم ہیں ۔ مسلمان ۴۸۲ ، ہندو ۵۶ ، عیسائی ۲ اور ان میں عورتیں صرف دو ہیں اور دونوں مسلمان (پہلی یقینی طور پر دوسری قیاساً) مسلمانوں میں ایسے شعراء جن کے فارسی اور اردو دونوں زبانوں کے اشعار تذکرے میں ہیں ۱۶ ہیں ۔ ایسے شعراء جن کا صرف فارسی کلام ہے ۲۳ ہیں ۔ باقی وہ ہیں جن کا صرف اردو

---

(۱) سال نامہ نگار ۱۹۶۴ء ، تذکروں کا تذکرہ نمبر ، ص ۲۵۱ مرتبہ راقم الحروف ۔
(۲) مقدمہ گلستان سخن ، جلد اول ، ص ۱۱۸ ، مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۶ء ۔
(۳) تفصیل کے لیے دیکھیے مضمون 'گلستان سخن' از قاضی عبدالودود مشمولہ کالج اردو میگزین قدیم دلی کالج ۔

کلام دیا گیا ہے ۔ ہندوؤں میں صرف ایک شاعر کا اردو فارسی کلام تذکرے میں درج ہے ۔ ۱۷ کے صرف فارسی اشعار ہیں اور ایسے شعراء جن کا صرف اردو کلام ہے ۳۸ ہیں ۔ عیسائیوں اور عورتوں کے صرف اردو اشعار ہیں ۔

(۲) مقامی حیثیت سے دیکھیے تو دہلی جہاں کے ۳۷۵ شعراء تذکرے میں ہیں اور تمام مقامات پر غالب ہے ۔ لکھنؤ کے صرف ۱۶ شعراء قابلِ شمول سمجھے گئے ہیں ۔ باقی شعراء دوسرے مقامات کے ہیں جن میں غالباً سب سے زیادہ آگرے کے ہیں ۔ سری رام کا یہ قول تو صحیح نہیں کہ مصنف نے دہلی سے باہر قدم رکھنا عار سمجھا ہے ۔ لیکن یہ ضروری صحیح ہے کہ بہ کثرت بیرونی مشاہیر مثلاً بحر ، رشک ، صبا ، نوازش وغیرہ نظر انداز کر دیے گئے ہیں ۔ دہلی کے بارے میں صرف مصنف کو ایک حد تک دعویٰ تھا لیکن وہاں کے بھی متعدد خوش گو شعراء (مثلاً مجروح ، ظہیر ، انور وغیرہ) کسی نہ کسی وجہ سے 'گلستانِ سخن' میں داخل نہ ہو سکے ۔ ہاں ایسے لوگ جن کا صابر و صہبائی سے تعلق ہے ۔ (خواہ ان کی مشق چند روز ہی کیوں نہ ہو) تذکرے میں شامل ہیں ۔

(۱) زمانۂ تالیف تذکرہ میں دہلی کے ہر طبقے کے لوگ شعر گوئی کی طرف مائل تھے اور صوفیہ ، اوباش اور رند مشرب ، اُمراء اور بازاری ، بادشاہ اور شہزادے سب کو اس کا ذوق تھا ۔ تیموری خاندان کے شعراء جن کا ذکر اس تذکرے میں ہے ۵۰ ہیں ۔

(۴) اس امر سے کہ پہلے تذکرے کا نام 'آثار المعاصرین' رکھا گیا تھا ۔ یہ نہ سمجھا جائے کہ اس میں صرف وہی شعراء ہیں جو اصطلاحی معنی میں صابر کے ہم عصر تھے ، اس لیے کہ اس میں مراد و قاسم وغیرہ ہیں جو صابر کیا صہبائی کے بھی ہم عصر نہیں کہے جا سکتے ۔

(۵) 'گلستانِ سخن' (مقدمۂ مقصد) میں دہلی کے جن اساتذہ کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے ان میں وہ بھی ہیں جو زمانۂ تالیف سے بہت قبل وفات پا چکے تھے (نصیر ، ممنون) اور وہ بھی جو اس قدر ہم عصر تھے کہ شاید صہبائی کے خاص حلقے سے باہر انہیں استاد نہ سمجھا جاتا ہو (مثلاً سوز) ۔ آزردہ کا ذکر علیحدہ کیا ہے اور انہیں سب سے بڑھایا ہے لیکن یہ غالباً مصلحت کی بنا پر ہے ۔ نہ وہ اس کے مستحق ہیں اور نہ صہبائی و صابر انہیں واقعی اتنا بڑا سمجھتے ہوں گے ۔

تذکرے کا آغاز بھی انہیں سے ہوا ہے (حالانکہ مقررہ قاعدے کے مطابق آزاد سے ہونا تھا) اساتذہ کی تعریف میں بڑے مبالغے سے کام لیا گیا ہے۔ اور کہیں کہیں صاف معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کھل کر بات کرنا نہیں چاہتا۔ یا کم از کم اس کی ذمہ داری خود قبول کرنا نہیں چاہتا۔ مثلاً مومن کی خود بینی کا ذکر۔ اظہار رائے میں ذمہ داری کا احساس کارفرما نظر نہیں آتا۔ صہبائی، سوز و صابر کی آواز گری (پروپیگنڈہ) تالیفِ تذکرہ کی سب سے بڑی غرض معلوم ہوتی ہے۔

(۶) بعض غیر مشہور شعراء کے حالات میں واقعہ نگاری سے کام لیا ہے۔ لیکن بیشتر مشاہیر کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ تاہم بہت سی کام کی باتیں اس تذکرے میں ملتی ہیں اور آزاد نے 'آبِ حیات' میں اس سے کئی جگہ کام لیا ہے، (مثلاً حالاتِ شاہ نصیر)، گو اس کا اعتراف نہیں کیا۔ یہ تذکرہ 'سخنِ شعراء' کے بھی ماخذوں میں ہے۔ خود اس تذکرے میں 'گلشنِ بے خار' کے سوا کسی تذکرے سے کوئی بات نہیں لی گئی۔ بعض اور تذکروں کا ذکر اس میں ضرور ہے۔

(۷) 'گلستانِ سخن' میں التزاماً تلمذ کا ذکر نہیں۔ خاص خاص شعراء کے شاگردوں کی تعداد جو مجھے اس کتاب سے معلوم ہوئی یہ ہے۔ صہبائی ۳۸ (اس میں درسیات پڑھنے والے بھی شامل ہیں)، نصیر ۲۹، احسان ۳، ذوق ۲۲، مشیر ۱۵، صابر ۱۴، غالب (بہ شمول حزیں) ۱۲، ممنون ۸، سوز ۳، تنویر ۳، آزردہ ۲، عارف ۲، ثابت (مؤخر الذکر کے بارے میں لکھا ہے کہ اولاد تیموریہ میں بیشتر اسی صاحب طبع کی شاگردی سے ممتاز ہیں)۔

واضح رہے کہ میں نے احتیاط سے گنا ہے لیکن شمار کرنے میں غلطی کا احتمال ہے۔ میں نے صرف ان شعراء کو لیا ہے جن کے بارے میں صراحتاً لکھا ہے کہ کس کے شاگرد ہیں۔ اپنی معلومات یا قیاس سے کام نہیں لیا۔ اگر کسی شاعر کو ایک سے زیادہ استادوں سے تلمذ ہے تو اس کا شمار سب استادوں شاگردوں میں کیا گیا ہے۔

(۸) واقعات جب بیان کیے جاتے ہوں تو کتاب میں زیادہ تر ایسے لوگوں کا ذکر ہو جنہیں جاننے کے مواقع حاصل ہیں تو اغلاط زیادہ نہیں ہو سکتے۔ لیکن دہلوی شعراء ہوں یا بیرونی تھوڑے، بہت اغلاط ان کے متعلق موجود ہیں۔ مثلاً سرور کے استاد کا تخلص سامی لکھا ہے حالانکہ یہ ساقی ہے (تذکرۂ سرور)۔ میر ببر علی انیس کا نام میر ہبر علی لکھا ہے۔

تذکرہ نگاروں کی طرح 'گلستانِ سخن' کے مؤلف نے بھی حالات کی فراہمی میں زیادہ زحمت اٹھانی گوارا نہیں کی اور سرسری طور پر جو کچھ معلوم ہو سکا ہے پیش کر دیا ہے ۔ مثلاً حزیں دہلوی کے متعلق لکھا ہے کہ اسے عارف سے تلمذ تھا ۔ غالب ہے کہ اب غالب سے اصلاح لیتے ہوں گے ۔ حالانکہ یہ کہ ولی عہد کے نوکر تھے ۔ بہ آسانی تحقیق کی جا سکتی تھی کہ وفاتِ عارف کے بعد کس کا تلمذ اختیار کیا تھا ۔

(۹) شاعروں کے تراجم کے ساتھ جو ان کے اشعار ہیں ان کی تعداد یہ ہے ۔ فارسی ۹۲۹ ، سید کے دو مصرع (وہ دہائے تاریخ) مزید بر ان اردو ۳۶۱۳ ، مخمس کے ۲۶ بند ، ان کے علاوہ مقدمے میں جو اشعار ہیں وہ اس تعداد میں شامل نہیں ۔ ذاتی تعلقات کی بنا پر ایسے لوگوں کے اشعار بھی بھر دیے ہیں جن کے اشعار کچھ بلند پایہ نہیں ۔ غلط انتساب کی صرف ایک مثال اس وقت میرے علم میں ہے ۔

ہوا ہے ابر ہے ساقی ہے مے ہے ۔۔۔ پر اک تو ہی نہیں افسوس ہے ہے

یہ میر انیس کی طرف منسوب ہے لیکن تذکرۂ قدرت اللہ شوق میں جو میر انیس کی ولادت سے قبل کی تالیف ہے ایک گمنام شاعر کے نام سے ہے ۔

(۱۰) کتاب کی عبارت نامانوس عربی و فارسی مفردات و مرکبات سے مملو ہے اور اس میں ایک جملہ بھی ایسا نہیں جس میں اردو کا لطف ملتا ہو ۔ بے نمک استعارات ، خنک تشابیہہ ، دور از کار کنائے ۔ مزید برآں ظاہر ہے کہ اس صورت میں بے ارادہ حقیقت سے انحراف ہو جانے کا بہت کچھ احتمال ہے اور ایسا ہوا ہے ۔

(۱۱) مقدمے میں بہت سی غیر ضروری باتیں ہیں لیکن جس زمانے میں لکھا گیا ہے اس لحاظ سے غنیمت ہے ۔ توافقِ لسانین پر مؤلف کی نظر ہے ، اگرچہ غلط مثالیں بھی دی ہیں ۔ لفظوں کی اصل معلوم کرنے کا بھی شوق ہے ، اگرچہ اس میں بھی بعض جگہ دھوکا کھایا ہے ۔ دساتیر سے متعلق طویل بحث ہے ۔ دساتیر سے واقفیت ظاہر ہوتی ہے ۔ مگر یہ تعجب کی بات نہیں کہ اپنے معاصرین کی طرح مؤلف کو بھی یہ خیال نہ ہوا کہ حواشی وغیرہ میں جن کتابوں کا ذکر ہے یاتو ان کا وجود ہی نہیں یا یہ بھی جعلی ہیں اور شکلِ اول میں اقتباسات محض فرضی ہیں[۱] ۔

ان خصوصیات کی روشنی میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ 'گلستانِ سخن' تاریخ تذکرہ نگاری میں خاص اہمیت رکھتا ہے ۔ چونکہ مصنف نے اس کے مواد کی فراہمی میں اپنی ذاتی کوششوں کے ساتھ اپنے احباب سے اور اس کی تدوین و ترئین میں اپنے استاد صہبائی سے بھی مدد لی ہے اس لیے یہ تذکرہ بلحاظ سوانح اور مباحث علمی خاصا مبسوط اور جامع ہو گیا ہے ۔

---

(۱) دہلی کالج میگزین ، ص ۹۵ ، ۱۹۵۳ء ۔

سترھواں باب

مناظراتی ادب

۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۴ء تک

اس دور میں ایک نئے ادب کا ظہور ہوا جسے ہم نے مناظراتی ادب کا نام دیا ہے ۔ اس ادب کے پانچ پہلو تھے :-

اول : اسلامی عقائد کی تشریح و وضاحت تا کہ اسلام کے اخلاقی ، معاشرتی اور معاشی نظام پر جو حملے غیر مسلم جماعتیں کر رہی تھیں ان کا جواب دیا جائے ۔ اس طرح ضمناً مذہب و سائنس ، نقل اور عقل ، عقل اور وحی ، صدورِ معجزات ، دوزخ ، جنت ، ملائکہ ، ارواح وغیرہ موضوعات پر بحثیں ہوئیں ۔ سود کا مسئلہ چھڑا ۔

دوم : عملی طور پر اعتراضات کا جواب اور مجادلوں ، مباہلوں اور مناظروں میں عیسائی اور ہندو معترضین سے مقابلہ اور اسلامی تصوّرات اور اسلامی شعارِ زندگی کی فوقیت پر زور ۔ تاریخِ اسلام اور اسلامی شخصیتوں کے سلسلہ میں مخالفین کی بحثوں کا جواب ۔

سوم : فرقہ وارانہ مناظرے جن میں بد قسمتی سے سنی ، شیعہ اور وہابی سب شامل تھے ۔ بدعت و سنت کی نزاع ، تقلید و عدم تقلید کا سوال ۔ یہ بحثیں بھی ہوئیں اور ان میں علماء کی مختلف جماعتوں نے حصہ لیا ۔ دیوبند ، فرنگی محل ، بدایوں اور بریلی نے خاص سر گرمی دکھائی ۔

چہارم : برطانوی حکومت کے قائم ہو جانے کی وجہ سے اس کی اطاعت اور عدمِ اطاعت ، فرضیتِ جہاد ، جدید تعلیم اور معاشرت کے جواز اور عدمِ جواز پر بحثیں ہوئیں ۔

پنجم : تمام اسلامی فرقوں کا قادیانیت کے خلاف محاذ ۔

اس مقالہ میں حتی الوسع ان تمام پہلوؤں کی نشاندہی کی گئی ہے ۔

(ادارہ)

انیسویں صدی کا وسط اس لحاظ سے بھی امتیاز رکھتا ہے کہ ہندوستان میں ذہنی بے چینی اور اندرونی کشمکش اپنے شباب کو پہنچ چکی تھی۔ یہاں بیک وقت مغربی و مشرقی تہذیبوں، جدید و قدیم نظامِ تعلیم اور نظامِ فکر اور اسلام و مسیحیت وغیرہ میں معرکۂ کارزار گرم تھا۔ اس کشاکش کے اوّلین علم بردار عیسائی مشنری تھے۔ اہلِ یورپ کی فتوحات کے ساتھ ساتھ عیسائی مبلّغ بھی ہر جگہ اپنا جال پھیلا رہے تھے دراصل ان سرگرمیوں کا اصلی محرک یورپ کا یہ خیال تھا کہ ہندوستان میں عیسائی حکومت کی سرپرستی میں ایک مسیحی کلیسا کی بنیاد رکھی جائے۔ اس کی تائید مسٹر مینگلس ممبر پارلیمنٹ کی اس تقریر سے ہوتی ہے جو انہوں نے ۱۸۵۰ء کے آغاز میں پارلیمنٹ کے دار العلوم میں کی۔ انہوں نے کہا:

> "خداوند تعالیٰ نے ہمیں یہ دن دکھایا ہے کہ ہندوستان کی سلطنت انگلستان کے زیر نگیں ہے، تا کہ عیسیٰ مسیح کی فتح کا جھنڈا ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک لہرائے۔ ہر شخص کو اپنی تمام تر قوت تمام ہندوستان کو عیسائی بنانے کے عظیم الشان کام کی تکمیل میں صرف کرنی چاہیے اور اس میں کسی طرح تساہل نہ کرنا چاہیے"۔

('حکومت خود اختیاری' بحوالہ 'علمائے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے')

اس کے پیشِ نظر عیسائی مشنریوں کی تبلیغی کوششیں ایسی بے ضرر نہ تھیں جتنا کہ ان کو بعض اوقات خیال کیا جاتا ہے۔ حق یہ ہے کہ ان کی سرگرمیوں سے ہندوستان میں رائج تمام مذاہب، ہندو دھرم، اسلام، سکھ دھرم، بہائی اور جینی سب خطرے میں تھے۔ اسلام البتہ زیادہ زد میں تھا۔ اس لیے کہ اسلام اور عیسائیت دونوں سامی الاصل مذاہب تھے۔ دونوں کی بنیادی اصطلاحات کسی حد تک متحد اور باہم مانوس تھیں۔ دونوں کے عقائد و ارکان کا معتدبہ حصہ باہم مشترک تھا۔ اس وجہ سے اوروں کے مقابلے میں مسلمانوں کو مبتلائے فریب کرنے میں زیادہ کامیابی کے امکانات تھے اور پھر حکومت بھی انہیں سے چھینی تھی، اس لیے یہ ضروری سمجھا جاتا تھا کہ مسلمانوں کے دینی احساس کو جہاں تک ممکن ہو مٹا دیا جائے۔ تاکہ دینی تنظیم میں ابتری کے ساتھ ساتھ ان کی سیاسی یک جہتی بھی ختم ہو جائے اور اگر ممکن ہو تو اسلام کو ہندوستان سے بالکل ہی ختم کر دیا جائے۔ اس لیے ایسی تدابیر اختیار کی گئیں جس سے عیسائی حکومت روز بروز مستحکم ہوتی جائے اور ہندوستان کے رہنے والوں میں، قطع نظر اس سے کہ وہ مسلمان ہوں یا ہندو،

مذہب کا احترام بالکل نہ رہے ، وطن کا احساس ختم ہو جائے اور باہمی رواداری کے بجائے وہ ایک دوسرے سے اس قدر خائف ہوں کہ انگریز کے سائے ہی میں اپنی بقا اور سلامتی یقینی خیال کریں ۔

فرانس کا ایک فاضل مستشرق گارساں دتاسی فروغ عیسائیت کی کوششوں کے بارے میں اپنے مقالات میں رقم طراز ہے کہ ابھی بمشکل پچاس برس ہوئے ہیں کہ انگریز مبلّغین نے ہندوستان میں کام شروع کیا ۔ اس عرصے میں ۸۷ ہزار اہل ہند انگلیکن کلیسا میں شامل ہو چکے ہیں ۔ جن ہندوستانیوں نے عیسائی مذہب قبول کیا ہے ان میں بعض نہایت مشہور لوگ شامل ہیں ۔ جیسے کلکتے کے 'بینر جی' اور 'مجھیا' ۔ جبل پور کے 'صفدر علی' ، دہلی کے 'رام چندر' اور 'تارا چندر' ۔ امرتسر کے 'عبداللہ اتھم' اور 'عماد الدین' ، پشاور کے 'دلاور خان گویا' ، 'نندر موہن ٹیگور کلکتوی' وغیرہ مسیحی حلقے میں شامل ہو چکے ہیں ۔ چنانچہ مدراس کے کلیسائی حلقے میں ۱۹۰ عہدے داروں میں ۹۷ بھارتی پادریوں کا تقرر ہوا ۔ گذشتہ تین سالوں میں مدراس کے کلیسائی حلقے میں ۷ ہزار ہندوستانیوں نے مسیحی مذہب قبول کیا ۔

۱۸۶۲ء میں جو اعداد و شمار جمع کیے گئے تھے ، ان کے مطابق ہندوستان میں کیتھولک فرقے کی تعداد ۸ لاکھ ۸۷ ہزار ۶ سو ۹۱ تھی ۔ لیکن اسقف ملمین کا خیال ہے کہ ان کی تعداد میں کچھ تخفیف ہو گئی ہے ۔ اس ضمن میں ایک اخبار لکھتا ہے :

> یسوعیوں کے مدارس نہایت عمدہ خدمات انجام دے رہے ہیں ، کیتھولک مشن کے سرگروہ ہندوستانیوں میں اسقف اعظم سٹین ہیں (Stein) جو نہایت قابل شخص ہیں اور ساتھ ہی ان میں وہ تمام خوبیاں ہیں جو کلیسا کے اعلیٰ عہدیداروں میں ہونی چاہئیں ۔ ان کی شخصیت سے ہر ایک متاثر ہوتا ہے"۔

(مقالات گارساں دتاسی)

> "اڈنبرا کے شریک اسقف اعظم کی صدارت میں اسکاٹ لینڈ کے اسقفی کلیسا نے ایک خاص شعبہ قائم کیا ہے ، جس کا مقصد غیر مسیحی ممالک اور خاص طور پر ہندوستان میں تبلیغ کرنا ہے"۔

(مقالات گارساں دتاسی)

> "چھوٹا ناگپور کے علاقے میں ۱۸۷۱ء میں سات سو انیس اشخاص نے بپتسما لیا ۔ کشمیر میں گرمی کے موسم میں سری نگر کی سڑکوں

ہر اردو میں وعظ کی اجازت مشنریوں کو ہوتی ہے۔ اس وعظ کا سڑکوں پر ہونا ناگزیر ہے۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ یہاں کوئی گرجا گھر نہیں ہے"۔ (مقالاتِ گارساں دتاسی)

'مولانا سید ابوالمنصور' مشہور مناظرِ اسلام نے اپنی ضخیم شہرہ آفاق کتاب 'نوید جاوید' میں رقم فرمایا ہے کہ:

"ہندوستان میں آج عیسائی مذہب والوں کی طرف سے مذہب پھیلانے کی کوشش ہو رہی ہے۔ اس سے مسلمانوں کو واقف ہونا چاہیے۔ اس کام کے واسطے عیسائی مشنیں قائم ہیں۔ ان میں پانسو مشنری بعضے ولایتی پادری اور دیسی پادری کتاب سناتے ہیں اور ان کی محنتوں سے سترہ لاکھ ہندوستانی اب تک عیسائی موجود ہیں اور ان میں سے تین لاکھ ہندوستانی عیسائی صرف مشنریوں کے ساتھ دین عیسوی پھیلانے میں سرگرم ہیں۔ بعضے ان میں انجیل شہر شہر اور گاؤں گاؤں میں سناتے اور بعضے انجیل پڑھاتے ہیں اور سال بہ سال ایک لاکھ سے زیادہ ہندوستانی لڑکے جو اب تک عیسائی نہیں ہوئے مشن کے مدرسوں میں انجیل پڑھائے جاتے ہیں اور دو مجلسیں صرف دینی کتابوں کے چھپوانے کے بندوبست کے واسطے مقرر ہیں۔ ایک بائیبل سوسائٹی کہ جس میں رسالے اور کتابیں جو اسلام وغیرہ کی تردید میں تصنیف کی جاتی ہیں۔ انہیں رسالوں کے چھاپنے کے واسطے جو روپے چندہ ہوتا ہے اور بائبل سوسائٹی کا خرچ اس سے زیادہ ہے۔ پادریوں، مدرسوں اور مدرسوں کا خرچ، تنخواہیں سب اس چندہ سے جاری ہیں"۔

"عیسائیوں کی ان تبلیغی سرگرمیوں کی وجہ سے زیادہ تر اور انگریزی تعلیم کی آزاد خیالی سے قدرے ہر 'چہار جانب مذہبی' مباحثوں کے اکھاڑے کھل گئے۔ عیسائی، ہندو، مسلمان سب ایک دوسرے کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور اس زمانے میں ایسا کہرام بالکل فطری تھا۔ کیونکہ ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگِ آزادی کے بعد سیاسی سرگرمیوں کے لیے بہت کم گنجائش رہ گئی تھی، اس لیے ساری توجہ ان مشاغل میں مرکوز ہو کر رہ گئی۔ اس وقت تو جیسے بحث مباحثوں کا طوفان آ گیا۔ کوئی مذہب ایسا نہیں رہا جو مناظرے

کے لیے میدان میں نہ نکل آیا ہو اور یہ انگریز کی 'لڑاؤ اور حکومت کرو' کی پالیسی کے عین مطابق بھی تھا۔

جیسا کہ سرجان میلکم نے ظاہر کیا ہے :

"اس قدر وسیع سلطنت میں ہماری غیر معمولی قسم کی حکومت کی حفاظت اس امر پر منحصر ہے کہ ہماری عمل داری میں جو بڑی جماعتیں ہیں ان کی عام تقسیم ہو ، اور پھر ایک جماعت کے ٹکڑے مختلف ذاتوں اور فرقوں اور قوموں میں ہوں ۔ جب تک یہ لوگ اس طریقہ سے جدا رہیں گے اس وقت تک غالباً کوئی بغاوت اٹھ کر ہماری قوت کا استحکام متزلزل نہ کرے گی"۔

('حکومت خود اختیاری' ، بحوالہ 'علمائے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے')

مسز اینی بسنت لکھتی ہیں :

"کمپنی والوں کی جنگ سپاہیوں کی جنگ نہ تھی بلکہ تاجروں کی جنگ تھی ۔ ہندوستان کو انگلستان نے اپنی تلوار سے فتح نہیں کیا تھا ، بلکہ خود ہندوستانیوں کی تلوار اور رشوت و سازش ، نفاق اور حد درجہ کی دو رخی پالیسی پر عمل کر کے اور ایک جماعت کو دوسری جماعت سے لڑا کر اسے ملک حاصل ہوا"۔

(روش ، مستقبل بحوالہ 'علمائے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے')

بہر حال ہندوستان میں انتشار زیادہ تر ان مناظروں سے واقع ہوا جو عیسائی مشنریوں نے بپا کر رکھے تھے ۔ ان مناظروں میں تمام مذاہب نے بالعموم اور عیسائی مشنریوں نے بالخصوص اسلام کو تختۂ مشق بنایا اور انہیں ایسے مسلمان مرتدین کی کھیپ ہاتھ لگ گئی تھی جو اسلام سے بھی اچھی واقفیت رکھتے تھے مثلاً 'عماد الدین' ۔ اس کے بارے میں 'گارساں دتاسی' نے اپنے مقالے میں تحریر کیا ہے کہ مولوی عماد الدین پہلے مذہبِ اسلام کے عماد تھے ۔ اب مسیحی مذہب کے عماد ہیں ۔ وہ اپنی تحریر و تقریر میں مسیحی مذہب کی ہندوستان میں بڑی خدمت کر رہے ہیں ۔ اس کے علاوہ پادری 'وارثِ دین' ، 'ولایت علی دہلوی' ، 'صفدر علی' ، 'سلامت علی آگروی' وغیرہم بھی اسلام سے نکل کر عیسائیوں کے حق میں بہت مفید ثابت ہوئے ۔

ان مناظروں میں زیادہ تر مندرجہ ذیل موضوعات زیرِ بحث رہے :

تثلیث

عیسائی مذہب میں تثلیث (باپ ، بیٹا اور روح القدس) کو اصولِ دین کے طور پر تسلیم کیا گیا ہے ۔ عیسائی علماء نے اس عقیدہ کی درجِ ذیل تشریح کی ہے :

''ہم تثلیث میں واحد خدا کی اور توحید کی پرستش کریں ، نہ اقانیم کو ملائیں نہ ماہیت کو تقسیم کریں ۔ کیونکہ باپ ایک اقنوم ، بیٹا ایک اقنوم اور روح القدس ایک اقنوم ہے ۔ مگر باپ بیٹے اور روح القدس کی الوہیت ایک ہی ہے ۔ جلال برابر ، عظمت ازلی یکساں ۔ جیسا باپ ویسا بیٹا ہی روح القدس ۔ باپ غیر مخلوق بیٹا غیر مخلوق 'روح القدس غیر مخلوق' باپ غیر محدود اور روح القدس غیر محدود ۔

اسی طرح تین غیر محدود نہیں اور نہ تین غیر مخلوق ، یوں باپ قادرِ مطلق ، بیٹا قادرِ مطلق ، تو بھی تین قادر مطلق نہیں ، بلکہ ایک قادر مطلق ہے ویسے ہی باپ بیٹا خدا ۔ روح القدس خدا ۔ تس پر بھی تین خدا نہیں بلکہ ایک خدا ۔ اسی طرح باپ خداوند ، بیٹا خداوند اور روح القدس خداوند ، تو بھی تین خداوند نہیں ۔ بلکہ ایک خداوند ۔ کیونکہ جس طرح مسیحی عقیدے سے ہم پر فرض ہے کہ ہر ایک اقنوم کو جداگانہ خدا اور خداوند مانیں ۔ اسی طرح دین جامعہ سے ہمیں یہ کہنا ہے کہ تین خدا یا تین خداوند ہیں ۔ باپ کسی سے مصنوع نہیں ۔ نہ مخلوق نہ مولود ۔ روح القدس باپ اور بیٹے سے ہے ۔ نہ مصنوع نہ مخلوق نہ مولود ۔ بس باپ ایک ہے ۔ نہ تین باپ بیٹا ہے نہ تین بیٹے ۔ ایک روح القدس ہے نہ تین روح القدس اور اس تثلیث میں ایک دوسرے سے پہلے یا پیچھے نہیں ۔ ایک دوسرے سے بڑا یا چھوٹا نہیں بلکہ تینوں اقانیم باہم ازلی برابر یکساں ہیں''۔

کفارہ

اس تثلیث پر کفارہ کا مسئلہ بھی قائم کیا گیا ہے ۔ یعنی عیسائیوں نے اپنے تین خداؤں کو مختلف فرائض سونپ رکھے ہیں ۔ باپ کا کام جہان کو پیدا کرنا اور

رکھنا ہے ، بیٹے کا کام نجات دینا اور کفارہ ہوتا ہے ۔ روح القدس کا کام انسان کے دل کو ایمان کے لیے مستعد کرنا اور ایمان لانے کے بعد قائم رکھنا ہے ۔

مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان زیادہ تر انہی دو موضوعات پر تقریری ، تحریری مناظرے ہوئے ۔ مسلمان مناظرین چونکہ توحید پرست تھے اور کفارہ پر ایمان نہیں رکھتے تھے ، اس لیے انھوں نے ان عقائد کا بطلان خود عیسائیوں کی کتابوں سے کیا ۔ اس دوران میں مسیحیت و اسلام کا تقابل بھی ہوتا رہا اور اسلام کی حقیقت بہ دلائل ثابت کی گئی ۔ توریت ، انجیل کا تقدس بجا ، لیکن یہ ثابت ہو گیا کہ موجودہ نسخے قطعی تحریف شدہ ہیں اور 'عہد نامہ جدید' جو نتیس اناجیل کا انتخاب اناجیل اربعہ (انجیل متی ، انجیل مرقس ، انجیل لوقا اور انجیل یوحنا) پر مشتمل ہے جو حضرت عیسیٰ کی تعلیمات سے زیادہ سینٹ پال کے خیالات کا مرقّع ہے ۔ عیسائی مناظرین حضور صلی اللہ علیہ و سلم کی صداقت پر اکثر منہ آتے ۔ لیکن مسلمان مناظرین نے خود عیسائیوں کی مقدس کتاب انجیل سے ثابت کیا کہ حضور ہی نبی برحق خاتم الانبیاء ہیں ۔ جن کی پیش گوئی حضرت عیسیٰ علیہ اسلام کی انجیلِ مقدّس میں کر دی گئی تھی ۔

تقابل قرآن و وید

مسلمانوں ، ہندوؤں اور آریہ سماجیوں میں زیادہ تر قرآن کا محرف ہونا اور ویدوں کا الہامی ہونا موضوع بحث رہا ۔ اس میں ہندوؤں کی طرف سے لاطائل دلائل پیش کیے جاتے[1] اور باطل گوئی سے کام لیا جاتا ۔ لیکن مقابلے میں ایسا مسکت جواب پاتے کہ دم گھونٹ کر رہ جاتے ۔ مولانا ثناء اللہ امرتسری کے حالات میں ایسی تصریحات ملیں گی جو ہندوؤں کی ہذیان گوئی اور اہلِ اسلام کی حق گوئی پر دال ہیں ۔ ان کے علاوہ دوسرے اہلِ تحقیق نے بھی قرآن پر اعتراضات کے جواب خوب شد و مد میں تحریر کیے اور ثابت کیا کہ قرآن میں ایک شوشے کا فرق بھی نہیں پڑا ۔ البتہ ویدوں کا الہامی ہونا قطعاً مشکوک ہے اور اس کی تائید میں عقلی دلائل ہی پیش نہیں کیے بلکہ نقلی حوالوں کا بھی انبار لگا دیا ۔

عیسائیوں ، ہندوؤں اور مسلمانوں کے آپس میں مناظروں کے علاوہ خود مسلمانوں کے فرقوں کے باہمی مناظروں کا الگ میدان کارزار تھا اور اب بھی کبھی کبھی جو چنگاری بھڑک اٹھتی ہے تو ایک فرقہ دوسرے کے مقابلے میں خم ٹھونک کر کھڑا ہو جاتا ہے اور آپس میں خوب خوب ملاحیاں سنائی جاتی ہیں ۔ اہلِ اسلام میں

زیادہ تر شیعہ ، سنی ، وہابی ، چکڑالوی (اہلِ قرآن) احمدی آپس میں بر سرِ پیکار رہے ہیں ۔ عصمت آئمہ ، خلافت و امامت ، جمعیت حدیث ، حیات و ممات مسیح ، ختم نبوت نور بشر ، حاظر و ناظر ، تقلید شخصی ، قرأت فاتحہ ، خلف الامام ، رفع یدین ، حیات نبیؐ وغیرہ مسائل پر عقلی نقلی ، لفظی دلائل بہم پہنچتے رہے ہیں اور معاملہ اکثر ہار جیت کے بغیر انجام کو پہنچتا رہا ہے ۔

عصمت آئمہ و خلافت و لظامت امامت

شیعہ اور سنیوں میں زیادہ تر عصمت ائمہ اور خلافت و امامت زیرِ بحث رہی ہے ۔ شیعہ امام کو مامور من اللہ مانتے ہیں اور حضور کے بعد حضرت علی کو علی الاتصال خلیفہ برحق جانتے ہیں ۔ اہلِ سنت کتاب و سنت اور آثار صحابہؓ سے اس کا رد ثابت کرتے ہیں اور حضرت نبی کریمؐ کے بعد حضرت ابو بکرؓ ، حضرتؓ عمرؓ ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کو علی الترتیب خلیفہؓ برحق اقرار دیتے ہیں ۔ اہلِ تشیع اپنی کتابوں سے اپنے مسلک کی تائید میں دلائل قاطع و براہین ساطعہ پیش کرتے ہیں ۔ اور معترضین کو گمراہ ٹھہراتے ہیں ۔

حیات نبی ، قرأت فاتحہ خلف الامام ، رفع یدین ، آمین بالجہر ، نور بشر وغیرہ

سنّیوں اور وہابیوں میں زیادہ تر حیاتِ نبی ، قرأت فاتحہ ، خلف الامام ، رفیع یدین ، آمین بالجہر ایسے موضوع زور آزمائی کا باعث بنے اور اب بھی ہیں ۔ سنّی بالخصوص اکثر بریلوی حضرات حضورؐ کی دنیوی اور برزخی زندگی میں کوئی فرق نہیں سمجھتے ۔ حضورؐ کو نور من نوراللہ مانتے ہیں اور قرآن کی آیۃ مبارکہ "قد جاء کم من اللہ نور" فی کتاب مبین" تائید میں پیش کرتے ہیں ۔ رفع یدین ، آمین بالجہر ، قرأت فاتحہ خلف الامام کے سلسلہ میں انکار یا تائید کے لیے تمام قرآن و حدیث' اقوالِ صحابہ' آثارِ سلف صالحین سے استدلال کرتے ہیں ۔ مخالف فریق اہلِ حدیث بالخصوص شدت سے ان کے منکر ہیں اور اپنے مؤقف کی تائید میں قرآن و حدیث سے حوالے مہیا کرتے ہیں ۔ ان موضوعات پر لاکھوں مناظرے ہوئے اور سینکڑوں کتابیں تصنیف ہوئیں ۔ ایک گروہ دوسرے گروہ کو دریدہ دہن ، گستاخ قطعی ، غیر ناجی قرار دیتا ہے ۔ دوسرا گروہ پہلے کو مشرک ، کندۂ دوزخ گردانتا ہے ۔

جمعیت حدیث

اہلِ قرآن اور غیر اہلِ قرآن میں زیادہ تر جمعیت حدیث کا مہتم بالشان موضوع زیرِ بحث رہا ہے ۔ اہلِ قرآن کہتے ہیں کہ اسلام میں افتراق و انتشار کا باعث

احادیث ہی ہیں جن کی حیثیت بجائے خود مشکوک ہے ۔ کیونکہ یہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کئی سو سال بعد مدوّن ہوئی ہیں ۔ مخالف فریق حدیث کو وحی خفی کا درجہ دیتا ہے اور بدلائل ثابت کرتا ہے کہ شریعت فقہ کی تکمیل اور قرآن کی تفہیم برون حدیثِ نبوی قطعاً ممکن نہیں ۔

ختمِ نبوت

احمدیوں کے نزدیک نبوت ختم نہیں ہوئی بلکہ بقول مرزا صاحب :

> ''ختم کے معنی مہر ہیں ۔ آنحضرتؐ بلا شبہ خاتم النبیین ہیں ، مگر اس کا مفہوم یہ ہے کہ اب جو بھی آپ کے بعد نبی آئے گا اس کی صداقت پر مہرِ نبوت محمدی ثبت ہوگی ۔ یعنی وہ شریعتِ محمدی کے تابع ہوگا ۔ جیسے انبیاء بنی اسرائیل شریعت موسوی کے تابع تھے ۔ یہ سلسلہ حضرت عیسیٰ ابنِ مریم پر ختم ہوگا ۔ میں مثیل مسیح ہوں اور وہی مسیح و مہدی ہوں جس کی آمد کی خبر احادیث میں ہے'' ۔

لیکن چونکہ جمیع المسلمین کا عقیدہ یہی ہے کہ حضورؐ کے بعد ظلی ، بروزی ، کوئی نبی نہیں آ سکتا ، اس لیے ختم نبوت کے موضوع پر موافق مخالف فریق میں زبردست مناظرے ہوئے (اور اب تک ہوتے ہیں) اور سینکڑوں مجلدات وجود میں آئیں ۔

اس پرآشوب دور نے بڑے بڑے زبردست مناظر پیدا کیے ۔ جو شخص اپنے مذہب کی معمولی شد بود کے ساتھ ذرا بھی زبان چلانے کا ملکہ رکھتا تھا ، محاربہ کے لیے نکل کھڑا ہوا اور چونکہ ایسے مناظرے علمی ، تحقیقی بحث کے بجائے اکثر الزامی جوابات پر مبنی ہوتے تھے ، اس لیے ان میں جیت عموماً انھی کی ہوتی ، جو ضلع جگت ، حاضر جوابی میں نظیر نہ رکھتے تھے ۔ اس کے باوجود اس عہد میں ایسے مناظر بھی پیدا ہوئے ، جن کی علمی تحقیقی قابلیت میں کسی کو کلام نہیں اور حق یہ ہے کہ انہیں کی فتوحات کا کچھ‌کچھ تذکرہ باقی رہ گیا ہے ۔ ورنہ آخور کی بھرتی ساتھ کے ساتھ غرق ہے ناب ہوتی رہی ۔

جیسا کہ پہلے بھی ذکر آ چکا ہے عیسائیوں میں اول اول ولایتی پادری مثلاً فنڈر ، راس ، لیفرائے ، رولینڈ ، پٹ مین ، پینل ، ویری ، وائرلیٹ سٹائین ، بوفائین ، ڈیڈ براؤن ، طامس ، کوری ، ہنری مارٹن اور جیمز وغیرہ تبلیغ عیسائیت کرتے تھے اور جب ان کی ہفوات سے متاثر ہو کر دنیا طلبی میں کئی ایک ہندوستانی بھی اپنی سیاہ بختی سے الٹی راہ پر پڑ لیے تو متذکرہ ولایتی کھیپ کی کمک ہاتھ لگ گئی ۔

اس زمانے میں مختلف مذاہب کے جن مناظرین نے بہت نام پیدا کیا اور شہرۂ آفاق کتب رقم کیں ان کی تفصیل حسب ذیل ہے :

ڈاکٹر کارل فنڈر

ایک جرمن مشنری تھا ، جسے روسی سلطنت نے جورجیا کے قلعے شوشا سے شہر بدر کر دیا تھا ۔ اس سے قبل وہ فارسی زبان سیکھ چکا تھا اور کئی مرتبہ ایران بھی ہو آیا تھا ۔ ایران میں پہلی بار وارد ہونے پر اس نے وہاں کے شہر کرمان شاہ میں اپنی پہلی کتاب 'میزان الحق' شائع کی ۔ 'میزان الحق' کے علاوہ اس نے بہت سی فارسی کتابیں لکھیں جن کا اردو میں ترجمہ ہوا ۔ 'میزان الحق' اس کی بہت مشہور کتاب ہے ۔ 'میزان الحق' میں کتب مقدسہ کی اصلیت کا ثبوت بہم پہنچایا گیا ہے ۔ بائیبل کی خاص تعلیمات کی تشریح کرنا اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ و سلم اور قرآن مجید کے کلام اللہ ہونے کے دعاوی کی تردید کرتا ہے ۔ اس کی دو اور کتابیں قابل ذکر ہیں ۔ 'طریق الحیات' اس میں گناہ اور اس کی ماہیت اور نتائج کا بیان کیا گیا ہے اور پھر نجات کے طریقہ کی تشریح کی گئی ہے ۔ یہ 'میزان الحق' سے بھی زیادہ اہم کتاب ہے ۔ 'مفتاح الأسرار' ، میں حضرت مسیح کے اعلیٰ مرتبے کا ذکر اور پھر ان کی بے مثل پیدائش اور معجزات ، ابنیت اور تثلیث کا بیان ہے ۔ ایل ۔ بیون جونز کا خیال ہے کہ ڈاکٹر فنڈر کی ایک کمی ہے کہ اسلام کی تعلیم اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خصائل و عادات پر نکتہ چینی کے بغیر مسیحی ایمان پر وہ لکھ نہیں سکتا تھا یا لکھنا نہیں چاہتا تھا ۔ بعض موقعوں پر اس کے دلائل بھی کمزور ہیں کہ مسلمان مناظروں نے جن سے پورا فائدہ اٹھایا ہے (اہل مسجد (People of the Mosque) از ایل ۔ بیون جونز) ۔

عماد الدین

۱۸۶۶ء میں رابرٹ کلارک کے ہاتھوں بپتسمہ لیا ۔ یعنی جس سال فنڈر ہندوستان سے چلا گیا ، عماد الدین کو بشپ مامین نے کلکتہ چرچ میں ایک اہم عہدہ پر ۱۸۶۸ء میں مقرر کیا ۔ بعد میں یہ لاہور میں بشپ فرنچ کا چپلن مقرر ہوا ۔ ۱۸۸۴ء میں آرچ بشپ آف کنٹربری نے اسے ڈی ۔ ڈی کی ڈگری عطا کی ۔ ۱۹۰۱ء میں مرگیا ۔ اس نے بیس سے زیادہ کتابیں لکھی ہیں جن میں زیادہ تر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کی ہے ۔ اس کی مشہور کتاب 'ہدایت المسلمین' ہے جس میں مضامین کے دوران میں کتب مقدسہ 'توریت' ، 'زبور' ، 'انجیل' کی صحت کی بڑی زور سے حمایت کی ہے ۔ اس کی دو کتابوں (۱) 'تاریخ محمدی' (۲) 'تعلیم محمدی' کا گارساں دتاسی نے

اپنے مقالات میں ذکر کیا ہے ۔ 'تاریخِ محمدی' کے بارے میں لکھتا ہے کہ یہ کتاب نو عیسائی پادری عماد الدین کی تصنیف ہے ، یہ پہلی کتاب ہے جو ایک ایسے شخص نے اپنی زبان میں اس موضوع پر لکھی ہے جو کبھی 'زمرۂ اسلام' میں تھا مگر اب باہر ہے ۔ سیرت نگار نے ان متضاد بیانوں کا ذکر کیا ہے جو قرآن میں ملتے ہیں ۔ معجزوں کو صداقت کے ثبوت میں بیکار بتایا ہے ۔ حدیث میں جو بذریعہ روایات محفوظ ہیں ، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب ایسے معجزے منسوب کیے گئے ہیں جو مضحکہ خیز ہیں ۔ مؤلف ان حدیثوں کو بھی رد کرتا ہے ۔ 'علمِ محمدی' کے بارے میں گارساں دتاسی رقم طراز ہے کہ یہ عماد الدین کی دوسری کتاب ہے ۔ اس میں دیسی مآخذ استعمال کیے گئے ہیں ۔ یہ کتاب ہندوستان کے مسیحی مناظراتی ادب میں خاص اہمیت رکھتی ہے ۔

عماد الدین کی کتابوں کے بارے میں اس کا ہم مذہب ایل ۔ بیون جونز اپنی تصنیف 'اہلِ مسجد' (People of the Mosque) میں لکھتا ہے کہ اگرچہ اس کی تصنیفات کا کسی زمانہ میں زبردست اثر رہ چکا ہے ، لیکن اب فنڈر کی کتابوں کی طرح اس کی کتابیں خارج از استعمال ہو رہی ہیں ۔

پادری صفدر علی

اس نے ۱۸۶۵ء میں جبل پور میں بپتسمہ لیا ۔ وہ اسکولوں کا انسپکٹر تھا اور اس نے کئی کتابیں تصنیف کیں ، جن میں ایک رسالہ 'نیاز نامہ' ہے ۔ اس رسالہ میں اس نے مسلمانوں کو اپنی تبدیلیٔ مذہب کی وجہ بتائی ہے ۔ اس کتاب کو محض اس خاطر عیسائیوں نے حرزِ جان بنایا کہ یہ ایک دنیا طلب مولوی کی تصنیف ہے جو پیٹ کے لیے عیسائی ہوگیا ۔ بقول ایل ، بیون جونز یہ عمادالدین کے پایہ کا مناظر نہیں تھا ، اسکا حملہ عمادالدین کا سا تیز نہیں ہوتا ۔

سرسیّد احمد خاں

۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء بمقام دہلی ولادت ہوئی ۔ ابتدائی تربیت والدہ کی زیرِ نگرانی ہوئی ۔ حصول تعلیم کے بعد ملازمت اختیار کی ۔ دورانِ ملازمت ہی تصنیف و تالیف کا کام بھی جاری رہا ۔

سرسیّد احمد خاں کی ابتدائی دور کی کتابوں میں مناظرہ و تقابل مذاہب کا رجحان ملتا ہے ، جو اس عہد کا محبوب مشغلہ تھا ۔ عیسائی مشنریوں کی غیر ملکی فرمانرواؤں

نے اپنے خاص مقصد کے تحت جسکا ذکر آ چکا ہے بہت کچھ حوصلہ افزائی کی تھی - اس عام فضا سے متاثر ہو کر سرسیدؒ نے بھی اس قسم کی بحثوں میں نمایاں حصہ لیا - ان نزاعات میں سید صاحب کو حضرت سید احمد بریلوی اور شاہ اسماعیل شہید کی تحریرات اور تعلیمات سے عشق تھا - اس دور میں سرسیدؒ کا نقطہ' نظر علمی اور خالصاً دینی تھا - زندگی کی مادی قدروں کی ہوتی اہمیت ان پر نہیں کھلی تھی - مسائل حاضرہ کی جگہ مجرد حقائق اور محض تصورات کے دلدادہ تھے - چنانچہ اس زمانہ میں مناظرہ اور عقائد ان کی جستجو کے خاص میدان تھے -

'تحفہ' حسن' میں حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی تصنیف 'تحفہ اثناء عشریہ' (شیعہ عقائد کے بارے میں) کے باب دہم و دوازدہم کا ترجمہ ہے - یہ رسالہ شیعوں کے مؤقف کی تردید میں ہے -

'راہِ سنت و ردّ بدعت' یہ رسالہ وہابیت کے جوش کے زمانے میں اہلِ بدعت کے بر خلاف متبعّینِ سنّت کی تائید میں لکھا ہے -

'خطبات احمدیہ' میں سر ولیم میور کے ان اعتراضات کا جواب ہے جو اس نے اپنی کتاب حیات حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں حضور پر کیے تھے - اس کتاب کو باقاعدہ سوانح عمری نہیں کہہ سکتے - یہ مختلف مضامین کا مجموعہ ہے - جس میں سوانح (بارہ برس تک) کے علاوہ دوسرے مباحث، مثلاً عرب کا جغرافیہ، انجیل کی بشارتیں، معراج وغیرہ کی حقیقت بھی موجود ہیں - اس میں سیرتِ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اصول سے عالمانہ بحث کی گئی ہے -

'تبئین الکلام' بائبیل کی تفسیر ہے اور اسکو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ تمام مذہبی کتابیں اصولی لحاظ سے ایک ہی سر چشمہ' فیض سے جاری ہوئی ہیں - البتہ فرق یہ ہے کہ سرسید نے موجودہ بائیبل کو لائقِ اعتماد اور مستند قرار دے کر اپنی گراں قدر سعی کی اہمیت خود کم کر دی ہے - اس سے یہ کمزوری پیدا ہوگئی ہے کہ علومِ اجتماعی کے مقابلے میں جو اعتراض بائیبل پر وارد ہوتے ہیں وہ قرآن پر خود بخود وارد ہو جاتے ہیں - یہ عقل اور نیچر پر ضرورت سے زیادہ اعتماد کا نتیجہ ہے - اس تصنیف میں بہرحال سرسید کا ذہن بڑی فکری تنظیم اور منصوبہ بندی سے چلتا ہے - اس میں دماغی کاوش بہت ہے -

'تفسیر القرآن' : اس تفسیر میں روایات سے بغاوت اپنی آخری حد پر ہے - اس تفسیر میں ان کے افکار کا محور یہ ہے کہ دین میں صرف قرآن مجید یقینی ہے - باقی

حدیث ، اجماع اور قیاس اصول دین میں شامل نہیں ۔ ان کا یہ بھی پختہ خیال ہے کہ اسلام کا کوئی مسئلہ عقل اور اصول تمدن کے خلاف نہیں ۔ اس تفسیر میں سرسید نے قرآن مجید کے جغرافیائی اور تاریخی عقدوں کو حل کرنے کی کوشش بھی کی ہے اور ان مسائل کو جن کے متعلق دور جدید کو کچھ اعتراضات تھے عقل ، فطرت اور تمدن کی روشنی میں پیش کیا ہے ۔ سرسید نے 'ناسخ منسوخ' ، 'معراج جسمانی' ، 'جہاد' ، 'سود' 'غلامی' ، 'تعدد ازدواج' 'آدم اور ابلیس کی کہانی' ، 'ملائکہ اور جنات' ، 'وفات مسیح اور رویت باری' وغیرہ کے متعلق جمہور کی رائے سے اختلاف کیا ہے ۔ سرسید کی تفسیر افکار دینی کے نقطۂ نظر سے اس لیے اہم ہے کہ اس نے آئندہ کے رجحانات کے بدلنے اور ڈھالنے میں بڑا حصہ لیا ۔ سید صاحب کی دوسری کتابوں کی طرح اس تفسیر نے دینی بحث و نظر کو روحانی سمت سے ہٹا کر عقلی و مادی سمت کی طرف متوجہ کیا ہے اور اس رجحان کو ترقی دی ہے کہ زندگی کی مادی قدریں قابل اعتنا ہیں ۔ باقی جو کچھ ہے ضمنی ہے ۔

سرسید کی تفسیر بحث و نظر کے اعتبار سے مربوط اور منظم ، اور اسلوب بیان کے لحاظ سے دلچسپ تصنیف ہے ۔ اس میں مذہبی اور علمی اصطلاحات کی وہ بھرمار نہیں جو عام طور پر تفاسیر میں ہوا کرتی ہے ۔ اس میں انہوں نے بائیبل کے بیانات سے فائدہ اٹھا کر مذہب کے تقابلی مطالعہ کی تحریک کو ایک قدم اور آگے بڑھایا ہے ۔

مولانا الطاف حسین حالی (۱۸۳۷ء - ۱۹۱۴ء)

ابتدائی تعلیم کے بعد سترہ برس کی عمر میں گھر کا بوجھ سر پر آ پڑا ، لیکن تعلیم کے شوق میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر دلی چلے گئے ۔ ۱۸۵۵ء میں واپس پانی پت آئے اور ۱۸۵۶ء میں حصار میں معمولی تنخواہ پر ملازمت مل گئی ۔ ۱۸۵۷ء میں غدر ہوا اور چار سال بیکاری میں گذر گئے ۔ اس دوران میں منطق ، فلسفہ ، حدیث ، تفسیر پڑھی ۔ خصوصاً ادب کی کتابیں لغات کی مدد سے دیکھیں ۔ عربی نظم و نثر میں مشق بہم پہنچائی ۔ دلی کے قیام میں غالب سے تعلق قائم ہوا اور وہیں اردو شاعری کے لیے انگیخت ہوئی ۔ ۱۸۶۳ء میں شیفتہ سے شناسائی ہوئی اور آٹھ برس ان کی مصاحبت کی ۔ وہیں مذاق شاعری بمراتب بلند تر ہوا ۔ نواب شیفتہ کے بعد پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو میں ملازمت مل گئی ۔ ترجموں کی عبارت درست کرتے رہے ۔ ۱۸۷۴ء میں محمد حسین آزاد نے جس شاعری کی بنیاد ڈالی ، اس میں چار مثنویاں لکھیں اور نثر میں بھی تصنیف و تالیف جاری رہی ۔

تریاق مسموم ۱۸۶۷ء میں یہ سب سے پہلی تصنیف ہے جو کسی عیسائی کے جواب میں رقم کی ۔ اب ناپید ہے ۔

تاریخ مھدی پر منصفانہ رائے

یہ عمادالدین کی تصنیف 'تاریخ مھدی' پر اپنی رائے کا اظہار کیا ہے ۔ ۱۸۷۲ء میں شائع ہوئی ۔ اب نایاب ہے ۔

نواب محسن الملک

نام سید مہدی علی ، ۱۸۳۷ء میں پیدا ہوئے ، والد شیعہ تھے ۔ خود نواب صاحب سنی ہو گئے اور اس ضمن میں ایک کتاب لکھی جسکا نام 'آیات بینات' ہے ۔ اس میں مذہب سنی کی فضیلت اور حقانیت بہ دلائل ثابت کی ہے ۔ اس کی تحریر کا سلسلہ جاری تھا کہ نواب صاحب کی ملاقات سرسید سے ہو گئی اور وہ خدمت قومی کی طرف متوجہ ہو گئے ۔ 'آیات بنیات' کا موضوع سرسید کے مسلک کے خلاف تھا اس لیے تین جلدیں لکھ کر اس کو ناتمام چھوڑ دیا ۔ اس کی پہلی جلد ۱۸۷۰ء میں مرزا پور مشن پریس سے لا ٹپ میں شائع ہوئی ۔ نواب صاحب کی دوسری کتابیں 'تقلید عمل بالحدیث' ، 'کتاب المحبت والشوق' وغیرہ ہیں ۔ نواب صاحب کی کتابیں بہت بلند درجے کی ہیں مگر مضامین میں کوئی جدید خیال نہیں ، البتہ 'تہذیب الاخلاق' کے مضامین میں بڑا جوش ہے ۔ محسن الملک دراصل سرسید احمد خاں کے ترجمان تھے اور اکثر مسائل میں انہیں کی پیروی کرتے تھے ۔ ابتداء میں ضرور انہیں سر سید کے خیالات سے وحشت تھی ۔ پھر تو ایسے رام ہوئے کہ سید صاحب انہیں کبھی کبھی لحمک لحمی اور محب اور محبوب کے الفاظ سے یاد کرتے ۔ انہوں نے سرسید کو 'خطبات احمدیہ' کی تالیف میں مدد دی ۔

نواب صاحب کے خیالات اور سر سید کے انحرافات ذہنی میں کہیں ٹکراؤ نہیں ، البتہ ان کے حق میں اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ وہ سلف کے دینی افکار سے یکسر الگ نہیں ہوئے اور وہ پرانی روایات و منقولات سے سر سید کے مقابلے میں کچھ زیادہ استفادہ کرتے تھے ۔

شبلی نعمانی (۱۸۵۷ء - ۱۹۱۴ء)

ابتدائی تعلیم کے بعد انہیں مذہبیات میں سب سے پہلے وہابیوں اور حنفیوں کے باہمی جھگڑے سے دلچسپی پیدا ہوئی ۔ چنانچہ انہوں نے عربی کا ایک رسالہ 'اسکات المہتدی'

وہابیوں کے رد میں لکھا - ان پر اس تحریک کا اثر اتنا گہرا ہوا اور دیرپا تھا کہ وہ کہتے تھے آدمی عیسائی ہو سکتا ہے غیر مقلد نہیں ہو سکتا اور اس جوش میں انہوں نے امام ابو حنیفہ نعمان بن ثابت کی رعایت سے اپنے نام کے ساتھ نعمانی کی نسبت اختیار کی اور 'سیرۃ النعمان' لکھی - آخر عمر میں بھی کہ آزادی عقل پسندی کے منتہیوں میں شمار ہوتے تھے ، حنفیت کی مدح و ثنا میں وہی جوش و خروش رہا -

شبلی کے دل میں عقل پسندی کا میلان اول اول علی گڑھ کی فضا میں ہوا - جہاں وہ پروفیسر تھے - یہاں انہوں نے محسوس کیا کہ مسلمانوں کے قدیم علوم کو نئے رنگ میں پیش کرنے کی ضرورت ہے - علی الخصوص تاریخ کی تدوین نئے مذاق کے مطابق اور بھی ضروری ہے

اگرچہ شبلی نے سر سید کے خیالات سے متاثر ہونے میں بہت احتیاط کی ، لیکن عقل پسندی طبیعت پر غالب آ کر رہی - اس لیے انہوں نے اپنی تحریروں میں اسلام کو جدید علوم اور جدید تمدن سے مطابقت دینے پر بہت زور دیا ہے اور فلسفۂ حال کے ان مسائل کی تشریح کی ہے جو مذہب سے بظاہر ٹکراتے ہیں -

سر سید اور شبلی کے نظریۂ دینی میں بظاہر فرق یہ ہے کہ سید صاحب قدیم کو ایسے رنگ میں پیش کرتے ہیں کہ اس سے تمدن اور زندگی کے نئے رجحانات کی تائید ہو - اس کے برعکس شبلی جدید رجحانات کی تاویل اس طرح کرتے ہیں کہ اس سے قدیم عقائد کی تائید نکلتی ہے - سر سید کی نظر جدید دورِ حاضر پر مرکوز رہتی ہے - شبلی کی نگاہ قدیم اصول پر جمی ہوئی ہے - شبلی کا اشارہ پیچھے کی طرف ہے - سر سید کا اشارہ آگے کی طرف - شبلی نے سید صاحب کے خیالات سے اختلاف کرتے ہوئے ایک جدید علم الکلام کی بنیاد رکھی - اس موضوع پر بہت سے مضامین کے علاوہ انہوں نے 'علم الکلام' اور 'الکلام' لکھیں - 'علم الکلام' مسلمانوں کے علمِ کلام یا فلسفۂ مذہبی کی تاریخ ہے - 'الکلام' میں شبلی نے مذہب اسلام کے اصولوں کو عقل کے مطابق ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور اپنے دلائل کو مغربی مصنفین کی تحریروں سے مربوط کیا ہے - معجزہ اور خرقِ عادت کے متعلق شبلی کی پوزیشن معتدل ہے اس میں وہ سر سید اور عام مسلمانوں کی رائے کے بین بین ہیں -

سب سے بڑا اور معرکہ آرا مسئلہ جس نے اس دور کے مصنفین اور مفکرین کو عرصہ تک پریشان رکھا وہ یہ تھا کہ اسلام تمدن اور ترقی کا مانع ہے - شبلی کہتے ہیں کہ تمدن کی ترقی کے جتنے اسباب ہیں وہ سب اسلام میں پائے جاتے ہیں - مثلاً

مساوات ، مذہبی بے تعصبی ، آپ اپنی عزت کا خیال ، جمہوریت ، تقسیمِ عمل ، انسانوں کا مختلف المراتب ہونا ، علمی ترقی کی انتہا ، دین و دنیا کا باہمی تعلق ، عملی زندگی کا اثبات اور رہبانیت سے نفرت وغیرہ وغیرہ۔ مختلف قوموں کے باہمی تعلق کے متعلق بھی ان کے خیال میں اسلام نے جو راہِ عمل وضع کی ہے ، وہ اسے ترقی اور تمدن کا بڑا مؤید قرار دیتی ہے ۔ نیز اسلام کا قانونِ وراثت اور اسلام کا عورتوں کے متعلق قانون نہایت مفید اور معقول ہے اور دنیا کے دیگر قوانین اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے ۔

القصہ ، شبلی کی آواز سر سید کی آواز سے گو جدا نہیں تھی ، لیکن ان کا اندازِ نظر عالمانہ اور عام مسلمانوں کے لیے مانوس ہے ۔ شبلی کے مقبول ہونے کے دو سبب ہیں ، ایک تو ان کا دلچسپ اور مختصر طرزِ تحریر ہے ۔ دوسرا ان کا یہ بنیادی اصول کہ قدیم خیالات کا سر رشتہ ہاتھ سے نہ جانے پائے ۔ ان اسباب کے پیشِ نظر سر سید کے مقابلے میں شبلی کی عقل پسندی گوارا کر لی گئی ۔

مولوی چراغ علی (۱۸۴۶ء - ۱۸۹۵ء)

کشمیری الاصل تھے ۔ والد کا نام محمد بخش ، میرٹھ میں آباد ہوئے اور وہیں ملازمت اختیار کی ۔ والد کے انتقال ۱۸۵۶ء کے بعد ان کی عمر دس گیارہ سال کی رہی ہوگی ۔ تعلیم پوری نہ ہو سکی اور جلد ہی ملازمت کے مخمصے میں پڑ گئے ۔ ابتدا معمولی محرری سے کی کچھ عرصہ بعد حیدر آباد میں ملازم ہو گئے ۔ وہاں ترقی کرتے معتمدی مالگزاری تک پہنچ گئے ۔ وہیں صوبہ داری کی عزت سے بھی نیک نام ہوئے ۔ ۱۸۹۵ء میں دار فانی سے رخصت ہو گئے ۔ وہ دور چونکہ مذہبی مناظروں کا تھا ، اس لیے ابتدا میں مولوی چراغ علی کو مناظرہ و تحقیق سے دلچسپی پیدا ہوئی ۔ چنانچہ انہوں نے پادری عماد الدین کی کتاب 'تاریخ محمدی' کا جواب 'تعلیقات' مطبوعہ ۱۸۷۲ء میں دیا ۔ اس کتاب میں دوسرے مذاہب کے مقابلے میں اسلام کی ترجیح کے وجوہ پیش کیے اور 'تاریخ محمدی' کے ماخذ کو ناقابلِ اعتبار قرار دیا ۔ علاوہ ازیں مولوی صاحب نے اسلام پر اعتراض کرنے والوں کی تردید میں رسایل لکھے اور یہ شوق اس درجہ پر تھا کہ انہوں نے مرزا غلام احمد قادیانی کے کہنے پر (ملاحظہ ہوں خطوط درج ذیل) 'براہین احمدیہ' کے لکھنے میں مدد دی ۔

خطوط مرزا غلام احمد صاحب بنام مولوی چراغ علی

نامہ محبت آمود عزّ ورود لایا اگرچہ پہلے سے مجھ کو بہ نیّت الزام خصم اجتماع براہین قطعیہ اثباتِ نبوت و حقیقتِ قرآن شریف میں ایک عرصہ سے سرگرمی تھی مگر جناب

کا ارشاد موجب گرم جوشی و باعث اشتعالِ شعا
موجب ازدیاد تقویت و توسیع حوصلہ خ'
فضیلت دینی و دنیوی تہِ دل سے حامی
اظہار فرمائے تو بلا شائبہ ریب '
نعم الجزا ۔

ماسوائے اس کے اگر اب
جمع فرمائے ہیں تو وہ مرحمت ہوں (سیر...

ایک دوسرے خط میں تحریر کیا ہے :

آپ کے مضمون اثبات نبوت کی اب تک [illegible] پر اب تک نہ عنایت نامہ نہ مضمون پہنچا ۔ اس لیے آج مکرر تکلیف دیتا ہوں کہ [illegible] بہت جلد مضمون اثبات حقانیت فرقانِ مجید تیار کرکے میرے پاس بھیج دیں ایک کتاب جو دس حصے پر مشتمل ہے تصنیف کی ہے ۔ نام اس کا 'براہین احمدیہ حقانیہ کتاب اللہ القرآن و النبوۃ المحمدیہ' رکھا ہے اور صلاح یہ ہے کہ آپ [illegible] جرائد بھی اس میں درج کروں ، اپنے مختصر کلام سے ان کو زیب و زینت بخشیں [illegible] اس امر میں آپ توقف نہ فرمائیں اور جہاں تک جلد ہو سکے مجھ کو مضمون مبارک [illegible] سے ممنون فرمائیں" ۔

اس کے بعد پنجاب میں آریوں کے شور و شغب اور عداوتِ اسلام کا کسی قدر تفصیل سے ذکر کیا ہے اور آخر میں لکھا ہے :

"دوسری گذارش یہ ہے کہ اگرچہ میں نے ایک جگہ سے وید کا انگریزی ترجمہ بھی طلب کیا ہے اور امید ہے کہ عنقریب آ جائے گا اور پنڈت دیا نند وبدلھاس کی کئی جلدیں بھی میرے پاس ہیں اور ان کا 'ستیارتھ پرکاش' بھی موجود ہے ۔ لیکن تاہم آپ کو تکلیف دیتا ہوں کہ آپ کو جو اپنی ذاتی تحقیقات سے اعتراض ہنود پر معلوم ہوئے ہیں یا جو ان پر اعتراض ہوتے ہوں ، ان اعتراضوں کو ضرور ہمراہ دوسرے مضمون اپنے کے بھیج دیں ۔ لیکن یہ خیال رہے کہ کتب مسلمہ آریہ سماج کی صرف 'وید' اور 'منوسمرت' ہے اور دوسری کتابوں کو علماء مستند نہیں سمجھتے ۔ بلکہ پرانوں وغیرہ کو محض جھوٹی کتابیں سمجھتے ہیں ۔ میں اس جستجو میں بھی ہوں کہ علاوہ اثبات نبوت حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ و سلم کے ہنود کے 'وید' اور ان کے دین

بھی سخت سخت اعتراض کیے جائیں۔ کیونکہ اکثر جاہل ایسے بھی ہیں کہ جب تک اپنی کتاب کا ناچیز اور باطل اور خلافِ حق ہونا ان کے ذہن نشین نہ ہو۔ تب تک گو کیسی خوبیاں اور دلائل حقانیت قرآن مجید کے ان پر ثابت کیے جائیں، اپنے دین کی طرفداری سے باز نہیں آتے اور یہی دل میں کہتے ہیں کہ ہم اس میں گذارہ کر لیں گے۔ سو میرا ارادہ ہے کہ اس تحقیقات اور آپ کے مضمون کو بطور حاشیہ کے کتاب کے اندر درج کروں (سیر المصنفین)"۔

ایک خط مؤرخہ ۱۸ فروری ۱۸۷۹ء میں تحریر کیا ہے :

"فرقانِ مجید کے الہامی اور کلامِ الٰہی ہونے کے ثبوت میں آپ کا مدد کرنا باعثِ ممنونی ہے نہ موجب ناگواری۔ میں نے بھی اسی بارہ میں ایک چھوٹا سا رسالہ تالیف کرنا شروع کیا ہے اور خدا کے فضل سے امید کرتا ہوں کہ عنقریب چھپ کر شائع ہو جائے۔ آپ کی اگر مرضی ہو تو وجوہاتِ صداقتِ قرآن جو آپ کے دل پر القا ہوں میرے پاس بھیج دیں تاکہ اس رسالہ میں حسبِ موقع اندراج پا جائے یا 'سفیر ہند' میں، لیکن جو براہین (جیسے معجزات وغیرہ) زمانۂ گذشتہ سے تعلق رکھتے ہوں ان کا تحریر کرنا ضروری نہیں کہ منقولاتِ مخالف پر حجت تو یہ نہیں آ سکتیں۔ جو نفس الامر میں خوبی اور عمدگی کتاب اللہ میں پائی جائے یا عندالعقل اس کی ضرورت ہو وہ دکھلانی چاہیے۔ بہر صورت میں اس دن بہت خوش ہوں گا کہ جب میری نظر آپ کے مضمون پر پڑے گی۔ آپ بمقتضا اس کے کہ الکریم 'اذا وعد وفا' مضمون تحریر فرما دیں لیکن یہ کوشش کریں کیف ما اتفق مجھ کو اس سے اطلاع ہو جائے اور آخر میں دعا کرتا ہوں کہ خدا ہم کو اور آپ کو جلد تر توفیق بخشے کہ منکر کتابِ الٰہی کو دنداں شکن جواب سے ملزم اور نادم کریں و لا حول ولا قوۃ الا باللہ"۔

اس کے بعد ایک دوسرے خط مورخہ ۱۰ مئی ۱۸۷۹ء میں تحریر کیا ہے :

"کتاب 'براہین احمدیہ' ڈیڑھ سو جز ہے۔ جس کی لاگت تخمیناً نو سو چالیس روپیہ ہے اور آپ کی تحریرِ محققانہ ملحق ہو کر اور بھی زیادہ ضخامت ہو جائے گی"۔

کا ارشاد موجب گرم جوشی و باعث اشتعالِ شعلۂ حمیت اسلام علی صاحبہ السلام ہوا اور موجب ازدیاد تقویت و توسیع حوصلہ خیال کیا گیا کہ جب آپ سا اولوالعزم صاحب فضیلت دینی و دنیوی تہ دل سے حامی ہو اور تائید دینِ حق میں دل گرمی کا اظہار فرمائے تو بلا شائبہ ریب اس کو تائیدِ غیبی خیال کرنا چاہیے - جزاکم اللہ نعم الجزا -

ماسوائے اس کے اگر اب تک کچھ دلائل یا مضامین آپ نے نتائجِ طبعِ عالی سے جمع فرمائے ہیں تو وہ مرحمت ہوں (سیرالمصنفین جلد دوم) -

ایک دوسرے خط میں تحریر کیا ہے :

آپ کے مضمون اثباتِ نبوّت کی اب تک میں نے انتظار کی، پر اب تک نہ کوئی عنایت نامہ نہ مضمون پہنچا - اس لیے آج مکرّر تکلیف دیتا ہوں کہ براہِ عنایتِ بزرگانہ بہت جلد مضمون اثباتِ حقانیت فرقانِ مجید تیار کرکے میرے پاس بھیج دیں اور میں نے ایک کتاب جو دس حصے پر مشتمل ہے تصنیف کی ہے - نام اس کا 'براہینِ احمدیہ علی حقانیہ کتاب اللہ القرآن و النبوۃ المحمدیہ' رکھا ہے اور صلاح یہ ہے کہ آپ کے فوائد جرائد بھی اس میں درج کروں، اپنے مختصر کلام سے ان کو زیب و زینت بخشوں - سو اس امر میں آپ توقّف نہ فرمائیں اور جہاں تک جلد ہو سکے مجھ کو مضمون مبارک اپنے سے ممنون فرمائیں" -

اس کے بعد پنجاب میں آریوں کے شور و شغب اور عداوتِ اسلام کا کسی قدر تفصیل سے ذکر کیا ہے اور آخر میں لکھا ہے :

"دوسری گذارش یہ ہے کہ اگرچہ میں نے ایک جگہ سے وید کا انگریزی ترجمہ بھی طلب کیا ہے اور امید ہے کہ عنقریب آ جائے گا اور پنڈت دیا نند ویدلہاش کی کئی جلدیں بھی میرے پاس ہیں اور ان کا 'ستیارتھ پرکاش' بھی موجود ہے - لیکن تاہم آپ کو تکلیف دیتا ہوں کہ آپ کو جو اپنی ذاتی تحقیقات سے اعتراض ہنود پر معلوم ہوئے ہیں یا جو ان پر اعتراض ہوتے ہوں، ان اعتراضوں کو ضرور ہمراہ دوسرے مضمون اپنے کے بھیج دیں - لیکن یہ خیال رہے کہ کتب مسلمہ آریہ سماج کی صرف 'وید' اور 'منوسمرت' ہے اور دوسری کتابوں کو علماء مستند نہیں سمجھتے - بلکہ پرانوں وغیرہ کو محض جھوٹی کتابیں سمجھتے ہیں - میں اس جستجو میں بھی ہوں کہ علاوہ اثبات نبوت حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ و سلم کے ہنود کے 'وید' اور ان کے دین

ہو بھی سخت سخت اعتراض کیے جائیں۔ کیونکہ اکثر جاہل ایسے بھی ہیں کہ جب تک اپنی کتاب کا ناچیز اور باطل اور خلافِ حق ہونا ان کے ذہن نشین نہ ہو۔ تب تک گو کیسی خوبیاں اور دلائل حقانیت قرآن مجید کے ان پر ثابت کیے جائیں ، اپنے دین کی طرفداری سے باز نہیں آتے اور یہی دل میں کہتے ہیں کہ ہم اس میں گذارہ کر لیں گے۔ سو میرا ارادہ ہے کہ اس تحقیقات اور آپ کے مضمون کو بطور حاشیہ کے کتاب کے اندر درج کروں (سیر المصنفین)"۔

ایک خط مؤرخہ ۸ فروری ۱۸۷۹ء میں تحریر کیا ہے :

"فرقانِ مجید کے الہامی اور کلامِ الٰہی ہونے کے ثبوت میں آپ کا مدد کرنا باعث ممنونی ہے نہ موجب ناگواری۔ میں نے بھی اسی بارہ میں ایک چھوٹا سا رسالہ تالیف کرنا شروع کیا ہے اور خدا کے فضل سے یقین کرتا ہوں کہ عنقریب چھپ کر شائع ہو جائے گا۔ آپ کی اگر مرضی ہو تو وجوہاتِ صداقتِ قرآن جو آپ کے دل پر القا ہوں میرے پاس بھیج دیں ، تا کہ اس رسالہ میں حسبِ موقع اندراج پا جائے یا 'سفر بند' میں ، لیکن جو براہین (جیسے معجزات وغیرہ) زمانۂ گذشتہ سے تعلق رکھتے ہوں ان کا تحریر کرنا ضروری نہیں کہ منقولاتِ مخالف پر حجت تو یہ نہیں آ سکتیں۔ جو نفس الامر میں خوبی اور عمدگی کتاب اللہ میں پائی جائے یا عندالعقل اس کی ضرورت ہو وہ دکھلانی چاہیے۔ بہر صورت میں اس دن بہت خوش ہوں گا کہ جب میری نظر آپ کے مضمون پر پڑے گی۔ آپ بمقتضا اس کے کہ الکریم 'اذا و عد وفا' مضمون تحریر فرما دیں لیکن یہ کوشش کریں کیف ما اتفق مجھ کو اس سے اطلاع ہو جائے اور آخر میں دعا کرتا ہوں کہ خدا ہم کو اور آپ کو جلد تر توفیق بخشے کہ منکر کتاب الٰہی کو دنداں شکن جواب سے ملزم اور نادم کریں و لا حول ولا قوۃ الا باللہ"۔

اس کے بعد ایک دوسرے خط مورخہ ۱۰ مئی ۱۸۷۹ء میں تحریر کیا ہے :

"کتاب 'براہین احمدیہ' ڈیڑھ سو جز ہے۔ جس کی لاگت تخمیناً نو سو چالیس روپیہ ہے اور آپ کی تحریرِ محققانہ ملحق ہو کر اور بھی زیادہ ضخامت ہو جائے گی"۔

مولوی چراغ علی صاحب نے زیادہ تر کتابیں انگریزی میں تحریر کی ہیں ۔ ان کی اردو میں کتابیں 'تعلیقات' اور 'اسلام کی دنیوی برکتیں' بھی ہیں ۔ دوسری کتاب کا نام مضمون پر ہی حاوی ہے ۔ نہایت دلچسپ کتاب ہے ۔ بہت پسند کی گئی ۔ بار بار شائع ہوئی ۔

'اعظم الکلام فی ارتقاء الاسلام' جو انگریزی میں لکھی ، اس کے پہلے چودہ صفحات کا ترجمہ انہوں نے خود اردو میں کیا ۔ تمام کتاب کو اردو میں منتقل کرنے والے مولانا عبدالحق ہیں ۔ اس میں ریورنڈ مالیکل صاحب کے اس اعتراض کا جواب دیا ہے کہ مذہب اسلام ترقی کا مانع ہے ۔ انہوں نے ثابت کیا ہے کہ اسلام ہر زمانے کی معاشرت کے مطابق تبدیل ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے ۔ مولوی صاحب کا خیال ہے کہ حدیث کی عقیدتاً ضرورت نہیں ۔ اسلامی سول لاء کے بعض حصے از سرِ نو لکھے جانے چاہیئیں ۔ مذہب اور سیاست الگ الگ چیزیں نہیں ۔ اسلام میں رائے کی آزادی ہے ۔ غلامی ، جنگ و جدل اور جہاد کا اسلام میں کوئی ذکر نہیں ۔ اسلام نے عورت کی حیثیت کو بہت بلند کر دیا ہے ۔ وغیرہ وغیرہ ۔

'قدیم قوموں کی تاریخ' قرآن مجید میں جن اقوام قدیمہ کا ذکر ہے ۔ ان کا حال قدیم تاریخوں سے تلاش کیا ہے اور عیسائیوں کے اس اعتراض کو اٹھایا ہے کہ قرآن کی مذکورہ اقوام کا کوئی وجود کبھی نہ تھا ۔ 'العلوم الجدیدہ و الاسلام' لکھ رہے تھے اور ابھی اس کی صرف تمہید رسالہ تہذیب الاخلاق میں چھپی تھی کہ انتقال ہو گیا ۔

مولوی چراغ علی اپنے ہم عصروں میں سے زیادہ محقق وسیع النظر تھے ۔ لفاظی ، عبارت آرائی نہیں جانتے تھے ، فصاحت و بلاغت سے سروکار نہیں تھا ۔ واقعات کی تنقید و تنقیح ، صحیح نتائج کے استخراج میں کمال حاصل ہے ۔ بحث سے الگ نہیں ہوتے ، کوئی غیر متعلق بات نہیں کہتے ۔ الزامی جواب نہیں دیتے ، امر زیرِ بحث مدِ نظر رہتا ہے ۔ اس کے مالہٗ و ما علیہ پر وسیع نظر کرتے ہیں اور حتی الامکان قرآن مجید سے استدلال کرتے ہیں اور نہایت صحیح اور عجیب نتائج استنباط کرتے ہیں اور اس ضمن میں بڑے بڑے مستند لوگوں کی رایوں کو پیش کرتے ہیں یا ان کی غلطیوں پر نظر ڈالتے جاتے ہیں ۔ جس بات کو لیتے ہیں اس پر جامعیت سے بحث کرتے ہیں البتہ ان کی مذہبی تصانیف میں تحریر روکھی ، جوش گرمی نہیں جو مذہبی بحث مباحثہ میں ہونی چاہیے ۔ تا کہ انسان کے جذباتِ لطیف بھڑک اٹھیں ، قلب پھڑک جائے ، مولوی صاحب کی تحریر سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک سرد مہر منطقی ایک ایسے مبحث پر جس سے اسے دلچسپی ہے بحث کر رہا ہے اور واقعات و دلائل و براہین پیش کر کے بال کی کھال نکال رہا ہے ۔ اور بس معلوم ہوتا ہے کہ مولوی صاحب کا مقصد مذہب کے

صرف اس حصے سے تھا جو امورِ دنیا سے متعلق ہے ۔ وہ یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ اسلام دنیاوی ترقی میں حارج نہیں ۔

مولوی نذیر احمد (م - ۱۹۱۲ء)

مولوی نذیر احمد نے اگرچہ براہِ راست مناظرانہ رنگ کی کتابیں تصنیف نہیں کیں ، لیکن بالواسطہ ان کی تمام مذہبی کتابیں وہ مقصد پورا کرتی ہیں جو خاص مناظرہ کے پیشِ نظر لکھی ہوئی کتابوں کا ہوتا ہے ۔

مولانا نذیر احمد ابتدائے کار ہی سے مذہب کے معاملے میں تحقیق پسند تھے ۔ جب دہلی کالج میں داخل ہوئے تو ان ایام میں حنفیوں ، وہابیوں کا اختلاف عروج پر تھا ۔ اول اول ڈپٹی نذیر احمد اسلامی فرقوں میں باہمی کش مکش کے پیش نظر کسی خاص جماعت سے ہمدردی یا تعصب نہیں رکھتے تھے بلکہ جیسا موقعہ مصلحت ہوتی ویسے ڈھل جاتے ۔ ہوتے ہوتے ان کے خیالات پختہ اور رائے صائب ہو گئی ۔ انہوں نے بہت سے مسائل میں اپنی سوچی سمجھی رائے قائم کی اور اس پر سختی سے جم گئے ۔ اکثر لوگ انہیں بھی نیچری کہتے ہیں اور اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ بہت سے عقائد میں وہ سر سید کے ہم خیال تھے ۔ وہ سر سید کے رنگ میں رائے اور عقل کی اہمیت پر بہت زور دیتے تھے ۔ تقدیر ، توکل ، خیر و شر کے متعلق ان کی وہی رائے تھی جو سر سید کی تھی ۔ لیکن اس میں وہ انتہا پسند نہیں تھے ۔ بلکہ اعتدال کے قائل تھے ۔ انہوں نے موقع موقع سے سر سید کے خیالات و مسلمات سے اختلاف کیا ہے ۔ ان کی طبیعت میں اجتہاد ، آزادیٔ رائے اور جرأت موجود نہیں ۔ انہوں نے اعتدال اور متانت سے سر سید کے اثر کو کم کیا ہے ، کھل کر ان کے خلاف بغاوت نہیں کی ۔

نذیر احمد نے مسلمانوں میں توکل کے مفہوم کے رواج ، مسئلۂ تقدیر کی یاس انگیز تفسیر کے خلاف دھواں دھار دلائل دیے ہیں ۔ ترکِ دنیا ان کے نزدیک غیر اسلامی فعل ہے ۔ انہوں نے اس دور کے اکثر مصنفوں کی روش کے مطابق یہ بات بزور کہی ہے کہ اسلام ترقی کے منافی نہیں ۔ مذہب فطرت کے عین مطابق ہے ۔ سائنس اور دین آپس میں متعارض نہیں ، از روئے اسلام مسلمانوں کا اور مسلمان حکومتوں کا غیر مسلموں سے برابر کا سلوک ہونا چاہیے ۔ ذمیوں کا مسئلہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد سرسید کے اکثر ہم خیالوں کے لیے ایک اہم موضوعِ بحث تھا ۔ مولوی نذیر احمد نے اس پر کھل کر بحث کی ہے ۔ جہاد پر البتہ نذیر احمد نے خاموشی اختیار کی ہے اور اپنی شہرۂ آفاق کتاب 'الحقوق والفرائض' میں جہاد کا باب تک قائم نہیں کیا ۔ ان کے خیال میں جن حالات میں جہاد کرنا فرض ہوتا ہے وہ انگریزی عملداری میں ناپید ہیں ۔

نذیر احمد کی قابلِ قدر تصنیفات میں ترجمہ 'قرآن مجید' اور فقہی کتاب 'الحقوق و الفرائض' ہے ترجمہ با محاورہ اردو میں ہے ۔ البتہ اس میں استعمال شدہ بعض محاوروں پر اعتراض اٹھائے گئے ہیں ۔ 'الحقوق و الفرائض' تین جلدوں میں ہے اور جدید اصول پر فقہی تصنیف ہے ۔ اس میں عقائد ، عبادات ، معاملات اور معاشرت کے متعلق خاص اسلامی نقطۂ خیال سے بحث کی گئی ہے ۔ اس کتاب کا طرزِ استدلال قدیم ہے ۔ مغربی حکمت و فلسفہ سے استفادہ بہت کم نظر پڑتا ہے ۔ 'الا جتہاد' میں عقائدِ اسلامی کا عقلی ثبوت ہے ۔ 'امہات الامت' میں ازواجِ مطہرات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات عیسائی معترضین جواب میں درج کیے ہیں ۔

نذیر احمد دینی کتابوں کے دلچسپ بنانے کے فن سے آگاہ نہیں ۔ البتہ اپنے قصوں میں دینی ، نیم دینی خیالات کو بہت کچھ دلکش انداز میں ظاہر کیا ہے ۔ ان کے قصوں سے مسائلِ دینی اور عقائدِ مذہبی کی اچھی خاصی تبلیغ ہوتی ہے ۔ مثلاً 'توبۃ النصوح' میں اسلامی زندگی کی تعلیم دی گئی ہے ۔ 'ابن الوقت' میں انگریزی اور ہندوستانی معاشرت کا مقابلہ کیا گیا ہے ۔ 'ایامیٰ' میں بیوہ عورتوں کے نکاح کی ضرورت و فوائد بیان کیے ہیں ۔

مولوی محمد علی بچھرانی (۱۸۱۷ء - ۱۸۸۷ء)

بچھراؤں ضلع مراد آباد وطن تھا ۔ ۱۸۱۷ء کو پیدا ہوئے ۔ ملازمت کی ابتدا ۱۸۲۳ء میں سررشتہ داری صدرالصدور سے ہوئی ۔ ۱۸۷۶ء میں پنشن پائی ۔ ۱۸۸۷ء میں واصلِ حق ہوئے ۔ مفسر ، محدث ، فقیہہ زمانہ (۳۰۵ھ)

سرسید کے مخالفوں میں ان کا نام سرِ فہرست ہے ۔ انہوں نے سرسید کے ایک ایک فقرہ اور ان کی ایک ایک بات کا جواب لکھنا شروع کیا اور قریب قریب ڈیڑھ ہزار صفحوں کی کئی جلدیں تصنیف کیں ۔ یہ 'مجلدات البرہان' کے نام سے مشہور ہیں ۔ پورا نام 'البرہان علی تجہیل من قال بغیر علم فی القرآن' ہے ۔ مولوی محمد علی نے اپنی تصنیف 'برہان' میں سرسید کی ہر قسم کی غلطیاں قرآن فہمی و عربی دانی کے متعلق صرف و نحو ، علم کلام ، اصول تفسیر کے حوالوں کے ساتھ بیان کی ہیں ۔ زبان میں قدامت کا اثر ایسا ہی ہے جیسا سر سید کی تحریر میں ، سر سید کو ہر جگہ سید الطائفہ یا سید الطائفہ النیچریہ لکھا ہے ۔ اول لفظ 'قال' لکھ کر سرسید کی تفسیر کا حصہ نقل کیا ہے ۔ پھر 'قلت' لکھ کر اپنا جواب لکھا ہے ۔

مولوی محمد علی بڑے عالم اور با خبر بزرگ تھے ۔ اس زمانے میں ایک طرف عیسائی اسلام پر حملے کر رہے تھے ۔ دوسری طرف سرسید اور مولوی چراغ نے عیسائیوں کی تردید اور اسلام کی تائید میں اسلام کے بعض مسلم قوانین و اصول کی توجیہہ اور ان پر رائے زنی شروع کر دی ۔ آزادی کے ایسے معرکہ میں حدیث شریف 'اختلاف امتی رحمة' کے مطابق کبھی ایک فریق حق پر ہوتا ہے ، کبھی دوسرا ۔ بہر حال مولوی محمد علی صاحب نے عیسائیوں اور بقول خود نیچریوں ، دونوں کے جواب لکھے ۔ ۱۸۷۳ء میں کانپور سے ایک رسالہ 'نورالآفاق' اسی مناظرے اور مباقشے کے لیے جاری ہوا تھا ۔ اس میں مولوی صاحب نے مضامین لکھے ۔ 'رد الشقاق فی جواز الاسترقاق' سرسید کے 'رسالہ ابطال غلامی' کا جواب ہے ۔ اس میں اسلام میں لونڈی ، غلام بنانے کے رواج کو جائز ثابت کیا ہے ۔ مطبوعہ ۱۸۷۳ء ۔ 'ظفر مبین' مسٹر اینڈرسن کے اعتراضات کا جواب ہے ۔ 'سوط اللہ الجبار' یہ بھی اینڈرسن کا جواب ہے ۔

مولوی الفت حسین صاحب

آپ بہت کامیاب مناظر تھے ، آپ نے ایک کتاب 'جواب بالصواب' تصنیف کی ہے ۔ اس میں عیسائیوں کے ان اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے جو وہ اسلام پر کرتے تھے ۔

مولوی ولی اللہ صاحب

بہت بڑے مناظر تھے ۔ خود فرماتے ہیں کہ اس احقر نے بعد فراغِ تحصیلِ علومِ ضروری کے فرقِ مخالفین سے سلسلۂ گفتگو کا شروع رکھا ۔ باین لحاظ کہ 'رسانیدن امرِ حق طاعتست' خصوصاً عیسائیوں سے کہ وہ ان دنوں میں جس مسجد میں کسی عالم کا نام سن پاتے اس کے دروازے پر جا کر مدعیٔ بحث ہوتے اور علمائے اہلِ اسلام بباعث ناواقفی مزاج حکام وقت نہ موجود ہوتے ، کتب مخالفین کے گفتگو کو غیر مناسب سمجھتے تھے ۔ الحمدللہ آج وہ حالت ہے کہ کوئی فرقہ مذکور سے بحث زبان پر نہیں لاتا ۔ اس فدوی نے عرصہ پندرہ سال میں صدہا پادریوں سے مختلف شہروں میں مناظرہ کیا اور تصانیف میں ان کے مطالعہ کیے ۔ 'ابحاث ضروری' چالیس صفحات پر مشتمل ایک رسالہ ہے جو عیسائیوں کے رسالہ 'شکوک کفارہ' مطبوعہ ۱۸۷۳ء منجانب پادری صاحبان مطبع مشن لدھیانہ کا جواب ہے اور ۱۸۷۸ء میں شائع ہوا ۔ اس میں قریب قریب عیسائیوں کے تمام ضروری مبحث آگئے ہیں ۔ 'صیانت الاسلام' آپ نے عمادالدین کی تصنیف 'تحقیق الایمان' کے جواب میں رقم فرمائی ۔

مولانا موضوع زیرِ بحث کا بخوبی استقصاء کرتے ہیں اور دلائل سے جواب رقم فرماتے ہیں کہ مخلف فریق خاموش ہو کر رہ جاتا ہے۔

مولانا محمد رحمت اللہ صاحب عثمانی کیرانوی

حضرت مخدوم جلال الدین کبیرالاولیا پانی پتی قدس اللہ سرہ العزیز کی اولاد سے تھے اور اس عہد میں خاندان ولی اللہ ہی کے سلسلے میں منسلک ہو کر دہلی میں تعلیمی اور تبلیغی خدمت انجام دے رہے تھے۔ پادری فنڈر کی جو شامت آئی تو وہ دہلی میں پادریوں کی جماعت کے ساتھ جن میں والپن فرنچ بھی جو لاہور کا پہلا بشپ مقرر ہوا شامل تھا، پہنچ گیا اور زور شور سے تبلیغ کرنے لگا۔ مولانا رحمت اللہ نے اسکو مناظرہ کا چیلنج دیا۔ اس مناظرے میں معزز ہندو مسلمان اور انگریز حاکم اور پنچ قرار دیے گئے۔ یہ مناظرہ آگرہ میں قرار پایا۔ مولانا رحمت اللہ نے غیبی امداد اور تائید الٰہی کے ساتھ اپنی خداداد قابلیت، تبحر علمی سے تین روز کے متواتر جلسوں میں اس امر کو ثابت کر دیا کہ موجودہ انجیل جس پر آج عیسائیوں کو ناز ہے تحریف شدہ ہے۔ فاضل مسیحی جلسہ چھوڑ کر بھاگ گیا اور فیصلہ مسلمانوں کے حق میں رہا۔

اس مناظرہ کی پوری کیفیت چھپ کر گھر گھر پہنچ گئی تھی۔ مولانا نے اس مناظرہ کے بعد اس فتنہ کے بالکلیہ استیصال اور روک تھام کی غرض سے جو کتابیں رد نصاریٰ میں تصنیف و تالیف فرمائیں وہ حسبِ ذیل ہیں:

اظہارِ حق

اس میں پادری فنڈر سے اکبر آباد آگرہ میں مناظرہ کی تفصیلی کیفیت اور تمام مسائل کا نہایت بسط و تشریح کے ساتھ بیان ہے۔ اس کا ترجمہ مولوی سلیم اللہ نے اردو میں کیا تھا۔ ۱۸۹۱ء میں ٹائمز آف لندن نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ "لوگ اگر اس کتاب کو پڑھتے رہیں گے تو دنیا میں مذہبِ عیسوی کی ترقی بند ہو جائے گی۔ اس کتاب نے مولانا کو بین الاقوامی مناظر بنا دیا۔

اعجازِ عیسوی

پونے چار سو سے زیادہ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ اس کتاب میں مولانا نے کامل طور پر بائبل کا غیر معتبر اور منحرف ہونا ثابت کیا ہے۔ پہلی بار آگرہ میں، دوسری بار مطبعِ رضوی دہلی میں ۱۲۹۳ھ میں طبع ہوئی۔ کتاب کا خاتمہ مناجات کے ان الفاظ سے

کیا ہے - ''اے رب العالمین تو جو ساری چیزوں پر قادر ہے اور بنی آدم کے دلوں کو شیطان کے وسواس سے چھڑانے کی طاقت رکھتا ہے ، اپنے فضل و کرم سے عیسائیوں کو جو سچے دل سے اپنی نجات کے خواہاں ہیں راہِ راست پر لا اور ان کو جو تعصب کی راہ میں دینِ محمدی کے دشمن ہو رہے ہیں تعصب سے چھڑا اور ان کو توفیق عنایت فرما کہ سچے دل سے تیری راہ تلاش کریں اور تیرے نبی آخرالزماں پر ایمان لا کر نجاتِ ابدی اور حیاتِ سرمدی پاویں - اے خدا وند تعالیٰ ان کو توفیق دے کہ اس کتاب کو بے تعصب اور بلا طرفداری دیکھیں اور ضلالت اور گمراہی کے ورطہ سے نکل کر ساحلِ نجات پر پہنچیں اور اس کتاب کو اپنے فضل و کرم سے قبول فرما اور اس میں جو کچھ سہو و نسیان ہوا ہو تو معاف کر اور ہمارا اور سب بھائی مسلمانوں کا خاتمہ بخیر کر اور قیامت کے دن سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت نصیب کر آمین یا رب العالمین'' -

ان کے علاوہ ان کی اور تصانیف 'ازالۃ الاوہام' (۱۲۶۹ھ ۵۶۴ صفحات بڑی تقطیع) - 'ازالۃ الشکوک' (۱۲۶۹ھ دو جلدوں میں ہے) 'اصح الاحادیث فی ابطال التثلیث (دلائل عقلیہ اور نقلیہ سے تثلیث کو باطل ثابت کیا ہے) - 'بروق لامعہ' (اس میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور آپ پر ختمِ نبوت کا مدلل اثبات) - 'البحث الشریف فی اثبات النسخ و التحریک' (۱۲۷۰ھ میں لکھی گئی تحریف انجیل پر محققانہ بحث ہے) - 'معدل اعوجاج المیزان' (یہ کتاب 'میزان الحق' مؤلفہ پادری فنڈر کا جواب ہے اور اب نایاب ہے) - 'تقلیب المطاعن' (یہ کتاب 'دینِ حق' پادری لاسمند کا رد اور جواب ہے) - 'معیار التحقیق' ، ('کتاب تحقیق الایمان' کا دندان شکن جواب ہے) وغیرہ وغیرہ ہیں -

مولوی رکن الدین

بڑے زبردست مناظر تھے - انہوں نے 'بطلان اصولِ مذہب عیسوی' تحریر کی - اس میں خود عیسائیوں کی تصنیفات سے عیسائی مذہب کی تردید کی ہے اور حق یہ ہے کہ بہت محنت اور عرق ریزی سے اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا ہے - اس کی تصنیف میں مصنف نے جو خونِ جگر کھایا ہے اور عیسائیوں کی کتابوں کو دیکھا بھالا کھنگالا ہے وہ قابلِ داد ہے -

مولوی فیروز دین

انہوں نے عیسائیوں کے خلاف مناظرہ میں بڑا نام پیدا کیا - آپ بہت بڑے عالم اور فنِ مناظر میں جواب نہیں رکھتے تھے - آپ نے ۱۸۹۳ء/۱۳۱۱ھ میں ایک کتاب 'الوہیتِ مسیح

اور تثلیث کا ردّ تحریر کی ۔ یہ کل ۱۷۶ صفحات پر مشتمل ہے لیکن جامعیت میں بڑی بڑی کتابوں پر بھاری ہے ۔ نمونۂ زبان ملاحظہ ہو :

> ایک نہایت مشہور انگریز مسٹر جان ڈیونپورٹ صاحب اپنی کتاب 'اپالو جی فار محامٹ اینڈ قرآن' میں کہتے ہیں کہ نیوٹن صاحب افضل الحکماء انگلستان نادر گبن صاحب اور علماء مؤرخین نصاریٰ نے بڑی کوشش سے ثابت کیا ہے کہ جن آیات انجیل سے مسئلۂ توحید مستنبط کیا گیا ہے وہ آیات اختراعی ہیں" ۔

مولوی علی بخش (سبارڈینیٹ جج گورکھپوری)

سر سید کے شدید مخالفوں میں ہیں ۔ انہوں نے 'تائیدِ اسلام' سر سید کے خلاف لکھی ۔ (تائیدِ اسلام کا جواب سر سید نے دافع البہتان میں دیا) ۔ اس میں بے شمار عقائد سر سید کی طرف ایسے منسوب کیے ہیں جو بالکل خلافِ واقعہ ہیں ۔ مثلاً یہ کہ مادہ مثل ذاتِ باری تعالیٰ ازلی ہے ۔ یا ذاتِ باری تعالیٰ خود مادی ہے ، یا باوجود قدرت کے قانون کے بعثت انبیاء کی ضرورت نہیں ، یا یہ کہ جب علومِ جدیدہ انگریزی پڑھنے سے معلوم ہو کہ مذہبِ اسلام میں ضعف پیدا ہوگا تو مذہبِ اسلام کا ترک کر دینا لازم ہے ، یا یہ کہ نبوتِ انبیائے سابقین یا کتبِ ساویہ کے انکار سے یا معاذ اللہ قرآن شریف کے عمداً بول و براز میں آلودہ کرنے یا اس کے پھینک دینے سے یا حلال کو حرام ٹھہرانے اور حرام کو حلال قرار دینے یا معاذ اللہ کسی نبی کو گالی دینے سے یا بہشت دوزخ اور قیامت کے انکار سے یا ضرورتِ دین کے انکار سے آدمی کافر نہیں ہوتا ، یا یہ کہ گرمی کے موسم میں رمضان کے تیس روزے فرض نہیں ہو سکتے یا تھوڑی سے شراب جو پکا متوالا نہ کر دے یا اتنا جؤا کھیلنا جو بے قید نہ بنا دے حرام نہیں ہو سکتا ۔

مولانا قاسم نانوتوی

۱۲۴۸ھ میں بمقام نانوتہ پیدا ہوئے ۔ گیارہ برس کے تھے کہ اپنے ایک ہم وطن بزرگ کے ساتھ دہلی چلے گئے ۔ وہیں تعلیم و تربیت حاصل کی ۔ آپ کی عوام میں شہرت زیادہ تر مباحثوں ، مناظروں کی وجہ سے ہوئی ۔ ان دنوں پادری جا بجا اسلام کے خلاف تقریریں کر رہے تھے ۔ اہلِ علم میں سے کوئی جس کا کام یہ تھا اس طرف متوجہ نہ ہوتا تھا ۔ فقط ایک منصور علی صاحب دہلوی تھے جنھوں نے عیسائیوں کے ساتھ مناظرے میں امتیاز حاصل کیا تھا ۔ انجیل انہیں زبانی یاد تھی ۔ طرزِ مناظرہ بھی جداگانہ تھا اور کئی شاگرد انہوں

نے پادریوں کے خلاف وعظ کے لیے تیار کیے تھے - اتفاق سے ١٨٧٦ء/١٢٩٣ھ میں ضلع شاہجہانپور کے ایک تعلقہ دار نے ہندوؤں ، عیسائیوں اور مسلمانوں کے ایک مباحثے کا انتظام کیا - 'میلہ خدا شناسی' اس کا نام رکھا - مولانا محمد قاسم بھی مولوی منصور علی کو لے کر اس میں شریک ہوئے اور 'ابطال تثلیث و شرک' اور 'اثبات توحید' میں گفتگو کی - اگلے سال پھر مباحثہ ہوا - ہندوؤں کی طرف سے آریہ سماج کے بانی سوامی دیانند سرسوتی شریک جلسہ تھے - مسلمانوں میں واعظ مولوی محمد علی بھی تھے جو مذہب ہنود کے مقابلہ کے لیے زیادہ مشہور ہیں - ان کے بعد مولوی صاحب نے مسئلہ توحید پر زبردست تقریر کی - ایک لیکچر رڑکی میں دیا تھا جو 'قبلہ نما' کے نام سے چھپا - یہ یہ سوامی دیانند کے اعتراضات کا جواب ہے - یعنی وہ کہتا تھا کہ مسلمان ہندوؤں کو بت پرست کہتے ہیں اور خود ایک مکان کو سجدہ کرتے ہیں اور یوں مسلمان بھی صنم پرست ہیں - مولانا نے اپنے ١٠٣ صفحے کے رسالے میں عقلی نقلی دلائل سے اس بات کا مسکت جواب دیا ہے - زبان اس رسالہ کی مولویانہ ہے - نمونہ تحریر :

> "ہم کعبہ کو اپنا معبود نہیں سمجھتے ، تجلی گاہ معبود سمجھتے ہیں اور چونکہ تجلی یعنی عکس یا تصویر عین ذی عکس اور عین ذی عکس تصویر ہوتے ہیں - اس تجلی کی طرف سجدہ عین خدا ہی کا سجدہ ہوگا" -

مولانا پچاس سال کی عمر میں ٤ جمادی الاول ١٢٩٧ھ/١٨٨٠ء کو بمقام دیوبند وفات پا گئے - 'تقریر دلپذیر و حجت الاسلام' بھی ان کی گراں قدر تصانیف ہیں -

ابو المنصور ، سید

آپ امام فن مناظرہ کہلاتے ہیں - ایک کتاب 'نوید جاوید' آپ نے عیسائیوں کے ابطال میں تصنیف فرمائی ہے - یہ ایک ضخیم کتاب کوئی ٦٣٦ صفحات پر محیط ہے - اس کتاب کے بارے میں فرماتے ہیں کہ میں نے یہ کتاب اس لیے نہیں لکھی کہ اس سے مسلمانوں اور عیسائیوں میں سلسلہ حجت و بحث دراز ہو ، لیکن اس لیے کہ جو کچھ اس کتاب میں سچ پایا جائے وہ پڑھنے والوں کے فائدہ کا باعث بنے - اس زمانے میں مذہبی کتابیں شاید اسی لب و لہجہ میں رقم ہوتی تھیں -

تحفۃ الہند

'تحفۃ الہند' کا مصنف ایک نو مسلم 'محمد عبداللہ' ہے - یہ کتاب ١٨٥١ء/١٢٦٨ھ میں لودھیانہ سے شائع ہوئی - یہ ہندو دھرم کے رد میں ہے اور کل ١٣٣ صفحات پر محیط

ہے ۔ اس میں چار باب ہیں ۔ نمونۂ زبان ملاحظہ ہو :

> ”بندہ محمد عبداللہ بیٹا منشی کوٹی مل متوطن قصبہ پاٹل کا یہ فقیر لڑکپن میں اپنے باپ کی جیتی ہی گرفتاری دین بت پرستی کا تھا ۔ اتنے میں رحمت الہی نے ہاتھ پکڑ کر کھینچا ۔ یعنی دین اسلام کی خوبیاں اور ہندوؤں کے دین کی قباحتیں میرے دل پر کھل گئیں اور جان و دل سے دین اسلام کو اختیار کیا اور اپنے آپ کو رسول مقبول صلی اللہ علیہ و سلم کے فرمانبرداروں میں گن لیا“۔

مولوی ابو رحمت حسین صاحب

آپ ہندوؤں سے مناظرہ کرنے میں مشہور ہیں ۔ آپ کو ہندوؤں کی مذہبی کتابوں یعنی ویدوں پر بہت عبور حاصل تھا ۔ آپ نے ایک کتاب 'وید اور قرآن کا موازنہ' تصنیف فرمائی ۔ یہ ۱۵۲ صفحات کی مختصر سی کتاب ہے لیکن تمام مضامین پر مشتمل ہے ۔ یہ ۱۸۹۵ء کو شائع ہوئی ۔ اس کی زبان ملاحظہ ہو :

> ”پڑھے نہ لکھے نام ودیا ناتھ ۔ دیا نندی ترجمہ وید اور عیسائیوں کی کتابوں سے کام چلانا اور ماہر وید و قرآن کہلانا باعث خجالت ہے ۔ مگر ان دیانندیوں کی عادت ہے کہ فضول دعووں اور لغوگوئی سے باز نہیں آتے“۔

مولانا احتشام الدین

آپ شیعوں کے خلاف مناظرہ کرنے میں شہرت خاص رکھتے تھے ۔ آپ کی ایک نا مکمل تصنیف 'نصیحۃ الشیخ' بہت مشہور اور یہ کوئی ٦٧٦ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے ۔ یہ کتاب استدلال کی متانت ، عبارت کی صفائی اور سلاست ، طرزِ بیان اور سلیقۂ تفہیم کی نفاست ، غرض ہر ہر حیثیت سے اہلِ انصاف کے نزدیک قابل پسند اور اپنے مصنف کی قابلیت اور عالی دماغی کی شاہدِ عادل ہے ۔ مولانا عبدالشکور کے خیال میں اردو زبان میں اس سے پہلے ان خوبیوں کے ساتھ اس مبحث میں کوئی کتاب نہ لکھی گئی ہوگی ۔ کتاب کا مضمون چند عنوانات سے ظاہر ہوگا ۔

۱ ۔ مذہب شیعہ میں دین چھپانے کی تاکید ۔

۲ ۔ خروج مہدی کے لیے ۷۰ھ/٦٨٩ء مقرر تھا مگر شہادتِ حسین کی وجہ سے خدا کو غصہ آ گیا اور رائے بدل گئی ۔

۳ ۔ حضرت زکریا علیہ السلام نے امام حسینؓ کا ماتم کیا ۔

۴ ۔ شیعوں کا اعتقاد تحریفِ قرآن کے متعلق ۔

۵ ۔ نجاست میں پڑے ہوئے لقمہ کے کھانے سے آدمی جنتی ہو جاتا ہے ، وغیرہ وغیرہ ۔

کتاب کی ابتدا ان الفاظ سے ہوتی ہے :

''بندہ مسکین محمد احتشام الدین مراد آبادی غفر لہ اللہ الہادی اس 'رسالہ' نصیحۃ الشیعہ' کو بندگانِ خدا کی خدمت میں پیش کرتا ہے ۔ مجیب الدعوات سے دعا ہے کہ اس کو قبول فرما کر ذریعہ ہدایت بنائے ۔ حضراتِ اہل سنت سے امید ہے کہ میری محنت کی قدر فرما کر دعائے خیر سے یاد کریں ۔ حضراتِ شیعہ کی خدمت میں التماس ہے کہ تعصب سے قطع نظر کر کے انصاف کی نگاہ سے ملاحظہ فرمائیں ۔ من یھدی اللہ فلا مضل لہ و من یظللہ فلا ھادی لہ ۔''
شیعوں کی روایاتیں جو اس کتاب میں مذکور ہوں گی وہ اکثر ایسی ہوں گی جو کتبِ شیعہ مثل 'کافی' وغیرہ سے بچشمِ خود دیکھ کر نقل کی ہیں ۔ ان کو میں بلا واسطہ کتبِ شیعہ کے حوالے سے لکھوں گا اور اگر کتبِ مطبوعہ سے نکل گیا ہے تو صفحات کا پتہ بتا دوں گا اور جو روایتیں کتبِ مناظرہ مثل 'تحفہ یا ازالۃ الغین' سے نقل کروں گا ، ان میں ان کتبِ مناظرہ کا واسطہ ظاہر کر دوں گا ۔ یہ بارِ عظیم جو میں نے اپنے سر پر لیا ہے ، ایسا مشکل کام ہے جو میرے حوصلہ سے باہر ہے ۔ مگر اللہ کے فضل سے بہت کچھ امید ہے اور اس کی مدد پر بھروسہ کر کے اب میں اصل مدعا شروع کرتا ہوں ۔ و ھو حسبی و نعم الوکیل ۔
سبب اس تالیف کا یہ ہوا کہ حسبِ اتفاق آج کل میری نظر بعض کتبِ احادیث شیعہ پر پڑی تو مجھ کو سخت تعجب ہوا کہ حضراتِ شیعہ اس امر پر کیوں غور نہیں کرتے کہ ان کی روایتیں نصوصِ قرآنی بلکہ شہادتِ عقلِ سلیم کے بالکل مخالف ہیں ۔ باوجود دعوائے غلو محبت اہل بیت کے انہیں کی روایتوں سے بہت کچھ توہین اہلِ بیت کی لازم آتی ہے ۔ میرا خیال ہے کہ عوام

شیعہ اپنی احادیث کے مطالب سے بے خبر ہیں ان کے علماء و مجتہدین عوام کی سمجھ سے ان اسرار کو مخفی رکھتے ہیں ۔ اس وجہ سے عوام کو انصاف کرنے اور حق کو سمجھنے کا موقع نہیں ملتا"۔

کتاب کا انداز دوسری مناظرے کی کتابوں کے مقابلے میں منصفانہ ہے ۔ زبان بھی مقابلتاً صاف، سلیس اور معائب لفظی و معنوی سے پاک ہے ۔ اس کتاب کا جواب شیعوں کی طرف سے صدر المحققین شمس العلماء مولوی ناصر حسین مجتہد نے 'روشنی' میں دیا ۔ 'روشنی' کے ابتدا میں آٹھ صفحات کی تمہید ہے ۔ اس تمہید میں حسب ذیل افادات ہیں :

۱ ۔ مولوی احتشام الدین کو یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ آپ کی اس کتاب کا کوئی اثر شیعوں پر نہیں پڑے گا ۔

۲ ۔ شیعہ اپنے زندہ مجتہد کے فتوے پر عمل کرتے ہیں اور مجتہد کے انتقال کے بعد فتویٰ بے اثر ہو جاتا ہے ۔

۳ ۔ مولوی احتشام الحق کو چاہیے تھا کہ وہ اپنی نقل کی ہوئی روایات کا قطعی الصدور ہونا ثابت کرتے اور یہ بھی ثابت کرتے کہ ان احادیث کا جو مطلب انہوں نے بیان کیا وہی مطلب علمائے شیعہ بھی بیان کرتے ہیں ۔

۴ ۔ شیعہ اثنا عشریہ کی بعض کتابوں میں ہر قسم کی حدیثیں جمع ہیں ۔ یہاں تک کہ مختلف اور بعض اختلاف بھی ایسے ہیں کہ حلال و حرام و جواز و غیر جواز کے بارے میں ہیں ۔

اصل جوابات کا نمونہ

احتشام الدین نے 'کتاب الشیعہ' میں پہلی روایت 'اصول کافی' سے یہ نقل کی ہے کہ آئمہ نے مذہب شیعہ کو چھپانے اور امر حق کو ظاہر نہ کرنے کی حد سے زیادہ تاکید کی ہے ۔ 'روشنی' میں جو اس کا جواب دیا گیا ہے ۔ اس کا خلاصہ تین باتیں ہیں :

۱ ۔ یہ روایت تنقید کے متعلق ہے ۔

۲ ۔ تقیہ کے معنی جھوٹ بولنے کے نہیں بلکہ پرہیز کرنا ، پوشیدہ کرنا ، راز کا چھپانا ہے ۔

۳ - سورۂ تحریم کی آیت 'و اذا سترالنبی' نقل کی ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی راز کو چھپایا - زبان اس کتاب کی بھی عام فہم ، سلیس ، معائبِ لفظی سے پاک ہے -

مرزا غلام احمد قادیانی

مرزا صاحب ۱۸۳۹ء یا ۱۸۴۰ء میں ضلع گورداسپور کے قصبہ قادیان میں پیدا ہوئے - گھر پر ہی متوسطات تک تعلیم پائی - طب والد سے پڑھی - نحو ، منطق ، حکمت مولوی فضل احمد اور مولوی گل علی شاہ صاحب سے پڑھیں - ۱۸۶۴ء میں ڈپٹی کمشنر سیالکوٹ کی کچہری میں ملازمت کر لی - ۱۸۶۸ء میں ملازمت سے استعفاء دے کر قادیان آ گئے اور زمینداری کے کاموں میں مشغول ہو گئے - اس دوران میں قرآن مجید ، تفاسیر و احادیث کا مطالعہ جاری رہا - یہ زمانہ مذہبی مناظروں کا تھا - مرزا صاحب نے اس میدان کو اپنی سرگرمیوں کے لیے چن لیا مرزا صاحب نے تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع کیا - مسیحیت ، سناتن دھرم ، آریہ سماج اور برہمو سماج کے اعتراضات کا بطورِ خاص رد کیا -

'براہینِ احمدیہ' کی تصنیف ۱۸۷۹ء سے شروع ہوئی - اس کتاب میں انہوں نے صداقتِ اسلام کی تین سو دلیلیں پیش کرنے کا اعلان کیا - اس کتاب کی تالیف میں مولوی چراغ علی صاحب اور سر سید نے بھی تعاون کیا - یہ کتاب چار حصوں میں بڑے سائز کے پانچ سو باسٹھ صفحات میں چھپ کر نکلی - مرزا صاحب نے اس کتاب کی اشاعت پر پہلی مرتبہ اس بات کا دعویٰ کیا کہ وہ اسلام کی صداقت ظاہر کرنے کے لیے خدا کی طرف سے مامور ہیں اور وہ تمام اہلِ مذاہب کو مطمئن کرنے کے لیے تیار ہیں -

اس کتاب کی تالیف و اشاعت کا سلسلہ ۱۸۸۰ء سے ۱۸۸۴ء تک جاری رہا - چوتھے حصہ پر یہ سلسلہ رک گیا - پانچواں حصہ جو کتاب کا آخری حصہ ہے ، آغازِ تصنیف کے پورے پچیس سال بعد ۱۹۰۵ء میں شائع ہوا (سیرۃ المہدی جلد ۲ ، ص ۱۵۲) - مصنف نے حصہ پنجم میں اس کا اعتراف کیا ہے کہ ۲۳ برس تک اس کتاب کا چھپنا ملتوی رہا - اس میں مرزا صاحب نے اس کا تذکرہ کیا ہے کہ پہلے خیال تھا کہ وہ اسلام کی صداقت پر تین سو دلیلیں پیش کریں گے لیکن اب خیال ترک کر دیا ہے - اس طرح پہلے پچاس حصوں میں شائع کرنے کا مقصد تھا لیکن اب پانچ حصوں پر اکتفا کریں گے اس لیے کہ ان دونوں عددوں میں صرف ایک نقطہ کا فرق ہے -

بظاہر یہ کتاب عیسائیوں اور آریہ سماجیوں کے مقابلہ میں ایک کامیاب کوشش معلوم ہوتی ہے - لیکن بقول ابوالحسن ندوی اس ضخیم دفتر میں کوئی نادر علمی تحقیق اور مسیحیت کے ماخذ اور اس کی قدیم کتابوں اور اس کے اسرار و حقائق سے اس طرح واقفیت نہیں نظر آتی جو 'اظہار الحق و ازالۃ الاوہام' کے مصنف رحمت اللہ کیرانوی یا مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی کے ہاں موجود ہے -

بہر حال اس کتاب کی اشاعت نے مرزا صاحب کو دفعتاً قادیان کے گوشۂ گمنامی سے نکال کر شہرت کے منظرِ عام پر کھڑا کر دیا -

۱۸۸٦ء میں مرزا صاحب نے ہوشیار پور میں مرلی دھر آریہ سماجی سے مناظرہ کیا - اس مناظرہ کے بارے میں 'سرمۂ چشم آریہ' کے نام سے ایک کتاب لکھی -

پہلے دن کے مناظرہ کا موضوعِ بحث 'معجزہ شق القمر' کا عقلی و نقلی ثبوت تھا - مرزا صاحب نے اپنی اس کتاب میں نہ صرف اس معجزہ بلکہ معجزاتِ انبیاء کی پر زور اور مدلل وکالت کی ہے - انہوں نے ثابت کیا ہے کہ معجزات و خوارق کا وقوع عقلاً ممکن ہے - محدود انسانی عقل اور علم اور محدود انفرادی تجربات کو اس امر کا حق نہیں کہ وہ ان معجزات و خوارق کا انکار کریں اور اس وسیع کائنات کے احاطہ کا دعویٰ کریں - وہ بار بار اس حقیقت پر زور دیتے ہیں کہ انسان کا علم محدود ، مختصر اور امکان کا دائرہ بہت وسیع ہے - ان کا اس پر بھی زور ہے کہ مذاہب و عقائد کے لیے ایمان بالغیب ضروری ہے اور اس میں اور عقل میں کوئی تضاد نہیں - اس لیے کہ عقل غیر محیط ہے - واقعہ یہ ہے کہ بعد میں انہوں نے رفع و نزولِ مسیح کے بارے میں اور حضرتِ مسیح کے کے صدیوں تک آسمان میں رہنے پر جو عقلی اشکال پیش کیے ہیں اور بعد میں ان کے اندر جو عملیت کا رجحان پایا جاتا ہے اس کی تردید میں اس کتاب سے زیادہ موزوں کوئی اور چیز نہیں ہو سکتی - اس کتاب میں مصنف کی جو شخصیت نظر آتی ہے وہ بعد کی کتابوں کی شخصیت سے بہت مختلف ہے -

مرزا صاحب کو اپنی ان دو کتابوں کے لکھنے کے بعد اپنی شخصیت کا ایک نیا انکشاف ہوا - ان کو اپنی تحریری و متکلمانہ و مناظرانہ صلاحیتوں کا علم ہوا اور ان کو اندازہ ہوا کہ انہیں اپنے ماحول کو متاثر کرنے اور ایک نئی تحریک و دعوت کے چلانے کی اچھی استعداد حاصل ہے - اس انکشاف نے ان کے ذہن میں ایک نئی تبدیلی پیدا کی - اب ان کا رخ عیسائیوں اور آریہ سماجیوں سے مناظرہ کرنے کے بجائے خود مسلمانوں کو دعوتِ مناظرہ و مقابلہ دینے کی طرف ہو گیا -

مرزا صاحب نے بے شمار کتابیں تصنیف کی تھیں جن میں کچھ درج ذیل ہیں:

'آریہ دھرم' ، 'ازالہ اوہام' ، 'اعجاز مہدی' ، 'اعجاز المسیح' ،
'انجام آتھم' ، 'آئینہ کمالات اسلام' ، 'تحفہ گولڑویہ' ، 'تریاق القلوب' ،
'توضیح مرام' ، 'چشمہ مسیحی' ، 'حقیقۃ المہدی' ، 'حقیقۃ الوحی' ،
'رسالہ جہاد' ، 'ست بچن' ، 'شہادۃ القرآن' ، 'کشتی نوح' وغیرہ وغیرہ۔

مرزا صاحب نے بتدریج ۱۹۰۱ء میں نبوت کا دعویٰ کیا۔ تردید و مخالفت کرنے والوں میں امیر ملت پیر جماعت علی شاہ صاحب ، مولانا عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری ، پیر مہر علیشاہ گولڑوی اور مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری نمایاں تھے۔

مرزا صاحب نے ۲۶ مئی سہ شنبہ کو دن چڑھے لاہور میں انتقال کیا۔ نعش قادیان لے جائی گئی۔ ۲۷ مئی ۱۹۰۸ء کو تدفین عمل میں آئی۔

مولانا ثناء اللہ امرتسری

۱۸۶۸ء میں امرتسر میں ایک منٹو خاندان میں پیدا ہوئے۔ والد بچپن میں فوت ہو گئے تھے۔ ذاتی ہمت سے تعلیم حاصل کی۔ آپ کو ابتدا ہی سے مناظروں میں دلچسپی تھی۔ آپ اکثر گرجا گھر چلے جاتے ، پادریوں کی تقریریں سنتے اور ان پر اعتراضات کرتے۔

آپ کی تمام عمر مناظروں میں گذری ، کوئی مذہب یا فرقہ آپ سے نہیں بچا۔ خود لکھتے ہیں کہ ''فراغت تعلیم کے بعد ادھر ادھر سے ماحول کے مذہبی حالات دریافت کرنے میں مشغول رہتا تھا۔ میں نے دیکھا کہ اسلام کے سخت بلکہ سخت ترین مخالف عیسائی اور آریہ دو گروہ ہیں۔ انہیں دنوں قادیانی تحریک پیدا ہو چکی تھی۔ بہر حال میں ان تینوں گروہوں کے علم کلام اور کتب مذہبی کی طرف متوجہ ہوا۔ سب سے پہلے پادری ٹھاکر دت کی تصنیف 'عدم ضرورت قرآن' کو لیا اور اس کے جواب میں کتاب 'تقابل ثلاثہ' (توریت ، انجیل ، قرآن) لکھی۔ اس کے بعد 'جوابات نصاریٰ' اور 'اسلام اور مسیحیت' رقم کیں۔

اسلام اور مسیحیت

یہ کتاب مولانا ثناء اللہ نے پادری برکت اللہ کی تین کتابوں 'توضیح القرآن' ، 'مسیحیت کی عالمگیری' اور 'دین فطرت' کے جواب میں تحریر کی ہے۔ یہ ۲۳۲ صفحات

کی کتاب ہے اور دو کتابوں میں سے ایک ہے جن کے بارے میں مولانا نے فرمایا ہے کہ خدا ان کو میری نجات کا ذریعہ بنائے گا ۔ دوسری کتاب 'مقدس رسول' جو 'رنگیلا رسول' مصنفہ راجپال کے جواب میں ہے ۔ 'اسلام اور مسیحیت' میں مولانا نے پادری برکت اللہ کے اعتراضات کا جواب شافی عقلی و نقلی دلائل سے دیا ہے ۔

آریوں کی کتاب 'ستیارتھ پرکاش' کا ناگری سے اردو میں ترجمہ ہوا تو مولانا نے اس کا جواب 'حق پرکاش' میں دیا ۔ 'ستیارتھ پرکاش' کا مصنف 'دیانند سرسوتی' ہے ۔ یہ آریہ سماج کے بانی ہیں ۔ یہ فرقہ خدا کو ایک مانتا ہے ۔ بت پرستی سے نفور ہے ۔ اس کے علاوہ اور تمام مذہبی عقائد میں سناتن دھرمیوں سے متفق ہے ۔ یہ فرقہ انگریزوں کی انگیخت پر وجود میں آیا ۔ اس کا مقصد زیادہ تر مسلمانوں کو شدھ (مرتد) کرنا تھا ۔ دیانند سرسوتی نے ستیارتھ پرکاش میں تمام مذاہب پر اعتراض کیے اور اس کا چودھواں اور آخری باب خاص اسلام کے لیے مخصوص کیا ۔ اس میں اس نے قرآن مجید پر ۱۵۹ اعتراض کیے ہیں ، مثلاً پہلا اعتراض یہ ہے کہ مسلمان کہتے ہیں کہ یہ قرآن خدا کا کلام ہے ۔ ان کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا بنانے والا کوئی دوسرا ہے ۔ کیونکہ اگر خدا کا بنایا ہوا ہوتا تو شروع ساتھ نام اللہ کے ایسا نہ کہتا ۔ بلکہ شروع واسطے ہدایت انسانوں کے ایسا کہتا ۔

سوامی سرسوتی کے اعتراضات کی نوعیت اس ایک اعتراض سے مضحکہ خیز طور پر ظاہر ہوتی ہے ۔ قرآن میں آیا ہے :

> "جو تم اس چیز سے شک میں ہو جو ہم نے اپنے پیغمبر کے اوپر اتاری
> اس جیسی ایک سورت لے آؤ" ۔

سوامی اعتراض میں تحقیق کی ٹانگ توڑتا ہے کہ اس کے مانند کوئی سورت نہ بنے ؟ کیا اکبر بادشاہ کے زمانے میں 'مولوی فیضی' نے 'بے نقطہ قرآن' نہیں بنا لیا تھا ۔ بایں عقل و دانش بباید گریست ۔ غرض ایسے ہی بے سروپا اعتراضات سے کتاب کو داغدار کیا ہے ۔

سوامی کی اس کتاب ستیارتھ پرکاش کا جواب مولانا نے 'حق پرکاش' میں دیا ہے جو ۲۴۰ صفحات پر محیط ہے ۔ سوامی نے اپنی کتاب میں یہ طرز رکھی ہے کہ پہلے قرآن شریف کا لفظی ترجمہ نقل کیا ہے پھر اپنا نام محقق لکھ کر اسپر اعتراض وارد کیا ہے ۔ مولانا ثناء اللہ نے اس سے مناسبت کی غرض سے محقق کے مقابلہ میں جواب کی ابتدا مدقق سے کی ہے ۔

مولانا نے تمام اعتراضات کا جواب 'ستیارتھ پرکاش' کے مستند ترجمہ اردو منجانب ہری ندھی سرجا پنجاب اور 'رگ وید' ترجمہ بابو بہال سنگھ رئیس ساکن کرنال کے حوالے سے خود آریہ سماج کے مسلمہ مذہب کی رو سے دیا ہے - مولانا کے جواب کا انداز ملاحظہ ہو :

''قرآن کی آیت جس نے تمہارے واسطے زمین کو بچھونا اور آسمان کی چھت بنائی ہے پر سوامی نے اعتراض کیا ہے کہ :

> ''محتو : بھلا آسمان چھت کس کی ہو سکتی ہے ؟ - یہ جہالت کی بات ہے - اگر کسی اور کرۂ زمین کو آسمان مانیے تو ان کے گھر کی بات ہے'' -

مولانا نے جواب دیا ہے - محقق آسمان نیلگوں مثل چھت کے نظر آ رہا ہے ، عربی میں ہر بلند شے کو جو سر سے اوپر ہو سقف کہا کرتے ہیں - اس بنا پر آسمان کو سقف (چھت) کہا گیا ہے -

'حق پرکاش' کے آخر میں سوامی کی اخلاقی حالات خود ان کے ہم مذہب لوگوں کی تحریروں سے ظاہر کی گئی ہے -

آریوں کی ایک اور کتاب 'کتاب اللہ وید ہے یا قرآن' کا جواب 'کتاب الرحمان' میں دیا ہے - قادیانیوں کے حق میں تو مولانا بلا تھے - وہ خود کہتے ہیں قادیانی تحریک کے متعلق کتابیں اتنی ہیں کہ مجھے خود ان کا شمار یاد نہیں -

مولانا کی دوسری کتابوں میں سے چند ایک حسب ذیل ہیں :

> تقلید شخصی ، تنقید تقلید ، فاتحہ خلف الامام ، فیصلہ مرزا ، نکات مرزا ، نکاح مرزا ، الہامات مرزا ، عقائد مرزا ، چیستان مرزا ، علم کلام مرزا ، عجائبات مرزا ، شہادت مرزا ' بہاءاللہ اور مرزا ، ترک اسلام بجواب ترک اسلام ، اصول آریہ ، سوامی دیانند کا علم و عقل ، بحث تناسخ ، نکاح آریہ ، توحید و تثلیث موید وغیرہ -

۱۹۴۷ء میں مولانا پاکستان چلے آئے اور ۱۵ مارچ ۱۹۵۸ء کو واصل بحق ہوئے -

مولانا اشرف علی تھانوی

مولانا ۵ ربیع الثانی ۱۲۸۰ھ (۱۸۶۳ء) کو چہار شنبہ کے دن بوقتِ صبح صادق پیدا ہوئے ۔ قرآن مجید زبانی حافظ حسین علی مرحوم سے حفظ کیا ۔ فارسی متوسطات حضرت مولانا فتح محمد صاحب سے پڑھیں ۔ انتہائی کتابیں اپنے ماموں واجد علی مرحوم سے ختم کیں ۔ واجد علی ادبِ فارسی کے استاد کامل تھے ۔ عربی کی تحصیل کے لیے دیوبند گئے وہاں بقیہ فارسی کتب مولانا منفعت علی دیوبندی سے پڑھیں اور فارسی میں دستگاہِ کامل حاصل کی ۔ زمانہ طالب علمی میں بعمر ۱۸ سال 'مثنوی زیر و بم' فارسی میں تصنیف کی ، عربی کی تکمیل دیوبند میں کی ۔ ۱۹ ، ۲۰ سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہو گئے ۔

زمانۂ طالب علی میں بحث و مناظرہ کا شوق رہا ۔ جہاں کوئی دوسرے مذہب والا مناظرہ کے لیے آیا ، فوراً پہنچ جاتے اور مغلوب کر لیتے ۔ ایک انگریز پادری سے مناظرہ آ پڑا ۔ مولانا محمود الحسن کو معلوم ہوا تو ڈر ہے کہ کہیں غصہ نہ کھا جائیں ، اس لیے اعانت کو پہنچ گئے لیکن وہاں تھانوی نے پادری کو اتنا عاجز کیا کہ غریب میدان چھوڑ کر بھاگ گیا ۔ مولانا بیان کرتے ہیں کہ 'جتنا مجھے اس زمانے میں مناظرہ کا شوق تھا ، اب بوجہ مضرتوں کے اتنی ہی اس سے نفرت ہے' ۔ بقول مولانا سید مرتضیٰ حسن مولانا کو فنِ مناظرہ میں اس قدر ملکہ تھا کہ بڑے سے بڑا مناظر بھی مقابلہ میں نہیں ٹھہر سکتا تھا ۔ بڑے بڑے معرکہ آراء مباحث پر بڑے بڑے زبان آور مناظر آ کر گفتگو کرتے لیکن تھوڑی سی دیر میں بند ہو جاتے اور لطف یہ کہ مولانا اصولِ مناظرہ سے سرمو انحراف نہ کرتے اور نہ ہی حق بات تسلیم کرنے میں تامّل فرماتے ۔ لیکن باوجود مناظرہ سے اس درجہ مناسبت ہونے کے مناظروں سے دلی نفرت ہو گئی اور بحث مباحث کی مجالس میں شرکت قطعاً ترک کردی ، خود بیان کرتے ہیں :

> "کیونکہ اکثر اس زمانہ میں مناظرین کی اغراض فاسد ہوتی ہیں ، اس لیے کوئی نفع مرتب نہیں ہوتا بلکہ ضرر ہوتا ہے ۔ کج بحثی اور ہٹ دھرمی کی عادت پڑ جاتی ہے ۔ حقیقت شناسی کی استعداد برباد ہو جاتی ہے" ۔

یہی وجہ ہے کہ اس عہدِ جدل و بحث کی کوئی تحریری روداد نہیں ملتی ۔ بعد میں مولانا نے البتہ جب مواعظ کا سلسلہ شروع کیا تو کئی ایک ایسے موضوعات زیرِ بحث آئے جو خاص مناظرانہ نوعیت کے تھے ۔ 'قائد قادیان' اور 'الخطاب العلیم فی تحقیق المہدی والمسیح' میں اگرچہ انہیں موضوعات کو چھیڑا گیا ہے ، جو مناظروں کی جان تھے ، لیکن مولانا کا

مسائل کوحل کرنے کا اپنا خاص انداز ہے ۔ وہ الزامی جواب سے چپ نہیں کراتے بلکہ تحقیقی جوابات سے مسائل کو مطمئن کرتے ہیں ۔ ان کی یہ روش آخر دم تک قائم رہی ۔

مولانا احمد رضا خان

اعلیحضرت لقب ، پیدائشی نام محمد ۔ تاریخی نام المختار ۔ دادا احمد رضا خان کہتے تھے ۔ خود عبدالمصطفیٰ احمد رضا خان تحریر کیا ہے :

محافظ تھا جو ناموسِ رسالت کا زمانے میں

جسے یہ فخر تھا کہ ہوں میں عبدالمصطفیٰ تم ہو

۱۴ جون ۱۸۵۶ء کو بریلی میں پیدا ہوئے ۔ والد کا نام شاہ نقی علی خان تھا ۔ ان کا اپنے زمانے کے معروف علماء میں شمار ہوتا تھا ۔ ابتدائی تعلیم والد ماجد سے حاصل کی ۔ سترہ سال کی عمر میں فارغ ہو گئے ۔ چودہ سال کی عمر میں پہلا فتویٰ قلم بند کیا ۔ 'فتویٰ رضویہ' آپ کی بلند پایہ تصنیف ہے ۔

مولانا نے اگرچہ جدل و بحث ، مناظرہ و محاربہ سے ہمیشہ دامن بچایا ۔ لیکن موقع پڑا تو طرح بھی نہیں دی ۔ ایک بار ایک آریہ سماجی آیا اور کچھ سوالات کیے ۔ مثلاً مسلمانوں کے لیے عبادت کے پانچ وقت کیوں مقرر ہیں ؟ پرمیشر کی عبادت جتنی کی جائے کم ہے ۔ قرآن ایک دم نازل کیوں نہیں ہوا ؟ آپ کے نبی کو معراج کی رات خدا نے بلایا تو انہیں پھر دنیا میں کیوں بھیج دیا ، وہ تو اس کے محبوب تھے وغیرہ وغیرہ ۔ مولانا نے ان سوالوں کے ایسے جوابات دیے کہ آریہ سماجی مطمئن ہو گیا ۔ اسی طرح دوسرے فریق مخالف عیسائیوں یا احمدیوں ، آریہ سماجیوں ، غیر مقلدوں ، دیوبندیوں ، نیچریوں سے اگرچہ باقاعدہ اکھاڑوں میں مناظرے نہیں کیے ، لیکن ان کی طرف سے اعتراضات کا جواب شافی دیتے رہے ۔ آپ کی بے شمار تصانیف میں 'منیرالعین فی حکم تقبیل الابہامین' اور 'حیات الموات فی بیان سماع الاموات' خالص مناظرانہ رنگ کے رسائل ہیں ۔

'منیر العین فی حکم تقبیل الابہامین' میں اذان کے کلمہ 'اشہد ان محمد رسول اللہ' کو سن کر انگوٹھے چومنے کا مسئلہ کھول کر لکھا ہے اور مخالفین کی ہر راہ فرار بند کرنے کی کوشش کی ہے ۔ اسی طرح سماعِ موتیٰ میں کتبِ حدیث ، فقہ ، تفسیر اور اصول کے حوالہ جات کی روشنی میں ثابت کیا ہے کہ ارواحِ مومنین کو اجازت ہوتی ہے کہ آسمان و زمین

میں جہاں چاہیں پھریں - بزرگوں کا دور اور نزدیک سے سننا یکساں ہے - انہیں دور سے پکارنا ہرگز شریعت طاہرہ کے خلاف نہیں بلکہ نعمت خداوندی کا اظہار و اقرار ہے - وغیرہ وغیرہ - - - - سیاسی تحریکوں کے آغاز پر جب مسلمانوں کو ہندوستان چھوڑو اور ہجرت کرنے پر آمادہ کیا گیا تھا جس سے ہزاروں مسلمان اپنے گھر بار چھوڑ کر افغانستان کی طرف کوچ کرنے لگے تو مولانا احمد رضا نے اس ہجرت کے خلاف فتویٰ دے کر مسلمانوں کو اس سیاسی غلطی سے بچانے کی کوشش کی - اسی طرح ہندو کے ساتھ مسلمانوں کی موالات کی تحریک کی بھی اس نے مخالفت کی اور ان مسلمان لیڈروں کی مذمت کی جو گاندھی وغیرہ کو اپنی مساجد میں لے جا کر تقریریں کرانے لگے تھے -

منشی امداد حسین

بڑے صاحب علم ہیں ، انہوں نے لالہ اندر من کی تصنیف 'صولت ہند' کا جواب اپنی معرکہ آرا کتاب 'ظفر مبین علی جمع الشیاطین' میں دیا ہے - یہ کتاب بڑی تقطیع کے ۶۱۶ صفحات پر محیط ہے - بڑی لاجواب کتاب ہے - لالہ اندرمن نے اپنی 'صولت ہند' میں اللہ ، رسول ، قرآن مجید اور حدیث شریف پر اعتراضات کیے ہیں - مثلاً :

۱ - قرآن حضورؐ کے عہد میں جمع نہیں ہوا تھا -

۲ - حضرت عثمانؓ نے اپنے عہد میں تمام آیات زبان قریش میں لکھوائیں -

۳ - حضرت عثمانؓ نے قصداً قرآن کو گم کر دیا اور بعض آیات کو متغیر مبدّل کر دیا -

۴ - قرآن جھوٹ سے خالی نہیں -

۵ - عبارات قرآن چنداں خوش نما نہیں -

غرض ایسے ہی اعتراضات کیے ہیں - منشی صاحب اول جواب دینے سے پہلے لالہ جی کی گوشمالی کرتے ہیں اور پھر جواب بالصواب رقم کرتے ہیں - منشی صاحب حقیقت میں اعلیٰ درجہ کے منشی ہیں - زبان بڑی عالمانہ ، عبارات عربی اکثر بطور حوالہ نقل کی ہیں - عربی ، فارسی ، اردو کے اشعار موقع بموقع جواب میں لکھتے ہیں - ان کی تحریر سے طبیعت بوجھل نہیں ہوتی ورنہ مناظرے کی کتابیں پڑھنا بڑے دل گردے کا کام ہے - منشی صاحب لالہ جی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

علم مناظرہ اور علم میزان سے ناواقف محض تھے ۔ دعویٰ عربی اور سنسکرت دانی کا بمبالغہ تمام کیا ہے ۔ مگر جہاں کچھ بھی بحث متعلق لغت آ جاتی ہے دم بخود رہ جاتا ہے ۔ عبارات عربیہ جو اکثر مقامات پر نقل کی ہیں سراسر غلط ہیں جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ الفاظ کی صحت و غلطی کی تمیز سے بھی معذور ہے ۔ یرحسہ عبارات سنسکرت کے جہاں کیے ہیں ، محض غلط جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ سنی سنائی یا دل کی بنائی باتیں لکھ دی ہیں ۔ اکثر عبارات کو عبارت بید لکھتا ہے مگر یہ نہیں لکھتا کہ نہ عبارت کس بید کی ہے ۔ اکثر جگہ بحوالہ کتب اسلامیہ لکھتا ہے مگر تحریر عبارت اصل کتاب یا ترجمہ معروضہ سے سراسر قاصر ہے ۔ شاید کہیں ایسا ہوگا کہ اخفائے حقیقت اور دغا بازی کو دخل نہ دیا ہو ۔ بعض جگہ ایسی کتابوں کا حوالہ دیتا ہے کہ اس نے نہیں دیکھیں ۔ اکثر جگہ ان کتابوں کا حوالہ دیتا ہے کہ شاید ان کو دیکھا ہو مگر یقیناً ان کی عبارت پڑھنے اور سمجھنے سے قطعاً معذور ہے ۔ غرضیکہ اس قسم کے اسقام سے اس کی کتاب بھری پڑی ہے ۔

ثبوت تناسخ از پنڈت لیکھ رام

اس کتاب میں پنڈت جی کے بقول عیسائی ، مہدی اور برہمو صاحبان کے ان تمام مطبوعہ اعتراضات کے جن کو وہ اپنے خیال میں لا جواب سمجھے ہوئے تھے ، تحقیقی اور الزامی جواب ہیں ۔ مزید برآں خود اس مسئلہ کے ثبوت میں بھی دلائل قاطع کا ایک کافی میگزین اور لائق فائق حکماء کی رائے کا اچھا خاصہ علمی خزانہ ہے ۔ نمونہ زبان :

> ''ہمارا مصمم ارادہ مسئلہ تناسخ پر ایک کتاب تحریر کرنے کا ہے جس میں چھ باب ہوں گے ۔ دیباچہ تشریح تناسخ ، عیسائیوں کے تمام اعتراضوں کا جواب ، مہدیوں کے تمام اعتراضوں کا جواب ، برہموؤں کے تمام اعتراضوں کا جواب ، دیگر اہل مذاہب کی تناسخ پر رائے علماء و فضلا کی رائے ، ویدوں اور شاستروں کی رائے'' ۔

ان کے علاوہ اور بہت سی کتابیں ہیں جو خاص مناظرہ کی غرض سے تصنیف ہوئیں ۔ ان کے ساتھ ساتھ بہت سے رسائل بھی خاص مناظرہ بازی کے لیے جاری ہوئے ۔ جن میں ایک دوسرے کے خلاف خوب کیچڑ اچھالا جاتا تھا ۔ مثلاً 'نورالآفاق' ، 'نورالانوار' ، 'تہذیب الآفاق' ، 'شمس الاخبار' ، کرسچئین ٹریزر' ، 'فرینڈ مسیحیت' ، 'منشور مہدی' ، 'نور افشاں' ، 'آریہ' وغیرہ وغیرہ ۔

ان مناظروں سے اگرچہ آپس میں منافرت بڑھی ، ذہنی اور اخلاقی انتشار پھیلا ، ایک ہی ملک کے رہنے والے ایک دوسرے سے کوسوں دور ہوگئے ، باہمی رواداری اور اخوت نام کو نہ رہی ، لیکن اردو کو ضرور فائدہ ہوا ۔ اس کو ایک عجیب و غریب قسم کا لٹریچر ہاتھ آ گیا جس کو مناظراتی ادب کا نام دیا گیا ہے ۔ یہ ادب اس وقیع ادب سے بالکل جداگانہ حیثیت رکھتا ہے جس کو سر سید اور ان کی جماعت مومنین تیار کر رہی تھی ۔ مناظراتی ادب میں تعقّل اور اعتدال برائے نام ہی تھا جبکہ سر سید اسکول کا امتیازی نشان عقل ، توازن ، مصالحت ، اعتدال اور اجتماعیت ہیں ۔ ان کے نزدیک حقیقت اور سچائی کو حاصل کرنے کا طریقہ تحقیق ہے نہ کہ مخالفانہ جذبات ۔ انہوں نے سائنسی نقطہٴ نظر سے دیکھنے اور پرکھنے کا میلان پیدا کیا اور اس میں کچھ شک نہیں کہ وہی ادب حیات جاوید حاصل کرتا ہے جو جذبات اور تعقل کا بہترین امتزاج رکھتا ہو اور یہی وجہ ہے کہ وہ مناظراتی ادب جس کی حیثیت محض وقتی اور ہنگامی تھی ، کتابوں کے قبرستان میں دفن ہو کر رہ گیا ۔ کوئی اس کو بھول کر بھی نہیں دیکھتا ۔ سوائے ان خدا ترس محققین کے جن کو وقت کی اہم تحریکوں اور سرگرمیوں کے متعلق معلومات مطلوب ہوتی ہیں ۔ خود سر سید اور ان کے حواریوں کی وہ کتابیں جو سر تا سر ہنگامی جذبات سے مملو ہیں اور متذکرہ صدر مناظراتی ادب سے تعلق رکھتی ہیں ، گلدستہٴ طاق نسیاں ہو کر رہ گئی ہیں ۔

البتہ چونکہ یہ سارا ادب ایک عہد کے ذہنی مشاغل اور افکار کی عکاسی کرتا ہے اور اس زمانے کی مخصوص ثقافت کے ایک اہم پہلو کا ترجمان ہے ہم نے اس کا تذکرہ تاریخِ ادبیاتِ اردو کی اس جلد میں ضروری سمجھا ہے ۔

اٹھارواں باب

اردو زبان کا جائزہ—صرف و نحو پر تصانیف و تالیفات

۱۸۵۷ء کے سیاسی انقلاب اور حکومت کی تبدیلی نے برصغیر پاک و ہند کے لسانی اور ادبی پس منظر کو بھی متاثر کیا۔ یہ تبدیلی صرف حکومت کی معمولی تبدیلی نہ تھی، کیونکہ حکومت میں تو انگریزوں کا اثر و نفوذ اس سے پہلے پوری ایک صدی میں آہستہ آہستہ محسوس ہونے لگا تھا۔ لیکن جب تک دلّی میں مسلمانوں کی برائے نام حکومت قائم تھی اور لال قلعے پر مغلوں کے اقبال کا پرچم لہراتا تھا دبی طور پر لوگ اس بے دست و پا اور مجبور و بیکس شہنشاہ کو ہی عظیم مغلیہ سلطنت کا وارث سمجھتے تھے۔ حکم کمپنی بہادر کا چلتا تھا، لیکن نفسیاتی طور پر کمپنی کے عہدہ داروں کو شہنشاہ کا وکیل ہی سمجھا جاتا تھا۔ جس دن لال قلعے کی فصیل پر انگریزوں کی فتح کا علم بلند ہوا اسی دن ایک بڑے تہذیبی دور کا خاتمہ ہو گیا۔ یہ تہذیب وہی تہذیب تھی۔ اسلامی تہذیب تھی جسے ہندوؤں اور مسلمانوں نے مل کر پروان چڑھایا تھا اور جس میں ہندی اور عجمی عناصر کی آمیزش و آویزش نے پورا حصّہ لیا تھا۔ فارسی اس تہذیب اور کلچر کی ایک نشانی تھی اس کی حیثیت صرف سرکاری اور عدالتی زبان کی نہ تھی اسے اس ملک میں اسلامی ثقافت کی کلید سمجھا جاتا تھا۔ فارسی نے اس ملک کی زبانوں کی نشوونما میں بڑا اہم کردار ادا کیا تھا، برصغیر کی بولیوں اور زبانوں کو پرا کرتی دور سے بڑھا کر جدید زبانوں کا مرتبہ اسی نے بخشا تھا۔ اردو بھی اس سے مستثنیٰ نہ تھی بلکہ اور زبانوں کے مقابلے میں اس نے کچھ زیادہ ہی فارسی کے اثرات قبول کیے تھے۔ کتابی زبان کے دو فقرے بھی اردو میں اس طرح لکھنا کہ اس میں فارسی لفظ یا ترکیب نہ آنے پائے ممکن نہ تھا۔ انشاء اللہ خان نے بہ تکلّف 'رانی کیتکی' کی کہانی میں یہ التزام رکھنے کی کوشش کی کہ کوئی لفظ عربی فارسی نہ لائیں، اول تو یہ تکلّف اور اہتمام تھا جسے عام ادبی یا کتابی زبان تو کیا بول چال کی عام زبان سے بھی تعلق نہیں اور دوسرے پوری احتیاط کے باوجود عربی فارسی کے الفاظ اس میں داخل ہو ہی گئے۔ اردو میں اکثر اصنافِ ادب نظم اور نثر دونوں فارسی سے آئی تھیں اور اپنے ساتھ اسالیبِ الفاظ، اصطلاحات اور تراکیب کا ایک خزانہ لائی تھیں جن سے اردو کے شعراء اور مصنّفین نے اپنی دوکان سجائی تھی۔ اس طرح فارسی اور فارسی کے وسیلے سے عربی اور ایک حد تک ترکی اردو کے لیے ایک ماخذ کی حیثیت رکھتے تھے۔ اب اس ماخذ کی سیاسی اہمیت کے ساتھ ادبی حیثیت اور ثقافتی اہمیت بھی کمزور پڑنے لگی۔ اس کی جگہ آہستہ آہستہ انگریزی نے لے لی۔ اگرچہ ۱۷۵۷ء میں پلاسی کی لڑائی کے بعد بنگال کے دیوانی کے انتظام کے سلسلہ میں جو معاہدہ

ہوا تھا اس میں فارسی کی دفتری حیثیت تسلیم کی گئی تھی ، لیکن انگریزوں نے کس کس عہد نامہ کی شرائط کو پورا کیا تھا جو وہ اسے پورا کرتے ۔ وہ تو فارسی کو مسلمانوں کی حکومت اور مغلوں کی سلطنت کا ایک زندہ نشان سمجھتے تھے اور جلد سے جلد اس سے چھٹکارا پانا چاہتے تھے ۔ فارسی کی جگہ یکایک انگریزی نہیں لے سکتی تھی اور نہ اتنے وسیع پیمانے پر انگریزی کی تعلیم و تدریس کا انتظام ہو سکتا تھا کہ دفتروں کے لیے کلرک اور افسر پورے ہو سکیں ۔ اس لیے عبوری طور پر اردو کو فارسی کی جگہ دی گئی اور ۱۸۳۵ء میں اس کا اعلان بھی ہوا ، لیکن اس کے ساتھ ہی ایک طرف ہندی کو اردو کا حریف بنا کر کھڑا کر دیا گیا اور دوسری طرف انگریزی کی اشاعت کے لیے تمام ممکن ذرائع اختیار کیے گئے ۔ یہاں تک کہ آہستہ آہستہ انگریزی فارسی کی جگہ تہذیب اور کلچر کی نشانی سمجھی جانے لگی اور رفتہ رفتہ تعلیم کی ہر سطح پر اسے ترجیحی درجہ دے کر ملکی اور قومی زبانوں کی ترقی اور ترجیح کے لیے تمام راستے مسدود کر دیے گئے ۔

اس انقلاب نے ایک اور تہذیبی مسئلہ بھی پیدا کیا ، یہ علوم و فنون کی تعلیم و تدریس اور ترقی کا مسئلہ تھا ۔ مسلمانوں نے اپنے دورِ حکومت میں علوم و فنون کی ترقی میں نمایاں حصہ لیا تھا اور بالخصوص قدیم علوم و فنون کے تحفظ اور بقاء کے لیے بڑا کام کیا تھا ۔ درس کے ان سلسلوں میں مثلاً ایک درسِ نظامی تھا جو مدتوں نہ صرف برّصغیر پاک و ہند میں بلکہ ساری دنیائے اسلام میں رائج رہا لیکن دورِ زوال میں ان علوم کو بھی زوال ہوا اور ان میں سے اکثر علوم دورِ جدید کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے مناسب وسعت پیدا نہ کر سکے ۔ اس عرصہ میں مغرب میں علوم و فنون کی ترقی نے بہت سے نئے علوم و فنون پیدا کیے اور بعض قدیم علوم و فنون میں نئے تصورات اور نظریات قائم کیے ۔ اب اس انقلاب کے بعد مشرق اور مغرب میں خیالات کے تصادم کی ایک نئی صورت پیش آئی ۔ اس کی ضرورت یوں پہلے بھی محسوس ہوئی تھی اور ۱۸۵۷ء سے پہلے ہی دلّی میں مرحوم دلّی کالج اور اس کے دارالترجمہ میں جدید علوم و فنون کی تعلیم و تحصیل کی طرف توجہ ہونے لگی تھی ، لیکن یہ دور در اصل تحریکِ سرسیّد سے شروع ہوتا ہے ۔

سرسیّد احمد خان کی ادبی تحریک سے پہلے اردو شعر و ادب کا بڑا حصہ مضامینِ خیالی کے بیان پر مشتمل تھا ۔ شاعری میں خاص طور شاعر کی توجہ بیشتر اپنے جذبات و کیفیات کی ترجمانی پر مرکوز رہتی تھی ۔ گویا یہ ادب بڑی حد تک تاثراتی تھا ۔ خارجی مناظر و مظاہر کا بیان ان میں کم تھا ۔ سماجی مسائل کی جھلک ان میں ضرور ملتی ہے ، لیکن یہ ادبی تخلیق کا مقصد نہ تھا اور علمی مضامین و موضوعات کی طرف توجہ نہ ہونے کے برابر تھی ۔ اصلاً ان ادبی تخلیقات کے حسن کا معیار ان کا اسلوب ، طرزِ ادا اور بیان تھا جس پر فارسی کے روایتی اسالیب کی

چھاپ لگی تھی۔ ادبی تخلیقات کا مقصد ادب برائے ادب کی تخلیق تھا ، جو ایک حد تک فن کے جمالیاتی نقطۂ نظر کا ترجمان تھا اور فن کی جمالیاتی اقدار سے کما جاتا تھا۔ ان تخلیقات کا کوئی سماجی یا تعلیمی یا اصلاحی مقصد نہ تھا۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اردو شاعری اور نثر کے اس عظیم سرمایہ کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ مثلاً نثر میں ایک سلسلہ طویل نثری داستانوں کا ہے جو بظاہر بے مقصد معلوم ہوتی ہیں۔ 'طلسم ہوشربا' اور 'داستان امیر حمزہ' ایسے دور کی یادگار معلوم ہوتی ہیں ، جب لکھنے والوں یا پڑھنے والوں کے سامنے کوئی مسئلہ نہ تھا یا وہ مسائل سے فرار چاہتے تھے۔ لیکن ان کی بھی ایک اہمیت ہے۔ ان میں اس عہد کی تہذیب و معاشرت رسم و رواج اور لوگوں کے خیالات ، میلانات اور رجحانات کی بڑی جیتی جاگتی تصویریں ملتی ہیں اور انہی داستانوں میں جو ہزاروں صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں لاکھوں الفاظ اور اصطلاحات استعمال ہوئی ہیں اور اس طرح اس عہد کی اردو زبان کا ایک بہت بڑا ذخیرہ ان کے ذریعہ سے محفوظ ہوگیا ہے۔ لیکن انیسویں صدی کے نصف آخر کا مطالبہ اردو کو ایک علمی زبان بنانے کا تھا صرف شاعری اور داستان کی زبان کی حیثیت سے اس کا مستقبل زیادہ روشن نہ تھا۔

یہ کام سر سید اور ان کے رفقاء نے انجام دیا۔ انہوں نے اپنی تحریروں سے ایسی تخلیقات کے نمونے فراہم کیے جن سے اردو کے علمی سرمائے میں اضافہ ہوا۔ اس سلسلے میں سب سے اہم مسئلہ اسلوب بیان اور زبان کا تھا۔ سر سید نے بالخصوص اپنے رسالے 'تہذیب الاخلاق' کے ذریعہ سے ایک ایسی زبان رائج کی جسے کاروباری اور علمی نثر کہہ سکتے ہیں۔ اس کی خوبی صرف سادگی نہیں ہے۔ سادگی کا نمونہ تو انیسویں صدی کے آغاز میں ہی میر امن کی 'باغ و بہار' اور پھر مرزا غالب کے مکاتیب میں ملتا ہے ، مگر میر امن یا غالب کی زبان علمی اور فنی مضامین کے لیے موزوں نہیں ہے۔

اس طرح کی سادہ آسان اور کاروباری زبان کے فروغ کے اور کئی اسباب جمع ہو گئے۔ ان میں سب سے اہم پریس کا قیام اور اخباروں اور رسالوں کا اجراء ہے جن کی وجہ سے اردو میں قاری کا حلقہ زیادہ وسیع ہو گیا۔ انیسویں صدی تک تعلیم بڑی حد تک ایک خاص طبقہ میں محدود تھی۔ دینی تعلیم اور غالباً خواندگی کی نسبت بھی آج کے مقابلے میں زیادہ تھی ، لیکن نشر و اشاعت کے ذرائع اور وسائل محدود ہونے کے باعث کتابوں کی اشاعت ، ان کا حلقہ اور پڑھنے والوں کی تعداد محدود تھی۔ ۱۸۵۷ء کے آس پاس اردو میں شائع ہونے والے اخباروں اور رسالوں کی تعداد اور ان کا تنوع دونوں باتیں حیرت انگیز ہیں۔ اس دور میں برصغیر کی کسی دوسری زبان میں اتنے اخبار اور رسالے شائع نہیں ہوئے۔ مثلاً 'صادق الاخبار' کے نام سے ہی دلی سے کئی اردو اخبار نکلتے تھے۔ مصطفیٰ خان کا 'صادق الاخبار' ۱۸۵۳ء میں نکلا۔ اسی نام کا دوسرا اخبار ۱۸۵۴ء میں جمال الدین خان نے نکالا۔ ۱۸۵۶ء میں ایک اور اخبار اسی نام کا نکلا جس کے مدیر خدا بخش تھے۔ 'سراج الاخبار' جو دلی کا سب سے پرانا اخبار تھا ، ۱۸۵۷ء

تک جاری رہا - مولوی کریم الدین نے ۱۸۴۵ء میں 'کریم الاخبار' نکالا - ۱۸۵۰ء میں لاہور سے منشی ہرسکھ رائے نے ایک اخبار نکالا جو اردو کے پرانے اخباروں میں ایک ممتاز اخبار تھا اور اس نے اس عہد میں بعض ممتاز اخبار نویس پیدا کیے - 'چشمۂ فیض' (سیالکوٹ و لاہور ۱۸۵۷ء) ، 'خورشید عالم' (سیالکوٹ) ، 'ریاض نور' (ملتان ۱۸۵۲ء) ، 'شملہ اخبار' (۱۸۵۰ء اردو زبان دیو ناگری رسم الخط) ، 'گلزار پنجاب' (گوجرانوالہ ۱۸۵۰ء) ، 'مطلع الانوار' (گجرات ۱۸۵۴ء) ، 'عروس بہار' (پشاور ۱۸۵۷ء) ، 'عقائے روزگار' (شملہ ۱۸۵۶ء) ، 'نور علی نور' (لدھیانہ) ، 'باغ نور' (امرت سر) ، 'حکومت ہند' (لاہور) 'صدر الاخبار' ، (آگرہ ۱۸۴۶ء) ، 'اسعد الاخبار' (آگرہ ۱۸۴۷ء) ، 'خطیب الاخبار' (آگرہ ۱۸۴۹ء) ، 'طلسم لکھنؤ' (۱۸۵۶ء) ، 'سحر سامری' (لکھنؤ ۱۸۵۶ء) ، 'اعظم الاخبار' (مدراس ۱۸۴۸ء) ، 'مظہر الاخبار' (مدراس ۱۸۵۶ء) وغیرہ - اس دور کے اخبارات ہیں - ان کے علاوہ بے شمار اخبارات ہیں جن میں سے بعض کا ذکر اور حوالہ دیگر مصنفین کے علاوہ فرانسیسی مصنف گارساں دتاسی نے اپنے خطبات ، مقالات اور تاریخ ادبیات میں دیا ہے - یہ تو اخبار تھے رسالوں کی تعداد بھی کم نہ تھی - 'خیر خواہ ہند' (۱۸۳۷ء) ، 'دہلی قرآن السعدین' ، (دہلی ۱۸۴۵ء) ، 'فوائد الناظرین' ، 'محب ہند' ، 'تحفہ الحدائق' ، 'ہمائے بے بہا' (لاہور ، ۱۸۵۳ء) ، 'معلم ہند' ، (لاہور ، ۱۸۵۴ء) ، 'خورشید پنجاب' (لاہور) ، 'گل رعنا' (دہلی ۱۸۴۵ء) ، بطور نمونہ پیش کیے جا سکتے ہیں - ان کے علاوہ قانونی ، علمی ، ادبی ، مذہبی وغیرہ مختلف نوعیتوں کے رسالے الگ الگ بھی شائع ہوتے تھے[1] -

آہستہ آہستہ اردو کی ترویج و اشاعت سے یہ صورت پیدا ہو رہی تھی کہ تہذیبی اعتبار سے اردو نے فارسی کی جگہ لے لی تھی اور شعر و ادب میں تو اردو شعراء اور مصنفین کو فارسی شعراء سے مقابلہ کرنے کی جرأت بھی ہو گئی تھی - میر و سودا کے عہد میں اردو شاعری کا انداز محض معذرتی نہیں ہے ، بلکہ وہ اپنے کلام کا مقابلہ فارسی کے مسلم الثبوت اساتذہ سے کرتی ہے - لیکن ۱۸۵۷ء کے بعد اردو کو اپنی علمی اور تعلیمی حدود میں وسعت کی ضرورت تھی - یہ کام سر سید اور ان کے رفقا نے انجام دیا -

اردو میں اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے بہت سے عناصر سے کام لیا گیا - ان میں ایک عنصر ان انگریزی الفاظ کا ہے جو ۱۸۵۷ء کے بعد اردو میں داخل ہوئے - یہ خود مختلف نوعیتوں کے الفاظ ہیں ، مثلاً حکومت کی تبدیلی کے اثر سے قدرتی طور پر انتظام ملکی کے سلسلے میں بہت سے نئے الفاظ اور اصطلاحات خواص اور عوام دونوں کی زبان پر آ گئے - مرزا غالب بیچارے نے ایک خط میں دلّی میں مسلمانوں کی بربادی کے سلسلے میں لکھا ہے کہ ایک

---

(۱) ڈاکٹر عبدالسلام خورشید - صحافت پاکستان و ہند میں ۱۹۶۳ء لاہور -

چیز نکلی ہے ۔ یوں ٹوٹی خدا معلوم کیا ہے کہ بغیر جرمانہ ادا کیے کوئی مسلمان شہری شہر میں آباد نہیں ہو سکتا ۔ یہ اصل میں ٹاؤن ڈیوٹی (Town duty) ہے شہر کا ٹیکس ، ڈاک اور ڈاکہ پرانے الفاظ تھے اب ٹکٹ ، اسٹام ، بیرنگ کے الفاظ آ گئے کہ مرزا صاحب کے خطوط میں یہ سب موجود ہیں ۔ پنشن خود انگریزی ہے مرزا صاحب کے یہاں بار بار ملتا ہے اور پھر پنشن کے سلسلے میں اپیل ، مجسٹریٹ ، کلکٹر ، ڈپٹی کلکٹر ۔ جنٹ صاحب ، لاٹ صاحب (Lord) ، سفینہ (Sub-pœna) ، وارنٹ (Warrant) ، جج ، ہائی کورٹ کتنے ہی الفاظ آ گئے نئی طرز حکومت کمپنی سے شروع ہوئی ۔ کمپنی ، ڈائریکٹر ، پارلیمنٹ ۔ ممبر ، بل (Bill) ، بجٹ ، اسپیکر اور پارلیمانی طرز حکومت کی کتنی ہی اصطلاحات اخباروں میں عام طور پر استعمال ہونے لگیں ۔ سر سید کے 'انسٹیٹیوٹ گزٹ' میں (جس کے نام میں دونوں جز انگریزی سے آئے ہیں) اس قسم کے موضوعات پر بہت سے مضامین شائع ہوتے تھے اور انگریزی کے یہ الفاظ اور اصطلاحات بلا تکلف ان میں استعمال ہوتے تھے ۔ اخباروں اور رسالوں کے ناموں میں عام طور پر گزٹ اور پنچ کے لفظ شامل ہو گئے ۔ ایڈیٹر ۔ نوٹ ۔ کالم ، پریس ، لیتھو ، سنکڑوں لفظ صحافت کے راستے سے اردو میں آئے ۔ نئی ایجادات اور مغربی درآمد شدہ مال اپنے ساتھ اشیاء کے نام لائے ۔ ایک ریل کی ایجاد کے سلسلے میں ریل ، اسٹیشن ، ٹکٹ ، ٹکٹ کلکٹر ، سگنل ، انجن جیسے الفاظ خاص و عام کی زبان پر چڑھ گئے ۔ لباس ، وضع قطع ، تراش خراش میں بھی اس طرح کے الفاظ بکثرت آ گئے ۔ کوٹ ، پتلون ، کالر ، بٹن ، بوٹ ، ہوٹل ، بیرا ، اسپتال ، ڈاکٹر ، کالج ، اسٹاف ، یونیورسٹی ، ٹرسٹی ، کالج یونین ، ہوسٹل ، ڈگری کتنے ہی الفاظ جو جدید طریقۂ تعلیم کی بدولت عام ہوئے ۔ یہ ایسے الفاظ تھے جو صرف علمی تحریروں تک محدود نہ تھے ، بلکہ زبان میں اس طرح دخیل ہوئے کہ ان میں سے اکثر آج تک اسی طرح استعمال ہوتے ہیں جس طرح سر سید اور ان کے عہد کے دوسرے لوگوں کے یہاں استعمال ہوتے تھے اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے ۔

اردو زبان میں موضوعات کی وسعت اور تنوع نے اردو کی کتابی ، ادبی اور علمی زبان پر بھی اسی طرح اثر کیا ، مثلاً تنقید ہی کو لے لیجیے ۔ مولانا حالی کے 'مقدمہ شعر و شاعری' پوئٹری امیجینشن (Poetry ، imagination) ، کرٹی سزم (Criticism) ۔ ہائر کرٹی سزم (Higher Criticism) ، بائیو گرافی (Biography) ، ورس (Verse) لٹریچر ، لٹریری قسم کے بہت سے الفاظ آ گئے ۔ لیکن اس قسم کے الفاظ زبان میں دخیل نہ ہو سکے ۔ مستعار رہے اور ان کی جگہ اردو نے اپنے لفاظ متعین کر لیے ۔ اصناف ادب میں ناول (Novel) ، ڈرامہ (Drama) ، ہیرو (Hero) ، تھیٹر (Theatre) ، تھیٹر کے سلسلے میں ایکٹر (Actor) ، ہیرو (Hero) ، سین (Scene) ، سینری (Scenery) ، ڈراپ سین (Drop Scene) وغیرہ الفاظ بھی اسی قبیل کے ہیں کہ ان میں سے بعض باقی رہ گئے اور دخیل بن گئے ، بعض ترک ہو گئے اور ان کی جگہ نئے لفظ آ گئے ۔ مثلاً ایکٹر کے لیے اداکار ، سین کے لیے منظر ، ڈائرکٹر کے لیے ہدایت کار وغیرہ

لیسے الفاظ ہیں جو نسبتاً بعد کے دور میں ملتے ہیں ۔

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے جدید علوم و فنون کی اشاعت کے سلسلہ میں بہت سے نئے الفاظ اور اصطلاحات بھی اردو میں آئیں ۔ دلی میں دلی کالج اور اس کے اساتذہ کی بدولت یہ کام ۱۸۵۷ء سے پہلے شروع ہوا تھا اور دلی کی سوسائٹی یہ کام کرتی ہے ۔ سر سید نے اس مفید کام کو آگے بڑھایا اور سائنٹفک سوسائٹی کے نام سے ایک ادارہ کی بناء ڈالی ۔ سوسائٹی کا نام ہی انگریزی ہے ۔ اس سوسائٹی نے اردو کے ذریعہ سے جدید علوم و فنون کی ترویج و اشاعت کا بیڑا اٹھایا اور بہت سی علمی کتابیں شائع کیں ۔ سر سید کو اس کام سے اس قدر دلچسپی تھی کہ جس زمانے میں وہ انگلستان گئے ہوئے تھے وہاں سے محسن الملک کے نام ایک خط میں انہوں نے بڑے دکھ سے اس مایوسی کا اظہار کیا تھا کہ قوم سے ان کو جو توقعات اس سلسلے میں تھیں وہ پوری نہیں ہوئیں اور اسی لیے سوسائٹی کا کام بڑی سست رفتار سے جاری رہا اور بالآخر ختم ہو گیا ۔ اسی زمانے میں سر سید احمد خان نے ورنیکولر یونیورسٹی کی سکیم سید محمود کی مدد سے تیار کی تھی ۔ اس ترکیب سے ہی انگریزی کے اثرات ظاہر ہوتے ہیں ۔ افسوس یہ ہے کہ بعض مجبوریوں کی بناء پر اس وقت یہ اسکیم پروان نہ چڑھ سکی ، لیکن بیسویں صدی کے نصف اول میں ہی سر سید کے پوتے راس مسعود کی کوشش سے حیدر آباد میں جامعہ عثمانیہ کے قیام سے یہ خواب پورا ہو گیا ۔ لیکن یہ ایک الگ داستان ہے اور اس وقت ہمارے موضوع سے خارج ہے ۔

تحریکِ سر سید کا اثر صرف ان کے رفقاء یا علی گڑھ کے مرکز تک محدود نہ تھا ۔ برصغیر کے ہر حصے میں اس طرح کا کچھ نہ کچھ کام شروع ہو گیا ۔ بہار میں اسی طرح کی ایک انجمن قائم ہوئی ۔ اس کا ذکر گارساں دتاسی نے بار بار اپنے مقالات اور خطبات میں کیا ہے ۔ ان انجمنوں میں سب سے اہم 'انجمنِ پنجاب' ہے جس کی تاسیس اور ترقی کا سہرا ڈاکٹر لائٹنر (Dr. Leitner) کے سر ہے ۔ ڈاکٹر لائٹنر نومبر ۱۸۶۴ء میں گورنمنٹ کالج لاہور کے پرانسپل مقرر ہوئے ۔ چند سال بعد ڈاکٹر لائٹنر کے علمی کارناموں کے بارے میں (Vienna Universal Exibition of 1873) کے سلسلے میں جو لاء رپورٹ برطانوی پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں میں پیش کی گئی تھی اس میں ڈاکٹر لائٹنر کے یہ خیالات ۱۸۶۴ء کے تعلیمی حالات کے بارے میں بیان کیے گئے ہیں :

> "He describes the government educational system as having little real hold on the people, who in sullen silence felt themselves to be disregarded, and their acnient civilization despised".

Dardistan ER. G. W. Lietner Government Central Book Dept. Lahore 1877. (۱)
Appendix p 1.

"وہ (ڈاکٹر لائٹنر) سرکاری نظامِ تعلیم کے بارے میں یہ رائے ظاہر کرتے ہیں کہ اس کا لوگوں پر بالکل اثر و نفوذ نہیں، جو ایک تلخ خاموشی سے یہ محسوس کرتے ہیں کہ ان کو نظر انداز کیا جاتا ہے اور ان کی قدیم تہذیب سے نفرت کی جاتی ہے"۔

لائٹنر پر اس کا ردِ عمل یہ ہوا کہ انھوں نے تعلیم کی اصلاح اور قدیم تہذیبی اقدار کے تحفظ کی خاطر 'انجمنِ پنجاب' قائم کی۔ انجمن کے ممبر تعلیمی، علمی اور ادبی موضوعات پر آزادی سے گفتگو کرتے تھے اور تعلیم، زبان و ادب کی اصلاح کے لیے کوشش کرتے تھے۔ انجمن اپنا ایک اخبار بھی نکالتی تھی جس میں انجمن کے جلسوں میں پڑھے جانے والے مضامین و مقالات بھی شائع ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ انجمن نے اردو میں نئے طرز کے مشاعروں کی بھی بنیاد ڈالی، جن کا مقصد محض تفریح یا شعراء کے لیے مقابلہ کا سامان بہم پہنچانا نہ تھا۔ اس میں مشاعروں کے رائج انداز کی بجائے جہاں ایک مصرعۂ طرح دیا جاتا تھا اور شعراء اسی پر طبع آزمائی کرتے تھے۔ مولانا محمد حسین آزاد اور حالی بھی اس وقت لاہور میں تھے اور انہوں نے بھی ان مشاعروں کے لیے نظمیں کہی ہیں۔ ان میں سے بعض موضوعات ایسے تھے جن پر پہلے بھی اردو میں نظمیں موجود نہیں، لیکن ان جدید نظموں کا انداز قدیم طرز کی شاعری سے مختلف تھا۔ شعراء حقیقت نگاری کی طرف زیادہ توجہ کرتے تھے اور حتی الامکان مبالغہ سے پرہیز کرتے تھے۔ زبان و بیان میں بھی تکلّف، تصنّع اور آورد کی جگہ سادگی، سلاست اور صفائیِ گفتگو پر زور دیتے تھے۔ یہی وہ عناصر تھے جن سے اردو شاعری میں ایک سادہ اور آسان ادبی اسلوب کی نئی روایت قائم ہوئی۔ انجمن کا حلقۂ اثر صرف لاہور یا پنجاب تک محدود نہ تھا۔ دور تک اس تحریک سے دلچسپی پیدا ہوگئی مثلاً، مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی جو ان مشاعروں میں شریک نہ تھے انہوں نے بھی ان مشاعروں کے لیے نظمیں کہی ہیں۔ ایک حد تک یہ کہنا درست ہے کہ اردو میں جدید شاعری کا دور 'انجمنِ پنجاب' کی تحریک کا مرہونِ منت ہے۔

لاہور میں بھی اسی زمانے میں ایک اور ادارہ تھا جس نے قابلِ قدر خدمات انجام دیں۔ یہ لاہور کا سرکاری بک ڈپو تھا۔ ڈاکٹر لائٹنر کی کتاب 'دردستان' جس میں اس علاقہ میں آباد لوگوں اور ان کی زبان کے بارے میں تحقیق کی گئی ہے اسی بک ڈپو سے ۱۸۷۷ء میں شائع ہوئی تھی۔ گمان ہے کہ اس بک ڈپو میں جملہ سرکاری مطبوعات طبع ہوتی تھیں، لیکن یہ صرف ایک طباعت خانہ نہ تھا۔ مولانا حالی کچھ عرصہ تک اس بک ڈپو میں ملازم رہے تھے اور ان کے سپرد یہ کام تھا کہ انگریزی سے جو مضامین اردو میں ترجمہ ہوں وہ ان کی عبارت درست کر دیا کریں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ادارہ میں بعض انگریزی مضامین اور کتابوں کے ترجمے بھی شائع ہوتے تھے اور ان ترجموں کی زبان اور بیان پر اصلاح کی طرف بھی توجہ دی جاتی

تھی۔ حالی جو انگریزی سے براہِ راست واقف نہیں تھے اسی زمانہ میں ان ترجموں کے ذریعہ مغربی خیالات سے آشنا ہوئے اور خاص طور پر ان کے 'مقدمہ' شعر و شاعری' میں یہ اثرات واضح طور پر ملتے ہیں۔ مولانا محمد حسین آزاد پر بھی یہ اثرات شاعری کے بارے میں ان کے اس مقالے میں نظر آتے ہیں۔ جو اردو شاعری کے سلسلہ میں انجمن کے جلسہ میں پڑھا گیا تھا اور اس کے بعض مضامین کا 'نیرنگِ خیال' میں واضح طور پر سراغ ملتا ہے۔ اس طرح صرف چند انگریزی الفاظ ہی ان حضرات کی بدولت اردو میں شامل نہیں ہوئے، بلکہ ایک نیا نقطۂ نظر زبان اور اسلوب کے بارے میں بھی پیدا ہو گیا۔ اس اسلوب کو انگریزی کی صاف گوئی کا اثر سمجھنا چاہیے اور اس نے زبان کے مزاج، اس کے ذخیرۂ الفاظ و تراکیب اور اندازِ بیان میں وسعت پیدا کی۔ افسوس یہ ہے کہ اس لک ڈیو کے بارے میں ہماری معلومات نہایت محدود ہیں اور اب اس کے کارناموں پر گمنامی کا پردہ پڑ چکا ہے۔ تلاش کے باوجود لک ڈیو کی اردو مطبوعات اب دستیاب نہیں ہوئیں۔

اس دور میں برصغیر پاک و ہند میں جدید علوم کے رواج کے سلسلے میں کسی غلط فہمی کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔ اول تو یہ کہ جدید علوم و فنون کا جو تصور، نوعیت، تقسیم، طریقۂ مطالعہ، موضوعات و مباحث ہیں وہ آج سے ایک صدی قبل کے تصورات سے بالکل مختلف ہیں بہت سے علومِ جدیدہ جو بیسویں صدی کے علوم ہیں ابھی پیدا بھی نہیں ہوئے تھے اور جو موجود تھے وہ دورِ جدید کے سائنسی نقطۂ نظر کے دور میں داخل نہیں ہوئے تھے۔ ڈاکٹر لائٹنر کے سلسلہ میں ۱۸۷۳ء میں برطانوی پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں میں پیش ہونے والی جس رپورٹ کا ابھی حوالہ دیا گیا اسی میں یہ عبارت موجود ہے:

"There was, indeed, we are told, a system of so-called English education, consisting chiefly of instruction in Mathematics and random or fragmentary selections of more or less known authors. One of the Courses contained portions of Mr. Dixox's Life of Bacon, "Pescott's Essay on Chateaubriand's Essay on Milton," Campbell's, Rhetoric' and Rogers' "Italy" as a curriculum of English Literature for advanced students; whilst in mental philosophy, Abercrombie; in history, a few notices of the history of the Jews, and of Rome or Greece, were deemeds ufficient. [1]

---

1. Dardistan—Aypendix yage 1.

ظاہر ہے یہ تعلیم نہ مشرقی تھی نہ مغربی ، اس کی اصلاح کے لیے ضروری تھا کہ تعلیمات و تدریس کے سلسلہ میں ایک طرف ان تمام علوم و فنون کو شامل نصاب کیا جائے جن کو جدید علوم و فنون کہا جاتا تھا اور دوسری طرف مشرقی علوم اور مشرقی زبانوں کی تعلیم و تدریس کے لیے ذرائع اور وسائل اختیار کیے جائیں ۔ انہیں کوششوں کے نتیجہ میں انجمن پنجاب قائم ہوئی اور لاہور میں اورینٹل کالج کی بنیاد رکھی گئی ، جو پنجاب یونیورسٹی کی تشکیل کا پہلا قدم تھا ۔ اس سلسلہ میں سرسیّد اور ان کے رفقا نے بعد میں کوشش کر کے ان تجاویز کا دائرہ وسیع کیا چنانچہ علی گڑھ میں ایک مدرسہ بعد میں کالج اور بالآخر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اس تحریک کی پیداوار ہیں ۔

اس سلسلہ میں سب سے اہم مسئلہ جدید علوم و فنون کے لیے نئی اصطلاحات کا تھا ۔ اس کا آغاز دلّی کالج میں ہو چکا تھا اور دلّی کالج کے کارکنوں نے اپنے ترجموں میں اصطلاحات کے استعمال کے لیے واضح اصول مرتب کر لیے تھے ۔ اور کم و بیش یہی اصول اس دور میں بھی قبول کر لیے گئے ۔ اصطلاحوں میں بعض اصطلاحیں خود انگریزی میں یونانی اور لاطینی سے لی گئی ہیں ۔ نئی اصطلاحوں کے بنانے میں انگریزی نے یونانی اور لاطینی کے بنیادی مادوں اور سابقوں اور لاحقوں سے مدد لی تھی ۔ اور یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے ۔ اس قسم کی بین الاقوامی اصطلاحوں کا ترجمہ ضروری نہیں ہوتا ۔ اس لیے ان کو اردو میں بھی بجنسہ قبول کرنے کی سفارش کی گئی ۔ مثلاً آکسیجن یا ہائیڈروجن کا اردو میں کیا ترجمہ کیا جائے ؟ البتہ اردو میں سابقے اور لاحقے یونانی یا لاطینی سے لانے کی بجائے ان زبانوں سے لینا ضروری تھے جن سے اردو کا رابطہ اور رشتہ قریبی تھا ۔ اور جن کے الفاظ اردو میں موجود تھے ۔ اردو آریائی نسل کی زبان ہونے کے باعث ایک طرف سنسکرت ، وسط ہند آریائی پراکرتوں ، جدید ہند آریائی زبانوں اور بولیوں کے عناصر قبول کر چکی تھی ، دوسری طرف مسلمانوں کے ساتھ عربی ، ترکی ، فارسی ، الفاظ اور عناصر بھی اس میں شامل ہو گئے تھے ۔ فارسی تو خود آریائی نسل کی زبان تھی اور جغرافیائی قرب ، نیز سیاسی اور تہذیبی روابط کی وجہ سے مسلمانوں کے دور حکومت میں فارسی کے بہت سے عناصر بھی اردو میں شامل ہو گئے تھے اور بالخصوص ادبی اور علمی زبان میں تو ان عناصر کی فراوانی تھی ۔ ترکی عناصر نسبتاً محدود تھے لیکن عربی کے عناصر کا بھی نفوذ خاصا تھا ۔ اول تو عربی مسلمانوں کے لیے قرآن حکیم ، احادیث اور اسلامی لٹریچر کی بنیاد تھی اور ان علوم کی تحصیل بغیر عربی کی تحصیل کے ممکن نہ تھی اور دوسرے عربی کے بہت سے عناصر خود فارسی میں اس قدر نفوذ کر چکے تھے کہ فارسی کا جزو بن گئے تھے اور فارسی کے ساتھ اردو میں آئے ۔ عربی سامی خاندان کی زبان تھی اور اس کی ساخت میں لسانی اعتبار سے سامی خصوصیات تھیں لیکن ان میں سے بعض عناصر ترکیبی اردو اور فارسی دونوں نے قبول کر لیے تھے ۔ عربی اور فارسی میں علوم قدیمہ کے ذخیرہ موجود تھے ۔ یہ زبانیں علمی زبانوں کی حیثیت سے صدیوں

سے رائج تھیں ۔ علمی زبانوں کی اصطلاحی زبان اور اصطلاحات اور ایک علمی اسلوب بیان میں پیدا ہوگیا تھا ۔ دیسی زبانوں میں اس وقت کوئی ایسی زبان نہ تھی جس میں کوئی قابل ذکر ادبی یا علمی ذخیرہ ہوتا ۔ اس لیے اردو میں نئے اضافوں کے لیے سوائے عربی اور فارسی کے عناصر سے مدد لینے کے اور کوئی چارہ نہ تھا ۔ اصطلاح سازی کے لیے بلا تکلف ان الفاظ کو قبول کر لیا گیا جو دیسی زبانوں میں مل سکتے تھے ۔ نئے عناصر کی تلاش میں فارسی اور عربی بالخصوص سابقوں اور لاحقوں اور عربی اوزان سے پورا پورا فائدہ اٹھایا گیا ۔ اس طرح اگرچہ مسلمانوں کی حکومت کے خاتمہ نے عربی اور فارسی کی سرکاری اور تہذیبی حیثیت کو ضعف پہنچایا لیکن اس کی علمی اور فنّی ضروریات نے نہ صرف اس کو برقرار رکھا بلکہ اردو کی ارتقاء کے لیے اسے ناگزیر سمجھا گیا لیکن اس دور کے مصنفین و مترجمین نے اس کا پورا لحاظ رکھا ہے کہ عربی فارسی کے مزاج کے مطابق ہوں اس لیے ان پر یہ اعتراض نہیں ہوتا جو بعد کے اصطلاح سازوں پر بالخصوص دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ حیدر آباد پر ہوتا ہے کہ وہ عربی کے نامانوس اور ثقیل مرکبات کو اردو میں رائج کرنا چاہتے ہے جو اردو قبول نہیں کر سکتی ۔ اسی سلسلہ میں ایک مسئلہ یہ تھا کہ مرکبات میں صرف ہم جنس عناصر کو مرکب کیا جائے ، یعنی فارسی کے ساتھ فارسی اور عربی کے ساتھ عربی اور ہندی اور فارسی کے مرکب کو قبول نہ کیا جائے ۔ بعض مصنفین نے اس کی کوشش کی ہے لیکن یہ بھی اردو کے مزاج کے خلاف ہے ۔ اس لیے بکثرت ایسی تراکیب اور اصطلاحات موجود ہیں جو مختلف النسل اور مختلف الاصل زبانوں کے عناصر سے ترکیب پاتی ہیں ۔ انگریزی عناصر کے سلسلے میں اصطلاح سازی میں تو ان کی ترتیب و ترکیب زیادہ نظر نہیں آتی لیکن ادبی زبان ، تہذیبی اور سماجی امور کی بحثوں میں انگریزی الفاظ بکثرت داخل ہوئے ہیں ۔ سرسیّد اور ان کے معاصرین کے یہاں سوشل ، پولیٹیکل ، اسپچ ، رفارمر ریفارم ، اسٹیج ، پلیٹ فارم ، روز لیوشن ، الیکشن ، ووٹ ، بجٹ ، سکریٹری ، کمیٹی ، کالج ، کونسل ، ممبر ، یونین ، ٹرسٹی ، بل ، اسکول ، یونیورسٹی ، پرنسپل ، ماسٹر ، ہوٹل ، ٹفن ، بگھی ، پریس ، مشین ، کانفرنس ، لیجسلیٹو کونسل ، بورڈ ، ڈائرکٹر ، لیگ ، کانگریس ، ورل ، کانشنس ، سولیزیشن ، سولائزڈ ، ان سو یلائزڈ ، پبلک لا (Law) پرسنل لا (Personal Law) کورٹ ، ہائی کورٹ ، جج ، بیرسٹر ، سول سروس ، نیچر ، لا آف نیچر (Law of Nature) نیچرل ، نیچرل پوئٹری ، نیچرل فلاسفی ، ڈاکٹر آف لاز (Doctor of Laws) ایکٹ ، جیوری ، وغیرہ بے شمار الفاظ ہیں جو سرسیّد اور ان کے رفقا کی تحریروں میں ملتے ہیں ۔ ان میں سے اکثر اکبر الہ آبادی کے یہاں بھی ملتے ہیں اگرچہ انھوں نے اکثر انگریزی الفاظ کا استعمال محض طنز یا مزاح پیدا کرنے کے لیے کیا ہے لیکن اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اردو بولنے اور پڑھنے والے ان الفاظ سے متعارف اور آشنا ہو چکے تھے ۔

الفاظ اور اصطلاحات کا ایک سلسلہ ایسے لغات پر مشتمل ہے جن کو ان نئے حالات میں نئے اور مخصوص معنی دیے گئے ، ایسے الفاظ زبان میں پہلے سے موجود تھے لیکن اب ان کو

مخصوص معنوں میں استعمال کیا گیا ۔ مثلاً قوم کا لفظ انگریزی کے (Nation) کے مترادف کے طور پر باقاعدہ پہلی مرتبہ سر سید کی تحریروں میں ملتا ہے ۔ پھر حالی ، نذیر احمد ، آزاد ، شبلی اور ان کے معاصرین کے یہاں اس کی مثالیں عام ہیں ۔ جلسہ کا تصور اردو میں باضابطہ (Meeting) کے معنوں میں مخصوص نہ تھا ۔ اندر سبھا اور دوسری سبھاؤں کو بھی جلسہ کہتے تھے ۔ ناچ گانے کی محفل بھی جلسہ تھی ۔ اب جلسہ ایسی مجلس کے لیے مخصوص ہو گیا جس میں کسی مسئلہ پر غور و فکر کے لیے چند لوگ جمع ہوں سماج کا لفظ بھی جن معنوں میں آج مستعمل ہے اسی زمانے میں اردو میں آیا ۔ فن کا لفظ (Art) کے مترادف اس کی ایک اور مثال ہے ۔ مضمون کا لفظ (Essay) کے معنوں میں مضامین تہذیب الاخلاق نے رائج کیا اور ایک مخصوص نثری صنفِ ادب میں ناول اور افسانے کی صنف کا رواج ہوا ۔ ناول اپنے ساتھ اپنا نام اور بعض دوسری اصطلاحات مثلاً پلاٹ ، میں لایا ۔ افسانہ بعض کہانی یا خیالی قصے کے معنوں میں استعمال ہوتا تھا اردو میں افسانہ (Short Story) کے لیے مخصوص ہو گیا ۔ تہذیب (Civilization) کے لیے اختیار ہوا ۔ تجویز (Resolution) کے لیے ۔ سر سید کے رفقاء میں ترجمہ کرنے والوں میں سب سے ممتاز نام مولوی نذیر احمد کا ہے ۔ ان کے کمال کا ایک نمونہ ان کے قانونی کتب کا ترجمہ ہے ۔ ضابطہ فوجداری اور اس کی مختلف دفعات کے ترجمے میں مولوی نذیر احمد نے اپنی زبان دانی اور زبان کی مزاج شناسی کا بڑا اچھا ثبوت دیا ہے ۔

ہر تحریر میں اسلوب کا دار و مدار بڑی حد تک تحریر کے موضوع پر ہوتا ہے ۔ اس دور میں جب انگریزی سے مختلف قسم کے موضوعات کا ترجمہ ہونے لگا تو قدرتی طور پر ترجمہ کرنے والوں کو نئے اسالیب کی راہ بھی نظر آئی ۔ 'مقدمہ' شعر و شاعری' کے بعض حصے ، 'سر سید کے مضامین' ، 'تہذیب الاخلاق' مولانا آزاد کے مضامین ، 'نیرنگِ خیال' بعض موضوعات کی جدت و ندرت ہی کی وجہ سے اہم نہیں ۔ ان کے ساتھ نئے اسالیب کے نمونے ملتے ہیں ۔ اس سے پہلے اردو نثر میں فارسی کی پر تکلف نثر کی تقلید میں ویسا ہی اسلوبِ نگارش مقبول تھا ۔ یہی وجہ ہے کہ میر امن کی سادہ اور پر تکلف نثر کا مرزا رجب علی بیگ سرور نے بھی مذاق اڑایا ہے ۔ غالب کے خطوط سے قطع نظر کیجیے تو خود مرزا صاحب اپنی تقریظوں اور دیباچوں میں وہی پر تکلف انداز اختیار کرتے ہیں ۔ صہبائی کا انداز وہی تھا جو سر سید کی 'آثار الصنادید' کے پہلے ایڈیشن میں ہے ۔ اس اسلوب کے مقابلے میں اب جو انداز مقبول ہوا اس کی بنیاد ، سلاست بیان اور سادگی پر تھی ۔ تحریر کا مقصد سر سید کے بقول یہ تھا کہ ''بات دل سے نکلے اور دل میں اترے'' ، اس لیے بیان میں بعض نحوی تبدیلیاں بھی ہوئیں ۔ اضافتوں کا خاص طور پر فارسی کی اضافتوں کا استعمال کم ہو گیا ۔ طویل جملوں اور فقروں کی جگہ مختصر جملوں اور فقروں نے لے لی اور اس بات کی کوشش ہونے لگی کہ اجزائے کلام کی ترتیب ، و ترکیب تحریر میں بول چال کے مطابق ہو ۔ اردو نثر کے قدیم اسلوب کو 'منشیانِ ہند' کا اسلوب کہہ سکتے ہیں ۔ اب اس کا زور

کم ہوا اور ایک منطقی اور سادہ نثر کا دور شروع ہوا جس کی بہترین مثالیں سر سید اور حالی کے یہاں ملتی ہیں ۔ شبلی کے یہاں عربی فارسی کا اثر سر سید اور حالی سے کچھ زیادہ ملتا ہے ۔ ایک تو یہ افتادِ طبع کا نتیجہ ہے کہ شبلی کے مزاج میں فارسی کا ستھرا مذاق رچا بسا ہوا ہے اور دوسرے سر سید و حالی کے مقابلے میں، انہوں نے عربی اور فارسی کی تحصیل کی طرف توجہ بھی زیادہ کی تھی ۔ اسی لیے وہ اکثر انگریزی الفاظ کے ساتھ قوسین میں مترادف اردو یا فارسی لفظ بھی لکھ دیتے ہیں ۔ لیکن یہ اثر مولانا آزاد کے یہاں اور بھی زیادہ نمایاں ہے ۔ یہ بھی مزاج کی بات ہے ۔ مولانا محمد حسین آزاد بنیادی طور پر انشا پرداز ہیں اور اپنی انشا پردازی میں زورِ بیان اور رنگینی و رعنائی پر زیادہ توجہ صرف کرتے ہیں ۔ آزاد اور نذیر احمد دونوں نے دلّی کالج میں تعلیم پائی تھی لیکن دونوں پر عربی فارسی کا اثر قائم اور باقی رہتا ہے نذیر احمد یوں تو دلّی کی صاف اور سادہ اور با محاورہ زبان لکھنے کے استاد ہیں لیکن بقول اپنے ایک نقاد کے وہ اپنی اس صاف اور با محاورہ اردو میں عربی فارسی کے روڑے ہی نہیں بچھاتے بلکہ پہاڑ کھڑے کر دیتے ہیں . . . یہ صورت صرف چند عربی فارسی الفاظ کے استعمال تک محدود نہیں رہتی ۔ وہ عربی کے پورے کے پورے فقرے نقل کر دیتے ہیں ۔ آزاد کے یہاں یہ شدت فارسی تراکیب کی ہے ، لیکن یہ مثالیں انفرادی مزاج اور پسند کی ہیں ۔ عام مسلک اس دور کا وہی ہو گیا تھا جو سر سید کا اسلوب کہلاتا ہے ۔ اس نئے اسلوب نے تحریر کا اصلی مقصد واضح کیا ۔ ہمارے یہاں پرانے ادیبوں اور انشا پردازوں کی توجہ زیادہ تر اپنی زبان دانی کے اظہار اور ندرتِ اسلوب پر صرف ہوتی تھی ۔ ملا وجہی کی 'سب رس' سے لے کر سودا کے دیباچہ تک نثر نگاری کا مقصد ایک طرزِ خاص کا اظہار تھا ۔ ان تحریروں میں موضوع کی اہمیت ثانوی تھی اور ابلاغ تو اس میں محض ضمنی حیثیت رکھتا تھا ۔ یہ اسلوب قصے کہانیوں کے لیے تو ساتھ دے سکتا ہے لیکن خالص علمی مباحث میں تو صرف دو ہی مقاصد تحریر کے ہو سکتے ہیں اول موضوع اور دوسرے اس کا زیادہ سے زیادہ مکمل ابلاغ ۔ پہلے قسم کا اسلوب ذاتی ، تاثراتی ، روائتی اور تقلیدی ہے ۔ دوسرا اسلوب معروضی ، تجزیاتی اور تجرباتی ہے ۔ سر سید اور حالی نے اسی دوسرے قسم کے اسلوب کو اختیار کیا تھا ۔ جو لوگ روائتی اسلوب کو ہی اسلوب سمجھتے ہیں ان میں سے بعض کا خیال ہے کہ سر سید کا کوئی اسلوب یا اسٹائل نہیں ہے اور اسی طرح بعض حضرات کے خیال میں حالی کا اسلوب بالکل سپاٹ ہے ۔ یہ احساس ان حضرات کا ہے جو اسلوب کی معروضی حیثیت اور اہمیت محسوس نہیں کرتے ۔ علمی اسلوب کی ایک شرط ہی اس کا معروضی ہونا ہوتا ہے اور معروضیت صاف اور سادہ اسلوب میں ہی حاصل ہو سکتی ہے ۔ یہی اسلوب مقصدی ادب کا اسلوب بن سکتا ہے جو سر سید اور ان کے رفقاء کے پیش نظر تھا ۔ شعر و شاعری اور زبان و ادب کو سر سید اور ان کے رفقاء کے نظریات کے مطابق قومی اور معاشرتی اصلاح کا ایک ذریعہ اور وسیلہ ہونا چاہیے ۔ یہی ادب کا اصلی مقصد ہونا چاہیے ۔ ادب کی بنیاد تخیل یا محض جذبات پر رکھنا ادب کو اس کے ایک اہم فریضہ سے محروم کر دینا ہے ۔ زبان جو انسان کے خیالات کے اظہار اور دوسروں تک اس کے

ابلاغ کا سب سے مؤثر ذریعہ ہے ، محض شاعری یا داستانوں کی زبان نہیں ہے ۔ زبان کا دائرۂ عمل وسیع اور لا محدود ہے ۔ اس معروضی اسلوب کے اختیار کرنے اور رواج دینے کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ مصنفین اور شعراء کی توجہ جو اسلوب کے جمالی پہلو کی تزئین پر صرف ہوتی تھی اب تلاش مضمون پر صرف ہونے لگی ۔ اس سے نئے موضوعات کی راہ نظر آئی اور یہی وجہ ہے کہ تھوڑے دنوں میں تاریخی ، علمی ، تہذیبی ، سیاسی ، سماجی اور فکری موضوعات پر بکثرت کتابیں اور مضامین لکھے جانے لگے ۔

اردو زبان کی تاریخ اور اس کے قواعد صرف و نحو پر اردو کے شعراء اور مصنفین کی توجہ پہلے بھی تھی اور بعض حوالوں سے پتہ چلتا ہے کہ انیسویں صدی کے آغاز سے اردو کی قواعد نویسی پر مغربی مصنفین کے علاوہ خود اہل زبان نے بھی طبع آزمائی کی تھی ۔ انشاء اللہ خاں انشاء کی 'دریائے لطافت' اس سلسلہ کی ایک اہم کڑی ہے ۔ اس تصنیف کو زیادہ عرصہ گزرا تھا کہ روشن علی انصاری نے سنہ ۱۸۱۰ء میں رسالہ صرف و نحو کے نام سے ایک رسالہ تصنیف کیا ۔ یہ ایک مختصر رسالہ ہے اور اس میں اردو کے صرف و نحو سے بحث کی گئی ہے ۔ اس پوری بحث میں فارسی کے قواعد نویسوں کا اتباع کیا گیا ہے اور اسی زمانے میں بہادر علی حسینی نے گل کرسٹ کے رسالہ قواعد اردو کو اردو میں منتقل کیا ۔ ایک اور مصنف محمد ابراہیم بھی جنہوں نے سنہ ۱۸۲۳ء میں قواعد اردو لکھی ۔ مولوی عبدالحق صاحب[1] لکھتے ہیں کہ سر سید احمد خان نے بھی اردو صرف و نحو پر ایک رسالہ لکھا تھا جس کا قلمی نسخہ اسلامیہ ہائی سکول اٹاوہ کے کتب خانہ میں موجود تھا اور کاتب نے کتاب کے آخر میں سنہ کتابت ۱۲۵٦ھ مطابق سنہ ۱۸۴۰ء تحریر کیا تھا اس لیے قیاس ہے کہ یہ رسالہ قریب قریب اسی زمانے میں تصنیف ہوا ہوگا ۔ مولوی صاحب کا بیان ہے کہ اس میں صرف و نحو کے معمولی قواعد ہیں اور زیادہ تر مصادر سے ترملا بحث کی گئی ہے اور اسی وجہ سے مولوی صاحب اس کو زیادہ قابلِ اعتنا نہیں سمجھتے ، سوائے اس کے کہ بقول ان کے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ سر سید کو اردو زبان سے کس قدر دلچسپی تھی ۔ معلوم نہیں اس رسالہ کے لکھنے سے سر سید احمد خان کا مقصد کیا تھا ۔ اگر وہ طالب علموں کی تدریس کے لیے لکھا گیا ہوتا تو سر سید اسے ضرور طبع کراتے ۔ شاید اس کا مقصد یہ تھا کہ وہ اردو زبان کی صحت کے لیے خود اہلِ زبان کے لیے قواعد کا مطالعہ ضروری سمجھتے تھے ۔ اردو کی قواعد کا ڈھانچہ فارسی قواعد کے انداز پر تیار ہوا تھا ۔ جب تک فارسی کا رواج عام رہا لوگ قواعد کی اصطلاحات اور تشریحات سے ایک حد تک واقف رہے ۔ فارسی کا رواج ختم ہوا تو صحتِ زبان کا ایک

---

(۱) مولوی عبدالحق ، قواعد اردو ص ۲٦ ۔

پہاں ختم ہو گیا اور اسی لیے اردو میں درس و تدریس میں قواعد کے مطالعہ کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔

سر سید کی قواعد کی تصنیف کے تین چار سال بعد مولوی احمد علی دہلوی نے 'چشمۂ فیض' کے نام سے ایک رسالہ قواعد صرف و نحو اردو پر لکھا جو سنہ ۱۸۵۵ء میں دہلی سے شائع ہوا۔ یہ بھی ایک معمولی سا مختصر رسالہ ہے اور طالب علموں کے لیے لکھا گیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مدارس اور مکتبوں میں اردو زبان کی تعلیم کے سلسلہ میں قواعد کی تعلیم بھی شامل ہو چکی تھی۔ اسی زمانے میں اس عہد کے مشہور عالم اور شاعر اور مصنف مولوی امام بخش صہبائی نے جو دلی کالج میں پروفیسر بھی تھے اردو صرف و نحو پر ایک کتاب لکھی تھی۔ مولوی عبدالحق صاحب[1] اس کا سنہ تصنیف ۱۸۴۹ء بتاتے ہیں لیکن گارساں دتاسی نے سنہ ۱۸۵۵ء بتایا ہے اور اس کی پوری تفصیلات بھی دی ہیں، جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ قواعدِ صہبائی کا نسخہ اس کے پیش نظر تھا۔ صہبائی نے 'حدایق البلاغت' کے نام سے عروض پر بھی ایک رسالہ مرتب کیا تھا۔ گارساں دتاسی کے بقول صہبائی کی قواعد کے نسخے مطبوعہ ۱۹۴۵ء میں دو سو اٹھانوے صفحات تھے اور اس کا عنوان بقول گارساں

A Grammar of the Urdu language in Urdu by Maulvi Imam Bakhsh of Delhi College.

تھا۔ گارساں کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کے تیسرے باب میں الفاظ اور چوتھے میں محاورات اور ضرب المثال سے بحث کی گئی تھی۔ اس بیان کے پیش نظر صہبائی کی قواعد کی عام کتابوں کے مقابلے میں موضوعات زیادہ تھے جو بالعموم قواعد صرف و نحو کا حصہ نہیں سمجھے جاتے۔ گارساں نے صہبائی کی ایک اور قواعد کا رسالہ جس میں اردو کے حروف تہجی سے بحث کی گئی ہے اور غالباً یہ رسالہ دلی کالج کے طالب علموں کی تعلیم و تدریس کے لیے لکھا گیا ہے۔

سنہ ۱۸۵۷ء کے آس پاس طالب علموں کے لیے قواعد اردو کی بیشمار کتابیں لکھی گئی ہیں ان کو تصنیف کی جگہ تالیف کہنا زیادہ مناسب ہے، کیونکہ تمام مصنفین نے ایک ہی ڈھانچہ اور ایک ہی انداز اختیار کیا ہے جسے Formal Traditional Grammar یا Grammar یعنی روایتی قواعد نویسی کہنا چاہیے۔ تصرف ہے تو اس قدر کہ بعض مؤلفین نے بعض بحثوں کو زیادہ پھیلایا ہے اور دوسروں نے اسے مختصر

(۱) مولوی عبدالحق - قواعد اردو ص ۲۶ -

کر دیا ہے اور مثالوں میں فرق ہے۔ ورنہ یہ سب فارسی قواعد کے نمونوں کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہیں۔ ان میں سے کسی نے اردو زبان کو خاص آریائی مزاج اور اس کی خصوصیات کو ملحوظ نہیں رکھا ہے۔ اس کا ایک سبب شاید یہ بھی ہو کہ اس وقت تک اردو کے لسانیاتی جائزہ کا کام شروع نہیں ہوا تھا اور اردو کی ابتدا اور ارتقاء کے بارے میں حقیقت سے زیادہ افسانوں کو دہرایا جاتا تھا۔ اردو کی ابتداء اور ابتدائی دور کے نمونوں کے بارے میں بھی تحقیقات کا سلسلہ شروع نہیں ہوا تھا اور اردوئے قدیم کے مختلف نمونے جو پنجاب، دکن، گجرات اور دوسرے علاقوں میں ملتے ہیں ان کی تدوین و تشہیر کی کوئی صورت نہیں نکلی تھی۔ اردو کی قواعد کی تفہیم کے لیے برِ صغیر پاک و ہند کی دوسری زبانوں اور بولیوں سے اردو کی ساخت کے تقابلی مطالعہ کی بھی ضرورت تھی لیکن اردو میں اس طرح کی کوئی تقابلی قواعد اس وقت تو کیا اس کے بعد بھی ایک مدت تک نہیں ملتی، حالانکہ یورپ میں تقابلی قواعد نویسی کا رواج عام ہو چکا تھا اس کا آغاز تو سنسکرت، یونانی اور لاطینی کے تقابلی مطالعہ سے شروع ہوا تھا جس میں بعد میں سنسکرت کے ساتھ اوستائی کا تقابلی مطالعہ بھی شامل ہو گیا تھا۔ لیکن بعد میں دوسری آریائی زبانوں میں بالخصوص Romance اور Germanic شاخوں کے تقابلی مطالعہ پر بڑا زور دیا گیا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے قواعد نویس ایک عرصہ تک یورپ کی اس تحققات کے نتائج سے بے خبر رہے۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ اس تحقیقات کا بڑا حصہ خاص طور پر جرمن زبان میں تھا۔

ایک اور رجحان جو اس دور کے قواعد نویسوں میں مشترک طور پر پایا جاتا ہے وہ بولی اور کتابی زبان کی برابری کا احساس ہے اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ قواعد نویس عام طور پر مثالوں میں شعراء کا کلام نقل کرتے ہیں۔ بظاہر شعراء کے کلام کو بطور سند پیش کرنے کا ایک ہی جواز ہے اور وہ یہ کہ شعراء زبان کے مزاج شناس ہوتے ہیں اور اپنے خیالات کے اظہار کے لیے موزوں ترین الفاظ تلاش کرتے ہیں لیکن یہ مسئلہ بڑا اختلافی ہے۔ خاص طور پر نحو کے بارے میں تو شعراء کے کلام سے سند لینا بہت ہی دشوار ہے۔ کیونکہ اکثر شعراء بحر، وزن، ردیف اور قافیہ کی پابندیوں کی وجہ سے اجزئے کلام کی ترتیب کو بدل دیتے ہیں جو عام روزمرہ گفتگو اور بول چال کی ترتیب سے مختلف ہوتی ہے لیکن کسی بھی زبان کی اصلی شکل اور اس کا حقیقی رنگ روپ یہی بول چال ہوتی ہے۔ نحو کے علاوہ بعض اوقات صرفی صورتوں میں بھی تصرف کر لیا جاتا ہے اور ایسے تصرفات کو مستند اساتذہ کا حق سمجھا جاتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس طرح زبان میں اضافہ کا سلسلہ جاری رہتا ہے جو زبان کے زندہ ہونے کی ایک دلیل ہے لیکن ہر تصرف کو زبان قبول نہیں کرتی اور ظاہر ہے ایسے تصرفات کو جائز نہیں سمجھا جاتا۔

اردو صرف و نحو پر اس دور کی بعض اور کتابوں کا پتہ چلتا ہے جو درسی ضروریات کے لیے لکھی گئی ہیں ۔ مولوی کریم الدین پانی پتی نے 'قواعد المبتدی' کے نام سے ایک قواعد لکھی تھی جس کا ایک ایڈیشن لاہور سے سنہ ۱۸۶۰ء میں شائع ہوا تھا ۔ کریم الدین نے ڈاکٹر فیلن کے ساتھ اردو شعراء کا ایک تذکرہ بھی مرتب کیا تھا اور فیلن کو ہندوستانی ڈکشنری کی ترتیب میں بھی مدد دی تھی ۔ ایک اور مصنف حیدر جنگ بہادر تھے جن کا ایک رسالہ 'قواعد ہندوستانی' کے نام سے لندن سے سنہ ۱۸۶۱ء میں شائع ہوا تھا ۔ ایک اور مصنف محمد علی ہیں جنہوں نے غیر ملکیوں کی تعلیم کے لیے 'ہندوستانی ٹیچر' کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی جو بنگلور سے سنہ ۱۸۷۰ء میں شائع ہوئی تھی ۔ پنجاب میں محکمۂ تعلیم میں کرنل ہالرائیڈ کی تحریک و تائید سے اردو کی درسی کتابوں کا ایک سلسلہ شروع ہوا تھا ۔ مولانا محمد حسین آزاد نے چار کتابوں کا سلسلہ لکھا تھا جو حال میں ترقی اردو بورڈ کراچی کے لیے ڈاکٹر اسلم فرخی نے مرتب کرکے دوبارہ شائع کیا ہے ۔ اسی سلسلہ میں کرنل ہالرائیڈ کے حکم سے 'قواعد اردو' کے نام سے ایک رسالہ تالیف ہوا تھا جو لاہور سے سنہ ۱۸۷۸ء میں شائع ہوا ۔ شو پرشاد کا ایک رسالہ 'صرف و نحو اردو' کے نام سے سنہ ۱۸۸۱ء میں لکھنؤ سے شائع ہوا ۔ ایسا ہی سلسلہ مولوی محمد اسمعیل میرٹھی نے شروع کیا تھا ۔ انہوں نے قواعد میں بھی دو رسالے لکھے تھے جو بار بار شائع ہوئے ۔ لکھنؤ سے ہی 'زبدہ القواعد' رائے درگا پرشاد کی ایک تالیف سنہ ۱۸۸۳ء میں شائع ہوئی ۔ اردو صرف و نحو کے نام سے الہ آباد سے ایک کتاب سنہ ۱۸۸۷ء میں شائع ہوئی جس کے مصنف راجہ شو پرشاد تھے ۔ یہ رسالہ یا تو ۱۸۸۱ء میں لکھنؤ سے اسی مصنف کے شائع ہونے والے نسخہ کا دوسرا ایڈیشن تھا یا کوئی اور رسالہ تھا ۔ ۱۹۰۱ء میں منشی صاحب علی نے 'قواعد اردو' کے نام سے اپنی ایک تالیف بنارس سے شائع کی اور سنہ ۱۹۰۴ء میں الہ آباد کے مولوی محمد احسن کی کتاب 'قواعد اردو' شائع ہوئی ۔ شیخ برکت علی کی 'ہندوستانی گرامر' سنہ ۱۹۰۵ء میں شائع ہوئی ۔ قواعد کی کتابوں کے اس سلسلہ میں ایک ممتاز کتاب فتح محمد جالندھری کی 'مصباح القواعد' ہے ۔ یوں تو اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے ہیں لیکن اشاعت خانۂ رام پور نے سنہ ۵-۱۹۰۴ء میں ناظم برقی پریس رام پور سے اس کا ایک نسخہ مصنف کے تصحیح کردہ نسخہ سے مقابلہ کرکے شائع کیا ہے ۔

قواعد کے علاوہ اس دور میں اردو لغت نویسی اور تاریخ زبان اردو کی طرف بھی خاصی توجہ ہوئی ۔ سورج مل[۱] نے 'ہندوستانی لغات' کے نام سے ایک لغت مرتب کیا جو پٹنہ سے سنہ ۱۸۷۴ء میں شائع ہوا ۔ ضامن علی جلال نے 'تنقیع اللغات' کے نام سے ایک رسالہ مرتب کیا جو لکھنؤ سے سنہ ۱۸۷۳ء میں شائع ہوا ۔ یہ مختصر رسالہ ۷۰ صفحات پر مشتمل ہے ۔ اسی

---

(۱) انڈیا آفس لائبریری نمبر ۱۲۶۶ ۔

(۲) ایضاً نمبر ۵۴۶ ۔

کا ایک اور ایڈیشن لکھنؤ سے سنہ ۱۸۷۵ء میں شائع ہوا تھا ۔ عبدالغفور کا رسالہ 'در تحقیق زبان ریختہ' لکھنؤ سے سنہ ۱۸۷۸ء میں چھپا اور منشی سید احمد دہلوی نے 'ارمغانِ دہلی' کے نام سے چار سو ستر صفحات پر مشتمل ایک رسالہ تصنیف کیا[۱] ۔ 'اشرف اللغات' کے نام سے عبدالفلاح نے[۲] ایک لغت مرتب کیا جس میں اسماء تھے اور ان کے مترادفات ہندوستانی (اردو) فارسی اور عربی میں دے گئے تھے 'مفتاح اللغات' کے نام سے سید محمد دہلوی کا ایک رسالہ[۳] دہلی سے سنہ ۱۸۵۱ء میں شائع ہوا تھا جس میں دو سو چوبیس صفحات تھے ۔ شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ کا 'ایک رسالہ 'تقویم اللسان'[۴] کے نام سے سنہ ۱۸۹۳ء میں شائع ہوا تھا ۔ لسانی مسائل پر بعض اور کتابیں بھی شائع ہوئی تھیں مثلاً منشی چرنجی لال نے (Hindustani Philology) کے عنوان سے ایک رسالہ تصنیف کیا[۵] جو دہلی سے ۱۸۸۶ء میں شائع ہوا ۔ منشی پرشاد نے[۶] 'کچھ بیان اپنی زبان کا' کے عنوان سے ایک رسالہ لکھا جو بنارس سے سنہ ۱۸۶۹ء میں شائع ہوا ۔

اردو کی قواعد کے سلسلے میں ایک مشکل مسئلہ جنسِ غیر حقیقی کی بحث کا تھا ۔ یوں تو جنسِ غیر حقیقی کے لیے سماعی اور قیاسی بعض تصرعات موجود ہیں لیکن پورا مسئلہ بڑا اختلافی ہے اور اکثر مصنفین اور قواعد نویسوں نے اپنے رسالوں میں اس سے بحث کی ، ہے لیکن اس موضوع پر مستقل تصانیف بھی ہیں ، مثلاً اس قسم کا ایک رسالہ 'تذکیر و تانیث' مشہور بہ 'مفید الشعراء' حکیم سیّد ضامن علی جلال لکھنوی (م ۱۹۰۹ء/۱۳۲۵ھ) کی تصنیف ہے ۔ اس کا پہلا ایڈیشن سنہ ۱۲۹۰ھ مطابق ۱۸۷۶ء میں شائع ہوا تھا اس کے بعد زمانۂ ملازمت نواب کلب علی خان والیٔ رام پور میں جلال نے اس پر نظرثانی کی ۔ اس کا ایک ایڈیشن مطبع مجیدی کانپور سے ۱۹۴۳ء/۱۳۶۲ھ میں شائع ہوا ہے ۔ اس سے پہلے کا ایک اور ایڈیشن ۱۹۲۲-۲۱ء/۱۳۴۰ھ میں بھی شائع ہوا تھا اور منیر لکھنوی نے اس کی تاریخ کہی تھی - 'مفید شاعران لا ریب و شک ہے' ۔ اس رسالے سے اس عہد کی زبان اور قواعد کے بارے میں مفید معلومات حاصل ہو سکتی ہیں ۔ ایک کتاب 'سرمایۂ زبان اردو' (۱۸۸۶-۸۵/۱۳۰۴ھ) ہے جس میں اردو محاورات جمع کیے ہیں اور ان کی تشریح کی ہے ۔ ایک اورکتاب 'منتخب القواعد' ہے جس میں مفرد اور مرکب الفاظ کی تحقیق ہے ۔ ایک دوسرا لغت اردو 'گلشنِ فیض' کے نام سے مرتب کیا ہے ۔ 'دستور الفصحاء' فن عروض میں ایک الگ رسالہ ہے اس طرح ضامن علی جلال شعرائے اردو میں اس اعتبار سے منفرد ہیں کہ انہوں نے زبان اور مطالعہ زبان کی طرف خاص توجہ کی ہے ۔

---

(۱) انڈیا آفس لائبریری نمبر ۱۱۴۱ -
(۲) ایضاً نمبر ۸۲۳ -
(۳) ایضاً نمبر ۱۳۵ -
(۴) ایضاً ۱۱۶۵۱ -
(۵) ایضاً نمبر ۶۳۰ -
(۶) ایضاً نمبر ۶۹۵ -

یہی حال لکھنؤ کے ایک اور ممتاز شاعر امیر احمد مینائی کا ہے (وفات ۳ اکتوبر سنہ ۱۹۰۰ء/۲۰ جمادی الآخر سنہ ۱۳۱۸ھ) امیر مینائی اس دور سے تعلق رکھتے ہیں جس کو دہلی اور لکھنؤ کے سنجوگ کا کہا جاتا ہے۔ سنہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد دہلی اور لکھنؤ کی مرکزی حیثیت ختم ہو گئی اور دربار رام پور میں ارباب فضل و کمال نے پناہ لی۔ امیر داغ دونوں بہ یک وقت یہاں پہنچے تو قدرتی طور پر دونوں نے ایک دوسرے کا اثر قبول کیا۔ امیر مینائی کے کلام نظم و نثر میں دو تصانیف زبان اور مطالعہ زبان کے سلسلہ میں قابل ذکر ہیں۔ ایک 'اردو شعراء کا تذکرہ' ہے جو 'انتخاب یادگار تذکرہ شعرائے رام پور' کے نام سے ۱۲۹۰ھ/۱۸۷۳ء میں مرتب ہوا لیکن ان کا سب سے بڑا کارنامہ اردو کے ایک لغت کی تالیف ہے جو انہوں نے 'امیر اللغات' کے نام سے مرتب کرنا شروع کیا تھا اور اس کی صرف جلد اول و دوم ہی مکمل کر سکے۔ اردو لغات میں آج بھی اسے بڑا معتبر اور مستند سمجھا جاتا ہے۔

اس دور کے دہلی کے ایک ممتاز مصنف اور زبان دان سید احمد دہلوی ہیں جو 'رسوم دہلی' کے مصنف کی حیثیت سے متعارف ہیں۔ لغت میں ان کا سب سے بڑا کارنامہ 'فرہنگ آصفیہ' ہے جو کئی جلدوں میں ہے اور اردو لغات میں ایک مستند لغت شمار ہوتا ہے۔ ان کے دو رسالے خاص دہلی کی زبان اور بیان کے بارے میں ہیں۔ ایک رسالہ 'مرقع بیان و زبان دہلی' ہے اور دوسرا 'ارمغان دہلی' ایک اور رسالہ میں اردو زبان کے مرکز اور ٹکسال کی بحث ہے۔ اس کا عنوان 'محاکمہ مرکز اردو' ہے۔ دلی اور لکھنؤ کے محاورات کے بارے میں ایک اور کتاب 'مصطلحات اردو' ہے جس کے مصنف محمد اشرف علی ہیں اور جو مطبع باقی لکھنؤ سے ۱۸۹۷ء میں شائع ہوئی تھی۔ 'محاورات ہند' کے نام سے ایک اور کتاب مولوی سبحان بخش نے لکھی جس میں دلی محاوروں سے بحث کی گئی ہے۔ یہ کتاب ۱۹۱۲ء میں شائع ہوئی۔ کتابیں ان کے علاوہ بھی بہت سی لکھی گئیں، مثلاً 'سلسلک مسلسل' کے عنوان سے چندرکا پرساد نے ایک رسالہ لغت محاورہ پر لکھا تھا جو نو لکشور پریس نے سنہ ۱۸۸۱ء میں شائع ہوا۔ معلوم ہوتا ہے کہ زبان لغت اور قواعد کی تحقیق کا مذاق عام ہو گیا تھا۔ اس دور میں بکثرت شعراء کے تذکرے، قواعد کی کتابیں، لغات محاوروں کی لغات اور درسی و تدریسی مقاصد کے لیے کتابیں لکھی گئیں زبان اور مطالعۂ زبان کے سلسلے میں ایک قابل ذکر نام مولانا محمد حسین آزاد کا ہے جن کا تذکرہ ہم کرنل ہالرائڈ کے سلسلے میں اور اردو کی درسی کتابوں کے باب میں کر چکے ہیں۔ اردو زبان کی ابتداء، ارتقاء اس کی شاعری اور نثر کے ادوار اور ان کی تاریخ کے سلسلے میں مولانا آزاد کی 'آب حیات' اپنی قسم کی پہلی کتاب ہے۔ اگر چہ مولانا آزاد کے مخصوص انشائیہ انداز نے اس تحقیقی کتاب میں بعض الجھنیں بھی پیدا کردی ہیں اور جدید تحقیقات کی روشنی میں آزاد کے بعض بیانات پر بھی نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ تاہم اس کی تاریخی اہمیت مسلم ہے[1] اس کتاب کی

---

(۱) تفصیلات کے لیے دیکھیے محمد حسین آزاد : ڈاکٹر اسلم فرخی، جلد دوم، مطبوعۂ انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی ۱۹۷۰ء

تجویز آزاد نے ۱۰ جولائی سنہ ۱۸۶۵ء کو انجمن پنجاب کے جلسہ میں پیش کی تھی ۔ اس کے بعد وہ ایران اور ترکستان کے سفر پر نکل گئے ۔ واپس آ کر اس کی تکمیل کی طرف توجہ ہوئی اور سنہ ۱۸۶۷ء میں ولی ، حاتم اور ہدایت پر مضمون تحریر کیے جو بعد میں 'آب حیات' میں شامل ہوئے ۔ ازاد کی اس مشہور کتاب کا پہلا ایڈیشن لاہور؟ سے وکٹوریہ پریس میں اہتمام سید رجب علی شاہ سنہ ۱۸۸۰ء میں شائع ہوا تھا اور اس وقت اس کی ۱۰۵۰ جلدیں طبع ہوئی تھیں ، اس کی مقبولیت کا اندازہ اس طرح ہوتا ہے کہ سنہ ۱۸۸۲ء تک یہ پہلا ایڈیشن ختم ہو گیا اور سنہ ۱۸۸۳ء میں اس کے دوسرے ایڈیشن کی اشاعت کی ضرورت پڑی ۔ یہ دوسرا ایڈیشن مئی سنہ ۱۸۸۳ء میں شائع ہوا اور 'آب حیات' کے موجودہ ایڈیشن اسی طبع ثانی پر مبنی ہے ۔ آزاد کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۱۸۸۳ء میں یہ کتاب پنجاب یونیورسٹی کے نصاب تعلیم میں شامل تھی اور اس سے بڑھ کر اس کی اہمیت کا ثبوت کیا ہوگا کہ آج ایک صدی ہونے کو آئی یہ کتاب اسی طرح شامل نصاب ہے اور اردو زبان و ادب اور اس کی تاریخ کا کوئی طالب علم اسے نظر انداز نہیں کر سکتا ۔ اس سلسلے میں ازاد کا دوسرا اہم کارنامہ 'سخندان فارس' ہے ۔ یہ دراصل مولانا آزاد کے خطبات کا مجموعہ ہے جو بعض حضرات کے بقول لاہور کے ٹریننگ کالج میں دیے گئے تھے ۔ حصہ اول کے لیکچر سنہ ۱۸۷۲ء میں دیے گئے ۔ حصہ دوم میں جو گیارہ لیکچر ہیں وہ سنہ ۱۸۷۲ء میں دیے گئے ۔ حصہ اول تو سنہ ۱۸۷۲ء میں ہی شائع ہو گیا تھا لیکن حصہ دوم کی اشاعت بڑی تاخیر ہوئی ۔ آزاد نے سنہ ۱۸۸۷ء میں دونوں حصوں پر نظر ثانی کی ، لیکن اشاعت سنہ ۱۹۰۷ء سے پہلے نہ ہو سکی ۔ ڈاکٹر اسلم فرخی[1] کا یہ قول صحیح ہے کہ ہماری زبان میں علمی لکچروں کے مجموعے برائے نام ہیں اور 'سخندان فارس' اس سلسلے کا نقش اول ہے ۔ لسانیات کے موضوع کو اس کے وسیع معنوں میں اردو میں پہلی مرتبہ اسی کتاب میں اختیار کیا گیا ہے ۔ پہلے حصے میں انہوں نے ہند ایرانی تقابلی لسانیات سے بحث کی ہے اس میں لسانیات کے تعارف اور یونانیوں سے اس کے آغاز کا ذکر کرنے کے بعد انہوں نے زبان کی تعریف کی ہے اور اس کی ابتداء کے بارے میں مختلف نظریات کا جائزہ لیا ہے ۔ آگے چل کر انہوں نے لغت اور اصطلاح کے مفاہیم کو واضح کیا ہے اور اس کے بعد الفاظ میں تبدیلیوں کی بہت سی مثالیں پیش کی ہیں اور تغیرات کا جائزہ لیا ہے ۔ فارسی اور سنسکرت کے تقابلی تعارف سے انہوں نے دونوں زبانوں کی یگانگت اور قریبی تعلق کی جھلک دکھائی ہے اور ایک زبان سے دوسری زبان میں الفاظ کے تبادلہ میں جو صوتی اور دوسری تبدیلیاں ہوتی ہیں ، ان کا تجزیہ کیا ہے اور فارسی و سنسکرت سے مثالیں دی ہیں ۔ ایک بحث حروف تہجی کے باب میں بھی کی ہے اور آگے چل کر تفصیل سے فارسی اور سنسکرت کے الفاظ کا تقابلی مطالعہ پیش کیا ہے اور فارسی اور سنسکرت کی قواعد کا بھی خاص طور پر سنسکرت اور فارسی کے افعال اور صیغوں کا تقابلی مطالعہ

---

(۱) اسلم فرخی - محمد حسین آزاد ، جلد ۲ ص ۳۷۵

انہوں نے بڑی محنت سے کیا ہے اور آخر میں ان لاحقوں کی بعض مثالیں پیش کی ہیں جو سنسکرت اور فارسی میں بطور مشترک موجود ہیں ۔ اردو میں اس موضوع پر یہ بلا شبہ اپنی قسم کی پہلی کتاب ہے اور ایک تاریخی اہمیت رکھتی ہے ۔

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ سنہ ۱۸۵۷ء کے بعد شعراء ، مصنفین ، مؤلفین ، قواعد نویس ، لغت نگار سب اردو زبان کے بارے میں احتیاط بلاتی اور ترتیب و تدوین کی فکر دامن گیر تھی اس میلان کے دو خاص اسباب تھے ۔ اول تو یہ کہ جب تک اردو صرف شاعری ، داستانوں ، کہانیوں ، وعظوں یا معمولی مسئلے مسائل کے اظہار کے لیے محدود تھی اس میں زبان کی قطعیت پر چنداں توجہ نہیں ہوتی تھی لیکن جب اسے علوم و فنون کے لیے اختیار کیا اور اس میں ایک علمی اسلوب اختیار کرنے کی ضرورت پڑی تو لازمی طور پر اس میں الفاظ کے صحیح اور واضح معانی مطالب کے تعین کرنے کی ضرورت پیش آئی ۔ اس کے نتیجہ کے طور پر صرف اصطلاحی الفاظ ہی پیدا نہیں ہوئے بلکہ عام الفاظ کے معانی میں بھی زیادہ قطعیت کا لحاظ رکھا جانے لگا ۔ اسی طرح جب نثر کا رواج زیادہ ہوا اور نثر میں مختلف موضوعات و مباحث پر اظہار خیال کی ضرورت پیش آئی تو قواعد صرفی و نحوی کو بھی زیادہ واضح اور مرتب و مقرر کرنا پڑا ۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور کی زبان اس عہد سے پچاس سال پہلے کی زبان سے تو خاصی مختلف ہے لیکن آئندہ پچاس سال میں اس طرح کہ صرفی و نحوی تبدیلیاں بہت کم ہوئی ہیں اور جسے آج معیاری اردو کہا جاتا ہے اس کا تعین اسی طرح ہوا ۔ سر سید ، حالی ، شبلی ، نذیر احمد ، آزاد اور ذکا اللہ کی تحریریں آج کے معیار سے بھی جدید اردو کا نمونہ ہیں ۔ دوسرا سبب اس تدوین کا یہ تھا کہ اردو زبان کی تاریخ میں اس سے پہلے اردو کی ترقی کے مختلف مرکز رہے تھے ۔ ابتدائی دور میں اردو زبان اور اس کے شعر و ادب کا فروغ دکن میں ہوا ۔ لیکن دکنی دور کی اردو کو شمالی ہند کے اکثر شعراء اور مصنفین 'لچر' اور 'پوچ' زبان سمجھتے تھے اور اسی وجہ سے دلی سے پہلے کسی دکنی شاعر کو قابل اعتنا نہیں سمجھتے تھے ۔ ولی کو جو استاد قبول اور تسلیم کر لیا گیا تو اس کا سبب یہی تھا کہ انہوں نے دکنی محاورہ کو ترک کر کے محاورہ شاہجہاں آباد یعنی اردوئے معلی کے محاورہ کو قبول کر لیا تھا ۔ زبان اردوئے معلی کی ٹکسال اس دور میں دلی تھی اور دلی میں بھی بقول انشا اللہ خان اس کی جغرافیائی حدود تھیں ۔ جب تک دلی کے دور زوال میں ایک تہذیبی مرکز لکھنؤ میں قائم ہوا اور اگرچہ لکھنؤ میں شعر و شاعری اور علوم و فنون کی شمع انہیں حضرات نے روشن کی تھی جو دلی سے فیض آباد اور لکھنؤ پہنچے تھے ، لیکن بہت جلد لکھنؤ والوں نے اپنی ایک الگ ساکھ قائم کر لی اور زبان میں تراش خراش کر کے اسے دہلوی اردوئے معلی کے مقابلے

میں زیادہ جدید کر لیا ۔ سلسلہ ناسخ (م ۔ ۱۲۵۴ھ/۳۹ - ۱۸۳۸ء) سے شروع ہوا اور ان کے شاگردوں کے دور میں پایۂ تکمیل کو پہنچا ۔ دلی میں سنہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے اثرات جو اردو پر ہوئے اس کا ذکر مرزا غالب ایک خط میں میر مہدی مجروح سے یوں کرتے ہیں:

''اے مہدی تجھے شرم نہیں آتی ۔ ارے اب اہلِ دہلی ہندو ہیں یا اہلِ حرفہ یا خاکی ہیں یا پنجابی ہیں یا گورے ہیں۔ ان میں سے تو کس کی زبان کی تعریف کرتا ہے ۔ لکھنؤ کی آبادی میں کچھ فرق نہیں آیا ۔ ریاست تو جاتی رہی باقی ہر فن کے کامل لوگ موجود ہیں''۔

آگے چل کر لکھتے ہیں :

''قصہ مختصر شہر صحرا ہو گیا تھا اب جو کنویں جاتے رہے اور پانی گوہر نایاب ہو گیا تو یہ صحرا ۔ صحرائے کربلا ہو جائے گا''۔

اللہ اللہ دلّی والے اب یہاں کی زبان اچھالے جاتے ہیں ! واہ رے حسنِ اعتقاد ۔ ارے بندہ خدا اردو بازار نہ رہا اردو کہاں ، دلی کہاں واللہ اب شہر نہیں ہے کمپ ہے چھاؤنی ہے نہ قلعہ نہ شہر نہ بازار نہ سہر''۔

یہ مرزا بیچارہ کا حسنِ ظن تھا ۔ سنہ ۱۸۵۶ء میں سلطنتِ اودھ کی ضبطی اور پھر سنہ ۱۸۵۷ء میں ہنگامے کے بعد لکھنؤ کا تہذیبی شیرازہ بھی بکھرنے لگا اور پھر دلی کی طرح لکھنؤ میں بھی بھانت بھانت کی بولیاں سنائی دینے لگیں اس افراتفری میں شاعروں ، ادیبوں اور زبان دانوں کو اپنے اس سرمایہ کو محفوظ کرنے اور مرتب کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی ۔ جلال کی جن کوششوں کا اوپر ذکر ہوا ان کو اسی سلسلہ کی ایک کڑی سمجھنا چاہیے ۔ لکھنؤ اور دلی کی روایتی چشمک بھی اس انقلاب کی بدولت ماند پڑ گئی ۔ اردو کو اس سے یہ فائدہ ہوا کہ اس کی وسعت میں اضافہ ہوا اور بقول وحید الدین سلیم(۱) ۔

''اردو زبان اب دہلی اور لکھنؤ میں محدود نہیں رہی ہے ۔ وہ ان حدود کو توڑ کر باہر نکل چکی ہے اس کے لیے اب اسی قدر وسعت کی ضرورت ہے جس قدر کہ ہندوستان میں وسعت ہے''۔

---

(۱) نورالحسن ، ڈاکٹر ، ہاشمی بحوالہ دلی کا دبستان شاعری ، طبع دسمبر ۱۹۶۶ء اردو اکیڈمی کراچی ص ۴۷۱ ۔

اس دور کے ادب کا مجموعی جائزہ

۱۸۵۷ء کی ناکام جنگِ آزادی کے بعد مسلمانانِ پاکستان و ہند کی زندگی کا دھارا ایسے موڑ مڑا کہ زندگی کے تمام پرانے شعار، تمام پرانی اقدار، تمام پرانے اندازہائے فکر بدل گئے۔ کوئی زمانہ تھا کہ غالب یہ کہہ سکتا تھا:

جی ڈھونڈھتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن
بیٹھے رہیں تصوّرِ جاناں کیے ہوئے

مگر اب کشمکشِ حیات کا رنگ نیا تھا، زندگی کے تقاضے نئے تھے اور مسلمانوں کا سب سے بڑا مسئلہ جہد اللبقا کا مسئلہ تھا۔ کچھ دیر وہ غیر ملکی حکومت کے تشدّد اور انتقامی کارروائیوں سے ایسے سہمے کہ انہیں اپنی سدھ بدھ نہ رہی مگر جب انہوں نے ہوش سنبھالے تو دنیا بدل چکی تھی اور اقدار و اعیار نیا روپ اختیار کر چکے تھے۔ چنانچہ ان نئے تقاضوں کو سمجھنا، نئے مسائل سے نمٹنا، اپنی فکری اور معاشرتی مشکلات کے لیے حل تلاش کرنا، تلخ حقیقتوں سے دوچار ہونا، شکستہ و ریختہ، مضمحل و مایوس معاشرہ میں نئی روح پھونکنا اور اظہار کے لیے اسلوب اختیار کرنا اس دور کے ادب کی امتیازی صفات بن گئیں۔

اس حیاتِ نو کا ذمہ دار اکثر لوگ سید احمد خان کو ٹھہراتے ہیں۔ بطل پرستی کے اس دور میں ایسا تصوّر تعجب خیز نہیں مگر انگریزی کے محاورہ کے مطابق یہ کہنا تا درست نہیں کہ ایک درخت سے نہ باغ بنتا ہے نہ جنگل، خواہ وہ درخت شاہ بلوط ہی کیوں نہ ہو۔ کسی قوم کی زندگی جب کوئی کروٹ لیتی ہے تو اس کے محرک بہت سے افراد ہوتے ہیں جن کے مقاصد، مطامحِ نظر اور طریقہ ہائے کار میں ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ البتہ ان میں ایک دو ایسے فعّال اور دور رس اشخاص بھی نمودار ہو جاتے ہیں جو اس نئی رو کو ایک سوچی سمجھی راہ پر چلانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ یہی حال انیسویں صدی کے دوسرے نصف میں مسلمانوں کی فکری اور ادبی زندگی کا ہوا۔ انہیں ایک ہادی مل گیا اور ایک راستہ۔ مگر یہ کہنا غلط ہوگا کہ اس راستے پر چلنے کے لیے سب لوگوں نے بلا تامل لبیک کہا! سب اس نئے نقطۂ نظر سے متفق نہ تھے مگر ایک قدرِ مشترک جو اس دور کے سب ادیبوں میں پائی جاتی ہے وہ قوم سے ہمدردی اور ملت کے احیاء کی

لکن ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ اقدار میں اختلاف ضرور تھا اور ایسا ہونا بھی چاہیے تھا۔ ایسے اختلافات تابندگیٔ حیات کی نشاندھی کرتے ہیں۔

اگرچہ اس دور کا ادب غالب کے خطوط سے شروع ہوتا ہے؛ مگر مرزا کے خطوط اس دور کے مزاج کی عکاسی نہیں کرتے۔ مرزا کے خطوط ایک ایسی تہذیب کی یادگار ہیں جس کی اقدار نے نصف صدی رفتہ رفتہ بیگانہ ہو گئی۔ وہ وضع داری، وہ مروت، وہ حسنِ اخلاق، وہ رواداری، وہ موانست اور خلوص، وہ شائستگی اور وہ رعنائی جو متذکرہ تہذیب کی خصوصیات نہیں، مرزا کے خطوط میں اپنی گونا گوں شگفتگیوں کے ساتھ موجود ہیں، مگر ان خطوط میں ایک مٹتی ہوئی تہذیب اور ایک رہروِ درماندہ کی صدائے دردناک بھی ملتی ہے۔ ان میں وہ تلخ حقیقتوں کی جھلکیاں نظر نہیں آتیں جن سے اس دور کے مسلمان دوچار تھے۔ پھر بھی اسلوب اور انداز کے لحاظ سے یہ خطوط ایک طرح سے بالکل نئے ہیں اور ایک رندہ و تابندہ شخصیت کے ترجمان۔ اس لحاظ سے وہ نرالے بھی ہیں۔ مناسب تھا کہ اس دور کا آغاز ایسے ہی 'جدید' شاہکار سے ہو۔

یوں اس دور میں ادب کی ہر صنف میں ایک نئی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ سوانح، تذکرہ نگاری، ناول، ملّی شاعری، انشاء، ڈراما، مناظراتی ادب غرض یہ کہ اردو ادب کی کوئی صنف ایسی نہیں جس میں ایک نیا آہنگ اور نیا اسلوب قائم نہ ہوا ہو۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس سارے دور میں ایک ہی روح کارفرما ہے اور وہ ہے ملت کا احیاء اور اپنی اقدار کی نئی تنظیم۔ یہی بات شبلی اور حالی کی سوانح نگاری میں پائی جاتی ہے اور یہی شرر اور نذیر احمد کے ناولوں میں اور یہی سر سید کے مضامین میں اور حالی کی 'شکوۂ ہند' یا 'مسدس' میں۔ یہ نہیں کہ ادب سے تفریح کا پہلو بالکل خارج ہو گیا اور اصلاح اور مقصدیت ہر قسم کے اظہار پر غالب آ گئی مگر خواہ وہ سرشار ہو یا منشی سجاد حسین، مرزا محمد ہادی رسوا یا آغا حشر، معاشرہ سے دلچسپی اور اس کے مشاغل، اس کی ناہمواریوں اور محاسن و عیوب میں انہماک تمام مصنفّین کے پیشِ نظر رہا۔ اکبر الہ آبادی ہی کو لیجیے، وہ ملکی تہذیب اور اسلامی اقدار کے پرستار تھے اور مغرب زدگی اور کورانہ یا نامعقول نقالی کو برا سمجھتے تھے مگر ان کے اندازِ بیان میں شگفتگی اور مزاح کا جو عنصر تھا وہ ان کی تلخ سے تلخ تنقید کو گوارا بنا دیتا تھا اور سچ تو یہ ہے کہ اگر اکبر الہ آبادی اور حالی جیسے مصلح اور باخبر مبّصر نہ ہوتے اور ان کے ساتھ سر سید کے دیگر رفقاء قوم کے احساسِ خود نگری کو بیدار نہ کرتے تو علامہ اقبال اتنی جلد نہ مقبول ہوتے اور نہ مؤثر۔ اقبال کی پذیرائی کے لیے زمین انہیں نے تیار کی

اور اگرچہ اقبال کا ذہن اپنی فکری معراج کو ۱۹۱۴ء کے بعد پہنچا ، مگر 'تصویرِ درد '، 'شمع و شاعر' ، 'شکوہ' اور 'جوابِ شکوہ' جیسی چونکا دینے والی نظمیں اقبال ۱۹۱۴ء سے پہلے ہی لکھ چکے تھے اور یہی وہ نظمیں ہیں جو اکبر الہ آبادی اور حالی کی روایت کی اگلی کڑی ہیں -

جس دور میں محمد حسین آزاد جیسے انشاء پرداز ہوں ، شرر ، سرشار ، نذیر احمد جیسے نثر نگار اور سر سید جیسے صاحبِ نظر اور اخلاق رہبر اور جس میں کیا صحافت اور کیا اخلاقی ادب سب ایک نئے جذبے سے سرشار نظر آئے وہ دور ہر طرح سے قوم کی قسمت کا ضامن اور ان کی تقدیر کا ذمہ دار قرار دیا جا سکتا ہے - چنانچہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اردو ادب کا یہ دور اس کے اعلیٰ ترین ایام میں شمار کیا جا سکتا ہے اور جس جس راستے پر اس ادب کی ہر صنف گامزن ہوئی اس کا منبع بلکہ سر چشمہ انیسویں صدی کا دوسرا نصف اور بیسویں صدی کے پہلے چودہ پندرہ سال تھے -

یہاں اس کی مثال اس دور کی شاعری میں صنفِ غزل اور شاعری کی غایت سے مل سکتی ہے - اس دور سے پہلے شاعر اپنے جذبات ، اپنے تاثرات اور اپنے تجربۂ حیات کو ہی موضوعِ سخن بناتا تھا - معاشرہ سے اس کا واسطہ یہی تھا کہ وہ اپنی قسمت کو روئے یا چرخِ کہن کو کوسے اور اغیار اور حریفِ 'رو سیاہ' کو گالیاں دے - انیسویں صدی کے نصف اول کے مراثی اور چند ایک عشقیہ مثنویوں سے قطع نظر وہ غزل ہی کو مرغوب ترین صنفِ شاعری تصور کرتا تھا - اس کا دائرۂ نگاہ اپنی ذات تک ہی محدود تھا - حتیٰ کہ موسموں کی تبدیلی اور ملکی یا سیاسی ، اجتماعی یا اخلاقی مسائل کو وہ در خورِ اعتنا نہیں سمجھا تھا - اس دور میں یہ نکتۂ نگاہ بھی رفتہ رفتہ بدل گیا - ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس کا ذمہ دار کرنل ہالرائیڈ تھا اور نئی یا نیچرل شاعری کے محرک محمد حسین آزاد ، مولانا ہی تھے ، کیونکہ زمانہ اور نزد و بعد کے اثرات سے کوئی معاشرہ بھی مامون نہیں رہ سکتا - انگریزی تعلیم عام ہونے پر یہ لازمی تھا کہ ہمارے اسالیب بھی مغربی ادبیات سے متاثر ہو جائیں ، مگر اس بات سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اس نصف صدی کی غزل باستثناء امیر مینائی اور مرزا داغ (اور ان میں بھی شدتِ احساس اور فکر کی کمی ہے) - اور نظم وہ نہ رہی جس میں تغزل کا عنصر غالب ہو - نظم نظیر اکبر آبادی بھی اعلیٰ قسم کی لکھ لیتے تھے ، مگر ان کی نظم میں 'غزلیت' ابھی غائب نہیں ہوئی تھی مگر اب حالی کے ہاں مثنوی نے بھی نیا رنگ پکڑا اور اقبال کے ہاتھ غزل محض ہیئت کے لحاظ سے

غزل رہی ورنہ وہ جنسیت چھوڑ بشریت سے بھی ماورا ہو کر فکر انگیز ہو گئی۔ یہ تفکّر اور تجرّد اس کے لیے بہت چھا رہا، کیونکہ اب اس میں بہت وسعت پیدا ہو گئی۔ یہ انقلاب بھی اسی دور میں وقوع پذیر ہوا۔ اس دور کے آغاز میں یا اس کے کچھ دیر بعد جب قوم پر مایوسی کے بادل منڈلا رہے تھے تو اکبر الہ آبادی جیسے مبصر نے اس قسم کی غزل لکھی:

وہ ہوا نہ رہی وہ چمن نہ رہا وہ گلی نہ رہی وہ حسیں نہ رہے
وہ فلک نہ رہا وہ سماں نہ رہا وہ مکاں نہ رہا وہ مکیں نہ رہے

نہ وہ آن رہی نہ امنگ رہی نہ وہ رندی و زہد کی جنگ رہی
سوئے قبلہ نگاہوں کے رخ نہ رہے در دیر پہ نقشِ جبیں نہ رہے

نہ وہ جام رہے نہ وہ مست رہے نہ فدائے عہدِ الست رہے
وہ طریقۂ کارِ جہاں نہ رہا وہ مشاغلِ رونقِ دیں نہ رہے

مگر بیسویں صدی کے پہلے سترے (۱۹۰۷ء) میں لکھی ہوئی اقبال کی یہ غزل ملاحظہ ہو۔ اس میں جو اعتماد اور جو طنطنہ ہے وہ اکبر الہ آبادی کی کیفیتِ مزاج سے بالکل مختلف ہے۔ اس غزل کا پس منظر بدل چکا ہوا ہے اور قوم پر یاس کی گھٹا چھٹ چکی معلوم ہوتی ہے۔ یہ رجائیت کا دور ہے اور اس کا آہنگ حیات آفرین ہے:

گذر گیا اب وہ دور ساقی کہ چھپ کے پیتے تھے پینے والے
بنے گا سارا جہان میخانہ ہر کوئی بادہ خوار ہوگا

کبھی جو آوارۂ جنوں تھے وہ بستیوں میں پھر آ بسیں گے
برہنہ پائی وہی رہے گی مگر نیا خار زار ہوگا

سفینۂ برگِ گل بنا لے گا قافلہ مورِ ناتواں کا
ہزار موجوں کی ہو کشا کش مگر یہ دریا کے پار ہوگا

میں ظلمتِ شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو
شرر فشاں ہوگی آہ میری نفس میرا شعلہ بار ہوگا

یہ پرجوش غزل ایک نئے دور کے لیے صحیح طور پر 'بانگِ درا' ہے۔ یہی اس دور کے ادب کی روح کہی جا سکتی ہے، اور اگرچہ ملتِ اسلامیانِ ہند و پاکستان پر کئی مصائب اور بھی ٹوٹے مگر وہ مایوسی کی وجہ سے پھر کبھی یخ بستہ نہیں ہوئے۔

(مدیرِ عمومی)

363114

صحت نامہ

اردو ادب - جلد چہارم (۱۸۵۷ء - ۱۹۱۴ء)

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۲	۲	خروس	خروس
۲	۱۵	مخمسہ	مخمسہ
۲	فٹ نوٹ	ٹامسین و گیرٹ	ٹامسن و گیرٹ
۴	۱	بے تدبیر	بے تدبیری
۵	فٹ نوٹ نمبر ۲	۶۱۰ء - ۱۹۳۷ء	۱۲۰۶ء - ۱۹۳۷ء
۸	فٹ نوٹ نمبر ۳	یہاں	یہاں
۹	۷	رفتہ رفتہ	رفتہ رفتہ
۱۲	فٹ نوٹ نمبر ۱	مطبوعہ	مطبوعہ
۱۳	۱	اپریل ۱۸۲۹ء	اپریل ۱۸۶۹ء
۱۷	۳	ایسوسی یشن	ایسوسی ایشن
۲۰	۸	یورپی	یورپی
۲۰	۲۲	پشت	پشت
۲۲	۱۲	ایک	ایک
۲۲	۱۹	ہو جانے سے	ہو جانے سے
۲۲	۲۷	تھے	سے
۲۵	۵/۶	خدمت گار گزار فارغ ہوکر	خدمت گار فارغ ہو کر
۲۵	۱۶	جدید	جدید

معذرت : پوری کوشش کی گئی ہے کہ اغلاط درست کر دی جائیں ۔ مگر تحقیقی کتب میں غلطیاں پھر بھی رہ جاتی ہیں ۔ امید ہے قارئین کرام ان اغلاط کو محض ہماری فرو گذاشت پر محمول نہیں کرینگے ۔

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۲۶	۲۸	بھی	بھی
۲۷	۳	اطلاحات	اطلاعات
۲۷	۷	بڑاھ	بڑھا
۲۷	۱۷	محمد اکرم	محمد اکرام
۲۸	۷	آرہ میں قائم ہوا	آرہ میں قائم کیا
۲۸	۱۸	سال بسال	سال بسال
۳۲	۲۶	مسیحت	مسیحیت
۳۳	۲۰	مسہانوں	مسلمانوں
۳۵	۸	سوسائٹی	سوسائٹی
۳۸	۲	ترکی ٹوپی	ترکی ٹوپی
۳۸	۱۹	محکم قوم	محکوم قوم
۳۱	۱۰	انگریزی کے نابلد نہیں	انگریزی سے نابلد نہیں
۳۰	۲۸	اونچی اونچی	اونچی اونچی
۴۱	۲	غلوم	علوم
۴۸	۱۰	ماوجدر اسلام	مذوجزر اسلام
۴۸	۱۳	دبتی	دیتی
۵۰	۱۹	بنانے	بنانے
۵۰	۲۳	انحراف	انحراف
۵۳	۱۳	مطمع نطر	مطمح نظر
۶۳	۲	کوئی بھی	کوئی بھی
۶۳	۳	بیش کرنا	پیش کرنا
۶۳	۱۸	رشنہ	رشتہ
۶۶	۱	پاستلر	پرملتا
۶۸	۱۵	تنکوہ	شکوہ
۷۶	۱۳	معتلق	متعلق
۷۷	۷	(۱۸۳۰ء - ۱۷۵۷ء)	(۱۸۳۰ء - ۱۸۵۷ء)
۷۹	۱۲	خطبات الاحمدیہ	خطبات احمدیہ
۸۲	۲۵	عہ	عمر

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۸۲	فٹ نوٹ	زبیری ، محمد امین	زبیری ، محمد امین
۸۹	۸	مجبولی	مجبولی
۹۲	۵	انہیں کانگرس کے صدر کے گشتی خط کا جواب دیتے ہوئے	انہوں نے کانگرس کے صدر کے گشتی خط کا جواب دیتے ہوئے
۹۳	۲	ناپ	باپ
۹۳	۲۱	خوش	خوش
۹۶	۱۷	نہیں	نہیں
۹۵	۱۸	قرآن مجید	قرآن مجید
۹۷	۲۳	جھجوانا	جھجوانا
۹۹	۱۵	وتباسات	اقتباسات
۹۹	۱۶	گرزتی	گرزتی
۱۰۰	۱۵	مذہبی	مذہبی
۱۰۳	۸	نتائج	نتائج
۱۱۰	۱۸	حزم	عزم و احتیاط
۱۱۰	۱۹	بداعی	بداعی
۱۱۱	۱۳	تلاش کریں	تلاش کریں
۱۱۲	۱۷	بڑھاپے میں کرتے ہو	بڑھاپے میں کرتے ہو
۱۱۵	فٹ نوٹ نمبر ۱	حامد حسین قادری	حامد حسین قادری
۱۱۹	فٹ نوٹ نمبر ۱	شیخ اسماعیل	شیخ اسماعیل
۱۱۹	،، سطر نمبر ۲	(فرنگیوں کا حال)	(فرنگیوں کا جال)
۱۱۹	،، سطر نمبر ۳	کتاب	کتاب
۱۲	فٹ نوٹ	علی عباس حیسی	علی عباس حسینی
۱۲۱	۱۳	نقطۂ نطر	نقطۂ نظر
۲۳	۲۱	رند مشرلی	رند مشرب
۲۳	۱۱	وسیع المشرلی	وسیع المشربی
۱۲۹	فٹ نوٹ سطر نمبر ۳	ملاقات شیروانی	مقالات شیروانی
۱۳۳	۱۵	محت	تحت
۱۳۴	۲۱	زیادہ آمد کار	زیادہ کار آمد

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱۳۵	فٹ نوٹ سطر نمبر ۴	بڑا	بڑا
۱۳۹	۲۳/۲۴	مذاحیہ رنگ	مزاحیہ رنگ
۱۴۰	۳۰	ہوس ربا	ہوش ربا
۱۴۲	۱۴	فلفسہ	فلسفہ
۱۴۳	۳	مباس معرلی	مباسِ معربی
۱۴۴	۲۱	مکاتیب	مکاتیب
۱۴۴	۳۱	رندکی	زندگی
۱۴۵	۲۴	موردِ الزام	موردِ الزام
۱۴۹	۱	الر	اگر
۱۴۹	۸	خوش اسلوبی	خوش اسلوبی
۱۵۱	۸	ضالین پڑھا کرے ہیں	والضالین پڑھا کرے ہیں
۱۵۳	۱۳	یہ مطلب	یہ مطلب
۱۵۴	۹	ہمیں رپوٹر کی خبروں سے	ہمیں رائٹر کی خبروں سے
۱۵۴	۱۳	جن کا کسی طرح	جن کا تعلق کسی طرح
۱۵۵	۴	عقدہ کشائی پر سکتی ہے	عقدہ کشائی ہو سکتی ہے
۱۵۷	۲۲	محفوط	مخطوط
۱۵۹	۱	دلالت کریا ہے	دلالت کرتا ہے
۱۶۲	۲	دولت کو صوف کیجیے	دولت کو صرف کیجیے
۱۶۴	۴	زبان	زبان
۱۶۴	۲۵	محفوط	مخطوط
۱۶۶	۱۲	انہوں ہی اس	انہوں نے ہی اس
۱۶۶	۱۵	اب سب کا طریق کار	ان سب کا طریق کار
۱۶۷	۱۹	زنادتی	زیادتی
۱۶۷	۲۶	حکومت	حکومت
۱۶۸	۲	ہندوؤں	ہندوؤں
۱۶۸	۸	نخوت	نخوت
۱۶۸	۱۸	معرب	مغرب
۱۶۸	۲۷	کا	کا
۱۷۰	۱۳	گورانہ	کورانہ

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱۷۰	۱۵	عالپ	غالب
۱۷۱	۱۷	ہڑے	بڑے
۱۷۶	۹	موچود	موجود
۱۹۳	۲	حکیانہ	حکیمانہ
۱۹۷	۱	۱۴ مکاسب شبلی	مکاتیب شبلی
۱۹۸	فٹ نوٹ نمبر ۲	لوح	لوح
۱۹۸	۱۴	ردعمل دخل	عمل دخل
۱۹۹	۱۰	مقالہ دکار	مقالہ نگار
۱۹۹	۱۱	زندگی	زلدگی
۱۹۹	۱۴	گے	کے
۲۰۳	۲	اىرپرىرى	اثرپذیری
۲۰۶	۴	و	وہ
۲۰۶	کتابیات نمبر ۲	شیخ محمد آکرم	شیخ محمد اکرام
۲۰۸	۵	ضروی	ضروری
۲۱۰	۲	مرناپور	مرزا پور
۲۱۱	۷	کے نام ایک کتاب	کے نام سے ایک کتاب
۲۱۱	۱۵	پتہ چلے	پتہ چلے گا
۲۱۲	۲۰	عالبا	غالباً
۲۱۲	فٹ نوٹ نمبر ۱	پڑئیفنگ	پرنٹنگ
۲۱۳	۲۵	لہلوتہی	پہلوتہی
۲۱۳	۲۵	رونیوسکرٹری	ریوینوسکریٹری
۲۱۳	۲۷	ابے	بنے
۲۱۶	۷	کتاپ	کتاب
۲۱۸	۲۷	کہہ	کہا
۲۲۲	۲۷	گی	کی
۲۲۳	۱	گی ترنیب میں بٹانے ہاتھ	کی ترتیب میں ہاتھ بٹانے
۲۲۴	فٹ نوٹ	عظمت رفتہ	عظمت رفتہ
۲۲۵	۱	آپا واجداد	آبا واجداد
۲۲۸	۲۵	نکرازی	انگریزی

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۲۳۰	۷	فائف ہوئے	فائز ہوئے
۲۳۱	۲	اسے ٹھان اٹھو	اسے ٹھان کے اٹھو
۲۳۱	۱۲	وضح	وضع
۲۳۱	۱۳	وضح اصطلاحات عماء	وضع اصطلاحات علمیہ
۲۳۲	۱۷	خاس	خاص
۲۳۳	۷	وقتاً فوتتا	وقتاً فوقتاً
۲۳۵	۱	زمانہ ہیں	زمانہ میں
۲۳۶	۸	پدولت	بدولت
۲۳۶	۲	سطر نمبر ۲ میں 'ہوئے' کے اوپر حوالہ (۱) زائد ہے	
۲۳۷	۱	اہل و ایال	اہل و عیال
۲۳۷	۲	تعتیف و تالیف	تصنیف و تالیف
۲۳۸	۶	رسوم نند	رسوم بند
۲۴۲	۱۶	مخزن	مخزن
۲۴۳	۳	مىلے ٹھاوں	میلے ٹھیلوں
۲۴۴	۱	لڑے	بڑھے
۲۴۵	۱۲	وارالمک	وقارالملک
۲۴۵	فٹ نوٹ	عمدالحسنی	عبدالحئی
۲۴۵	۱۳	عبدلحی	عبدالحئی
۲۴۵		سطر نمبر ۱۷ میں "بحال رکھا" کے اوپر حوالہ نمبر ۲ زائد ہے	
۲۴۶	۷	زندکی	زندگی
۲۴۹	۲۵	یک باوقار	ایک باوقار
۲۵۰	۱۵	ریانی	ریاض
۲۵۱	۷	پش نطر	پیش نظر
۲۵۲	۳	نے	نے
۲۶۰	۲	۱۶ شعبان ۱۱۴۴ھ	۱۶ شعبان ۱۲۴۴ھ
۲۷۱	فٹ نوٹ نمبر ۱	زبان گی	زبان کی
۲۷۲	۳	نظم طباطبائی	نظم طباطبائی
۲۸۳	۲۸	لفت	نعت
۲۸۶		سطر ۱۱ میں دوسرا مصرعہ یوں پڑھیے : روحیں منڈلاتی ہیں گراوج فضائے عرس پر	

صحیح	غلط	سطر	صفحہ
سطر ۱۱ میں دوسرا مصرعہ یوں پڑھیے : دست بیداد اجل نے نہ مٹائی ہوتی			۲۸۷
نہ وہ نسترن نہ سمن زہی	یہ وہ نسترن نہ سمن زہی	۱۶	۲۸۸
مکتب میں فارسی بھی سیکھی	کتب میں فارسی بھی سیکھی	۲۵	۲۸۹
عبدالقادر سروری	عبدالغفار سروری	کتابیات نمبر ۱۲	۲۹۳
احساسات	احساست	۸	۳۰۳
روے	روے	۱۸	۳۰۳
اور	ور	۷	۳۰۶
زیر بحث	زیرث	۷	۳۰۹
سرمنشی	مرمنشی	فٹ نوٹ نمبر ۲	۳۱۰
کلام	کلآم	۱۳	۳۱۳
نکلیں گے یہ ایک	نکلیں گے یہ ایک	۱۲	۳۱۳
جائیں	جاہیں	۲۸	۳۱۳
(اگر اسے بدسلوکی)	(اگریسے بدسلوکی)	۱۹	۳۱۶
مزید روشنی	مزاید روشنی	فٹ نوٹ	۳۱۸
عذاری	غداری	۲۸	۳۲۳
عذر	غدر	۹	۳۲۴
خود	خو	۱۳	۳۲۴
کوئی	کرئی	۲۱	۳۲۹
چیزوں	حیزوں	۸	۳۳۱
بھاگ گے	بھاک گے	۲۴	۳۳۱
رعایت لفظی	ریاعت لفظی	۱	۳۳۴
رعایت لفظی	ریاعت لفطی	۹	۳۳۴
نذیر احمد	نذر احمد	۱۹	۳۳۵
انگریز خاتون	انگرنری خاتون	۱۲	۳۳۶
صدیقی	صدیفی	فٹ نوٹ	۳۴۱
نذیر	ندیر	۲۵	۳۴۳
ایامی	ایالی	۳	۳۴۶
نفسیات	نقسیات	۲۷	۳۴۶
ے	ے	۸	۳۴۷

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۳۴۹	۲۴	زندکی	زندگی
۳۵۳	۱۹	داستان تاریخ اور ، اُردو	داستان تاریخِ اُردو ، اور
۳۵۶	۱۱	تحریر	عریر
۳۵۷	۷	پہلے	پہلے
۳۵۸	۷	فسانۂ مبتلا (۱۸۸۸۵ء)	فسانۂ مبتلا (۱۸۸۵ء)
۳۵۹	۲۲	محموعہ	مجموعہ
۳۶۱	۱۵	بہتر	بہتر
۳۶۲	۸	نزیر احمد	نذیر احمد
۳۶۲	۱۷	۱۹۸۷ء میں	۱۸۸۷ء میں
۳۶۲	۲۷	مسلمانان ہندئے مہذب	مسلمانانِ ہند مہذب
۳۶۳	۹	کتاب نفسیر	کتاب تفسیر
۳۶۳	۲۲	شیخ محمد اگرم	شیخ محمد اکرام
۳۷۱	۳	حدر آباد	حیدر آباد
۳۷۱	۱۳	لکھنؤ .	لکھنؤ
۳۷۳	۳	پہلا	پہلا
۳۷۸	۳	اوۃ ب	اوقات
۳۷۸	فٹ نوٹ نمبر ۲	فراق گورکھپوری	فراق گورکھپوری
۳۷۹	فٹ نوٹ سطر نمبر ۳	لعبت چیں	لعبت چین
۳۸۰	۲۳	محموعی	مجموعی
۳۸۱	۷	معاشرے	معاشرتی
۳۸۱	۱۱	پہلو	پہلو
۳۸۳	۳	واضع	واضح
۳۸۵	کتابیات نمبر ۱۱	عبدلحلیم	عبدالحلیم
۳۸۵	کتابیات نمبر ۱۷	داتم	دائم
۳۸۵	کتابیات نمبر ۲۷	مارج	مارح
۳۸۸	۲۵	والس میکزی	والس میکنزی
۳۹۳	۳	شراب نوسی	شراب نوشی
۳۹۳	۸	نیاض	نباض
۳۹۳	۲۵	تخیّل	تخیّل

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۲۹۴	۸	عام زالدکی	عام زندگی
۳۰۱	۱۶	پیشتر	بیشتر
۳۰۱	۲۰	خاض	خاص
۳۰۱	۲۷	ایشج	اسٹیج
۳۱۰	۱۳	اداد بھائی	دادا بھائی
۳۱۰	۲۸	راست گمتار	راست گفتار
۳۱۲	۱۳	وکٹوریہ تھیٹر	وکٹوریہ تھیٹر
۳۲۲	۱۰	طیعزاد	طبعزاد
۳۲۲	۱۷	عرصعہ	عرصہ
۳۲۳	۱۵	گوپی حند	گوپی چند
۳۲۵	۴	ڈاٹرکٹر	ڈائرکٹر
۳۲۵	فوٹ نوٹ نمبر ۱ (ب)	ڈاکٹر نامی	ڈاکٹر نامی
۳۲۷	۴	(یوپی)	(یو - پی)
۳۳۱	۱۹	۱۰۰۸ء سے ۱۹۲۵	۱۹۰۸ء سے ۱۹۲۵ء
۳۳۶	۳	موڑ خانہ	مؤر خانہ
۳۳۶	۱۵	عقپدت	عقیدت
۳۴۴	۱۳	حضرت کے کردار کو	حضرت عمر کے کردار کو
۳۴۶	۷	سوانخ عمری ں	سوانخ عمریاں
۳۵۰	۲	موڑ خانہ مقصد	مؤر خانہ مقصد
۳۵۱	۷	تخر	فخر
۳۵۱	۱۲	حیاتِ اصلاح الدین	حیاتِ صلاح الدین
۳۵۵	۱	رواق	اوراق
۳۶۴	۱۷	انکار کوئی خط	ان کا کوئی خط
۳۶۴	۲۱	مجیور	مجبور
۳۷۰	۶	مکاتیب کے لیے مجموعے	مکاتیب کے مجموعے
۳۷۳	۲۲	ھی	بھی
۳۷۴	۱۱	مرزا محمد حادی رسوا	مرزا محمد ہادی رسوا
۳۷۵	۳	آبین	بین

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۴۷۵	۳	یا گیا	آیا گیا
۴۷۵	۱۶	پا	یا
۴۷۵	۱۸	چتنی	جتنی
۴۷۶	۷	ہوکا	ہوگا
۴۹۵	۵	ترقی پسندانہ	ترقی پسندانہ
۴۹۵	۱۶	زندکی	زندگی
۴۹۵	۲۱	نقطہ نظر	نقطۂ نظر
۴۹۵	۲۷	پگانے ادب	یگانے ادب
۴۹۷	۴ تا ۶	ایضا	ایضاً
۵۰۳	سطر ۲ ، ۹ ، ۱۵ ، ۱۷ پر حوالہ جات نمبر یوں ہیں		۱ ، ۲ ، ۳ ، ۴
۵۰۷	۱۹	پہچانا	پہنچانا
۵۱۱	۱۱	ثم لکھنوی	ثم لکھنوی
۵۱۲	۲۴	کمرے کے گرد	کمر کے گرد
۵۱۳	۱۳	یک رخ خاکے	یک رخے خاکے
۵۱۳	۲۷	علم ہثیت	علم ہئیت
۵۱۷	فٹ نوٹ	تخلیق کے مطابق	تحقیق کے مطابق
۵۲۳	۱۵	نعلیم	تعلیم
۵۲۷	۱۸	مولانا	مولانا
۵۳۷	۷	بہ مندرچات	بہ مندرجات
۵۴۱	۷	وئی	کوئی
۵۴۴	۲۶	قاضی بدایونی	فانی بدایونی
۵۴۷	۱	لزٹ	گزٹ
۵۵۱	۹	بوسف	یوسف
۵۵۲	۱	کشوش	کوشش
۵۵۷	۱۸	ردو	اُردو
۵۵۹	۲۴	ابنا	اپنا
۵۷۲	۲۲	۱۸۶۵ء/۱۲۶۱ھ	۱۸۴۵ء/۱۲۶۱ھ
۵۷۲	۲۳	انتخات درارن	انتخاب دواوین
۵۷۵	۲۳	دعوت فکر و نظر بھی(۱)	دعوت فکرو نظر بھی(۲)

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۵۷۸	۱۱	عیاراشعرا	عیاراالشعراء
۵۷۹	۳	تراجم میں	تراجم ہیں
۵۷۹	سطر ۱۰ میں حوالہ (۱) اور (۲) کی بجائے (۲) اور (۳) پڑھیے		
۵۸۰	۱۹	گنوائی ہیں (۲)	گنوائی ہیں (۳)
۵۸۱	۱٦	(۱)	(۳)
۵۸۱	۲۷	استادنہ	استادانہ
۵۸۷	۲۸	مرکور	مرکوز
۵۸۸	۸	برتوں	فرقوں
۵۹۱	۱۱	اقرار دیتے	قرار دیتے
۵۹۳	۱	مناظرین	مناظرین نے
۵۹۴	۳۳	بقام	بمقام
۵۹۷	سطر نمبر ۱۰ ، ۱۱ ، ۱۲ ، ۱۳ ، اور ۱۴ کے آغاز کے جو لفظ ٹوٹ گئے ہیں وہ یہ ہیں 'کہ' 'ہو گئے' 'لکھ کر' 'تائب' 'المحبت والشوق'		
۵۹۹	۲۳	رسایل	رسائل
٦۰۲	۱۳	قرآن محید	قرآن مجید
٦۰۳	۹	ڈپشی نذیر احمد	ڈپٹی نذیر احمد
٦۰۴	۸	جواب میں	کے جواب میں
٦۰٦	۱۴	گھر پہنچ گی	گھر گھر پہنچ گئی
٦۰۸	۲۴	کتاب ہیں	کتاب میں
٦۱۱	۱۷	بتادوں کا	بتادوں گا
٦۱۴	۱۸	کے کے	کے
٦۱٦	۷	فریقہ	فرقہ
٦۱۸	۸	زمانۂ طالب علی	زمانۂ طالب علمی
٦۲۱	۱۷	مکی	کی
٦۳۷	۷	مختف	مختلف
٦۳۷	۸	واعد	قواعد
٦٦۰	۹	امیراللعات	امیراللغات